
فروغِ اردو
لکھنؤ

۸ ۱۸ شمارہ ۲
رجسٹرڈ نمبر: ایل - ۲۰
لسٔنس نمبر: ۲۰۶۴۱۷/۲۰۱۸۱۶۴
فون نمبر ۲۶۱۳۵

ادارہ فروغ اُردو ھند کا علمی و ادبی ماہنامہ

فروغ اُردو لکھنؤ

جون ۱۹۷۱ء

مدیر اعزازی:
پروفیسر سید احتشام حسین

ادارت:-
محمد حسین شمس علوی
عبدالقوی دریابادی
سعادت علی صدیقی

زر سالانہ: چار روپے
فی پرچہ: ۳۷ پیسے

پتے:-
۱- ادارۂ فروغ اُردو
امین آباد پارک، لکھنؤ - ۱
۲- انوار اشرف
۵۰ - ب، ڈی سلوا ٹاؤن
نارتھ ناظم آباد - کراچی، پاکستان

ترتیب

سید انصار حسین پرنٹر، پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اُردو [illegible]

محمد حسین شمس علوی

اپنی باتیں

ہندی اور اُردو الگ الگ قومی زبانیں ہیں اور دستورِ ہند میں اپنا مقام رکھتی ہیں اس لئے ہم برابر اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ ہندوستان میں اصولاً اُردو زبان کے لئے ہر طرح کے حقوق دستورِ ہند کی کتابوں میں درج نظر آتے ہیں لیکن عملاً اِس کی بقا اور ترقی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں مختلف تعلیمی مدارج پر تدریس کی سہولتیں نصاب کی کتابوں کی فراہمی اُردو کے اساتذہ کی تعلیم دفتری کاموں میں اُردو زبان کا معاملہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں قول و عمل کا فرق نمایاں نہ ہو اور ان حقوق کے حاصل کرنے کے سلسلہ میں ہم مستقل طور پر تیئیس ۲۳ سال سے جدوجہد بھی کررہے ہیں مگر افسوس اربابِ حکومت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی ہندوستان کی ہر سیاسی پارٹی الکشن کے موقع پر اپنے حصول و اقتدار کی خاطر بہانگ دہل یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ اقلیت کے حقوق ان کی زبان۔ کلچر۔ تمدن۔ معاشرت کا تحفظ کریگی مگر الکشن کے بعد اقلیت کے حقوق کو فراموش کرکے اپنے اقتدار کے چنگل میں پھنس کر اقلیتوں سے کئے گئے ایفاء وعدہ کی تکمیل کو فراموش کرکے اپنے اقتدار کی جدوجہد میں مصروف ہوجاتی ہے۔ ان حالات میں اراکین حکومت سے یہ توقع کرنا کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کریگی بے سود ہے۔ ہم کو بڑی توقع تھی کہ ہمارے ملک کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی جوکہ الکشن کے موقع پر برابر اقلیتوں کی زبان اور کلچر کے سلسلہ میں دلاسا دلا رہی تھیں کہ جو اُردو زبان کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھا جارہا ہے میں صاحبِ اقتدار ہونے کے بعد ان کے کلچر زبان۔ تہذیب اور معاشرت کو فروغ دینے کے سلسلہ میں ہر ممکن

رادوں کی وہ بھی صاحبِ اقتدار ہونے کے بعد ببانگ دہل اعلان کرچکی ہیں
۔ زبان اور اُردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے حکومت کسی
طرح تسلیم نہیں کرسکتی۔

اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ ادارۂ فروغ اُردو معہ
ہندوستان کی جملہ ان تنظیموں سے جوکہ اُردو زبان کے حق کو قانونی طور پر حاصل
کرنا چاہتے ہیں یہ توقع کرے کہ جملہ اُردو تنظیمیں ایک لڑی میں منسلک ہوکر اجتماعی
طور پر اربابِ حکومت سے درخواست کریں کہ اقلیتوں کے وہ تمام حقوق جو دستور
ہند میں درج ہیں ان کو اس جمہوری حق سے نوازے اور ان کو وہ حقوق
دے کہ جس کی دستورِ ہند میں ضمانت دی گئی ہے۔

زمانہ نام ہی ہے خوشی اور غم کے اجتماع کا اور حیات و مرگ کی اس کشمکش
کا جس سے گذرنا ہر قوم کی تقدیر ہے یہ کاروبار ہر وقت اسی طرح جاری
رہتا ہے کہ بہت سے لوگ اس سے بے خبر گذرتے ہیں لیکن بعض واقعات
کا اثر محض شخصی نہیں ہوتا اور کسی نہ کسی حیثیت سے مخصوص مقاصد اور مسائل
کے تحت متوجہ کرتا ہے گذشتہ چند مہینوں کے اندر اگر محض اُردو زبان کے نقطۂ نظر
سے دیکھا جائے تو اُردو زبان کے تین خدمت گزاروں کی موت بھلائے جانے کی چیز نہیں

ایک مولانا اختر علی تلہری جوکہ عربی۔ فارسی۔ تنقید و ادب کے اچھے نقاد ہی
نہیں بلکہ عربی فارسی کے ایک اچھے محقق و ادیب بھی تھے داغِ مفارقت دے گئے۔

اسی طرح عالم باعمل، شفاء الملک حکیم شمس الدین جن کے دم سے طبِ یونانی
اور دنیاوی کا چراغ گلُ ہوگیا ان کی شخصیت کا طوطی علم طب میں دنیائے طب
کے لئے حادثہ عظیم ہے۔

مولانا احترام الدین شاغل جوکہ صوبہ راجستھان کے ایک ممتاز۔ خوش مزاج
خوش اخلاق ادیب ہی نہیں بلکہ اُردو زبان کی بقاء اور جدوجہد کے سلسلہ میں
(صوبہ راجستھان میں جو جدوجہد اور کامیابی انکی وجہ سے تھی) وہ بھی داغِ مفارقت دیگئے

اراکین ادارۂ فروغ اُردو منجملہ حضرت کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں
اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل [illegible]

جناب حکیم تیموری

غزل

قضا ٹھیرے، رُکے گردش، مٹیں غم، وقت ٹل جائے
جو تم چاہو تو میری زیست کا عنواں بدل جائے

اگر اِک آہ تیموری دُکھے دل سے نکل جائے
زمین و آسماں کیا، عرش کا بھی دِل دہل جائے

وفا کو ہم اگر عنواں بنالیں جہدِ ہستی کا
بہت ممکن ہے دُنیائے جفا کا رُخ بدل جائے

سنبھالا دوسرا اک نام ہے اپنی ہی لغزش کا
سنبھلنا ہو جسے وہ ٹھوکریں کھا کر سنبھل جائے

بلا ہے دل تو رسم و راہ پیدا کیجئے دِل سے
نہ ہو ایسا کہ ہاتھ آئی ہوئی دولت نکل جائے

نئے چہروں نے بڑھ کر کہنہ چہروں کی جگہ لے لی
یہی قانونِ قدرت ہے جو آج آئے وہ کل جائے

مُسلّم ہے افادیت نشاط و کیف کی لیکن
بُرا کیا ہے کوئی غم کھا کے پلتا ہے تو پل جائے

ترے لب، رشکِ صد تسنیم، آنکھیں رشکِ صد کوثر
نہ کیوں مضطر تقدس ہو، نہ کیوں ایماں مچل جائے

جو تم آجاؤ گلشن میں تو ناممکن نہیں کچھ بھی
ہوا تھنکے، فضا چہکے، کھلیں گل، رُت بدل جائے

نہیں اس کے سوا کوئی تمنا دِل میں تیموری
محبت سرخرو ہو، زندگی سانچے میں ڈھل جائے

ادت علی صدیقی

ڈاکٹر عبدالسلام سلاؔم سندیلوی

تعارف اساتذہ اُردو، جامعات ہند — ۵

ڈاکٹر سلاؔم سندیلوی کے فن اور شخصیت کے بارے
ں، مضمون لکھنا بہت آسان سمجھ رہا تھا اسلئے کہ ڈاکٹر صاحب،
لد محترم (ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی) کے دیرینہ دوست
ں۔ بچپن سے ان کو بہت نزدیک سے دیکھتا اور سُنتا آیا ہوں
نِ شعور کو پہونچنے کے بعد سے ان کی تحریریں پڑھ رہا ہوں
مختصر یہ کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا مطالعہ
ت قریب سے کیا ہے۔ لیکن جب مضمون لکھنے کے لئے
م اُٹھایا تو خیالات نے ڈاکٹر صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کے
منے گھٹنے ٹیک دئیے، الفاظ نے ساتھ چھوڑ دیا، اور میں جس
م کو جتنا آسان سمجھ رہا تھا۔ وہ اتنا ہی دشوار اور مشکل نظر
نے لگا لیکن جب لکھنے بیٹھ گیا تو کچھ تو لکھنا ہی تھا ٹوٹے
وٹے الفاظ اور بے ربط جملوں میں ہی۔

ڈاکٹر سلاؔم سندیلوی کا نام آتے ہی، مروت، خلوص
ضع داری، شرافت، سنجیدگی، متانت، سادگی، انسانیت
ر محبت کی جیتی جاگتی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے
، صرف پڑھے لکھے آدمی ہی نہیں، نیک اور سچے انسان
بھی ہیں۔ سیدھے سادے، معصوم صفت، ریاکاری و،
دھوکہ فریب کی ان کے یہاں گنجائش نہیں۔ وہ جو کچھ
ظاہر میں ہیں، وہی باطن میں۔ قول و فعل کا تضاد ان کے
یہاں عنقا ہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں میرؔ کے بقول
یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے " پراگندہ طبع لوگ" مشکل
سے ملتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب پیدا تو مضافات سندیلہ میں ہوئے لیکن عمر
عزیز کا بڑا حصّہ لکھنؤ میں بیتا ہے۔ پہلے سُنی ہائی اسکول
میں استاد تھے اور اب شعبہ اُردو گورکھپور یونیورسٹی میں
لکچرر ہیں۔ لکھنا پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے اور ڈگریاں
حاصل کرنا ان کا محبوب مشغلہ۔ اسی لئے بیشمار ڈگریوں
کے مالک اور کثیر کتابوں کے مصنف ہیں۔ زندگی کی
جد و جہد میں سینکڑوں " نشیب و فراز " سے دوچار ہو چکے
ہیں جسکی داستان " قیدِ حیات " کے عنوان سے لکھ رہے
ہیں۔ (" قیدحیات " سلام صاحب کی خود نوشت سوانح عمری
ہے جو نشاط میں قسط وار شائع ہو رہی ہے) اس سلسلہ

اس مضمون میں "سوانحی حالات" سے گریز کیا گیا ہے اور محض ادبی و علمی خدمات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی بیک وقت شاعر، نقاد اور محقق ہیں۔ اگرچہ ان کا خاص موضوع تنقید ہے مگر انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری سے کی ہے۔ انکی شاعرانہ حیات کا آغاز ۱۹۳۴ء سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ تجرباتی دور تھا جو تقریباً دو سال تک قائم رہا اس دوران میں انھوں نے کچھ غزلیں کہیں مگر ان کو محفوظ نہیں رکھا کیونکہ وہ ابتدائی مشق کا زمانہ تھا ان کے قلم سے جو پہلا شعر نکلا وہ یہ ہے۔

عنوان بدلتا جاتا ہے، ہر گام پہ عشق لافانی
سینے میں یہی انگارا تھا پلکوں پہ جو ہے ٹھنڈا پانی

دراصل غزل سے زیادہ ان کی توجہ نظم کی طرف بھی ہے انھوں نے جب لکھنؤ کی ادبی فضا میں آنکھ کھولی، اس وقت جوش ملیح آبادی اور احسان دانش کی نظموں کی دھوم تھی اس کے علاوہ لکھنؤ کے مشاعروں پر جگر مرادآبادی بحیثیت غزل گو شاعر کے چھائے ہوئے تھے۔ سلام سندیلوی نے ان تینوں شعراء کا اثر قبول کیا۔ چنانچہ ان کی ابتدائی نظموں پر جوش ملیح آبادی اور احسان دانش کے نقوش گہرائی کے ساتھ ثبت ہیں مگر آگے چل کر انھوں نے اپنے لئے خود ایک نیا راستہ تلاش کر لیا اسی طرح ان کی ابتدائی غزلوں میں جگر مرادآبادی کی ہلکی سی جھلک موجود ہے لیکن بعد میں انھوں نے میر، غالب اور فانی کے اثرات قبول کیئے۔ اب وہ شاعری میں کسی کے معتقد نہیں ہیں اور ہر صنف میں اپنا الگ نیا رنگ رکھتے ہیں۔

۱۹۳۶ء سے سلام صاحب نے باقاعدہ نظموں کی تخلیق کا آغاز کیا۔ چنانچہ ان کی پہلی نظم جو ان کے مجموعہ کلام اوّل "ساغر و مینا" میں شامل ہے، "تالاب کے کنارے" ہے اس نظم کا انداز بیان جوش ملیح آبادی کے اسلوب سے ملتا جلتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اک روز میں کھڑا تھا تالاب کے کنارے
پیش نظر تھے میرے کچھ دلنشیں نظارے
رنگین تھیں فضائیں، سورج چمک رہا تھا
ہر ذرۂ زمیں کا چہرہ دمک رہا تھا
ٹھنڈی ہوا سے شاخیں پانی پہ جھومتی تھیں
مستی میں آکے لہریں کرنوں کو چومتی تھیں
پانی میں ایک کم سن لڑکی نہا رہی تھی
لہروں میں ہلکی ہلکی چاندی بہا رہی تھی
شانوں پر بھیگے بھیگے وہ کالے کالے گیسو
وہ مست مست آنکھیں، شرمندہ جس سے آہو

سلام صاحب کی شاعری کے ابتدائی دور میں ہم عشقیہ نظمیں کافی مقدار میں ملتی ہیں۔ اور یہ بات فطری ہے کیونکہ اس وقت ان کی عمر بائیس تئیس سال کی تھی۔ یعنی انھوں نے شباب کی وادی میں قدم رکھا تھا۔ یہاں حسن و عشق کی کلیاں چٹک رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس دور میں متعدد عشقیہ نظمیں کہی ہیں "پھر یہ موسم کہاں" کے دو بند دیکھئے۔

کچھ عجب آج مستی ہواؤں میں ہے کیف بادہ مچلتی گھٹاؤں میں ہے
جھومتی کونپلوں کی صداؤں میں ہے پیہو پیہو کا نغمہ فضاؤں میں ہے
کچھ پیو کچھ پلاؤ سے ارغواں
پھر یہ موسم کہاں، ہم کہاں، تم کہاں

چھایا کبھی چاند نکلا کبھی ہے کبھی تیرگی اور کبھی روشنی
دن مل جل کے کرنے لگیں دل لگی چاندنی، بدلیاں، بدلیاں چاندنی
بدلیاں چاندنی، چاندنی بدلیاں
پھر یہ موسم کہاں، ہم کہاں، تم کہاں

نظم میں جذبات عشق کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ اسکے ساتھ ہی سلاست، روانی، موسیقی اور نغمگی نے اس نظم کے جام کو مئے دو آتشہ کے خمار میں تبدیل کر دیا ہے۔

سلام کا عشقیہ دور رفتہ رفتہ ختم ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد ان میں زندگی کے تلخ حقائق کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۴۴ء میں "ایک ہی دے خوشی کبھی" "شکایت" "گداگری" "برما کی لاش" اور "مفلس کی پکار" وغیرہ نظمیں کہیں جن کا لب و لہجہ غمگین ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں قومی شعور بھی بیدار ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کا نعرہ بلند کیا، اور "اے ہند کے جوان" "اس بستی کے رہنے والے" "غلامی کی زنجیر" اور "گریۂ سحری" وغیرہ نظموں کی تخلیق کی جن میں حریت کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔

۱۹۴۷ء سے سلام سندیلوی کی حیات کا تاریک زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس دور میں ان کی زندگی کوہ غم سے ٹکرا گئی اور پاش پاش ہو گئی۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ان کی چار ماہ کی بچی نزہت شہوار داغ مفارقت دے گئی۔ پھر ۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو ان کی رفیقۂ حیات اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان مسلسل سانحات نے ان کی رگ رگ میں زہر بھر دیا۔ اب ان کو زندگی میں بجز تاریکی کے خوشی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ اسی دور کی پیداوار اور ان کی شہرۂ آفاق نظم "پاگل کوے" ہے۔ دراصل یہ نظم ان کی ۱۹۴۳ء کی تخلیق ہے۔ مگر بعد میں انھوں نے اس میں کچھ تبدیلیاں کیں اس طرح یہ نظم ۱۹۴۸ء میں مکمل ہوئی۔ اس نظم کے چند بند یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

پاگل کوے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا
مجھ سے تو خفا ہے سارا جہاں، ہے کون یہاں آنے والا
میری دیوار پہ تو بیٹھا، کیوں پاپی شور مچاتا ہے
کیوں بھولی بسری باتوں کو پردیس میں یاد دلاتا ہے
کیوں کانوں کو جھٹلاتا ہے، کیوں نظروں کو بہکاتا ہے
میرا دنیا میں کوئی نہیں، کس کا سندیس سناتا ہے
جا چھیڑ نہ دکھتی رگ ناداں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

بہکے کوے! سن بات مری، گھبرا کے ڈگر کیا بھول گیا
کچھ غور تو کر، کچھ سوچ تو لے، جلدی میں نگر کیا بھول گیا
جس کے گھر تجھ کو جانا تھا، تو اس کا گھر کیا بھول گیا
کیا نقشہ تجھ کو یاد نہیں، دیوار و در کیا بھول گیا
وہ ہوگا کوئی اور مکاں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

اک باپ تھا "نیلا باغ" میں ہے جو زیر تربت سوتا ہے
اک ماں جو گاؤں میں رہتی تھی، ہے ساکن جنت سوتا ہے
اک بھائی کہیں پردیس میں ہے، جس کے ہے ملامت [illegible]
اک دور کا ماموں [illegible]

پھر کس کے آنے کا ہو گماں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

تیری بولی سے اِک بھی اک تازہ چوٹ اُبھر آئی
وہ اپنی زوجۂ خوش باطن، جو تھی غمخوار تنہائی
جس کی ہر سانس میں بجتی تھی اُلفت کی سنہری شہنائی
وہ جنت کی جانب چل دی لیتی ہوئی موت کی انگڑائی

خاموش لحد ہے جس کا نشاں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

اس نظم کی تعریف تقریباً سبھی نقادوں نے کی ہے خاص طور سے پروفیسر فراق گورکھپوری اس نظم سے بہت متاثر ہوئے۔ سلام صاحب کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے:

"یقین مانیے اسے پڑھکر اتنا اثر ہوا کہ دل میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ اس نظم میں مجھے تو کوئی عیب نظر نہیں آیا۔ خوبیاں ہی خوبیاں نظر آئیں اگر کبھی آپ اتنے معصوم جذبات اور اتنے معصوم ترنم سے لبریز پچاس ساٹھ نظمیں دو چار برس کے اندر کہہ ڈالیں تو آپ اردو ادب اور ہندوستان پر احسان کریں گے۔ اس نظم کو گنگناتے ہوئے میں مشکل سے اپنے آنسو روک سکا۔"

سلام صاحب کی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ "ساغر و مینا"، ۱۹۴۹ء میں شائع ہو کر مقبول ہوا اور اردو کے ممتاز ناقدوں نے تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ علامہ نیاز فتحپوری نے نگار نومبر ۱۹۵۶ء میں "ساغر و مینا" پر مندرجہ ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

" اس مجموعہ میں ۱۰۸ صفحات نظموں کے لئے وقف ~~وقف~~ کئے گئے ہیں اور ۴۰ صفحات غزلوں کے لئے جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۹ء تک کے افکار پر مشتمل ہے نظم کی تعداد ۵۴ ہے اور غزلوں کی ۲۶ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نظم نگاری کی طرف زیادہ مائل ہیں لیکن ان کی نظموں میں بھی اتنا تغزل پایا جاتا ہے کہ ہم پوری کتاب کو غزلیات کا مجموعہ تصور کریں تو اسے نارو اجسارت نہ کہا جائے گا۔

جناب سلام صاحب کی منظومات کی خصوصیت ان کا درد مندانہ لب و لہجہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قنوطی تو نہیں لیکن شدید قسم کے حساس شاعر ضرور ہیں۔ لب و لہجہ نرم، زبان حد درجہ سلیس اور آسان، انداز بیان بہت شگفتہ اور دلنشیں و پاکیزہ یہ ہیں خصوصیات سلام صاحب کی شاعری کی جو یقیناً دل میں گھر کرنے والی چیزیں ہیں۔"

۱۹۴۹ء کے بعد سے سلام صاحب کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔ اے کیا اس وقت ان کی ملاقات پروفیسر سید احتشام حسین اور آل احمد سرور سے ہوئی۔ احتشام صاحب ایک اشتراکی نقاد ہیں اور سرور صاحب بھی اشتراکیت کے ہم نوا رہے ہیں۔ اس لئے سلام صاحب نے ان دونوں کے اثرات کسی نہ کسی حد تک قبول کئے مگر وہ مکمل طور سے اشتراکی شاعر نہیں ہوئے۔ البتہ ۱۹۴۹ء کے بعد سے

انھوں نے کچھ اشتراکی نظمیں کہی ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام "نکہت و نور" کے عنوان سے ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا جس میں اشتراکی۔ رومانی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔

"نکہت و نور" مجموعہ بھی اردو داں طبقہ میں کافی مقبول ہوا اور اس پر بھی نقادوں نے فراخ دلی سے تبصرے کئے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:۔

"نکہت و نور" سلام سندیلوی صاحب کے کلام کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جس کو ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ سلام سندیلوی صاحب کے کلام کا پہلا مجموعہ "ساغر و مینا" چند سال قبل شائع ہو کر دادِ قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جس کا تعارف پروفیسر آل احمد سرور نے قلم بند کیا ہے۔ اس مجموعہ میں نظموں کے ساتھ غزلیں بھی شریک ہیں۔ اور نظمیں اشتراکی، رومانی اور تاریخی ہر قسم کی شامل ہیں۔

"نکہت و نور" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سلام میں شاعری کا فطری ذوق ودیعت ہے اور شاعر کے لئے جس تڑپ اور لگن کی ضرورت ہے وہ بھی ان کے دل میں موجود ہے۔ قدرت کی طرف سے انکی زندگی میں ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ جن کے سبب سے ان کے کلام میں سوز و گداز پیدا ہو چکا ہے۔ ایسا سوز و گداز جو اردو کے شاعری فرضی اور رسمی طور پر اپنے کلام میں پیدا کرتے ہیں۔ ان حادثات اور جاں گسل صدمات سے سلام صاحب کو فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ ان کے کلام کی مقبولیت اور ان اثر میں اضافہ ہو اور وہ اردو کے ایک بڑے اور کامیاب شاعر ثابت ہوں۔

سلام صاحب کے کلام کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان کو زبان پر اچھا قابو حاصل ہے اور انکی نظموں کے بہت سے بند جوش ملیح آبادی کے کلام سے میل کھاتے ہیں اور کچھ دیر کے لئے یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم جوش کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ ان کا لفظی خزانہ وسیع اور انتخاب الفاظ قابل تعریف۔ اسی وجہ سے کلام میں روانی اور بیان میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ جو سلام کے دوسرے ہم عصروں میں کم نظر آتا ہے۔" (سب رس۔ حیدرآباد نومبر ۱۹۵۵ء)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلام صاحب نے جاں گسل صدمات برداشت کئے ہیں اس لئے ان کے کلام میں سوز و گداز اور یاسیت و محزونیت پیدا ہو گئی ہے۔ مگر "ساغر و مینا" کے مقابلہ میں "نکہت و نور" میں یاسیت کم ہے۔ یہ یاسیت نظموں اور غزلوں دونوں میں شدید کے بجائے لطیف ہو گئی ہے "نکہت و نور" کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

قدم قدم پہ زمانے کی چوٹ کھا کے چلے
مگر تیرا ہی کرم تھا جو مسکرا کے چلے

گئے وہ دل سے تو اب آرزو نہیں دل میں
چلے وہ گھر سے تو گھر کا دیا بجھا کے چلے

جو تیری زلف کے سائے میں زندگی گذرے
بجھا بجھا یہ زمانہ خوشی خوشی گذرے

ادھر کہتا ہوں میں روداد غم آہستہ آہستہ
ادھر ہوتی ہے ان کی آنکھ نم آہستہ آہستہ

اب ان کا نام نہ لے میرے سامنے ہمدم
چھلک پڑے گی مری آنکھ سے ابھی شبنم
خوشی کے پھول کھلے تھے تمہارے ساتھ کبھی
پھر اس کے بعد نہ آیا بہار کا موسم

اجل کا خوف نہیں زندگی کی آس نہیں
میں جس جگہ ہوں وہاں کوئی آس پاس نہیں
ہیں سامنے مرے جام و سبو مگر خالی
سمجھ رہا ہے زمانہ کہ مجھ کو پیاس نہیں

سلام صاحب نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ رباعیات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کی رباعیات کا رنگ بالکل جدا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے رنگ کے موجد ہیں۔ ان رباعیات کی خوبی یہ ہے کہ ابتدائی دو یا تین مصرعوں میں منظر نگاری ہے، مگر اس کے بعد تیسرے اور چوتھے مصرعہ میں اس منظر کی تشبیہ کسی تاریخی یا روایتی واقعہ سے دی گئی ہے۔ ان رباعیات کا مجموعہ "شام و شفق" کے عنوان سے بار اول ۱۹۶۰ء میں اور بار دوم ۱۹۶۶ء میں شایع ہو چکا ہے دو رباعیات ملاحظہ فرمایئے :۔

گلشن میں صبا ہے گل و اشجار کے گرد
رقصاں ہے پتنگ شمع کے گرد
جاں اپنی فدا کرنے کو جیسے بابر
پھیرے کرے بیمار ہمایوں کے گرد

یہ رات کی بل کھاتی ہوئی زلف دراز
یہ انجم و مہتاب کے بجتے ہوئے ساز
اک پھول کے نزدیک وہ سنبل کی بیل
محمود کے پہلو میں ہو جس طرح ایاز

ان رباعیات کے بارے میں حضرت آثر لکھنوی مرحو[م] نے لکھا ہے :

"شام و شفق" ڈاکٹر سلام سندیلوی ک[ی] رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ زبان و بیان کی نزاکتو[ں] لطافتوں اور رعنائیوں کے علاوہ ان رباعیو[ں] میں ایک ایسی جدت ہے جو اردو اور فارسی[ی] کی رباعیوں میں کم سے کم میری نظر سے نہیں گذ[ری]۔ عام طور پر رباعیوں میں یا تو منظر نگاری ہو[تی] ہے یا مناظر و مظاہر فطرت سے سبق منظر [...] کام لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی رباعیوں میں تاریخی یا روایتی واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے گویا وہ ان کی جیتی جاگت[ی] تصویریں ہیں۔ واقعات مناظر میں مجسّم یا مصـ[ـور] ہو گئے ہیں۔ اس طرز اظہار نے کلام میں تازگ[ی] کی روح پھونک دی ہے۔ ان رباعیوں کا ایک افادی پہلو بھی ہے۔ لطافتِ خیال سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ہم کو تاریخ ا[ور] روایات سے بھی واقفیت حاصل ہو جاتی [ہے]۔ ہر رباعی کے ساتھ ایک فٹ نوٹ بھی ہے۔ ا[ن] رباعیوں کو پڑھئے اور مسرت کی لہروں سے چھینٹ[ے] کھیلئے۔"

چونکہ سلام صاحب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری ارد[و] رباعیات پر حاصل کی ہے اس لئے اردو اور فارسی کی رباعیات کا سرمایہ ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ یہ[ی] وجہ ہے کہ انھوں نے رباعی میں اپنے لئے ایک نئی راہ نکال[ی]

سلام صاحب نے رباعی کے علاوہ قطعات کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ انھوں نے مختلف قسم کے قطعات کہے ہیں۔ مثلاً منظریہ قطعات۔ عشقیہ قطعات۔ تاریخی قطعات۔ المیہ قطعات۔ نرگسی قطعات۔ اخلاقی قطعات۔ فلسفیانہ قطعات۔ اور سیاسی قطعات وغیرہ۔ ان قطعات کا مجموعہ "شبنم و شراب" کے عنوان سے بہت جلد منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ ان کے چند منظریہ قطعات یہاں بطورِ نمونہ پیش کئے جاتے ہیں

یہ غنچۂ گلاب ہے کتنا اسیرِ جور
اس کو سکوں دیا نہ غمِ روزگار نے
رہ رہ کے اس کے قلب میں شعلے مچلتے ہیں
گھر بند کر کے آگ لگا دی بہار نے

چمن میں کون ہے یہ محوِ گلگشت
شگوفے ہو چلے ہیں ارغوانی
نہیں یہ سرخ پنکھڑیوں پہ شبنم
گلوں کے منہ میں بھر آیا ہے پانی

گلزار میں پتوں کے تصادم کا یہ عالم
جس طرح کوئی عاشقِ ناکام ملے ہاتھ
تاباں نہیں یہ پنکھڑی پر اوس کے قطرے
رکھا ہے کسی شوخ نے شبنم کے تلے ہاتھ

سلام صاحب کا ایک اور مجموعہ کلام قریب الاشاعت ہے جس کا عنوان "برگ و بار" ہے۔ یہ منظریہ نظموں کا مجموعہ ہے جو تقریباً پچاس نظموں پر مشتمل ہے۔ سلام صاحب کی شاعری کا خاص موضوع فطرت ہے۔ انھوں نے مختلف پرندوں اور پھولوں پر حسین نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں کا انحصار ان کے ذاتی مشاہدہ پر ہے۔ اسی لئے ان میں اصلیت اور صداقت موجود ہے۔ اُردو شاعری میں منظریہ نظموں کی بہت کمی ہے۔ جس طرح انگریزی میں ورڈز ورتھ نے "ڈیفوڈل" نظم کہی ہے اس طرح کی نظموں کا اُردو شاعری میں فقدان ہے۔ مگر سلام صاحب نے اِس کمی کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً انھوں نے دیپنگ ویلو۔ کس می کوئیک۔ نائٹ او کلاک۔ بچلیس بٹن۔ ہیوی کس فلاور۔ میڈین ہیر۔ مینالتا کا پھول۔ رات کی رانی۔ سروِ گلستاں۔ عشقِ پیچاں۔ گلِ سوسن۔ گل ہندی کے پودے۔ املتاس کے پھول اور گلِ مہر وغیرہ نظمیں کہی ہیں۔

سلام صاحب صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ایک محتاط محقق اور ایک حقیقت پسند نقاد بھی ہیں۔ اُنھوں نے نثر نگاری کا آغاز شاعری کے بعد کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ان کی ایک کتاب "ذخیرہ معلومات" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں "گنجینۂ معلومات" کے عنوان سے ایک اور کتاب منظرِ عام پر آئی۔ یہ دونوں کتب معلوماتی ہیں جو طلبہ کے لئے زیادہ مفید ہیں مگر ان کی تنقیدی اور تحقیقی اہمیت زیادہ نہیں ہے۔

سلام صاحب کی اصل تنقید کا آغاز ۱۹۵۹ء سے ہوتا ہے۔ اسی سال ان کی کتاب "ادب کا تنقیدی مطالعہ" شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی اور بے حد مقبول ہوئی۔ یہ کتاب ہڈسن کی مشہور تصنیف [illegible]

"AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF LITERATURE"

کے سوا دپر مبنی ہے۔ اس میں سلام صاحب نے بتایا ہے کہ شاعری، ناول، ڈراما، افسانہ، انشائیہ اور تنقید کا مطالعہ کس طرح کرنا چاہیئے اور کن رموز ونکات کو مطالعہ کے وقت ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ اس کتاب کو علامہ نیاز فتح پوری نے بہت پسند فرمایا تھا۔

"ادب کا تنقیدی مطالعہ" ڈاکٹر سلام سندیلوی کی تالیف ہے جس میں انھوں نے ہڈسن کی ایک مشہور کتاب کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ ادب و اصناف ادب کا مطالعہ کرنے کے کیا اصول ہیں اور ان کو سمجھنے اور پرکھنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر اردو میں یہ سب سے پہلی معقول کتاب ہے جس میں باوجود ایجاز کے کام کی کوئی بات ترک نہیں کی گئی۔

اُردو میں انتقادی لٹریچر بہت کچھ فراہم ہوگیا ہے لیکن نقد الانتقاد کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ یہ کتاب اس کمی کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے اور ضرورت ہے کہ ہر اہل وناا ہل نقاد اس کا مطالعہ کرے۔ اس کے مطالعہ سے ہم نہ صرف مختلف اصناف ادب کی خصوصیات سے ناواقف ہو سکتے ہیں بلکہ ان نقادوں کے کارناموں پر بھی نقد کر سکتے ہیں جو لکھتے زیادہ اور سمجھتے کم ہیں۔" (نگار ستمبر ۱۹۶۲ء)

دراصل یہی کتاب سلام سندیلوی کی تنقید کا سنگ بنیاد ہے۔ "ادب کا تنقیدی مطالعہ" مختلف یونیورسٹیوں کے بی۔اے کے نصاب میں شامل ہے اس کتاب پر یو۔پی گورنمنٹ نے ۱۹۶۱ء میں پانچسو روپیہ انعام بھی دیا ہے۔ اس کے اب تک چھ سات اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے مشعلِ راہ کا کام کرتی ہے۔

اسی سال یعنی ۱۹۵۹ء میں سلام صاحب کی ایک اور کتاب "کعبہ میں صنم خانہ" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے مسلمان اُردو شعراء کی ان نظموں کو یکجا کر دیا ہے ——— جنھوں نے ہندو مذہب اور ہندو عقائد اور ہندوؤں کے تہواروں پر اپنے منظوم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس میں امیر خسرو، محمد علی قطب شاہ، فائز دہلوی، جوشش عظیم آبادی، میر۔ نظیر اکبرآبادی، انشا۔ رنگین۔ امانت۔ بہادر شاہ ظفر۔ شاہ تراب کاکوروی۔ بے نظیر شاہ۔ سلیم پانی پتی۔ اقبال۔ بیدم شاہ وارثی، باسط بسوانی، سیماب اکبرآبادی۔ حسرت موہانی، ظفر علی خاں۔ رفقر موہانی۔ حامد اللہ افسر میرٹھی۔ نہال سیوہاری۔ ثاقب کانپوری۔ ساغر نظامی۔ آل احمد سرور۔ نشور واحدی۔ نظیر لدھیانوی۔ غلام ربانی تاباں۔ اور شمیم کرہانی کی نظمیں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کے مسلمان شعراء کو ہندوستان، اس کے ماحول، اور اس کی روایات سے کسقدر لگاؤ ہے اور یہ لگاؤ آج سے نہیں ہے بلکہ امیر خسرو کے زمانہ سے ہے جنکی حیات ۱۲۵۳ء سے ۱۳۲۵ء تک کے عرصہ پہ

لی ہوئی ہے یعنی ہندوستان سے انسیت کا اظہار
خسرو نے اب سے تقریباً ساڑھے سات سو سال قبل
تھا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

۱۹۶۱ء میں سلام صاحب کے تنقیدی مضامین کا
عہ" ادبی اشارے" کے نام سے شائع ہوا۔ اس
ے میں ان کی تنقیدی قوتیں اور زیادہ نکھار کے
تھ ابھری ہیں۔ اس میں "فن سوانح نگاری اور
لی" "م انرسیا اور اُردو نثر میں اس کا ارتقا"۔
ہدی افادی" اور "جوش ملیح آبادی کی منظر نگاری"
مضامین ہیں۔ یہ کتاب بھی مختلف یونیورسٹیوں کے
اب میں داخل ہے۔ اس پر دسمبر ۱۹۶۱ء میں "نگار"
علامہ نیاز فتح پوری نے تبصرہ فرمایا تھا وہ تحریر
اتے ہیں :-

"ادبی اشارے" ڈاکٹر سلام سندیلوی کے چند
ادبی و انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے
نسیم بک ڈپو نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر
سلام سندیلوی ان لوگوں میں سے ہیں جو صرف
پڑھنے لکھنے ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور شب و
روز اسی مشغلہ میں مصروف رہتے ہیں۔ نقد و ادب
پر انکی متعدد کتابیں اسوقت تک شائع ہو چکی ہیں
اور بہت پسند کی گئی ہیں۔

یہ مجموعہ ان کے بارہ مقالات پر مشتمل ہے
اور ان میں کوئی مقالہ ایسا نہیں جو اپنی افادی
خصوصیات کے لحاظ سے قابل توجہ نہ ہو خصوصیت
کیساتھ رباعی نویسی ایران کا مضمون بہت غور
... بل ہے۔"

۱۹۵۵ء میں سلام صاحب نے "اُردو رباعیات"
پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد
یہ مقالہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ "اُردو رباعیات"
پر اس سے بہتر اور کوئی کتاب اس وقت تک شائع
نہیں ہوئی ہے اس کتاب میں سلام صاحب نے رباعی
کی ایجاد پر مفصل بحث کی ہے انھوں نے باب اول
میں بتایا ہے کہ رباعی ایران کی ایجاد ہے۔ اس کے بعد
باب دوم میں فارسی شعرا کی رباعیات سے بحث کی
ہے جن کا اثر اُردو کے رباعی گو شعرا پر پڑا ہے۔
باب سوم میں دَور قدیم کے رباعی گو شعرا کی رباعیات
پیش کی گئی ہیں۔ باب چہارم میں دَور متوسط کی
رباعیات سے بحث کی گئی ہے۔ باب پنجم میں دور متاخر
کے رباعی گو شعرا شامل ہیں۔ باب ششم رباعی کے فن
پر مشتمل ہے۔ باب ہفتم میں اُردو رباعی کے موضوعات
پر روشنی ڈالی گئی ہے اور باب ہشتم میں رباعی کی وسعت
اور اس کے مستقبل پر بحث کی گئی ہے۔ غرضیکہ اس کتاب
میں سلام سندیلوی نے رباعی کے ہر پہلو کو مد نظر رکھا
ہے۔ پروفیسر سروری مرحوم کے بقول :

"ڈاکٹر سلام سندیلوی کا مقالہ بہت جامع
اور رباعی سے متعلق سارے پہلوؤں پر حاوی
ہے۔ اسے ہم تاریخ ادب اُردو میں ایک اضافہ
سمجھتے ہیں۔" (ریڈیو کشمیر۔ سری نگر)

۱۹۶۳ء کے بعد سلام صاحب کی تخلیقات و
مطبوعات میں ایک خلا نظر آتا ہے۔ اس کا سبب
یہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۵ء میں ڈی لٹ کی ڈگری کے
لئے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا [illegible]

پانچ سال تک اس مقالہ کی تیاری میں مصروف رہے ان کے مقالہ کا عنوان "اُردو شاعری میں منظر نگاری" ہے اس مقالہ پر ۱۹۶۴ء میں ان کو لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈی، لٹ کی ڈگری مل گئی۔ مگر یہ مقالہ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔

"اُردو شاعری میں منظر نگاری" ان کا بہت ٹھوس مقالہ ہے۔ یہ مقالہ سائنٹفک تنقید کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ سلام صاحب نے اس مقالہ میں اس بات پر زور دیا ہے کہ منظر نگاری میں صداقت اور اصلیت کو پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر بذاتِ خود اپنی آنکھوں سے مناظر قدرت کا مشاہدہ کرے اس کے بعد ایک مصور کی طرح ان مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچ دے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ جن شعرا نے مشاہدہ سے کام لیا ہے وہ منظر نگاری میں زیادہ کامیاب ہوئے ہیں اور جنھوں نے صرف تخیل کا سہارا لے کر منظر نگاری کی ہے وہ ناکام رہے ہیں۔

یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں منظر نگاری کی تعریف کی گئی ہے اور مناظر قدرت کے پہلوؤں پر نظری اعتبار سے بحث کی گئی ہے۔ باب دوم میں اُردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب سوم میں اُردو شاعری میں فطرت کا بطور پسِ منظر استعمال دکھایا گیا ہے۔ باب چہارم میں اُردو شاعری میں فطرت کا مصورانہ بیان پیش کیا گیا ہے۔ باب پنجم میں اُردو ... بحث کی گئی ہے۔ باب ششم میں اُردو شاعری میں فطرت کے داخلی بیان سے بحث کی گئی ہے۔ باب ششم میں اُردو شاعری میں فطرت کے ذریعہ متصوفانہ، فلسفیانہ، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اس طرح منظر نگاری کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو اس مقالہ میں موجود نہ ہو اس سے قبل ڈاکٹر حامد بلگرامی نے "اُردو کی نیچرل شاعری" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا مگر اس کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے سلام صاحب کا یہ مقالہ نہایت گراں قدر ہے مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں :-

> "اُردو شاعری میں منظر نگاری" اس موضوع پر مستقل کتاب اُردو میں غالباً یہ پہلی ہی کہی جائیگی۔ گو متفرق طور پر اُردو میں اس موضوع پر معلومات اچھے خاصے پہلے ہی مل جاتے ہیں۔ انگریزی، اُردو، ہندی سب کہیں سے ان متفرق اور بکھرے معلومات کو جمع کرکے اور پھر انھیں محض نقل کر دینا نہیں بلکہ قوت فکری سے کام لیکر ان میں ایک خاص ترتیب بلکہ تصنیف کی شان پیدا کر دینا مصنف ہی کا کام ہے۔ مقالہ سینر ڈاکٹریٹ کے لئے تیار ہوا تھا۔ اور مبصرین کے نزدیک اس معیار پر پورا اترا۔ جا بجا طوالت اور غیر ضروری تفصیل ہے بلکہ کہیں کہیں بال کی کھال نکال کر رکھدی گئی ہے (جیسا کہ یونیورسٹیوں کے مقالوں کا کچھ دستور سا بندھ گیا ہے) پھر بھی غنیمت ہے کہ مصنف نے موضوع سے تجاوز زیادہ نہیں کیا ہے
> [illegible]

ہے جو کچھ بھی لکھنے کے قابل تھا ،سات بابوں کے اندر کہنا چاہیئے کہ سب کچھ آگیا ہے ایک خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے قرآن مجید، تفسیر قرآن ۔ اور بائبل سے بھی استناد و استشہاد کیا ہے ۔ اس کی مثال شائد ہی اور کہیں ملے بہرحال امید ہے کہ موضوع سے ذوق رکھنے والے جو اس کتاب کو ہاتھ لگائیں گے یقین ہے کہ مایوس نہ رہیں گے ۔"

(صدق جدید ۲ ؍ مئی ۱۹۶۹ء)

" اُردو شاعری میں منظر نگاری" کی ایک اور خصوصیت ہے ۔ یہ تصنیف تقابلی مطالعہ کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سلاؔم صاحب اپنے مقالہ کے لئے انگریزی ، عربی ، فارسی ، سنسکرت ، ہندی اور اُردو ادب سے مواد اخذ کرتے ہیں وہ کئی زبانوں کے ماہر ہیں ۔ چنانچہ انھوں نے اُردو ، فارسی ، اور تاریخ میں ایم اے کیا ہے ایل ایل بی کی بھی ڈگری حاصل کی ہے ۔ اُردو میں پی ایچ ، ڈی اور ڈی لٹ کی سندیں موجود ہیں ۔ ہندی میں وشارد اور ساہتیہ رتنا کر کی ڈگریاں بھی رکھتے ہیں ۔ عربی میں ان کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے مگر پرائیویٹ طور پر انھوں نے کچھ عربی پڑھی ہے اس لئے عربی ادب سے بھی استفادہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مقالوں میں تقابلی مطالعہ کا ایک اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں ۔ " اُردو شاعری میں منظر نگاری" پر یو ۔ پی گورنمنٹ سے مبلغ آٹھ سو روپیہ انعام بھی مل چکا ہے ۔

سلاؔم صاحب کی تنقید سائنٹفک ہوتی ہے انھوں نے ٹھوس بد ہسپنسٹ ہی کے اصولوں کی روشنی میں زیادہ تر تنقید کے مراحل طے کئے ہیں مگر ۱۹۶۸ء میں انکی تنقید نے ایک نیا موڑ لیا ۔ انھوں نے اسی سال غالبؔ کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ تصنیف پیش کی اسی سال وہ بے خوابی کے بڑی طرح شکار ہو گئے جس کا سلسلہ چھ ماہ تک چلتا رہا وہ علاج کے لئے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز دہلی گئے اور ۲ ماہ کے بعد تھوڑی بہت صحت یابی حاصل کر کے پلٹ آئے ۔ واپس آکر انھوں نے ڈھائی مہینہ میں ۴۰۰ صفحات کی کتاب تیار کر لی ۔ اگرچہ وہ دماغی کام کرنے کے لائق نہیں تھے مگر ان کی ادبی تشنگی نے انہیں مجبور کیا کہ وہ جشنِ غالبؔ کے سلسلہ میں کوئی کتاب لکھیں ۔

" غالبؔ کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ" اپنے طرز کی واحد کتاب ہے ۔ اس سے قبل اُردو تنقید میں اس انداز کی کوئی کتاب نہیں شائع ہوئی ہے وہ قطعی طور پر اوریجنل ہیں خصوصاً باب سوم "غالبؔ کا مشاہدہ باطن" نہایت اہم ہے ۔ اس تصنیف کے مطالعہ سے ڈاکٹر صاحب کی قوتِ فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

۱۹۷۰ء میں سلاؔم صاحب کی ایک اور کتاب شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے " میر انیس کے مرثیوں میں جذباتی مطالعہ" جہاں تک مجھے علم ہے جذباتی مغالطہ پر اُردو میں کوئی کتاب اَب تک شائع نہیں ہوئی ہے ۔ جذباتی مغالطہ رسکن کا نظریہ ہے ۔ سلاؔم نے رسکنؔ کے اسی نظریہ کی روشنی میں میر انیس کے مرثیوں کو جانچا ہے یہ کتاب بھی تقابلی مطالعہ کی ایک اچھی مثال ہے ۔ سلاؔم صاحب نے [illegible]

میں انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی ادب سے جذباتی مغالطہ کی مثالیں فراہم کی ہیں اور بتایا ہے کہ اس قسم کا رجحان دیگر زبانوں کے ادب میں بھی ملتا ہے۔

سلام صاحب کی ایک 'نفسیاتی کتاب' "اُردو شاعری میں نرگسیت" زیرِ طبع ہے جو تقریباً ۸۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ نرگسیت پر باقاعدہ کوئی کتاب اب تک اُردو میں نہیں شائع ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انگریزی اور ہندی میں بھی اس موضوع پر کوئی مقالہ نہیں لکھا گیا ہے۔ سلام صاحب نے اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں پچاس ساٹھ سائیکالوجی کی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر خاص طور سے انھوں نے فرائڈ اور کیرن ہارنی کی کتب سے فیض حاصل کیا ہے۔

مجھے اس بات کے کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ سلام صاحب ایک اعلیٰ شاعر، ایک زیرک نقاد اور ایک ذہین محقق ہیں اور ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے یہاں تنقید اور تحقیق کے دو خانے الگ الگ نہیں ہیں بلکہ دونوں کی سرحدیں ایک مرکز پر آکر مل جاتی ہیں۔ ان کی شاعری، تنقید اور تحقیق کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے بجا طور پر ارشاد فرمایا ہے:۔

"آپ تخلیق۔ تحقیق اور تنقید تینوں میدانوں میں داخل ہو رہے ہیں اور اس قدر دلکش کے ساتھ کہ رشک آتا ہے"۔

غزل

ڈاکٹر سلام سندیلوی

لشن میں اک جھلک نہیں رنگِ شباب کی
وہ اپنے ساتھ لے گئے کلیاں گلاب کی

شائد سحر کے وقت انھیں آگئی ہنسی
پہونچی ہے میرے گھر میں کرن آفتاب کی

یرے لئے تو لطف و کرم بھی عذاب ہے
مجھ میں کہاں ہے تاب کسی کے عتاب کی

لطف و سرور گھٹ گیا رفتارِ جود سے
مضراب! روح کھینچ نہ تارِ رباب کی

رے پھول کے پیالے میں شبنم کی مے مجھے
بد ذوق کو عطا ہو یہ بوتل شراب کی

کیا جانے کیوں کتاں سے اسے بغض خاص ہے
یوں تو حیات بخش ہے ضو ماہتاب کی

اچھا ہوا کہ ختم ہوئی رسم و راہ دید
چھریاں نہ اب چلیں گی سوال و جواب کی

دل میرا ٹوٹ جاتا ہے بادِ عتاب سے
مجھ کو خدا نے دی ہے طبیعت حباب کی

صحرا میں مل رہا تھا مجھے کچھ سکوں سلامؔ
گلشن میں آکے اور بھی مٹی خراب کی

احمد جمال پاشا

انشائیہ

خیالی پلاؤ

کھانے پکانے کی بھلا کون ایسی چیز ہوگی جو بلا سیکھے کون بنا سکے۔ پھر پلاؤ تو ایسی چیز ہے کہ اگر آدمی پکانا بھی جانتا ہو تب بھی ہمیشہ نہیں پکا سکتا۔ قدرت نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا ہے کہ انسان کو خیالی پلاؤ پکانا سکھا دیا کہ ہوائی قلعوں میں رہو اور خیالی پلاؤ پکاتے رہو۔ اور وہ بھی ایسے کہ اس میں ایسے کہ اس میں لگتا کچھ نہیں مگر مزے میں پلاؤ سے بھی بڑھ کر ہی ہوتا ہے!

جن لوگوں کو پلاؤ نہیں ملتا وہ خیالی پلاؤ سے اپنا کام بآسانی چلا لیتے ہیں۔ اور جو پلاؤ زردے پر ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں وہ پانچوں انگلیاں گھی اور سر کڑھائی کے چکر میں خیالی پلاؤ ہی پکاتے رہتے ہیں۔

لوگوں کی بات چھوڑیے خود میری مثال لیجئے۔ بات یہ ہے کہ میں شروع ہی سے بڑا شیخ چلی ٹائپ واقع ہوا ہوں اور اسی شیخ چلی پنے میں ہمیشہ ہوائی قلعے بناتا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کب سے خیالی پلاؤ پکاتا آ رہا ہوں۔ لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی ایسا زمانہ میرے ذہن میں نہیں جب میں خیالی پلاؤ نہیں پکاتا تھا اور خاص طور پر اس زمانے میں بچپن میں بالکل ذرا سا تھا یہی کوئی ڈھائی تین تولے

کا اور میرے ماسٹر صاحب میرے لئے مصیبت ہوئے تھے۔ وہ مجھے پڑھاتے کم اور مارتے زیادہ تھے۔ کچھ تو لاڈلا ہونے کی وجہ سے میں خود ہی شوق واقع ہوا تھا کہ بلا ڈانٹ پھٹکار اور مار پیٹ کے میرا پڑھانا ممکن نہ تھا۔ دوسرے اتنا کند ذہن تھا کہ اِدھر پڑھا اور اُدھر نکلا سبے۔ چنانچہ سوائے پٹائی کے کچھ یاد نہ رہ جاتا اور ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد میں اپنی خیالی دنیا میں ایک بم بناتا اور اس سے ماسٹر صاحب کو ایک دھماکے کے ساتھ اُڑا دیتا۔ پھر مزے سے چھت پر پتنگ اُڑانا شروع کر دیتا۔ اور کبھی ایک بھاری بھرکم اور بہت ہی بارعب شخصیت بن جاتا اور والد صاحب کی گرجدار آواز میں ” ماسٹر صاحب! آپ نے میرے صاحبزادے پر ہاتھ کیسے اٹھایا؟ میں نے آپ کو پڑھانے کے لئے رکھا ہے یا میرے بیٹے کی ہڈی پسلی ایک کرنے کے لئے ؟ لیجئے یہ روپے اپنے۔ اب آپ کل سے زحمت نہ کیجئے گا! پھر ماسٹر صاحب کے جانے پر دل ہی دل میں خوش ہوتا اور اس وقت

ش رہتا جبتک کہ پھر میرے ہاتھ میں کتاب
سٹر صاحب کے ہاتھ میں میرا کان نہ آجاتا۔
یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جب ایک ماسٹر
ب کے بجائے میں ماسٹروں کی پوری فوج کے
میں پھنس گیا، یعنی میرا داخلہ اسکول میں
اور پچھلے ماسٹر صاحب جن کے بارے میں،
تک سوچ چکا تھا کہ بڑا ہوکر میں فوج کا
ن بنوں گا۔ اور پھر ایک دم سے ماسٹر صاحب
رٹ مارشل کردوں گا۔ مگر اسکول میں داخلے کے
پہلا خیال یہی آیا کہ گھر والے ماسٹر صاحب تو
ت سیدھے سادے۔ نیک اور فرشتوں کی طرح
م تھے۔ وہ تو کبھی گوشمالی اور لپوتوں سے آگے
نہیں بڑھتے تھے۔ بے چارے! — مگر یہ موذی
مرغا بناتے ہیں، تو کبھی بری اور بچھو کبھی بنچ
ڑا کرتے ہیں تو کبھی اٹھک بیٹھک شروع کرادیتے
بات بات پر گھونسہ، لات اور جوتے سے کم
ہی نہیں کرتے۔

ان سب کی سرکوبی کے لئے میں نے اپنی
ی دنیا میں کئی بار فوج بنا کر ان سب کو
تار کرکے نہایت عبرتناک سزائیں دیں۔ جن
سب سے سخت ترین سزا یہ تھی کہ "جتنی دیر
مائیے، برابر ہنستے اور مسکراتے رہیئے" ہر شاگرد
"معاف کیجئے گا" کہہ کر بات بڑی شفقت
شروع کیجئے اور بیچ بیچ میں اگر پڑھنے والے بور
ہے ہوں تو اُن کو پہلے مٹھائی منگا کر کھلا دیئے
کے بعد کوئی دلچسپ قصہ یا کہانی سنائیے جو
ز کم کسی بادشاہ، دیو یا پری کی ہو، اور آپ کو
جو کچھ بھی پڑھانا ہو۔ خاص طور پر حساب یا ریاضی
وہ سب اسی کہانی میں پڑھا دیجئے۔ لیکن بچوں
کو ہرگز پتہ نہ لگنے پائے کہ آپ انھیں کہانی سنانے
کے بہانے پڑھا رہے ہیں۔

جب ہم ذرا کچھ بڑے یا بقول شخصے کچھ اونچے
درجوں میں پہونچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے تمام
پچھلے ماسٹر صاحبان ہم سے اتنی ہی محبت کرتے
ہیں جتنی کہ ہمارے ماں باپ اور سب کے سب
انتہائی قابل اور اچھے لوگ ہیں۔ اور انھوں نے
جو کچھ بھی کیا، محض ہماری بھلائی کے لئے۔ اس
انکشاف اور احساس کے بعد ہم نے طے کیا کہ
"جب ہم اپنے بچے کو پڑھانے کے لئے بٹھائیں گے
تو ہم ان کے ماسٹر صاحب کو نہ صرف ایک حد میں
نہایت زور دار بید پیش کریں گے، بلکہ ان سے
فرمائش کریں گے کہ" صاحبزادے بلند اقبال اگر نہ
پڑھیں تو اس کو فلاں فلاں سزائیں ضرور دی
جائیں۔" اور جب ماسٹر صاحب پڑھا کر جانے لگیں
تو ہم ان کی بہت خاطر کیا کریں گے اور اُس سے
پوچھا کریں گے کہ" بھلا آج آپ نے اس شیطان
کو کون کون سی سزائیں دیں؟"

اسکول سے جب ہم کالج اور پھر یونیورسٹی
پہونچے تو سزاؤں کا سلسلہ ہوا، تقریباً ختم ہی
ہو گیا۔ اس کے بجائے ایک نئی آفت کا سامنا
کرنا پڑا یعنی کبھی لڑکے ہڑتال پر اور کبھی ٹیچر
اسٹرائک پر جس کے بارے میں ہم سوچا کرتے کہ
کیوں نہ ایک ایسا اسکول قائم کر دیا جائے جہاں
صرف اسٹرائک اور اس کے آداب کی تعلیم دی

جائے۔ مثلاً ادھر لڑکے نے استاد سے کوئی گستاخی کی اور سب ٹیچروں نے مل کر اس لڑکے کا اُس وقت تک گھیراؤ کیا جب تک کہ لڑکا معافی نہ مانگ لے یا مثلاً ٹیچر بجائے کلاس میں جانے کے اسٹاف روم میں گپ لڑا رہا ہو یا اسٹاف کلب میں سیاست لڑا رہی ہو تو اس سنہرے موقع سے فائدہ اُٹھا کر لڑکے استاد کا گھیراؤ اُس وقت تک کرتے رہتے ہیں جب تک کہ موصوف اسی نرغے کے عالم میں ایک کے بجائے دو پیریڈ تک نہ پڑھا دیں۔

ہم یہ بھی سوچتے کہ اِدھر ذرا پرچہ گڑ گیا، یعنی بہت سخت پرچہ آیا، موریل خراب ہوا۔ سیر و تفریح کے سلسلے میں پڑھائی لکھائی خاص نہ ہو سکی تو ہڑتال سے لے کر گھیراؤ تک شروع کر دیا۔ فوراً سب "پیپر آؤٹ" کئے جائیں۔ امتحان میں نقل کے عام حق کو تسلیم کیا جائے اور پڑھائی کم کی جائے۔

مگر جناب آخر میں ہم ہوتے اور ہماری کتابیں اور پڑھائی سے رٹائی تک سرگرداں نظر آتے۔

پہلے جب ہم خیالی پلاؤ پکانے بیٹھے تو اپنی خیالی دنیا میں بادشاہ بن کر سب سے بدلے نکالتے، کچھ بڑے ہوتے تو گھٹتے گھٹتے، گھٹتے گھٹتے! بادشاہ سے وزیر، وزیر سے سپہ سالار، سپہ سالار سے فوج کا کپتان پھر پولیس کا تھانیدار بنتے، آخر یہاں تک نوبت پہونچی کہ جب پڑھ لکھ کر یونیورسٹی سے نکلے تو صرف اظہار کا دوسرا صفحہ دیکھ کر نظریں دوڑاتے کہ کہیں بھی، کسی بھی قسم کی کوئی بھی ایسی نوکری مل جائے کہ ہم دھندے سے لگ جاتے۔ اور جب دھندے سے لگے تو ایسے مگن ہوئے کہ اب خیالی پلاؤ تک میں نہ پڑھائی ہے اور کچھ۔ بس ہم ہیں، ہمارا دفتر اور گھر۔ آفس فائیلیں اور گھر میں بیوی اتنا موقع ہی کہاں ہیں کہ ہم خیالی پلاؤ تک پکا سکیں۔

(غیر مطبوعہ)

علیم جہانگیر

منتظر ہیں کب سے گھر کے بام و در آیا کرو
راستہ تکتی ہے سونی رہ گزر آیا کرو
ذہن کی کھڑکی سے آنکھوں میں اُتر آیا کرو
گوشۂ دل میں کبھی چپکے سے در آیا کرو
اَب تو تم کو دیکھ کر بھی ایک مدت ہوگئی
خواب میں ہی کیوں نہ ہو نظر آیا کرو
روز مثلِ ابرِ آوارہ گزر جاتی ہو تم
بن کے ساون کی گھٹا بھی تو ادھر آیا کرو
ابر آلودہ فلک بڑھتا ہوا آندھی کا شور
اس فضا میں شام سے پہلے ہی گھر آیا کرو

سید احمد شاکر

قلب بھی مائلِ فریاد ہے اَب کیا ہوگا
ہر نفس آج تو ا فتاد ہے اب کیا ہوگا
میں نے سمجھا تھا کہ ہے حسن ابھی تک معصوم
حسن کے پردے میں صیاد ہے اب کیا ہوگا
دل دھڑکتا ہے تو ہے سانس پہ لرزہ طاری
یہ محبت ہی کی بنیاد ہے اب کیا ہوگا
قصۂ درد مرا سن کے بہائے آنسو
ایک سی دونوں کی روداد ہے اب کیا ہوگا
مہرباں شاکر دلگیر پہ بے مہر ہے آج
اک نئے ظلم کی ایجاد ہے اب کیا ہوگا

غزلیات

دوستو آؤ علاجِ شبِ ہجراں کرلیں
دل کے داغوں کو جوابِ مہِ تاباں کرلیں
شوقِ صادق کو اگر رہبرِ دوراں کرلیں
لوگ ہر مرحلۂ زیست کو آساں کرلیں
میں گرفتار سہی۔ ذہن ہے آزاد مگر
غور اس پر بھی ذرا میرے نگہباں کرلیں
دیکھنا یہ ہے کہ انجام بہاراں کیا ہے؟
آؤ ہم مصلحتاً سیرِ گلستاں کرلیں
آنے والی ہیں گلستاں میں بہاریں فہمی
کیوں نہ ہم پہلے ہی سے چاک گریباں کرلیں

تسنیم فہمی

حصارِ درد کا اتنا طویل ہو جائے
غموں سے چور زمانہ تمام کھو جائے
بدن کے ساتھ بدن کس کا ساتھ دیتا ہے
کوئی نہ روح کی گہرائیوں میں کھو جائے
تمھارا جسم زمرتا بہ پا حسین چہرہ
تمام جسم مرا صرف آنکھ ہو جائے
عدم کے شہر میں کیا کیا لطافتیں ہیں نہاں
پلٹ کے آئے نہ ہرگز یہاں سے جو جائے
ہم اپنی آنکھوں کے احسان مند ہیں اشرف
کہ آپ سے ہو ملاقات جسم سو جائے

اشرف مالوی

انکارِ معاصرین :-

اُردو ہے جس کا نام……

میرا صفحہ

کرامت علی کرامت

نہرو کے بعد کون ؟ کی طرح - اُردو کے بعد کیا ؟ اُردو داں اور غیر اُردو داں حلقوں میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُردو زبان بیچاری اپنے وطن میں غریب الوطن تھی ہی، اب پاکستان میں بھی اس کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے۔ وہاں بنگالی، سندھی، اور پنجابی بولنے والے اپنے اُوپر اُردو کا تسلط اسی طرح گوارا نہیں کرتے، جس طرح جنوبی ہند والے اپنے اوپر ہندی کا تسلط۔ ہندوستان میں صرف کشمیر میں اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے اور آندھرا میں ثانوی زبان کی۔ لیکن اہلِ کشمیر کشمیری زبان کو فروغ دینے کے سلسلہ میں اس حد تک محتاط ہوگئے ہیں کہ وہاں بھی غالباً زیادہ دنوں تک اُردو کا سکہ چل نہیں سکے گا۔ میری رائے میں آندھرا میں اُردو کے خلاف اس لئے کوئی تعصب نہیں ہے کہ اُردو ہندی والوں کے تعصب کا شکار ہے اور اہلِ آندھرا ہندی والوں کے غلط رویہ سے بیزار۔

یہ سبھی جانتے ہیں کہ اُردو ایک ہندوستان گیر زبان ہے۔ اس میں کثیر الاشاعت اخبارات و رسائل کی …

عثمانیہ یونیورسٹی میں ۱۹۴۸ء سے قبل تک آرٹس، سائنس، طب، انجینیرنگ ان تمام شعبوں میں یہ ذریعۂ تعلیم رہی۔ جبکہ دوسری علاقائی زبانوں کو اس قابل ہونے کے لئے کم از کم آج سے اور بھی دس بیس سال کی ضرورت ہے۔ اُردو زبان کا ماضی نہایت شاندار رہا ہے۔ بنگال کے مشہور ادیب ستی کانت گوہا نے بجا فرمایا ہے کہ ہندوستان نے اب تک دو ہی مکمل شاعر پیدا کئے ہیں۔ ایک کالی داس، دوسرا غالب۔ جس وقت ۱۸۶۱ء میں سرسید کی تحریک پر دھرم نرائن نے مِل کی "پولیٹیکل اکانومی" کا "اصولِ سیاستِ داں" کے نام سے ترجمہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس وقت بنگالی جیسی آج کی ترقی یافتہ زبان بھی اِس قابل نہیں ہو پائی تھی۔ ہندوستان کی کون سی علاقائی زبان ہے جس کی نشوونما میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں نے بڑھ چڑھ کر دلچسپی لی ؟ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بعض نے زبان کو نکھارنے اور سنوارنے کا۔ بعض نے دوسری زبانوں سے ترجموں نیز اُردو کے قواعد و لغات کی ترتیب و تالیف کا، بعض نے اُردو میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تصنیف کا اور بعض نے اُردو کی صحافت کو عروج کمال تک پہونچانے، نیز اُردو کی علمی و ادبی …

ردو کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ اُردو کو اگر کسی صوبے کی علاقائی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا، تو اس سے کیا ہرج ہوتا ہے؟ جبکہ ساہتیہ اکاڈمی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح اُردو کے مصنفوں کو بھی انعام و اکرام سے نوازتی ہے۔ حکومت اُردو کے مفلوک الحال ادیبوں کے لئے وظائف بھی مقرر کرتی ہے اور اُردو کے لکھنے والوں کو اتنی تعداد میں پدم بھوشن اور پدم شری کے خطابات عطا کرتی ہے کہ دوسری علاقائی زبانیں رشک کرنے لگتی ہیں؟ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی حکومتِ ہند کی طرف سے جس تزک و احتشام سے منائی گئی، ہندوستان کی کسی دوسری زبان کے کسی شاعر کو یہ بات نصیب نہیں۔ حکومت انجمن ترقی اُردو ہند کو مالی امداد بہم پہونچاتی ہے۔ حال میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں یہ بات چلی ہے۔ حکومت ہند نے اُردو میں نصاب کی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے لئے ایک کروڑ روپے منظور کئے ہیں اور اس کام کی تکمیل کے لئے ترقی اُردو بورڈ کی تشکیل بھی ہو چکی ہے۔ آخر اُردو والے کیوں چلاتے ہیں کہ انھیں ان کا حق نہیں مل رہا ہے؟

میری رائے میں اُردو کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ دوسرے علاقوں کا ذکر چھوڑیے، خود یوپی اور دہلی کی نئی نسل بلا تفریقِ مذہب و ملت رفتہ رفتہ اُردو کی تعلیم سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اس کی تعلیم و تربیت ہندی میں ہوئی ہے۔ اُردو یونیورسٹی کے لئے طلبہ کہاں سے آئیں گے، جبکہ پرائمری کلاس میں اُردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے؟ اب تو ہم یہاں تک سوچنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ چند دنوں کے بعد ہماری تحریروں کو صحیح طور پر پڑھنے والے ودان سے محفوظ ہونے والے رہ بھی جائیں گے کہ نہیں؟

اُردو والوں کو اب بھی یہ خوش فہمی ہے کہ ان کی زبان ایک زندہ زبان ہے، وہ کبھی مر نہیں سکتی۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ سماجی اور سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبانیں بنتی، بگڑتی اور مٹتی رہی ہیں۔ جب سنسکرت جیسی ترقی یافتہ ادبی زبان اور پالی جیسی عوامی زبان اپنی اصلی شکل میں زندہ نہ رہ سکی، تو اُردو کو کون پوچھتا ہے، اُردو کو اب تک جو کچھ نقصان پہونچا ہے، وہ محض سیاست کے غلط رویّہ کی وجہ سے۔ اُردو کبھی بھی ایک فرقے کی زبان نہیں رہی (حالانکہ انگریزوں نے اس سلسلے میں بڑی کوشش کی تھی کہ اُردو اور ہندی کو دو الگ الگ فرقوں سے وابستہ کر دیا جائے۔ تاکہ ہندی اور اُردو والے آپس میں جھگڑتے رہیں)۔ انگریزوں کا خواب تو ان کے دورانِ حکومت پورا نہ ہو سکا، لیکن ان کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد فرقہ پرست ذہنیت کی وبا عام ہونے کی وجہ سے ان کا یہ خواب پورا ہو گیا۔ یہاں میں ایک خاص بات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، جسے فراق صاحب نے ایک دفعہ دورانِ ملاقات مجھے بتایا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی اسکول کی، طالب علمی کے زمانے میں اُردو کلاس میں طلبہ کی تعداد ایک سو پچیس ہوا کرتی تھی (جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی، مسلمانوں کی نہیں) اور ہندی کلاس میں صرف بیس پچیس۔ لیکن اب ہندی کلاس میں طلبہ کی تعداد ایک سو پچیس ہوا کرتی ہے اور اُردو کلاس میں طلبا کی تعداد بیس پچیس۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ دہلی اور یوپی میں اُردو زندہ تھی تو محض اس لئے کہ ہندوؤں نے اسے اپنے سینے سے لگایا تھا۔ [illegible]

بحران چھایا ہے، تو محض اس لئے کہ سیاسی غلط روی کی وجہ سے ان میں سے اکثر نے اُردو کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اُردو صرف ایک فرقے سے غلط طور پر منسوب ہو کر رہ گئی ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ دہلی کے سفر کے دوران لکھنؤ کے ایک ایسے ہندو تعلیم یافتہ شخص سے میری ملاقات ہوئی جو اُردو کا نہایت رچا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے والدین کو تو خط اُردو میں لکھتے ہیں لیکن اپنی بیوی کو خط ہندی میں۔ ابھی حال میں یو۔پی کے چند ایسے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ جن کی مادری زبان اُردو ہوتے ہوئے بھی خود اُردو سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لوگ رفتہ رفتہ اُردو سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا جب تک اُردو کو دستورِ ہند میں دیے ہوئے حقوق پورے طور پر حاصل نہ ہوں اور اسے کم از کم ان صوبوں میں جہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے۔ اُردو کو بھی دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا جائے، تو اُردو کا مستقبل یقیناً تاریک ہے۔ لیکن یہاں ہمارے سامنے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بظاہر ممکن نظر آ رہا ہے؟ کیا فرقہ پرستی کا جو ہوا چلی ہے، وہ ایسا ہونے دے گی؟ کیا یو۔پی اور دہلی کے وہ ہندو خاندان جو اُردو کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ پھر سے اس طرف توجہ دیں گے؟ میری نظر میں اُردو والوں کے لئے اس وقت چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ لیکن صرف ایک طرف سے امید کی کرن پھوٹتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ وہ یہ کہ چاہے اُردو کے لئے موافق فضا پیدا ہوئی ہو یا نہ ہو، سارے ملک میں اُردو کے مخالفوں کے خلاف ایک زبردست فضا تیار ہو چکی ہے، ہمیں اپنے خونِ دل سے اس دن کے انتظار میں اُردو کا چراغ جلائے رکھنا ہے، جبکہ اُردو کو اس کے جائز حقوق حاصل ہوں گے۔ چونکہ اُردو ایک بہت ہی ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس لئے اُمید قوی ہے کہ مختلف علوم و فنون کے حصول، نیز اس کے ادبی سرمایہ سے مستفید ہونے کی غرض سے لوگ بلا تفریق مذہب و ملت پھر سے اُردو پڑھنے لگیں گے۔

لیکن اپنے خونِ دل سے اُردو کا چراغ جلایا جائے تو کیسے؟

اس وقت خود اُردو والوں کو قربانیاں دینے کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں اُردو کے لئے اپنی جان دینے والے (مرحوم) دیونارائن پانڈے کو ان قربانیوں کی علامت کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہوگا۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جن خاندانوں میں اُردو کلچر زندہ ہے، ان میں کسی نہ کسی طرح اُردو کی تعلیم کا سلسلہ (کم از کم گھریلو طور پر) جاری رکھنا ہوگا۔ اُردو کے رسم الخط کو بدل دینا اُردو کو موت کے گھاٹ اتارنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا اُردو کے وہ ادیب جو بآسانی ہندی رسائل میں اپنی تخلیقات چھپوا کر پیسے کما لیتے ہیں، وہ اُردو کے غریب رسالوں کے لئے بھی بلا معاوضہ لکھنے کا سلسلہ جاری رکھیں تاکہ اُردو کا تخلیقی سرچشمہ خشک نہ ہو جائے اس وقت ہندوستان میں معیاری ادب پیش کرنے والے رسالوں کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں ہے ...

؛ کالج ہیں، ان سب میں اگر یہ رسالے منگوائے
ں اور اُردو کے تمام اساتذہ نیز اُردو کے تمام
ل ادیب اگر ان کی خریداری اور سرپرستی قبول
تو امید ہے کہ یہ تمام رسالے خود کفیل ہو جائیں
سالے زندہ نہیں رہیں گے، تو ہمارا ادب بھی
ین بڑھ سکے گا۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی یہ ہے
ے اُردو میں لکھتے ہیں۔ انھیں خواہ مخواہ اُردو
رار دے کر انھیں اُردو سے دُور نہ کیا جائے، بلکہ
ور قریب لانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مثال
کرشن چندر کے تردیدی بیان کے بعد اور
ں کی اپنے خیالات کی وضاحت کے بعد پھر ان
کو اُردو دشمن قرار دینا میری رائے میں عین
فی ہے۔ رام لال نے وضاحت کر دی ہے کہ اُردو
جو ادیب ہندی رسم الخط کی تائید کرتے ہیں،
اس لئے کہ انھیں بھی اپنا پیٹ بھرنا ہے اور
ے رسائل اور اُردو کے قارئین ان کا پیٹ بھرنے
رہیں۔ رام لال نے جو کچھ کہا ہے۔ اس میں صداقت
ہر در پنہاں ہے۔ لیکن اس بحرانی دَور میں ہمارے
ادبار قربانی نہیں دیں گے، تو اور کون دے گا؟
لے میں میں نے انھیں لکھا کہ ادیبوں کا اقتصادی
س وقت دُور ہو سکتا ہے۔ جبکہ اُردو کو ہندی
دیا جائے اور ہمارا ضمیر کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتا
کے جوابی خط کا اقتباس درج ذیل کر رہا ہوں
دو سے متعلق ان کا غیر متعصب نظریہ بہتر طور پر
کے سامنے آ سکے۔

اُردو کے بارے میں آپ نے میرے متعلق جو کچھ فرمایا ہے، اس کے لئے آپ کا بیحد ممنون ہوں اور مطمئن ہوں کہ آپ بھی چند دوسرے متوازن اور سنجیدہ دوستوں کی طرح کسی قسم کی جذباتیت اور غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں۔ اُردو کی صفوں میں کچھ انتشار پسند اور فتنہ پرور لوگ ایسے ہیں، جنھیں دوسروں کے خلاف کیچڑ اُچھالنا مرغوب ہے۔ اُنھیں اُردو کے کاز سے کوئی عملی ہمدردی نہیں ہے۔ اُردو کی آڑ لے کر وہ جب ہندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس میں بھی اپنی فرقہ وارانہ عصبیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگ ہندی میں بھی ہیں۔ جو اُردو مخالفت کی آڑ میں اپنی تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہیں۔ بقول آپ کے ہندی کالجوں کے لئے جہاں ایک بھی ہندی کا طالب علم نہیں ہوتا۔ بڑی بڑی تنخواہوں پر ہندی کے لکچرار مقرر کر دیے جاتے ہیں، تو اُس کے پیچھے بھی کافی حد تک وہی ذہنیت کام کر رہی ہوتی ہے لیکن اقتصادی بحران کو دُور کرنے کے لئے اُردو زبان کو ہندی زبان میں ضم کر دیا جائے۔ آپ کی اس بات سے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اُردو کا خاتمہ اس ذہنیت کو ختم کرنے میں معاون نہیں بن سکے گا۔ اس کے بعد یہ بھی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ ہندی پڑھانے کے لئے مسلمان لکچرار کیوں مقرر کئے جائیں؟ میں نے اس مسئلے پر ایک ناول بھی حال ہی میں لکھا ہے۔ زبان کسی ایک فرقے کی میراث نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی بھی ترقی کر سکتا ہے اور اسے پڑھا بھی سکتا ہے۔ اُردو کے مخالفوں کے خلاف جو قسم کی فضا [illegible]

توہے۔ ایسے لوگ ہی تو فراق، کرشن چندر اور رام لعل کو غلط طور پر اُردو دشمن ثابت کررہے ہیں۔ اسی ذہنیت کا سلسلہ انتظار حسین کے اس بیان سے ملتا ہے، جو چند برس پہلے لاہور کے ایک روزنامہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ پریم چند، رگھوپتی سہائے فراق۔ کرشن چندر وغیرہ نام اسلامی روایات کا حصہ نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک اُردو زبان ایک اسلامی زبان ہے جبکہ یہ سوفی صد غلط ہے۔ اُردو ایک تہذیبی زبان ہے۔ جس میں مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں تک کی مذہبی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ زبان تہذیبی سطح پر پورے برصغیر کو جوڑے ہوئے ہے۔ اس زبان کو تہذیبی سطح پر ہی بچایا جانا چاہیئے۔ اسے ہندوستانی تہذیب کے اور زیادہ قریب کر دیا جائے (جبکہ پہلے بھی بہت دُور نہیں ہے) اس کے دوستوں اور ہمدردوں کو دشمن کہہ کر دُور نہ کر دیا جائے بلکہ انھیں جمع کیا جائے۔

آخیر میں، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چاہے انجمن ترقی اُردو ہند، علیگڑھ ہو یا اُردو کمیٹی بمبئی (یا کوئی اور ادارہ، جو اُردو کے لئے جدوجہد کرتا ہے) میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اُردو کو ایک ہندوستان گیر زبان تصور کرنے کے باوجود بنگال، اڑیسہ، مدراس، میسور، گجرات اور مہاراشٹر وغیرہ صوبوں میں اُردو کے جو مسائل ہیں، انھیں ان اداروں کی طرف سے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اگر دہلی، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، پنجاب، ہریانہ اور راجستھان میں اُردو کے مسائل حل ہو بھی جائیں تو دیگر علاقوں کے مسائل کا حل کیا ہوگا؟ اور وہاں تمام اُردو پڑھنے والوں کے لئے سہولتیں کیسے فراہم ہونگی۔

رشا خیار۔ کٹک

ب وقار خلیل

کتابِ سحر کا شاعر

اُردو غزل، غالب سے اِس عہد تک زندگی کے
یچ وخم کی رمز شناسی کرتی آرہی ہے، عصری آواز
و بنج اور کھنک نئی شاعری کے لہجے سے عبارت ہے
رآباد میں نئی منزل کے امکانات کو فروغ دینے
وں میں خورشید احمد جامی اور مخدوم محی الدین
ی آئینہ بھلائے نہیں جا سکتے۔

دکن کے اِسی دبستانِ غزل کے جواں فکر شاعر
نقی علی خاں ثاقب نے دیکھتے کے دیکھتے اپنے لب
بہ کی انفرادیت، اور عصری طریہ فکر کی بدولت غزل
وہ خوبصورت تجربے کئے ہیں کہ گلشتِ سخن کھلتا ر
کلتا رہو گئی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے کہ " ثاقب
رآباد کی اُس نسل کے شاعر ہیں جن کا ذہنی اُفق
سری بڑی جنگ ملک کی تقسیم اور آزادی کے ساتھ
ہونے والے نئے تقاضوں سے عبارت ہے۔ نورد
ت کے اس تصادم میں اُنھیں وہ کرب یا نظر ملی جو
اور انقلاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ شکست و ریخت کے
دور اہے پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اگلی حکمراں تہذیب
کا وارث، نئے تقاضوں سے بغل گیر ہو رہا ہے۔ نگاہ
کی تازہ کاری اور بصیرت کا نیا پن اُسے احساس
کی صداقت کے لئے جذبات کے اظہار کو نیا سانچہ اور
نیا لہجہ عطا کر رہا ہے اور یہی نیا لہجہ ثاقب کی غزل کا
وہ سویرا ہے جو اس کے پہلے مجموعے "نقشِ جاوداں"
سے اب "کتابِ سحر" کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اِس
سفر میں ثاقب نے کئی مرحلوں پر رک کر سوچا ہے، سفر
کی صعوبت اُٹھائی ہے، مگر کہیں بھی شکست نہیں کھائی،
ظفر مندی سے منزلِ شوق طے ہوئی اور آج ہم دیکھتے
ہیں کہ وہ اُردو کی نئی شاعری کی جناب میں پورے
اعتماد اور یقین کے ساتھ "کتابِ سحر" پیش کر رہا ہے،
یہاں پھر میں پروفیسر احتشام حسین کی ایک رائے نقل
کر دوں گا کہ " عصری شعرا کی طرح ثاقب کے پاس بھی
یاسیت اور تاریکیٔ حیات کا جا بجا ذکر ملے گا اور یہ
حالات پر گہری اور خلاقانہ نظر کا غماز ہے۔ جبھی تو شاعر
نے اس کی تنقید کے لئے "کتابِ سحر" کی آرزو کی ہے
جس سے وہ بآسانی اپنے دَور کے المیۂ اور تضاد کو
پہچان پاسکا ہے؟

زندگی اور اُس کے روزمرہ کے مسائل پر ثاقب کی خلاقانہ بصیرت کے غماز یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ویسے تو زندگی ہے اُجالوں کا شہر بھی
دیکھو تو مقبروں کا اندھیرا دکھائی دے
جاؤں اُدھر تو ایک سمندر ہے بیکراں
دیکھوں اِدھر تو پیاس کا صحرا دکھائی دے

نظر نظر ہے دھندلکا نفس نفس ہے غبار
ہر ایک شخص ہے خود اپنی خواہشوں کا مزار

شکستِ صبح وفا ہے کہ رخصتِ شبِ غم
یہ زندگی ہے کہ گرتی ہوئی کوئی دیوار

یہ شخص تہی دست ہے ہر شخص تہی جام
اس دَور کا مقسوم ہی دریوزہ گری ہے

ہر موڑ سے ہم بچ کے گزر جاتے ہیں لیکن
ہر موڑ پہ ٹکراتی ہیں ماحول کی چیخیں

ثاقب نے بہت کم مدّت میں اس قدر شگفتہ، تازہ کار اور خوبصورت شعر کہے ہیں۔ نئی نسل کے غزل گو شعراء کے ہاں ذہن و فکر کا ایسا ابلاغ کم کم ہی ملے گا۔ اِس طرح ثاقب اپنے شعور و فکر کی بدولت نئی غزل کے میدان میں سنگِ بنیاد شاعر قرار پاتے ہیں اور اپنے شاندار مستقبل کے غماز نظر آتے ہیں۔ اُس کا یہ مقطع ملاحظہ ہو ؎

روایتوں کے اُفق پر نئی کرن چمکی
نئے مزاج کی ثاقب غزل سناتا ہے

ثاقب کی غزل کلاسیکی رنگ و آہنگ کی مہک کے ساتھ ترقی پسند قدروں اور نئی جہتوں کی جولانگاہ کی خوبصورت تثلیث ہے۔ وہ سوالات کے سہمے ہوئے جزیرے پر تنہا نظر آتا ہے تو کبھی ہجومِ گلُ بداماں میں کسی کے رُخ سے پن کو دانش کے دریچوں سے کرن کرن چھنتا ہوا دیکھتا ہے تو کبھی جلتی ہوئی یادوں کے دھوئیں میں گم ہو جاتا ہے۔ کبھی اُسے خیالِ محبوب گلاب جیسا لگتا ہے۔ جب وہ زندگی کے سفر کا ارادہ کرتا ہے تو یہ شعر بھی کہتا ہے ؎

سفر کٹھن ہے کہیں پیار بھی نہ کھو جائے
بہت قریب نہ ہو زندگی کے رستے میں

ثاقب کی فکر کے تیور بھی ملاحظہ ہوں ؎

کھڑا ہے کب سے کوئی کاسۂ ہستی لے کر
سحر نے ہاتھ اُٹھا کر ابھی بُلایا نہیں

یہی وہ مقام ہے جہاں ہر باشعور فنکار کو اپنی تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور شدید ہوتا ہے۔ ثاقب کی غزلوں میں لفظ تنہائی کا صَرف اِس عمدگی سے ہوا ہے کہ اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی، چند اشعار پڑھئے اور سر دُھنیے ؎

اسقدر بھری دنیا کا در دل کی ویرانی
ہر قدم پہ ہنگامہ اور آدمی تنہا

میری تنہائی کے دروازے پہ
جانے کیوں بھیڑ لگی رہتی ہے

شمیم بادِ جاناں بھی نہیں ہے
کسے آواز دیں تنہائیوں میں

کتنا حسّاس ہے یہ عالمِ تنہائی بھی
پھول کھلتے ہیں تو زخموں سے مہک آتی ہے

دیدار کی ساعت ہے نہ فرصت کی گھڑی ہے
کس موڑ پہ مجھ سے مری تنہائی ملی ہے

ارضِ دکن میں بات چلی ہے کچھ اس طرح
ثاقب دیا یہ شعر میں تنہا دکھائی دے

تنہائی کے یہ ششں جہت، ثاقب کی پہلو دار شخصیت
ئے کے مد و جزر اور حالات کی اُلٹ پلٹ کے مظہر ہیں
سے آج کے تقریباً ہر باشعور فنکار کو سابقہ پڑتا ہے۔
ثاقب کی شخصیت کے بارے میں سوانحی طور پر
لکھا جائے تو یہی لکھا جا سکتا ہے کہ یہ دکن کے آصفی
ندان کے چشم و چراغ ہیں مسلّم الثبوت اُستادِ سخن
رت تقی جاہ تقی کے فرزندِ دلبند ۲۹ نومبر ۱۹۲۷ء
یخ پیدائش، ۱۹۵۰ء ان کی آغازِ شاعری کا مبارک
ء ۱۹۶۲ء پہلے مجموعے "نقشِ جاوداں" کی اشاعت
ال سال۔ خاندانِ آصفی اور خانوادۂ عثمانی کے
صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی انھیں کو
ل ہے، خوش اخلاق، خوش خیال، خوش جمال۔
فطرت، نیک سیرت، خوش لباس و خوش اوقات۔
ضعدار، مزاج میں رندی کے ساتھ ساتھ معصومیت،
ت میں شعلہ و شبنم کی سی کیفیت، مختلف علوم و فنون
چسپی اور دلبستگی۔ کئی تہذیبی اور علمی اداروں
بط ضبط کے باعث ثاقب حیدرآباد میں ہر دلعزیز
ہند و پاک کے معیاری رسائل میں چھپتے اور اربابِ نقد

و نظر سے خراج لیتے رہے ہیں۔ غزل اِن کی محبوب صنفِ سخن ہے مگر ثاقب نے رومانی نظمیں بھی اچھی کہی ہیں، قطعات بھی لکھے ہیں۔ نثر میں بھی اظہارِ رائے کی خوب صلاحیت رکھتے ہیں۔ غرض ثاقب ایک دردمند انسان اور باشعور فنکار ہیں۔ "کتابِ سحر" کے شاعر میں ایک عہد آفریں شاعر بننے کی پوری صلاحیت پیدا، پنہاں اور جلوہ فرما نظر آتی ہے اور جس خلوصِ دل سے ادبی دنیا میں اُس کو "خوش آمدید" کہتا ہوں۔

(غیر مطبوعہ)

عبادت علی صدیقی

کتابوں کی باتیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

ربل کتھا کا لسانی مطالعہ

مصنفین:- ڈاکٹر خلیق انجم
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

فحات ۱۷ - قیمت: چار روپے
اشر: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار۔ دہلی

"کربل کتھا" فضل علی فضلی کا ایک نا قابل موش شاہ کار ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے اس کتاب کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو، لیکن شمالی ہند میں اس کا شمار ردو کی اولین تصانیف میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب منقل تصنیف نہیں ہے، بلکہ "روضۃ الشہدا" منفہ ملا حسین واعظ کاشفی کا آزاد ترجمہ ہے۔ ملی نے یہ ترجمہ نواب مشرف علی خاں کی فرمائش پر محمد شاہ دشاہ کے عہد میں کیا تھا اور نظر ثانی کے فرائض محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں انجام دیئے تھے۔ کتاب نے ن قدر مقبولیت حاصل کی اس کی نشاندہی مشکل ہے ہن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کتاب نے یورپ میں جلاوطنی ندگی بسر کی۔ بیسویں صدی عیسوی میں پروفیسر خواجہ احمد ماروقی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کی انتھک جدوجہد سے اپنے وطن میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی اور شاعت کا جامہ پہنا۔ یہ کتاب کھڑی بولی میں ہے۔ اوردو صدی پہلے کی تصنیف ہے۔ اس دور میں زبان کا ڈھانچہ کیسا تھا اور آج زبان نے تدریجی طور پر کس قدر ترقی کی ہے اس کے بتلانے کی ضرورت نہیں، یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ دو ڈھائی صدی میں صوتی اعتبار سے زبان میں اس قدر تبدیلیاں ہوئی ہیں اور رسم الخط نے زمانے کے اعتبار سے ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ اس کی وجہ سے قدیم تصنیفات کا مطالعہ بے انتہا مشکل ہو گیا ہے۔ اس مشکل کو لسانی مطالعہ ہی کے ذریعہ آسان کیا جا سکتا ہے۔ "کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" اسی نوع کا ایک قابلِ قدر کام ہے جو ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مشترک کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس مطالعہ نے جہاں ایک طرف کربل کتھا کے مطالعہ کو آسان بنا دیا ہے وہاں دوسری جانب اس کے مطالعہ سے دو صدی قبل کے صوتیاتی ڈھانچہ کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کام آسان نہ تھا۔ اس کام کی دشواریوں کا اندازہ اس کتاب کے صفحہ ۱۵ سے صفحہ ۱۷ تک کے مباحث اور اس کی تشریحات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان صفحات میں فاضل مصنفین نے زبان کی ان تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے جن کا احساس

وڈھائی صدی قبل کی لکھی ہوئی کتابوں کے پڑھنے کے
فت ہوتا ہے۔ ان میں صوتی، صرفی، نحوی اور الفاظ
ے ردو قبول کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ "املا میں
بدیلیاں" بھی ایک خاص باب ہے جس پر خاصی محنت
گئی ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے
ندیم زندہ زبان کا ایک جامع و مکمل تصور ہمارے سامنے
بھر کر آجاتا ہے۔ اس تالیف میں مصنفین نے بڑی محنت
سے کام کیا ہے جس کے لئے وہ اُردو دنیا کی جانب سے
شکریہ کے مستحق ہیں۔ "کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" کی
کتابت و طباعت اور گٹ اپ دلکش ہے۔ ہر ذی علم
کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

۲۔ پندرہ روزہ "واقعات" دہلی — مدیر اعلیٰ عبدالوحید صدیقی

قیمت فی شمارہ ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۱۸ روپیہ
ملنے کا پتہ: ڈی ۱۰ نظام الدین۔ نئی دہلی

اُردو دنیا میں جب کوئی خوبصورت، معیاری
در دلکش جریدہ منظر عام پر آتا ہے تو خوشی کے
ساتھ ساتھ یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ خدا جانے یہ پرچہ
کتنے دن زندہ رہے گا اور کب اُردو والوں کی سرد مہری
کے ہاتھوں موت کی نیند سو جائے گا؟ پندرہ روزہ واقعات
(خدا اسے تا قیامت سلامت رکھے) کو دیکھ کر بھی یہ خیال
دل میں آیا تھا لیکن جب مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے مولانا
عبدالوحید صدیقی کا اسم گرامی نظر آیا تو یہ اندیشہ ذہن
محو ہو گیا۔

مولانا عبدالوحید صدیقی کی شخصیت محتاج تعارف
نہیں ہے، موصوف اُردو کے نہایت تجربہ کار، جفاکش
اور محنتی صحافی ہیں۔ روزنامہ نئی دنیا کی ایڈیٹری
سے پندرہ روزہ واقعات کی ادارت تک کی، ان کی
خدمات اُردو صحافت و ادب کا سرمایہ عزیز ہیں جو
کبھی فراموش نہ کی جا سکیں گی۔

واقعات اپنے طرز کا منفرد جریدہ ہے۔ اس
طرز کے پرچے کی ضرورت کافی عرصہ سے محسوس کی جا رہی
تھی۔ مولانا صاحب اُردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں
کہ انھوں نے وقت کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ ہما، ہدی
ہدی کی طرح پندرہ روزہ واقعات بھی عبدالوحید صاحب
کے حسن قلم، حسن ادارت اور حسنِ ذوق کا آئینہ دار ہے۔
باتصویر "واقعات" کا ہر شمارہ ۵۲ صفحات
پر مشتمل ہوتا ہے لیکن ان ۵۲ صفحات میں دریا کو کوزہ
میں بند کرنے کے مصداق، ادبی، علمی، سیاسی، سماجی
ثقافتی، ملکی، قومی، بین اقوامی، مذہبی، تاریخی،
اور تہذیبی موضوعات پر دلکش اور معلوماتی مضامین
و منظومات یکجا مل جاتی ہیں۔ اُردو میں اس طرز
کوئی دوسرا معیاری پرچہ موجود نہیں ہے۔

پندرہ روزہ واقعات کی کتابت و طباعت
تو دوسرے پرچوں کی مناسبت سے بہت بہتر ہے
ہے لیکن کاغذ خراب ہونے کی وجہ سے تصویروں
وہ حسن نہیں آپاتا جو قاری کو اپنی طرف فوراً متوجہ
کرے۔ اس طرف مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

اُردو داں حضرات کو چاہیئے کہ وہ اس
کے حلقہ اشاعت کو وسیع کرنے [illegible]
کوشش کریں۔

۴۔ عروج نشاط

شاعر: محبوب جام صفحات ۱۶۰ قیمت عہ

ناشر: بزم قمر، ناظر باغ۔ کان پور

"عروج نشاط" نوجوان شاعر محبوب عالم انصاری محبوب جام شاگرد رشید حضرت رشید قمر لکھنوی کی رباعیات، کا ایک حسین اور دلکش مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ سے قبل ان کا ایک اور مجموعہ رباعیات "فروغ خمار" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں مختلف عنوانات کے تحت ۴۸ رباعیات شامل ہیں — رباعی ایک مشکل صنف سخن ہے اور اردو کے گنے چنے شاعروں نے ہی اس صنف میں کامیابی حاصل کی ہے۔ محبوب جام ایسے نو عمر اور نسبتاً غیر مشہور فن کار کے مجموعہ رباعیات پر ایک سرسری نظر ڈالی تو حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ انھوں نے بہت کم مدت میں اتنی کامیاب رباعیاں کہی ہیں۔

دیکھی جو حسین رخ پہ شفق تابی بھی آنکھوں میں نظر آئی ظفر یابی بھی
تسکین جو مرے ذوق نظارہ کو ملی کام آئی شب ہجر کی خوں نابی بھی

یہ اور اس قسم کی دیگر رباعیاں اس مجموعہ میں شامل ہیں جن سے محبوب جام کی فن کارانہ صلاحیتوں اور شعری و ادبی ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مجموعہ کی کتابت و طباعت بہت نفیس اور سرورق خصوصاً نہایت دلکش ہے۔ ضخامت و حسن طباعت کو دیکھتے ہوئے مجموعہ کی قیمت حیرت ناک طور پر بہت کم ہے۔

مطبوعاتِ ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت)

۱۔ اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر۔ ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۰/

۲۔ اُردو مہم نمبر۔ فروغ اُردو۔ اقبال صدیقی ۳/۵۰

۳۔ انوار اللغات۔ اُردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۴/۰

۴۔ ادبی تاثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/۵۰

۵۔ آئینہ عقل۔ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری ۴/۵۰

۶۔ اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۴/۵۰

۷۔ امیر خسرو اور اُن کی ہندی شاعری۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۲/۵۰

۸۔ انارکلی۔ امتیاز علی تاج ۲/۲۵

۹۔ اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد ۴/۰

۱۰۔ اُردو میں تنقید۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۳/۰

۱۱۔ انتخاب قصائد اردو۔ مغیث الدین فریدی ۱/۵۰

۱۲۔ ادب اور نظریہ۔ آل احمد سرور ۵/۰

۱۳۔ اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم۔ عبدالشکور ۴/۵۰

۱۴۔ ادبی نقوش۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ۵/۰

۱۵۔ اقبال۔ مرتبہ فروغ اُردو ۰/۵۰

۱۶۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ عبدالماجد دریابادی ۴/۵۰

۱۷۔ اکبر اعظم اور اس کا عروج و زوال۔ ڈاکٹر حبیب احمد ایم اے ۲/۰

۱۸۔ انتخاب کلام میر مع مقدمہ۔ ناظر کاکوروی ۱/۰

۱۹۔ انتخاب کلام غالب۔ بشیر احمد علوی ۱/۵۰

۲۰۔ ادبی تنقید۔ ڈاکٹر محمد حسن ۴/۵۰

۲۱۔ ادب کیا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/۵۰

۲۲۔ ادبی خطوط غالب۔ مرزا محمد عسکری ۵/۰

۲۳۔ آئینۂ نثر اُردو۔ سعادت علی صدیقی ۳/۰

۲۴۔ ایک نادر روزنامچہ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/۵۰

۲۵۔ ابوالخیر۔ مجنوں گورکھپوری ۰/۲۷

۲۶۔ اُردو کی کہانی۔ سید احتشام حسین ۱/۵۰

۲۷۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر ،، ،، ۴/۷۵

۲۸۔ انتخاب نثر جدید ،، ،، ۳/۰

۲۹۔ ابوالکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد ۰/۳۵

۳۰۔ ارمغان نثر و نظم۔ عبداللہ خاں خلیل ۳/۷۵

۳۱۔ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۱/۵۰

۳۲۔ اچھی نظمیں اخگر مشتاق ۰/۴۵

۳۳۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید اڈیشن۔ غلام احمد فرقت ۱۲/۰

۳۴۔ اُردو شاعری امیر احمد علوی ۱/۵۰

۳۵۔ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ ۱/۲۵

۳۶۔ حافظ، صائب، غالب فارسی ۰/۱۰

۳۷۔ اپنی پہچان (پوری زندگی کا حال معلوم کرنیوالی کتاب) اعجاز احمد فاروقی ۱/۲۵

۳۸۔ اللہ کے پیارے۔ امیر حسن نورانی ۰/۵۰

۳۹۔ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۱/۵۰

۴۰۔ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی۔ عبدالماجد عطاء اللہ ۱/۲۵

۴۱۔ اسپین کی شہزادی صادق سردھنوی ۳/۵۰

۴۲۔ ایک جان تین قالب۔ خاں محبوب طرزی ۴/۰

۴۳۔ الفت ،، ،، ۲/۵۰

۴۴۔ آغاز سحر ،، ،، ۴/۰

۴۵۔ الٰہ آباد ،، ،، ۴/۰

۴۶۔ اپنی موج میں آوارہ ۱/۵۰

۴۷- ایجادوں کی باتیں - مصطفےٰ حسن رضوی ۲/۰

۴۸- اچھی کہانیاں (حصہ اول) شمس الدین نوری ۰/۲۵

۴۹- " " (حصہ دوم) " " " ۰/۳۱

۵۰- " " (حصہ چہارم) " " " ۰/۵۰

۵۱- ادب کا مقصد - ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۳/۰

(ب)

۵۲- بابائے اردو عبدالحق - عبداللطیف اعظمی ۵/۰

۵۳- بستان حرم (جدید نعتیہ کلام) از ڈاکٹر حمید صدیقی ۱/۵۰

۵۴- شہید محبت بوٹا سنگھ - خان محبوب طرزی ۴/۰۰

۵۵- بزم بے تکلف - ڈاکٹر سید عابد حسین ۲/۵۰

۵۶- برگ گل - شبلی نعمانی ۰/۴۰

۵۷- بہادر شاہ ظفر - امیر احمد علوی کاکوروی ۴/۸۰

۵۸- بہشتی گوہر (اول دوم) یعنی خلاصہ بہشتی زیور
مولانا تھانوی ۲/۵۰

۵۹- بانی اسلام (علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا
اردو ترجمہ) ۷/۵۰

(پ)

۶۰- پطرس کے مضامین - پطرس بخاری ۱/۵۰

۶۱- پیاری باتیں محسن کاکوروی ۰/۲۰

۶۲- پھولوں کا انبار (ناول) منظر سلیم ۴/۵۰

۶۳- پیسہ اور پرچھائیں (مجموعہ ڈرامہ) ڈاکٹر محمد حسن ۳/

۶۴- پاگل خانہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۳/۲۵

۶۵- پیغام " طاہر دیاپوری ۳/۰

۶۶- پنجاب میں اردو - حافظ محمود شیرانی ۴/۵۰

۶۷- پردیسی کے خطوط (حصہ اول) مجنوں گورکھپوری ۴/۰

۶۸- تاریخ ادب اردو - فرورٹ - (اردو ایڈیشن)
ڈاکٹر سید اعجاز حسین ۸/۰

۶۹- تحریریں مجموعہ مضامین ڈاکٹر گیان چند ۴/۵۰

۷۰- تصویر درد و مع تشریحات و تراجم
فرید احمد علوی /۷۵

۷۱- تاریخی جائزے - ڈاکٹر محمد یٰسین ۳/۰

۷۲- تعارف تاریخ اردو (جدید ایڈیشن)
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/۰

۷۳- تاجدار مدینہ - اقبال صدیقی /۷۵

۷۴- تنقیدی اصول اور نظریئے - حامد اللہ افسر ۴/۰

۷۵- تنقید و تحلیل - شبیہ الحسن نونہروی ۳/۰

۷۶- تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن)
سید احتشام حسین ۴/۵۰

۷۷- تنقیدی نظریات (جلد اول) " " ۶/۰

۷۸- " " (جلد دوم) " " ۶/۰

۷۹- تنقیدی اور عملی تنقید " " ۲/۸۰

۸۰- تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) ۱۹۶۴ء
آل احمد سرور ۱/۵۰

۸۱- ترانہائے حیات - ڈاکٹر رفیع حسین /۰

(ٹ)

۸۲- ٹیگور - نادم سیتاپوری /۰

۸۳- ٹھیکرے کی مانگ - صدیقہ بیگم سیوہاروی /۰

(ث)

۸۴- ثنائے حبیب (نعتیہ کلام) بحر لکھنوی [illegible]

(ج)

۸۵- جام سفال - محمد شفیع [illegible]

۸۶۔ مونس   انور صہبائی   ۳/۰

۸۷۔ جواہرات انیس۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی   ۱/۰

۸۸۔ جنگ آزادی نمبر ا (۱۸۵۷ء) فروغ اُردو   ۳/۰

۸۹۔ جنگ آزادی نمبر ۳   "   "   ۳/۰

۹۰۔ جوئے رواں (مجموعہ کلام) حامد اللہ افسر   ۲/۵۰

۹۱۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اختر بلگرامی   ۳/۵۰

۹۲۔ جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین   ۲/۵۰

۹۳۔ جلوے   معین الدین دردائی   ۱/۷۵

۹۴۔ جمیلہ بوازری (ناول) خاں محبوب طرزی   ۴/۵۰

۹۵۔ جگر نمبر اول   سید احتشام حسین   ۶/۰

(چ)

۹۶۔ چوتھی بہن مجموعہ افسانہ۔ مسیح الحسن رضوی   ۲/۷۵

۹۷۔ حیات فضل الحق   خیرآبادی   ۱/۲۵

۹۸۔ حالی بحیثیت شاعر (جدید ایڈیشن مع اضافہ)
(ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی   ۴/۰

۹۹۔ حسرت موہانی۔   عبدالشکور   ۳/۵۰

۱۰۰۔ حسرت تعمیر۔   ڈاکٹر اختر اورینوی   ۴/۵۰

۱۰۱۔ حجاج بن یوسف۔   جرجی زیدان   ۴/۵۰

۱۰۲۔ حکیم نباتات وزیر خاں فنکراں   ۲/۲۰

۱۰۳۔ خوش بختی کی تلاش   احسن الظفر بی اے   ۲/۰

(خ)

۱۰۴۔ خیالات رنگیں یعنی مجموعہ مضامین فارسی (زیر طبع)

۱۰۵۔ خلاصہ شریف زادہ۔   مرزا رسوا   ۱/۰

۱۰۶۔ خطبات ماجد یا سیرت نبوی
عبدالماجد دریابادی   ۲/۷۵

۱۰۷۔ خضر راہ   مع ترجمہ   علامہ اقبال   ۷۵/

۱۰۸۔ خلاصہ روح تنقید   /۰

۱۰۹۔ خلاصہ جواہر العروض   /۰

۱۱۰۔ خلاصہ المیزان   /۷۵

۱۱۱۔ خبثی [illegible] محمد علی واحدی مع مقدمہ
[illegible] تھانوی   /۵۰

۱۱۲۔ خلاصہ شعر الہند دوم

(د)

۱۱۳۔ دلچسپ کہانیاں   مسعود عالم   /۰

۱۱۴۔ دیوان فغانی   /۵۰

۱۱۵۔ داستان سہراب و رستم مع مقدمہ (فارسی)
عبداللہ خاں خلیل   ۳/۰

۱۱۶۔ دیوان صفی (حصہ اول) صفی لکھنوی   ۲/۰

۱۱۷۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ   ۱/۰

۱۱۸۔ دستۂ گل   -   شبلی نعمانی   /۳۰

۱۱۹۔ دوشیزۂ ظلمت ناول خاں محبوب طرزی   ۵/۰

۱۲۰۔ دلربا   "   "   "   ۳/۰

۱۲۱۔ دلی کا دبستان شاعری مع اضافہ جدید ایڈیشن
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی   ۱۰/۰

(ڈ)

۱۲۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد   انوار الحسن   ۲/۷۰

(ذ)

۱۲۳۔ ذوق و جستجو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی   ۱۲/۵۰

۱۲۴۔ ذوق ادب و شعور۔ پروفیسر احتشام حسین   ۴/۰

۱۲۵۔ ذوق جنوں مجموعہ کلام۔ آل احمد سرور   ۴/۵۰

(ر)

۱۰۔ روایت اور بغاوت۔ سید احتشام حسین ۲/۵۰

۱۰۔ رباعیات غالب مع اُردو ترجمہ
سید امیر حسن نورانی ۳/۰

۱۰۔ رہبر مضمون نویسی۔ شفاعت علی صدیقی ۲/۵۰

۱۱۔ راکھی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۰/۳۷

۱۱۔ رخسار سحر۔ انصر کریم قدوائی ۱/۵۰

۱۲۔ رفتار (ناول) ۳/۵۰

۱۲۔ رموز حکمت مع مقدمہ اُردو۔ محمد شریف ۳/۵۰

۱۱۔ ریاض فارسی۔ منتخب کلام فارسی ۲/۰

(ز)

۱۲۔ زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ)
مولانا تھانوی ۰/۵۰

زنبیلیوں کا بادشاہ (حکیم باتا) (مزاحیہ ناول)
علی عباس حسینی ۳/۰

(س)

سلور کنگ ۔ آغا حشر کاشمیری ۳/۰

سوانح اور خاکے ۔ نجم الدین نقوی ۳/۰

سردر جہاں آبادی ۔ ڈاکٹر حکیم چند نیّر ۷/۰

سرود نو (مجموعہ کلام) پروفیسر اختر قادری ۳/۰

سنگ گہر ۔ سید احتشام حسین ۳/۰

ساحل و سمندر سید احتشام حسین ۵/۰

سرسید احمد یا شاید کوہ قاف کی پری
سید علی عباس حسینی ۱/۵۰

سرمایہ زبان اُردو ۔ جلال لکھنوی ۲/۵۰

سخنہائے گفتنی ۔ کلیم الدین احمد ۵/۰

سفر [illegible] (ناول) ماہر [illegible] آبادی ۲/۰

۱۴۷۔ سیاحت زمین (ناول) محمود عالم [illegible] ۲/۵۰

۱۴۸۔ سید سالار مسعود غازی وحش محمود آبادی ۳/۵۰

۱۴۹۔ ستاروں سے آگے۔ ناظر کاکوروی ۲/۵۰

۱۵۰۔ سنہرا حلقہ ۳/۷۵

۱۵۱۔ سر سید احمد خاں۔ انوار الحسن صدیقی ۰/۳۷

۱۵۲۔ سوشل اسٹڈی۔ احمد محسن کاکوروی ۱/۷۵

(ش)

۱۵۳۔ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) غلام احمد فرقت ۸/۰

۱۵۴۔ شرح سنگ گہر۔ عبد القوی دریابادی ۲/۵۰

۱۵۵۔ شاہ غمگین حضرت جی۔ پروفیسر عبد الشکور ۴/۰

۱۵۶۔ شرح ادب پارے نثر ۴/۵۰

۱۵۷۔ شرح ادب پارے نظم ۳/۰

۱۵۸۔ شرح منتخبات فارسی۔ عبد القوی دریابادی ۲/۵۰

۱۵۹۔ شبلی نعمانی ۔ انوار الحسن صدیقی ۰/۳۷

۱۶۰۔ شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن)
نظم طباطبائی ۵/۰

۱۶۱۔ شاہان مالوہ یعنی گجرات کی تاریخ۔ امیر احمد علوی ۲/۵۰

۱۶۲۔ شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم
شبلی نعمانی ۲۵/۰

۱۶۳۔ شرح نثر امروز ایران احسن الظفر بی۔ اے ۲/۰

۱۶۴۔ شرح شعر امروز ایران " ۲/۵۰

۱۶۵۔ شمع و شاعر علامہ اقبال ۰/۲۵

۱۶۶۔ شرح حکیم نباتات خاں۔ نیر مسعود ۱/۲۵

۱۶۷۔ شرح انتخاب قصائد غزلیات
مطابق نصاب بی اے۔ عبد العلیم قدوائی ۹/۰

۱۶۸۔ شرح ترانہائے خیام۔ حکیم عبد القوی ۱/۰۰

(ص)

۱۶۹۔ [illegible] (مزاحیہ مضامین) [illegible] ۳/۰

۔۔۔ محمود الٰہی ۵/۰

(ط)

۱۷۱۔ طرزی کا نمبر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اردو ۲/۰

۱۷۲۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے
غلام الثقلین ۰/۲۷

۱۷۳۔ طلسم اسرار (ڈرامہ) مرزا رسوا لکھنوی ۱/۲۵

۱۷۴۔ طرۂ امیر۔ امیر مینائی منتخب کلام
(جدید ایڈیشن) امیر احمد علوی ۳/۵۰

(ع)

۱۷۵۔ عذرا (ناول) صالحہ عابد حسین ۵/۰

۱۷۶۔ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
سید احتشام حسین ۴/۵۰

۱۷۷۔ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینہ میں۔ اخلاق حسین عارف ۲/۰

(غ)

۱۷۸۔ غالب کی تخلیقی تخیل۔ شہید صفی پوری ۷/۰

۱۷۹۔ غنچہ و گل۔ سید محمود الحسن رضوی ۲/۵۰

۱۸۰۔ غالب کا کلام بہ لحاظ عناصر۔ ناظم سیتاپوری ۲/۵۰

۱۸۱۔ غرقی دروازہ ناول مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۱۸۲۔ غزلیات نظیری — ۱/۵۰

(ف)

۱۸۳۔ فن خطابت یعنی استاد تقریر۔ کتب مصطفٰے ایڈووکیٹ ۶/۰

۱۸۴۔ [illegible] خان محبوب طرزی ۲/۰

۱۸۵۔ فلسفہ ورلیم کالج اور اکرام علی۔ ناظم سیتاپوری ۲/۵۰

۱۸۶۔ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دسنوی ۳/۵۰

۱۸۷۔ [illegible] مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۱۸۸۔ فروغ جام جم ۔۔۔

۱۸۹۔ فغان محسن ۔ محسن کاکوروی ۰/۲۰

۱۹۰۔ فارسی آموز ۔ مبشر احمد علوی ۰/

۱۹۱۔ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن)
پروفیسر کلیم الدین احمد ۵۰/

(ق)

۱۹۲۔ قدیم و جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں غلام احمد فرقت ۰/

۱۹۳۔ قصائد خاقانی ۵۰/

۱۹۴۔ قصائد ظہیر فاریابی ۵۰/

۱۹۵۔ قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۵۰/

۱۹۶۔ قطرے سے گہر ہونے تک۔ صالحہ عابد حسین ۰/

۱۹۷۔ قدر و نظر ڈاکٹر اختر اورینوی ۰/

۱۹۸۔ قصص و مسائل۔ عبدالماجد دریابادی ۰/

۱۹۹۔ قصائد قاآنی۔ (فارسی)

۲۰۰۔ قومی ادب نثر و نظم۔ حامد افسر ۸۰/

۲۰۱۔ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول)
(خان محبوب طرزی)

(ک)

۲۰۲۔ کیسر اور کاہی بدرالدین طیب جی

۲۰۳۔ کف گل فروش (مزاحیہ مضامین)
(غلام احمد فرقت)

۲۰۴۔

(گ)

۲۰۵۔ گلہائے حرم مسعود مقامات مقدسہ [illegible]
ناظم [illegible]

گلدستہ [illegible] ۱/۹۰

گلزار فارسی [illegible] آمد نامہ /۳۰

گلہائے ادب ۔ عبدالاحد خاں خلیق ۲/۰

گاندھی جی کے ساتھ ۔ حامد اللہ افسر ۱/۵۰

(ل)

۔ لوائح جامی مع مقدمہ عبدالاحد خاں خلیق ۱/۲۵

۔ لال قلعہ مائل ملیح آبادی ۶/۰

۔ لب بام عادل رشید ۵/۰

۔ لسانیات اور اردو ۔ سید محمود حسن رضوی ۲/۰

مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو
غلام احمد فرقت ۸/۰

(م)

۱۔ مسلمان اور کانگریس ۔ ابوالکلام آزاد ۲/۵۰

۲۔ مرثیہ نگاری اور میر انیس ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۳/۵۰

۳۔ مضامین فرحت (حصہ اول) مرزا فرحت اللہ بیگ ۳/

۴۔ مضامین فرحت (حصہ دوم) " " " ۳/۰

۵۔ مانی کی کہانیاں ۔ آفتاب اختر تلہری ۲/۵۰

۶۔ بڑے اسٹیج ڈرامے ۔ ڈاکٹر محمد حسن ۳/۰

۷۔ موسم گل (ناول) عادل رشید ۶/۰

۸۔ مجبور " خان محبوب طرزی ۴/۵۰

۹۔ مضامین جدیدہ محمد ہادی ۱/۲۵

۱۰۔ مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ
قدرت اللہ بیگ ۲/۵۰

[illegible] شاہ احمد علی منیری ۔/۴

۲۲۸۔ مطالعہ حالی " [illegible]

۲۲۹۔ میٹھے بول [illegible]

۲۳۰۔ مولوی نذیر احمد کی کہانی ۔ مرزا فرحت [illegible]

۲۳۱۔ معرکہ روم و دیوتاں صادق سردھنوی [illegible]

۲۳۲۔ مصنوعی چاند ۔ خان محبوب طرزی [illegible]

۲۳۳۔ مقدمہ شعر و شاعری (مطابق نصاب [illegible])
حالی ۲۰

۲۳۴۔ مرثیہ غالب " [illegible]

۲۳۵۔ محبوبۂ کربلا جرجی زیدان [illegible]

۲۳۶۔ معاد مائل ملیح آبادی [illegible]

۲۳۷۔ مولانا حالی انوار الحسن صدیقی [illegible]

۲۳۸۔ مہاراج بلی ڈاکٹر احسن فاروقی [illegible]

۲۳۹۔ مطر ملائی لوک جھوک ۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب [illegible]

۲۴۰۔ مجذوب اور ان کا کلام مولانا رضا انصاری [illegible]

۲۴۱۔ مصباح بلاغت مع مقدمہ (اردو)
مصنفہ [illegible]

۲۴۲۔ مطالعہ سودا ڈاکٹر محمد حسن

۲۴۳۔ مزاحیہ شرح دیوان غالب غلام احمد فرقت

۲۴۴۔ مقدمات و مقالات عبدالاحد خاں خلیق

۲۴۵۔ منتخب سوانح اور خاکے [illegible]

۲۴۶۔ نثر امرؤ ایران ڈاکٹر یوسف حسن [illegible]

[illegible]

[illegible] شجاعت علی سندیلوی ۱۲/-
[illegible] ۔ خان محبوب طرزی ۲/۰
[illegible] مقدمہ و انتخاب محمد شریف ۳/۰
[illegible] یعنی انتخاب کلام آفاقی کبیر احمد جائسی ۲/۰
[illegible] تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ حامد اللہ افسر ۳/۰
[illegible] (ناول) خان محبوب طرزی ۳/۵۰
[illegible] " مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
[illegible] اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ) ۴/
آل احمد سرور
[illegible] فن و فنکار۔ مجنوں گورکھپوری ۴/۵۰
[illegible] ۔ انتظار حسین ۳/۰
[illegible] احمد کی کہانی۔ فرحت اللہ بیگ ۱/۰

عبدالرحمان خلیق

(ہ)

۲۶۱۔ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے
علی عباس حسینی /۰
۲۶۲۔ ہندی کے مسلمان شعرا۔ امیر حسن نورانی /۷۵
۲۶۳۔ ہمارا جھنڈا حامد اللہ افسر /۰
۲۶۴۔ ہندوستان شاہراہ ترقی پر۔ منظر سلیم /۵۰
۲۶۵۔ ہندوستان کا تیسرا منصوبہ " " /۵۰

(ی)

۲۶۶۔ یادگار غالب مولانا حالی /۵
۲۶۷۔ یاقوتی (ناول) خان محبوب طرزی /۵۰
۲۶۸۔ یادگار انیس۔ امیر احمد علوی /۵۰

پتہ:- ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷- امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

[illegible] کی [illegible] تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملے [illegible] بحوالہ نمبر خریداری خبر کر دی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں [illegible] ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

[illegible] آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں۔

[illegible]

جلد (۱۸) شمارہ (۴)

جولائی ۱۹۷۰ء

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

مدیر اعزازی :-
پروفیسر احتشام حسین

مدیران :-
محمد حسین شمس علوی
عبدالقوی دریابادی
سعادت علی صدیقی

سالانہ :- ۴ روپے
پرچہ :- ۳۷ پیسے

پتہ :- ۱- ادارۂ فروغ اُردو
۳۷- امین آباد پارک لکھنؤ- ۱

۲- انوار اشرف
۵۰ ب، ڈی سلو ٹاؤن
نارتھ ناظم آباد- کراچی، پاکستان

رجسٹرڈ نمبر ال- ۲۰
لائسنس نمبر [illegible]
فون نمبر [illegible]

ترتیب

۲۴۹۔ نقش حالی اول دوم یعنی حالی نمبر پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، شجاعت علی سندیلوی ۱۲/۰

۲۵۰۔ نغمۂ کوہسار ۔ خان محبوب طرزی ۳/۰

۲۵۱۔ نفحات الہند مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۳/۰

۲۵۲۔ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی۔ کبیر احمد جائسی ۲/۰

۲۵۳۔ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ حامد اللہ افسر ۳/۰

۲۵۴۔ نیا راستہ (ناول) خان محبوب طرزی ۳/۵۰

۲۵۵۔ نوروز ؍؍ مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۲۵۶۔ نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ) آل احمد سرور ۶/۰

۲۵۷۔ نقوش و افکار ۔ مجنوں گورکھپوری ۳/۵۰

۲۵۸۔ نیلم ۔ انتصار حسین ۳/۰

۲۵۹۔ نذیر احمد کی کہانی۔ فرحت اللہ بیگ ۱/۰

۲۶۰۔ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی عبدالاحد خاں خلیل

(ہ)

۲۶۱۔ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے علی عباس حسینی

۲۶۲۔ ہندی کے مسلمان شعرا۔ امیر حسن نورانی ۷۵

۲۶۳۔ ہمارا جھنڈا حامد اللہ افسر ۰

۲۶۴۔ ہندوستان شاہراہ ترقی پر۔ منظر سلیم ۵۰

۲۶۵۔ ہندوستان کا تیسرا منصوبہ ؍؍ ؍؍ ۵۰

(ی)

۲۶۶۔ یادگار غالب مولانا حالی ۷۵

۲۶۷۔ یا قوتی (ناول) خان محبوب طرزی ۵۰

۲۶۸۔ یادگار انیس ۔ امیر احمد علوی ۵۰

ملنے کا پتہ :- ادارہ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دسویں تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملے تو اس کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دوکاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی۔ ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھئے۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

ادارۂ فروغِ اُردو لکھنؤ کا علمی و ادبی ترجمان

جلد (۱۸) شمارہ (۳)

جولائی ۱۹۷۱ء

ماہنامہ فروغِ اُردو لکھنؤ

مدیرِ اعزازی :-
پروفیسر احتشام حسین

مدیران :
محمد حسین شمسی علوی
عبدالقوی دریابادی
سعادت علی صدیقی

سالانہ :- ۴ روپے
فی پرچہ :- ۳۷ پیسے

پتہ :- ۱- ادارۂ فروغِ اُردو
۳۷- امین آباد پارک لکھنؤ- ۱

۲- انوار اشرف
۵۰ ب، ڈی سلو ٹاؤن
نارتھ ناظم آباد، کراچی، پاکستان

رجسٹرڈ نمبر: ایل- ۲۰
لائسنس نمبر: ۲۰۶۴۱۷/۲۰۱۸۱۶۴
فون نمبر: ۲۶۱۳۵

ترتیب

سید انصار حسین پرنٹر، پبلشر نے سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر دفتر فروغ اُردو لکھنؤ سے شائع کیا

سعادت علی صدیقی

اپنی باتیں

اُردو زبان کے متعلق مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کا پارلیمنٹ میں یہ بیان کسی قدر حوصلہ افزا ہے کہ وہ اس کو آئینی حق دلانا چاہتی ہیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے یو، پی اور دوسری ریاستوں کے بڑے وزیروں سے مفصل کیفیت طلب کی ہے۔ تمام ریاستوں سے رپورٹ آجانے کے بعد ہی وہ اس پر کوئی موثر قدم اُٹھا سکتی ہیں۔ توقع ہے کہ ریاستوں کے بڑے وزرا جلد مفصل رپورٹ پیش کریں گے اور اُردو کے وہ تمام حقوق مل جائیں گے جن کو لسانی سامراجیت، تعصب اور تنگ نظری نے غصب کرلیا ہے۔

اُردو زبان اور کچھ نہیں چاہتی، وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ جمہوریہ ہند میں اس کو بھی زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے پورے مواقع حاصل ہوں، اس کو وہ تمام سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہوں جو آزادی سے پہلے حاصل تھیں۔ اس کے پڑھنے پڑھانے کسی قسم کی کوئی پابندی نہ ہو، اس کو سرکاری، نیم سرکاری، اور پرائیوٹ اداروں بھی باوقار جگہ حاصل ہو اُردو پڑھے ہوئے لوگوں پر ملازمت کے دروازے بند ہوں، اور اُردو پڑھا ہوا، نااہل اور جاہل نہ قرار دیا جائے۔ بائیس تیئیس سال مسلسل جس منظم اور مؤثر طریقوں سے اُردو کو ختم کیا جاتا رہا ہے اور جس طرح ا والوں کو طفل تسلیاں دی جاتی رہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ نئی نسل اُردو سے بالکل ناواقف ہے، دفتروں، کچہریوں اور تمام دو سرکاری نیم سرکاری اداروں میں اُردو جاننے والے نہ عہدیدار ہیں اور نہ استاد حد یہ ہے کہ فلاح عامہ، اور عوام سے رابطہ قائم رکھنے والے محکموں میں بھی اُرد جاننے والے نایاب ہوگئے۔ ریاستی اور مرکزی محکموں میں شائد ہی کوئی ایسا محکمہ ہو جہاں اُردو جاننے کی شرط لازمی نہ سہی اختیاری ہی رکھی گئی ہو۔ حد یہ ہے محکمۂ ڈاک کے پوسٹ مین بھی اب اُردو جاننے والے نہیں رکھے جاتے، نتیجہ یہ

کہ اُردو میں پتہ لکھے ہوئے تمام خطوط یا تو ضائع کردیے جاتے ہیں یا پھر بہت
سے ملتے ہیں۔ اسی طرح انفارمیشن اور دوسرے ضروری محکمے ہیں جن میں ہر شخص کو اُردو
ن لازمی ہونا چاہیئے کم از کم ان ریاستوں میں تو ضرور ہونا چاہیئے جہاں اُردو کشی کی مہم
باوجود اب بھی کروڑوں صرف اُردو جاننے والے موجود ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ وزیر اعظم
تبہ مرکزی محکموں سے بھی اُردو کی حق تلفیاں دُور کرنے کی کوشش کریں گی۔

جہاں تک ریاستوں کا تعلق ہے اور خاص طور سے اُتر پردیش کا، نہ معلوم کتنی مرتبہ
نے اُردو کے سلسلہ میں معلومات فراہم کیں، کبھی کسی وزیر کو جائزہ لینے کے لئے
ا، کبھی دوسرے ذرائع سے اُردو کے بارے میں حالات معلوم کئے لیکن نتیجہ کچھ بھی
نکلا یا تو سرکاری طور پر یہ اطلاع دی گئی کہ اُردو کو تمام سہولتیں میسّر ہیں اور کسی
کی کوئی دقت اُردو والوں کے لئے نہیں ہے، یا پھر جو رپورٹ پیش کی گئی اس پر عملدرآمد
ہوا، آج بھی اُردو کی حق تلفیوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ نہ تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہے۔
پڑھانے کے لئے اساتذہ، نہ دفتروں اور کچہریوں میں اُردو جاننے والا عملہ، نہ اُردو پڑھے
ے لوگوں کو کوئی اقتصادی اور معاشی سہولت، ہوسکتا ہے کہ سرکاری رپورٹ میں سب ٹھیک
۔ لیکن اگر سرکاری سطح سے ہٹ کر جماعتی سطح پر، اور عوام سے براہِ راست رابطہ قائم کرکے
دو کے لئے معلومات حاصل کی جائیں تو کسی قدر اصل حقیقت ظاہر ہوسکتی ہے۔

جولائی کے مہینے میں اُردو کے اداروں اور ہمدردوں کی ذمّہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔
خلہ مہم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی ضرورت ہے، اپنے اپنے حلقوں کے اسکولوں میں
دو کے طلبا داخل کرائیے، اُردو کے اساتذہ کا مطالبہ کیجئے اور کوشش کیجئے کہ
تعلیمی ادارے میں اُردو کی تعلیم رائج ہوجائے۔

● مہاتما گاندھی ڈگری کالج، سنبھل مرادآباد میں، جناب حکیم رئیس احمد صاحب کی جدوجہد سے،
لے کے درجات میں اُردو کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ حکیم صاحب کی قومی خدمات اور اُردو
سے محبت شکریہ یا مبارکباد سے بے نیاز ہے تاہم ادارہ، کالج کی مجلس منتظمہ، اور
صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

● مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر کتابت کی منزلوں سے قریب قریب گزر چکا ہے، یہ نمبر ملک و بیرون
کے مشاہیرِ ادب، علمائے کرام اور رہنمایانِ ملّت کے گرانقدر مقالوں پر مشتمل ہے۔ امید ہے کہ یہ نمبر
ب شائع ہوجائے گا۔ توقع ہے کہ اُردو دوست اور ادب نواز اس یادگار اور عظیم الشان نمبر کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے

● ہندوستان کے مایہ ناز مورخ و اہلِ قلم پروفیسر محمد حبیب اور بزرگ سیاست داں و ماہرِ تعلیم سری پرکاش
ت سے، ادبی و سیاسی دُنیا میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے، وہ آسانی سے پُر نہیں ہوسکتا۔ ادارہ ان
ں کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

عدیل عباسی جامی جریا کوٹی

غزل

کھینچ کر تیغ وسنا تیشوں کو چمکائے ہوئے
سر بکف نکلے ہیں باغی پھر قسم کھائے ہوئے

ڈال لو تم بھی تو اپنے حسن پر کوئی نقاب
ہم تو بیٹھے ہیں دلِ وحشی کو سمجھائے ہوئے

یہ خموشی ہے کسی طوفاں کی آمد کا پیام
ناخدا ہشیار! کچھ بادل ہیں منڈلائے ہوئے

سرخ رو بنتے ہو لیکن کیا تمھیں معلوم ہے
خونِ ناحق میں نظر آتے ہو نہلائے ہوئے

خیر اتنا زور آیا ناتوانوں میں بھلا
اب نظر آتے ہیں کچھ قاتل بھی گھبرائے ہوئے

ہم چلے جاتے تو ہیں لیکن رہے اتنا خیال
انجمن میں آپکی آئے تھے بلوائے ہوئے

مل گئی ہوتی ہمیں منزل مگر ہم کیا کہیں
ہم ہیں وہ راہی جو ہیں رہبر کے بہکائے ہوئے

موت تو آتی ہے بن کر اک رہائی کا پیام
کاٹتے ہیں زندگی کے دن سزا پائے ہوئے

شاملِ جشنِ بہاراں ہیں مگر کس حال میں
راہ کے پتھر کی صورت ٹھوکریں کھائے ہوئے

موسمِ گل ہے یہی تو کیا ہے پھر فصلِ خزاں
ہر کلی سہمی ہے جامی پھول مرجھائے ہوئے

وسیم فاروقی ایم اے

قطعات

شعر گوئی میں لوگ پہونچے ہیں
جلوۂ کوہ طور سے آگے
کوئی تنقید میں مگر نہ بڑھا
احتشام[1] و سرور[2] سے آگے

ماہتاب آفتاب ہیں دونو
موجِ تسنیم و آبِ کوثر
احتشام و سرور اردو
فنِ تنقید کے پیمبر

جو بھی ان کی زباں سے نکلا ہے
کر نہیں سکتا ہے کوئی تردید
دید و توریت کے برابر ہے
احتشام و سرور کی تنقید

فنِ تنقید میں اضافہ
راحشِ رنگ و نور کی با
درحقیقت زبور و قرآں
احتشام و سرور کی با

---

[1] پروفیسر سید احتشام حسین رضوی صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی
[2] پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر گیان چند

اعجاز صاحب میرے اُستاد

[illegible] طالب علمانہ زندگی میں کئی درسگاہوں میں [illegible] اساتذہ کے آگے زانوئے ادب طے کیا [illegible] میں اپنے محترم اساتذہ کے بارے میں کچھ سپردِ قلم کرتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ وہ اُستاد جس نے مجھے سب سے زیادہ مدت تک پڑھایا یعنی مسلسل چار سال، وہ صرف پروفیسر اعجاز صاحب کی ذاتِ گرامی ہے۔ [illegible] بھی درسگاہ کے [illegible] اتنے عرصے تک فیض [illegible] نہیں کیا میں نے [illegible] کا [illegible] کا جو شعور و عرفان مجھے اعجاز صاحب سے ملا وہ کسی [illegible] نہیں تو میں اپنے دیگر اساتذہ کے ساتھ بے انصافی [illegible] نے [illegible] کافی کم عرصے تک درس دیا ہے۔

جب سے میں نے ان کے بارے میں کچھ سپردِ قلم کرنے کا ارادہ کیا ہے میں خود کو ایک کشمکش، ایک بے یقینی، ایک عدم اعتمادی میں مبتلا پاتا ہوں کیا میں اس لائق ہوں کہ [illegible] رفیع موضوع پر لب کشائی کر سکوں۔ ان کی شخصیت [illegible] واضح حصے ہیں ایک اہلِ قلم ادیب کی اور دوسرے استاد اور انسان کی۔ کیا میں اس تحریر میں ان کی ادبی شخصیت کا جائزہ لوں؟ میں یہ سوچ کر ہی کانپ جاتا ہوں۔ استاد پر تنقید کیونکر کی جا سکتی ہے۔ یہ کام تو وہی کر سکتا ہے جو ان کے مرتبے کا اہلِ قلم ہو۔ میرے لیے سہل تر ہے کہ ان کی شخصیت پر اظہارِ خیال کروں وہ ایک بڑی ہی شخصیت ہی نہیں دل نشیں شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ جو لوگ ان کی محفلوں میں بار پا چکے ہیں وہ ان کی نغز گوئی اور [illegible] ہوتے ہیں۔ ادبی کارناموں کی نسبت شخصیت پر لکھنا [illegible] فنکار کی تحریروں [illegible] شخصیت نگاری کے لئے ایک بار بیٹھ کر [illegible] لکھنا کافی ہے لیکن مجھے یہ مرحلہ بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔

منٹو نے لکھا ہے: " میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکایا جائے۔

یہ لکھنا منٹو کی اخلاقی جرأت ہی کی نہیں عظمت کی بھی دلیل ہے۔ خود میں نے اس پر عمل کیا ہے۔ کئی سال پہلے

میں نے اپنے بھوپال کالج کے رفیقِ کار رشید ابنِ محمد عرب کی رحلت کے بعد جو مضمون لکھا تو اسی میں میں ان کی شخصیت کے تمام رنگارنگ پہلو افشا کئے۔ یہ تمام رنگ روشن نہ تھے لیکن اس سفیدی وسیاہی کے امتزاج ہی سے ایک دل سے لگنے والی شخصیت ابھری میں منٹو کے اصول کو اور آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ میں مرحومین ہی نہیں زندوں کے کردار کو بھی خواہی نہ خواہی معصوم و مقدس بنانے کا قائل نہیں۔ اردو کے بعض چوٹی کے ادیبوں پر کتابوں یا رسالوں کے خاص نمبروں کا لوح سے تمت تک مطالعہ کر جائیے معلوم ہوگا کہ داستانوں کے ہیروں کی طرح ان میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ کوئی انسانی کمزوری انھیں چھو کر ہی نہیں گئی۔ ہم نے لاکھ سنا ہے کہ کوئی بزرگ عبا و قبا کے باوجود دفتِ رزر کے رسیا تھے یا کسی فنکار کی زندگی کی سب سے رچی ہوئی حقیقت الفتِ سادہ رویاں تھیں یا دوسرے فن کار کی ازدواجی زندگی میں استقلال نہ تھا لیکن جب ان کے بارے میں کتابیں یا رسالوں کے خصوصی نمبر دیکھئے تو ان میں سب کچھ ملے گا صرف وہی حقائق (شخصی علامات کے پردے میں بھی) نہ ہوں گے جو زبان زدِ خلق ہیں۔ جیسے کوئی سازش کرلی گئی ہو کہ انسانی دلچسپی کے حامل ان رخوں پر حجاب ڈال کر گزر جاؤ۔ مجھے اس قسم کے عقید تمندانہ دفتر کھوکھلے بے روح معلوم ہوتے ہیں۔ یہ شخصیت کو فاش نہیں کرتے اس پر پردے ڈالتے ہیں۔ تر دامن بشر معصوم فرشتے سے زیادہ انسان ہوتا ہے میں خطاؤں سے مرکب ہوں اس لئے مجھے بے داغ شخصیتیں پسند نہیں۔ بے عیبی انسان کے لئے سب سے بڑا عیب ہے۔

استادی اعجاز صاحب فرشتہ نہیں غیر مکمل انسان ہیں۔ وہ بے عیب نہیں اس لئے انسانوں کے دلوں سے نزدیک ہیں لیکن ان میں کوئی ایسا عیب دیکھنے سننے میں نہیں آیا جو قابلِ ذکر ہو یا جس کے ذکر پر مجھے یا انھیں شر[مندہ ہونا پڑے]۔ ان کی ذات میں جو معمولی سی انسانی کمزوریاں ہ[یں] خود انھیں نے اپنے قلم سے اپنی سرگزشت کے صفحا[ت پر] ان کا اعلان کر دیا ہے مثلاً طفلی میں وہ بار بار امتحانوں [میں] فیل ہوئے، نوجوانی میں، جنانکہ افتد دانی، کا نمونہ ر[ہے] یعنی کوئے ملامت کا طواف کیا، پختگی کی منزل پر پہو[نچ] کر وہ دنیا کے معاملات میں ایسے سادہ ثابت ہوئے [کہ] بار بار دوستوں سے مالی جبر کے کھائے۔ اعجاز صاحب [کی] شخصیت کا خاکہ پیش کیا جائے تو ان کی متعدد خوبیو[ں] کے ساتھ ساتھ ایسی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کرن[ا ہوگا] اگر انھیں چھپا لیا گیا تو جو شخصیت ابھر کر سامنے آئے [گی] وہ ڈاکٹر اعجاز حسین کی نہیں کسی تقدس مآب مدظلہ العا[لی] کی ہو گی۔

کیا ایک شاگرد، شاگرد بھی ایسا جو عمر، تجربے [اور] ادبی مرتبے میں اتنا پیچھے ہو، اپنے استاد کی شخصیت کے [ہر] پہلو پر قلم اٹھانے کا منصب رکھتا ہے کہا جاتا ہے

با خدا دیوانہ باش و با مصطفےٰ ہشیار باش

استاد کا معاملہ بھی ایسا ہی گو مگو کا ہوتا ہے۔ باپ کے [بعد] استاد کی شخصیت سب سے بھاری سب سے زیادہ عقید[ت] طلب ہوتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ استاد کے بارے میں [لکھتے] وقت میرا قلم شوخی کی زد میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھے، کہی[ں] بھولے سے اس کی زبان آلودہ نہ ہو جائے۔

کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھئے گا کہ میں اس حسین حیلے سے [ان کے حضور] عقیدت پیش کرنے سے پہلو تہی کر رہا ہوں۔ اپنے استاد [کے] لئے عقیدت کا اظہار میرے لئے موجب سعادت ہے۔

اعزاز ملا ہے کہ میں ان کے ارشد تلامذہ میں رہا ہوں
اور یہ لکھتے ہوئے میرے تصور کی آنکھوں کے آگے یادوں
کی کڑیاں گزر جاتی ہیں پچیس تیس برس بیشتر کے ان ایام کی
کی جب میں الہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم تھا طلبہ کی
کے لیے اعجاز صاحب بشاملِ نصاب مصنفوں پر
فردوز کچھ دینے کے ساتھ ساتھ بعض اوقات مختصر
بھی لکھا دیا کرتے تھے۔ یہ نوٹس وہ کسی بیاض سے
لکھواتے تھے فی البدیہہ بول کر لکھاتے تھے۔ کمال یہ
صفحۂ قرطاس پر اترنے کے بعد یہ تقریر اچھے خاصے پختہ
ان کے انداز کی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں اعجاز صاحب
نکل پر یونیورسٹی آتے تھے۔ فرماتے تھے جب کبھی مجھے
میں نوٹ لکھانا ہوتے ہیں تو میں پیدل آتا ہوں کہ راستے
کرتا چلوں۔ اس طرح وہ فکر کی حد تک استانی ہیں۔

مجھے اعجاز صاحب کی شخصیت کے دو پہلوؤں نے
بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ ان کی تحریر اور ان کا تکلم۔
نے بہت کچھ لکھا ہے اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ۔
عصر ادب پر لکھنا سب سے کٹھن ہوتا ہے کیونکہ ہم ان
ت سے اتنے نزدیک ہوتے ہیں کہ کوئی قابلِ اعتماد فیصلہ
سکتے۔ ہم عصروں کے بارے میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابیں
ستیں جن کا سہارا میسر نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ہی
پر کھڑے ہو کر رائے بنانی ہوتی ہے۔ مخدومی اعجاز صاحب
انھیں اجنبی منزلوں کی تسخیر کی۔ "نئے ادبی رجحانات" اور
"آزادی کے بعد" جیسی کتابیں لکھنا انھیں کا کام ہے۔
سکی میدان میں بھی بند نہیں "آئینۂ معرفت" اور
شاعری" جیسی تصانیف اس کی شاہد ہیں۔ ان میں
لاہوت اور ہاہوت جیسی اصطلاحوں سے دوبدو ہو قاری مبہوت
ہو جاتا ہے۔ ترقی پسندی سے متاثر ہونے کی وجہ سے
اعجاز صاحب کی تنقیدوں کی خصوصیت ادب کو سماج کے
آئینے میں مطالعہ کرنے کا رجحان ہے۔ اس قسم کا گلِ سرسبد
"اردو شاعری کا سماجی پس منظر" ہے۔ عمر کی اس منزل میں
بھی وہ اتنی بڑی کتاب لکھ سکتے ہیں۔ ان کے تنقیدی
مضامین کا ایک مجموعہ "ادب اور ادیب" ہے۔ تحریروں کا
تنوع تو ملاحظہ ہو ملکِ ادب کے شہزادے (خاکہ نگاری)
ادبی ڈرامے (ایک بابی ڈرامے) میری دنیا (سوانح)۔ اس
کے علاوہ بھی اردو اور ہندی میں ان کے کچھ کام ہیں اور
سب پر مستزاد یہ کہ عرصہ تک آپ نے ایک ادبی رسالہ
بھی نکالا ہے۔

ان کی اس خوبی سے زیادہ موہنے والی خصوصیت یہ
ہے کہ وہ بہت دلچسپ بات کرنے والے ہیں۔ ان کی مزے
کی باتوں میں بڑی شگفتگی، بڑی بذلہ سنجی ہوتی ہے۔ کبھی کسی نے
بھی ان کی فطری خوش مزاجی کو مجروح نہیں کیا۔ خوش قسمت
ہیں وہ لوگ جنھیں اعجاز صاحب کی صحبتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میسّر
ہے۔ میں نے بحیثیت شاگرد دور ہی کا جلوہ دیکھا ہے۔
میں اپنے دورِ طالب علمی کی بات کر رہا تھا۔ بی اے
اور ایم اے دونوں کی جماعتوں میں اعجاز صاحب کا دستور
تھا کہ کلاس میں ٹیکسٹ (متن) کسی طالب علم سے
پڑھواتے تھے جہاں کچھ سمجھانا ہوتا وہاں روک کر نکات و
غوامض آشکارا کر دیتے۔ ایم اے کے ایک اور کلاس
میں پروفیسر ضامن علی مرحوم بھی لڑکوں ہی سے پڑھواتے
تھے۔ مجھے یہ فخر ہے کہ اپنے بی اے اردو اور ایم اے کی

سب جماعتوں میں میں نے ہی کتاب خوانی کی۔ یہ جان جوکھم کا کام تھا۔ کسی لفظ کا تلفظ غلط ہو جائے یا فارسی عطف و اضافت کو صحیح مقام پر نہ ادا کیا جائے تو پھر سے کلاس میں ساکھ جاتی تھی۔ پھر بھی چار سال تک میں نے یہ فریضہ اپنے ذمے رکھا۔ کلاس میں حاضری کے بعد اعجاز صاحب فرماتے تھے پڑھئے جین صاحب۔ بی اے کے کلاس کی بات ہے [illegible] روز مجھ سے پڑھنے کو کہا تو اس افتتاحیے کا بھی [illegible] صاحب تو ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ریڈر ہیں [illegible] لفظ کی معنویت دار طلب ہے۔ خود نجیب [illegible] لکچرر تھے۔

بعض اوقات اعجاز صاحب اپنے کسی شاگرد پر یکایک کوئی ایسا شوخ جملہ کہہ جاتے ہیں کہ وہ بیچارہ ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ ایک بار میں زوروں کی بارش میں یونیورسٹی پہونچا اور ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ خیال تھا کہ ایسے میں حاضری پر وہ مجھے آفریں کریں گے لیکن انھوں نے کہا تو گویا [illegible] تو اسٹوڈنٹ ہوتے تو ایسے موسم میں یونیورسٹی نہ آتے، اور ان کے اس بے لاگ مشاہدے پر میں خود اپنی نظر میں گھو بن کر رہ گیا۔ واقعی ان کا فرمانا بجا تھا۔ ایسی بارش میں بڑی اسفند یاری کر کے پہونچ بھی جائیں تو تنہا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا اور تنہا لڑکے سے جماعت نہیں لگائی جا سکتی۔

میں ایم اے یا ریسرچ میں تھا۔ کسی وجہ سے کئی دن تک میں لکھ پڑھ نہ پایا تھا۔ میں نے ان کے کمرے میں کہا کہ آج کل لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بڑی سادگی سے اعجاز صاحب نے سوال کیا "کیوں کہیں کوئی معاشقہ ہو گیا ہے کیا؟" دوسروں کے سامنے مجھ جیسے مقطع طالب علم پر معاشقہ کا بہتان باندھا جائے تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ مجھے کتنے پسینے چھوٹے ہوں گے۔ اسی طرح ایک بار میں نے کسی [illegible] شراب نوشی پر [illegible] اور افسوس کے [illegible] اعجاز صاحب نے ادیبوں کے انداز میں کلام میں کہا کیا شراب [illegible] برا ہوتا ہے [illegible] ظاہر ہے کہ یہ مجھے چھیڑنے کے لئے کہا گیا۔

میری پی ایچ ڈی ریسرچ کا موضوع داستانیں تھا۔ سوچا کہ داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال کے ضخیم دفتروں سے [illegible] تو ان پر کچھ لکھ سکتا ہوں۔ یونیورسٹی [illegible] ہوتا ہو ہوسٹل [illegible] تھا۔ داستان امیر حمزہ کی جلد [illegible] کا بوغ بند ہوتی تھی۔ بوستان خیال کسی پر کھینچ ماریں تو [illegible] کے آگے تارے ناچ جائیں۔ تیور [illegible] گرے۔ اعجاز صاحب مجھے یہ دفتر [illegible] دیکھتے تو [illegible] کر دیتے۔

[illegible] بغرض [illegible] کی ایک کتاب چاہیے۔ یونیورسٹی چھوڑ [illegible] جب [illegible] میں ملازم ہو [illegible] ایک بار الہ آباد گیا اور اعجاز [illegible] کے دولت کدے پر سلام کرنے گیا۔ [illegible] پوچھا کہ پان [illegible] سگریٹ پیتے ہیں [illegible] دونوں سے معذرت کی کیونکہ میں ان کی لذت چشی سے بیگانہ ہوں۔ پھر انھوں نے دریافت کیا کہ شادی کی؟ میں نے کہا "نہیں"۔ اس پر آپ نے فرمایا "آپ سے بڑی مشکل ہے پان کھاتے ہیں نہ شادی کرتے ہیں نہ سگریٹ پیتے ہیں"۔ اس فقرے کو یاد کرتا ہوں تو اب بھی پھڑک اٹھتا ہوں۔ اس میں یہ تو مزاح ہے ہی کہ پان سگریٹ اور شادی کو برابر کا عیش قرار دیا ہے یہ ادبی انداز بھی ہے کہ شادی کی بات کو پان اور سگریٹ کے بیچ میں ڈال کر

ہے گویا یہ بالکل مسلّمہ ہے کہ تینوں اشتغال میں برابر کی لذّت
تو رہا شمیا ہو گیا

اعجاز صاحب نے شاگردوں کی عقیدت و محبت کو
زندگی کی سب سے عزیز متاع کہا ہے۔ ان کی خود نوشت
سوانح "میری دنیا" اپنے شاگردوں کے لئے ان کی بے پناہ
محبت کا مظہر ہے وہ اپنے شاگردوں کو اتنی اہمیت دیتے
ہیں کہ اپنی سوانح کے تقریباً نصف صفحات [illegible]
[illegible] وقف کر دئیے [illegible]
[illegible] ان کے شاگردوں کا [illegible]
کی دنیا ہے۔ اس کے صفحہ [illegible] پر انھوں نے اپنے
شاگردوں کے نام گنائے ہیں جو ادبی دنیا میں [illegible]
[illegible] ہیں۔ مجھے خوشی ہے [illegible]
[illegible] عزادار میں مجھ گمنام کا نام بھی شامل ہے۔

لیکن مجھے ایک شکایت ہے۔ انھوں نے میرے لئے
صفحے سے بھی کم دیا ہے جبکہ متعدد دوسرے شاگردوں کو
جو زیادہ اہم نہ تھے کئی صفحات عطا کئے ہیں میں ان کی دنیا
میں زیادہ مقام کا مستحق تھا۔ انھوں نے میرے حالات
میری طالب علمی پر یعنی ڈگری ملنے پر ختم کر دئیے ہیں۔ اس کے
بعد کوئی پتہ نہیں دیا کہ میرا کیا شغل ہے۔ جس طرح میرے
رفیق کار ابو محمد سحر صاحب کے بارے میں اطلاع دی ہے
وہ حمیدیہ کالج بھوپال میں اُردو پڑھانے پر مامور ہیں
اس طرح میرے بارے میں بھی لکھا جا سکتا تھا۔ کتاب کی
اشاعت کے وقت میں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر ہو چکا
تھا لیکن کم از کم حمیدیہ کالج بھوپال تک میرا اتا پتہ دے
دیا جاتا۔

اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ میرے مختصر
حالات میں بھی اعجاز صاحب نے میری بڑی تعریف کر کے
میری عزت افزائی کی ہے۔ خطوط میں بھی میری ہمت افزائی
کرتے رہتے ہیں۔ چند سال پہلے ہماری زبان میں میں نے سردار
جعفری کی غزل اور مروّجہ عروض کے عنوان سے ایک مضمون
لکھا تھا۔ اس کے دوسرے حصّے میں میں نے تجویز کی تھی کہ
اردو شاعری میں ارتقا ہوتا رہا ہے لیکن اردو عروض جمود کا
شکار ہے۔ اس کی تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ اعجاز صاحب
نے میرے اس مضمون سے متاثر ہو کر جس فراخدلی سے
داد دی اس سے ان کی غیر معمولی شفقت کا اندازہ ہوتا ہے۔
خط میں لکھا:

"دوسرا حصّہ جس کو آپ نے کوئی عنوان نہیں
دیا ہے سراسر میری دلچسپی کا ہے آپ نے میرے دل کا
کانٹا نکال دیا بڑی معقول و نفسیاتی تجویز ہے اردو کے فن
عروض سے دلچسپی لینے والے کاش اس پر عمل کریں۔"

غرض اپنے شاگردوں پر اعجاز صاحب کی شفقتیں بے
پناہ ہیں۔ وہ بڑے عالم، بڑے ادیب، بڑے بلند کردار
کے انسان ہیں۔ میں ان کا ایک شاگرد ہوں۔ ان کی بے تکلف
صحبتوں کا ہم نشیں نہیں۔ محمد شاہ اور نادر شاہ جب ایک
صحبت میں موجود تھے تو چوبدار نے محمد شاہ کو پیچوان پیش
کر کے کہا تھا کہ بادشاہوں کی تواضع بادشاہ ہی کو زیب دیتی
ہے۔ اعجاز صاحب کے ادب یا ہزار شیوہ شخصیت پر لکھنا
میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ یہ کوئی ان کا ہم پایہ
یا ہم نشیں ہی لکھ سکتا ہے۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۲ پر)

پروفیسر امین چند شرما

قیس

قیس تمھارا نام یوں تو مشہور ہوا ہے خلقت میں
فدوی شمس الامراء کے ہم سنتے ہیں کہلاتے ہو

آصف جاہ ثانی کا دور علم و ادب کا دور تھا۔ دربار کی سرپرستی اور امراء و رؤسا کی علم دوستی کی وجہ سے حیدرآباد شعراء اور فضلاء کا ملجا و مسکن بنا ہوا تھا۔ دہلی کی تباہی کے بعد بہت سے شاعر اپنا وطن چھوڑ کر حیدرآباد آ گئے تھے۔ اس وقت حیدرآباد میں استاد الشعراء شیر محمد خاں ایمان مانے جاتے تھے۔ ایمان کے شاگردوں میں قیس اور چندا بائی کافی مشہور ہیں[1]

قیس عہد آصف جاہ کے ممتاز شعراء میں سے ہیں۔ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ قیس نے عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد اپنے آبائی پیشہ تاریخ نگاری اور تاریخ دانی میں مہارت و استعداد بہم پہونچائی۔[2] طبیعت میں شعری رجحان تھا۔ شعر کہنا شروع کیا۔ بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ مہاراجہ چندو لال شاداں اور سر کبیر شمس الامراء نے ان کی سرپرستی کی۔[3] دونوں نے دو روپیہ یومیہ مقرر کیا۔ فکر معاش سے آزاد ہو کر انھوں نے ساری توجہ شعر و شاعری کی طرف کر دی۔ ریختہ کے ساتھ ریختی بھی کہی۔ جلد ہی حیدرآباد میں ان کو شہرت اور قبولیت حاصل ہو گئی۔ اور وہ اچھے شعراء میں شمار کئے جانے لگے۔

مہاراجہ چندو لال شعراء کے بڑے سرپرست تھے نصیر دو تین مرتبہ حیدرآباد آئے مگر قیس کی زندگی میں وہ یہاں جم نہ سکے۔ مہاراجہ کے دربار میں قیس کی شاعری کا اثر غالب تھا۔

قیس نے کہا ہے:

شاداں ہے قیس دولت شاداں سے رات دن
سو رشتہ جب سے اس کی ہے سرکار میں مزدہ

قیس نے بڑی عمر پائی تھی، کہتے ہیں:

یاد پیری میں جوانی کو نہ کر قیس وہ بھی تھا خیال خام

کلام — ایک دیوان قیس نے مرتب کیا ہے۔ اس دیوان کا نام انھوں نے بیتکار رکھا ہے

جو دیکھتا ہے صاحب دیوان کہے ہے
چھوٹا سا قیس خوب ترا بیتکار ہے

۱۔ اردو میں دکن ہاشمی (کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی) صفحہ ۴۱۱
۲۔ ایضاً ایضاً ” ۴۱۲
۳۔ ایضاً ایضاً ” ۴۱۱
۴۔ دکن میں اردو ہاشمی (کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی)

قیس پر اس کے زمانہ کے عام رجحان کا اثر نہ ہو سکا
… میر اور درد کی شاعری سے ملتا جلتا ہے۔
… کے کلام سے ان کی شاعری اور شخصیت پر روشنی
… ہے قیس کی غزلوں میں میر کا سوز و گداز اور درد کا تصوف
… قیس کے قصائد میں دربارداری کے تمام لوازمات
… جاتے ہیں۔ قیس نے زندگی کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی
… عام شعرا کی طرح وہ زندگی سے بیزار ہیں۔ قیس کے یہاں
… باعیات ملتی ہیں۔ ان میں واقعات کربلا کا ذکر ہے۔ درج
… رباعیات میں قیس نے جوش اور عقیدت کا اظہار کیا ہے
… میں الفاظ کی شان و شوکت اور روانی ہے۔

حضرت علی کی منقبت میں فرماتے ہیں۔ یہ اللہ کی ذات
… کا کشف اسرار خفی … شمع ہدایت ہے۔ وہ حضرت
… آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قوت بازو ہیں۔ ان کے
… کوششوں نے شہید ہو کر بنائے لا الہ کو مضبوط مستحکم بنا دیا۔

… کشف اسرار خفی شمع ہدایت
… تو … کلمہ رشد و ہدایت
تو قوت بازوئے نبی ختم رسالت
تو نور نظر دیدہ خورشید قیامت

جناب عباس علمدار کی شجاعت، ہمت اور تیغ زنی کی
… کرتے ہوئے کہا ہے کہ
… تو … ہے … غضنفر …
… داد ہمت کی یہاں ہے دلاور

عباس اپنا علمدار ہے جو نمازی لشکر
برش جسے کہتیں وہ تیغ کا جوہر
چوتھے مصرعہ میں تلوار علمدار کی برش کو تیغ کا جوہر
قرار دیا ہے۔

حضرت عباس علمدار شہ کربلا کی میدان وغا میں
پہونچنے کے بعد لشکر یزید میں سراسیمگی پھیل گئی ہے۔
ملاحظہ کیجئے:—

جس وقت ہوا جنگ کو تو معرکہ آرا
گھبرا کے لگے کہنے کہ آپس میں یہ اعدا
اس فوج میں کوئی ایک بھی جیتا نہیں بچتا
کس واسطے خورشید قیامت ہوا پیدا

حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام کے عدل و انصاف کی
تعریف کی ہے کہ … ہر کاہ ہم سنگ ہے۔

منصف ہے وہ عادل ہے تو ابن سعد اللہ
اور خالق اکبر بھی ہے اس بات سے آگاہ
میزان عدالت تیری مشہور ہے یا شاہ
ہم سنگ ہے ہر کوہ سے ہر ایک پر کاہ

خداوند قدوس کی جناب میں گنہ گار قیس اس کے رحم و کرم و
الطاف کی التجا کرتا ہے۔ آہ و زاری کرتا ہے کہ خدائے آموز
گار کے سوا کوئی فریاد رس نہیں ہے۔ دستگیر نہیں ہے عصیان
سے آبرو باختہ در کریم پر عنایت الٰہی کا طالب ہے۔

ہر چند ترا قیس گنہگار ہے آقا　　پر تیری عنایت کے سزاوار ہے آقا
جز تیری بھلا کون مددگار ہے آقا　　کچھ کہہ نہیں سکتا وہ لاچار ہے آقا

حضرت عباس کی علمداری کی تعریف کرتے ہیں۔

بے شک ہے تو لاریب ہے گنجینۂ اسرار
تو بحر ولایت کا بھی ہے گا در شہوار
جس وقت کہ خورشید قیامت ہو نمودار
ہمسایہ علم کا ہو مرے سر پہ علمدار

نیزے کی تعریف ملاحظہ کیجیے۔

نیزے کا وہ عالم ہے ترے قبلۂ عالم
خورشید قیامت کا ہو جس نیزے کا پرچم

دیکھے خط محور تو نہ پھر مار سکے دم
وہ پھل ہے کہ پیغام قضا جس سے ہے توام[۱]

ان رباعیات کے غائر مطالعہ اور اسلوب بیان سے ظاہر ہے کہ اگر قیس صرف مرثیہ نگاری ہی کرتے اور اس قسم دو بیتی ہی لکھتے وہ دکن کے انیس ہوتے۔

جیسا کہ قیس رباعیوں سے ظاہر ہے ان کے مضامین کی نوعیت خالص مذہبی ہے اور وہ بھی سید الشہداء سے متعلق دیگر اخلاقی مضامین جو رباعیوں میں عام طور پر ملتے ہیں ان کے یہاں مفقود ہیں۔ ان کا دائرۂ فکر جو کچھ ہے بس یہی جو بیان میں آیا۔ اس طرح ہم قیس کو رباعی گو شعراء کے اس گروہ سے متعلق پاتے ہیں جن کے فکر کا میدان صرف کربلا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قیس نے ان رباعیوں میں اپنی عقیدت مندی کا اظہار نہایت خلوص سے کیا ہے۔

۱۔ مذکورہ بالا رباعیات قلمی دیوان قیس مخزونہ سنٹرل لائبریری حیدرآباد مخطوطہ نمبر (۹۷) سے اخذ کی گئی ہیں۔

بقیہ مضمون صفحہ ۹ سے

اب وہ بہتر بہتر کے پیٹے میں ہیں (نوجوانوں کی طرح نہیں) بڑے آدمیوں کی طرح دل کے مریض ہیں۔ اس عارضے نے چند سال پہلے انھیں صاحب فراش کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی انھوں نے اُردو دنیا کو "اردو شاعری کا سماجی پس منظر" جیسا شاہکار دیا۔ عمر کی اس منزل میں انکی یہ ادبی لگن ان کے شاگردوں کو ولولہ عطا کرتی ہے۔ کاش یہ مشعل راہ ایک عمر تک ضیا افگن رہے۔

مفتوں کوٹھی

غزل

کتنے ہیں بزم میں افگندہ جبیں بیٹھے ہیں
آج کچھ یوں وہ باندازِ متیں بیٹھے ہیں

...ت جسم کی بھی کوئی عزت و قیمت نہ رہی
کن اداؤں سے ترے خاک نشیں بیٹھے ہیں

...ے نقشِ قدم آئیں تو کہیں ہم و نظر
ہم تو سجدے کے لئے آمادہ جبیں بیٹھے ہیں

... سو گئے سننے والے
لے کے ہم ذکر تیرا جب بھی کہیں بیٹھے ہیں

...جسم کا یہ حسن لطافت، تو سبھ
کتنے جلوے ہیں کہ وہ قلب گزیں بیٹھے ہیں

تاروں پہ پہونچنے کے ہیں کیا کیا ارماں!
آسماں دل میں لئے اہلِ زمیں بیٹھے ہیں

...رہے ہیں ہمیں اربابِ بصیرت طعنے
پھر بھی ہم تجھ پہ کئے دل میں یقیں بیٹھے ہیں

کیا بدلا کہ سب اٹھ گئے تیرے در سے
جم کے بیٹھے ہیں تو بس ایک ہمیں بیٹھے ہیں

بزم میں جا ہیں ہٹیا نگاہی مفتوں
دیوتا بن کے کچھ انسان لعیں بیٹھے ہیں

وقار رومانی

غزل

ایک شخص کھڑا دیر سے یہ سوچ رہا ہے
کیوں رات گئے تک تیرا دروازہ کھلا ہے

کھڑکی سے ہٹے دیر ہوئی اسکو ابھی تک
لگتا ہے دریچے سے کوئی جھانک رہا ہے

جس وقت گلی میں کوئی آہٹ سی ہوئی ہے
تخیل کے پردے پہ تیرا عکس پڑا ہے

کیوں اپنی جفاؤں پہ ہوئے آپ پشیماں
کیا میری وفاؤں کا اب احساس ہوا ہے

ہر لمحہ نیا درد ہے ہر پل نئی الجھن
شاید میرے حق میں یہ فقیروں کی دعا ہے

پھر کشتیٔ دل آئی ہے یادوں کے بھنور میں
تا حدِ نظر رقص میں اک موج بلا ہے

بیٹھا ہوا پہروں سے یہی سوچ رہا ہوں
کیا سوچ کے تم نے مجھے دیوانہ کہا ہے

مولانا طاہر محسن کاکوروی

مُلّا محسنؔ کاکوروی

اور

اُنکا معنی بند مضمون باب کلام

کیا شیراز کو پامال اُردو کے مقطعے نے　　گیا مان اصفہاں تو ہاری نبغِ مہنّد کا

نوازِ اللغا رت [illegible] جس کو ایک خصوصیت روحانی بھی عاشقِ رسولؐ ملا محسنؒ سے حاصل ہے جہاں تک ناز کرے بجا ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں مُلّا محسنؒ کے صاحبزادے حضرت نیر مرحوم نے ایک رات عالم رویا میں عاشقِ رسولؐ کی زیارت کی۔ اس زمانے میں یہاں کئی قسم کے انگور کی بیلیں جعفری پر پھیلی ہوئی تھیں اور اُسی کے قریب حضرت نیر گرمیوں میں شب کو آرام فرماتے تھے۔ ایک صبح کو اس نامۂ سیاہ سے فرمایا کہ رات ہم نے میاں جان (مُلّا محسن) کو یہاں انگور کی روش پر ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ وہ بشاش اور خوش وخرم دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے یہ تو معلوم ہی ہوا کہ عاشق رسول کو اس گھر سے کیا روحانی نسبت ہے۔

ہوسکتا ہے کہ مثل اور شعرا کے مُلّا محسنؒ نے بھی مذکورہ بالا شعر کو شوخیانہ لباس میں ملبوس فرمایا ہے لیکن واقعہ یہی ہے کہ ان کی زبان کوثر و تسنیم کی دھوئی زبان ہے اور مضامین [illegible] دات واحساسات قلبی نمونہ۔ بلاغت۔ سلاست۔ شگفتگی اور حقیقت [illegible] اوصاف ایک شاہکار ادیب، شاعر اور فنکار [illegible] ہونا چاہیئے وہ سب کے سب اُن کے یہاں پائے جاتے ہیں [illegible] دینے والے کی [illegible] ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مُلّا محسنؒ کسی [illegible] میں آئیں [illegible] آئیں لیکن وہ بے سمجھے بوجھے اُن کے کلا[م] پڑھتا اور اپنی اہلیت کے لحاظ سے مزے لیتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ جو ایک آنکھ سے دیکھنے کے عادی [illegible] ان کے کلام کو جیبتاں کہتے ہیں یہ نا اہل اس بحث [illegible] پڑنا چاہتا اور عاشق رسولؐ کے کلام سے صرف چند آبدار موتیوں کے آپ کے سامنے پیش کرتا ہے [illegible] صبح تجلّی سے صرف ایک موتی نذر ہے یہ مثنوی خلقت [illegible] اسلام صلعم پر لکھی گئی۔

یہ صبحِ سعادت جہاں ہے　　نو روزِ بہارِ جاوداں [illegible]

مفتاحِ خزینہ ہائے اسرار　　مصباحِ تجلّیات انو[ار]

ہے بدرِ کمال اوج تشبیہ　　لبریز جمال مہرِ تنز[یہ]

ان اشعار کو　　یہ گوہر آبدار حسن کی جوت سے آنکھیں [illegible]

...دماغ تک منور اور ایک خاص روحانی لذت سے ہمکنار ...ہیں حسان الہند مُلّا محسن عاشق رسول صلعم کے جذبات ...اس رتِ قلبی اُس نادر و نایاب جواہر خانے کا ایک انمول ...ہے جس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ ؎

ہے زمیں پہ کبریائی بندے کے لباس میں خدائی

اس چمک دمک اور ٹھنڈی روشنی سے وہی لطف اندوز ...تے جن کو درحقیقت ٹھنڈے سورج کی حاشیہ نشینی ...ہی اور کسی طرح کا لگاؤ ہے ہم نے بہرہ نام کے اُمتی لکیر ...تیرا سکی ٹھنڈی روشنی کے اکتساب سے بھی محروم ہیں۔ پابند ...نہ جانے اس کو ... بار کہیں یا ... لیکن روحانیت ...بزرگ اس کی قدر و منزلت کتنی کرتے ہیں اُنھیں سے ...چاہیئے۔ حضرت تیر مرحوم نے اپنی رباعی میں شریعت ...وحانیت کو اس طرح پیش کیا ہے۔ رباعی

...اسکو شوق میں حاجت رواں کہیں
...گنا ہگار شفیع الوریٰ کہیں
پابند شرع یوں تو حبیبؐ خدا کہیں
وارفتگی بڑھی تو خدا جانے کیا کہیں

...پھرے اور وارفتہ مزاجوں نے اس کی توضیح یوں ...خدا کبر نے عرش بریں سے جو نہ جانے کتنا اونچا ...ن پستی پر اپنی شان۔ پوری آن بان اور اپنا مکمل ...خاتم المرسلین روح عالم صلعم (جس کا ادل نہیں ...ونپ دیا۔ اپنے محبوب کو ایک خاص ادا سے ...اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ عامتہ الناس پر اپنا ...ست۔ شان استغنا اور کبریائی دکھانے اور جتانے ...مبعوث فرمایا۔ ان امور کا مشاہدہ اور مظاہرہ

مخلوق کے لیئے اس وقت تک ناقابل قبول تھا جب تک صانع قدرت خود عالم وجود میں نہ آجاتا اور یہ بات وحدہ لاشریک کے واسطے قطعًا و یقینًا ناممکن ہے اسی وجہ سے حضرت موسیٰ نے جب دیدار کی حسرت کی تو اس لم یزل نے جواب میں (لن ترانی) فرمایا۔ اسی مناسبت سے دنیا (جس کو تماشہ گاہ یا سنیما کہنا چاہیئے) کی تشکیل۔ تعمیر اور تکمیل کے واسطے بصد بے نیازی و استغنا سنیما دیکھنے والوں سے روشناس کروا دیا اس مضمون کو اس طرح بھی ادا کیا ہے ؎

دیکھا ہے خدا نے اپنا عالم آئینہ بنا کے قدِ آدم

اس میں شک نہیں کہ جانِ رسل انبیا و مرسلین کی آخری کڑی ہیں۔ مالک سنیما کو یہ اسٹیج کرنا مقصود تھا کہ تماش بین اس بے بدل اور بے مثال ہیرو کو دلکی آنکھوں سے دیکھ کر ہماری صناعی اور کاریگری پر جان دیں اور ہمارے اور صرف ہمارے ہی ہو کر اپنے جینے اور مرنے کو پسند کریں جن کے نصیب میں تھا انھوں نے ہیروؐ کے حرکات و سکنات کو حتی المقدور اپنانے کی کوشش کی اس کے میٹھے بول شربت شکر خنہ سمجھے اور دونوں کی سعادت حاصل کی جو بدنصیب تھے ان کا ٹھکانا نہ یہاں لگا نہ وہاں۔

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

ناقۂ سیاہ کے نزدیک یہی ایک شعر مثنوی کے سیاق و سباق سے عبارت ہے۔ بصیرت رکھنے مبالغہ نہ سمجھیں تو اسمیں کلام نہیں کہ یہ شعر سادگی بیان۔ سلاست زبان۔ بالغ نظری۔ کیف و آمد۔ خلوص اور عشق کو محبت کا سرچشمہ اور

اپنی مثال آپ ہے۔ دیکھا آپ نے معنی بندی اور مضمون یابی ہے ملا محسن کے اشعار میں دو ایک شعر مثالاً اور پیش ہیں تپلیوں کی تعریف میں فرماتے ہیں اور پھر آنکھوں کی قسم کھاتے ہیں جو بڑی لطیف ہے۔

خلوت گہ کبریا کو دیکھا   آنکھوں کی قسم خدا کو دیکھا
اے پرتو مہر لا یزالی   بے مثل مثال بے مثالی

اپنی جہالت اور بے ہنری کی وجہ سے نامہ سیاہ کی زبانی قلم اس کی تشریح سے عاجز ہے ہاں اس قدر ضرور عرض کرنا ہے کہ باوجود فرومائیگی اور تنگی مطالعہ کے اردو شاعری میں تو خیر فارسی شاعری میں اس کا جواب نہیں ہے

اب ہم آپ کو ملا محسن کے نامیہ یا نعتیہ قصیدہ کی نعت کی طرف سیر کے واسطے لئے چلتے ہیں۔ زیادہ نہیں اس وقت صرف دو ہی چار شعروں سے آنکھوں کو تراوٹ اور دل و دماغ کو فرحت حاصل ہوگی۔ یہ قصیدہ مدیح خیر المرسلین حقیقتاً لذت میں ہے۔ اس کی تشبیب بے شک نرالی ہے۔ اس سے شاعر کے پاکیزہ جذبات۔ بلندی خیال، نکتہ دانی اور رفعت کلامی پر صاد کرنا ہی پڑتا ہے۔

پھر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں اٹھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

مہابن بھرتپور اور متھرا کے درمیان ایک تاریخی مقام ہے۔ برج کا رقبہ ۸۴ میل ہے، مہابن اور گوکل اسی میں شامل ہیں۔ پہلے تو شاعر عالیہ مارغ، دقیقہ رس نے متھرا اور گوکل کے باسیوں کو گنگا جل سے اشنان کرایا پھر آگے بڑھا تو ہوا کی تار برقی (وائرلیس) سے مہابن والوں کو یہ خوشخبری دی کہ تم بھی خوشیاں مناؤ کیونکہ گنگا جل سے لدے پھندے بادل اب آیا ہی چاہتے ہیں بالخصوص دھیان میں رہے کہ متھرا اور اس کے پاس پڑوس کا علاقہ کرشن جی مہاراج کا جنم بھومی کہا جاتا ہے اس لئے تقدس میں کم نہیں ہے۔ اس لئے یہ بادل گنگا کے پوتر جل سے بھرے ہوئے مہابن جیسے مقدس استھان کے درشن کے واسطے گنگا جلی کا نذرانہ عقیدت لئے ہوئے آ رہے ہیں۔

اپنی کم ظرفیوں سے لاکھ فلک چڑھا ہے
میری آنکھوں کا ہے اترا ہوا صدقہ

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ظلمت نہ ہوتی تو نور کی پہچان کی اور کفر نہ ہوتا تو اسلام کا ظہور کیوں ہوتا۔ دنیا میں اسلام نمودار ہو ظلمت کے بادل پھٹ گئے جس طرح ہوا اڑ گیا اسی طرح کا فر تسلط اکناف عالم سے ہٹتا چلا گیا بھاگ گیا اڑا اڑ گئے جب تک حبل المتین کلمہ گویوں کی گرفت میں رہی ساری دنیا میں پھیلے اور خوب پھلتے پھولتے رہے۔ دو کی فراوانی عیش و عشرت کی ساز و سامانی نے ان کو بے کر دیا خدا کی رسی کو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دیا نتیجہ ظاہر تھا آپس میں خانہ جنگیاں ہونے لگیں اور بھی آ گیا کہ ہندیوں پر فرنگی مسلط ہو گئے۔ فرنگی کی حکو کا انحصار جھوٹ، فریب، مکاری اور بے حیائی پر تھا وہ فنی حیثیت سے طرح طرح کے سوانگ رچا کر بھولے بھا اہل ہند کے سامنے پیش کیا کرتے تھے غریبوں اور دکھیا کے پھسلانے کو عدالتیں بنائیں جہاں سوا رشوت اور کے اور کوئی کاروبار نہ تھا۔ پھر اسٹامپ ڈیوٹی۔ مالگز جرمانے۔ نذرانے۔ ہندو قانون اور آئے دن کی نت

ں غریبوں اور مظلوموں کو مٹانے کے لئے ایجاد کی جاتیں
ذلیل، حقیر اور کمینہ سمجھا جاتا نسلی امتیاز عروج پر تھا بڑاؤ
ملومت کرو کی پالیسی پر حکمرانی کا دارومدار تھا۔ ننگے اور
سوز حرکتوں کا بازار گرم تھا۔ چاپلوسیوں اور خوشامد خوری
خور ایک معمولی بات ہوگئی تھی۔ یہ سب باتیں شاعر
پرور دعالیہ ماغ کی آنکھوں میں خار ہو کر کھٹکنے لگیں۔
اور جگر سوز شاعرانہ سفلی اور کمینی حرکتوں پر بلبلا اٹھا
س نے اپنے واردات قلبی کو اس طرح ہمارے سامنے
کیا ہے مطلب یہ ہے کہ بادلوں کا بھاپ بن کر اوپر
سائنس کا اصول ہے۔ یہ تو بدیہی بات ہے کہ بادلوں
(مادّہ) پستی ہی ہے۔ جب بادل اپنے زعم بلندی اور
ں میں آکاش تک پہونچتا ہے تو اس کو غرور اور گھمنڈ
تا ہے اور وہ گرج چمک کے خوب خوب برستا ہے اس
عا گھمنڈ اور غرور کا نتیجہ اسوقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ
نے کے بعد بے آب ہو کر کوئی مال نہیں رہتا گویا بادلوں
مازتو اس دغرور سے ہے اور انجام میں وہ اپنی
ت وحقیقت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ نکتہ دان اور دقیقہ
شاعر کے یہاں بادلوں کا یہ چلن نہایت اوچھا۔ بے حد
انتہائی کم ظرفی اور سفلے پن کا مظہر ہے اس کا کہنا ہے
ہ نسو جو زمانے کی نیرنگی، انقلاب سے بے چین ہو کر
کھوں سے گرے وہی بھاپ بن کر بادل کی شکل
گئے اور وہاں پہونچکر اسقدر گرجے چمکے اور ٹوٹ
ر برسے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہستی کو
، نتیجہ اس غرور کا یہ ہوا کہ بے آب ہو کر کوئی مال
ہے واقعہ یہ ہے کہ شاعر نے تو اپنی آنکھوں پر سے

صدقہ اتارا تھا (صدقہ کسی چیز کو کسی کے چاروں طرف پھرا
کے تصدق کرنا۔ اکثر لوگ صدقے کی چیز سر کے گرد پھرا
کے اللہ واسطے بھی دیدیتے ہیں اور کبھی سر یا بدن سے
چھوا کر چوراہے پر رکھدیتے ہیں)
یہ حقیر۔ بے ہنر اور فرد مایہ عاشق رسول ؐ کی روشن
ضمیری۔ دور بینی۔ روحانی پاکیزگی اور نازک خیالی کی داد بھر
نہیں دے سکتا اس جگہ اس کی زبان وقلم دونوں گنگ
ہیں۔ البتہ اتنا ضرور عرض کرتا ہے کہ تقریبًا ایک صدی پہلے
شاعر نے بدل جو باتیں بیان فرمائیں آج ہم میں وہی سب
بلکہ مَعَ شَیئِِ زائد پائی جاتی ہیں۔
کالے کوسوں نظر آتیں ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا عمل
شاعر نکتہ سنج وعالیہ ماغ یہ کہنا چاہتا ہے کہ
ہندوستان کے مقدس اور مشہور شہر بنارس میں ان گنت
مندر ہیں اور وہاں کی نیرنگی اصنام بھی اعجوبہ روزگار ہے۔
گوکل اور مہابن میں بھی اسی طرح کے پوجا پاٹ کے ساز و
سامان مہیا ہیں۔ کاشی (بنارس) سے جو کالی کالی گھٹائیں
گنگا جل میں ڈوب کر اٹھیں وہ دُور دُور تک پھیل گئیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری خدائی ظلمت وتاریکی میں
نہا گئی۔ گویا پوری دنیا میں اصنام کی بادشاہت ہوگئی
کنھیا جی ہلکے سیاہی مائل رنگ کا حسین امتزاج تھے یساری
فضا اس رنگ سے متاثر تھی اور کشور ہند میں زمانہ دراز
تک انھیں کا سکہ چلتا رہا۔ شاعر اچنبھے میں پڑ گیا اور اپنے
دل سے پوچھنے لگا کہ آیا یہ سکہ کرشن جی کا صرف ہندوستان
ہی میں رائج ہے یا اکناف عالم میں؟ اسکے بعد حسب ذیل

شعر میں اس سکّے کا ساری خدائی میں چلنے کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

جانبِ قبلہ ہوئی ہے یورشِ ابرِ سیاہ
کہیں پھر کعبے میں قبضہ نہ کریں لات وہبل

یہ دھیان میں رہے کہ قبلہ سے مراد بیت المقدس ہے، یہ فلسطین میں واقع ہے۔ چودہ سو برس پہلے کعبہ مکرمہ کی جانب منھ کرنے کی بجائے اسی قبلے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم تھا (شومیِ قسمت کہیئے یا افلاسِ دین یا اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ۱۹۶۷ء کی پنج روزہ جنگ اسرائیل واردن کے بعد وہ متبرک قبلہ ہم سے چھن کر یہودیوں کے قبض و تصرف میں چلا گیا۔ اللہ ہم کو جوشِ ایمانی دے اور ہم اپنے دین کی حفاظت کے لئے اپنے اس قبلہ کو بدسرشت قوم سے واپس لے لیں۔ آمین) کعبہ جس کو بیت اللہ بھی کہتے ہیں پہلا گھر اللہ کا یہی ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ نے بنایا اور اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی منت مانی اور اس کو اپنے نزدیک پورا بھی کیا۔ دعا سے حضرت متمم اخلاق والمکارم سے اللہ اکبر نے قبلے کی جگہ کعبے کی طرف منھ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دیا۔ کسی وقت اسی کعبے میں ۳۶۰ بتوں کی پوجا ہوتی تھی ان میں بڑے بڑے حاجت رواؤں میں دو یہ ہیں "لات وہبل" انیسویں صدی میں روس کے زار پیٹر اعظم نے افغانستان سے ہو کر خیوا بخارا تاشقند پر قبضہ جمایا اور بحر اخضر سے نکل کر ترکستان پہنچا وہاں جس خونریزی۔ بربریت اور مردم کشی کا مظاہرہ کیا وہ ناقابل بیان ہے۔ تاریخی کتابیں روس کی اس وقت کی نسل کشی کے واقعات سے پٹی پڑی ہیں (جیسے "روس و انگلستان کا سچا حال" مرتبہ منشی محفوظ علی کاکوروی نیجبر راج سنگھا [illegible] ضلع کھیری۔ ڈپٹی کلکٹر جن کا تخلص فہم تھا اور منشی سجاد [illegible] *ایڈیٹر اودھ پنچ کے رفقاء اور معاونین میں تھے)۔ [illegible] دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ زار صاحب نے کس طرح کلمہ گویوں کو چن چن کر مارا، اُن کی بے بس عورتوں اور بچوں کو جو [illegible] ہو کر مسجدوں میں پناہ گزیں تھے آگ لگا کر بھون ڈالا [illegible] مثلاً وینسرا لارڈ ڈفرن کے پرائیویٹ سکریٹری نے روز [illegible] کی تاریخ لکھی ہے اس میں پیٹر اعظم کی قلعی کھولی ہے [illegible] "تزکِ عبدالرحمانی" مرتبہ امیر عبدالرحمان خاں والیِ [illegible] ملاحظہ فرمائیے تو اُس صدی کے رُوس۔ ایران ترکی [illegible] افغانستان اور انگلستان کی باہمی رقابتیں اور جنگجویا [illegible] ایک دوسرے کا ملک گیری کی ہوس میں دست و گریبان ہونا اور نبرد آزمائی کا تفصیل سے حال معلوم ہوتا [illegible] اور ترکتازان ہند (مختصر تاریخ جسکے مرتب ڈاکٹر تارا [illegible] ہیں) وغیرہ کے مطالعے سے اس زمانے کی تصویر آنکھ [illegible] کے سامنے آجاتی ہے اور فرنگی چالبازیوں، مکاریوں اور عیاریوں کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ شاعر نازک خیال [illegible] دوربین و نکتہ نواز ان اِن کے دل دہلا دینے وا [illegible] حالات و واقعات سے بے متاثر ہو کر اپنے دُکھی [illegible] کی کربناک آہوں کو اِن اشعار میں پیش کیا ہے۔ یہ [illegible] رہے کہ اس فرنگی عہد میں جب ہر طرف ایسے لوگو [illegible] کے واسطے سامان دار و گیر مہیا ہے اور آزادی کا تو در کنار اس کا خیال بھی باعث دار و رسن ہو ٹھیک [illegible] زمانے میں شاعر نازک خیال نے اس قصیدے میں [illegible] انوکھے ڈھنگ سے اپنے غمزدہ دل کے جذبات د [illegible]

ظاہر کیا ہے۔ شاعر اپنے اندیشوں کو اس طرح ظاہر کر رہا اور خود ہی سوال ہے کہ وہ بیت اللہ (کعبہ) جو مدت صنم خانہ بنا رہا جانِ اسلام صلعم کے دنیا میں تشریف لانے بعد وجود اصنام سے پاک ہوگیا تھا اور وہاں وحدہٗ لا شریک لہٗ کی پرستش ہونے لگی تھی کیا پھر وہ صنم کدہ بن جائے گا اور بتوں کی پوجا پھر ہونے لگے گی۔

شاعر کا دل نازک یہاں کے حالات و واقعات سے اس قدر رتپہ تو دینے لگا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم
برق بنگالہ ظلمت میں گورنر جنرل

عہد ایسٹ انڈیا کمپنی میں گورنر جنرل شاہ انگلستان کا نائب بن کر یہاں آتا تھا۔ ملکہ وکٹوریا کی تخت آرائی کے کچھ دنوں کے بعد کمپنی بہادر کا چراغ گل ہوگیا اور ملکۂ انگلستان کا نائب وائسرائے بن کر آنے لگا یہ صرف الفاظ کا ہیر پھیر ہے ورنہ اختیارات میں پہلے سے اضافہ ہو گیا۔ انہی دنوں گورنر جنرل کا دار الحکومت بنگال تھا۔ اس دور سے سیکڑوں برس قبل مہاتما گوتم بدھ بھی بنگالے گئے تھے اور کئی جگہ قیام کیا جہاں ان کے استھانوں کا پتہ ملتا ہے۔ فرنگیوں نے بنگالیوں کی سورش فرد کرنے کی وجہ سے مجبوراً بنگال کو تقسیم کرنا چاہا اس پر سخت احتجاج ہوئے ۱۹۰۵ء میں آخر کار وہ تقسیم ہوگیا لیکن شورش نے جب زیادہ زور پکڑا تو وہ قانون منسوخ کردیا ۱۹۱۲ء میں شاعر نکتہ سنج کا کہنا یہ ہے کہ اب کے برسات میں سیاہ بادل بڑے زور شور اور گھن گرج سے اٹھیں ہیں۔ [illegible]

سے بادلوں کی سیاہی اور تاریکی ہٹانے میں مشعل راہ بنی ہے۔ وادی پنجاب اور بنگال کے دریاؤں سے مہیب موجیں اٹھتی ہیں اور آپس میں ٹکراتی ہیں تو اُن سے دل دہلا دینے والی لرزہ براندام آوازیں پیدا ہوتی ہیں یہ لہریں کوسوں کی خبر لیتی ہیں۔ ان سے ہیجانی اور طوفانی کیفیت ہوتی ہے۔ یہی ان بادلوں کا اعلیٰ درجہ کا کارنامہ ہے جس کو شاعر کمالیہ ماغ و بلند پرواز نے نظامت کا عہدہ عطا فرمایا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رعد ایک فرشتہ ہے جس کو حکم احکم الحاکمین کی طرف سے مینہ برسانے کی خدمت سپرد ہوئی ہے۔ اُس فرشتے کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا ہوتا ہے جب بادل تہہ بہ تہہ ایک جگہ جم جاتے ہیں تو رعد اپنے اُس کوڑے سے اُن کو ہانکتا ہے اس کوڑے کے بادلوں پر مارنے سے جو چمک دکھائی دیتی ہے وہی بجلی ہے۔ شاعر ہمہ داں کا خیال ہندوستان کی سیاسی شطرنج کی طرف ہے جو اس وقت پنجاب اور بنگال میں کھیلی جا رہی تھی۔ پنجاب میں مرہٹوں سے لڑائیاں ہو رہی تھیں افغانستان میں شیر علی خاں سے فرنگی ساز باز کر رہا تھا روس افغانستان پر ڈورے ڈال رہا تھا اور سونے کی چڑیا ہندوستان پر دانت لگائے تھا وغیرہ وغیرہ ۱۸۷۰ء اہل بنگال و پنجاب کے واسطے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ ایک تو بنگال سے لیکر پنجاب اور دکن تک مہاکال پڑا جس میں ہزاروں جانیں بھوک میں گھلیں۔ ماں باپ اپنے بچوں، اپنے آنکھوں کے نور اور جگر کے ٹکڑوں کو محض اس لئے کہ جان سے نہ جائیں اِدھر اُدھر بیچنے اور بانٹنے پر مجبور ہوئے ۱۸۷۹ء میں پنجاب میں کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں اور

بنگال میں بھی بھوٹانیوں کی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اس سے تیس چالیس سال پہلے ولی اللّٰہی طبقہ کے سرفروش مجاہدین نے بدیسی عیار قوم کے خلاف بغاوت کی اور شمالی مغربی پر بمقام ستھانا اپنا پرچم لہرا دیا۔ فرنگیوں نے مجاہدین حریت کے سینے اور بندوقوں اور سنگینوں سے چھلنی کر دئیے۔ اسی طرح اودھ میں حضرت سید امیر علی نے جاں نثار مجاہدین کے ساتھ علم بغاوت بلند کیا۔ چند ہموطن مولویوں نے فتویٰ دے کر فرنگیوں کے ہاتھوں شہید کروا دیا۔ اور بہت سے واقعات اسی طرح کے اس زمانے میں پیش آتے رہے جن سے شاعر کا جام صبر لبریز ہو کر چھلک اٹھا۔ (ملاحظہ ہو حیات طیبہ مرزا حیرت۔ تنوی مومن۔ تاریخ اودھ وغیرہ۔)

رہ تپش دل کا اڑا ہوا نقشہ بجلی
چشم پر آب کا دھویا ہوا خاکہ بادل

غرض مُلّا محسنؔ کے اس قصیدے میں اسی قسم کے اشارے آپکو ملیں گے اور اُن کے تپش دل کا سامان بنیں گے۔ اس میں ذرا بھی نہیں ہے کہ انہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء اور اس سے بہت پہلے زبانوں کی نشاندہی ایسے انداز میں کی ہے۔ ان واقعات کو ایسے پُر آشوب دور میں (جب ایمانداری رسیل جول اتحاد واتفاق اور انصاف کی بات کرنا سولی پر چڑھنا یا جزائر انڈمان ذکوبار کی میہمانی قبول کرنا ہوتا تھا) سلک نظم میں پرونا انکی دیدہ وری۔ دانشوری۔ بصیرت اور روحانیت کا بھرپور تصرف سمجھنا چاہئیے۔ مزہ یہ ہے کہ یہ ساری باتیں وہ بہار ہی بہار کے پیرائے میں کیا کرتے چلے ہیں جن کے سمجھنے اور سمجھانے کے واسطے آج ہم کو اپنا پچھلا کورس

ہماری نا اہلی۔ فرد مائیگی اور خود ہمہ دانی اگر اُن کے [illegible] بند اور مضمون یاب کلام بلاغت نظام کو سمجھنے سے قاصر ہے تو ہم کو ان پر اعتراض کا بھی کوئی حق نہیں ہے اگر قصیدے میں مستاصل۔ استھل۔ دُھر یکھیم کسل یا اسی قسم کے اور الفاظ کوئی شاعر استعمال کرتا ہے اور ہم اپنی کم علمی تنگی مطالعہ کی وجہ سے نہ سمجھ سکیں اور نام اونچا کرنے کیلئے اس میں تنافر کا عیب نکالدیں تو یہ ہماری نادانی اور جہالت ہے۔ سوداؔ۔ ذوقؔ۔ میرؔ اور پھر غالبؔ کے قصیدوں کو پڑھئے اور انصاف کیجئے کیا ان کے یہاں بقول ہمارے تنافر نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم سرے سے قصیدے کی تعریف ہی سے نابلد ہیں۔ اور ہمارے مضامین کا رسالوں میں شایع ہو جانا ہمارے لئے آجکل کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ ملا محسنؔ کے بارے میں حضرت امیر مینائی کے شاگرد جناب مولوی احسن اللہ خاں ثاقب گوالیاری نے جو جامع مکتوبات ہیں۔ مکتوبات امیر مینائی کے صفحہ ۱۳۱ پر یہ لکھا ہے "جامع مکتوبات نے ایک مرتبہ استاد کے حضور میں جناب قبلہ محسن کاکوروی علیہ الرحمتہ کی سخن آفرینی اور بلاغت کلام کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اُن کا کلام ایک عالم ہے خیالات نادرہ کا کہ اسکو دیکھ کر انسان حیران ہوتا ہے اور اُن کا ہر شعر معراج بلاغت ہے" یہ ہے مُلّا محسن علیہ الرحمتہ کا وہ کلام جس کو معنی بند مضمون یاب کہا جاتا ہے۔

دو ایک سر پھرے اور شوریدہ مزاج اس دریائے ناپیدا کنار میں غوطے لگا رہے ہیں ہماری یہ دعا ہے کہ

معاصرین

"اُردو ہے جس کا نام ....."

...اعظم کا ٹیلی ویژن انٹرویو

تقریبًا ایک ہفتہ پہلے وزیر اعظم اندرا گاندھی کے
...یلی ویژن انٹرویو کی رپورٹ اخبارات میں شائع ہو
...ہے، جس میں مختلف عوامی طبقات کے نمائندوں نے
...اعظم سے مختلف موضوعات پر اپنے سوالوں کے جواب
...تھے۔ اس انٹرویو میں ملک کے ایک ممتاز اہل قلم
...محمد حسن نے بھی "اُردو کو بعض ریاستوں میں دوسری
...ی زبان قرار دئیے جانے کے موقف پر وزیر اعظم سے
...سوال کیا تھا۔ انٹرویو کا جو خلاصہ اخبارات میں شائع
...اُس سے وزیر اعظم کے جواب کی صحیح نوعیت واضح نہیں
...تھی۔ لیکن اس سلسلہ میں اب خود ڈاکٹر محمد حسن کا ایک بیان آگیا
...اشاعت گزشتہ میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاچکا ہے

ڈاکٹر صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ:۔

"میرا سوال یہ تھا کہ میں اُردو لکھتا ہوں۔ اس زبان
...پچھلے ۲۵ سال سے قتل کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کی پارٹی اور
...دوسری پارٹیاں اس بات کو تسلیم کرتی آئی ہیں کہ اُردو
...کو اس کا جائز حق نہیں ملا۔ اُردو کے ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ بولنے
...والے ایک ...

مطالبہ بھی پیش کرچکے ہیں۔ کیا آپ اردو کو اتر پردیش بہار
اور بعض دوسری ریاستوں کی دوسری سرکاری زبان قرار دینے
کے مسئلہ پر غور کر رہی ہیں؟"

اس سوال کے خصوص میں وزیر اعظم کے جواب کا
خلاصہ یہ ہے کہ:

"ہم اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے پر غور
نہیں کر رہے ہیں البتہ آئین کے مطابق اُردو کو جو حقوق
ملنے چاہیئے اُن کو دلانے کے لئے ہم ریاستی حکومتوں
سے گفتگو کر رہے ہیں۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اب تک اُردو کے
ساتھ بے انصافی ہوتی رہی ہے اور اسے اس کا جائز مقام
نہیں ملا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد وزیر اعظم سے
اُردو کے ساتھ بے انصافی کے خاتمہ کے لئے اُن کے
مجوزہ اقدامات کی وضاحت چاہی تو اُنھوں نے کہا:

"مجھے اب تک یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اتر پردیش
میں اُردو کی سہولت کے لئے کسی اسکول میں ۴۰ اُردو طلبار
کی موجودگی کی شرط ہے پھر یہ کہ اُس اصول پر بھی عمل نہیں
ہو رہا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ریاست کے ...

کردیا جائے۔ اور ان علاقوں کی عدالتوں اور دفتروں میں بھی اُس کے استعمال کی اجازت ہو۔"

پوچھا گیا کہ کیا کیرالا کی حکومت کی طرف سے ہر سرکاری اسکول میں عربی مدرس کے تقرر کی طرح اتر پردیش کی تعلیم گاہوں میں بھی ہر جگہ ایک "اُردو ٹیچر" کا تقرر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے جواب میں وزیر اعظم نے کہا "ظاہر ہے کہ جن علاقوں میں اُردو بولنے والے بہت کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں وہاں اس کا انتظام نہیں جاسکتا۔"

ڈاکٹر محمد حسن نے ان جوابات سے بجا طور پر یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اُردو کی تعلیم "تعداد کی پابندی" کا شکار رہے گی اور اُردو کو بعض ریاستوں کے مخصوص علاقوں تک محدود رہنا پڑیگا اور اسی کے ساتھ حسب ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔

(۱) وزیر اعظم اور اُن کی جماعت کے سامنے اُردو کے معاملہ کو پوری وضاحت و صراحت کیساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے۔

(۲) یہ کہ اب تک حکمران ذمہ داروں کے سامنے اُردو کا مسئلہ اس طرح آیا ہے کہ یہ بعض ریاستی علاقوں کا ایک محدود معاملہ ہے جسے صرف ریاستی سطح پر ہی حل کیا جاسکتا ہے۔

اور (۳) یہ کہ ارباب اقتدار کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ اُردو والے اس زبان کو دوسری سرکاری زبان نہ قرار دیئے جانے اور اس کے آئینی حقوق سے محرومی کے نتیجہ میں کیسی تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہیں؟

ڈاکٹر صاحب کے ان اخذ کردہ نتائج سے ہم سو فیصدی متفق ہیں۔ اردو زبان سے خود ناواقف ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ وزیر اعظم اس کے بارے میں تمام ضروری [illegible] کے محتاج ہیں۔ اور ان ذرائع سے انھیں جتنا اور جیسا بتایا جائے گا اُتنا ہی وہ سمجھ سکیں گی۔

اُردو کے معاملے میں وزیر اعظم کی مکمل "بے اسی سے ظاہر ہے کہ اُنھیں یہ تک نہیں معلوم تھا کہ کے سرکاری اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کے لئے ایک تعداد میں طلبا کی موجودگی کی شرط ہے اور پھر اس پر بھی عمل نہیں ہورہا ہے۔

جب موصوفہ اور جزوی باتوں سے بھی ناواقف کا عالم یہ ہے تو یہ امر بھی کچھ زیادہ خلاف قیاس ہے کہ اُن کو یقین دلا دیا گیا ہوگا کہ اتر پردیش اور بہار وغیرہ میں اُردو خاص واہم مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک محدود علاقائی معاملہ۔ اور یہاں اُردو کو اُس کا "جائز مقام" بس اتنا کرکے فراہم جاسکتا ہے کہ اُس کو بعض علاقائی سہولتیں دیدی جائیں

غور کیجئے کہ جب کسی زبان کی بے حقیقتی اور کم اہمیت کی ایسی تصویر بنے گی تو اُس کے لئے یہ مطالبہ کتنا مبالغہ آمیز سمجھا جائے گا کہ اسے ملک کی متعدد ریاستوں میں سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا جائے؟

واقعہ یہ ہے کہ ایک ملک کے سب سے اہم ذمہ دار کی ، ایک اہم و زبردست لسانی مسئلہ سے ایسی مطلق ناواقفیت کیسی خطرناک چیز ہے؟ یہ ہمیں معلوم ہے کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کے اردگرد ابھی ایسے عناصر کی کمی نہیں ہے جن کو اُردو سے کوئی ہمدردی نہیں ہے ، مگر یہاں سوال صرف اُنھیں کا نہیں بلکہ اُن افراد کا بھی تو ہے جو نہ صرف اُردو دوست ہیں بلکہ جن کا تعلق اُس فرقہ سے ہے جس کے لئے اُردو مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور

فراد وزیراعظم کے بہت قریب اور اُن کے معتبر بھی
ں۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے بھی وزیراعظم کو بھی اُردو کے
لہ کے پورے سیاق وسباق سے باخبر رکھنے کی کوئی کوشش
ں نہیں کی؟

ہم کوتاہیوں کی ذمہ داری کی کسی بحث میں نہیں
نا چاہتے پھر بھی اتنا ضرور پوچھنا چاہیں گے کہ وہ مُلک
ں بعض بڑی بڑی انجمنیں اور اُن کی "ممتاز شخصیتیں کہاں
یں؟ جو ڈھول پیٹا کرتی تھیں کہ انھوں نے اُردو کے مقدمہ
لو ... وضاحت وجامعیت کے ساتھ حکمران قیادت، اور
اعلیٰ ذمہ داروں کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ اب اُس کے
خاطر خواہ فیصلے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی ہے؟ یہ انجمنیں
اور شخصیتیں اسی نعرے پر برسوں سے پل رہی ہیں اور مادّی
منفعتوں سے اپنے دامن بھر رہی ہیں۔

مرکزی سطح پر کچھ نہیں ہوا؟ تو ریاستی حدود ہی میں
کتنا کیا گیا ہے؟ کیا اس کی کوئی تفصیل اُردو کے عوام کے
سامنے پیش کی جاسکتی ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اب سے برسہا
برس پہلے اُردو بولنے والوں کی تعداد ملک میں ۲۳ ملین تھی،
بہار سے دس لاکھ اور یوپی سے ۲۰ لاکھ اُردو کا مطالبہ کرنے
والوں کے دستخط صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔
مگر اب نئی مردم شماری اور آبادی میں اضافہ کے بعد تو یہ اعداد
شمار بدل گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں
جو اُردو کے حق میں مضر نہیں مفید ہی ہیں ان نئے اثبات و
شواہد سے اُردو کے مقدمہ کو مزید جاندار بنانے کے لئے اب
تک کیا گیا ہے؟ یا اب بھی وہی پُرانے نعرے اور زبانی
جمع خرچ پر بھروسہ اور تکیہ ہے؟

ہم کہیں گے کہ دوسروں سے زیادہ اس میں
قصور ہمارا ہی ہے کہ ہم حکمران کانگرس میں گھُسے بھی
رہے، اُردو کی وکالت کے دعوے بھی کرتے رہے اور
وزیراعظم کو یا مرکزی قیادت یا ریاستی حکمران طبقہ ہی کو اُردو
کے مسئلہ کے صحیح حجم اُسکی اہمیت و وسعت سے واقف نہ
کراسکے نہ اُنھیں اپنا حامی و ہمنوا بنا سکے۔

اندرا کانگرس کی حمایت کرنا غلط نہیں تھا۔ اسلئے
کہ اسکی نئی ترقی پسند لیڈرشپ حقیقتاً اُردو دشمن نہیں ہے۔
اور ماضی کی حکومتوں سے زیادہ اس سے "اُردو" زبان
فائدہ اُٹھا سکے گی۔ لیکن صرف ووٹ دے کر گھر بیٹھ جانا
کافی نہیں ہے۔ ابھی اُردو کے مخلصین کو اس عظیم مسئلہ
کے سیاق وسباق سے نئی روشن خیال قیادت کو واقف
کرانے اور اسے اس کے جائز حقوق دینے پر مکمل طور
سے آمادہ کرنے کے لئے ایک جدید وسرگرم مہم چلانے
کی ضرورت ہوگی۔ جب ہم اپنی اس کوتاہی کو پورا کرلیں اور
جواب تسلّی بخش نہ ملے تب ہمیں یہ سوچنے کا حق ہوگا کہ ہم کو
"اُردو" کے ساتھ انصاف کے لئے اب اور کونسے متوازی
اقدامات کرنے چاہئیں؟ (سیاست۔ کانپور)

باقی مضمون صفحہ نمبر ۲۰

اور مُلّا محسن کے کلام کی باریکیاں اور دقائق مسلک تحریر میں آجائیں۔
آمین۔ سہ دریائے محبت میں ہم ڈوب کے دیکھیں تو
سُنتے ہیں جو ڈوبا پھر وہ لبِ ساحل ہے
انشاء اللہ اس کے آگے بشرط صحت کسی دوسری فرصت میں
عرض کرونگا۔ واللہ المستعان۔

جناب احسن علوی ایم اے

حبسیۂ غالب

ایک ناقابلِ فراموش کتاب

سعادت علی صدیقی اُردو کے نوجوان محقق و نقاد ہیں یوں تو انھوں نے بچوں کے ادب کے لیے بھی کافی کام کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی ایک کتاب "بچوں کی لوک کہانیاں" زیورِ طباعت سے بھی آراستہ ہو چکی ہے لیکن ان کی طبعی ذہانت اور ان کے زورِ قلم کے اصل جوہر تحقیق و تنقید کے میدانوں ہی میں کھُلتے ہیں۔ موصوف کے تحقیقی و تنقیدی مضامین اُردو کے معیاری رسائل و جرائد میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سعادت صاحب کی ایک کتاب "حبسیۂ غالب" کے نام سے فروری ۱۹۷۱ء میں ادارۂ فروغِ اُردو (لکھنؤ) سے شائع ہوئی ہے جسے تصنیف بھی کہا جا سکتا ہے۔

یوں تو "حبسیۂ غالب" تیرہ ابواب میں منقسم ہے لیکن میری رائے میں اس کے دو حصے کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے حصے میں شروع کے آٹھ ابواب رکھے جا سکتے ہیں جن کی رو سے یہ کتاب ایک تصنیف کا درجہ پانے کی مستحق ہے اور دوسرے حصے میں آخر کے پانچ باب شامل کیے جا سکتے ہیں جن کو نظر میں رکھتے ہوئے سعادت صاحب کی یہ قابلِ قدر پیش کش ایک تالیف قرار پاتی ہے۔ آئیے ذرا تفصیل سے ان دونوں حصوں پر نظر ڈالیں۔

پہلے اُس حصے کا جائزہ لینا مناسب ہوگا جسے میں نے "حبسیۂ غالب" کا دوسرا حصہ قرار دیا ہے۔ اس میں باب نمبر ۹ میں غالب کا وہ فارسی ترکیب بند شائع کیا گیا ہے جو انھوں نے اپنے ایامِ اسیری میں قید خانے کی کال کوٹھری میں کہا تھا۔ باب نمبر ۱۰ میں اسی فارسی ترکیب بند کا اُردو ترجمہ چھاپا گیا ہے جو سعادت صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ باب نمبر ۱۱ میں اس ترکیب بند کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب نمبر ۱۲ میں اُن کتابوں کی فہرست ہے جن سے سعادت صاحب نے حبسیۂ غالب کی تالیف میں مدد لی ہے اور آخری باب میں مختلف مصنفین کی تصنیف کردہ ایسی تمام مطبوعہ کتابوں کی ایک مکمل و جامع فہرست حروفِ تہجی کی ترتیب میں دی گئی ہے جو غالبیات کے وسیع و عمیق مطالعے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

"حبسیۂ غالب" کے اس دوسرے حصے میں سب سے عمدہ چیز فارسی ترکیب بند کا منثور اُردو ترجمہ ہے جو سعادت علی صدیقی کی زبان دانی و مہارتِ فن کا

...دار ہے۔ ڈاکٹر سید رغیب حسین صاحب نے جو "پیش گفتار"
...یر فرمایا ہے اُس میں انھوں نے ترجمے کو بہت زیادہ
...ہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"ترجمہ کرنا درحقیقت ایک دشوار فن ہے
لیکن مجھے خوشی ہے کہ عزیزی سعادت علی صدیقی
نے اس ترکیب بند کا ترجمہ نہایت ہی خوبصورتی
کے ساتھ کیا ہے اور اس ذمہ داری کو خوش
اسلوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔ چونکہ وہ زبان کی
باریکیوں سے خوب واقف ہیں اسلئے انھوں نے
اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے کہ ترجمے سے
شعر کی اصل روح مجروح نہ ہونے پائے۔

کہیں کہیں تو یہ نثری ترجمہ اس قدر لاجواب ہے کہ
...رجم کا قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً غالب کا یہ فارسی
...عر ملاحظہ فرمائیے ؎

بہرۂ اہل جہاں چوں زجہاں درد و غم است
بہرۂ من زجہاں بیشتر آمد گوئی

...ر پھر سعادت صاحب کا یہ معرکتہ الآرا اُردو ترجمہ دیکھئے:

"دنیا والوں کی قسمت میں اس دنیا کی وجہ
سے درد و غم ہیں تو پھر میرے درد و غم کا اندازہ
نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میری قسمت میں اس
دُنیا سے زیادہ درد و غم ہیں"

...یا پھر غالب کا یہ شعر ؎

...مہ و جامہ بیارید و محمل بنویسید
خواب از بخت ہمی دام ستانم در بند

...اور سعادت علی صدیقی کا یہ منثور ترجمہ:

"قلم اور دوات لے آؤ اور یہ عجیب و
غریب بات لکھو کہ میں اپنی قسمت کی تعریف اس
قید خانہ میں بھی کرتا ہوں اور یہاں اپنے سوئے
ہوئے نصیبہ سے نیند ادھار لینا چاہتا ہوں"

لیکن "حبسیۂ غالب" کے دوسرے حصہ سے کہیں
زیادہ لائق ستائش اس کا پہلا حصہ ہے جو میری رائے میں
شروع کے نو ابواب پر مشتمل ہے اور جس کی رو سے یہ
کتاب تالیف کے بجائے تصنیف کے زمرے میں آ گئی
ہے۔ ان ابواب میں سعادت صاحب نے غالب کے
حادثۂ اسیری کو تفصیل سے بیان کیا ہے، اسکے اسباب
پر روشنی ڈالی ہے، قمار بازی کی عادت غالب کو کیوں
اور کیسے پڑی اس موضوع پر بحث کی ہے، غالب کے
زمانے کے اخبارات اور اُردو شعراء کے تذکروں میں انکی
گرفتاری کا ذکر کس کس طرح کیا گیا ہے اس کا جائزہ لیا
ہے، ان کے مقام اسیری کی جزئیات بیان کی ہیں قید خانے
میں ان کی جو کیفیت کی تھی اس کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے،
حادثہ اسیری کے جو اثرات غالب کے قلب و ذہن
اور ان کے فکر و فن پر پڑے اُنھیں صراحت کے ساتھ
تحریر فرمایا ہے اور یہ سب کچھ مختلف محققین و ناقدین
کی رائوں کے حوالے کے ساتھ ساتھ خود اپنے دماغ سے
سوچی ہوئی دلیلوں سے مزین کر کے انتہائی دلنشین انداز
میں لکھا ہے۔ چونکہ سعادت علی صدیقی آجکل پی۔ایچ۔ڈی
کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے "زندانی ادب" کے موضوع
پر ریسرچ کر رہے ہیں اس لئے یہ کام ان سے بہتر طور
پر کوئی اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔

"عیارِ غالب" کے مذکورہ بالا ابتدائی نو ابواب میں سعادت صاحب کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کے بعض ناقابلِ فراموش نمونے موجود ہیں۔

ویسے تو ایک محقق کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر ریسرچ کر رہا ہے اس سے متعلق ایسی باتیں ڈھونڈ کر نکالے جو پردۂ خفا میں ہوں لیکن ادب کے میدان کے ایک اچھے محقق میں اس کے ساتھ ساتھ دو اوصاف اور بھی ہونا چاہئے اول یہ کہ جس موضوع پر وہ تحقیق کر رہا ہے اس پر جن جن لوگوں نے جو جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے اس کو پوری طرح واقف ہونا چاہیئے اور اپنا تحقیقی مقالہ ترتیب دیتے وقت ان کی تحریروں سے مناسب و موزوں حوالے دینے چاہئیں۔

دوئم یہ کہ ان تمام تحریروں میں جن راؤں کا اظہار کیا گیا ہے انھیں الگ الگ پرکھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ان میں سے کون سی رائے غلط ہے اور کونسی صحیح، اور آخر میں خود اپنی ایک محکم رائے قائم کرنی چاہیئے۔ سعادت علی صدیقی میں ایک محقق کی حیثیت سے یہ دونوں اوصاف موجود ہیں۔

اول الذکر وصف یعنی مختلف مصنفین کی راؤں کے حوالے دینے کا بہترین ثبوت باب نمبر ۶ میں ملتا ہے جس میں غالب کے مقامِ اسیری کے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس چھوٹی سی بات کے بارے میں سعادت صاحب نے مولانا آزاد، غلام رسول مہر، شیخ اکرام، اور سر سید احمد خاں وغیرہ کی تصنیفات کے حوالے دینے کے ساتھ ساتھ خود مرزا غالب کی بیان کردہ تفصیل کا بھی ذکر کیا۔ ہے۔ علاوہ ازیں وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے نکلنے والے "اُردو معلّی کے" غالب نمبر" میں شائع ہونے والی تصاویر کا حوالہ دینا بھی نہیں بھولے ہیں۔ موخر الذکر وصف یعنی متعلقہ موضوع کی بابت راؤں کے پرکھنے اور انکے غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ ہوئے خود اپنی ایک مدلل رائے پیش کرنے کا نمونہ باب نمبر ۷ میں ہے۔ یہ باب" اسیری میں کی کیفیت" کے بارے میں ہے۔ سعادت صاحب پہلے" یادگارِ غالب" کے حوالے سے حالی کی رائے کی ہے جس کے بموجب غالب کو اسیری میں تما حاصل تھیں، کھانا کپڑا اور دوسری چیزیں حسب اُن کے گھر سے آتی تھیں اور ان کے دوست ا۔۔ بے تکلف اور بے روک ٹوک آتے تھے رہ کی اس رائے کو غلط قرار دیا ہے کیونکہ سعادت صاحب کا خیال ہے کہ

"حالی کا یہ بیان یا تو سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے یا محض غالب سے خوش عقیدگی بنا پر یہ سب لکھ دیا ہے"

سعادت صاحب کے اس خیال کا سبب حالی کا وہ ہے جو انھوں نے مولانا آزاد کے استفسار پر دیا تھا سے" یادگارِ غالب" والے بیان کی تردید ہوتی ہے بیان کو سعادت علی صدیقی نے غلام رسول مہر کی "غالب" کے صفحہ نمبر ۱۸۷-۱۸۸ سے نقل کر دیا میں کہا گیا ہے کہ ایام اسیری میں نہ صرف غالب "دوستوں اور ہم جنسیوں بلکہ عزیزوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں تھیں اور اس بات میں شرمندگی کرنے لگے تھے کہ مرزا کے عزیز قریب تصور کئے جا اس دلیل کے علاوہ سعادت صاحب نے غالب

ترکیب بند سے ایسے اشعار نقل کئے ہیں جن سے پتہ
ہے کہ "قید کے دوران ان کے احباب نے بے رخی
کرلی تھی، کوئی خبر لینے والا نہ تھا"۔ مثلاً یہ شعر ؎

خویشاں شدہ بیگانہ ز بد نامیٔ من
غیر نشگفت خورد گر غم ناکامیٔ من

ب میں سعادت صاحب نے "آبِ حیات" کے
ے سے مولانا آزاد کے اس بیان کا ذکر کیا ہے کہ جب
صاحب جیل میں تھے تو ان کے کپڑوں میں جوئیں پڑ
تھیں۔ ایک دن بیٹھے ہوئے اپنے کپڑوں سے جوئیں نکال
ے تھے کہ ایک معزز رئیس ان سے ملاقات کرنے کے
پہونچے۔ اس وقت غالب نے یہ شعر برجستہ پڑھا ؎

ہم زدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

ب حیات" کے علاوہ سعادت صاحب نے نظامی
یونی کی شرحِ کلامِ غالب کا بھی حوالہ دیا ہے کیونکہ اس
ں بھی اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں حوالوں
ے ساتھ انھوں نے غلام رسول مہر کی رائے کا بھی ذکر کیا
ہے جو اس واقعے کو "مستبعد" سمجھتے ہیں اور نہ تو مذکورہ
شعر کو غالب کا شعر سمجھتے ہیں اور نہ شعر کی شانِ نزول
قابلِ قبول تصور کرتے ہیں۔ خود سعادت صاحب نے
س ضمن میں یہ رائے پیش کی ہے کہ اس واقعے کی
صحت مشتبہ ہے"

سعادت علی صدیقی کی کتاب "حبسیۂ غالب" جہاں
ک طرف انھیں بہت اچھا محقق ثابت کرتی ہے وہاں
وسری طرف نقاد کی حیثیت سے بھی ان کی عظمت کا سکہ
جماتی ہے۔ سعادت صاحب کا تنقیدی جوہر سب سے
بہتر طور پر باب نمبر ۳ میں کھلتا ہے جو میری رائے میں
اس کتاب کا نفیس ترین باب ہے۔ اس باب میں غالب
کی قمار بازی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اُن نفسیاتی عوامل کا
جائزہ لیا گیا ہے "جنھوں نے غالب جیسے فلسفی شاعر اور
عالم کو قمار بازی اور شراب نوشی پر مجبور کردیا تھا"۔
سعادت صاحب کو سید امیر حسن نورانی کی اس رائے سے
اتفاق نہیں ہے کہ:

"بچپن کا پورا زمانہ بے فکری اور ہر طرح
کی آسائش میں بسر ہوا اس لئے ربط و ضبط بھی
بے فکرے امیر زادوں سے رہا، جس کی بدولت
بے راہ روی پیدا ہوگئی جس کا اثر کسی نہ کسی
صورت میں زندگی بھر باقی رہا"

کیونکہ بقول سعادت صاحب:

"عقلِ سلیم یہ بات قبول کرنے کے لئے
تیار نہیں ہوتی کہ بچپن کے وہ اثرات اُن داخلی
وخارجی تجربات کی وجہ سے زائل کیوں نہیں
ہوگئے جنھوں نے غالب کی فلسفیانہ اور ادبی
شخصیت کی تعمیر کی تھی"

سعادت صاحب یہ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں
کہ "غالب کی شراب نوشی، قمار بازی اور اس قبیل
کی دوسری عادتیں فی الواقع سماجی اور قانونی جرائم کا
ارتکاب کرنے کی حیثیت سے تھیں"۔ کیونکہ "ایک قد آور
فلسفیانہ شخصیت رکھنے والا انسان طبعاً جرائم پیشہ نہیں
ہوسکتا"۔ تو پھر سوال یہ اُٹھتا ہے کہ غالب کی عادت قمار

کا اصل سبب کیا تھا؟ اِس سوال کا جو جواب سعادت صاحب نے دیا ہے وہ بالکل ہی نیا اور انوکھا ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی قابلِ قبول بھی ہے۔ میں اُن کی اصل عبارت نقل کرتا ہوں (اور میری دانست میں یہ عبارت اُردو کے تنقیدی ادب میں لازوال قدر و منزلت پانے کی مستحق ہے):

"غالب ایک بلند ذہن رکھنے والے انسان ہونے کی حیثیت سے سماجی مسلمات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کی شاعری اور خطوط سے ایک آزردہ رو شخصیت سامنے آتی ہے۔ حضرت علیؓ کی تعریف سے لے کر شراب نوشی تک صرف یہی ایک قدر مشترک ہے، جس کو ہم آزادہ روی اور رندِ مشربی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس لئے غالب نے جس دن داڑھی رکھی سر کے بال منڈوا دیئے کیونکہ عام روش اس کے برخلاف تھی۔ شراب وہ اعلانیہ پیتے تھے۔ افطار سوم کی دستگاہ نہ ہونے کی وجہ سے روزہ کھاتے تھے اور یہ تمام باتیں ان کی ایسی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں جو فلسفہ کے ہر معیار سے تشکیک پسند ذہن رکھتی تھی اور اپنے قول و عمل میں مطابقت پیدا کرنا چاہتی تھی لیکن اس زمانے میں سماجی نظام کے پہرے دار غالب کی "اس تلاش" کو جو بغاوت کی سرحدوں تک نہیں پہونچی تھی برداشت نہ کر سکے اور انجام کار اس "رندِ مشرب" اور "قلندر" کو جیل خانے کی دیواروں کے پیچھے پہونچا دیا گیا۔"

● ادبی تحقیق و تنقید کے کوچے میں قدم رکھنے والا شخص اس وقت تک مکمل کامیابی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ اچھا محقق و نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ ادیب بھی نہ ہو۔ سعادت علی صدیقی زبردست تحقیقی و تنقیدی صلاحیتیں رکھنے کے ساتھ ساتھ قلم کے بھی دھنی ہیں۔ ان کی کتاب "حبسیہ غالب" میں جگہ جگہ اتنی اچھی نثر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں کہ بے اختیار منھ سے واہ نکل جاتا ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

مختصر یہ کہ "حبسیہ غالب" سعادت صاحب کی ایک انتہائی اہم تالیف و تصنیف ہے جسے بے جھجک ایک ناقابلِ فراموش کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

احسن انور ادیب

غزل

...ین منت مے ہیں یہ رتجگے میرے
تمہارے حسن جہاں سوز کی ضرورت کیا

...خود بھی گردشِ دوراں کا ہوں ستایا ہوا
اب ایسے حال میں اُن کی کروں رفاقت کیا

...ر کی ننگ پرستی ہے اور کچھ بھی نہیں
کہو اے ہمنفسو چیز ... ہے محبت کیا

...ہیں حسن کو سجدے مری نگاہوں نے
اسے جو کفر کہو تم تو ... عبادت کیا

...نغمۂ جرسِ کارواں میں کھو جائیں
وہ طے کریں گے کبھی شاہراہِ الفت کیا

...جگر کے داغو! اک بار میرے دیکھ تو لو
یہ پوچھتے ہو کہ ہے حاصلِ محبت کیا

...ر سے دور جو ہو تم تو بس غرض کیلئے
جنوں یہی ہے تو اے مردِ ہوشمند فراست کیا

اب انور اُن کے مقابل سے اٹھ کے آیا ہے
جچے گی اُس کی نظر میں جہاں کی دولت کیا

تقی شاعر (باقری)

رباعیات

(۱)
تصویر کو ہر خراش کرنا، کیا خوب؟
پھر اپنا خیال خام بھرنا، کیا خوب؟
اشعار پہ تنقید کے نشتر، تو بہ
یہ زلف کو قینچی سے کترنا، کیا خوب؟

(۲)
کیا لطف ملے گا، اسطرح، جینے سے،
کیا فائدہ؟ یوں خون جگر، پینے سے؟
جو مُرغ ٹھہرتے نہیں میداں میں کبھی
وہ لڑتے ہیں، اپنے عکس و آئینے سے۔

(۳)
جبریل صفت، مائل پرواز بھی ہوں،
بجتا ہوا اک ساز ہوں، اور راز بھی ہوں،
گنبد سے دماغ کے پکارا، مجھے کون؟
اچھا، سمجھا، خود اپنی آواز بھی ہوں،

(۴)
ہے شرط، اٹھا رسم کہیں کے پردے،
اسباب بشاشت کے اکٹھا کر دے
خواہش ہے اگر کہ ہو، ترا مہر طلوع
اُٹھ! جام شراب ارغوانی بھر دے

(۵)
کس شان سے، باریاب ہو جاتے ہیں،
برہم کُنِ اضطراب، ہو جاتے ہیں،
چلتا ہے کبھی غم، تو مسرت کے نقیب
رستے ہی میں ہم رکاب ہو جاتے ہیں

یوم آزادی کے پُرمسرت موقع پر

ادارہ **فروغِ اُردو** لکھنؤ

کی ایک یادگار اور ناقابلِ فراموش ادبی پیش کش

ماہنامہ **فروغِ اُردو** کا

عبدالماجد دریابادی نمبر

۱۵ راگست ۱۹۷۱ء کو منظرِ عام پر آرہا ہے

اس غیر فانی ادبی شاہ کار میں، اُردو کے مایۂ ناز ادبا و شعرا کی گرانقدر تخلیقات شامل ہیں

مولانا غلام رسول مہر۔ مولانا ماہر القادری، مولانا ابوالحسن علی میاں، مولانا محمد ہاشم فرنگی محلی، پروفیسر آل احمد سرور۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ پروفیسر سید احتشام حسین۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی۔ پروفیسر نور الحسن ہاشمی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ ڈاکٹر غلام دستگیر۔ حضرت ملا واحدی۔ حضرت نادم سیتاپوری۔ شاہ معین الدین ندوی۔ حضرت عبدالمنان بیدل۔ حضرت آوارہ۔ حضرت فرقت کاکوروی۔ حضرت انیس احمد عباسی۔ حضرت اشتیاق احمد عباسی۔ جناب سید شبیہ الحسن نونہروی۔ جناب سید امیر حسن نورانی۔ جناب سید اختر علی تلہری (مرحوم) جناب معین الدین حسن علوی۔ جناب غلام محمد۔ جناب حامد اللہ ندوی۔ جناب محمد ایوب واقف۔ جناب شرف الدین ساحل جناب اے ایے ندوی۔ جناب اختر بستوی۔ جناب رباب رشیدی۔ جناب ثمر بسوانی۔

کے علاوہ بہت سے دوسرے مشاہیر ادب شرکت فرمارہے ہیں۔

ترتیب کار

- ★ پروفیسر سید احتشام حسین
- ★ مولانا محمد حسین شمس علوی
- ★ حکیم عبدالقوی دریابادی
- ★ جناب سید امیر حسن نورانی
- ★ سعادت علی صدیقی

اس عظیم الشان یادگار کو فوراً حاصل کیجئے۔

اگر آپ ماہنامہ فروغ اُردو کے مستقل خریدار ہیں تو فوراً چار روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں اور اگر ابھی تک خریدار نہیں ہیں تو ۲۵ جولائی تک دس روپے منی آرڈر روانہ فرما دیجئے۔ تاکہ آپ کی خدمت میں یہ ادبی پیش کش بذریعہ رجسٹری روانہ کی جائے۔

جلدی کیجئے ورنہ کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ (ادارہ)

سعادت علی صدیقی

کتابوں کی باتیں

(تبصرے کے لیے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

عظیم اور لازوال

ترتیب و ترجمہ: عابد رضا بیدار

صفحات: ۳۲ بار دوم، سال طبع ۱۹۶۸ء قیمت: سات روپے

ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، رام پور

اس کتاب میں مندرجۂ ذیل معروف افراد کے اقوال اور تاثرات کو جمع کیا گیا ہے، ہمرشیلڈ، اقبال، رشید احمد صدیقی، جبران، نیٹشے، بھرتری ہری، معری، ہینسکا، لاؤتزے، گوتم، کامیو۔

معروف و برگزیدہ افراد کے مختصر اقوال و تاثرات جن کو عالمِ تنہائی میں قلم بند کیا جاتا ہے، واقعی عظیم اور لازوال ہوتے ہیں۔ اور ان کو غالب کے الفاظ میں "گنجینۂ معنی کا طلسم" کہنا چاہیئے۔ بیدار صاحب نے ان اقوال کو مرتب کرکے، ایک عمدہ کام کیا ہے کہ وہ اردو والے جن کی رسائی اصل تک نہیں ہو پاتی، وہ بھی اس گنج معانی سے فیض اٹھا سکیں۔ مرتب نے پیش گفتار میں لکھا ہے:

"ترجمہ ایمانداری کا فن ہے مگر بعض ترجموں میں ایمانداری اپنے ساتھ بے ایمانی کے مترادف ہو جاتی ہے خصوصاً جہاں مترجم کو مصنف کی ہر آواز اپنی گم خدہ آواز اور ہر صدا اپنی صدائے بازگشت لگتی ہو لیکن اس بے ایمانی کا کچھ اور مطلب ہرگز نہ سمجھئے۔ بلکہ صرف اتنا کہ مصنف کی آواز کو زیادہ موثر اس کے لہجے کو زیادہ پرخلوص اور اس کے جذبے کو زیادہ شدید کر دیا جائے "زیادہ" میں نے غلط کہا۔ اس کی فکر کی مناسبت سے تپاں و لرزاں!"

یہ بہت بڑا ادعا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ہمارے واقعی اچھے کام کرنے والے، اس قسم کے خالص جذباتی اور رومانی اندازِ فکر اور اندازِ بیان سے دامن کش رہیں، پڑھنے والا شروع ہی سے بدگمانی کے دھندلکے میں آجاتا ہے۔ اس قسم کے ادعا کے بغیر بھی بات کہی جا سکتی ہے مترجم نے یہ نہیں بتایا کہ رشید صاحب کے اقوال کہاں سے ماخوذ ہیں۔ ان کی کتابوں سے، خطوط سے یا یہ مرتب کی ذاتی معلومات کا نتیجہ ہیں [illegible]

اور جگہ بھی ہے جب کہ اقبال، ہمرشیلڈ اور کامیو کی ڈائریوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ بڑی کمی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ دوسروں کے اقوال کا ترجمہ کیا جائے اور جس حد تک اُس کو تخلیقی صلاحیت سے آمیز کیا جائے۔ لیکن مترجم نے جس طرح کا دعویٰ کیا ہے اس کے نتیجے میں اصل خیال سامنے نہیں آیا تا ہے۔ یا کوئی شخص یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس میں فرد کا حصہ کتنا ہے اور مترجم کا اضافہ کتنا ہے جب تک کہ وہ اصل کتاب کو سامنے نہ رکھے اور اگر اس کی ضرورت باقی رہے کہ اصل کتاب کو بھی سامنے رکھا جائے تو پھر ترجمے کا فائدہ کیا ہوا؟

کتاب جس قدر اچھی ہے اسی قدر بری چھپی ہے۔ اور اس کی ترتیب میں بے ترتیبی سی ہے۔ اس سے بظاہر یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ یہ دراصل کتاب نہیں ہے۔ بلکہ کسی رسالہ میں چھپے ہوئے مختلف مضامین کے اجزا کی شیرازہ بندی کر دی گئی ہے۔ کامیو والا حصہ تو شاید اردو ادب میں بالکل اسی صورت میں شائع ہو چکا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے اوراق کو لے کر چسپاں کر دیا گیا ہے۔ یہ بجائے خود خواہ غلط نہ ہو لیکن اس سے کتاب کی ترتیب پر بہت برا اثر پڑا کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مضمون لکھا جاتا ہے تب صرف وہ مضمون پیش نظر ہوتا ہے اور جب اس کو کتابی صورت میں مرتب کیا جاتا ہے تو اسی کے لحاظ سے ترمیم و تنسیخ ضروری جاتی ہے تاکہ سب اجزا مل کر باضابطہ کتابی صورت میں منتقل ہو جائیں۔ اس مجموعے میں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

(کتاب نما، دہلی)

۲۔ آکاش گنگا (ہندی)

شاعر: اشرف مالوی
صفحات ۴۸ قیمت ۲۵.
ناشر: آل انڈیا ہندی اُردو سنگم لکھ

آل انڈیا ہندی اردو سنگم نے مختصر سی مدت میں، قو اور زبانوں کی ایکتا اور اتحاد کیلئے قابل قدر خدمات انجام د اُردو اور ہندی کے شاعروں کو ایک دوسرے سے قریب لانے عوام سے متعارف کرانے کیلئے ادارہ کیطرف سے کئی شاندار پروگرا ہو چکے ہیں اسکے ساتھ ساتھ اُردو اور ہندی رسم خط میں، شا ادیبوں کی تخلیقات بھی شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی ہیں۔ اسی کا بھی، ادارہ کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہوئی ہے جو جانے پہچانے شاعر جناب اشرف مالوی کی نظمیں اور غزلیں ہیں، یہ مجموعہ دیوناگری رسم خط میں چھاپا گیا ہے ابتدا میں اردو سنگم کے جنرل سکریٹری جناب حیات وارثی کا پیش لفظ ہے انھوں نے لکھا ہے کہ قومی وحدت کی علمبردار آل ا اردو سنگم اردو کے ابھرتے اور نئی پیڑھی کے مانے جانے شاعر مالوی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "آکاش گنگا" پیش کر رہا ہے ہمیشہ ایسے کام کرتا رہتا ہے کہ جس سے دیش کی تمام زبانوں ا ادیبوں کے خیالات کو سمجھنے اور فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے بقول ــ "اشرف مالوی کی قومی نظموں میں ایک سچے وطن ۔ کے دل کی دھڑکنیں صاف سنی جا سکتی ہیں۔"

اشرف مالوی کی قومی نظموں کو پڑھ کر حیات وارثی صاحب اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ انکی غزلوں میں بھی پیار انسانیت، قومی وحدت اور اخوت کے خیالات نمایاں ہیں "آکاش گنگا" کی کتابت وطباعت بہتر ہے صفحات عجیب وغریب طریقے سے ڈالے گئے ہیں جس سے بڑی دشواری ہ

مطبوعاتِ ادارۂ فروغِ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت)

۱۔ اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر۔
ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۰/

۲۔ اُردو مہم نمبر۔ فروغ اُردو۔ اقبال صدیقی ۳/۵۰

۳۔ انوار اللغات۔ اُردو المعروف بہ شمس اللغات
(پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۴/۰

۴۔ ادبی تاثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/۵۰

۵۔ آئینہ عقل۔ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری ۴/۵۰

۶۔ اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۴/۵۰

۷۔ امیر خسرو اور اُن کی ہندی شاعری
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۲/۵۰

۸۔ انارکلی۔ امتیاز علی تاج ۲/۲۵

۹۔ اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ
پروفیسر کلیم الدین احمد ۴/۰

۱۰۔ اُردو میں تنقید ڈاکٹر احسن فاروقی ۳/۰

۱۱۔ انتخاب قصائد اردو مغیث الدین فریدی ۱/۵۰

۱۲۔ ادب اور نظریہ۔ آل احمد سرور ۵/۰

۱۳۔ اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبد الشکور ۴/۵۰

۱۴۔ ادبی نقوش۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ۵/۰

۱۵۔ اقبال۔ مرتبہ فروغ اُردو ۰/۵۰

۱۶۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں عبد الماجد دریابادی ۴/۵۰

۱۷۔ البرامکہ ادران کا عروج و زوال۔
ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے۔ ۲/۰

۱۸۔ انتخاب کلام میر مع مقدمہ۔ ناظر کاکوروی ۱/۰

۱۹۔ انتخاب کلام غالب۔ بشیر احمد علوی ۱/۵۰

۲۰۔ ادبی تنقید۔ ڈاکٹر محمد حسن ۴/۵۰

۲۱۔ ادب کیا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی /۵۰

۲۲۔ ادبی خطوط غالب۔ مرزا محمد عسکری /۰

۲۳۔ آئینہ نثر اُردو۔ سعادت علی صدیقی /۰

۲۴۔ ایک نادر روزنامچہ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی /۵۰

۲۵۔ ابوالبحر۔ مجنوں گورکھپوری /۷۵

۲۶۔ اُردو کی کہانی۔ سید احتشام حسین /۵۰

۲۷۔ ادبپارے حصہ نظم و نثر " " " /۷۵

۲۸۔ انتخاب نثر جدید " " " /۰

۲۹۔ ابو الکلام آزاد (نظم) جگناتھ آزاد ۲۵

۳۰۔ ارمغان نثر و نظم۔ عبد اللہ خاں خلیل /۷۵

۳۱۔ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۵۰

۳۲۔ اچھی نظمیں اخگر مشتاق ۴۵

۳۳۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد
جدید اڈیشن۔ غلام احمد فرقت /۰

۳۴۔ اُردو شاعری امیر احمد علوی /۵۰

۳۵۔ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ /۲۵

۳۶۔ حافظ، صائب، غالب فارسی ۱۰

۳۷۔ اپنی پہچان (پوری زندگی کا حال معلوم
کرنیوالی کتاب اعجاز احمد فاروقی /۲۵

۳۸۔ اللہ کے پیارے۔ امیر حسن نورانی /۵۰

۳۹۔ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو /۵۰

۴۰۔ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی۔ عبد الماجد دریابادی ۲/۵۰

۴۱۔ اسپین کی شہزادی صادق سردھنوی /۵۰

۴۲۔ ایک جان تین قالب۔ خاں محبوب طرزی /۰

۴۳۔ الفت " " /۵۰

۴۴۔ آغاز سحر " " /۰

۴۵۔ امین آباد " " /۰

۴۶۔ اپنی موج میں آوارہ /۵۰

۴۷۔ ایجادوں کی باتیں ۔ مصطفےٰ حسن رضوی ۲/۰
۴۸۔ اچھی کہانیاں (حصّہ اول) شمس الدین نوری ۲/۲۵
۴۹۔ " " (حصّہ دوم) " " " " ۳۱/۰
۵۰۔ " " (حصّہ چہارم) " " " ۵۰/۰
۵۱۔ ادب کا مقصد۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۳/۰

(ب)

۵۲۔ بابائے اردو عبدالحق۔ عبداللطیف اعظمی ۵/۰
۵۳۔ بُستان حرم (جدید نعتیہ کلام) زائر حرم حمید صدیقی ۱/۵۰
۵۴۔ شہید محبت بوٹا سنگھ خان محبوب طرزی ۴/۰
۵۵۔ بزم بے تکلف۔ ڈاکٹر سیّد عابد حسین ۲/۵۰
۵۶۔ برگ گل ۔ شبلی نعمانی ۴۰/۰
۵۷۔ بہادر شاہ ظفر ۔ امیر احمد علوی کاکوروی ۴/۸۰
۵۸۔ بہشتی ثمر (اول دوم) یعنی خلاصہ بہشتی زیور
مولانا تھانوی ۳/۷۵
۵۹۔ بانی اسلام (علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا
اُردو ترجمہ) ۷۵/۰

(پ)

۶۰۔ پطرس کے مضامین ۔ پطرس بخاری ۱/۵۰
۶۱۔ پیاری باتیں محسن کاکوروی ۲۰/۰
۶۲۔ پھولوں کا انبار (ناول) منظر سلیم ۴/۵۰
۶۳۔ پیسہ اور پرچھائیں (مجموعہ ڈرامہ) ڈاکٹر محمد حسن ۳/
۶۴۔ پاگل خانہ ، (ناول) مائل ملیح آبادی ۳/۲۵
۶۵۔ پیغام " طاہر دیالپوری ۳/۰
۶۶۔ پنجاب میں اُردو حافظ محمود شیرانی ۴/۵۰
۶۷۔ پردیسی کے خطوط (حصّہ اول) مجنوں گورکھپوری ۴/۰

۶۸۔ تاریخ ادب اُردو۔ فروغ اُردو ایڈیشن)
ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین ۸/۰
۶۹۔ تحریریں مجموعہ مضامین ڈاکٹر گیان چند ۴/۵۰
۷۰۔ تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ
فرید احمد علوی ۶۲/۰
۷۱۔ تاریخی جائزے۔ ڈاکٹر محمد یسین ۳/۰
۷۲۔ تعارف تاریخ اُردو (جدید ایڈیشن)
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/۰
۷۳۔ تاجدار مدینہ۔ اقبال صدیقی ۷۵/۰
۷۴۔ تنقیدی اصول اور نظریئے۔ حامد اللہ افسر ۴/۰
۷۵۔ تنقید و تحلیل ۔ شبیہہ الحسن نونہروی ۳/۰
۷۶۔ تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن)
سید احتشام حسین ۴/۵۰
۷۷۔ تنقیدی نظریات (جلد اول) " " ۴/۰
۷۸۔ " " (جلد دوم) " " ۴/۰
۷۹۔ تنقیدی اور عملی تنقید " " ۴/۵۰
۸۰۔ تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) ۱۹۶۴ء
آل احمد سرور ۳/۵۰
۸۱۔ ترانہائے خیام۔ ڈاکٹر رغیب حسین ۲/۰

(ٹ)

۸۲۔ ٹیگور ۔ نادم سیتاپوری ۲/۰
۸۳۔ ٹھیکرے کی مانگ۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی ۴/۰

(ث)

۸۴۔ ثنائے حبیب (نعتیہ کلام) بہزاد لکھنوی ۱/۷۵

(ج)

۸۵۔ جان غالب۔ محمد حسین شفیق علوی ۱/۵۰

۸۶۔ مومن ۔ انور سیوانی ۳/۰
۸۷۔ جواہرات انجمن۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱/۰
۸۸۔ جنگ آزادی نمبر (۱۸۵۷ء) فروغ اردو ۳/۰
۸۹۔ جنگ آزادی نمبر ۲ 〃 ۳/۰
۹۰۔ جوئے رواں (مجموعہ کلام) حلیم اللہ افسر ۲/۵۰
۹۱۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اختر بلگرامی ۳/۵۰
۹۲۔ جنگ بہنائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین ۲/۵۰
۹۳۔ جلوے معین الدین دردائی ۱/۷۵
۹۴۔ جمیلہ بوا ازی (ناول) خان محبوب طرزی ۴/۵۰
۹۵۔ جگر نمبر اول ۔ سید احتشام حسین ۶/۰

(چ)

۹۶۔ چوتھی بہن مجموعہ افسانہ۔ مسیح الحسن رضوی ۲/۷۵
۹۷۔ حیات فضل الحق خیرآبادی ۱/۲۵
۹۸۔ حالی بحیثیت شاعر (جدید ایڈیشن مع اضافہ)
(ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۲/۰
۹۹۔ حسرت موہانی ۔ عبدالشکور ۳/۵۰
۱۰۰۔ حسرت تعمیر۔ ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰
۱۰۱۔ حجاج بن یوسف ۔ جرجی زیدان ۲/۵۰
۱۰۲۔ حکیم نباتات وزیر خان لکراں ۲/۲۰
۱۰۳۔ خوش بختی کی تلاش احسن الظفر بی اے ۲/۰

(خ)

۱۰۴۔ خیالات رنگین یعنی مجموعہ مضامین فارسی (زیر طبع)
۱۰۵۔ خلاصہ شریف زادہ۔ مرزا رسوا ۱/۰
۱۰۶۔ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی
عبدالماجد دریابادی ۲/۷۵

۱۰۷۔ خضر راہ مع ترجمہ علامہ اقبال ۷۵/
۱۰۸۔ خلاصہ روح تنقید
۱۰۹۔ خلاصہ جواہر العروض
۱۱۰۔ خلاصہ المیزان ۱/۷۵
۱۱۱۔ تجلی ۔ ڈاکٹر محمد علی واحدی مع مقدمہ
حسرت تھانوی ۱/۵۰
۱۱۲۔ خلاصہ شعر الہند دوم ۱/۰

(د)

۱۱۳۔ دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۰/۰
۱۱۴۔ دیوان فغانی ۱/۵۰
۱۱۵۔ داستان سہراب و رستم مع مقدمہ (فارسی)
عبداللہ خان خلیل ۳/۰
۱۱۶۔ دیوان صفی (حصہ اول) صفی لکھنوی ۲/۰
۱۱۷۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۰
۱۱۸۔ دستہ گل ۔ شبلی نعمانی ۰/۴۰
۱۱۹۔ دوشیزۂ قلات ناول خان محبوب طرزی ۵/۰
۱۲۰۔ دلربا 〃 〃 〃 ۳/۰
۱۲۱۔ دلی کا دبستان شاعری مع اضافہ جدید ایڈیشن
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۱۰/۰

(ڈ)

۱۲۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد انوار الحسن ۷/۲۰

(ذ)

۱۲۳۔ ذوق و جستجو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۲/۵۰
۱۲۴۔ ذوق ادب و شعور۔ پروفیسر احتشام حسین ۴/۰
۱۲۵۔ ذوق جنوں مجموعہ کلام۔ آل احمد سرور ۴/۵۰

(ر)

روایت اور بغاوت۔ سید احتشام حسین ۲/۵۰

رباعیات غالب مع اُردو ترجمہ
سید امیر حسن نورانی ۳/۰

رہبر مضمون نویسی۔ شفاعت علی صدیقی ۲/۵۰

راکھی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۰/۳۷

رخسار سحر۔ انور کریم قدوائی ۱/۵۰

رفتار (ناول) ۳/۵۰

رموز حکمت مع مقدمہ اُردو۔ محمد شریف ۳/۵۰

ریاض فارسی۔ منتخب کلام فارسی ۲/۰

(ز)

زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ
مولانا تھانوی ۰/۵۰

۱۔ زینیٹوں کا بادشاہ (حکیم بانا) (مزاحیہ ناول)
علی عباس حسینی ۳/۰

(س)

۱۔ سلور کنگ ـ آغا حشر کاشمیری ۳/۰

۱۱۔ سوانح اور خاکے۔ نجم الدین نقوی ۳/۰

۱۔ سرور جہاں آبادی۔ ڈاکٹر حکیم چند نیر ۷/۰

۱۴۔ سرود نو (مجموعہ کلام) پروفیسر اختر قادری ۳/۰

۱۱۔ سنگ گہر۔ سید احتشام حسین ۳/۰

۱۴۔ ساحل و سمندر سید احتشام حسین ۵/۰

۱۱۔ سرسید احمد یا شاہ کوہ قاف کی پری
سید علی عباس حسینی ۱/۵۰

۱۲۔ سرمایہ زبان اُردو۔ جلال لکھنوی ۲/۵۰

۱۴۔ سخنہائے گفتنی ۔ کلیم الدین احمد ۵/۰

۱۲۔ سفینہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۰

۱۴۷۔ سیاحت زمین (ناول) محمود اعظم فہمی ۱/۵۰

۱۴۸۔ سید سالار مسعود غازی (حق محمود آبادی) ۳/۵۰۰

۱۴۹۔ ستاروں سے آگے۔ ناظر کاکوروی ۲/۵۰

۱۵۰۔ سنہرا حلقہ ۲/۷۵

۱۵۱۔ سرسید احمد خاں۔ انوار الحسن صدیقی ۰/۳۷

۱۵۲۔ سوشل اسٹڈی۔ احمد محسن کاکوروی ۱/۷۵

(ش)

۱۵۳۔ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) غلام احمد فرقت ۸/۰

۱۵۴۔ شرح سنگ گہر۔ عبدالقوی دریابادی ۳/۵۰

۱۵۵۔ شاہ غمگین حضرت جی۔ پروفیسر عبدالشکور ۲/۰

۱۵۶۔ شرح ادب پارے نثر ۲/۵۰

۱۵۷۔ شرح ادب پارے نظم ۳/۰

۱۵۸۔ شرح منتخبات فارسی۔ عبدالقوی دریابادی ۲/۵۰

۱۵۹۔ شبلی نعمانی ـ انوار الحسن صدیقی ۰/۳۷

۱۶۰۔ شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن)
نظم طباطبائی ۵/۰

۱۶۱۔ شاہان مالوہ یعنی گجرات کی تاریخ۔ امیر احمد علوی ۲/۵۰

۱۶۲۔ شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم
شبلی نعمانی ۲۵/۰

۱۶۳۔ شرح نثر امروز ایران احسن الظفر بی اے ۲/۰

۱۶۴۔ شرح شعر امروز ایران " ۲/۵۰

۱۶۵۔ شمع و شاعر۔ علامہ اقبال ۰/۲۵

۱۶۶۔ شرح حکیم نباتک خاں۔ نیر مسعود ۱/۲۵

۱۶۷۔ شرح انتخاب قصائد غزلیات
مطابق نصاب بی اے۔ عبدالعلیم قدوائی ۹/۰

۱۶۸۔ شرح ترانہائے خیام۔ حکیم عبدالقوی ۱/۵۰

(ص)

۱۶۹۔ صید و صیاد (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۳/۰

۱۷۰۔ صحیفۂ محبت (مہدی افادی کے خطوط) ڈاکٹر محمود الٰہی ۵/۰

(ط)

۱۷۱۔ طرزی کا نمبر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اردو ۲/۰

۱۷۲۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے — غلام الثقلین ۰/۳۰

۱۷۳۔ طلسم اسرار (ڈراما) مرزا رسوا لکھنوی ۱/۲۵

۱۷۴۔ طرۂ امیر۔ امیر مینائی منتخب کلام (جدید ایڈیشن) امیر احمد علوی ۳/۵۰

(ع)

۱۷۵۔ عذرا (ناول) صالحہ عابد حسین ۵/۰

۱۷۶۔ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) سید احتشام حسین ۴/۵۰

۱۷۷۔ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینہ میں۔ اخلاق حسین عارف ۲/۰

(غ)

۱۷۸۔ غالب کی تخلیقی تخیل۔ شہید صفی پوری ۷/۰

۱۷۹۔ غنچۂ گل۔ سید محمود الحسن رضوی ۲/۵۰

۱۸۰۔ غالب کے کلام میں لحاقی عناصر۔ نادم سیتاپوری ۴/۵۰

۱۸۱۔ خونی دروازہ ناول مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۱۸۲۔ غزلیات نظیری — ۱/۵۰

(ف)

۱۸۳۔ فن خطابت یعنی استاد تقریر۔ کلب مصطفیٰ ایڈووکیٹ ۶/۰

۱۸۴۔ فریدہ خان محبوب طرزی ۲/۰

۱۸۵۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرم علی۔ نادم سیتاپوری ۴/۵۰

۱۸۶۔ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۳/۵۰

۱۸۷۔ فلسفی ابن رشد۔ مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۱۸۸۔ فروغ جام مجموعۂ کلام۔ نشور واحدی

۱۸۹۔ فغان محسن۔ محسن کاکوروی

۱۹۰۔ فارسی آموز۔ مشیر احمد علوی

۱۹۱۔ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد

(ق)

۱۹۲۔ قدر بچے جدیدیت پر مزاحیئیں غلام احمد فرقت

۱۹۳۔ قصائد خاقانی

۱۹۴۔ قصائد ظہیر فاریابی

۱۹۵۔ قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی

۱۹۶۔ قطرے سے گہر ہونے تک۔ صالحہ عابد حسین

۱۹۷۔ قدر و نظر ڈاکٹر اختر اورینوی

۱۹۸۔ قرآنی مسائل۔ عبدالماجد دریابادی

۱۹۹۔ قصائد قاآنی۔ (فارسی)

۲۰۰۔ قومی ادب نثر و نظم۔ حامد افسر

۲۰۱۔ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) (خان محبوب طرزی)

(ک)

۲۰۲۔ کیسر اور کاہی بدرالدین طیب جی ۱/۰

۲۰۳۔ کلبۂ گلفروش (مزاحیہ مضامین) (غلام احمد فرقت) ۱/۰

۲۰۴۔ ۱/۰

(گ)

۲۰۵۔ گلبانگ حرم مصور مقامات مقدسہ کے فوٹو زائر حرم حمید لکھنوی ۱/۰

گلدستہ فارسی اول دوم ۱/۶۰
گلزار فارسی یعنی آمد نامہ /۴۰
گلہائے ادب۔ عبدالاحد خاں خلیل ۲/۰
گاندھی جی کے ساتھ۔ حامد اللہ افسر ۱/۵۰

(ل)

۱۔ لوائح جامی مع مقدمہ عبدالاحد خاں خلیل ۱/۲۵
۔ لال قلعہ مائل ملیح آبادی ۶/۰
۔ لب بام عادل رشید ۵/۰
۔ لسانیات اور اردو۔ سید محمود حسن رضوی ۲/۰
۔ مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو غلام احمد فرقت ۸/۰

(م)

۲۔ مسلمان اور کانگریس۔ ابوالکلام آزاد ۲/۵۰
۲۔ مرثیہ نگاری اور میر انیس۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۳/۵۰
۲۔ مضامین فرحت (حصہ اول) مرزا فرحت اللہ بیگ ۳/
۲۔ مضامین فرحت (حصہ دوم) " " " ۳/۰
۲۔ ماضی کی کہانیاں۔ آفتاب اختر تلہری ۲/۵۰
۲۔ بیرسے اسٹیج ڈرامے۔ ڈاکٹر محمد حسن ۴/۰
۲۔ موسم گل (ناول) عادل رشید ۶/۰
۲۔ مجبور " خان محبوب طرزی ۴/۵۰
۲۲۔ مضامین جدیدہ محمد بادی ۱/۲۵
۲۲۔ مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ قدرت اللہ بیگ ۲/۵۰
۲۲۔ مطالعہ شبلی۔ ناظر کاکوروی، شجاعت علی سندیلوی ۴/
۲۲۔ مطالعات شبلی۔ جالب مظہری ۲/۵۰

۲۲۷۔ مثنویات حالی۔ ناظر کاکوروی، شجاعت علی سندیلوی ۲/۵۰
۲۲۸۔ مطالعہ حالی " " " ۴/۵۰
۲۲۹۔ میٹھے بول " " ۱/۲۵
۲۳۰۔ مولوی نذیر احمد کی کہانی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۰
۲۳۱۔ معرکہ دوم دیوانان صادق سردھنوی
۲۳۲۔ مصنوعی چاند۔ خان محبوب طرزی ۴/۰
۲۳۳۔ مقدمہ شعر و شاعری (مطابق نصاب بی اے) حالی ۱/۲۵
۲۳۴۔ مرثیہ غالب " ۰/۲۵
۲۳۵۔ محبوبہ کربلا جرجی زیدان ۳/۵۰
۲۳۶۔ معاد مائل ملیح آبادی ۲/۵۰
۲۳۷۔ مولانا حالی انوار الحسن صدیقی ۰/۳۷
۲۳۸۔ مہاراج بلی ڈاکٹر احسن فاروقی ۲/۰
۲۳۹۔ مطرملائی لوک جھوک۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ۰/۷۵
۲۴۰۔ مجذوب اور ان کا کلام مولانا رضا انصاری ۱/۵۰
۲۴۱۔ مصباح بلاغت مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۲/۰
۲۴۲۔ مطالعہ سودا ڈاکٹر محمد حسن ۳/۰
۲۴۳۔ مزاحیہ شرح دیوان غالب۔ غلام احمد فرقت ۸/۰
۲۴۴۔ مقدمات و مقالات عبدالاحد خاں خلیل ۵/۵۰
۲۴۵۔ منتخب سوانح اور خاکے۔ نجم الدین نقوی ۳/۰
۲۴۶۔ نثر امروز ایران ڈاکٹر رغیب حسین ۳/۰

(ن)

۲۴۷۔ نشاط غالب۔ وجاہت علی سندیلوی ۱/۵۰
۲۴۸۔ نقد و انتقاد۔ اعجاز احمد معجز ۲/

۲۴۹۔ نقش حالی اول دوم یعنی حالی بحیثیت شاعر
ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ شجاعت علی سندیلوی ۱۲/-
۲۵۰۔ نغمۂ کوہسار۔ خان محبوب طرزی ۲/۰
۲۵۱۔ لغات الہند مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۲/۰
۲۵۲۔ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی کبیر احمد جائسی ۲/۰
۲۵۳۔ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ حامد اللہ افسر ۳/۰
۲۵۴۔ نیا راستہ (ناول) خان محبوب طرزی ۳/۵۰
۲۵۵۔ نوروز ،، مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
۲۵۶۔ نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ) ۴/
آل احمد سرور
۲۵۷۔ نقوش و افکار۔ مجنوں گورکھپوری ۴/۵۰
۲۵۸۔ نیلم انتصار حسین ۳/۰
۲۵۹۔ نذیر احمد کی کہانی۔ فرحت اللہ بیگ ۱/۰

۲۶۰۔ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی
عبدالاحد خان خلیل

(ھ)

۲۶۱۔ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے
علی عباس حسینی

۲۶۲۔ ہندی کے مسلمان شعرا۔ امیر حسن نورانی
۲۶۳۔ ہمارا جھنڈا حامد اللہ افسر
۲۶۴۔ ہندوستان شاہراہ ترقی پر۔ منظر سلیم
۲۶۵۔ ہندوستان کا تیرا منصوبہ ،، ،،

(ی)

۲۶۶۔ یادگار غالب مولانا حالی
۲۶۷۔ یاقوتی (ناول) خان محبوب طرزی
۲۶۸۔ یادگار انیس۔ امیر احمد علوی

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دسویں یا تیس تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی۔ ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھئے۔

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ کا آنا ضروری ہے۔

۱۸ شمارہ ۴ تا ۶
رجسٹرڈ نمبر: ایل ۲۰
نس نمبر: ۲۰۱۸۱۶۴ / ۲۰۶۴۱۷
فون نمبر ۲۶۱۳۵

ادارۂ فروغ اردو ہند کا علمی و ادبی ماہنامہ

فروغ اردو لکھنؤ

اگست تا اکتوبر ۱۹۷۱ء

باعزازی:
پروفیسر سید احتشام حسین

ادارت:-
محمد حسین شمس علوی
عبدالقوی دریابادی
سعادت علی صدیقی

مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر

سالانہ: چار روپے
فی پرچہ: ۳۷ پیسے

مرتبین

۱۔ حکیم عبدالقوی دریابادی
۲۔ سید احتشام حسین
۳۔ محمد حسین شمس علوی
۴۔ سید امیر حسن نورانی
۵۔ سعادت علی صدیقی

شر:-
ادارۂ فروغ اردو
۲۷ امین آباد پارک لکھنؤ - ۱

قیمت عبدالماجد نمبر نو روپیہ

سید انصار حسین پروپرائٹر پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا

ضروری گذارش

اگر آپ ابتک ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ کے خریدار نہیں بنے ہیں
تو آپ کا فرض ہے کہ اُردو زبان کی بقار اور اُس کے
تحفظ کے لئے
اسکے خود خریدار بنئے اور اپنے اُردو دوستوں اور مخلصوں کو
خریدار بنائیے
کیونکہ اُردو زبان کی بقار کی خاطر ہم سب کا فرض ہے کہ درمے
دامے درمے خدمت کریں
اس وقت یہ سنہرا موقع ہے کہ
آپ نو روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر ما جد نمبر
جس کی قیمت نو روپیہ ہے
وہ حاصل کیجئے
اور اسکے بعد ہر ماہ ایک سال تک ماہنامہ فروغ اُردو کو زیر مطالعہ رکھئے
(مینجر)

فہرست مضامین

محمد حسین شمس علوی

اپنی باتیں

رسالہ فروغ اُردو خود ستائی کے طور پر نہیں، اظہار واقعہ کی حیثیت سے یہ یاد دلانا ضروری سمجھتا ہے کہ اس وقت تک جتنے مفید اور خیال افروز خاص نمبر شائع کئے ہیں، انھیں ارباب نظر سے سند تحسین ملی ہے اور اُسے اُمید ہے کہ اگر قدر دانیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا تو ادارہ ابھی اور بہت سے نمبر شائع کرے گا۔ ہم اُردو کے خدمت گزار ہونے کی حیثیت سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم پر اُردو کے اُن ادیبوں کا قرض ہے جن کے رشحاتِ فکر سے ہمارے ذہنوں کی جِلا ہوئی ہے، ہمارے قلب میں روشنی آئی ہے اور ہمارا ادبی سرمایہ وسیع ہوا ہے، اسے ادا کرنے میں اپنے اہم ادیبوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے افکار و خیالات اُن کے ادبی تصورات اور علمی نظریات کی ترویج و اشاعت بھی کرسکیں گے۔

اِس وقت اُردو کی علمی دنیا میں چند ہی نام ایسے ہوسکتے ہیں جنھیں محترم مولانا عبدالماجد دریا بادی کا ہم سر اور ہم پایہ قرار دیا جاسکے۔ ہمیں یہ سعادت حاصل ہورہی ہے کہ ہم رسالہ فروغ اُردو کا ایک ضخیم شمارہ ان کے لئے مخصوص کردیں، یہ آرزو تو بار بار دل میں کروٹیں لے چکی تھی اور کبھی کبھی دوستوں اور ہمدردوں کے سامنے لبوں تک بھی آئی تھی لیکن کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل آئی کہ ہم خاموش رہ گئے۔ کبھی یہ خیال رکاوٹ بنا کہ شاید ہم مولانا موصوف کی شخصیت کے شایانِ شان مضامین فراہم نہ کرسکیں کیونکہ ہمارے بہت سے نقاد اور ادیب صرف انھیں موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں جو بازار میں فیشن کی

رائج ہیں۔ کبھی یہ خوف دامنگیر ہوا کہ ممکن ہے مولانا کی بے نیاز اور
ط پسند طبیعت اسے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھے۔ کبھی اس احساس نے
ایا کہ آخر رسالہ کے خریداروں کے ذوق کو بھی تو پیشِ نظر رکھنا ہے۔
نہ ہو کہ انھیں اس سے دلچسپی نہ ہو، لیکن یہ خیال ہر وہم و گمان پر حاوی
کہ مولانا عبدالماجد ہمارے جن بزرگ، ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں
عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور تقریباً نصف صدی
بس طرح کتنیت علم و ادب کو سینچ رہے ہیں، اُس کو دیکھتے ہوئے
ہی کوئی ایسا احسان فراموش ہو جسے اُردو زبان کی ترقی بھی عزیز ہو اور
غ اُردو کے عبدالماجد نمبر کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھے۔ بہرحال
یہ نمبر نکالنا اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ہم موصوف کی علمی و ادبی خدمات
تراف کرنا چاہتے ہیں۔
اس کا پختہ اور مصمّم ارادہ کرلینے کے بعد ہم نے اس مخصوص نمبر کا
کردیا مقالہ نگار حضرات کی خدمت میں قلمی اعانت کے لئے خطوط بھی
یے اور اپنی جگہ پر یہ سوچ کر خوش رہے کہ ہم ایک علمی خدمت انجام
رہے ہیں لیکن ہر خاص نمبر کی طرح اس کے لئے بھی مواد کی فراہمی ایک
زما مہم بن گئی۔ مولانا کے بعض قدر دانوں نے تو ہماری آواز پر فوراً لبیک
ور اپنے گراں قدر مضامین روانہ کردیے لیکن بہت سے ایسے ادیبوں نے
پر ہمیں مکمل اعتماد تھا ہمارے صبر و تحمل کا سخت امتحان لیا اور یاد دہانیوں
باوجود بہت دیر میں توجہ کی۔ شائد یہ دیر آید درست آید کا مصداق
ور اس نمبر کو زیادہ دلکش اور مفید بنانے میں معین ہو۔ اس لئے ہم
ت نہیں کرتے بلکہ غالبؔ کا یہ شعر پڑھ کر شکوہ و شکایت کا باب ہی
کر دیتے ہیں ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہئے

میرے لئے یہ نامناسب ہوگا کہ میں اس شمارۂ خصوصی کی اہمیت

اور انفرادیت کا تذکرہ نہ کردوں، تمام مضامین جو اس میں شامل کئے گئے ہیں اپنے انداز میں دسعا طرف اشارہ کرتے ہیں اور سب مل کر مولانا عبدالماجد در کو ایک جامع الصفات عالم کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ہمیں اس با کا احساس ہے کہ مولانا کی شخصیت اور مختلف الجہات علمیت کا احاطہ ا مضامین سے بھی نہیں ہوسکا ہے بلکہ بعض پہلو اکثر مضامین میں تکرار کی حا دہرائے گئے ہیں لیکن ایک رسالہ کے لئے لکھے ہوئے مضامین میں ایسا ناگزیر ہے۔ مختلف ارباب قلم مختلف اوقات میں آزادانہ لکھتے ہیں اور انکا خیالات میں توارد کا واقع ہونا قرین قیاس ہے اس لئے ان مضامین کا م انھیں حدوں کے اندر کرنا چاہیئے۔ اُن تمام حضرات کا شکریہ فرداً فرداً ادا ممکن نہیں ہے لیکن میں ان میں سے ہر ایک کا شکر گزار ہوں اور خاص ان بزرگوں کا جنھوں نے دُور رہ کر بھی ہم پر کرم کیا ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ اِس نمبر میں مولانا کی تحریروں کا ایک اچھا انتخا بھی شامل ہوگا تاکہ اِس کی اہمیت میں اضافہ ہوجائے لیکن جب ہم ۔ اِس قصد سے انتخاب کا کام شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ اس کے لئے بڑی درکار ہوگی کیونکہ ہر کتاب ہر مضمون اور ہر تحریر میں ایسے ادبی شہ پارے موجود ہیں جنھیں انتخاب میں جگہ نہ دینا ظلم ہوگا۔ تاہم نمونتہً کچھ شاہکار محت تحریروں سے چُن کر پیش کئے گئے ہیں۔

مجھے یہ مخصوص شمارہ پیش کرتے ہوئے یہ اطمینان ہے کہ ہم نے ا طرف سے اِسے جامع اور بہتر سے بہتر بنانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔

Photograph taken on the occassion of the Marriag Ceremony of Janab Abdul Majid Daryabadi

at Civil Military Hotel, Lucknow on 4th June 1916.



Right to Left:

Sitting on Chairs: Molvi Tajammul Karim Qidwai, Vakil, Molvi Masud Ali Nadvi Bhayar Maulana Abdul Bari Nadvi, Maulana Syed Suleman Nadvi, Maulana Abdul Majid Daryabadi, Justice Syed Karamat Husain, Maulana Abdul Halim Sharar, Syed Sajjad Haider Yaldram, Dr. Naziruddin Hasan Naziryar Jung

Standing R. to L.: Mohib Ali, Anis Ahmad Abbasi, Mushtaq Mustafa Gadevi, Dr. H. Ha Syed, Hafiz Mohammad Yunus Daryabadi, Ahmad Karim Daryabadi Judge



Left to Right Ambassador of Saudi Arabia, Maulana Abul Hasan Ali Nadvi and Maulana Abdul Majid, Daryabadi.
(BHOPAL 1971)

بدالماجد دریابادی

غُبارِ کارواں

یہ مضمون اپنی سوانح پر خود مولانا کے قلم کا ہے جو ماہنامہ 'آجکل' دہلی میں نکلا تھا۔

لکھنؤ سے پورب کی جانب فیض آباد کو ریل سے چلئے،
جو اودھ کا دارالحکومت رہ چکا ہے۔ شجاع الدولہ
کے زمانہ تک۔ تو آدھوں آدھ پر ایک اسٹیشن ملے گا،
دریاباد۔ اسٹیشن سے ڈیڑھ دو میل دور شمال میں چلئے
تو اصل قصبہ میں پہونچ جائیے۔ اودھ کے قصبات میں
تھوڑی بہت امتیازی حیثیت رکھے ہوئے۔ شروع
انگریزی حکومت میں بجائے بارہ بنکی کے یہی ضلع
تھا۔ اب ضلع کیا معنی تحصیل بھی نہیں۔

قصبہ کی بنیاد، آج سے کوئی ۵½ سو سال قبل
شاہان شرقیہ جون پور کے زمانہ میں پڑی۔ اسوقت
ان اطراف کے حاکم کوئی صاحب دریا خاں نامے تھے
وہی میرے خاندان کے مورث اعلیٰ شاہ مخدوم محمدؐ
آبخش خلیفہ ابوالفتح کان پوری کو ایک متصل قصبہ
محمود آباد سے لے آئے اور اپنے نام پر قصبہ کو آباد کرایا۔

اس قصبہ کے ایک قدوائی خاندان میں اس ننگ
خلائق کی پیدائش وسط مارچ ۱۸۹۲ء میں ہوئی سنہ
ہجری کا مہینہ شعبان کا تھا۔ رانگریزی کی تاریخ بھی غالبًا
۱۲ ارتھی) نام ابھی قدوائی خاندان کا آیا ہے۔ دو لفظوں میں

اس کی بابت بھی سُن لیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے بزرگ
قاضی معزالدین تھے۔ جنھیں لوگ احترامًا قدوۃ العلم
والدین کہتے تھے۔ قاضی قدوہ اسی کا مخفف ہے مشہور
ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے ہم عصر تھے۔ ہندوستان
آکر قصبہ اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں آباد ہوئے۔
(اجودھیا ہی کا دوسرا نام اودھ ہے) اور اُن کی اولاد اودھ
کے قصبات میں پھیل گئی۔ بڑا گاؤں، ہگدر، مسولی، رسولی،
جگور، بھیارہ وغیرہ میں اب تک اُن کی آبادیاں موجود
ہیں۔ ہمارے نسب ناموں میں اُن کا اسرائیلی ہونا درج
ہے۔ حضرت ہارون کی نسل سے تھے جن کا سلسلہ بائبل
میں دیئے ہوئے شجرہ کے مطابق لاوی بن یعقوب پر ختم ہوتا
ہے۔ اودھ کے عربی النسل شیوخ (صدیقی، عثمانی وغیرہ)
بلکہ سادات تک نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور مناکحت
کے رشتے ان سے کثرت سے قائم کئے۔

میرے دادا چار بھائی تھے۔ منجھلے کا نام [illegible]
کریم تھا۔ بڑے کا نام مولوی حکیم نورکریم تھا۔ جو میرے
حقیقی نانا بھی تھے۔ اُن کی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا
اور طبیب سے بڑھ کر طبیب گر کی حیثیت سے شہرت پائی۔

مگر علاج اور مطلب ایک خاص سن آجانے کے بعد قطعاً چھوڑ دیا تھا[1]۔ اور مشغلہ صرف مدرسی کو بنا لیا تھا۔ ساتھ ہی خطاط و خوشنویس بھی اعلا درجے کے تھے۔ خدا جانے کتنی کتابیں تاریخ، حدیث، تفسیر، لغت وغیرہ ہر علم و فن کی اپنے ہاتھ سے نقل کر ڈالیں، متعدد اب تک موجود ہیں۔ تالیف و ترجمہ سے بھی ذوق تھا۔ دو کتابیں زیادہ مقبول ہوئیں، ایک شفاء الامراض، دوسرا ترجمہ مخزن الادویہ۔ سالِ وفات ۱۸۷۱ء۔

دادا صاحب اپنے وقت کے ایک جید فقیہ و عالم تھے۔ تحصیل علم فرنگی محل (لکھنؤ) میں مولوی عبدالحکیم صاحب سے کی۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت شاہجہاں پور میں کلکٹری میں سررشتہ دار تھے۔ الزام ان پر یہ لگا (خدا معلوم صحیح یا غلط) کہ باغی اُن کے مکان پر جمع ہو کر بغاوت کے لئے منصوبے بناتے تھے۔ اور یہ مذہبی فتوے دے دے کر اُنھیں ورغلاتے تھے۔ بعد ختم شورش غدر مقدمہ چلا اور اسپیشل کمشنر شاہجہاں پور کی عدالت سے اُنھیں ۱۸۵۹ء میں نو سال کی سزا عبور دریائے شور (عوامی زبان میں کالے پانی) کی ہوئی اور ہندوستان کے متعدد علماء مثلاً مولوی فضل حق خیرآبادی اور قاضی عنایت احمد (مصنف تواریخ حبیب اللہ) وغیرہ کا ساتھ رہا۔ اور اُن کو خود بھی کوئی عہدہ "محرری" کا دیا گیا (اس سے صحیح کیا مراد تھی یہ تو معلوم نہیں، لیکن بہرحال تھی تو لکھنے پڑھنے ہی کی شکل) وغیرہ رہ کر اُنھوں نے کی لغت، جغرافیہ کی مشہور کتاب مراصد الاطلاع کا اردو ترجمہ بھی کر ڈالا۔ اس کا قلمی نسخہ اُنھیں کے قلم کا یہاں محفوظ ہے چھپا ہوا نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایک مخلص نے ابھی کئی سال ہوئے اطلاع دی کہ اُس نے ایک نسخہ انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں دیکھا قیدیوں کو "خوش اطواری" کی کچھ چھوٹ بھی ملا کرتی ہے اس بنا پر اُنھیں بجائے کُل پورے سات سال جلاوطن رہ کر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں پروانۂ رہائی مل گیا اور وطن آ کر فتویٰ نویسی وغیرہ میں مشغول رہ کر وفات سنہ ۱۸۹۰ء میں پائی۔ پانچ لڑکیوں کے علاوہ اُن کے دو فرزند تھے بڑے عبدالرحیم، چھوٹے عبدالقادر ہیں انھیں کی اولاد کی چھوٹی اولاد ہوں۔ ایک بھائی اور ایک دونوں مجھ سے بڑے تھے۔ بھائی عبدالمجید مرحوم آٹھ سال مجھ سے عمر میں بڑے تھے، لیکن اتنے کے باوجود میں ان سے بڑا بے تکلف تھا۔ بچارے کے مریض بچپن سے رہے باضابطہ تعلیم صرف انٹرنس تک پائی۔ یہ بھی اس زمانہ کے معیار سے کچھ کم نہ تھی باقی کتب بینی سے اپنی استعداد ہر قسم کی بڑھائی اور اشعار کے لئے کہنا چاہیئے کہ حافظ تھے خصوصاً مولانا اور مولوی ظفر علی خاں کے کلام کے بیاض تحصیلداری

[1] مطب چھوڑنے کا سبب بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ فرنگی محل سے بڑے خصوصی تعلقات تھے ایک مرتبہ وہاں سے طلبی آئی، دسمبر کی سردی تھی اور رات کا وقت جاڑوں کا پانی برس رہا تھا کوئی سواری بھی اس وقت نہ ملی پیدل چلے گئے۔ واپسی میں جوڑوں اور ٹانگوں میں شدید درد پیدا ہو گیا بس اسی وقت سے عہد کر لیا کہ پیشہ چھوڑے دیتا ہوں۔ جب تک پیشہ کروں گا کہیں اور کسی وقت جانے سے انکار کیسے کروں گا۔

اردو
ت میں داخل ہوئے اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر
پنکر پنشن لی۔

۱۹۴۴ء میں کچھ دن سٹی مجسٹریٹی بھی کی۔ یہ عہدہ ایک
ہی اہمیت رکھتا تھا۔ خاصے مذہبی تھے۔ نماز کے پابند
المزاج، اور لوگوں کے بڑے ہمدرد، خصوصاً کنبہ
ں کے ساتھ ... پنشن کے بعد بھی مسلمانوں کے عام
ی کاموں میں پوری دلچسپی لیتے رہے۔ بہن اس میں ۴۵
ں بڑی تھیں۔ اور بڑی عابدہ صالحہ تھیں۔ گویا معصوم
ت، شادی چچازاد بھائی ڈاکٹر محمد سلیم کے ساتھ
ی۔ اولاد کوئی نہیں ہوئی اپریل ۱۹۴۵ء میں وفات
والدِ ماجد کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنا تھا۔ اس لئے اسے
موخر کر دیا ہے۔

اُن کا سالِ پیدائش ۱۸۴۸ء تھا تعلیم حسبِ رواج
ی و عربی کی اچھی خاصی پائی۔ زیادہ تر فرنگی محل میں
ھا۔ اور مولوی محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے عقیدت
کر دانہ آخر تک رہی۔ بڑے سن پر پہنچ کر انگریزی
بھی بہ قدر ضرورت تحصیل کر لی تھی۔ ملازمت کی ابتدا
ول کی مدرسی سے ہوئی۔ کسی انگریز حاکم کو پڑھایا۔
نے خوش ہوکر عدالت میں سررشتہ دار بنا دیا۔ اس سے
ں کر کے تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ ڈپٹی کلکٹری
زمانہ میں معراجِ ترقی تھی۔ پنشن کے وقت سیتاپور
تھے۔ نماز، روزے، مختصر وظیفے کے پورے پابند
علمی صحبتوں کے حریص تھے اور کتابوں کے علاوہ
ر بھی خوب پڑھا کرتے۔ بعد پنشن لکھنؤ کے اردو روز
ہ آندھ اخبار میں مضمون نگاری بھی کرتے رہے۔

۱۹۱۲ء میں بیوی، لڑکی وغیرہ کے چھوٹے سے
قافلے کو لے کر حج کو گئے اور معاً بعد فرائضِ حج ۱۱ یا ۱۲
ذی الحجہ کو ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۳، ۱۴ ذی الحجہ کو
عین فجر کے وقت داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہوئے رخصت
ہو گئے قطعہ تاریخ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کہا۔ آخری شعر تھا
اسقدر مصروفِ ذکر و شغل تھے 'شغل' ہی سے نکلی تاریخِ وفات

(۱۳۳۰ھ)

نکاح، سگی چچازاد بی بی نصیر النساء کے ساتھ ہوا تھا۔ اُن کو میں
نے جب دیکھا تہجد گزار پایا قرآن مجید ناظرہ پڑھی ہوئی تھیں
تلاوت کسی حال میں ناغہ نہ ہوتی۔ ۱۹۴۱ء میں وفات پائی
۸۲-۸۳ سال کی عمر میں۔

دستور برادری اور گھرانے میں پانچویں برس بسم اللہ
خوانی کا تھا۔ اپنی عمر ابھی چوتھے ہی سال اور ۱۸۹۵ء
تھا کہ بسم اللہ کرنا طے پا گئی۔ والد مرحوم لکھیم پور کھیری
میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ایک سہ پہر کو محفل آراستہ ہوئی
اور وطن کے ایک خوش اوقات و خوش صفات عالم
صاحب، جو بھائی صاحب کی اتالیقی پر مامور تھے۔
وہ زنانہ مکان کے صحن میں بسم اللہ کرانے بیٹھے مٹھائی
کے خوان سامنے رکھے ہوئے اور عزیزوں، نوکروں
چاکروں کا گروہ حلقہ جمائے ہوئے۔ مولوی صاحب
بچارے نے پیار و شفقت کے لہجہ میں کہا کہو بسم اللہ
یہاں جواب میں قطعی خاموشی۔ اب اور لوگ بھی اُن کے
شریک کار ہوئے لیکن اس ضدی لڑکے کی زبان پر تو
قفل لگا ہوا تھا۔ والد مرحوم کو آخر غصہ آیا۔ اور کچھ تک

نہ آتا۔ سمجھانے، بجھانے، پچکارنے کی حد ہو چکی تھی چھوٹی
ہاتھ میں لے اُنھوں نے جمانا شروع کر دی۔ لوگوں نے
ایں بایں کر کے کسی طرح جان بچائی، چلمنوں کی آڑ
سے والدہ بے خبر یہ تکلیف دہ تماشا دیکھتی رہیں اندر بلایا
سمجھایا۔ آخر میں جو میری کھلائی تھیں اُن بچاری نے
ہا کہ دولہ میرے بھتیا کو کیا بسم اللہ کہنا آتا نہیں۔ میں نے
ہا آتا کیوں نہیں، بس میں اُن کے ساتھ جا، مولوی صاحب
کرنے کے باہر ہی سے اُنھیں چلا کر سُنا آیا۔ اُداسی
شی سے بدلی، چہروں پہ ہنسی اور مسکراہٹ آ گئی۔
ی کو کہتے ہیں۔

"ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو؟"

زندگی کا یہی سب سے پہلا اہم واقعہ ہے۔

گھر پر قرآن مجید ناظرہ اور فارسی کی وہی تعلیم رہی
ا کا اُس وقت شریف مسلمانوں کے ہاں رواج تھا۔
دو میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈریں اپنے
میں بہترین کتابیں تھیں۔ فارسی میں گلستاں، بوستاں
سکندر نامہ پڑھا، اور امام غزالی کی فارسی کتاب
ئے سعادت بھی جو اپنے فن کی بہترین کتاب ہے۔
اوّل تو اتنی کم سنی میں پڑھنے اور سمجھ میں آنے
ابل نہیں، دوسرے اس کا پڑھانا بھی ہر اُستاد کا کام
اور ہاں اسی اعلیٰ کتاب کے پہلو بہ پہلو وہ گندی
یوسف زلیخا بھی پڑھنا پڑی، صرف اس لئے
منسوب ملّا جامی کی طرف ہے عربی کی شُد بد شروع
تھی کہ اسکول میں عربی لے لی۔ اب سن کوئی ۱۱/۱۲ *
کا تھا۔ پڑھائی سیتاپور کے ہائی اسکول میں ہو رہی

تھی۔ عربی کے پہلے اُستاد لکھنؤ کے ایک ذی استعداد شخص
حکیم محمد ذکی مرحوم تھے۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے کچھ
بعد فرنگی محل کے ایک ذی علم اُستاد مولوی عظمت اللہ
مرحوم آگئے۔ عربی ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی آئی۔ اُن کی
بدولت آئی، بڑے شفیق بھی تھے اور قابل و فاضل
بھی۔

اسکول کا ہر درجہ کھٹا کھٹ پاس کر کے ۱۹۰۷ء
میں دسویں میں آ گیا۔ ہاں حساب میں بہت ہی کمزور تھا
اور یہ کمزوری اپنوں ہی کے ہاتھ آئی تھی۔ اپنے بھائیوں
ہی نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب ساتویں سے جامیٹری
اور الجبرا بھی پڑھو گے اور حساب تو مسلمانوں کو آتا نہیں
اب دیکھنا ہے کہ تم کیسی پوزیشن حاصل کرو گے یہ سُن
سنا کر واقعی ہمت پست ہو گئی اور نفسیاتی مرعوبیت
ایسی غالب آ گئی کہ اِدھر حساب کا سوال سامنے آیا اور
اُدھر دل کانپنے لگا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی
لال ایک دانشمند اُستاد تھے اور مجھ پر بہت عنایت
کرنے والے اُنھوں نے یہ دیکھ، میرے ہی ایک اچھے ہندو
ساتھی کو حکم دیدیا کہ اُنھیں اسکول کے بعد آدھ گھنٹے کے
لئے روک کر اس میں سوال حساب کے کرا دیا کرو تاکہ ان
کی جھجک مٹ جائے اور ہمت کھُل جائے۔ اس ساتھی
بچارے نے یہ فرض تن دہی سے ادا کیا اور بعد کو جب
میں نے کچھ نقدی بطور معاوضہ کے دینا چاہی تو کسی طرح
اُسے قبول نہ کیا۔ حالانکہ بچارے کی معاشی حالت خاصی
مندی کی سطح تک پہونچی ہوئی تھی شرافت کسی خاص
قوم و مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں۔ خیر دسواں سکینڈ ڈویژن

پاس ہوگیا۔ اسکول کی تعلیم ختم کرکے جولائی ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوا۔ انٹرمیڈیٹ میں منطق انگریزی مضمون نگاری میں بہت اچھا رہا۔ انگلش ...ڈی میں کمزور سے عربی میں اوسط درجہ کا رہی لے میں تو سائیکلوجی میں نام پیدا ہوگیا۔ اور انگریزی مضمون ...اری میں بہت اچھے نمبر ملنے لگے ۱۹۱۲ء میں بی اے سکنڈ ڈویژن پاس کرلیا۔ ایم اے فلسفے کا انتظام لکھنؤ میں نہ تھا۔ علی گڑھ گیا۔ وہاں انتظام تو تھا مگر کچھ یوں ہی سا زیادہ جی نہ لگا اور کورس کی ایک کتاب تو دستیاب نہ ہوئی ۱۹۱۲ء میں امتحان دینے الہ آباد گیا (علیگڑھ اس وقت تک محض کالج تھا یونیورسٹی نہ تھا) وہاں مولانا ...لی کے بھائی منیر صاحب نامور ایڈوکیٹ کے ہاں ٹھہرا امتحان میں ناکام رہا۔ اسباب ناکامی کا ذکر کچھ غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا۔

۱۹۱۳ء میں میں ایم اے کرنے دہلی گیا سینٹ اسٹیفن کالج میں داخل ہوا۔ والد مرحوم کا انتقال ۱۹۱۲ء کے آخر میں ہو چکا تھا۔ اور اب جو کچھ گھر میں روپیہ تھا ایک چلتے ہوئے بنک میں جمع تھا۔ اتنے میں خبر آئی کہ وہ بنک ٹوٹ گیا اور جو روپیہ اس میں تھا وہ ڈوب گیا۔ اپنا دل دہلی سے اچاٹ اور لکھنؤ کے لئے بیتاب تھا ہی، اس لیے بہانہ ہاتھ آگیا اور ایم اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ لکھنؤ واپس آگیا۔ خیال یہ قائم کیا کہ دو برس کے عرصے میں انگریزی رسالوں میں مقالے فلسفہ پر لکھ کر ایم اے کی ڈگری کا کفارہ کرلوں گا۔ لڑکپن کی نادانیاں اور خوش خیالیاں!

اب تلاش معاش شروع ہوئی۔ بڑی امید اس کی تھی کہ اپنے ہی کیننگ کالج میں فلسفہ منطق کے جونیر لکچرر کی جگہ پر آ جاؤں گا۔ پرنسپل ڈاکٹر کیمرون بھی بہت خوش تھے مگر امید بر نہ آئی تقرر ایک دوسرے صاحب کا ہوگیا۔ ریلوے اور ڈاکخانے میں کچھ مناسب جگہیں نکلیں کوشش کی اور ریلوے کے لیے تو راجہ صاحب محمود آباد نے زبردست سفارش کی۔ بے سود رہی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری بابائے اردو مولوی عبدالحق بہت کام آئے۔ بابائے اردو نے بعض انگریزی کتابوں کے ترجمے معقول اجرت پر کرانے شروع کر دیئے۔ یہ امداد بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ اس سے ذرا قبل مولانا شبلی مرحوم اپنی زیر تصنیف سیرۃ النبی کے سلسلے میں انگریزی مآخذوں کی تلاش کے لئے گھنٹے دو گھنٹے کام کے لئے پچاس روپیہ ماہوار دیتے تھے۔

والد صاحب کے انتقال سے آمدنی کا اصلی ذریعہ تو بند ہی ہوگیا تھا۔ بھائی صاحب کی تنخواہ نائب تحصیلداری کی خود ہی قلیل تھی۔ پورے خاندان کا اسی سے خرچ چلانا دشوار ہو رہا تھا۔

۱۹۱۱ء تھا، جون میں شادی ہوئی۔ خرچ کا بار قدرتاً بڑھ گیا تھا۔ علی گڑھ کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے توقیر افزائی فرمائی اور کانفرنس میں بطور لائبریری اسسٹنٹ کے بلالیا۔ تنخواہ پونے دو سو ماہوار، مکان بلاکرایہ۔ یوں بھی تنخواہ وقت کے معیار سے بے جا نہ تھی اور پھر میں تو حاجت مند بھی تھا۔ صاحبزادہ صاحب بڑی شفقت و عنایت سے پیش آتے رہے لیکن اُسے کیا کیجیے کہ ٹیڑھا لگا تھا قلم سر نوشت کو

لازمت بہر حال ملازمت تھی۔ طبیعت ہر قسم کے قید و
ندکو بار سمجھ رہی تھی، تیار نہ ہو پائی اور دو ہی مہینے
کے بعد اندر خرابی صحت کا بہانہ کر کے وہاں سے استعفا
دے دیا۔

۱۹۱۸ء آگیا۔ حیدرآباد میں عثمانیہ یونی ورسٹی کی
اغ بیل پڑی اور اس کے لئے بطور پیش خیمہ ایک نیا
محکمہ سرشتۂ تالیف و ترجمہ کھلا۔ مولوی عبدالحق صاحب
کی نظامت میں، اور میں اس کے لئے بہ حیثیت مترجم
صفہ مقرر ہوا۔ تنخواہ کا آغاز تین سو سے ہوا۔ یعنی آج
کے ۱۹۶۶ء کے تین ہزار کے مساوی گیا اور گیارہ مہینہ وہاں
قیام کیا۔

طبیعت کی بے قیدی یہاں بھی رنگ لائی۔ خیالات
بھی الگ ملحدانہ تھے۔ دکن کی مذہبی صحافت کو (جیسی
کہ بھی وہ تھی) ایک موقعہ شدید نکتہ چینی کا ہاتھ آگیا
۔ب خوب حملے ہوئے۔ یکم ستمبر ۱۹۱۹ء کو یہاں پہونچا
تا آخر جولائی ۱۹۱۸ء تک مشکل سے نباہ کیا پھر چھٹی لیکر
لکھنؤ آیا اور یہاں سے استعفا بھیجدیا۔

۸-۱۰ مہینے پھر بیکاری میں گزرے۔ عرض حال لکھ
سر امین جنگ چیف سکریٹری پیش گاہ مبارک
خدمت میں بھیجا۔ یہ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں
پھر بہت ہی مہربان رہے تھے۔ کئی ہفتے کے بعد
کا تار آیا کہ نظام دکن کی خدمت میں پیش ہونے
لئے تیار ہو کر آجاؤ۔ گیا۔ اب کی سرکاری مہمان کی
حیثیت سے نواب صدر یار جنگ صدر الصدور امور مذہبی
یہاں ٹھہرایا گیا۔ پیشی ہوئی اور کوئی ۴۵ منٹ تک

باریابی رہی۔ ۱۲۵ روپئے ماہوار کی پنشن تاحیات منظور
ہوئی۔ اور کام صرف مولانا شبلی کی طرح کتابوں کو سلسلہ
آصفیہ سے منسوب کر دینا۔ ظاہر ہے کہ اس سے آسان
تر صورت اور کیا ہو سکتی تھی۔ قیام کی کوئی قید نہیں،
جہاں چاہوں رہوں۔

۱۹۴۲ء میں یعنی اجرائے پنشن کے ۲۰، ۲۲ سال بعد جب
روپئے کی قیمت گھٹ گئی تو یہ رقم بھی عملاً اپنی چوتھائی
رہ گئی۔ اب صدر اعظم نواب امین الملک سر مرزا محمد اسمٰعیل
تھے۔ ہوش بلگرامی میرے قدیم مہربان اب نواب ہوشیار
جنگ تھے اور اعلیٰ حضرت کے مقرب خاص۔ انھوں نے
میرا معاملہ سر امین الملک کے سامنے پیش کیا اور اس میں
اضافہ ہو کر پنشن اب دوسو ماہوار ہو گئی۔ دو ہزار کی رقم
نقد عنایت ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں جب پولیس ایکشن ہوا اور سلطنت
آصفیہ مٹی یہ پنشن بھی بند ہو گئی۔ یہاں سے مولانا ابوالکلام
وزیر تعلیمات نے لکھا پڑھی کی۔ آخر میں خود پنڈت جواہر لال
نہرو نے لکھا، جب جاکر ۱۹۵۱ء میں بحال ہوئی۔ پوری رقم دوسو
کی نہیں بلکہ وہی قدیم ایک سو پچیس (۱۲۵) کی جزوی بحالی کے
بعد رقم خزانہ حیدرآباد سے منتقل ہو کر اب خزانہ لکھنؤ میں
آگئی اور اب تک یہیں سے مل رہی ہے۔

پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ جہاں کوئی چیز چھپی
ہوئی سامنے آئی، عام اس سے کہ رسالہ ہو یا کتاب
یا اخبار یا اشتہار، بس اسے پڑھنا شروع کر دیا۔
رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں، ساتویں درجہ میں تھا۔

رعمر کے بارہویں سال میں کہ اودھ اخبار (لکھنؤ) میں
سلے اور مضمون بھیجنے لگا۔ نام سے نہیں کسی فرضی نام
، اور یہ زیادہ تر والد ماجد کے ڈر سے تھا' اور کچھ
ِ طبعی شرمیلے پن سے بھی۔ آٹھویں درجہ میں پہونچا،
یک کتاب ہی مرتب کر دی۔ عیسائیوں کے جواب میں
لوی محمد علی رحمۃ مونگیری بانیٔ ندوہ) ایک ماہنامہ
لتے تھے تحفۂ محمدیہ کانپور سے۔ بس انہیں سے مضامین
ذ کر لئے گئے تھے۔ گورکھپور کے ایک وکیل صاحب
ے مولوی احسان اللہ عباسی چریا کوٹی 'ان کی کتابیں
ں خوب پڑھ لیں تھیں الاسلام وغیرہ۔ اس سے بھی
لے کر مضمون لکھا کرتا تھا۔ وقت کے چلے ہوئے عنوانات
ور دائرہ اب اودھ اخبار سے وسیع ہو کر ریاض
خبار (گورکھپور)، اور اخبار الاسلام (امرتسر) تک بڑھ گیا
اتھا۔

ایک چھوٹا سا کلب بھی بعض سینیر لڑکوں اور
ہر والوں سے مل کر قائم کیا تھا۔ فرینڈز کلب کے نام
ے ایک آدھ ہندو بھی اس کے ممبر تھے' اس کے
نہ دار جلسے بھی ہمارے ہی ہاں ہوا کرتے۔ علاوہ دوسرے
چوں کے علی گڑھ منتھلی بھی اس میں آتا تھا' آدھا اُردو
آدھا انگریزی میں۔ ایک آدھ مقالہ بھی اس کلب
ُ سنایا۔ انگریزی کتابیں اسکول لائبریری سے لایا کرتا
ننہ میں لکھنؤ مستقل طور پر آ گیا۔ کالج میں پڑھنے لگا
ب بینی اور رسائل بینی وسیع ہو گئی تھی، اب ملک بھر
ے رسالے اور اخبار رفاہِ عام لائبریری، ایڈورڈ کیتھ
لائبریری اور سب سے بڑھ کر کیننگ کالج لائبریری

سب کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ سنہ ۱۰ء میں جب سے
امیر الدولہ پبلک لائبریری کھل گئی، اُس کے چکر
متواتر اور کثرت سے لگنے لگے۔ لائبریری ہی میں اگر
کبھی چھٹی ہوتی تو وہ دن بہت کھلتا اور طبیعت دن بھر
بے چین رہتی۔ کالج ڈبیٹنگ کلب میں تو خود کبھی زیادہ
نہیں بولا۔ البتہ دوسرے مقرروں کو برابر مدد دیتا رہتا
مسلمانوں کا ایک سنجیدہ سہ روزہ امرتسر سے وکیل نامی
نکلتا تھا۔ سنہ ۸ء، سنہ ۹ء میں اس میں بھی دو لمبے مضامین
لکھے ایک کا عنوان تھا محمود غزنوی اور دوسرے
کا غذائے انسانی۔ بعد کو وکیل بک ایجنسی نے انھیں
کو رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا اور اُن کی خوب
دھوم رہی۔

سنہ ۱۰ء تھا کہ لکھنؤ کے نئے ماہنامہ الناظر میں
مولانا شبلی کی الکلام پر تنقیدی نظر کے عنوان سے
ایک مقالہ لکھا اور اُس کے بڑے چرچے اُس زمانے
میں رہے پھر الناظر سے تو جیسے مستقل تعلق ہو گیا۔
برسوں اسی میں مضمون نکلتے رہے۔ کچھ نام سے اور
کچھ فرضی ناموں سے۔ الہ آباد سے ایک ادبی ماہنامہ
آب و تاب سے ادیب کے نام سے نکلا تھا اس میں بھی
سنہ ۱۲ء، سنہ ۱۳ء میں مضمون لکھے۔ الندوہ (لکھنؤ) کا معیار
بہت بلند تھا۔ سنہ ۱۲ء میں اس میں ایک آدھ مضمون
انگریزی سے ترجمہ کر کے دیا اور اس کے مضمون نگاروں
کی فہرست میں اپنا نام دیکھ لیا۔

کالج چھوڑنے کے بعد مستقل قیام لکھنؤ
میں رہا۔ لکھنؤ اپنا وطن بن چکا تھا۔ مضمون نگاری کے

اُردو، انگریزی دونوں میں رہا۔

معارف میں مضمون تو شروع ہی سے نکلنے لگے تھے ۱۹۱۷ء میں اس سے باضابطہ ادارتی تعلق پیدا ہو گیا جو غالباً ۱۹۲۲ء تک قائم رہا۔ مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کی نگرانی ۱۹۲۵ء سے اپنے ذمہ رہی باقی اس سے گہرا ادبی تعلق شروع ہی یعنی ۱۹۱۳ء سے تھا۔

۱۹۲۵ء سے اپنا ہفتہ وار لکھنؤ سے سچ کے نام سے نکالا پہلے ظفر الملک علوی کی شرکت میں اور پھر اپنا کر لیا۔

ایک دوست نے اسی زمانہ میں فرمائش کی جدید تعلیم کے طریقوں پر ایک چھوٹا سا رسالہ لکھ دو۔ اس وقت تک عادت رات کو کام کرنے کی زیادہ تھی ایک رات کو اور زیادہ جاگ کر چند گھنٹے کے اندر مسودہ تیار کر دیا "فرائض والدین" کے عنوان سے ایک "خادم تعلیم" کی طرف سے نقد نقد معاوضہ اسی وقت ہاتھ آ گیا۔ ان دنوں میں ادیب، معارف وغیرہ بھی معاوضہ دیتے تھے۔

فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع اسی دور کی تصنیفات ہیں (فلسفۂ اجتماع کو بعد میں اپنی فہرست تصانیف سے خارج کر چکا ہوں) برکلے فلسفی کے مکالمات کا ترجمہ شائع کر دیا دار المصنفین ہی اسی عہد کا یادگار ہے۔ لیکی کی "ہسٹری آف یورپین مارلس" کا ترجمہ تاریخ اخلاق یورپ (دو جلدوں میں) اور بکل کی "ہسٹری آف سویلیزیشن ان انگلینڈ" (تاریخ تمدن انگلستان) کی تین جلدوں میں سے بیشتر حصہ کا ترجمہ یہ سب اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ آمدنی کا ذریعہ بس یہی رہ گیا ایک گم نام ڈرامے کا ذکر رہا ہی جاتا ہے ۱۹۱۵ء میں پشیمان کے نام سے "ناظر" کی طرف سے شائع ہوا اس کا ابتدائی مسودہ ریل کے ایک سفر میں لکھنؤ سے بمبئی تک میں تیار ہو گیا تھا

حیدرآباد میں جب یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے اخیر ۱۹۱۸ء تک رہا تو ایک فاصی ضخیم کتاب منطق پر تیار کی نام تھا ایک پرانی کتاب کی نظرثانی کا، لیکن نظرثانی ہی میں گویا وہ ایک نئی کتاب ہی بن گئی۔ وقت رہ گیا تھا اس میں اپنے فن سے باہر ایک تاریخ یورپ کے ترجمہ کا تکملہ کر دیا یہ دونوں کتابیں سررشتۂ ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے چھپیں۔

اگست ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ میں واپس آ گیا اور اب مستقل تصنیف و تالیف کا دور شروع ہو گیا۔ پہلے ایک چھوٹی سی کتاب تحفۂ خسروی چھپی ہے یہ محض ایک مجموعہ قرآن، حدیث، اور سعدی وغیرہ کے اقتباسات کا شعر و ادب کے علاوہ تمامتر مغربی فلسفہ کے ماہرین کے افکار زیر مطالعہ آئے۔ برطانوی فلسفی اسپنسر، مل وغیرہ تو گویا لوک زبان تھے ۱۹۱۲ء کے نصف آخر میں مطالعہ غیر مسلم فلسفہ و تصوف کا شروع ہوا، ہندو فلسفہ، بدھسٹ فلسفہ، چینی فلسفہ وغیرہ انگریزی کے ذریعہ سے۔

ہندو فلسفہ میں علاوہ گیتا کے انگریزی ترجموں کے مسز بسنٹ، بھگوان داس، آربندو گھوش وغیرہ کی تصنیفوں کا مطالعہ رہا۔ ماہنامہ صبح اُمید (لکھنؤ)

مون نگاری اسی رنگ کی شروع کی اور پھر مثنوی کے مطالعہ نے گویا اس پر مہر لگادی اور مولانا شبلی [illegible] النبی کی جلد اول بھی اس میں بڑی معین ہوئی۔ کا رنگ سا دوسرا ہو گیا۔ نفسیات مغربی کا غیر مختصر [illegible] بھی قلم کا موضوع تھا۔ مبادی فلسفہ [illegible] فلسفہ کی پہلی کتاب اور مبادی فلسفہ، فلسفہ کی دوسری [illegible] سب اسی رنگ کی نکلیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے [illegible] رامپور، پشاور، علی گڑھ میں پڑھے ہوئے [illegible] کی صورت میں شائع ہوئے قصص و مسائل، اسلام کا پیام تمدن اسلام کی کہانی جدید قصص الانبیاء، انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن دونوں کا ولولہ با وجود [illegible] کم استعداد کے پیدا ہو گیا چھ سات [illegible] کی محنت میں کام ختم ہوا اور تاج کمپنی لاہور نے [illegible] کا پی رائٹ خرید لیا۔ پھر اردو تفسیر کی [illegible] اور پہلے ایڈیشن کے بعد، توفیق الٰہی نے [illegible] نظر ثانی معقول و معتدبہ اضافہ کے ساتھ، دوسرے [illegible] کے لئے دستگیری کی، پہلی جلد اس کی نقل ہے اور دوسری جلد بھی ان شاء اللہ آج ہی کل میں آنے والی ہے۔ پانچ جلدیں اس کے بعد بھی باقی رہیں گی اس کی طبع و اشاعت کا اللہ ہی مالک ہے مطالعہ [illegible] کے سلسلہ میں چھوٹے بڑے رسالے بھی کئی نکل [illegible] تاج کمپنی (کراچی) نے انگریزی میں محض ترجمہ [illegible] تفسیر کی فرمائش ابھی دو ہی چار سال ہوئے اور جوں توں فرمائش پوری کر دی گئی۔ ترجمہ کی [illegible] قسط یہاں سے اکتوبر ۴۹ء میں روانہ کی گئی۔ شروع

۱۹۳۰ء میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی مرحوم نے مدراس مدعو کیا کہ کسی قرآنی موضوع پر چھ لکچر آکر دیجئے۔ چنانچہ موضوع تقریباً اچھوتا اور جدید "سیرت نبوی قرآن سے" اختیار کیا گیا اور فرمائش پوری کر دی گئی۔ لکچروں کے دو ایڈیشن نکل چکے ایک اور کتاب بھی تمام تر قرآن سے ماخوذ اسی زمانہ میں تیار ہو گئی۔ بشریت انبیاء کے نام سے یہ موضوع بھی اب تک تقریباً اچھوتا ہی رہا ہے اور عین ان سطور کی تحریر کے وقت ایک دوسری فرمائش بھی لکچروں کی مدراس سے آئی ہے۔ اب کے موضوع اختیار کیا گیا ہے "مشکلات قرآن" یا "قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں۔ یہ انتخاب اپنی تفسیر ہی سے ہوگا۔ اور اس کے خصوصی نکتے ان لکچروں میں ترمیم و تصرف کے بعد پیش کر دئے جائیں گے۔

تفسیر ماجدی کے دوسرے ایڈیشن کی باقی جلدیں اپنی زندگی میں دیکھ لوں، یہی بات بڑی اور غیر معمولی سی بات ہوگی۔ ہر جلد پر مصارف اتنے آرہے ہیں کہ اللہ اگر ایک مخلص و سرتاپا خیر بندے کو آگے نہ کر دیتا تو کوئی صورت ہی طبع و اشاعت کی نہ تھی۔

مذہبی تحریروں کے ذکر کی رو میں یہ ذکر رہ ہی گیا کہ ادبی اور شعری ذوق بھی اس دور میں فنا نہیں ہوا۔ بلکہ برابر باقی ہی رہا۔ حضرت اکبر سے جو عقیدت رہی وہ خود ایک مستقل عنوان گفتگو

ہو سکتا ہے۔ بہرحال کئی مضمونوں اور مضمونچوں کا مجموعہ اکبرنامہ کے نام سے اس درمیان میں شائع ہو گیا۔ انشائے ماجد جلد اول و جلد دویم اور نشریات ماجد جلد اول کے نام سے کئی مجموعہ تیار ہو کر شائع ہوئے۔ شخصیات میں جو عقیدت حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد علی سے رہی اُس کا ذکر آگے آ رہا ہے؛ بہرحال حکیم الامت کے نام سے ایک جلد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی نذر ہو چکی اور محمد علی ذاتی ڈائری، کے عنوان سے دو جلدیں محمد علی کی۔

ایمان و عقیدہ کی دنیا میں بار بار تبدیلیاں ہوئیں بچپن بھر اور شروع جوانی میں سخت مذہبی رہا۔ عمر کے ترھویں سال سے اسلامیت میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا، انگریزی کتابیں پڑھ پڑھ کر۔ ان میں سے کسی میں اسلام پر حملہ براہ راست نہ تھا۔ بس ایسے معلومات و افکار جمع کر دیئے گئے، جن سے زد جا کر اسلام پر پڑتی تھی۔ مثلاً رسولؐ اسلام کا فوٹو ایسا شائع کرنا (ایک مستند قلمی مرقع کے حوالے سے) جس میں شکل و صورت سے، بجائے کسی قسم کی نرمی اور نرم دلی کے تمام تر خشونت اور اکھڑپن برس رہا ہو اور عبا کے ساتھ کمر میں تلوار پڑی ہو اور کاندھے پر تیر دکمان! اور اس پر ستم انگریزی کی ایسی کتابیں ڈاکٹری یا نفسیات کے موضوع پر، جن میں ضمناً یہ درج ہو کہ مرگی یا ہسٹریا کی ایک قسم ایسی ہے، جسے لوگوں نے "وحی" سے موسوم کیا ہے اور دوسری طرف وہ کتابیں جن میں نفس مذہب پر حملہ ہے .... عبادات، عصمت، ضبط نفس نفس کشی کی ہر صورت پر چھینٹے ہیں، اور اسراف حظ نفس، شہرت رانی کی حمایت کر کے اُن کی تبلیغ؛ حوصلہ افزائی کا حق ادا کر دیا گیا۔ ان سب کا یہ ملا کر نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت اسلام کی طرف سے برگشتہ ہو گئی۔ اور نفس بہ جائے الحاد و ارتداد کا چل گیا۔ بے تکلف لندن کی ریشنلسٹ ایسوسی ایشن کا ممبر بن گیا۔ اور اپنے کو کھلم کھلا ریشنلسٹ (عقلیت پسند) یا "ایگناسٹک" (لا ادری) کہنے لگا یہی غنیمت ہوا کہ سوشل حیثیت سے مسلمان اس وقت بھی رہا۔ یعنی مسلمانوں سے وہی میل جول، وہی مسلم برادری، وہی مسلم معیشت۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک یعنی سترھویں سال سے لے کر ستائیسویں سال کی عمر تک یہی انداز فکر رہا۔ مغرب کی ٹھیٹھ مادیت کا بُت ہندو فلسفہ کے مطالعہ سے ٹوٹا۔ اور رد حانیت کے نام سے چڑھ اور بیزاری نہ رہی۔ ڈیڑھ دو سال اسی حالت میں گزرے اور ۱۹۲۰ء سے کہنا چاہئے کہ مرتد از سر نو اسلام لے آیا۔

دورِ ظلمت سے دورِ ہدایت تک پہونچنے میں جن حضرات سے مدد ملی ان میں ایک امتیازی درجہ مشہور شاعر حضرت اکبر الٰہ آبادی کا ہے۔ حکیم و عارف تھے کن کن لطیف حیلوں بہانوں سے مجھے رُشد و ہدایت کی طرف لاتے رہے۔ دوسرے رہبر اس سلسلے میں مولانا محمد علی تھے۔ ان سے مجھے محبت ہی نہیں، عشق تھا یہ ہر طرح ڈانٹ ڈپٹ کر میری اصلاح کے پیچھے پڑے رہتے۔ ہندوؤں میں بنارس کے فاضل

[redacted]

غی درویش یا بھگوان داس کی باتیں بھی بڑی
ملحانہ رہیں اور اس سلسلہ میں نام گاندھی جی کا
ں آتا ہے۔ چھوٹے بڑے ہادی و رہنما اور بھی
ہے۔ قسمت نے یاوری کی کہ مولانا اشرف علی
ۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رسائی ہو گئی۔ جہاں
رنگ سب سے نرالا تھا۔ یہاں سے جو کچھ پایا۔ بس
پنے ظرف کا منتہاد ہی تھا۔

شوق اسکولی زندگی میں تھوڑا بہت کرکٹ
اور ٹینس کا بھی رہا۔ لیکن زیادہ دلچسپی فٹ بال سے
رہی اور اس میں بس اوسط درجہ کا کھلاڑی سمجھا جاتا
رہا کہ کالج میں آتے آتے پڑھنے کی ایسی لت پڑ گئی
کہ شام کے کھیل کا وقت بھی پڑھائی کی نذر ہو گیا
کھیلنے دوڑنے کا کوئی وقت ہی باقی نہ رہا۔ ادھیڑ
سن کے وقت تک ورزش پر مطلق توجہ نہ کی، ۵۰
سال کے بعد خیال آیا اور صبح تڑکے قبل فجر دوڑ
کی مشق شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فائدے سے زیادہ
نقصان ہاتھ رہا۔

آخر میں سخت قسم کی ورزشوں سے توبہ کی
اور ہلکی ورزش صبح ٹہلنے اور چلنے کی رکھی۔ مدتوں یہ
معمول رہا۔ اب کئی سال سے یہ بھی چھوٹ گیا ہے صحت
بحیثیت مجموعی اچھی ہے۔ بیمار نسبتاً کم ہوتا ہوں کھانا
ہر قسم کا بڑے شوق سے کھا لیتا ہوں۔ چائے ایک
زمانہ میں بہت زیادہ پینے لگا تھا اب نسبتۃً کم کر دی
... ... اور سن کے تقاضے

سے گراں گوشی پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس سے کہیں بڑھ
کر تکلیف دہ ضعف بصارت ہے، اس کا سب سے
تباہ کن اثر خط پر پڑا ہے۔ اپنا خط خود نہیں پڑھ
پاتا ہوں۔ لکھنے میں کثرت سے حروف چھوٹ جاتے
ہیں اور دور کی چیز تو بالکل ہی نہیں دیکھ سکتا ہوں۔

رات کو لکھنے پڑھنے کا کام سالہا سال سے
بند ہے، اس ضعف بصارت کی وجوہ، لڑکپن اور نوجوانی
میں بڑی ہی بے احتیاطیاں تھیں۔ ناکافی اور
دھندلی روشنی میں برابر مطالعہ کرتا رہتا تھا اور کبھی
لیٹ کر بھی اس کا خمیازہ جوانی ہی میں بھگتنا پڑا بول کر
لکھانے کی عادت نہیں۔ قلم جب ہاتھ میں آ جاتا ہے،
تب ہی دماغ چلتا ہے۔ بڑا وقت خط و کتابت کی نذر
ہو جاتا ہے لوگ عجیب عجیب سوال لکھ بھیجتے ہیں مثلاً یہ کہ
لوگ عمر فاروق کو فاروق اعظم کیوں کہتے ہیں۔ کیا کوئی
دوسرے فاروق بھی ہوئے ہیں اور یا یہ کہ حضرت یوسف
سے شادی کے وقت بی بی زلیخا کا کیا سن تھا اور ان
سے اولادیں کتنی ہوئیں۔ وغیرہ مروت میں اکثر جواب
دینا ہی بنتا ہے۔ کوئی اسسٹنٹ یا معاون پاس نہیں۔
کتابیں مکان کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔
انھیں اٹھا کر لانا اور حوالہ ڈھونڈھنے میں بڑا ہی
وقت نکل جاتا ہے۔

شادی ہمارے ہاں ماں باپ کی پسند اور
مرضی ہی سے ہوا کرتی ہے اور اکثر خاندان ہی کی کوئی
لڑکی اپنے عزیز سے منسوب ہو جاتی ہے یہی نسبت
بھی اسی طریقہ سے بچپن ہی میں طے شدہ تھی اور گویا

کسی نے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ جب میں کالج میں پڑھنے لگا تو خیالات میں انگریزیت کے ساتھ اس باب خاص میں بھی "صاحبیت" نے زور کیا۔ لڑکی میں اور کوئی برائی نہ تھی صورت شکل میں اوروں سے بہتر تھی۔ لیکن رہتی دیہات میں تھی شہر کی آب و ہوا سے ناآشنا۔ اور اپنے نزدیک نقطۂ عیبوں کا ایک عیب یہی تھا جب بی۔ اے کر چکا پھر والد ماجد کچھ دن بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔

والدہ ماجدہ کے کانوں تک یہ خبر اپنی نارضامندی کی پہونچا دی۔ وہ بیچاری بہت دق رہ گئیں کہ لڑکی والوں کو اب کیا منھ دکھاؤں گی۔ لیکن قدرت کا انتظام دیکھئے کہ عین زمانہ میں ایک دوسری عزیز لڑکی نظر کے سامنے آگئی میری ایک حقیقی خالہ کی پوتی تھی۔ عمر میں مجھ سے دو ہی چار سال چھوٹی رنگ روپ کی اچھی نکھری۔

اور بڑی بات یہ کہ قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہتا تھا۔ باضابطہ تعلیم تو کچھ ایسی ہی رہی۔ البتہ معاشرت بالکل شہری لکھنؤ میں قصباتی آداب سے خوب واقفیت وضع لباس، چال ڈھال سب شہریوں کی سی۔ بس یہ لڑکی دل میں کھُب گئی۔ بہن بھاوج، والدہ سب ڈر رہی تھیں کہ خدا معلوم کس کرسٹان عورت کو گھر میں لے آؤں۔ اس انتخاب کی خبر سن کر سب باغ باغ ہو گئیں۔ باقاعدہ پیام کا خط ادھر سے گیا اور اب حسب دستور پردہ ہو گیا۔ اتفاقات عجیب [illegible] کبھی کسی عزیز قریب کا انتقال کبھی کچھ اور۔ دن ٹلتے رہے اور مزاق کی مدت مشکل ہو گئی اشتیاق بڑھتا گیا اور محبت بڑھ کر ... کے درجہ تک پہونچ گئی یا آخر شروع جون ۱۹۱۲ء عقد خاصے دھوم دھام سے لکھنؤ میں ہو گیا مکان کاپاندے میں تھا۔ جائیداد وہیں تھی۔ والد شیخ پورہ آنریری مجسٹریٹ اور رئیس تھے۔ بیوی جو آئیں تو مقبول ہر دلعزیز۔ خاصی خوشحال تھیں۔ مگر میرے ہا[ں] عین اس زمانہ میں تنگی اور ان بیچاری نے بڑے [صبر] دشکر کے ساتھ قناعت کی زندگی اختیار کر لی۔ ا[پنے] برتاؤ سے سب کو خوش رکھا۔ خود مجھ سے البتہ کبھی جنگ ہو جاتی تھی زیادہ تر مالی معاملات [پر] بحیثیت مجموعی زندگی بڑے سکھ کی تھی۔ درمیان میں ایک حاجت مند اور صاحب اولاد بیوہ سے میں[نے] عقد ثانی بھی کر لیا تھا اکتوبر ۱۹۳۲ء میں۔ لیکن نباہ ان سے عرصہ تک نہ ہو سکا۔ ہر فریق کو کوفت ہی کوفت رہا کی۔ مجبوراً جون ۱۹۳۲ء میں نرم الفاظ میں طلاق نامہ بھیج کر باقاعدہ علیحدگی اختیار کر لینا پڑی گو تھوڑی بہت خدمت کی توفیق اس کے بعد بھی ان کی زندگی بھر ہوتی رہی اگر اس باب میں کوئی زیادتی یا ستم رانی میری طرف سے ہوئی تو اللہ معاف فرمائے۔

اولادیں ہوئیں تو متعدد، زندہ چار ہی ہیں۔ چاروں لڑکیاں گھر ہی پر ان کو کچھ تعلیم دے دلا کر شادیاں، چاروں مناسب سن والے [illegible]

[illegible]

جون ۱۹۱۲ء سے دسمبر ۱۹۶۸ء تک کا زمانہ بڑی ازدواجی مسرت وکامیابی کا گزرا جس حد تک مسرت اس عالم ناسوت میں ممکن ہے۔ (صحت بیچاری کی خاص طور پر خراب رہا کی بلڈ پریشر، وجع مفاصل شدید امراض کی شکار رہیں پھر بھی میرے لطف و مسرت میں کوئی فرق نہیں، اور طویل مدت مفارقت کو تو میں نے کبھی جانا ہی نہیں اور حق رفاقت جس طرح انھوں نے ادا کیا کم ہی کسی کو اس کا موقع ملتا ہے۔ دسمبر ۱۹۶۸ء میں بھتیجے الزماں ایڈوکیٹ باندے کی لڑکیوں کی شادی باندے میں تھی بڑے شوق سے بلائی گئیں۔ اور بڑے شوق سے گئیں میں وقت پر میں بھی عقد میں شرکت کے لیے گیا۔ دو دن کے بعد میں آگیا خیال یہ تھا کہ ہفتہ عشرہ کے بعد یہ بھی واپس آجائیں گی ۔ ۲۶ جنوری کو دن [illegible] واپس پہنچ گیا۔ میں بیٹھا قرآن مجید [illegible] کام کر رہا تھا کہ بے ساختہ دکھائی ایک موٹر عین دروازے پر آکر رکی اور میرا دل دھک سے ہو گیا۔ معاً آواز حلیم سلمہ کی آئی اور دل میں بجلی سی کوند گئی کہ کوئی شدید واقعہ پیش آگیا اور یہ مجھے بلانے کو آئے ہیں۔ کمرے میں داخل ہوئے اور روتے ہوئے بولے کہ جو کچھ میں کہنے آیا ہوں وہ کس زبان سے کہوں۔ میں نے دو سکنڈ کے تامل کے بعد جواب دیا۔ الحمد للہ۔ اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی اور بہترین وقت واپس لی ہے پھر انھوں نے رو رو کر تفصیل بیان کی کہ ۔ رات کو بارہ بجے مرحومہ کو قلب کا دورہ [illegible] لگے بھتیجے موجود

تھے۔ انھوں نے گولیاں دیں کچھ اثر نہ ہوا۔ دوڑ کر انجکشن لائے۔ اتنی دیر میں دو مرتبہ کلمہ شہادت پڑھ کر یہ رخصت ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کہ دوا کا وقت گزر چکا تھا۔ باندے سے ٹرنک کال پر یہ اطلاع ۸ بجے صبح لکھنؤ ہوئی۔ موٹر آپ کے لئے لایا ہوں۔ گرتا پڑتا پہلے لکھنؤ میں پہونچا۔ مولانا علی میاں ندوی، مولانا محمد اویس ندوی نگرامی اور مولوی ہاشم فرنگی محلی گھر پر تعزیت کو موجود تھے۔ سہ پہر لاری میں خاندان بھر کو ساتھ لے کر ۸ بجے شب کو باندے پہونچا اور گھر میں قدم رکھ کر وہ منظر دیکھا کہ اب کیا بیان ہو۔ گزری جو کچھ گزرنا تھی، آہ وہ کفن پوشی کی جامہ زیبی جنازہ قبرستان لے جایا گیا۔ نماز بھی آخری پڑھائی۔ قبر میں اتار کر قبر بند کی اور مٹی ڈال دی۔ کون جان سکتا ہے کہ جس کو عمر بھر یہاں تک کہ اس ضعیفی میں بھی محبوبہ بنا کر رکھا۔ اسی کے لیے یہ سب کچھ کرنا بھی اپنی قسمت میں تھا نام کی عفت النساء ایک پیکر عفت تھی۔

مرحومہ کی وفات کے وقت سے قلب میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے اور ہنسی جسے کہتے ہیں وہ ۱۷ مہینے ہو چکے ہیں مگر آج تک چہرہ پر نہیں آئی۔

سیاست ملکی میں زیادہ [illegible] البتہ جب سے کامریڈ نکلنا شروع ہوا تو میں اس کا حرف حرف پڑھنے لگا۔ ترکی سیاست اور عالم اسلامی سیاست سے دلچسپی ہونے لگی پھر جب [illegible] میں [illegible]

عقیدت کی بناء پر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ ہوم رول اور کانگریس کو اچھا سمجھنے لگا۔ پھر گاندھی جی کی تحریک ترک موالات اُٹھی اور اس کا علم بردار علمی حلقہ بن گیا۔ چنانچہ ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں مضمون ستیہ گرہ اور اسلام پر لکھا اور پھر جب علی برادران گرفتار ہو کر کراچی کے مقدمہ میں سزایاب ہوئے تب سے تو تحریک خلافت کا بے داموں کا غلام بن گیا۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور پھر اس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر بھی رہا اودھ خلافت کمیٹی کا صدر کئی سال تک رہا ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ میں خلافت کانفرنس کا جو اجلاس ہوا اس کی مجلس استقبالیہ کا صدر تھا جو ایڈریس اس میں پڑھا لوگوں نے اس کی بڑی ہمت افزائی کی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے ہمدردی رہی لیکن وہی دور دورکی اور جب سے محمد علی کا انتقال ہو گیا۔ سیاست سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ گاندھی جی کی دوراندیشی، تدبر اور اخلاص سب کا مداح زندگی بھر رہا اور اُن کی بے وقت اور بیدردانہ موت ملک کے لئے ہی نہیں مسلمانوں کے لئے بھی ایک سانحہ ہے۔

عقیدت شوق صدی محمد علی سے رہی اور اُن کے بعد خلافت کمیٹی سے الگ ہو گیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی عزت و وقعت دل میں قائم رہی۔ مالی خوش حالی زیادہ کبھی نہیں رہی بلکہ بعض دور تو خاصی تنگی کے بھی گزرے ہیں۔ لیکن بھائی صاحب برابر اور مستقل مدد کرتے رہے اور مخلصوں کی ایک تعداد بھی وقتاً فوقتاً ہدیئے اور نذرانے پیش کرتی رہی۔

حیدر آباد کی علمی پنشن ۳۰۰ روپئے ماہوار تھی، پولیس ایکشن کے بعد بند ہو گئی۔ جب مولانا ابوالکلام اور پنڈت جواہر لال کی تحریک پر دوبارہ کھلی تو کل ۱۲۵ پر آ گئی ۱۹۵۸ء سے ہند سرکار نے عربی اسکالر کی حیثیت سے ماہانہ پنشن مقرر کر دی۔ اس کی رقم اب ۳ ہزار سالانہ ہے، پہلے کم تھی۔

یعنی سرکار سے پنشن ۲۵۰ روپیہ ماہوار کی ملتی رہتی ہے۔ کچھ آمدنی کتابوں اور صدق سے ہو جاتی ہے سورت اور پھر ملایا کے سیٹھ دادا بھائی نے ایک بار کئی ہزار کی رقم پیش کی تھی اور ایک اور مخلص بھی جن کا نہ نام کچھ ہے نہ پتا معقول رقم پیش کرتے رہے مدراس میں مجھے لیکچر دینے کا موقع مل گیا تھا۔ عین اس وقت پھر وہی صورت نکل رہی ہے۔

مدتوں قیام طالب علمی ختم ہونے کے بعد بھی لکھنؤ ہی میں رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہی وطن ہے۔ دور خلافت اور ترک موالات میں ملاقاتیوں کی بھرمار، جلسوں جلوسوں کی کثرت اور ہمہ وقتی شور و شغب سے گھبرا کر وہاں سے وطن آبائی کو منتقل ہو آیا۔ شروع شروع میں جی نہ لگا۔ پھر خوب لگ گیا۔ کام کا موقع سکون و خاموشی کے ساتھ رہتا ہے۔

پڑھنا لکھنا جو کچھ آیا، اس میں بڑا دخل مولانا شبلی کو ہے، اُن سے بہت کچھ سیکھا گویا اولین اُستاد وہی تھے۔ بعد کو زبان کی حد تک بڑی مدد مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی سے اور کسی حد تک شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی سے ملی۔ باقی تھوڑی سی بہت خوش فہمی

نہ معلوم کتنے غرمنوں سے کی اور اب بھی کر رہا ہوں۔ سب کے نام کہاں تک گنا سکتا ہوں۔ اللہ اُن سب کو جزائے خیر عطا کرے۔ بہت کچھ گزر چکی، باقی جو رہ گئی ہے وہ گنے دن کی، آناً فاناً گذر جائے گی وقت عزیز جتنا برباد ہو، اُس پر قلق و حسرت کس زبان سے کیجیے۔ جب اپنی بد استعدادی، کم علمی پر نظر جاتی ہے۔ تو خدا جانتا ہے کہ حیرت ہی ہو کر رہ جاتی ہے اور دنگ و ششدر ہو کر رہ جاتا ہوں کہ اتنا کام بھی کیسے بن پڑ گیا۔

> ہے آرزو کہ ابروئے پُرخم کو دیکھیے
> اس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

دُنیا خوب گزر گئی اور دینوی نعمتوں سے سرفرازی جی بھر کے رہی اب فکر اسی منزل کی ہے، جو سب کو پیش آتی ہے۔

> وقتِ طلوع دیکھا، وقت غروب دیکھ
> اب فکر آخرت ہے، دُنیا کو خوب دیکھا

اپنے اعمال پر نظر جاتی ہے تو تصویر یاس بن کر رہ جانا پڑتا ہے۔ مگر معاً خیال آجاتا ہے کہ جس نے اس عالمِ ناسوت میں قدم قدم پر بے شمار عیبوں کی ستاری کی۔ بغیر کسی حق و استحقاق کے سب کچھ چھپا ڈالا کیا آخرت میں جب اس کی صفت غفاری کا ظہور کامل ہوگا کیا وہ اپنے بندہ کو بے کس اور بے سہارا چھوڑ دے گا تو معاً امید یاس پر غالب ہو جاتی ہے اب تمنا ہے تو صرف اتنی کہ تفسیر کے نئے ایڈیشن کی تکمیل اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔

(آجکل)

مکتوب جناب مولانا عبدالماجد صاحب۔ دریابادی

بنام

جناب مولانا شاہ غلام حسنین صاحب، چشتی، سلیمانی، پھلواروی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۷۱ء — دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی

برادرم۔ وعلیکم السلام

(۱) تحفۂ شمس المعارف پہنچا ———— سبحان اللہ

(۲) جلوۂ سلیمانی نظروں میں پھر گیا ———— ما شاء اللہ

(۳) صدق میں چند سطریں گنجائش نکلنے پر نکلیں گی ———— ان شاء اللہ

(۴) والا نامہ پہنچا تصویب و تحسین لئے ہوئے ———— بارک اللہ

(۵) ضمناً صحت و خیریت بھی دریافت ہو گئی ———— الحمد للہ

والسلام
دعاگو و دعاخواہ
عبدالماجد

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا دریابادی
ذاتی تاثرات

۱۹۲۳ء کا کوئی مہینہ تھا، میری عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ میں اس زمانہ میں والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے والدہ صاحبہ کے ساتھ اپنے وطن رائے بریلی میں رہتا تھا کہ اچانک ایک اخبار کسی کے ہاتھ میں دیکھا جس میں اس زمانہ کے مشہور بزرگ مولانا سید عین القضاۃ صاحب بانی مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ کی وفات کی خبر، ان کے انتقال کا واقعہ اور ان کے متعلق ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا، یہ "سچ" کا پہلا پرچہ تھا جو نظر سے گذرا۔ بات بہت پرانی ہوگئی، مضمون تو غالباً مولانا کے مسترشد مولوی ظفر الملک صاحب علوی کاکوروی کا لکھا ہوا تھا جو اس وقت شریک ادارت تھے لیکن لوح پر مدیر کی حیثیت سے نام مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا تھا جو لوح دل پر اسی وقت سے نقش ہوگیا، غالباً اس سے زیادہ سیدھا سادہ عام فہم اور روزمرہ کسی پرچہ یا اخبار کا نام اس وقت ہندوستان میں نہ تھا، لیکن اس کا ادبی معیار اس کے مضامین کی سطح میری عمر اور استعداد سے بہت زیادہ تھی، اس لئے اس عمر میں اس سے زیادہ استفادہ کا موقع نہ تھا اور نہ اس شمارے کے بعد کسی اور شمارے کا دیکھنا یاد آتا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد میں اپنی تعلیم کی غرض سے لکھنؤ زیادہ تر اپنے بڑے بھائی حکیم ڈاکٹر مولوی سید عبدالعلی صاحب کے پاس رہنے لگا۔ محمد علی "ڈائری" کے ابتدائی مضمون سے معلوم ہوا کہ مولانا عبدالماجد صاحب اپنے محبوب مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی معیت میں ندوہ کے اجلاس کانپور (۱۹۲۵ء) میں شریک تھے۔ میں بھی ایک کمسن تماشائی کی حیثیت سے جس کے خاندان کا اس تحریک و ادارہ سے بہت قدیم اور گہرا تعلق تھا اول سے آخر تک اجلاس میں شریک رہا۔ ہندوستان کے چوٹی کے مشاہیر عصر و زعماء کی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ دہیں زیارت کی، حاذق الملک حکیم اجمل خاں تو خیر صدر جلسہ ہی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں قاضی سلیمان منصور پوری مصنف سیرت "رحمۃ للعالمین" مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور کتنے ہی مشاہیر کو وہیں دیکھا، اس وقت اچھی طرح یاد نہیں لیکن یہ بات بہت قرین قیاس ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب کو پہلی مرتبہ دہیں اسٹیج پر مولانا محمد علی کے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھا

ہوا۔ غرض اولین تعارف کی پہلی ملاقات اس کے ایک دو سال بعد نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی تشریف لانے والے تھے تو خیالی گنج کی کاکوری والی کوٹھی سے منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی ٹمٹم میں مولانا کی معیت و ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ اگرچہ اس وقت کمسن سال نہیں تو کہنہ مشق ضرور ایک مشہور و معروف ادیب فلسفی، مصنف، صحافی اور مفکر اور ایک ۱۴ سالہ طالب علم کا کیا جوڑ! مولانا کو التفات بھی نہ ہوتا لیکن تعارف ہونے پر والد صاحب اور بھائی صاحب کے تعارف و تعلق سے بزرگانہ شفقت فرمائی گئی۔

اس زمانہ میں میں شیخ خلیل عرب سے پڑھتا تھا ان کا مکان باولا جھاؤ لال لکھنؤ میں عربی ادب و زبان کی تعلیم کا ایک مرکز بنا ہوا تھا۔ میری عربی تعلیم کی تو بسم اللہ بھی وہیں ہوئی لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء فرنگی محل اور لکھنؤ یونیورسٹی کے بہت سے منتہی طلبہ اور عربی ادب کے شائقین مختلف وقتوں میں وہاں استفادہ اور تعلیم کے لئے آتے تھے۔ یہ مختلف عمروں اور استعدادوں کے طالب علم تھے اور اکثر فارغ وقت میں پڑھنے والے تکمیل کے طالب علم ہوتے تھے اس لئے ان سے زیادہ مناسبت اور یگانگت کی کوئی وجہ نہ تھی سوائے ایک ہی ہمعمر اور ہم سبق ساتھی تھے اور وہ عرب صاحب کے چھوٹے بھائی حسین عرب یا کچھ عرصہ کے بعد میرے چچازاد بھائی سید ابو بکر حسنی[1] تھوڑا زمانہ گزرا تھا کہ میرے ایک ہم عمر اور ہم سن طالب علم کا اضافہ ہوا یہ مولانا عبدالماجد صاحب کے بھتیجے حکیم عبدالقوی صاحب تھے جن کو ہم لوگ ان کے عرفی اور گھریلو نام آفتاب سے جانتے اور مخاطب کرتے تھے۔ بھائی آفتاب صاحب کا مطالعہ اس وقت بھی ہم لوگوں کے مقابلہ میں وسیع اور متنوع تھا، وہ مولانا کے تعلق اور رشتہ سے مولانا محمد علی کے نام کے عاشق اور فدائی تھے اور ان کے تمام مخالفین اور معترضین سے سخت ناراض تھے۔ مجھ پر زمیندار کے مطالعہ سے ظفر علی خاں کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور سیاست اور ادب و شاعری سب میں ان کے گن گاتا تھا اکثر ہم دونوں کی نوک جھونک ہوتی اور عرب صاحب کے مکان کی دیوار کے نیچے گلی میں کھڑے ہوئے مناظرے ہوتے رہتے۔ ان کے ذریعہ مولانا کی تحریریں، مضامین اور تصانیف کا نام اور حوالے کان میں پڑے۔

مولانا کی سب سے پہلی تحریر جو بھائی صاحب آفتاب کے ذریعہ پڑھنے کو ملی وہ مولانا کا وہ خطبۂ استقبالیہ تھا جو چند سال پہلے لکھنؤ میں ہونے والی خلافت کانفرنس کے لئے لکھا گیا تھا ایک دینی اور نیم سیاسی جلسہ میں پڑھا جانے والا خطبہ تھا لیکن سیاسی و دینی سے زیادہ اس پر ادبی رنگ غالب تھا اور وہ ایک سیاسی خطبہ ہونے کے بجائے ایک ادبی دستاویز اور مولانا کے طرز تحریر کا ایک اعلیٰ ادبی نمونہ بن گیا تھا، میں اس سے پہلے آزاد کی "آب حیات" "نیرنگ خیال" اور خاص ادبی چیزوں میں رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" پڑھ چکا تھا۔ علامہ شبلی کی چند اہم ادبی تصنیفات بھی نظر سے گذر چکی تھیں اس لئے ادب اور زبان کا چٹخارا پیدا ہو گیا تھا اور اچھا برا سمجھنے لگا تھا، مولانا کا خطبہ بڑے لطف و ذوق سے پڑھا اور دل نے پہلی مرتبہ انکا قلم اور زور بیان کا لوہا مانا۔ اس کے بعد جب کبھی مولانا کی خدمت میں حاضری ہوئی قدیم تعارف کے بعد بھائی آفتاب کی ہم سبقی کی نسبت کا اضافہ ہو گیا جو مولانا کے لئے توجہ و کشش اور مزید شفقت کا ذریعہ بن گئی اور اس طرح محبت و شفقت میں جدید آب و تاب پیدا ہو گئی۔

یہی زمانہ تھا جب مولانا عبدالماجد صاحب

[1] مولوی ابو بکر حسنی ایم۔ اے سابق استاد ...

میرے بڑے بھائی ڈاکٹر صاحب نے بھی اسی زمانہ میں مولانا سے تعلق پیدا کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا گھر لکھنؤ میں مولانا کی مستقل فرودگاہ بن گیا۔ اس جدید روحانی رشتہ سے مولانا عبدالماجد صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی جلد از جلد زیارت ہونے لگی۔

۱۹۲۹ء میں مولانا نے حج و زیارت سے فراغت حاصل کی اور وہ سفرنامہ ان کے قلم سے نکلا جو نہ صرف ان کی تحریروں بلکہ ان لاتعداد کتابوں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں امتیاز خاص رکھتا ہے۔ جہاں تک یاد ہے یہ مولانا کی پہلی کتاب تھی جو میں نے بڑے شغف و انہماک کے ساتھ پوری پڑھی، پڑھتا تھا اور مولانا کے زور قلم اور البیلے طرز تحریر پر جس میں ادب اور واردات قلبی کا نہایت حسین اور دل آویز امتزاج ہے جھوم جھوم جاتا تھا۔ اسی زمانہ کے قریب ندوہ کے ابناء قدیم (اولڈ بوائز) کا جلسہ ہوا۔ انھوں نے مولانا کو اس جلسہ کا صدر اور حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کو صدر استقبالیہ منتخب کیا۔ مولانا نے جو علامہ شبلی کے ساتھ خصوصی تعلق اور ندوہ کے مقاصد سے ہم آہنگی بلکہ ندوہ کے تخیل کی عملی تصویر ہونے کی بنا پر اعزازی ندوی تسلیم کئے گئے تھے اور مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی نے تو اپنے ایک خطبے میں ان کو باقاعدہ فضلاء ندوہ میں شمار کر کے ان کو بطور سند پیش کیا تھا۔ اس موقع پر جو خطبہ پڑھا اس میں ان کے طرز تحریر کی ساری خوبیاں اس کا پورا بانکپن اور اس کی پوری رنگینی موجود ہے بے ساختہ اور بے تکلف مسجع عبارتیں اور ادبی استعارے اور تشبیہیں قلم سے نکل گئی ہیں حافظہ کی کمزوری کی باوجود اس کا ایک فقرہ ابھی تک یاد ہے، بانیان ندوہ اساتذہ دارالعلوم اور موجودہ طالب علموں کو بیک وقت خراج محبت پیش کرتے ہوئے ان کے قلم سے یہ جملہ نکلا ہے۔

• اللہ کی رحمت پیران مے فروش پر اللہ کی رحمت جوانان مے فروش پر۔

ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ، سنجیدہ اور خشک و پر تقدس ہو وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دل آویزی کو روک نہیں سکتا اور اس کے لئے اپنے ادبی ذوق اور اسلوب تحریر سے عاری و خالی ہو جانا ناممکن ہوتا ہے خلافت و ندوہ کے خطبات کا تقدس و متین ماحول ہو یا فلسفہ اجتماع یا فلسفہ جذبات کی سنگلاخ زمین اور پرخار وادی یا تفسیر و تصوف کا پر عظمت اور نازک میدان جہاں ہر ہر قدم پر "ہوشیار باش" اور "نگاہ روبرو" کی آواز اور بڑے بڑے ادیبوں کے کان میں یہ ؎

قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

کی صدا آتی ہے، اس کا قلم گل کاری اور گلفشانی سے باز نہیں رہتا اور یہی راز ہے کہ ادب و زبان کے رسیا اور لطف بیان کے بھوکے بھی یہ بھاری بھرکم "تحریریں" ذوق و شوق سے پڑھ لیتے ہیں اور گرانی محسوس نہیں کرتے۔ خالص ادیبوں میں یہ امتیاز مولوی محمد حسین آزاد کا ہے کہ شعراء کی محفل سخن ہو یا سلطان وقت کا دربار اکبری، ان کی ہر تصویر میں نیرنگ خیال اور ان کی ہر تحریر میں آب حیات نظر آتا ہے عالموں اور محققوں میں مولانا شبلی کی خصوصیت یہ ہے کہ شعرالعجم اور موازنۂ انیس و دبیر جیسی خالص ادبی و تنقیدی تصنیف ہو یا الفاروق و سیرۃ النبی جیسی ٹھوس، پرشوکت و باعظمت موضوع، یا الکلام و علم الکلام جیسا سنگین و خشک مضمون، ہر جگہ ان کی تحریر کی شگفتگی و رعنائی قائم رہتی ہے اور ادب و زبان کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

یہی اپنے رنگ میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی خصوصیت ہے کہ ان کی کوئی تحریر ادب و زبان کی چاشنی سے خالی نہیں اور کہیں ان کا اسلوب تحریر جو ان کی شخصیت بن گیا ہے ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا

لیکی کی کتاب ہسٹری آف یورپین مارلس کے ترجمہ تاریخ اخلاق یورپ پیش ہوا، جو اپنے موضوع، اپنے فنی اصطلاحات، اردو کی تنگ دامنی اور ترجمہ کی مشکلات کی وجہ سے نہایت مشکل کام تھا، وہ پورے طور پر کامیاب ہوئے ہیں اور پوری کتاب میں کہیں ثقالت و خشکی اور ترجمہ پن نظر نہیں آیا۔ میرے محدود مطالعہ میں ظفر علی خاں کی "معرکہ مذہب و سائنس" کے بعد ترجمہ کی کوئی کوشش اتنی کامیاب نظر نہیں آئی، اس بارہ میں ان کے علاوہ اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے، تو وہ مولوی عنایت اللہ بی۔ اے۔ دہلوی ہیں۔

اب وہ زمانہ آیا کہ میرا ذہن بلوغ کی منزلیں طے کرنے لگا، بڑے بھائی صاحب کی صحبت میں مغربی تہذیب کی سطحیت اور موجودہ تمدن کا کھوکھلا پن نمایاں ہونے لگا اس موقع پر "سچ" کے پرچے جو ندوہ کی طالب علمی اور مولانا سے روزافزوں تعلق کی بنا پر باقاعدے سے مطالعہ میں آنے لگے تھے، بڑی رہنمائی کرنے لگے اور ان سے ذہن و شعور کو فراوانی کے ساتھ غذا ملنے لگی بلکہ اس اجمال کی تفصیل اور اس خیال کی تکمیل اسی کی رہین منت ہے "سچ" کے مطالعہ نے دو بڑے کام کیے، ایک مغربی تہذیب کا جس کو مولانا یاجوجی تمدن اور دجالی فتنہ سے تعبیر کرتے تھے حقارت آمیز وتعمق اور اس کے ثبوت میں دلائل و واقعات کی فراہمی جو مولانا برطانیہ سے نکلنے والے انگریزی پرچوں سے براہ راست چھاپا فرماتے تھے، دوسرے لسان العصر میر اکبر حسین الہ آبادی کی شاعری اور ان کے حکیمانہ خیالات سے گہری واقفیت اور قلبی مناسبت! اکبر کے کلام سے مخصوص خاندانی ماحول اور ہم خیالی کی بنا پر مناسبت تو شروع ہی سے تھی لیکن "سچ" نے اس کو عقیدت و محبت کے درجہ تک پہونچا دیا، "سچ" کا کوئی پرچہ مشکل سے ان دونوں باتوں سے خالی ہوتا تھا، مولانا انگلستان و ہندوستان سے نکلنے والے پرچوں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے

حقائق یا اعداد و شمار (تہذیب مغرب کی ناکامی، اس کی انسانیت کشی اور انسان دشمنی کی مثالیں پیش کرتے تھے کہ آنکھیں کھل جاتیں اور خون کھول اٹھتا، دوسری طرف حضرت اکبر کے حکیمانہ اشعار کو اپنی دلپذیر تمہید و تشریح کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ جن باتوں کے لیے ضخیم ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں وہ جملوں میں ادا ہو جاتیں اس طرح "سچ" اس ذہن و شعور کی تشکیل میں بیش قیمت مدد کرتا رہا۔ جس سے اپنی بعد کی اردو عربی تصنیفات اور ہندوستان اور ہندوستان کے باہر دعوتی کاموں میں بنیادی حصہ رہا یہ وہ احسان ہے جس کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

اب وہ وقت آیا کہ مجھے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس قرآن اور تفسیر کی خدمت سپرد ہوئی، مولانا نے اپنی انگریزی تفسیر لکھنا لیں کا سلسلہ شروع فرما دیا تھا اور اس سلسلہ میں ان کے مطالعہ کا اصل میدان اور تفسیروں میں ان کی تفسیر کا اصل امتیاز صحف سماوی اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور ان شخصیتوں مقامات اور تاریخی ادوار کی جدید جغرافیائی و تاریخی معلومات کی روشنی میں تحقیق اور قرآن مجید کے مشکل مقامات کا حل پیش کرنا تھا جن کے بارے میں جدید علوم مستشرقین کے اعتراضات اور جدید مطبوعات نے مختلف سوالات کھڑے کر دیئے ہیں میں اپنے درس میں سورہ بقرہ میں ہاروت و ماروت کے قصہ و ما کفر سلیمان و لکن الشیاطین کفروا آیت پر پہونچا تو مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ مولانا کی تحقیقات و مطالعہ سے استفادہ کروں غالباً سب سے پہلی مرتبہ دریاباد اسی مقصد سے گیا، مولانا ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھا اور دریہ تک گفتگو کی شفقت فرمائی، میں وہاں سے اچھا [illegible]

بار پیش آیا کہ مجھے جب کوئی ایسی مشکلات پیش آتیں، تو دریاباد کا قصد کرتا یا مولانا کو خط لکھتا۔ مولانا ہمیشہ ب خاطی سے مدد فرماتے، مولانا کے یہ خطوط جو تقریباً میرے پاس محفوظ ہیں، نہ صرف تفسیر کے طالب علموں لئے بلکہ عام اہل ذوق کے لئے بھی افادیت رکھتے ہیں

اس زمانہ میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ رسالہ "الندوہ" کا احیا فرمایا اور اس کی ادارت میں میرے رفیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کے سپرد ہوئی نے عام ناظرین کی دلچسپی اور اہل علم کی رہنمائی کے لئے سلسلہ مضامین "میری محسن کتابیں" کے عنوان سے شروع ور ہندوستان کے مشاہیر اہل علم اور اہل نظر کو موضوع اٹھانے کی دعوت دی۔ اس دعوت کی بڑی پذیرائی کی اور قدیم وجدید حلقے کے چوٹی کے اصحاب فکر و نظر اس میں حصہ لیا۔ مضمون نگاروں کی پہلی صف میں قدرتاً نا عبدالماجد دریابادی بھی تھے، جنھوں نے دعوت قبول کے اپنی خورد نوازی اور علم پروری کا ثبوت دیا۔ اس مون میں ان کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات اور ذہنی فکری ارتقاء و انقلاب کی مختصر تاریخ آگئی۔ جس ئندہ مورخوں اور ادیبوں کو بڑی مدد ملے گی۔

میرے استفادہ اور خط و کتابت کا یہ سلسلہ برابر رہا غالباً ۱۹۴۳ء میں مولانا نے اپنے ایک پرچہ میں یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر سی ایم جوڈ کی دو فلاسفی آف اٹامز" اور "اے گائیڈ ٹو ماڈرن کے اقتباسات پیش کئے، میں اس زمانہ میں کتاب عالم بانحطاط المسلمین لکھ رہا تھا جس کا مختصر "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان قول کے ساتھ دوسرا اڈیشن "انسانی دنیا وج وزوال کا اثر" کے نام سے نکلا ہے

نے یہ دونوں کتابیں امیر الدولہ لائبریری سے نکلوائیں اور پوری پڑھ گیا، لیکن ان کے بہت سے مقامات جو خاص اصطلاحات اور تاریخی واقعات اور ادبی تلمیحات پر مبنی تھے، میری سمجھ میں نہیں آئے میں نے مولانا کو تکلیف دی، اور مولانا نے ان کی پوری تشریح فرمائی، میں نے اپنی کتاب کی تصنیف میں ان کے بہت سے اقتباسات پیش کئے اور ان سے بہت فائدہ اٹھایا۔ کتاب کی تالیف کے دوران میں مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں سچ اور صدق کے پرانے فائل پر ایک نظر ڈال لوں کہ ان میں میرے کام کی بہت سی باتیں ہوں گی۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور میرے پاس صرف ایک دن تھا۔ مولانا کے اصول و معمول کے مطابق میں اطلاع دے کر ایک دن صبح کی گاڑی سے پہونچا۔ مولانا ایسے موقع پر پسند کرتے ہیں کہ ان کے لائق بھتیجوں میں سے کوئی موجود ہو تاکہ کتابوں کی تلاش کرنے اور دہاں کے کام اور آرام میں ان سے مدد ملے اور مولانا کا حرج نہ ہو، غالباً عزیز گرامی محمد ہاشم صاحب قدوائی (حال استاذ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) موجود تھے۔ مولانا نے اپنے معمول کے مطابق ضروری انتظامی سوالات کئے، کتنا ٹھہروگے، دوپہر کا کھانا کس وقت کھاؤگے، پرہیز وغیرہ وغیرہ۔

یہاں پر یہ ذکر بھی کرتا چلوں کہ یہ تھانہ بھون کی سنت ہے جو مولانا کا دوسرا مرکز روحانی اور آخر میں مولانا کی ذہنی اور قلبی عقیدت کا سب سے بڑا مرکز رہ گیا تھا، مولانا تھانوی کے خلفا اور مسترشدین بہت تھے اور سب ان کے رنگ کے عاشق، لیکن انضباط اوقات اور تنظیم کار کا جیسا نمونہ مولانا کے یہاں دریاباد میں دیکھا مشکل سے کہیں اور پایا اور یہی راز مولانا دریابادی کے اتنے مختلف النوع بلکہ متضاد کاموں کی کامیابی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کا ہے، غرض ان سوالات پر میں نے عرض کیا کہ میں صرف آج ٹھہروں گا اور چلوں کہ وقت بہت کم اور کام

بہت ہے دوپہر کا کھانا نہیں کھاؤں گا کہ گرمیوں میں اس کے بعد کام کرنا مشکل ہے باوجود بزرگانہ شفقت کے ایک بار بھی اس پر جرح نہیں فرمائی اور نہ کھانے پر اصرار کیا میں نے کام شروع کیا اور بیچ کا جب سے اجراء ہوا تھا میں نے اس کے پرچوں پر نظر ڈالی اور اپنے کام کی چیزیں نوٹ کرنی شروع کیں۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ مولانا تکا یک تشریف لے آئے گلاس ہے کہ گرمی کا زمانہ ہے اور کھانے میں دخل نہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ میں نے اس کو بسر و چشم قبول کیا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد پھر اسی طرح سے لسی کا گلاس اور پھر کسی وقت شربت آیا اور میں اس حکیمانہ ضیافت و میزبانی کی داد دیتا رہا اور قبول کرتا رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر تفریح و لطیف غذا کی یہ کمک وقتاً فوقتاً نہ پہونچتی رہتی تو میں اس شدید گرمی میں مسلسل دماغی کام نہ کر سکتا تھا اور اپنے اس اعلان پر پچھتا رہتا کہ میں دن بھر کچھ نہ کھاؤں گا، میری نوعمری، محنت کوشی گرمیوں کا لمبا دن اور کام کی دھن کہ میں نے مغرب تک اپنا کام مکمل کر لیا اور اگلے دن وہاں سے کامیاب آیا۔

اس وقت سے مولانا کی یہ بزرگانہ شفقت اور اور ان کا عالمانہ ذوق ہے کہ جب کبھی میرے کام کی کوئی چیز ان کی نظر سے گذرتی ہے یا کوئی ایسی کتاب اور مضمون ملاحظہ فرماتے ہیں جو ان کے نزدیک میرے مطالعہ سے گذرنا چاہیے تو وہ کتاب یا مضمون کا تراشہ میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ جب میری دریا باد آمد کی خبر سنتے ہیں تو وہ تمام رسائل مضامین اور کتابیں مہیا فرما لیتے ہیں جن [illegible] مطلوبات مہیا کرنا [illegible] کے متعلق واقف کرانا [illegible]

گفتگو کرنے کا وقت نکال لیں اور پہلے سے اس کی تیاری فرما لیں، بعض مرتبہ ایسے عزیزوں سے گفتگو کرنے کے [illegible] ان کو کسی دن کام کی مقدار اور رفتار بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ تھوڑا سا وقت اس دن کے لئے [illegible] کر لیں، جس دن ایسے عزیز کو آنا ہے اس لئے کہ مولانا کے یہاں صحیح معنی میں وقت "ناپا تلا" رہتا ہے۔ ہر وقت کے لئے ان کے پاس کام ہے اس لئے محض لوازم [illegible] اور گفتگو و مذاکرہ کے لئے جب ہی وقت نکل سکتا ہے جب پہلے سے اس کی تیاری ہو جائے اس کی وجہ سے [illegible] وقت میں بڑی برکت اور ان کے کاموں میں نہ صرف تنوع بلکہ اس کی مقدار بھی اتنی ہی ہے جو اچھے اچھے کام کرنے والوں کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اس بارے میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ اس کے امام و پیشوا امام مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کو انھوں نے صرف دین ہی کا نہیں دنیا کا بھی حکیم مانا اور [illegible] شعبہ میں اب تو تنہا وہی ان کے مقتدیٰ کامل نظر آتے ہیں۔

مولانا کے اسلوب تحریر اور ادبی خصوصیات کے متعلق میرا کچھ کہنا تو بے ادبی اور جسارت ہو گی [illegible] ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے طرز کے بانی [illegible] خاتم ہیں طنز نگاری، اسالیب بیان اور [illegible] میں نازک ترین اور دشوار ترین صنف ہے [illegible] ادیب، صاحب قلم کامیاب ہو سکتا ہے جو [illegible] زبان کے ادا شناس اور مزاج داں ہو۔ [illegible] ہو کہ ذرا سی چوک بے احتیاطی اور بے [illegible] بعض اوقات محاوروں کی چاٹ اور زبان کے [illegible] [illegible] پھکڑ پن اور بے تمیزی کی [illegible] واقع ہو جاتا ہے، حد یہ ہے کہ [illegible] [illegible] محاورات کے استعمال کے [illegible]

...نت کو قائم نہ رکھ سکا اور ان مرحوم کی اس کی وجہ سے ...مردوں کا بہت ملامت اور بلا ضرورت اذیت کا بھی ...ا کرنا پڑا۔ قرآن مجید کے ترجمہ اور امہات الا قہ ...ہر دو تحریر میں ان سے ایسی ہی فرو گذاشتیں ہونے کی ...سے مہذب مجلسوں میں ان کے استعمال سے احتیاط ...ی جاتی ہے۔ ذرا سی غفلت، البسیار گوئی اور داستان سرائی ...ہوتی میں آدمی کو خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ ہمارے علم مولانا آزاد جنہوں نے لکھنؤ کی ادبی مجلسوں کا لطف اٹھایا تھا اور زبان کی نوک پلک سے خوب واقف اس بارہ میں بڑے محتاط تھے۔ مولانا عبدالماجد کی حس ...بارہ میں ذکاوت حس تک پہنچی ہوئی ہے۔ الفاظ کے معاملہ میں ان پر گرفت مشکل ہے۔ بعض مرتبہ ان کا فقرہ ایک شذرہ کا اور ایک شذرہ پوری کتاب کا کام کر جاتا ہے اور کسی وقت ان کا ایک جملہ مخاطب مشار الیہ کے لئے ایسا بھی بھاری پڑ جاتا ہے کہ اس کا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اٹھانا بھی۔ بعض مرتبہ وہ پرانے شاعر کے مصرعہ کو عنوان بنا کر پورا کام کر جاتے دراصل مصرعہ سب کچھ کہہ جاتا ہے اس کے بعد جو کچھ ہے سب اس کی تشریح اور تفصیل ـــــ اس ان کی ادبیات کے ذخیرہ پر وسیع نظر ان کے بھی اور ان کے حسن انتخاب کی بے اختیار داد دینی وہ یہ مصرعہ کہاں سے لائے اور کس طرح اس کو انگوٹھی میں جڑ دیا۔

کی تمام ذوقی باتوں، ان کے تمام علمی تحقیقات ...قات سے کلی اتفاق نہ ہو یہ نہ ہر پڑھنے لکھنے ...ی ہے نہ مولانا کی عظمت و شہرت ...مفید لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ...مضمون نگار اور صاحب کمال ... [illegible]

حیثیت سے بھی قرآن کے ایک مفسر و خادم کے لحاظ سے بھی، قدیم و جدید کے ایک جامع عالم کے طور پر بھی، اور اپنے وقت اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہونچانے والے انسان کی حیثیت سے بھی، ایک کہنہ مشق صحافی اور ایک صاحب طرز ناقد و طنز نگار کی بنا پر بھی وہ ہر طرح قابل قدر اور اعزاز کے مستحق ہیں، میں نے اپنے مضمون مدراس کی تعلیمی تقریر میں کہا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ اس نسل کے لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کو دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی تھیں، اگر ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں میں صحیح قدر شناسی اور صحیح معنوں میں بے تعصبی ہوتی تو ان کو یونیورسٹیوں کی طرف سے ادب فلسفہ اور دینیات میں اعزازی ڈگریاں ڈاکٹریٹ کی پیش کی جاتی، لیکن یہاں چند مثالوں کو چھوڑ کر یہ سب کام سیاسی اور انتظامی مصالح کی بنا پر ہوا کرتے ہیں، اور ان سے اکثر مفادات یا سیاسی فوائد وابستہ ہوتے ہیں، مولانا کو اس وقت تک مرکزی حکومت یا صوبائی حکومت کی طرف سے جو کچھ اعزاز یا اعتراف حاصل ہوا وہ خود ان کے لئے باعث اعزاز اور ان کے عمدہ مذاق اور حسن انتخاب کی دلیل ہے، مولانا کی عزت و عظمت میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوا کہ

مادح خورشید مداح خود است

ادارہ فروغ اردو مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے وقت پر اس ضرورت کو محسوس کیا اور جو لوگ مولانا کے کام اور مقام سے واقف نہیں ان کو وقت گذرنے سے پہلے ان کے مقام کے پہچاننے اور ان کی علمی و ادبی کمالات سے استفادہ کا موقع فراہم کیا۔

ختم کلام پر یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی تصانیف میں ادبی حیثیت سے سفر حجاز اور محمد علی ذاتی ڈائری کا [illegible] سمجھتا ہوں۔

اے ادیبِ ایشیا

ضیا ھانی

(حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت)

اے مفسر! اے محقق! اے خطیب خوش بیاں!
اے مفکر! اے مبصر! اے وطن کے پاسباں!
اے ادیب ایشیاء! اے نازشِ ہندوستاں!
اے کہ تیری ذات ہے، سرمایۂ صد افتخار!
تیری عظمت سے کوئی، انکار کر سکتا نہیں!
تیرا اک اک حرف ہے علم و ادب کا شاہکار!
تو نے سچائی کو بخشی ہے حیاتِ پائیدار
علم و فن کی تو نے خدمت کی ہے ستر سال تک
تو نے "فنِ نقد" کو بخشی وہ معراجِ کمال!
سانس لیتا ہے اسی دنیائے آب و گل میں تو!
تیری ہر "تحریر" ہے مہر و محبت کی کتاب!
تیری ہر تصنیف "حکمت" کا چھلکتا جام ہے!
تیرے ہر نقطہ میں پنہاں "صدق" کا پیغام ہے!
تلخ تر کوئی حقیقت، تجھ سے پوشیدہ نہیں!
نظمِ تدبیرِ سیاست، میں ہے "گمراہی" ہنوز!
دور کرنا چاہتا ہے دہر سے "بغض و عناد"!
کس قدر لطفِ بیاں ہے کس قدر سوز و گداز!
مجھ کو دنیا کی غمِ ہستی کا ہے عرفان بھی!
دیکھتا ہے "عالمِ ایجاد" کی ہر واردات
کارناموں کو ترے دنیا بھلا سکتی نہیں!

اے جلیل القدر نقاد! اے حکیم نکتہ داں!!
اے عظیم المرتبت! اے قوم کے نوحہ خواں!
طول و عرضِ ملک میں لاکھوں ہیں تیرے قدرداں!
رشک کے قابل ہے تیرا خامۂ معجز نگار!
کوئی سورج کو پسِ دیوار کر سکتا نہیں،
تیرے ہی دم سے ہے قائم آج "اردو" کا وقار
نازِ فائق ہے جس پہ رحمتِ پروردگار
تیرے مداحوں میں تھے آزاد اور اقبال تک
جس کو کہہ سکتے ہیں، اربابِ بصیرت "لازوال"
باتیں، یوں کرتا ہے گویا ہے ہمارے دل میں تو!
تیرا ہر اک لفظ ہے گویا "صداقت" کا رباب
مجتہد ہے "ندرتِ اسلوب" تیرا کام ہے
ذہن تیرا واقعی "گہوارۂ الہام" ہے
تجھ کو فطرت نے عطا کی ہے "نگاہِ دوربیں"
"امن" کی منزل سے ہیں ناآشنا "راہی" ہنوز
تیرا نعرہ "اتحاد و اتحاد و اتحاد"
ہیں تری "تحریر" میں بکھرے ہوئے دنیا کے راز
تیری نظروں میں "بشر" کی انقلابی شان بھی
تو بہر لمحہ، کیا کرتا ہے "تنقیدِ حیات"
نقش جو تو نے بنایا ہے مٹا سکتی نہیں

سبز ہے تیری عرق ریزی سے "اردو" کا چمن!!
گل بداماں ہے ترے دم سے ریاضِ علم و فن"

مولوی غلام محمد بی اے حیدرآبادی مقیم کراچی

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی

ذاتی تاثرات

ایک صاحب طرز انشاء پرداز، نادر شاہ طنز، فن [illegible] سفر حاضر کے نکتہ رس، نفسیات بشری کے رمز شناس، ماہر شرعیت [illegible] دانا طریقت کے بینا، اسم با مسمٰی "کے خاندان سے وہ شرف [illegible] ہوئے [illegible] اردو اور انگریزی دونوں زبانوں [illegible] کلام مجید کے کامیاب مترجم اور مفسر، ایسے جامع کمالات [illegible] ایک دو صفت کی بھی تعریف [illegible] ایسے کی زبان [illegible] کا تعلق علم و قلم سے بس نام ہی کا ہو وادی ناشناسی [illegible] خیال ہی کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور بات صرف اپنے ذاتی [illegible] تک محدود رہتی ہے [illegible] اور نفع بھی، چنانچہ اسی [illegible] کی کوشش کی جاتی ہے۔

آج کل بڑی شخصیتوں اور اونچے درجہ کے دیندار [illegible] زندگیوں کو بھی اگر قریب سے دیکھا جائے تو ان کے مشاغل [illegible] جتنے گرانقدر اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں مگر ان کی زندگی [illegible] ترتیب و تنظیم، اوقات کا انضباط، اصولوں کا پاس [illegible] مشکل ہی سے ملے گا۔ اپنے حد علم میں اصول و ضابطہ کی [illegible] حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی [illegible] میں مولانا دریابادی مدظلہ کی آتی ہے، [illegible]

کا اصول متعین، ہر ہر کام کے اوقات بندھے ٹکے، تعلقات بہت وسیع اور گوناگوں، بڑوں سے بھی اور چھوٹے سے چھوٹوں تک بھی، عقیدت کے بھی، شفقت کے بھی، دوستی کے بھی اور رشتہ داری کے بھی، علمی بھی اور سیاسی بھی، خالص ادبی بھی اور خالص دینی ومذہبی بھی اور ان سب کے مراتب کی پوری رعایت اور خیال بھی، مجال جو کہیں ضابطہ اور اصول میں فرق آئے۔ مثال [illegible] ہو جائیں زندگی کا مولانا کو دیکھئے تو قدر نمایاں [illegible] آئے گی۔

میں نے سنا تھا کہ مولانا کے رفیق محترم علامہ سید سلیمان ندوی جب اپنے اصول پسند دوست کو ساتھ لے کر لطف اندوز ہونا چاہتے تو یہی ہوتا کہ اگرچہ دو دن کا پروگرام بنا کر اعظم گڈھ تشریف لائے ہیں تو عین چلتے وقت ایک دن اور رک جانے پر اصرار فرماتے اور اس وقت تک اصرار فرمائے رہتے جب تک کہ انکار میں جھنجھلاہٹ پیدا نہ ہو جاتی اور یہ پرلطف قہر آمیز جواب نہ لیتے کہ حیرت ہے آپ جیسے لوگ بھی اوقات کا پاس و لحاظ نہیں کرتے ہیں..... خیر یہ تو سنی سنائی بات تھی۔ مشاہدہ کا واقعہ سنئے۔ جولائی ۱۹۶۰؁ میں لکھنؤ جا رہا تھا اور مولانا کی خدمت میں اپنی حاضری کی تاریخ پہلے ہی لکھ بھیجی تھی

ادھر طلوع سحر کے ساتھ میں لکھنؤ پہونچا، ادھر صبح دس بجے کی ڈاک سے مولانا کا کرم نامہ دریاباد سے آگیا کہ اس ناچیز کی خاطر سے ڈیڑھ دن کے لئے اگلی صبح تشریف لائیں گے اور اسٹیشن سے سیدھے اس کمترین کی قیامگاہ پر پہونچیں گے اور ادھر لکھنؤ یا زیارت سے مشرف رکھیں گے پھر اسی شام عصر کے مغرب خادم اپنے مخدوم کے در دولت کدہ خاتون منزل پر حاضر ہوگا اور چائے نوشی کا شرف پائے گا۔ دوسرے دن صبح ۸ بجے ناشتہ کرکے مکرر تشریف ارزانی میری شامگاہ پر ہوگی اور ۱۰ ½ بجے صبح یہاں سے سیدھے اسٹیشن بہ عزم دریاباد روانگی ہوگی ــــــــــ ہوا یہ کہ مولانا کی آمد پر میرے میزبان جناب سید حسین صاحب ایڈیشنل مجسٹریٹ لکھنؤ نے مولانا سے درخواست کی کہ کل صبح کی تشریف آوری میں ناشتہ یہیں فرمالیں۔ مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے بھی یہ درخواست قبول فرمالی ہے اور ذرا تامل کے بعد فرمایا کہ مولانا تشریف لا رہے ہیں تو میں بھی ناشتہ وہیں کرلوں گا۔ چنانچہ ٹھیک آٹھ بجے تشریف لائے ہم لوگ بس ناشتہ سے فارغ ہوئے تھے کہ موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ بڑی پرلطف صحبت رہی، ادبی لطائف وظرائف سے بھرپور مگر درمیان درمیان میں خشیت باری تعالیٰ کی تجلیات بھی کوندتی رہیں۔ مجھے تو وقت کا خیال نہ تھا مولانا نے یکایک جیب سے گھڑی نکالی اور دیکھا تو ۱۰ ½ بجنے والے تھے۔ راقم الحروف کو مخاطب کرکے فرمایا "اچھا اب وقت ہوچکا گیارہ بجے کی ٹرین سے جانا ہے" مولانا عبدالباری صاحب نے فرمایا کہ ایسی موسلادھار بارش میں آپ کہاں جائیں گے، شام کی ٹرین سے چلے جایئے گا ــــــ مولانا فرمانے لگے کہ میں ایسا رکنے والا نہیں ہوں، یہ کہہ کر اپنی چھتری سنبھالی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا عبدالباری صاحب نے ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا اور فرمایا یہ رکنے والے نہیں۔ چنانچہ مولانا چل پڑے ہم لوگ مولانا کے ساتھ کوٹھے سے اتر کر کوٹھی کے گیٹ تک مولانا کو وداع کرنے آئے اور مولانا اسی بارش میں پیادہ پا چھتری لگائے ہوئے روانہ ہوگئے۔

اور ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کی محض دوستانہ دعوت اور مخلصانہ اصرار پر مولانا اپریل ۱۹۵۵ء میں پاکستان تشریف لائے۔ ڈھائی ہفتہ کا کل سفر تھا، مگر ایک ایک دن کا پروگرام پہلے سے منضبط! کراچی پہونچے تو اسٹیشن پر استقبالیہ ملاقات کی سعادت اس حقیر نے بھی پائی تھی، مگر خاص گورنر جنرل ہاؤس میں جاکر ملنے میں دل متذبذب تھا، حالاں کہ وہاں مولانا کی خاطر آنے جانے والوں کے لئے راستہ ایسا ہی کھلا تھا جیسے کسی عام شہری کا گھر۔ بہرحال اسی تذبذب میں شاید دو دن گذرے ہوں گے کہ اتوار کی صبح ۸ بجے کسی نے اس غریب کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولا تو دیکھتا ہوں کہ سلمان میاں (سید سلمان صاحب خلف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ؒ) ہیں اور ان کے ساتھ مخدومنا الکریم مولانا دریابادی۔ بس اپنی حالت پہ مجھ کو ... کہ

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

خیر تعظیم و محبت سے مولانا کو بٹھایا اور عرض کیا کہ حضرت نے بڑا کرم فرمایا۔ مولانا آج کچھ فرصت مل گئی، فرمایا نہیں آج صبح کا پروگرام یہی تھا۔ پہلے حضرت سید صاحب کے گھر جاؤں وہاں سے آپ کے پاس آکر آدھ گھنٹہ بیٹھوں اور پھر آپ کو ساتھ لے کر سید صاحب کے مزار کی زیارت کروں، پھر آپ کو رخصت کرکے میں اپنی فہرست کے مطابق اور لوگوں کی ملاقات کے لئے چلا جاؤں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس واقعہ میں علاوہ ضبط اوقات کے دلداری

اس سفر کی دلچسپ روداد ماجدی قلم سے پہلے قسط وار صدق جدید میں چھپی پھر رسالہ کی شکل میں شائع ہوئی۔ نام ہے ڈھائی ہفتہ پاکستان میں
[illegible]

دلنوازی کی کتنی نفسیاتی رعائتیں ملحوظ نہیں، چاہتے تو میرے
غ (حضرت مولانا سید سلیمان ندوی) نور اللہ مرقدہ کی قبر پر
تک بڑھ کر اس بندہ بے دام سلیمان کے گھر تشریف لائے
راس نسبت کی خاطر داری بلکہ قدر افزائی بھی منظور تھی۔ جو
مولانا توان کو حضرت سلیمان (علیہ رحمۃ الرحمٰن) کے ساتھ
صل ہے، اس اندازہ کرم سے میرے دل نے جو حلاوت
ی اور جس درجہ ممنون شفقت ہوا۔ اس کو کوئی اور سمجھ
ی نہیں سکتا۔

اس سے بھی زائد ایک اور بات مولانا کی پاکستان تشریف آوری پر سب سے زیادہ تعجب جماعت اسلامی کے عمائدین اور اس کے خاص ہی خواہوں پر ہوئی تھی ان میں سرگوشیاں یہ تھیں کہ غلام محمد صاحب (جو جماعت کے سخت خلاف تھے) نے مولانا کو جماعت اسلامی کے اسلامی دور اس کے امیر کے خلاف علمی محاذ قائم کرنے کے لئے بلایا ہے۔ اس وقت صرف اپنے شرائط طے کرنے کے لئے مولانا آئے ہیں، شرائط طے ہوتے ہی مستقلاً پاکستان منتقل ہو جائیں گے۔ اور تو اور مولانا ظفر احمد انصاری نے جو جماعت کے غیر ممبر مخلص ترین رضاکار ہیں" مجھ سے پوچھا کہ مولانا عبد الماجد صاحب کیوں آئے ہیں۔؟ میں نے عرض کیا کہ غلام محمد صاحب کی شخصی دعوت پر محض دوستانہ ملاقات کے لئے۔ انصاری صاحب بولے "نہیں مولانا کو جماعت اسلامی کا زور توڑنے کے لئے یہاں مستقلاً بلایا جا رہا ہے۔"

میں نے عرض کیا کہ میں مولانا کے مزاج سے خوب واقف ہوں ان کو کوئی شخص کسی قیمت پر "استعمال" نہیں کر سکتا، اُن کی تائید ہو یا مخالفت وہ ان کی اپنی فکر و فہم کی بنا پر ہوتی ہے، فرمائش یا دباؤ کا وہاں گذر نہیں۔ مگر انصاری صاحب کو یقین نہیں آیا، بولے۔ "دیکھئے گا" ۔۔۔ میں نے دل میں کہا کہ ہم کیا دیکھیں آپ ہی دیکھئے گا ۔۔۔ دن گذرتے رہے مولانا کی روانگی کی مدت قریب آگئی۔ گورنر جنرل پاکستان نے اصرار پر اصرار کیا کہ مولانا ایک ہفتہ اور رک جائیں مگر مولانا نے بس یہی جواب دیا کہ بس اتنی ہی مہلت نکال کر اور اتنی ہی مدت کے لئے صدق اور دوسرے کاموں کا انتظام کرکے چلا تھا ایک دن کی بھی دیر ہوگی تو نظام میں خلل پڑ جائے گا۔ چنانچہ ٹھیک اپنے پروگرام کے مطابق مولانا یہاں سے روانہ ہو گئے اور رقیبانہ نگاہیں نہ جانے کب تک سامان بدگمانی لئے ان کی واپسی کو تکتی رہیں مگر پھر مولانا کراچی تشریف نہیں لائے۔

عام طور پر قاعدہ ضابطہ برتنے والوں کا مزاج رکھا اور خشک اور لوچ اور ذوق محبت سے عاری ہوتا ہے مگر ہمارے مولانا ایسے نہیں وہ اسقدر پابند نظم و ضبط ہو کر بھی بہت رقیق القلب، بڑے شفیق اور محبت نواز ہیں، ان کا دل خشیت الہٰی سے لرزاں رہتا ہے۔ باتوں باتوں میں دل کا بھر آنا، آنکھوں سے آنسوؤں کا بہہ نکلنا خود اسی عاجز نے بھی دیکھا ہے۔ اپنے محبوب معاصرین کی رحلت پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے تعلق خاطر اور رابطۂ الفت کے موثر نقوش ہیں، دوست داری کا یہ حال ہے کہ جب کبھی دریاباد سے لکھنؤ جانا ہوا تو اپنے بزم احباب کے رکن آخریں مولانا عبد الباری صاحب ندوی (مدظلہ) سے (جو عمر سے صاحب فراش ہیں) ان کے گھر جا کر ملے بغیر چین نہیں آتا۔ چند ماہ پہلے مولانا عبد الباری صاحب نے اس عاجز کو لکھا کہ "ماجد میاں" مدراس کے اس طویل سفر سے لکھنؤ پہنچے اور اس ناکارہ کی خبر گیری کے

سابق سکریٹری مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی وحالیہ منتخب ممبر رکن مرکزی اسمبلی پاکستان

لئے گھر تشریف لائے، تعلق اور وضعداری میں ذرا فرق نہیں آنے دیتے۔ یہ انھیں کی ہمت ہے۔" یہی معاملہ چھوٹوں کے پر شفقت کا دیکھا کہ اپنی طرف سے عریضہ لکھنے میں کبھی غیر معمولی تاخیر ہو گئی تو فوراً خیریت طلبی کا کرم نامہ آجاتا ہے، بہت مختصر مگر پُر از محبت، کیفیت، کمیت سے بے نیاز کئے ہوئے

یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ حلقۂ احباب کے مخلص اور مقبول، اپنے گھر اور خاندان کے قاطع رحم اور نامقبول ہوتے ہیں، مولانا گھر اور باہر ایک ہیں۔ ڈپٹی عبد المجید مرحوم کی رحلت پر "ناز برادرانہ بھائی" کے زیر عنوان جو کچھ مولانا نے صدق میں لکھا یا پھر اپنی اہلیہ کی وفات پر "بوڑھی محبوبہ" کے عنوان سے جو اثر انگیز واقعات تحریر فرمائے ان کا لفظ لفظ خون دل کی تراوش ہے جو گہری محبت اور "احساسِ فراق" کا پتہ دے رہا ہے جو ایک محبت آفرین خاندانی زندگی ہی میں پایا جا سکتا ہے۔

مولانا کی زندگی ایک بہت ہی کم یاب وصف یہ ہے کہ ان کی زندگی ایک متعین مقصد کے لئے وقف ہے دین و ملت کی علمی اور فکری خدمت کو انھوں نے اول روز سے اپنا مقصد بنایا اور آج تک سر مو اس سے ہٹنے نہیں پائے۔ حالانکہ نصف سے زائد صدی کے عرصہ میں کتنے انقلابات آئے اور لوگ کیا سے کیا ہو گئے کوئی مسندِ علم اٹھ کر خار زار سیاست میں جا پڑا، کوئی خدمت ملی کو چھوڑ کر حکومت کی کرسی پر چڑھ بیٹھا، کسی نے مدارس سے اکتا کر خانقاہ کی راہ لی، کتنے بوریہ نشین زاہد و متوکل حرص دنیا اور حُب مال کے دلدل میں جا پھنسے مگر مولانا اس سارے طوفان حوادث میں اپنی جگہ ایسے قائم رہے گویا قدرت نے انھیں کوہ جودی پر بٹھلا رکھا ہے،

یاد ہے پاکستان کے دوران قیام میں احقر کی موجودگی میں ایک صاحب نے مولانا سے عرض کیا کہ اب تو پاکستان تشریف لے آئے ہیں۔ ہندوستان میں کیا رکھا ہے، مولانا کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی اور ناگواری کے لہجہ میں فرمایا "آپ کے نزدیک میں ہندوستان میں بیٹھا تضیع اوقات کر رہا ہوں"؟ اپنے دائرے میں مولانا کی جو خدمات "صدق جدید" کے ذریعہ تقسیم ہند کے بعد جاری ہیں وہ اس معاصر کے لئے معمولی نہیں، مولانا کے کام میں بلا شبہ کی چمک اور کڑک نہیں مگر غور سے دیکھئے تو ماہتاب کی خاموش فیض رسانی کا اثر موجود ہے۔

مولانا درباری مجلسی آدمی بالکل نہیں، تحریر میں وہ جس قدر شگفتہ بلکہ شوخ و شنگ نظر آتے ہیں، مجالس میں وہ اس کے برعکس سراپا سکوت اور مرقع وقار رہتے ہیں، یہ نہیں کہ وہ کھلتے ہی نہیں مگر اس کے لئے بہت ہی محدود مجلس اور خاص بے تکلف اہل ذوق شرط ہے، ایسی مجلس میں مولانا کی ظرافت اور ادا پورے جوہر دکھاتی ہے مگر عین ایسے وقت میں اگر کوئی بھی غیر آگئے تو وہ دفعتاً ایسے بند ہو جاتے ہیں جیسے چھوئی موئی کا پتہ ذرا سے چھو جانے سے بند ہو جاتا ہے

—— کراچی جب مولانا تشریف لائے تھے یہاں "ادارہ صحت نفس (Mental Hygiene Association)" نے مولانا سے استفادہ کے لئے ایک خاص مجلس مذاکرہ منعقد کی جس میں دس بارہ افراد سے زائد نہ تھے۔ راقم الحروف ہی کے ساتھ اس مجلس میں تشریف لائے، گفتگو کا آغاز ادارہ صدر کے ڈاکٹر کرنل سنا[illegible] کیا "تعدد ازدواج" کا مسئلہ اسلامی نقطہ نظر سے زیر [illegible] آیا، تقریباً ہر حاضر مجلس نے اپنا اپنا خیال پیش کیا اور سب کا منشا یہ تھا کہ مولانا آخر میں اس پر دینی لحاظ سے تفصیلی روشنی ڈالیں گے، مگر اہل مجلس [illegible] اٹھانی پڑی، بس یہ رہا کہ مذاکرہ کے دوران کبھی سر کے اشارے سے اور کبھی ٹھیک [illegible]

[illegible]

فارغ ہو چکی تو مولانا نے مجھ سے فرمایا " آپ ان حضرات
فرما دیں کہ میں مجلسی آدمی نہیں ہوں اپنا لٹریچر میرے رکھ
دیں میں اس کو پڑھ کر اپنی رائے لکھ دوں گا " ـــــ
الے تو پہلے ہی اپنے احباب ادارہ کو یہ بات بتلا دی تھی
ان کو یقین اس ملاقات کے بعد ہی حاصل ہوا۔

مولانا کا ایک بڑا کمالِ وصف یہ ہے کہ وہ بڑے
نواز اور قدر داں و قدر افزا ہیں۔ اس جوہری کو جس
میں کہیں صلاحیت کی جوت نظر آتی اس نے اپنے گوشہ
ل میں بیٹھے بیٹھے خطوط کے چھوٹے چھوٹے ہلکوں
اس کی ایسی ... کہ اس کی اصل صلاحیت ہیرے
طرح چمک اٹھی خود اس ہونہار کو ... میں سب
پہلا اور بڑا ہاتھ مولانا ہی کا ... کے سال
میں پہونچ کر صدق ... ماجدی کا
ل کر دیا، پھر انشا نے خود ... دلچسپی پیدا
مولانا کی شخصیت ... پیدا ہو گیا اسلت کی
مداوست ۱۹۳۹ء سے ہوئی ... بڑھتا گیا، نفع پہونچتا
ہمت افزائیوں نے مضمون نگاری سے بڑھ کر تصنیف تالیف
جرأت پیدا کر دی اپنی پہلی تصنیف نواب بہادر یار جنگ
کی سوانح ... "بہادر یار" ... دو حرف لکھنے
درخواست کی، مقدمہ جب لکھ کر آیا تو اپنے وہم و گمان
کہیں زیادہ سامان ہمت افزائی کے لئے ہوئے اس
صنیف نے اس گمنام کو اہل قلم میں کچھ متعارف کردیا اور
مضامین کا سلسلہ اور صدق کے ذریعہ مولانا کی ذرہ
ازیاں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ جب مرشد اقدس علامہ
مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تو
ان کی سوانح نگاری کے لئے مولانا نے صدق میں اس
عاجز کا نام تجویز فرمایا جو اوروں کے لئے تو تعجب کا باعث
تھا ہی خود اپنے لئے بھی تمامتر حیرت سامانیاں ہی لئے
ہوئے تھا۔ مگر جب بہ تائید الٰہی تذکرہ سلیمان پیش کرنے

کرنے کی سعادت ملی تو اللہ کے فضل و عنایت سے تجویز ماجدی
کو ہر شخص نے سراہا اور خود حضرت دریابادی مدظلہ کا بزرگانہ
شکر و مسرت سے کھلا ہوا چہرہ اب تک نگاہوں میں تازہ ہے
جب لکھنؤ میں ملاقات ہوتے ہی مولانا نے شفقت بھری
نظریں مجھ ناکارہ پر ڈالیں اور فرمایا اور اشارہ تذکرہ
سلیمان کی جانب تھا "اب کیا فرماتے ہیں وہ حضرات جن کو
میری تجویز پر حیرت تھی"۔ میں نے عرض کیا کہ اب تو
خود ان حضرات کے خطوط بھی بہت داد و تحسین کے آئے
ہیں۔ ـــــ غرض اپنے پر قیاس کر کے یقین کے ساتھ کہہ
سکتا ہوں کہ جب فیضانِ ماجدی کی شعاعیں شمال سے
دکن کے گوشوں تک پھیل سکتی ہیں تو انھوں نے اپنے اطراف
کو کتنا کچھ فیضیاب نہ کیا ہوگا۔ اور کتنے ذرے انہی شعاعوں
سے چمک نہ گئے ہوں گے۔

آخر میں دل کی ایک بات ! ۔ جولائی ۱۹۶۰ء میں جب
لکھنؤ جانا ہوا تو یہاں اصل مقصود حضرت مولانا عبدالباری
ندوی مدظلہ سے باطنی استفادہ تھا۔ مگر اس سفر کا ایک
اور ارمان تھا کہ لکھنؤ سے دریاباد ضرور حاضری دوں گا
اور وہاں پہونچ کر بالکل تخلیہ میں جب طالب و مطلوب
کے سوا کوئی اور موجود نہ ہوگا اپنا یہ ارمان نکالوں گا مگر
افسوس کہ اپنے ارادے بلکہ خود حضرت دریابادی مدظلہ
سے وعدہ کر لینے کے باوجود دفعتاً پروگرام ملتوی کر کے
لکھنؤ سے حیدرآباد دکن جانا پڑا اور دل کی بات دل
میں رہ گئی۔ اب جب کہ دوبارہ حاضری اور حصول نیاز کا
قریبی امکان باقی نہیں رہا ہے، اس وقت جامی سامی کی
طرف سے ایک مخفی اکساہٹ دل میں پا رہا ہوں۔ ؎

بیا جاناں کہ رہا کن شرمساری
زصاف و دُرد پیش آر آنچہ داری

ارمان یہ تھا کہ اپنے مخدوم کو دور حاضر کے مدعی نبوت کے
بارے میں ان کے "تاویلی" مسلک سے جس کی وجہ سے

دل لرز اٹھتا ہے، مٹانے کی وہ تدبیر اختیار کی جائے جو اب تک کسی نے نہ کی ہو۔ جی میں یہ تھا کہ محبت و برہان کے ذریعہ نہیں کہ اس کا تو اتمام بھی ہو چکا اور یوں بھی پھر

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے

بلکہ عشق و محبت کی راہ سے کہ پھر

عشق بے چارہ نہ مُلّا نہ فقیہہ!

اپنے مخدوم و محبوب کو منوا لیا جائے —— ارادہ یہ تھا کہ ان کے پاؤں پکڑ لینا اور اپنا سر ان کے قدموں پر رکھ کر حبّ نبوی کا واسطہ دے کر عرض کرنا کہ اس مسئلہ میں اب رجوع ہی فرما لیں، اور اس وقت تک نہ چھوڑنا کہ وہ مان ہی لیتے یا جھلا کر قدم بوس کو ٹھکرا دیتے مگر یہ احتمال ہی احتمال تھا، اپنی نیاز مندی اور ان کی شفقت و محبت نوازی اور نیک نیتی اور ان کی جوہر شناسی یقین سے کہ ان کو ماننے پر مجبور کر دیتی۔

معذرت خواہ ہوں کہ مضمون کا سلسلہ ایسے وقت میں آیا کہ اس گنہگار کی بارگاہ رحمت میں طلبی کے سامان ہو چکے تھے یعنی سفر حج اب دو ہی تین دن میں مقدر ہو دل و دماغ کو حرمین شریفین کی جاذبیت تمام تر اپنی طرف کھینچے ہوئے ہیں اسلئے "سفر نامۂ حجاز" مردوں کی مسیحائی اور سیرت نبوی قرآنی کے مصنف اور اپنے محسن مخدوم پر جو کچھ لکھ سکتا تھا اور لکھنا چاہیے تھا کچھ بھی نہ ہو سکا۔

۴۸۶
۹۲

توایخ مراتب اعلیٰ — باخراج عقیدت

۱۹۷۱ عیسوی ۱۳۹۱ ہجری

بگرامی خدمت پاک نہاد جناب الحاج مولٰنا عبدالماجد

تیرے قلم نے بزم ادب میں
فکر رسا کی شمع جلا دی
شعر سے بڑھ کر تیرے فقرے
نثر کی عظمت تو نے بڑھا دی
حسن بیاں سے طرز ادا سے
حرف کے آئینے کو جلا دی
تو ہی فروغ شمع سخن ہے
مرشد اُردو! نثر کے بادی
رہبر عالی، فاضل، ناقد
عبدالماجد دریا بادی

۱۹۷۱ عیسوی

نیاز مند: معین الدین فریدی۔ استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی

حضرت آوارہ

مولانا عبدالماجد کی طالب علمی کا زمانہ

ایک اسکولی ساتھی حضرت آوارہ کا مکتوب

بنام فرقت صاحب کاکوروی

فرقت صاحب! حقیقت حال یہ ہے کہ بچپن کا یہ ساتھ، بقول غالب

ع ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

مولانا میرے ہم مدرسہ ضرور تھے۔ ہم دونوں کا کا بھائی کے تھے۔ میں ۱۳۰۸ ہجری کے ربیع الاول میں پیدا ہوا۔ عیسوی سن ۱۸۹۰ تھا مولد سیتاپور روہیں پرورش پائی۔ خاندانی رواج کے مطابق فارسی عربی کے درسیات سے فارغ ہو کر انگریزی شروع کی۔ جو بلی ہائی اسکول لکھنؤ کے چھٹے درجے میں داخل ہوئے اور وہاں سے منتقل ہو کر ۹ ستمبر ۱۹۰۵ء کو گورنمنٹ ہائی اسکول کے چھٹے درجہ میں آ گیا۔ ماجد میاں سے ربط کیسا یہ بھی یاد نہیں کہ وہ اسکول میں تھے یا نہیں۔ نویں درجہ تک یہی حال رہا۔ اب آپ کا بھائی بھی نویں میں داخل ہوئے تھے۔ مولانا جنکے ہم سبق تھے۔ ان سے میل جول کا سوال نہ تھا۔ کھیل کے میدان میں بھی وہ کبھی نہیں پائے گئے۔ ان دنوں ہیڈ ماسٹر تھے

چھانی (رہردوئی) کے بابو گھمنڈی لال۔ ڈسپلن کے اتنے سخت کہ اسکول کے پیچھے پیاؤ پر یا چھوٹی رفع حاجت کے لئے ایک ساتھ دو ہم سبق باہر نہیں جاسکتے تھے۔ چند ... پانی چھٹی میں مولانا بھی ٹم ٹم پر سول لائنز کے بنگلے چلے جاتے۔ انکے بنگلے پر ۱۲ ربیع الاول کو محفل میلاد منعقد ہوتی۔ نماز مغرب کے وقت سلام پڑھا جاتا۔ آپ کا بھائی حافظ اور قاری تھے بہت خوش الحان وہ جاتے اور قصیدہ بردہ سناتے اور پنج آیت پڑھتے۔ مجھے وہاں بار نہ تھا۔ ماجد میاں کے والد مولوی عبدالقادر صاحب ایک وجیہ سنجیدہ بزرگ تھے۔ کچہری میں ڈپٹی اور شہر میں یا مسلمان اللہ اللہ یا برہمن رام رام۔ جامع مسجد جمعہ کی نماز کے لئے ہمیشہ آتے۔ مولانا اور انکے بڑے بھائی مرحوم عبدالمجید ہمراہ ہوتے۔ آپ کا بھائی تو مولانا کے ساتھی تھے ہی انکا ایک اور گہرا دوست ڈسٹرکٹ جیلر کا خوبرو لڑکا دین سہائے بھی یاد پڑتا ہے۔

اکثر مولانا اُس کے تانگے میں آتے۔ اسکول کی پوری
زندگی میں جو ۱۹۲۲ء میں میٹرک کر کے ختم ہوئی ایک
اور صرف ایک واقعہ وہ بھی ادھورا سا یاد ہے صوبے
کے ڈائریکٹر تعلیمات سی ایف ڈی لا فوس جو رسمی
دورہ آئے تھے تیسرے پہر کو مدرسے کے سامنے
ضلع کے سارے گورے کالے حکام اور عمائد شہر
میں جمع تھے۔ اس جلسے کے صدر تھے مسٹر پیل (PEEL)
سشن جج سنا تھا کہ یہ صاحب مشرقی علوم اور السنہ
کے ماہر تھے۔ جلسے کا آغاز جمناسٹک کے کرتبوں سے
ہوا تھا۔ پھر مختلف زبانوں کے حمد اخلاقی نظمیں بطور
RECITATION پیش کی گئی تھیں۔ میرے
عربی کے اُستاد معظم حضرت مولانا حضرت مولانا
عظمت اللہ فرنگی محلی نے میرے لئے عربی کی حمد
مولائے کائنات سرکار مرتضوی سے منسوب پسند
فرما کر یاد کرائی تھی۔ جسکا پہلا مصرعہ الحمد للہ [illegible]
[illegible] ہم نے دو روپئے
اور ریشمی رومال دیا جلسے کی آخری مد ایک مکالمہ تھا
جسکے شریک دو تھے۔ ایک مولانا دوسرے میں۔ وہ
اسکندر اعظم تھے۔ میں پورس مکالمہ کسی طرح شروع
ہوا۔ یاد نہیں۔ البتہ نقطۂ عروج وہ تھا جب سکندر
[illegible]
کر کے پوچھا تھا [illegible] کیسا برتاؤ کیا
جائے؟ [illegible]
[illegible]
[illegible]
سن کر سکندر [illegible] اُٹھتا تھا اور پورس کو گلے

لگا کر مختصر ملک واپس [illegible] تھا۔ میٹرک پاس کر کے
میں کیننگ کالج میں داخل ہوا۔ وہاں ماجد میاں بی اے
میں پہونچ چکے تھے۔ غالباً سلام علیک کی نوبت بھی نہیں
آئی۔ میں مولانا کی علی گڑھ اور حیدرآباد کی
زندگی سے بالکل واقف نہیں اب کئی برس پہلے
آل انڈیا ریڈیو میں گھڑی بھر کی ملاقات ہوئی۔
دیکھا تو اب وہ مولانا صوفی اور درویش تھے۔ وہ
میرے خاندان چھوٹے بڑے زن و مرد سے خوب
واقف ہیں۔ اور میں انکو اپنا بزرگ بھائی [illegible]
کے برابر سمجھتا ہوں۔

ملا واحدی دہلوی مقیم کراچی

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب [illegible]
نت سے ہول جب [illegible] المعظم
ے۔ اور انھوں نے [illegible]
سے علامہ شبلی نعمانی کی کتاب الکلام [illegible]
وردار تھا [illegible] مضمون لکھا [illegible]
[illegible] تھے اور انھوں [illegible]
[illegible] سے کہا کہ "میاں! یہ [illegible]
پاس لاؤ" یہ بات مجھے عبدالملک [illegible]
پھر طالب علم صاحب کو علامہ شبلی کے پاس [illegible]
[illegible] اور علامہ شبلی [illegible]
[illegible] اور [illegible] ابوالکلام [illegible]
علمی اور اسلامی دنیا کو دیئے تھے۔ طالب علم [illegible]
[illegible] میں لگ گئے اور طالب علم صاحب [illegible]
برا ماننے والے اور [illegible] کے [illegible]
گرویدہ ہوتے گئے۔

لیکن ابھی طالب علم صاحب مسٹر عبدالماجد [illegible]
سنہ ۱۹۲ء میں ارادہ کیا کہ [illegible] کرائیں [illegible] گا
سرسین سینٹ اسٹیفنز کالج دلی میں فلسفے کے [illegible]

تھے۔ ان کی فلسفہ دانی کا شہرہ تھا۔ مسٹر عبدالماجد سینٹ اسٹیفنز کالج [illegible] داخل ہونے آئے سنہ ۱۹۱۹ء میں میرا [illegible] نکل رہا تھا اور میں نے نیاز فتحپوری [illegible] نیاز فتحپوری کہلاتے تھے۔ نگینہ [illegible] کے لئے بلا لیا تھا۔ نیاز صاحب سے ملنے مسٹر [illegible] لگے تشریف لائے لیکن تلاسیج [illegible] نہیں فرمایا۔ وہ بے نیازانہ [illegible] نیاز صاحب کے تعارف کرانے پر مجھے دیکھا گیا تھا [illegible] مسٹر عبدالماجد جوش ملیح آبادی کے ساتھ حضرت خواجہ [illegible] میں نظر آئے۔ دونوں رندی کے [illegible] تھے۔ خواجہ صاحب نے "آپ فلسفی [illegible] صاحب" کہہ کر خیر مقدم کیا۔ آنے کا مقصد صرف [illegible] دیکھنا اور ایک مشہور و ممتاز قلم کار سے ملاقات کرنا تھا۔ نیاز صاحب کے پاس بھی ان کی [illegible] پروادی ہی [illegible] کی۔ ملاقات نیاز صاحب سے اور خواجہ صاحب سے پہلے کی ہوئی لیکن میں نے بس ایک ایک بار دیکھا۔

یہ مسٹر عبدالماجد پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا
ان کا سابقہ علامہ شبلی جیسے مولوی سے پڑا، جو کہ

فتوے دے کر کفر کی چنگاری بھڑکانے والے مولوی نہیں تھے، بلکہ گم گشتہ راہ کی سرپرستی کر کے اصلاح کرنے والے مولوی تھے۔ علامہ شبلی کے ساتھ ساتھ حضرت اکبر الٰہ آبادی بھی مسٹر عبدالماجد کو سنبھالتے رہے۔ حضرت اکبر کا مسٹر عبدالماجد کے والد ماجد سے دوستانہ رہ چکا تھا۔ حضرت اکبر نے مسٹر عبدالماجد کی خوب سنبھال کی، اور علامہ شبلی تو مردم شناس ہی نہیں مردم ساز بزرگ تھے۔

ہاں میں یہ لکھنا بھول گیا تھا کہ اسی دور میں مسٹر عبدالماجد نے مضامین کے علاوہ اس دور کی دو معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کیں۔ جنھیں اس رنگ کے لوگوں ہی نے نہیں، میں نے بھی شوق سے پڑھا تھا۔ ایک کا نام شاید "فلسفۂ جذبات" دوسری کا "فلسفۂ قیادت"۔ حضرت مولانا عبدالماجد اب سے اپنی تصنیفات سے خارج کر چکے ہیں اور بھلا چکے ہیں ممکن ہے میں بھی صحیح نام بھول گیا ہوں۔

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب کا علامہ ابوالکلام سے معرکہ بھی یاد ہے، مگر وہ خالص ادبی و لسانی تھا۔ اور اخبار "الہلال" جاری ہونے کے بعد ہوا تھا۔

حضرت اکبر اور علامہ شبلی سے تربیت پا کر مسٹر عبدالماجد رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی صحبت میں پہونچے۔ اور سیر نے سوا سیر کو اللہ تعالیٰ اور دین اسلام کی طرف متوجہ دیکھا اس کا بھی بہت اچھا اثر پڑا۔ اور پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے فیض صحبت سے ان میں عظیم اور قابل رشک انقلاب آگیا۔

تمام تربیت کنندگان نے مسٹر عبدالماجد سے چیز نہیں عمل، اپنے عمل اور کردار، اور اپنے نمونہ سے متاثر کیا، اور انھیں مسٹر عبدالماجد سے مولانا عبدالماجد کر دیا۔ اور یہ خداداد صلاحیت تھی کہ مولانا عبدالماجد واقعی مولانا عبدالماجد ہو گئے۔ "مولانا" غیر مولوی بے شمار ہیں، لیکن مولانا عبدالماجد سچ مچ مولوی ہیں اور مولویوں سے بڑھ کر مولوی ہیں۔

دنیوی اور دینی دونوں علوم جانتے تھے ان سے غیر معمولی خدمتِ اسلام انجام دلائی ہے۔

مولوی صاحبان اس شخص کو اپنی جماعت میں شامل نہیں کیا کرتے، جس نے کسی دینی مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہو۔ حضرت مولانا عبدالماجد ایسے تنہا ایسے شخص ہیں، جنھیں مولوی صاحبان مانتے ہیں اور ان کے ترجمہ و تفسیر قرآن مجید کی خوبیوں کے معترف ہیں۔

حضرت مولانا عبدالماجد نے اپنے ترجمہ و تفسیر کو انگریزی میں بھی پیش کیا ہے۔ میں ہندوستان کے مسلمانوں کو دنیا بھر کے مسلمانوں سے بہتر سمجھتا ہوں، ان میں حضرت مولانا عبدالماجد فائق ترین مسلمان ہیں۔ مراد غالباً مسلمانوں سے ہے۔ اور ۱۹۴۷ء سے پہلے کے مسلمانوں سے ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہونے والوں، یا پلنے والوں کا حال میں نہیں جانتا۔

حضرت مولانا عبدالماجد صحابہ کرامؓ کے قدم بہ قدم ہیں۔ انھیں دیکھ کر حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی صورت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور توکل اور تقویٰ اپنی آپ مثال ہے۔ عجیب کایا اللہ تعالیٰ نے مسٹر عبدالماجد کی پلٹی ہے! ایسی اللہ ہر مسٹر کی پلٹے۔

اوپر میں مسٹر عبدالماجد دریابادی کی ۱۹۱۸ء کی نظربندی کا ذکر کیا ہے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر میرے پڑوس میں آکر رہے اور مجھ پر بے حد کرم فرماتے تھے۔ تو حضور نے مسٹر عبدالماجد کو اور ان کی نظروں کو قربان کر دیا۔ اب وہ مسٹر نہیں مولانا تھے۔ نماز کو حقیر کیسے سمجھتے، بے نیازی ہونے کے بجائے غیر معمولی توجہ اور رغبت پیدا شروع ہوگئی۔

حضرت مولانا عبدالماجد کو روزنامہ ہمدرد کے سلسلے میں مہینے کے مہینے دلّی تشریف لانا پڑتا تھا۔ مولانا محمد

مولانا غلام رسول مہر (لاہور)

مولانا عبدالماجد دریابادی
عقیدت و ارادت کا ایک گلدستہ

مولانا عبدالماجد سے غائبانہ تعارف پہلے پہل ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا جب میں اسلامیہ کالج لاہور میں سکنڈ ایر کا طالب علم تھا۔ اس سال "الہلال" ماہ جون کے دو نمبروں میں مولانا کا ایک مضمون "حظ و کرب" کے عنوان سے شائع ہوا جس کے آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ایک مختصر سے نوٹ میں توضیح فرمادی تھی کہ "حظ و کرب" کی جگہ "لذت و الم" کے الفاظ زیادہ صحیح اور موزوں تھے۔

محض مضمون سے تو شاید مولانا عبدالماجد (جنہیں اس زمانے میں "مسٹر" عبدالماجد کہا جاتا تھا) کی شخصیت کا نقش لوحِ حافظہ پر زیادہ گہرا نہ جمتا لیکن مولانا عبدالماجد نے مولانا ابوالکلام مرحوم کی تجویز پر بحث شروع کردی اور "حظ و کرب" یا "لذت و الم" کا سلسلہ کئی مہینے تک جاری رہا جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس شدید اختلاف کی حالت میں بھی مولانا ابوالکلام مرحوم نے اس زمانے کے "مسٹر" عبدالماجد کے متعلق جو الفاظ فرمائے تھے، وہ اب تک ذہن میں تازہ ہیں اور قابل ملاحظہ ہیں۔ فرمایا تھا:

"آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں، جن کو عام حالت میں حق امتیاز و استثنا حاصل ہے اور ہماری مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نشان امید رکھتے ہیں۔ میں ان کی وقعت کرتا ہوں انھیں چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبدالماجد بی۔ اے بھی ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو انشاء اللہ بہت فائدہ پہونچائے گا اور علوم حدیثہ کے تراجم میں ان سے بہت مفید مدد ملے گی جو اب تک اردو زبان میں گویا مفقود محض ہیں۔"

(الہلال ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء)

(۲)

مولانا ابوالکلام کے یہ الفاظ بہر حال میں مو عبدالماجد کی غیر معمولی قابلیت کا کھلا ہوا اعتراف جہاں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد

سے کم و بیش پچاس سال پیشتر وقت کے ایک نہایت بلند پایہ صاحب علم کے نزدیک، امتیاز و استثنائے خاص کے مستحق سمجھے جاتے تھے، وہاں مولانا ابوالکلام مرحوم کی یہ خصوصیت ہی منظر عام پر آتی ہے کہ وہ شدید اختلاف کی حالت میں بھی مخاطب کی خداداد صلاحیتوں کے اعتراف و ستائش میں ہرگز تامل نہیں فرماتے تھے۔ آج [illegible] کی جوہر شناس نگاہیں کہاں ہیں؟ پھر ماحول اور فضا سے بالکل بے تعلق ہو کر اعتراف حقیقت کی [illegible] کہاں سنی جا سکتی ہیں؟

(۳)

مولانا ابوالکلام مرحوم کی [illegible] گوئی کا ایک حصہ [illegible] مولانا عبدالماجد کی ذات گرامی [illegible] کہا جا سکتا ہے کوئی بڑی [illegible] اس کا دامن گراں بہا جواہر پاروں سے [illegible] ہی بھر سکتی جس پیمانے پر مولانا عبدالماجد [illegible] البتہ یہ ظاہر ہے کہ علوم حدیثہ کے تراجم [illegible] وقت صرف کرنے کے بجائے مولانا عبدالماجد نے [illegible] حق کی نشر واشاعت اور خدمت گزاری [illegible] دے لیا اور گزشتہ پچاس سال کے شب و [illegible] میں گذار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے [illegible] کے دائرے کو زیادہ سے زیادہ وسعت [illegible]

(۴)

مرزا غالب فرماتے ہیں :

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم

ہر صاحب فکر و نظر کے ذہنی ارتقا میں مختلف مراحل پیش آتے ہیں۔ بعض کی ترقی کسی نہ کسی درمیانی منزل پر رک جاتی ہے اور وہ آگے نہیں بڑھتے، جنھیں منازل ارتقا میں تائید ایزدی کا شرف حاصل ہو جاتا [illegible] اہم مقامات یعنی منظور [illegible] ہیں وہ منزل مقصود پر پہونچے بغیر کہیں نہیں رکتے مولانا عبدالماجد بھی ماشاء اللہ ایسے ہی خوش نصیب [illegible] فضل باری تعالیٰ برابر سایہ فگن [illegible] وہ اسی منزل پر پہونچ کر رکے جہاں مشیت کو [illegible] ان کے علمی سفر کی ابتدا فلسفے [illegible] انھوں نے درجۂ اختصاص [illegible] تصنیفات اس مبارک [illegible] ان کے [illegible] رکاوٹ نہ بن سکیں۔ [illegible] قدرت نے بطور خاص انھیں عطا کیا تھا [illegible] وہ اسی کے لئے موزوں تھے [illegible] ہو کر روانہ ہوئے تھے تو کسی کو [illegible] خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی اصل منزل [illegible] دین حق اور اصلاح خلق ہے جسے وہ جلد [illegible] ان کی بابرکت زندگی کا ایک ایک لمحہ [illegible] اشاعت دین ہی کے لئے وقف رہا۔ [illegible] زندگی کی سعادت اندوزیوں اور مراد مندیوں [illegible] گراں بہائی کے بارے میں کچھ ایسا فرمایا، علم و [illegible] کیا کہہ سکتا ہے جو نصف صدی کے لیل و نہار [illegible] کائنات کی بہترین اور جامع ترین خدائی تعلیم

...تارنے کے لئے بسر کر چکی ہے اور کون اسے زیادہ سے زیادہ باعث صد رشک قرار نہ دے گا؟

(۵)

اس سلسلے میں اولین درجہ بے شک وشبہ قرآن مجید کے انگریزی اور اردو ترجموں کو حاصل ہے۔ جن کے ساتھ تشریحی وتفسیری حواشی تحریر فرمائے۔ اب اردو ترجمہ نظر ثانی کے بعد مزید تفسیری حواشی کے ساتھ جلد وار دوبارہ چھپ رہا ہے۔ ان کے علاوہ بے شمار کتابیں مولانا نے مدون فرمائیں۔ چھوٹی بھی اور بڑی بھی۔ پھر عرصہ دراز سے انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کر رکھا ہے جو پہلے باشتراک مولانا ظفر الملک علوی مرحوم مدیر "الناظر" "سچ" کے نام سے جاری ہوا تھا پھر تنہا مولانا نے "صدق" کے نام سے جاری کیا۔ اب وہ "صدق جدید" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ مولانا اس اخبار کے فرائض بھی پورے کر رہے ہیں۔ کتابیں بھی مرتب فرما رہے ہیں مختلف قومی وملی تقریبات میں بھی شریک ہوتے ہیں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ماہانہ رسالہ کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

(۶)

انھوں نے ابتدا میں ادب، فلسفہ، تاریخ وغیرہ پر خاص توجہ فرمائی اور خاصا بلند درجہ حاصل کر لیا۔ یہ سب کچھ اس خدمت گزاری میں ان کا رفیق ومعاون بنا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کی زندگی کا مشغلہ خاص بن گئی۔ واضح رہے کہ علمی خدمات کے سلسلے میں اصل معاملہ تفصیلات کا نہیں بلکہ تمام تفصیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقاصد کے لئے صحیح اصول پر صرف فرمانے کا ہے۔ مولانا عبدالماجد کی ذات گرامی بھی اس کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ فلسفے کو عموماً گمراہی کا موجب جانا جاتا ہے۔ یقیناً یہ گمراہی کا موجب بن سکتا ہے، بشرطیکہ مقاصد واصول کی بنیادیں استوار نہ ہوں لیکن مولانا عبدالماجد کی عقل سلیم اور فہم مستقیم کو فلسفے سے فائدہ ہی پہنچا، بفضل اللہ نقصان کوئی نہیں ہوا۔

(۷)

تحریک ترک موالات میں بھی مولانا نے سرگرم حصہ لیا تھا۔ وہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم مغفور [illegible] کا مرید [illegible] فرما رہے اور ان کے متعلق ایک نہایت عمدہ کتاب مرتب فرمائی۔ [illegible] دوسری اسلامی [illegible] کا رشتہ استوار ہوا۔ جو اب تک بدستور قائم ہے اگرچہ بعض امور میں مولانا سے اختلاف [illegible] لیکن اختلاف صرف جزوی امور کے سلسلے میں ہوا جس سے مقاصد میں اتفاق ویک جہتی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا جوش جوانی کے دور کو چھوڑ کر میرا عمل یہی رہا ہے کہ جہاں مقاصد واصول میں اتفاق وہاں جزوی اختلافات گوارا کر لینا چاہیے یا ان کا دائرہ صرف نفس اظہار تک محدود رہنا چاہیے

مقاصد واصول کے اختلاف کا معاملہ دوسرا ہے اس کے بارے میں بھی جذبۂ اختلاف کی تسکین کے لئے نہیں، صرف اپنے تصور کے مطابق امرحق کی توضیح کے لئے لکھنا پڑتا ہے۔

(۸)

میں مولانا عبدالماجد کے متعلق مفصل مقالہ لکھنا چاہتا تھا جس میں ان کی علمی و دینی خدمات کے بعض نہایت اہم پہلو واضح کرنے مقصود تھے لیکن افسوس کہ اوائل جنوری میں بیمار ہوگیا۔ اور کم و بیش ڈیڑھ مہینے بے حد پریشان رہا پھر بیماری سے نجات ملی تو ضعف مسلط رہا اور مجھے اطمینان سے بیٹھ کر خیالات جمع کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اب اپنے عزیز دوست مولانا حکیم عبدالقوی صاحب منیجر "صدق جدید" کے نامۂ گرامی سے معلوم ہوا کہ مقالہ کے لئے زیادہ انتظار ممکن نہ ہوگا لہٰذا سرسری معروضات صفحہ قرطاس پر پھیلا رہا ہوں کہ مولانا کے سلسلے میں جو خاص نمبر نکل رہا ہے اس میں شرکت کی سعادت سے محروم نہ رہ جاؤں۔

دوسرے اصحاب مولانا کی بارگاہِ عظمت میں بڑے بڑے نوادر پیش کریں گے۔ مجھے کم از کم ایک گلدستہ تو ساتھ لے لینا چاہیئے، اگرچہ وہ بے رنگ ہو۔ ارمغان کی قدر و قیمت کا انحصار اس کی گرانی پر نہیں بلکہ پیش کرنے والے کے اخلاص اور عقیدت پر ہے۔

بقیہ مضمون ملا واحدی

صا ۴۲ سے آگے

ان سے مشورے لیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالماجد آتے تو میرے یہاں بھی چند لمحے گزارتے تھے۔ ملے بغیر عموماً واپس نہیں جاتے تھے۔ اس وقت سے مجھے ان سے اور ان کے [illegible] سے قلبی تعلق ہے۔ میں فالج کے شدید حملے سے زندہ بچ گیا تو پہلا خط میں نے انہیں لکھا تھا اور وہ میری صحت یابی سے اس قدر خوش ہوئے تھے کہ میرے دل نے اثر قبول کیا تھا۔

لکھنا مجھے حضرت خواجہ حسن نظامی کی صحبت میں آیا۔ دینی معلومات حضرت مولانا محمد ایوب نے ہم پہنچائی۔ اور تاریخ نویسی کا شوق حضرت مولانا عبدالماجد کی [illegible] بالخصوص [illegible] میں منفرد ہے۔ اس طرح حضرت مولانا عبدالماجد عمر میں چار یا پانچ برس چھوٹے ہونے کے باوجود میرے استاد ہیں تعجب نہ کیجئے۔ حضرت مولانا محمد ایوب مرحوم دس برس چھوٹے تھے جنہوں نے دینی معلومات ہی نہیں دینی امور پر غور کرنا سکھایا۔ دینی معلومات میری حضرت مولانا عبدالماجد کی تصنیفات سے بھی بڑھی ہیں۔ حضرت مولانا عبدالماجد کے کارنامے میری تعریف و توصیف سے بالا ہیں۔ وہ ہمہ صفت موصوف ہیں۔ دین سے بھی واقف اور دنیا سے بھی واقف۔ عالم بھی اور تعلیم یافتہ بھی۔ صاحب طرز ادیب بھی اور صاحب دل و دماغ بھی۔ میں دین میں ان کا ہم مسلک اور پیرو ہوں۔

ِسین خاں مرحوم:۔

مولانا عبدالماجد

جس طرح عالم صوری میں نغمۂ فطرت اپنی جلوہ
ں کے لئے کہیں قمری اور کہیں بلبل کی نغمہ سرائیوں
ئیزا ختیار کر لیتی ہے اُسی طرح عالم معنوی میں مشیت
، اپنے ظہور کے مختلف اسلوب چن لیتی ہے، پیغمبر کا
، شاعر کا شعر، حکیم کی حکمت ۔۔۔ مظاہر مشیت
ہیں۔ اور قبول عام انکی ۔ند۔ مولانا عبدالماجد
یابادی اُن مخصوص شخصیتوں میں سے ہیں جو آئے دن
یدا ہوتے ہیں نہ جن کا نقش جریدۂ عالم پر ایک مرتبہ
۔ ہو جانے کے بعد پھر نہ کسی کے مٹائے مٹ سکتا ہے
۔ن کی قدر ان کے بعد کرے گا اسلئے کہ عالم معنوی
بھی بصریات کا قانون نافذ ہے یعنی یہ کہ کسی شے
صاف نظر آنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کچھ فاصلہ
ہو، حد سے زیادہ نزدیکی اور حد سے زیادہ دُوری
ئوں اس کا مانع مرئیت ہیں۔

راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں ۱۹۰۹ء
نیاز حاصل ہے۔ وہ ۱۹۰۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ
داخل ہو چکے تھے اور میں ۱۹۰۹ء میں آیا اور بحمداللہ
یہ بیش روی اور پیش روی کی نسبت میرے اور
ان کے درمیان بدستور قائم ہے کیننگ کالج میں ہم
مذاق طلباء کی ایک مختصر سی جماعت تھی جس میں
ڈاکٹر حفیظ سید مرحوم، متین الدین ایڈوکیٹ لکھنؤ بھی
تھے اُسی زمانہ میں ندوہ بھی ایک ہی مذاق کے طلباء کا
گروہ پیدا کر رہا تھا۔ ڈاکٹر مولانا سید سلیمان تو
فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ مولوی عبدالسلام بھی فضیلت
کے قریب تھے۔ مولوی عبدالباری صاحب جو عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد سے ریٹائرڈ ہو کر اب لکھنؤ میں مقیم ہیں معقولات
سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے جو انجمن
قائم کی تھی اس کے صدر مولانا عبدالماجد دریابادی
صاحب اور میں سکریٹری کے فرائض انجام دیتا تھا۔
مولوی عبدالماجد صاحب بھی اس کے اس سرگرم ممبر تھے
علامہ شبلی مرحوم کی ادبی شخصیت سے ہم سب متاثر
تھے اور ان کی تحریروں کو سنجیدہ ادب کا بہترین نمونہ
سمجھتے تھے۔ شام کے وقت اکثر امین آباد کے پارک کے
فلیٹ پر جہاں علامہ شبلی نے سیرت نبوی کا
دفتر قائم کیا تھا۔ ہم حاضر ہوتے تھے اور ان کے
فیضان صحبت سے مستفیض ہوتے تھے۔ علامہ شبلی کی
نظر انتخاب مولانا عبدالماجد پر اُس وقت پڑی جب
مولانا نے علامہ کی الکلام پر الناظر لکھنؤ میں
ایک تنقیدی نظر ڈالی اور حقیقت یہ

مولانا عبدالماجد دریا بادی کا یہ مضمون ان کے ایوانِ شہرت کی پہلی اینٹ تھی، لطف یہ کہ سارا مضمون علامہ شبلی کے اسٹائل کا نہایت کامیاب چربہ تھا۔

مولانا عبدالماجد کی سوانح عمری دراصل ایک تاریخی فلسفہ ہے، اس لئے کہ ان کی ایک [illegible] میں وہ سب دور گذر چکے ہیں [illegible] ہوئی تاریخ فلسفہ کا موضوع ہوتے ہیں، مذہب پرستی مذہب سے بیزاری، تشکیک [illegible] اور پھر [illegible] کی جانب بازگشت، مولانا کی تنہا ذات ان تمام مدوجزر افکار کا مرکز رہی ہے

آئندہ سوانح نگار کی سہولت کے لیے مولانا کی حیات کے خاص خاص واقعات یہاں پر قلمبند کئے جاتے ہیں تاکہ اس کو وہ راہیں معلوم ہو جائیں جو مزید تحقیقات و اجتماع مواد کے لئے اختیار کرنا ہیں۔

خانگی حالات اور ابتدائی تعلیم:

مولانا عبدالماجد مارچ [illegible] میں پیدا ہوئے [illegible] تین بھائی بہن میں سب سے چھوٹے تھے، رسم [illegible] پانچویں سال کے چوتھے سال ہی کرادی گئی۔ گھر دنیوی خوشحالی کے ساتھ اچھا خاصا مذہبی بھی [illegible] مولانا کے والد ماجد نہایت دین دار بزرگ تھے [illegible] مکہ معظمہ میں انتقال کیا۔ ماں اور بہنیں دونوں عبادت گذار تھیں تہجد گذار تھیں ابتدائی تعلیم اسی انداز پر ہوئی جو عام مسلمان شرفا کے ہاں رائج ہے۔ یعنی پہلے قرآن مجید اس کے بعد مولوی اسمٰعیل [illegible] اردو فارسی پڑھی فارسی میں گلستاں بوستاں [illegible] کیمیائے سعادت وغیرہ [illegible] سال [illegible] اسکول میں داخلہ ہوا۔ تھرڈ، فورتھ ۲ کلاسوں میں ڈبل ترقی [illegible]

امتحان پاس کیا۔ اور سب مضمونوں میں برق لیکن حساب میں کسی قدر کچے تھے۔ اس لئے سکنڈ ڈویژن پاس ہوئے۔

عربی کی ابتدائی تحصیل حکیم مرزا محمد ذکی صاحب اور اس کے بعد مولوی عظمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے کی۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانیں خوب جی لگا کر پڑھیں۔ مولانا پڑھنے کے شروع سے بڑے شوقین ہیں۔ اس زمانہ میں اخبار، اشتہار، رسالہ کتابیں جو چیز ہاتھ آگئی اسے بے پڑھے نہ چھوڑتے تھے۔ اسکول سے چار بجے آتے خوب بھوکے ہوتے تھے۔ ناشتہ پر گرتے لیکن اس وقت بھی کوئی کتاب، اخبار، رسالہ سامنے رہتا۔

الحاد کا آغاز:

مضمون نگاری کا سلسلہ بارھویں ہی سال سے شروع ہو گیا تھا۔ مولانا نے اپنے مضامین میں کسی سے بھی اصلاح نہیں لی۔ یہ مضامین فرضی ناموں سے لکھے گئے، عنوانات [illegible] ہوتے تھے۔ ایک پورا رسالہ [illegible] کے جواب میں لکھ ڈالا۔

[illegible] میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے اب کالج کی لائبریری اور رفاہ عام کلب کی لائبریریاں تھیں [illegible] انگریزی کتابوں [illegible]

رفتہ رفتہ [illegible] شکوک پیدا ہو گئے اور ایک سال کے اندر ساری دینداری کی عمارت زمین کے برابر ہو گئی۔ رشنلسٹ پریس ایسوسی ایشن کے سستے ایڈیشن اس وقت بازار میں کثرت سے تھے ان کتابوں نے [illegible] کام کر دیا۔ اب مولانا بجائے مسلمان کے اپنے کو [illegible] ایگناسٹک لا ادری کہلانے پر فخر [illegible] سمجھتے تھے [illegible] میں جب ایف، اے کے امتحان کا فارم بھرنے کو [illegible] الاخرے [illegible]

...ں کی مقتضی ہے کہ فارم میں مذہب کا خانہ خالی چھوڑ دیا
...ا ہے۔

...لِ تعلیم :-

عربی بطور سیکنڈ لینگویج کورس میں برابر رہی۔ ۱۹۱۲ء میں بی۔ اے۔ کیا۔ منطق اور سائیکولوجی سے خاص ذوق تھا چنانچہ جب دیگر طلبہ کے ہاتھ میں جیمس کی ٹیکسٹ بک آن سائیکولوجی کی مختصر جلد تھی جو بی۔ اے۔ کورس میں مقرر تھی، مولانا کے پاس ... جیمس کی پرنسپلز آن سائیکالوجی کی دو جلدیں تھیں، جو زیادہ تر ایم۔ اے۔ کے کورس میں داخل تھیں۔ اسی کو پڑھ کر امتحان دیا۔ چھوٹی کتاب مولانا نے خریدی ہی نہ تھی۔ اسی زمانہ میں انگریزی میں مضمون نگاری شروع ہو چکی تھی۔ رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ بمبئی میں اور دوسرے لائق پرچوں مثلاً ٹیچر، سٹیزن، ریویو وغیرہ میں مضمون لکھتے تھے۔ اردو رسالوں میں الناظر، ادیب، الندوہ، وغیرہ مولانا کے رشحات قلم سے سیراب ہوتے رہتے تھے کالج میں پروفیسر اور پھر پرنسپل کیمرانگ کی ان پر خاص توجہ رہی۔ فلسفہ میں ایم۔ اے۔ کرنے علیگڑھ گئے لیکن کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ تکمیل نہ کر سکے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ :-

۱۹۱۳ء میں وکیل ایجنسی امرتسر سے متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے مثلاً "غذائے انسانی"، "محمود غزنوی" وغیرہ شائع کر چکی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں سب سے پہلی مستقل کتاب فلسفۂ جذبات انجمن ترقی اردو کی طرف سے نکلی، اس کے سال دو سال بعد انجمن مذکور ہی نے فلسفۂ اجتماع شائع کی۔ نومبر یا دسمبر ۱۹۱۵ء میں انگریزی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ لندن کے نامور پبلشر فشر ان وِن اینڈ کمپنی نے شائع کی۔ اور اکثر ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ سے لے کر چھوٹے بڑے متعدد ولایتی جریدوں نے تبصرے کیے۔

اس کے بعد اردو تصنیف و تالیف کا کام مسلسل اور باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا۔ اور ۲۲۔۲۳ سال کی عمر میں مولانا مستقل اور نامور مصنفوں کی صف میں آ گئے۔

رومانی دور :-

اگر سیرت انسانی کو دل اور دماغ کی دو مستقل سرخیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو بعض شخصیتیں ایسی نکلیں گی جن پر "دماغ" کا غلبہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پہلو میں "دل" ہے ہی نہیں۔ اس کی مثال جرمنی کا مشہور عالم فلسفی کانٹ ہے، جو ایک کافرادا کے خنجر ابرو سے بری طرح گھائل ہو کر بچ گیا۔ اور ساری عمر تجرد ہی میں کاٹ دی۔ برخلاف اس کے بعض ایسے "دل چلے" ہوتے کہ گویا "دماغ" رکھتے ہی نہیں۔ مولانا کی سیرت میں فطرت نے دل و دماغ کا ایک لطیف توازن ودیعت کیا ہے اور کیریکٹر کے ان دو اسپرنگوں میں توازن ہونے سے فکر و عمل اور کردار کے ہر شعبہ میں ایک ایسا دلآویز توازن پیدا کیا گیا ہے۔ جو بلند مرتبہ شخصیتوں کا مخصوص جوہر ہوتا ہے جب مولانا پر یہ رومانی دور گزر رہا تھا۔ میں لکھنؤ ہی میں تھا اور ان کے ساتھ شب و روز کی نشست و برخاست تھی، رازدانی اپنے ساتھ رازداری کے فرائض بھی عائد کرتی ہے۔ بہرطور ایک ناول نگار کی زبان سے نہ سہی ایک مورخ کی سیدھی سادھی بے کیف اور معاملہ فہم زبان اختیار کرتے ہوئے اس قدر لکھنے پر کفایت کروں گا کہ جون ۱۹۱۶ء میں مولانا کی شادی ہو گئی جہاں وہ چاہتے تھے۔ اور بحمداللہ محبت و شیفتگی کا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ آج تک برقرار ہے

ایک بار ایک آزمائش میں پڑ جانے کے باوجود اس میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔

ادبی نقطۂ خیال سے ہماری دلچسپی کی چیز اس رومانی دور کا وہ سایہ ہے جو مولانا کے قلم پر پڑا۔ یوں تو غزل و نظم سننے اور پڑھنے کا شوق شروع سے تھا۔ لیکن اس زمانہ میں باقاعدہ غزل گوئی بھی شروع ہو گئی۔ غزلیں عموماً حسرت موہانی، شیفتہ، جوہر (مولانا محمد علی جوہر) مرحوم کی زمینوں میں ہوتی تھیں۔ اور کلام کبھی کبھی حضرت اکبر الہ آبادی کے پاس اصلاح کے لئے بھیجتے رہتے تھے۔ ایک ڈرامہ زود پشیماں کے نام سے گمنام اور اسی دور کی یادگار ہے جو غالب کے اس شعر پر ختم ہوتا ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیدرآباد کی ملازمت:

اس ساری مدت میں خیالات ملحدانہ اور مادہ پرستانہ رہے۔ اور فخر مل اسپنسر اور ہکسلے وغیرہ کی ترجمانی پر زور ہے۔ ۱۹۱۷ء میں مسٹر راس مسعود (جو حیدرآباد میں اس وقت ڈائرکٹر تعلیمات تھے) اور مولوی عبدالحق صاحب کے اصرار سے حیدرآباد گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے سررشتۂ ترجمہ و تالیف میں چار سو کے مشاہرہ پر ملازمت منظور کر لی۔ اس سے قبل کا واقعہ یعنی ۱۹۱۱ء مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کے ملازمت کرنے اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی دلداری اور عنایتوں کے باوجود چند ہفتوں کے بعد چھوڑ دینے کا ہم سب کے علم میں تھا چنانچہ جب مولانا حیدرآباد جانے کے لئے پا بہ رکاب تھے تو میں نے پوچھا تھا کہ "استعفاء بھی جیب میں ہے یا نہیں"۔

الحاصل لشتم پشتم ایک سال حیدرآباد میں کاٹا۔ اور اگست ۱۹۱۸ء میں رخصت لے کر لکھنؤ واپس آئے تو پھر حیدرآباد استعفاء ہی گیا۔

مولانا کی تصانیف میں "فلسفۂ اجتماع" واقعی نقطۂ نظر سے کہیں کہیں فی الجملہ قابل اعتراض ہے۔ میڈا میں غیر ملکیوں کے خلاف ایک محاذ ہمیشہ قائم رہتا تھا جو اس کتاب کو آڑ بنا کر [illegible] سختی سے لے دے مچائی گئی۔ بیسیوں فتوے کفر کے شائع کئے اور جوش و غیظ کا طوفان [illegible] برپا [illegible]

زمانۂ قیام حیدرآباد میں [illegible] بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات پیدا ہو گئے تھے جن میں خاص طور پر قابل ذکر عماد الملک سید حسین بلگرامی، نواب سالار جنگ، مہاراجہ کشن پرشاد، نواب [illegible] جنگ [illegible] بلگرامی کے نام ہیں۔

عبوری دور:

حیدرآباد سے لکھنؤ آ کر ہندو فلسفہ کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ انگریزی میں جو لٹریچر پڑھے وہ چھوڑ کر مسز [illegible] ڈاکٹر بھگوان داس، اربندو گھوش، اور ٹیگور کی تصنیفات میں سے کوئی کتاب مطالعہ سے نہ بچی، سب سے زیادہ مؤثر مسز بیسنٹ اور ڈاکٹر بھگوان داس کی تحریریں ثابت ہوئیں۔ اس مطالعے نے بالکل نیا منظر آنکھوں کے پیش کر دیا اور یہ پہلی بار ذہن میں آئی کہ فرنگیت مادیت ہی دنیا میں فلسفہ کے آخری لفظ نہیں۔ روحانیت، خدا پرستی اور الہیاتی مباحث بھی کچھ رکھتے ہیں یہ دور ۱۹۱۸ء کے سہ ماہی سے لے کر [illegible] تک رہا اور کہنا چاہیئے کہ یہ مولانا کے الحاد اور [illegible] کے درمیان کا عبوری دور تھا۔ رفتہ رفتہ طبیعت کی طرف کھنچنے لگی اور پھر بزرگوں اور بزرگان دین

بیزاری باقی نہ رہی۔

ہندو تصوف سے اسلامی تصوف کی جانب منتقل ہو جانے میں کچھ دیر نہ لگی۔ اور گیتا کے پر شوق مطالعہ نے گویا مثنوی مولانا روم کے لئے دروازہ کھول دیا۔ مثنوی کا ہاتھ لگنا تھا کہ مولانا اس کے عاشق ہو گئے اور اس کی چھ ضخیم جلدیں مع شرح و حاشیہ ۲۷ ہزار اشعار لفظ بہ لفظ پڑھے اور ایک ایک شعر پر وجد کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ علامہ شبلی کی سیرۃ النبی اور محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ القرآن بھی اس دوران میں اپنا کام کرتے رہے اور نفس مذہب کے فلسفیانہ مطالعہ میں خصوصی جگہ اسلام کے لئے پیدا کرتے رہے۔ مذہب کی تحقیق میں شغف کا یہ عالم تھا کہ پبلک لائبریریوں کی کتابوں کے مطالعہ ہی پر قناعت نہ کی بلکہ احباب کے پاس جو اس موضوع پر پڑھنے کے قابل کتابیں تھیں وہ بھی مانگ مانگ کر پڑھیں۔ قصہ یہ ہوا کہ شوق سے بھی مولانا نے فلسفۂ مذہب پر کتابیں منگائی تھیں اور ہربرٹ ڈاکٹر منزلیس کی ہسٹری آف ریلیجن، تو اس کی سائیکولوجی آف ریلیجن اور وارڈ کی … و ڈاکٹر نوری کی فلاسفی آف ریلیجن مولانا کو بھیجی تھیں … مولانا نے جلد واپس کر دی تھیں اس لئے کہ شاید ان کی پڑھی ہوئی یا ان کے پاس تھیں، تاہم ان سے استفادہ کیا۔ بالخصوص منزلیس بہت عرصہ تک اپنے پاس رکھی۔ حضرت اکبر الہ آبادی کی زندہ شخصیت بھی اس عبوری منزل کو طے کرنے میں حکیمانہ مدد دیتی رہی۔

حضرت اکبر الہ آبادی جب لکھنؤ تشریف لاتے تھے امین آباد میں ایک فلیٹ پر قیام کرتے تھے۔ مولانا عبدالماجد ان سے ضرور ملنے جاتے تھے۔ گو کہ حضرت اکبر مرحوم نے ایک بار بھی تبلیغ نہیں فرمائی۔ لیکن نہایت لطف اشاروں سے اسلام کی جانب مولانا کی طبیعت کو مائل کرتے رہے۔ مولانا محمد علی کی صحبت و رفاقت بھی منزل اسلامیت کی جانب لانے میں معین رہی۔ آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم سے روحانی عقیدت سونے پر سہاگہ کا کام کر گئی۔

اس زمانہ میں انگریزی مضامین ماڈرن ریویو کلکتہ میں زیادہ تر نکلتے رہے۔ کبھی نام سے کبھی گمنام کبھی اے۔ ایم کے نام سے معارف کی ایڈیٹری بھی مدت تک کی۔ لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار حقیقت نکلوایا۔ مدتوں اس میں لکھتے رہے لیکن زیادہ تر گمنام طور پر۔ بالخصوص الناظر لکھنؤ میں بہت کچھ لکھا۔

نظام کی قدر دانی:۔

۱۹۱۹ء میں سر امین جنگ سکریٹری اعلیٰ حضرت نظام حیدر آباد کا تار مولانا کی طلبی میں آیا۔ تار پا کر حیدر آباد گئے۔ چار دن مہمان رہے، باریابی ہوئی۔ اور ۱۲۵ روپیہ کا وظیفہ مقرر ہو گیا کہ خواہ کہیں رہیں، ہر سال جس موضوع پر چاہیں کوئی کتاب کسی ضخامت کی ہو تیار کریں۔ ۱۹۲۶ء میں وظیفہ کی تعداد دو سو روپیہ ماہوار ہو گئی۔ افسوس کہ اب یہ وظیفہ بند ہو گیا ہے۔ ہمیں حکومت ہند کی قدر دانی سے امید ہے کہ موجودہ اقتصادی حالات کے پیش نظر اسے صرف دوبارہ جاری ہی نہیں کر دیا جائے گا بلکہ اس میں اضافہ بھی کر دیا جائے گا۔

تجدید اسلام:۔

۱۹۲۰ء سے کہنا چاہیے کہ مولانا از سر نو مسلمان ہوئے اور اسی وقت سے لکھنؤ کی مستقل سکونت ترک کر کے دریا باد چلے گئے۔ لکھنؤ میں عزیزوں دوستوں کی کثرت سے لکھنے پڑھنے کا وقت کم ملتا تھا۔

دریاباد میں مولانا کا مہمان ہونے کا مجھے اتفاق ہوا ہے وہاں وہ اپنی زندگی نہایت منضبط پروگرام کے تحت بسر کر رہے ہیں آبائی گھر کو ضروری ترمیم کر کے اپنے حسب ضرورت بنا لیا ہے۔ لائبریری کے لئے ایک لمبی گیلری نکالی ہے جو میرے پہونچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی انھوں نے مجھے بڑے شوق و مہربانی کے ساتھ دکھائی گھر پر پڑھی ہوئی فارسی اور کالج میں پڑھی ہوئی عربی اب کام آئی۔ تصوف کا بڑا لٹریچر فارسی میں ہے۔ پہلے اسے پڑھا پھر رفتہ رفتہ کلام، حدیث، تفسیر کا مطالعہ کیا اور سنہ ۱۹۲۹ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔

صحافت:-

سنہ ۱۹۲۳ء میں محبت و عقیدت کے تعلقات مولانا محمد علی کے ساتھ اور گہرے ہو گئے جو ان کے سنہ وفات سنہ ۱۹۳۱ء تک بڑھتے ہی گئے۔ دہلی ان کے پاس برابر جانا ہوتا رہتا تھا اور ان کا روزنامہ ہمدرد عملاً شروع نومبر سنہ ۱۹۲۴ء ہی سے مولانا کے اختیار میں تھا۔ باقی سنہ ۱۹۲۵ء میں تقریباً آٹھ ماہ تک باضابطہ مولانا ہی کے ہاتھ میں رہا۔ مولانا محمد علی بہ غرض علاج یورپ گئے تھے اور پرچہ مولانا کے ہاتھ میں چھوڑ گئے تھے۔ ہر پرچہ پر مولانا کا نام بطور نگراں نکلتا رہا تھا۔

شروع سنہ ۱۹۲۵ء میں مولانا ظفر الملک اور ایک اور صاحب کی شرکت میں "سچ" ہفتہ وار لکھنؤ سے جاری کیا جولائی سنہ ۱۹۲۵ء سے اخبار کی ادارت تمام تر مولانا ہی کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ عارضی وقفوں کو چھوڑ کر اخبار ۹ سال یعنی آخر سنہ ۱۹۳۳ء تک مسلسل جاری رہا آخری ایام سنہ ۱۹۳۳ء میں تحریک قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کی پیدا ہوئی۔ یہ کام چوبیس گھنٹے کی مشغولی کا تھا۔ پرچہ مجبوراً بند کرنا پڑا۔ مئی سنہ ۱۹۳۵ء سے جدید انتظام کیا تھا یہ پرچہ "صدق" کے نام سے پھر نکلنا شروع ہوا۔ کبھی سہ روزہ، مگر عموماً ہفتہ وار۔ جو لوگ مولانا کی طرز تحریر اور بلند کی خیال کے شیدائی ہیں، اخبار کو ہاتھوں ہاتھ خریدتے اور ہر نئے نمبر کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت "صدق" بند ہے اور کچھ روز بعد نئے انتظام کے ساتھ نکلنے والا ہے۔

سیاسیات:-

عملی سیاسیات سے مولانا کو کبھی دلچسپی نہیں رہی البتہ اسلام اور مذہب کے ماتحت اس سے برابر تعلق قائم رہا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت میں عملی حصہ لینا شروع کیا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں اودھ کی صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے اور تین سال متفقہ طور پر اس عہدہ پر انتخاب ہوتا رہا۔ آخر جب کمیٹی کے اندر اختلافات کے آثار دیکھے تو استعفا دیدیا۔ آل انڈیا مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی کے بھی کئی سال ممبر رہے اور اس کی مختصر مجلس ورکنگ کمیٹی کی ممبری پر دو سال تک انتخاب ہوتا رہا۔ فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں سالانہ جلسہ خلافت لکھنؤ میں صدر مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے خطبہ پڑھا۔

ادبی اور تعلیمی اداروں سے تعلق:-

مذہب کے بعد مولانا کے ذوق کی چیز اردو ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کی انجمن اردو کے غالباً سنہ ۱۹۲۹ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک صدر رہے۔ ہندوستانی اکیڈمی یو، پی کونسل کے ممبر بشروع سنہ ۱۹۳۰ء سے اب تک ہیں۔ شاید درمیان میں تھوڑے عرصہ تک نہیں رہے۔ علیٰ ہذا آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اردو ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر ہیں۔ پہلے نشری تقریروں کے لئے دہلی اکثر جایا کرتے تھے۔ اب سفر بہت کم ہو گئے

ہیں اور نشریات بھی لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن تک محدود رہیں۔

مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر شروع ۱۹۲۱ء سے ہیں اور اس میں مجلس انتظامیہ کے ممبر بھی سال سے ہیں۔ کچھ عرصہ عثمانیہ یونیورسٹی کے سینیٹ کے ممبر بھی رہے عثمانیہ یونیورسٹی میں کئی سال تک ایم۔ اے میں اردو ادب کے ممتحن رہے۔ لکھنؤ اور علی گڑھ یونیورسٹیوں میں بھی بھی ممتحن ہوتے رہے۔ ایک سال الہ آباد یونیورسٹی میں بھی ممتحن رہے۔

مسطورہ بالا نقوش مولانا عبد الماجد کے مختصر سے خاکے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اہم بات اس شخصیت کی سوانح نگار کے لئے شرط اول یہ ہو کہ وہ خود بھی ایسا صاحب شخصیت ہو کہ موضوع بحث شخصیت کو احاطہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ورنہ بڑی شخصیت پر جب نظر ڈالے گا۔ کچھ نہ کچھ حصہ اس کے حد نظر سے باہر رہ جائے گا چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے میں نے چاہا کہ مولانا اپنے کچھ حالات قلمبند کر کے دیں۔ اول تو ازراہ انکسار جو استقامت و استقلال کے بعد ان کی سیرت کا ایک نمایاں جوہر ہے انکار کرتے رہے لیکن جب میرا اصرار بڑھا تو کچھ مختصر سا حال لکھ کر مجھے بھیجا۔ لیکن اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی۔ جو مجھے پہلے سے معلوم نہ ہو۔ ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ایک بات سے دس باتیں یاد آگئیں۔ مولانا کی بھی شخصیت دراصل پبلک ملکیت ہوتی ہے اور ملک و قوم کا مطالبہ بالکل بجا ہو گا کہ وہ اپنی سوانح حیات خود قلمبند کریں۔ بعض مشاہیر عالم نے اپنے اس فرض کو پہچانا ہے۔ چنانچہ روسو، جان اسٹوارٹ اور ہربرٹ اسپنسر نے اپنے سوانح حیات خود قلم بند کر کے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔ مولانا یاد کریں کہ ل اور اسپنسر کے آٹو بائیو گرافیاں انھوں نے کس شوق سے پڑھی تھیں۔ پھر دنیا ان کی سبق آموز زندگی سے کیوں محروم رہے۔

تصنیفات:

مولانا نے اردو میں سنجیدہ ادب کا معتدبہ اضافہ کیا پھر انداز تحریر اس قدر دلآویز و شگفتہ کہ جن کو موضوع بحث سے دلچسپی نہیں ہے وہ لطف ادب ہی حاصل کرنے کے لئے مولانا کی تصنیفات پڑھتے ہیں۔ ان کی خاص خاص تصنیفات کی فہرست یہ ہے۔

(۱) تفسیر قرآن مجید انگریزی میں دو پاروں کی تفسیر شائع ہو چکی ہے۔ (تاج کمپنی لاہور و کراچی) یہ تقسیم ہند سے پہلے مولانا تاج کمپنی کو اشاعت کے لئے دے چکے ہیں۔ ۲۸ پارے پبلشر کے پاس ہیں۔

(۲) سائیکالوجی آف لیڈرشپ (فشرانون لندن)

(۳) اردو ترجمہ تفسیر القرآن (تاج کمپنی)

(۴) مقالات ماجد، ادبی مضامین کا مجموعہ (تاج آفس بمبئی)

(۵) مقالات حصہ دوم انشاء ماجد کے نام شائع ہوا

(۶) مبادی فلسفہ حصہ اول دوم (دار المصنفین اعظم گڑھ)

(۷) سوز مجاز (دار المصنفین)

(۸) فیہ ما فیہ، ملفوظات مولانا روم (دار المصنفین)

(۹) تصوف اسلام (دار المصنفین) اس کتاب کے ۵ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

(۱۰) فلسفہ جذبات (انجمن ترقی اردو)

(۱۱) فلسفۂ اجتماع (انجمن ترقی اردو)

(۱۲) تاریخ اخلاق یورپ ۲ جلد۔ لیکی کا ترجمہ۔ (انجمن ترقی اردو)

(۱۳) تاریخ تمدن۔ بکل کا ترجمہ۔ دو جلد۔ جس کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے۔ انجمن ترقی اردو)

از مولوی رئیس احمد جعفری (ندوی مرحوم)

مولانا عبدالماجد دریابادی
ایک کامل المعیار انسان

مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی جامعی، مولانا عبدالماجد دریابادی کے خصوصی معتقدوں میں تھے افسوس کہ چند سال ہوئے وہ یکایک مرض قلب کے حملے سے وفات پاگئے۔ ان کا ارادہ مولانا دریابادی پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا تھا لیکن اس ارادہ کو پورا کرنے سے قبل ہی وہ چل بسے۔ اُن کا ایک مفصل مضمون مولانا دریابادی پر انکی کتاب "دید و شنید" میں جو پہلی بار ۱۹۴۳ء میں کتاب منزل لاہور سے شائع ہوئی تھی اور اب نایاب ہے) مولانا عبدالماجد دریابادی ایک کامل المعیار انسان کے عنوان سے درج ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ مولانا کی سوانح لکھتے تو وہ کس شان و آن کی ہوتی۔

(حکیم عبدالقوی دریابادی)

ایک زمانہ تھا کہ مولانا عبدالماجد ایک بہترین انشاپرداز، ایک صاحب طرز مصنف اور مولف، ایک سنجیدہ مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے مشہور انام اور مرجع خواص بنے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ مذہب کے منکر تھے، ارتیاب، تشکیک اور الحاد و دہریت کے علم بردار تھے، لیکن ان کی لامذہبی، آزاد خیالی اور ترقی پسندی، بھی اپنے اندر ایک آن رکھتی تھی۔ اُس میں ایک وزن تھا، وقار تھا وہ مذہب کا مذاق نہیں اُڑاتے تھے نہ اُس کے خلاف دلائل رکھتے تھے اور سنجیدہ بحث کرتے تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی کی "الکلام پر ایک تنقیدی نظر" طالب علم کی حیثیت سے ڈالی اور سنجیدگی، متانت اور وقار علم کے ساتھ ان کے مذہبی دلائل کی ایسی مخالفت کی کہ وہ بھی ان کی ذہانت، قوت فکر اور جولانی طبع کے قائل ہوگئے۔

پھر وہ دور آیا کہ ؎

وہی ریاض جو تھے بُت پرست و بادہ پرست
خدا کی یاد میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

مذہب نے اُن پر اثر کیا اور ان کا اوڑھنا بچھونا مذہب بن گیا، تاریخ ہو یا فلسفہ، سیاست ہو یا معاشرت، ہر چیز کو وہ خالص اسلامی حیثیت سے دیکھنے اور پرکھنے

گئے۔ داڑھی منڈی تھی بڑھ گئی۔ کوٹ پتلون نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ موٹے کھدر کا کرتہ اور پاجامہ، ٹوپی اور عبا، ان عناصر اربعہ نے مستقل لباس کی صورت اختیار کرلی۔ بزم وانجمن کی رنگینیاں رخصت ہوگئیں مسجد وخانقاہ سے دل ملنے لگا۔ علوم عصریہ اور افکار جدیدہ اور حوادث حاضرہ کے مطالعہ ومشاہدہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا لیکن زیادہ وقت اب صرف ہونے لگا، قرآن پر، تفسیر پر، حدیث رسولؐ پر، سیرت نبوی پر، حیات صحابہؓ وتابعین پر پہلے فلسفہ پر ایک فن کار کی حیثیت سے لکھتے تھے۔ اب اس فن کو ایک بڑے مقصد — اسلام — کی تائید میں صرف کرنے لگے جب تک لامذہب تھے، دوسروں کو اپنانے سے بے نیاز تھے، مسلمان ہوئے تو ساری دنیا کو اسی دین پر عمل پیرا دیکھنے کی آرزو کرنے لگے، قلم میں قدرت نے بے پناہ کشش اور قوت ودیعت کردی تھی۔ فلسفہ جذبات ہو یا تصوف، اسلام، یہ کشش ہر رنگ میں موجود ہے۔

مجھے جب کتابوں کے پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا ہوا اور میں ان کے نام نامی واسم گرامی سے واقف ہوا تو یہ مسٹر سے مولانا بن چکے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کا یگانہ اور منفرد اخبار "سچ" جس کا نام اب صدق ہے[1] — نکلا، پہلا نمبر دیکھا۔ طرز تحریر ایسا بھایا کہ میں اس کے مستقل قارئین میں شامل ہوگیا۔

[1] دسمبر ۱۹۵۰ء سے یہی اخبار صدق جدید کے نام سے برابر لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ (فروغ اُردو)

ان کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر اور ایک ایک حرف کو والہانہ ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتا، مجنونانہ جوش وخروش کے ساتھ دوستوں کو سناتا۔

یو، پی کی حکومت نے ہندوستانی اکاڈمی کے نام سے ایک علمی وادبی ادارہ قائم کیا اس کے جو ممبر سرکار نے نامزد کئے ان میں مولانا عبدالماجد بھی تھے مجھے ایک سرکاری ادارہ میں ان کی شرکت پسند نہ آئی۔ جذبۂ عقیدت کو ٹھیس سی لگی، فوراً ایک خط لکھا کہ آپ محرم کے زمانہ میں مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ حسینؓ بن علیؓ کے نقش قدم پر چلیں۔ باطل کا مقابلہ کریں اور ناحق سے برسر جنگ ہوں، دوسری طرف آپ خود وقت کے یزیدوں اور فرعونوں کے بنائے ہوئے اداروں میں شریک ہوتے ہیں آخر یہ کیا ستم ظریفی ہے؟ ...... " یہ خط میں نے "مقتدر حسین جعفری" کے نام سے لکھا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ انھیں میرا نام معلوم ہو دوسرے ہفتے میں "مقتدر حسین صاحب جعفری" سے خطاب کیا گیا کہ آپ اپنا پتہ لکھئے، آپ کا جواب دیا جائے گا میں نے اپنے دوست حامد علی مدیر "خضر راہ" کے ذریعہ جواب مانگا۔ جواب ملا، ملاقات کیجئے تو گفتگو اب مقتدر حسین کا جواب حائل اٹھتا نظر آرہا تھا، بڑی کشمکش میں تھا۔ ملوں یا نہ ملوں۔ آخر ہر چہ بادا باد کہہ کر میں نے پھر ایک خط لکھا کہ میرا نام مقتدر حسین نہیں رئیس احمد ہے، میں ندوہ کا طالب ہوں، مصلحتاً میرا نام بدل دیا تھا اگر آپ ملنا چاہیں

ملنے آؤں فوراً جواب آیا۔ "خفا؟ آپ ایک نوعمر عزیز کی حیثیت سے ملنے آئیے خفگی کی کیا بات ہے؟"

اب ذرا ڈھارس بندھی اور دوسرے روز خاتون منزل ـــــ گولہ گنج ـــــ میں پہونچا، اوپر اطلاع کرائی تھوڑی دیر کے بعد طلبی ہوئی۔ دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر پہونچا بزرگانہ شفقت اور محبت سے پیش آئے، دہشت نکل گئی افسوس سا پیدا ہوگیا۔ میں نے دیکھا، ایک ہاتھ زخمی سا نظر آرہا ہے۔ پٹی بندھی ہوئی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا عہد طفلی میں ہاتھ پر اپنا نام گُدوا لیا تھا، پھر تجدید اسلام کے بعد کتب مذہبی میں اس کے خلاف وعیدیں دیکھیں فوراً ڈاکٹر کو بلایا، ہاتھ اُسکے سامنے بڑھا دیا کہ اس کئی انچ کے لمبے اور چوڑے حصہ کو اتنی پوری کھال کو کھرچ دو، تراش دو، ڈاکٹر نے افہام تفہیم کی کوشش کی لیکن ناکام ہوا اور آخر اُسے حکم کی تعمیل کرنی پڑی یہ وہی زخم تھا جس کی کئی دنوں سے ڈریسنگ ہو رہی تھی اور جس کے مندمل ہونے میں ابھی کئی ہفتوں کی مدت باقی تھی، زخم دیکھ کر اور زخم سے زیادہ یہ عزم واستقامت فی الدین دیکھ کر میرے تو واقعی رونگٹے کھڑے ہوگئے دل نے کہا یہ ہے وہ خضر راہ تحت الشعور میں جس کی تلاش تھی، خوبی قسمت کہ آج وہ آنکھوں کے سامنے ہے ؎

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

ڈریسنگ اور علاج کے سلسلہ میں جب تک مولانا لکھنؤ میں مقیم رہے، میں بڑی پابندی اور کثرت سے ملتا رہا۔ رفتہ رفتہ بے تکلفی پیدا ہوگیا جو ایک خادم اور مخدوم میں خورد اور بزرگ میں ہوتا ہے اور خدا کے فضل سے یہ تعلق اور اختصاص روز بروز پائندہ تر اور مستحکم تر ہوتا گیا۔

میں گیا تھا ایک باغی کی حیثیت سے، واپس آیا تو دل عظمت اور محبت کا سرچشمہ بن چکا تھا۔

مولانا کی تربیت کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ مخاطب کو "عبد ذلیل" اور اپنے تئیں "رب جلیل" سمجھ کر گفتگو نہیں کرتے، نہ گفتگو میں واعظانہ اور ناصحانہ رنگ غالب ہوتا ہے، وہ باتوں باتوں میں نہایت سادگی کے ساتھ اپنا خیال اس طرح آپکے دل میں پیوست کردیں گے کہ وہ آپ کا خیال بن جائے گا۔ کچھ عرصہ تک اگر ان کے فیض صحبت سے کسی کو مستفید ہونے کا موقع ملے تو وہ ان کی آنکھوں سے دیکھنے لگے گا اس لئے کہ وہ اس دلسوزی، اور اپنائیت سے شکوک دُور کرتے ہیں، اس خلوص اور سچائی سے دلائل پیش کرتے ہیں اور تحقیق و تفصیل سے صورت مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں کہ ان کی بصارت، مخاطب کی بصارت بن جاتی ہے، اُن کی ذکاوت اس کی ذکاوت بن جاتی ہے۔ یہ اپنے خیالات کسی کو ٹھونستے نہیں اپنے خیالات کا جال اس خوبی سے پھیلاتے ہیں کہ اس سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔

مولانا طنزیات کے بادشاہ ہیں۔ نثر میں رعایت لفظی اس کمال سے استعمال کرتے ہیں کہ سہل ممتنع کا مزا آجاتا ہے، طرز تحریر اتنا دلنشین کہ ؎

بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

در پھر لطف یہ کہ جس موضوع پر لکھیں گے، اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے طرزِ تحریر بھی ایسا ہی رکھیں گے جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو، ایک ہی قلم ہے جس نے "تاریخ اخلاقِ یورپ" بھی لکھی اور "فلسفہ جذبات" بھی۔ جس نے "تصوف اسلام" بھی لکھی اور فلسفہ اجتماع بھی، جس نے مثنوی بحرالمحبت (مصحفی) بھی مرتب و مہذب کی اور "مکالمات برکلے" بھی، جس نے "سفرنامۂ حجاز" بھی لکھا اور جو "سچی باتیں" بھی لکھتا ہے۔ ان میں ہر ایک میں انفرادیت پوری شان قائم ہے۔ طرزِ تحریر کہیں معلم کا ہے۔ کہیں مترجم کا، کہیں فلسفی کا، کہیں انشا پرداز کا۔ کہیں ادیب کا۔ تاریخ اخلاق یورپ شستہ اور رواں ترجمہ ہے۔ فلسفہ جذبات اور فلسفہ اجتماع کا اندازِ تحریر باوقار اور سنجیدہ ہے۔ تصوف اسلام اور فیہ ما فیہ میں تصوف کی متانت غالب ہے۔ سفرِ حجاز میں قلم ایسے مصور کا مو قلم بن جاتا ہے جو دل کے جذبات کو، تصور کی جلوہ آرائیوں کو، عقیدت اور احترام کے تاثرات کو محسوس اور مرئی صورت میں دکھا سکتا ہے، ہر مصنف کو اپنے قلم پر یہ قدرت نہیں ہوتی۔

فلاسفہ کی خشک مزاجی، علما کی تمکنت اور صوفیا کی ع

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید

ہمارے مولانا ان تینوں نعمتوں سے مالامال ہیں، وہ فلسفی بھی ہیں، عالم بھی ہیں اور صوفی بھی۔ ان میں فلسفی کا وقار، عالم کا جلال، صوفی کا سکوت سب کچھ ہے لیکن حد کے اندر۔ اُن سے آپ گفتگو کیجئے۔ ان کی مجلس میں بیٹھئے۔ کسی طرح انُ سے قرب کا شرف حاصل کر لیجئے پھر آپ دیکھیں گے کہ یہ ملک کا بہت بڑا فلسفی، کتنا شگفتہ مزاج ہے، یہ قرآن کا مترجم و مفسر کتنا بذلہ سنج ہے۔ یہ اسرارِ تصوف کا رمز آشنا، اپنی گفتگو میں شوخی کی چاشنی، طنز کے تیز رعایتِ لفظی کی صنعت، غرض کیا کچھ نہیں رکھتا پھر موقع موقع سے اساتذہ کے اشعار، ہر رنگ شاعری کے ادا شناس، مثنوی مولانا روم سے لے کر اکبر تک۔ امانت سے لے کر داغ تک، ہر استاد کے اشعار یاد۔

ادب ہو یا لٹریچر، فن ہو یا آرٹ، مشین ہو یا آلہ، اخبار ہو یا رسالہ، کتاب ہو یا مخطوطہ، سیاست ہو یا صحافت، یہ سب سے اپنا کام لیتے ہیں، کسی کا آلۂ کار نہیں بنتے۔ ریڈیو رکھتے ہیں لیکن حظ نفس کے لئے نہیں، شیطان کی ترقیاں دیکھنے کے لئے۔ لندن اور امریکہ کے نسوانی رسالے۔ خیاطی کے میگزین، آرٹسٹوں اور فنکاروں کے صحائف دیکھتے ہیں اور بغور دیکھتے ہیں لیکن صرف اس لئے کہ معلوم کریں کہ دخترانِ مغرب کا اخلاقی زوال کس حد عروج تک پہونچ چکا ہے۔ نت نئے فیشنوں نے کیسے معیار تک اقتصادی اور اخلاقی زوال بنیاد ڈال دی ہے، آرٹ اور فن کے نام پر آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں کیا کچھ نہیں کر رہی ہیں؟

علما کا احترام کرتے ہیں، بزرگوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن تقلید اعمیٰ سے گریز کرتے ہیں اور اپنی رائے بے خوف لومۃ لائم پورے استقلال و استقامت، بیباکی و صفائی سے ظاہر کر دیتے ہیں۔

نہ جھکتے ہیں، نہ تامل کرتے ہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب کے مرید ہیں لیکن سیاسیات میں ان کے مسلک سے یہ سخت اختلاف رکھتے ہیں، اور اس کے اظہار میں بھی تامل نہیں کرتے۔ مولانا اشرف علی ان کی نظر میں حکیم الامت تھے۔ تھانہ بھون ہر سال کسب فیض کے لئے جایا کرتے تھے اور ہفتوں رہتے تھے، لیکن اس عقیدت کے باوجود متعدد مسائل اور امور ایسے تھے جن میں حکیم الامت کا مسلک کچھ اور تھا اور ہمارے مولانا کا کچھ اور۔ اور اس کے اظہار میں انھوں نے کبھی مداہنت نہیں کی۔ محمد علیؒ سے محبت و عقیدت کا یہ عالم ہے کہ آج بھی

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے

جس دن سے ان کا انتقال ہوا ہے ملکی سیاست سے عملی طور پر یک قلم دستکش ہو چکے ہیں، ان کی دیانت و امانت اور اصابت رائے کا لوہا مانتے تھے لیکن کئی ایسی باتیں تھیں جن میں ان دونوں کے درمیان کبھی نہ بنی۔

ایک بڑی چیز ہے توازن۔ کم لوگ ایسے ہیں جو اس نعمت سے بہرہ ور ہوں، یا افراط میں مبتلا ہیں یا تفریط میں مولانا کو خدا نے توازن کے ساتھ وہ سلامتی فکر عطا کی ہے جو افراط و تفریط سے بہت دور ہے۔ وہ بڑے کٹر حنفی ہیں لیکن غیر مقلدوں کے دشمن نہیں۔ وہ سیاسیات میں مسلم لیگ اور پاکستان کے قائل ہیں لیکن نیشنلسٹوں کو اچھوت نہیں سمجھتے، وہ اپنے سنی ہونے پر ناز کرتے ہیں لیکن شیعوں کو مسلمان سمجھتے ہیں، جس کے مخالف ہیں اس کی حمایت کر سکتے ہیں۔ وہ ظاہر کو بھی دیکھتے ہیں اور باطن کو بھی۔ وہ ان میں سے کسی ایک پر فیصلہ نہیں کر دیتے ان کا فیصلہ ہر دو پر مبنی ہوتا ہے۔

وہ ہنستے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں، ہنساتے بھی ہیں اور رُلاتے بھی ہیں۔ ہنستے ہیں تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں، روتے ہیں تو آنکھوں سے آبدار موتیوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ ہنساتے ہیں تو فضا کو باغ و بہار بنا دیتے ہیں، رُلاتے ہیں تو دل میں گداز و سوز پیدا کر دیتے ہیں۔ اُن کے پاس نشاطِ حیات بھی ہے اور فکرِ آخرت بھی۔ وہ فکرِ آخرت پر نشاطِ حیات کو قربان نہیں کرتے اور نشاطِ حیات کے مقابلے میں فکر آخرت کو فراموش نہیں کرتے، وہ آخرت کی فکر بھی کرتے ہیں اور زندگی سے لطف بھی لیتے ہیں۔ وہ ورزش بھی کرتے ہیں۔ واکنگ WALKING بھی کرتے ہیں نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ رات کو جاگتے بھی ہیں اور سوتے بھی ہیں، جاگنے کے وقت جاگتے ہیں، سونے کے وقت سوتے ہیں، آرام کے وقت آرام کرتے ہیں، اور کام کے وقت کام، غرض اُن کی ہر بات میں ہر چیز میں ایک اعتدال ہے، توازن ہے۔ ایک کامل العیار انسان میں اس سے زیادہ اور کیا صفات ہو سکتے ہیں۔

جناب نادم سیتاپوری

"برادرِ محترم"

شبلی نے اردو ادب کو ایک نیا اسلوب اور مزاج ہی نہیں بخشا۔ بلکہ ان کا یہ احسان بھی کچھ کم نہیں ہے کہ انھوں نے گہری صلاحیت میں ڈوبے ہوئے ذہن و شعور کو ایک ایسی منزل کی طرف موڑ دیا جو اس کا صحیح مقام تھا۔

شبلی سے پہلے اس عہد کی عربی داں نسلیں نہ صرف "مذہبیات" میں محصور و مقید تھیں۔ اور مذہب بھی وہ جو فقہ و حدیث میں محدود ہو چکا تھا۔ ماحول کی اس گھٹن نے اس زمانہ کے کتنے با صلاحیت افراد کو ان کی فطری صلاحیتوں سے محروم کر دیا۔ جن کا نام بھی آج کوئی نہیں جانتا۔؟

ایک طرف تو شبلی خود "خانقاہی جمود" سے دور رہے دوسرے انھوں نے ایک ایسی نسل پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی جو مذہبی و دینی اقدار سے منسلک ہونے کے باوجود اپنی خداداد فطری صلاحیتوں کی منزل تک پہنچ گئی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی —— ؟

اسی نسل کی یادگار ہیں۔ اور غالباً اپنے تمام ساتھیوں سے بچھڑ کر بھی ایک عزم و ولولے کے ساتھ اس مشن کو پورا کر رہے ہیں جس کی داغ بیل شبلی نے ڈالی تھی۔

یہ وہی مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں جنھیں میں "برادرِ محترم" لکھتا ہی نہیں رہوں بلکہ قدیم اور اٹوٹ رشتوں کی بنیاد پر دلی احترام کے ساتھ اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں!

میرے والد کے انتقال کو پینتیس[۳۵] سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے لیکن آج بھی میرے حافظہ پر مولانا دریابادی کے والد ماجد مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم کے تذکرے اسی روایتی شان سے نقش ہیں جیسے خاندانی بزرگوں کے اذکار و تذکار دراثتاً کسی کو پہونچتے ہیں مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم پچھلی صدی کی آخری دہائیوں میں "تحصیلداری" کے عہدے پر فائز ہو کر سیتاپور پہونچے تھے۔ اور اس دور کی تحصیلداری، ایک قسم کی شاہی ہوتی تھی۔ اس زمانہ کے رؤساء، امراءٔ شرفاء، وکلاء، زمین دار اور اہلِ علم ان سرکاری عہدے داروں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ پھر یہ سرکاری

عہدیدار جو اعلیٰ عہدوں پر فائز کئے جاتے تھے سربرآوردہ خاندانوں سے منتخب کئے جاتے تھے جو آسودہ حال اور متمول گھرانے سمجھے جاتے تھے۔ زمانہ قطعاً غیر جمہوری "تھا اس لئے نظم و نسق انھیں کو سونپا جاتا تھا جو پورے تدین و دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم بھی اودھ کے ایک ممتاز متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اودھ کے اکثر نمایاں خاندانوں میں بلا تفریق مسلک و عقائد ایک برادرانہ شیرازہ بندی قائم تھی اس لئے جب مولوی صاحب سیتاپور پہونچے تو میرے خاندان سے خاص طور پر گہرا ربط و ضبط ہو گیا۔ میرے دادا میر مظفر حسین وکیل صاحب کا شمار اودھ کے نامور وکلاء میں تھا۔ نانا میر ناظر حسین ناظر سیتاپوری اور چچا سید نظیر احمد صاحب بھی وکیل تھے ان سب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو تھا ہی تعلقات دن بہ دن بڑھتے گئے۔ میرے والد اور چچا سے برادرانہ اخلاص۔ اور میر مظفر حسین صاحب کا بزرگانہ احترام مولوی صاحب زندگی بھر کرتے رہے۔

اس عہد کا سیتاپور علمی، ادبی، اور مجلسی اعتبار سے لکھنؤ کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ حکیم مومن خاں مومن کے داماد مولوی عبدالغنی صاحب وکیل مارہرے کے شاہ محمد صادق وکیل۔ غالب کے اعزاء میں ان کے حقیقی بھانجے ڈپٹی عباس بیگ، سر سید احمد کے بھتیجے سید محمد احمد خاں، ہز ہائی نس بیگم سر رضا علی والی رامپور کے دادا نواب عبدالسلام خاں اور سردار محمد ہاشم خاں وغیرہ کا شمار اس دور کے عمائد میں سے تھا۔ مقامی شخصیات میں سیتاپور، خیرآباد، لاہرپور اور محمود آباد ایک سے ایک یگانہ روزگار شخصیت کو سینے سے لگائے ہوئے تھا جن کا مختصر تذکرہ بھی ان سطور میں ممکن نہیں۔؟

مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم بہ حیثیت تحصیلدار تو شاید زیادہ دنوں تک سیتاپور میں نہ رہ سکے البتہ اس کے بعد ہی ترقی پاکر جب ڈپٹی کلکٹری پر سیتاپور پہونچے تو کچھ جم کر رہے ان کے دونوں بیٹے مولوی عبدالمجید صاحب مرحوم اور مولانا عبدالماجد صاحب کی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی۔ مولوی عبدالمجید صاحب مرحوم کو سیتاپور سے ایسا عشق تھا کہ جب بھی ملتے تھے تو ریاض خیرآبادی کے اس شعر میں تصرف کر کے پڑھا کرتے تھے ؎

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی تھی
بڑی حسرت سے لب پر نام سیتاپور آتا تھا

اور سیتاپور سے روحی و قلبی لگاؤ میں مولانا عبدالماجد بھی اپنے بڑے بھائی (مولوی عبدالمجید مرحوم) سے پیچھے نہیں تھے۔ آج بھی نصف صدی ادھر کے سیتاپور کا جو عکس مولانا کے حافظہ پر ہے خود سیتاپور کے باشندوں کا ذہن و شعور اس سے خالی ہو چکا ہے۔ میں جتنی بار مولانا سے ملا "مرحوم سیتاپور" کا تذکرہ ہی ان کے لب پر تھا۔ ہر ایک ہم سبق، ہر ایک اسکول فیلو، ہر ایک ساتھی کی یاد انھیں تڑپا پا کرتی ہے۔

مولانا سے شرف ملاقات کا اعزاز تو مجھے بہت دیر میں حاصل ہوا۔ لیکن تھوڑی بہت خط و کتابت پہلے سے تھی — پہلی ملاقات ہی میں یہ محسوس ہوا جیسے دوری کا ہلکا سا حجاب قطعاً حباب آسا تھا۔ بزرگی اور خوردی کے ملفوظات کے باوجود ماضی کے گہرے تعلقات نے مجھے مولانا سے اتنا قریب کر دیا کہ میرا ذہن و شعور آج بھی اس کیف و سرور کے مزے لے رہا ہے۔

مارچ ۱۹۶۱ء میں ۲۳ برس کے بعد ملاقا

ہ سیتا پور تشریف لائے تو غریب خانہ پر قیام فرمایا
وگرام نہایت مختصر تھا۔ ۱۹ مارچ کو آئے اور ۲۲ مار
چ کی سہ پہر کو لکھنؤ واپس آ گئے۔

مولانا کی با اصول زندگی ایک خاص نظم و ضبط
حامل ہے۔ پابندی کے ساتھ ایک ایک منٹ کا
اب رکھتے ہیں۔ اس پروگرام کے سلسلے میں بھی
ے چند شرائط کا پابند کر دیا گیا تھا۔

ایک آدھ مخصوص افراد (جن کے نام مولانا نے
یر فرما دیئے تھے) کے علاوہ میرے آنے کی شہرت
ی جائے۔

سول لائن کی وہ کوٹھی جس میں میرے بچپن اور
نی کا کچھ زمانہ گذرا ہو اس کے ہر حصہ کو آزادی کے
تھ دیکھنے کا اہتمام کر دیا جائے۔

۳۔ میرے آنے کے سلسلے میں کوئی تقریب منعقد
جائے۔

اسی قسم کی دو ایک شرطیں اور بھی تھیں —
یں میں نے آنکھیں بند کر کے منظور کر لیا تھا — پروگرام
صر تو تھا ہی ——— مگر سیتا پور پہنچ کر مولانا بھی
یادوں میں ایسے محو ہو گئے کہ اگر ان کے پاس وقت
تا تو شاید ہفتہ دو ہفتہ ان ناہموار گلیوں کے چکر کاٹتے
ہتے جس کے چپہ چپہ پر ان کے بچپن کی کہانیاں جگمگا رہی
یں۔ سیتاپور کے ایک ایک قبرستان گئے۔ ہر اس گلی
سے پیدل چل کر ایک ایک در و دیوار سے گلے ملتے رہے
ضی محمد طاہر وکیل اور پنڈت راج نرائن وکیل سے
لنے گئے۔ یہ سب انکے کلاس فیلو رہ چکے تھے جس کوٹھی
ان کے والد مرحوم رہتے تھے اگرچہ اس کا نقشہ کچھ
ل چکا تھا مگر مولانا اس کوٹھی کی ہر دیوار سے اس
رح گلے مل رہے تھے۔ جیسے ماضی کے دھندلکے انھیں
پنا آغوش میں بھینچے لے رہے ہیں۔

اس کوٹھی سے نکلے تو قریب ہی آغا صاحب کا بنگلہ تھا۔ وہی بنگلہ جس کے سرسبز لان پر برسوں ٹینس اور فٹ بال کھیل چکے تھے ——— یہ بنگلہ بھی اب ویران ہو چکا تھا۔ لق و دق کوٹھی میں صرف ایک بیوی چند بوڑھے نوکروں کے ساتھ صبر آزما زندگی گزار رہی تھیں اور یہ تھیں بیگم آغا سید احمد رضا صاحب مرحوم۔ ان کے بچپن کے دوست آغا احسن صاحب کی بھاوج ——— سابق صدر پاکستان اسکندر مرزا کی سالی۔ گورنمنٹ اسکول اسی بنگلے کے شمالی جانب تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی اسکول سے مولانا نے میٹرک پاس کیا تھا۔ جوش ملیح آبادی اور مرزا عشق لکھنوی وغیرہ کا ساتھ بھی اسی اسکول میں رہ چکا تھا۔

آغا صاحب کے بنگلہ پر پہنچ کر اس زمانے کے ایک ایک فرد کو پوچھتے رہے۔ یہاں تک کہ انھیں وہ غلام رسول بھی یاد آ گیا جو ٹینس بال اٹھایا کرتا تھا۔ دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ شہر گیا ہوا ہے۔ ہم لوگوں کا رکشا ابھی کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ سول اسپتال کے قریب مولانا بیقرار ہو کر رکشا سے اتر پڑے۔ سامنے غلام رسول آ رہا تھا۔

اس والہانہ محبت کے ساتھ بغل گیر ہوئے گویا کوئی بچھڑا ہوا بھائی مل گیا۔ آنکھوں میں بے ساختہ آنسو چھلک آئے۔ کوئی پچاس برس کے بعد غلام رسول کو دیکھا تھا شاید۔

کہنے لگے چلئے "مدرسہ اسلامیہ" بھی ہو لیں، وہاں کون ملتا! ایک بھی پرانا آدمی نظر نہیں آیا۔ نئے لوگ سونے مولانا کی شخصیت کے۔ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ ایک ایسے باپ کے بیٹے ہیں۔ جو مدرسہ کے بانیوں میں تھے۔

معائنہ بک لائی گئی تو مولانا نے چند سطروں میں مدرسہ کی پوری تاریخ تحریر فرما دی۔

"آج اتفاق سے سیتا پور آنا ہوا۔ اور

دہاتا کہ اس مدرسے کی زیارت کے بغیر چلا جاؤں۔ !

"اس مدرسہ کے قیام کو تقریباً ۵۵ برس ہو گئے ہوں گے اور اس کے قائم کرنے میں بڑا دخل علاوہ مولوی ہادی علی خاں مرحوم مولانا عظمت اللہ فرنگی علی مرحوم مولانا سلیمان احمد مرحوم وغیرہم کے میرے والد مرحوم مولوی عبدالقادر (پنشنر ڈپٹی کلکٹر) کا رہا ہے۔ میں اس وقت اسکول کا طالب علم تھا۔ والد مرحوم اس مدرسہ کی مجلس انتظامیہ کے صدر تھے۔ معائنہ کے لئے نہیں۔ زیارت کے لئے بہرحال چند منٹ کا وقت نکالا اور شکل دیکھ کر خوش خوش واپس آیا! ——

گو اور بہت سی تبدیلیاں ہو گئی ہیں پھر بھی عمارت مدرسہ اور طلبہ کی تعداد مسرت انگیز ہے۔

اللہ سے ہر طرح اس کی فلاح و کامیابی کی دعا ہے "

عبدالماجد دریابادی

۱۲ مارچ ۱۹۶۱ء ۴ شوال ۱۳۸۰ھ

سیتاپور اور خیرآباد کا وہ تاریخی زمانہ مولانا کی نگاہوں کے سامنے گذر رہا ہے جب یہ مقامات اپنی علمی و فضیلت کے اعتبار سے اودھ میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ سید محمود (امرشید کے صاحب زادے) کا انتقال سیتاپور میں ہوا۔ مولانا کی کم عمری کا زمانہ تھا مگر انکے حافظے پر وہ بھی نقوش موجود تھے۔ مولوی عبدالغنی وکیل (مومن دہلوی کے داماد) کے دیکھنے والوں سے سیتاپور خالی ہو چکا ہے پھر بھی مومن کو جو مجلسی مرحوم کے سلسلے میں ایک مضمون لکھتے وقت مولانا ہی نے میری رہنمائی فرمائی —— اور ایسی معلو[مات] فراہم کر دیں کہ "مولوی کے پسماندگان" پر ایک مضمون [تیار] ہو گیا۔

یوں تو مولانا کی علمی و ادبی زندگی کے کئی پہلو ہیں لیکن ان کے بے پناہ تنقیدی شعور نے بڑے بڑے [نقادوں] سے لوہا منوالیا۔ ان کی تنقید قدیم اور جدید تنقید سے ہٹ کر اپنا ایک علیحدہ مزاج رکھتی ہے۔ ناقدانہ [و فنی] اصطلاحات سے وہ بھی کام لیتے ہیں لیکن ان میں لفا[ظی] نہیں ہوتی۔ کڑی تنقید بھی کرتے ہیں تو اسی کی [دل آزاری] خاطر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک زمانہ میں ان کی تنقید [وں] نے ایسی دھوم مچائی کہ ہفت روزہ صدق کے صفح[ات] اس کا بوجھ نہ سنبھال سکے۔ چار ورق کے اس چھو[ٹے] سے اخبار کو ظاہر ہے کہ صرف رسالوں اور کتابوں پر تب[صرے] کے لئے وقف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی لئے مولانا [نے] تبصرے کے عنوان کو ختم کر کے "رسید کتب" کے عنوان [سے] ایک مختصر سلسلہ شروع کیا۔ یہ عنوان مولانا کی مختصر نگار[ی] کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ایک ایک دو دو سطر[وں میں] وہ ضخیم سے ضخیم کتابوں پر تنقید کر ڈالتے ہیں اور [جچے] تلے فقروں میں وہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں جسکے تنقید نگاروں کو لمبے چوڑے مضامین لکھنے کی زحمت کرنا [پڑتی] ہے نقوش لاہور کے "شوکت تھانوی نمبر" پر لکھا ہے۔

"شوکت مرحوم کی یاد میں ایک جامع و مبسوط نمبر۔ اتنے ضخیم نمبر میں ظاہر ہے کہ مضمون ہر قسم اور ہر سطح کے ہوں گے جن چند مضمونوں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا انمیں سب سے بہتر فضلی صاحب کا مضمون نظر آیا۔ اور اس کے بعد نادم سیتاپوری۔ ارشد تھانوی۔ رشید صدیقی۔ شاہد احمد دہلوی اور کنھیا لال کپور کے مضمون بھی

اچھے معلوم ہوئے۔"

صدق جدید ۸ نومبر ۱۹۶۳ء

غالب پر میرے تحقیقی مضامین کا مجموعہ جب پہلی بار ... نام آدرم" کے نام سے شائع ہوا تو مولانا نے صرف ... چند سطریں تحریر فرمائیں۔

غالب سے متعلق نو مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضمونوں کا مجموعہ۔ مضمون لکھے گئے ہیں تحقیقی نقطۂ نظر سے ——— لیکن رکھے پھیکے نہیں خالص ادبی رنگ والے ہیں۔!

صدق جدید ۹ نومبر ۱۹۶۲ء

مختصر نگاری کا یہ کمال صرف نقد و تبصرے تک محدود ... ہے نجی اور ذاتی خطوط بھی ان کی یہ انفرادیت عام ... سے نمایاں نظر آتی ہے۔ مولانا کے مختصر اور طویل ... مضامین کا اچھا خاصہ ذخیرہ سیتاپور میں رہ گیا ۱۹۶۳ء ... جب میں پاکستان آیا تھا تو مولانا کی علالت کی خبر سن ... عیادت کا خط لکھا۔ جواب ایک کتاب پر ملا۔

برادرم وعلیکم السلام۔ اب خدا خدا کر کے اس قابل ہوا ہوں کہ کچھ لکھ پڑھ سکوں۔ آپ کی کتاب (غالب نام آدرم) ایک صاحب سے مانگ کر سی پر چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ والسلام

عبدالماجد۔ لکھنؤ

۷ اپریل ۱۹۶۳ء

میرے مضامین اور کتابوں سے خاص دلچسپی ہے ... میرا دل بڑھانے کے لئے داد بھی دیتے ہیں۔

بہت دنوں کی بات ہے امیر الدولہ لائبریری (قیصر باغ لکھنؤ) سے نکلتے ہوئے ایک دن مولانا کے بھتیجے داماد اور صوری و معنوی جانشین عزیزی حکیم ...

پوچھا۔؟

کون سی کتاب لے آئے لائبریری سے۔؟

کہنے لگے ——— آپ کا ناول "محلسرا" ہے چچا نے مانگ بھیجا ہے۔؟

میں نے کہا۔

اب مولانا کو میرے ناول بھی پڑھوائیے گا آپ!

ہنسنے لگے ——— وہ اپنی راہ چلے گئے اور میں اپنی راہ ———؟

کچھ دنوں بعد جب مولانا سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تو "محلسرا" کی تعریف کرنے لگے۔

میں نے عرض کیا۔

اس میں رکھا ہی کیا تھا جو آپ نے بلاوجہ اپنا وقت خراب کیا۔؟

فرمایا ———؟

لکھنؤیات پر بہت دنوں بعد ایک اچھا ناول نظر آیا۔

بڑی ہمت افزائی کی ——— میں پانی پانی ہوا جاتا تھا مگر......؟

عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا نے عرصے سے نقد و تبصرے کا سلسلہ ہی ختم کر دیا ہے اپنے علمی اردو دینی مشاغل کی وجہ سے اب ان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا۔ یوں بھی ان کی مختصر نویسی ہمیشہ محتاط نگاری "تک محدود رہی! ان حالات میں بغیر کتاب پڑھے مولانا اظہار رائے فرمادیں ناممکن بات تھی۔؟

لیکن غالب پر میری دوسری کتاب (غالب کے کلام میں الحاقی عناصر) جب آخری مراحل میں تھی تو میں نے مولانا کو لکھا کہ اس کتاب پر آپ بھی کچھ لکھ دیں تاکہ انھیں ابتدا میں شامل کر دوں؟

کتنی مہمل بات تھی؟ صرف موضوع بتا کر کتاب

لکھوانا چاہتا تھا اور وہ بھی مولانا عبدالماجد دریابادی سے ـــــ ، مگر مولانا کے خلوص اور محبت پر اعتماد کچھ ایسا ہی تھا ؟ چنانچہ مایوس نہیں ہونا پڑا۔ ایک مختصر تمہید کے بعد مولانا نے لکھا۔

"نادم صاحب پرانے غالب دوست۔ غالب فہم۔ غالب سنج ہیں۔ ان کے ذوق و طبع سلیم پر اعتماد" کرکے اور مسودہ کتاب کو دیکھے بغیر یقین رکھتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہوگا۔ سوچ سمجھ کر تلاش و کاوش کے بعد اور ذمہ داریوں کے پورے احساس کے ساتھ لکھا ہوگا۔
ان کی یہ تازہ تراوش قلم یقیناً غالبیات کے ذخیرے میں ایک دلچسپ اور قابل قدر اضافہ ہوگی۔"

کچھ دنوں بعد جب مسودہ ناشر کے حوالے کرنے لکھنؤ گیا تو پتہ چلا کہ مولانا یہیں تشریف رکھتے ہیں۔ میں مسودہ لے کر پہونچا ـــ عرض کیا مسودہ کتابت کے لئے جا رہا ہے وقت ہو تو ملاحظہ فرمالیں۔ تین سو ساڑھے تین سو کتابی صفحات کا مسودہ کوئی چھوٹا سا مضمون تو تھا نہیں ؟ پھر مولانا کی مصروفیات۔ ! یقین تو یہی تھا کہ میرے منھ پر مار دیں گے ـــــ مگر کچھ نہیں کہا ؟ بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ رکھ لیا یہ کہہ کر ـــــ

کل صبح لے لیجئے گا۔

دوسرے دن صبح کو پہونچا تو مسودہ کی ورق گردانی کر چکے تھے۔ اسی پنسل لفظ میں چند سطروں کا اضافہ فرما دیا۔

"اس کے بعد مسودہ کتاب کی بھی جھلک سرسری دور سرسری دیکھنے کو مل گئی ۔۔ ا

عین اس وقت جب وہ پریس کو جا رہا ہے تو داستان ہی دوسری نکلی ۔ بالکل معاملہ "این گل دیگر شگفت" تھا۔ تحقیق کے کوچے کوچے سے تو میں ہو کر بھی نہیں گزرا۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ داستان ہے بڑی دلچسپ اور بڑی ہی سبق آموز ۔ ؟"

اب آپ ہی بتائیے ایسی محبت اور شفقت کی مثالیں کہیں اور ملیں گی اس زمانے میں۔ ؟

مولانا جس پائے کے نقاد صحافی اور صاحب طرز لکھنے والوں میں ہیں اس کے متعلق دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں "سچ" سے لے کر "صدق جدید" تک ایک ایک سطر دیکھ جائیے حشو و زوائد سے پاک نظر آئے گی۔ ایک ایک لفظ ایک ایک فقرہ جچا تُلا ملے گا۔

مختصر نویسی کا یہ کمال مولانا کی تحریروں میں ملتا ہے اس کی مثالیں اس دور میں کم ہی ملیں گی لطیف طنز ـــــ اور وہ بھی علمی و ادبی مولانا کی طرز انشا پردازی کی جان ہے۔ ایک چھوٹے سے فقرے میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔

اردو کے ایک نامور نقاد کا ذکر کرتے ہوئے کس دلچسپ پیرائے میں لکھا تھا ایک بار ـــ ؟

"........ اردو میں لکھتے لکھتے اب اردو پر لکھنے لگے ہیں۔"

اسی طرح ایک تازہ خط میں مجھے تنبیہ فرمائی ہے۔ صرف ایک مصرعہ لکھ کر !

"بھول جانا ہمارا ـــ یاد رہے" ؟

کسی کا مشہور شعر ہے

یاد رکھنا ہمارا بھول گئے
بھول جانا ہمارا یاد رہا

جمیل مہدی صاحب ایڈیٹر عزائم

مولانا عبدالماجد دریا بادی

عالم، مصنف، صحافی اور دانش ور

مولانا عبدالماجد دریا بادی اگر ہندوستان کے بجائے کہیں اور پیدا ہوتے تو ان کا نام ابن جوزی ہوتا۔ انگلینڈ میں پیدا ہوتے تو کانن ڈائل اور ہندوؤں میں پیدا ہوتے تو ویکا نند ہو جاتے، ابتدا سے لیکر ان کی زندگی خط مستقیم کے ذریعہ ناپی نہیں جا سکتی اس میں کتنے ہی موڑ ہیں، کتنے ہی پیچ و خم۔ آرتھر کانن ڈائل شرلاک ہومز کا فرضی کردار تخلیق کرنے کی قابلیت رکھتا تھا لیکن مولانا عبدالماجد نے اخلاق کا ایک مجسمہ تراش کر زندگی کے ہر ایک کنارے اور گوشے پر استادہ کر دیا ہے۔ وہ فطرتاً ماضی پرست ہیں لیکن حال سے ان کے تعلقات اتنے گہرے ہیں کہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کے ذہنی محسوسات میں کسی قسم کی کہنگی اور فرسودگی آئی ہے۔ ان کی زندگی ایک متشکک فلسفی، ایک صاحب طرز ادیب، ایک عظیم صحافی، ایک بلند پایہ مفسر، ایک خوش عقیدہ اور باصفا مرید، ایک شفیق و بزرگ مرشد اور ایک صاحب فہم و فراست مبلغ کی زندگی ہے۔

جس ایک زندگی اور جس ایک شخصیت میں اتنے گوشے اور موتی کی طرح بے شمار پرتیں پائی جاتی ہوں، اس کے بارے میں آسانی کے ساتھ، قطعیت کے ساتھ کوئی آخری بات نہیں کہی جا سکتی۔

وہ عبقریوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو تین تین چار مکمل زندگیوں کا بوجھ اٹھانے کی طاقت رکھتی تھی، انکے سلسلہ ارشاد کے ہی دو بزرگوں، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی کی زندگی اور شخصیت میں بیک وقت کئی مکمل زندگیوں اور شخصیتوں کی موجودگی واضح طور پر دکھائی دے جاتی تھی، مولانا اشرف علی تھانوی ایک مرجع خلائق پیر، ایک عظیم دینی مصلح اور ایک بے مثال دینی مصنف کی تین مکمل شخصیتوں کے حامل تھے، مولانا حسین احمد مدنی، ایک مدرس، ایک مرشد اور ایک سیاسی رہنما کی تین مکمل شخصیتوں کو عمر بھر اپنے اندر سمیٹے رہے، مولانا عبدالماجد دریابادی اگر ایک مصنف، ایک صحافی اور ایک مفسر کی مکمل زندگیوں کے

حامل نظر آئیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی، سیاسی، صحافتی، اور علمی زندگی کا آغاز بھی بڑے تلاطم اور تہلکے سے بھرپور زمانے میں ہوا تھا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، احیا پسندوں کی ایک آخری کوشش تھی، اس کوشش کو اتنی بے رحمی کے ساتھ انگریزوں اور کچھ برادرانِ وطن کی گولیوں اور سنگینوں سے دبایا کہ پھر چالیس بیالیس برس تک مکمل ششدری کی سی حالت مسلمانوں پر طاری رہی۔ بوڑھے سرسید کی ایک آواز، اور مولانا قاسم نانوتوی کی پُراسرار سرگرمیوں کے علاوہ دور تک سناٹا طاری دکھائی دیتا رہا، کچھ لوگ رامش ورنگ میں مشغول ہوگئے، کچھ مایوس اور دل برداشتہ ہوکر، کونے کھدروں میں جا چھپے، باقی لوگ آہ سرد تو اکثر بھر لیتے، فرنگیوں کے رعب و داب کے سامنے دم مارنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

پھر وہ دور آیا کہ مولانا آزاد پیدا ہوئے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی پیدا ہوئے، بیرسٹر مظہر الحق پیدا ہوئے۔ کسی طرف سے حسرت موہانی نکل آئے۔ مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر سر محمد اقبال نے جنم لے لیا، حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری گوشۂ عافیت سے باہر آگئے۔ پرانے شبستانوں کے محرمانِ اسرار، انہدام اور انقلاب کے چشم دید، گواہوں اور رفتہ عظمت کے نوحہ خوانوں کی حیثیت سے پرانی نسل کے، جہاں دیدہ، حالی، شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد، جو لرزہ میں گرفتار ایک پوری قوم کو۔ مرتعش اور ضعیف ہاتھوں سے کچھ نہ کچھ گرمی پہونچانے کی کوشش مدت سے کر رہے تھے۔ نئی نسل کو خراش انگیز۔ نغمہ سرائی اور مردوں میں روح تازہ پھونک دینے کے عزم ا بجزم میں مصروف دیکھ خوش خوش آگے پیچھے رخصت ہوگئے، مرتے وقت اتنا اطمینان ضرور رہا ہوگا کہ ہم سے جو کچھ بن پڑا کردیا، باقی یہ لوگ دیکھ لیں گے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اسی قافلہ کے ہمسفر اور اسی راہ کے ایک راہی تھے۔ جوان لوگوں نے اختیار کی جن کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ انھوں نے جس وقت قلم ہاتھ میں لیا تھا۔ قلم کی عظمت اور عصمت کی بڑی نگہداشت کی جاتی تھی، قلم اگر تلوار سے تیز نہ ہو، نیزہ سے زیادہ آبدار اور تیر سے زیادہ خوں چکاں نہ ہو، تو اس کو ہاتھ میں، لینے کی ہمت ہی کسی کو نہیں ہوئی تھی خوف سے لرز جانے اور دولت سے بک جانے والے قلم کے مقابلے میں لوگوں کو بالاخانوں پر رکھے ہوئے حقوں کا نیچہ تھام لینا زیادہ عزت کا کام معلوم ہوتا تھا، صرف وہ لوگ اس میدان قلم کے میدان میں اترتے تھے جو خدمت اور بندگی کے اظہار کے لئے عبادت کو ناکافی سمجھتے تھے، قلم کی عظمت اور ناقابلِ تسخیر قوت کا اعتراف ہر زمانہ میں کیا جاتا تھا لیکن اس کا اظہار اسی وقت ہوا جب مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہاتھوں نے اس کے ذریعہ اس گرجتے ہوئے طوفان سے ہندوستان کو بھر دیا جس کی بازگشت آج بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طور سنائی دے جاتی تھی۔

جمال الدین افغانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد علی، مولانا سید سلیمان ندوی۔ اکبر الہ آبادی۔ —— یہ وہ سمتیں ہیں جو مولانا کے فکر و ذہن کا میدان متعین کرتی ہیں، وہ اسلام کی گذشتہ عظمتوں کی بازیابی کے علم بردار، اسلامی تعلیمات کے فروغ کے مبلغ، سیاست، صحافت، علم عمل اور ذہن دستور کو انسانیت کے تابع رکھنے کے موید اور تہذیب گذشتہ کے بہت بڑے ترجمان ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے انقلاب کے بعد پیدا ہوئے اور ایک بہت بڑے انقلاب کے بعد زندہ رہنے والے بہت بڑے مسلم اہل قلم اور دانشوروں میں سے ایک ہیں۔ خلافت کی، رومانی، پرجوش، ہمہ گیر اور سرشار تحریک کی یادگاروں میں اب چند ہی ۔ شائد چار پانچ لوگ رہ گئے ہیں، چودھری خلیق الزماں پاکستان میں —— ڈاکٹر سید محمود، لیٰسین نوری، مولانا کرم علی اور مولانا عبدالماجد دریابادی —— ہندوستان میں خلافت مرکز اسلام کے تحفظ کی بین الاقوامی تحریک سے لیکر قیام پاکستان کی علاقائی تقسیم کی جدوجہد کے تیس سال، بڑے تلاطم، بڑے پیچ وخم، بڑی سنگین فکری الجھنوں کے برسوں تک جو فاصلہ طے کیا گیا ہے وہ ہندوستان ہی کی نہیں، اسلام کی عالمی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے مولانا عبدالماجد دریابادی، اس تمام عرصے میں، قلم کا تیشہ، اور ذہن کا ترکش لئے ہوئے پہلی صف میں موجود رہے وہ ہندوستان کی مسلم سیاست کے مشاہد اور طوفانوں کے برساحل نگہداری نہیں بچاس سالہ مدت کی مجسم سرگزشت ہیں۔

[illegible]

۱۹۲۵ء سے لیکر جب کہ انھوں نے سچ کی عنانِ ادارت سنبھالی ۱۹۷۱ء کے اس وسط آخر تک کے پینتالیس برسوں میں جو کچھ انکے قلم سے نکلا ہے، شاید ہی کبھی یکجا طور پر سامنے آسکے، لیکن ان پینتالیس برسوں میں ان کے قلم کی کاٹ اور تحریر کی دھار میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا، ان کا لہجہ حیرت ناک طور پر اتنا یکساں اور اتنا ہموار ہے کہ کبھی بھی پستی اور بلندی کا فرق نہیں پیدا ہوتا —— وہ اُردو میں ایک طرز خاص کے موجد اور لہجہ کے ایک خاص اسلوب کے مخترع ہیں، ان کے چھوٹے چھوٹے فقرے غضب کی بلاغت، مضمون آفرینی، ضبط وتوازن اور ایجاز واعجاز سے بھرپور وہ ساری کیفیتیں اور خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں جو کامیاب کے اشعار کے لئے لازمی قرار دی گئی ہیں لیکن ان تمام معنوی خصوصیات کے باوجود یہ فقرے اشعار نہیں بن پاتے، نثر کا ہی ایک اسلوب رہتے ہیں اور یہ مولانا عبدالماجد کی تحریر کا وہ کمال ہے جس میں اُردو نثر کا کوئی بھی صاحب اسلوب انشأ پرداز ان کا شریک نہیں۔

فلسفہ اخلاق کی پیچ در پیچ تہوں سے لیکر قرآن کے اسرار رموز کی گہرائیوں تک انھوں نے اپنے ذہن کو دوڑایا اور خصوصی میں مصروف کر رکھا ہے۔ ڈرامہ نگاری، افسانہ طرازی، انشاپردازی اور ادب وصحافت کے ہر ایک موضوع کو انکے قلم کو چھیڑا اور چھوا ہے، تحریر کے ہر کوچہ کی خاک چھانی اور تجربہ حاصل کیا ہے۔ وہ دین سے لیکر بیدینی اور آشنا رہے ہیں، ان ساری کوچہ گردیوں نا

اور بادیہ پیمائیوں کے بعد وہ اپنے ذہن و دماغ کی پوری صحت و صلاحیت کے ساتھ الہامیات کے ساحل پر اُتر پڑے ہیں اور مولانا شبلی کی طرح اُنھوں نے بھی عمر آخر کی تمام تر جولان گاہ، اسلامی تعلیمات کی تبلیغ اور دینی خدمات کو قرار دے لیا ہے ــــ مولانا شبلی نے تو سیرۃ النبی کی تصنیف و تالیف کے مشغلہ کو خاتمہ بالخیر قرار دے لیا تھا، مگر مولانا عبدالماجد تفسیر ماجدی جیسی عہد آفریں تالیف کے بعد بھی، بدستور آسودگی کے متلاشی اور رزق جستجو میں غرق و مضطرب نظر آتے ہیں، یہ ان دو عظیم انشا پردازوں اور مصنفوں کی شخصیتوں کا فرق نہیں، ایک حال و احوال کا وہ اختلاف ہے جو ایک ہی دُکھ سے جنم لینے والے دو انسانوں کے ذوق و عادات میں تنوع اور ایک ہی زمین سے اُگنے والے دو درختوں کے پھلوں میں ذائقہ اور رنگ میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔

ایک بڑے اہل قلم اور عظیم شخصیت کے ناطے مولانا عبدالماجد دریابادی کا انکسار، حقیقت کی تلاش اور تسلیم کرنے پر ہمہ وقت آمادگی، فکری نتائج کے تجربہ، حسن و قبح کی چھان پھٹک اور آزمائش کے بعد، اصلاح و ترمیم کے لئے ہمیشہ تیار رہنے کی خصوصیت، اُنھیں ایسے بہت سے مفکرین اور اہل قلم سے ممتاز کرتی ہے جو اپنے فیصلے کو حرف آخر اور اپنے کام کو کارنامہ قرار دینے کی مکافات بہت آگے چل کر بھٹکتے اور بالآخر ساقط الاعتبار اور محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ اب تک جو کچھ بھی کہتے رہے ہیں، ہمیشہ اس کا حساب رکھتے اور نفع و نقصان کا تخمینہ لگاتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے اندازوں کی غلطی تسلیم کرنے میں جھجک سے کام نہیں لیا، اپنے شخصی وقار اور وجاہت کو اس سلسلے میں کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا ــــ اس سلسلہ کی تازہ مثال ان کے وہ مضامین ہیں، جو انھوں نے پاکستان میں علاقائی رجحانات کے طاقتور ہو جانے کے بعد لکھے۔

انھوں نے صاف طور پر نہ صرف اپنی ملک اپنی نسل اور اپنے ہم مسلک اہل دین اور اہل قلم کی طرف سے اعتراف کیا کہ پاکستان کی موجودہ صورت حال، رجحانات اور کشمکش ان تصورات کے بالکل مخالف اور برعکس ہیں، جن کو مدنظر رکھ کر ہم لوگوں نے تحریک پاکستان کی تائید کی تھی انھوں نے بے لاگ الفاظ میں پاکستان کی موجودہ علاقائی کشمکش اور اس ملک میں، سندھی، پنجابی، سرحدی اور بنگالی کی تمیز و تفریق کو اس جذبۂ دین کو یکسر مخالف قرار دیکر، دکھ اور اذیت کے ساتھ اپنی مایوسی کا اظہار کیا اور کہا کہ دین کی سربلندی اور اسلام کے تقاضوں اور اصولوں کے تحفظ و احیاء کا جذبہ تھا جس نے انھیں اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو، ایسے خواب دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا جو کبھی پورے نہیں ہوتے۔

مولانا عبدالماجد جیسی باوقار اور محترم شخصیت رکھنے والا کوئی بھی دوسرا فرد اس پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا اور ــــ آمادہ نہیں ہوا کہ وہ صاف صاف طور پر اعلان کرے کہ وہ بے خبری میں

مولوی محمد یوسف (لکھنؤ)

مولانا عبدالماجد دریابادی

مولانا مشرقی اور مغربی علوم کے جامع کیننگ کالج لکھنؤ کے قدیم گریجویٹ اور تقریباً ساٹھ برس سے کہنہ مشق و پختہ کار انشا پرداز ہیں۔ انھیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ انگریزی کے منتہی بھی ہیں۔ گذشتہ سو برس میں انگریزی تعلیم سے جو لوگ مستفید ہوئے اور مغربی علوم حاصل کر لینے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی مستثنیات چھوڑ کر ان میں سے اکثر و بیشتر کے قالب پر جدید رنگ چڑھ گیا اور مشرقی رنگ یا تو بالکل مٹ گیا یا ماند پڑ گیا۔ ظاہری صورت شکل، وضع قطع، طرزِ بود و ماند پر مغربی طرز چھا گیا اور باطن میں نظریات و خیالات یا معتقدات تک یکسر بدل گئے گویا کہ ؏

جو پڑھا لکھا تھا نیازؔ نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا

شروع شروع میں مغربی فلسفہ کے زیرِ اثر مولانا پر بھی تشکیک کا دور گزرا لیکن اُنکی فطرتِ سلیم، اصابتِ رائے اور طلبِ صادق نے اُنھیں زیادہ عرصہ بھٹکنے نہیں دیا۔ اور جلد راہِ مستقیم پر لا چھوڑا۔ قدرت نے مولانا کو سلیم فطرت عطا کی ہے۔ جودتِ ذہن اور فطرتِ سلیم بہت کم یکجا ہوتی ہیں۔ مگر مولانا کی شخصیت میں دونوں جمع ہیں۔ ابتدا میں مولانا کا یہ روش اختیار کرنا اسی جودتِ ذہن اور ذکاوتِ طبع کا نتیجہ تھا۔ جیسے جوانی میں غیر معمولی ذہین اور ذکی طالب العلم اِدھر اُدھر بھٹکنے اور چل پھر کر دیکھنے کے بعد راہِ مستقیم پر آتا ہے

چل پھر کے ذرا دیکھ جھجکتا کیا ہے
مل جائے گی راہِ راست گمراہ تو ہو

یہ مولانا کی سلیم الفطرتی تھی کہ بہت جلد جدید علم و تمدن کی چھوٹی چوک دیکھ سے واقف ہو گئے اور نہ صرف واقف بلکہ قطعاً متنفر اور بےزار ہی اپنی اصلاح کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا اور مجددِ وقت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تزکیۂ باطن اور اصلاحِ نفس کا تعلق رکھا۔ اس انقلابِ حال نے مولانا کو وہ مقام عطا کیا جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا۔

مولانا بزمِ دوشیں کی یادگار، کاروانِ اُردو کے قافلہ سالار، دین و ملت کے خدمت گزار، طریقۂ سلف کے پیرو کار، ملتِ بیضا کے مؤید و مددگار، علومِ قدیم و جدید کے طلبگار اور سب سے بڑھ کر قرآن کے

رموز و اسرار کے ماہر و واقف کار۔

علومِ مشرق و مغرب عجب یکجا بہم آمد
قدامت از یمین آمد تجدد از یسار آمد

توازن

اسوقت ہند و پاک میں مولانا کی ذات مغتنمات سے ہے۔ اُن میں قدیم و جدید کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا ہے کہ شاید و باید۔ ہر اہلِ قلم کی طبیعت کا خاص میلان ہوتا ہے اور یہ طبیعت کا جھکاؤ اکثر راہِ اعتدال سے ہٹا دیتا ہے۔ خیالات و نظریات کے دوسرے پہلو خواہ کیسے ہی جاذبِ نظر اور دلکش و دلنشین ہوں مگر اُن سے صرفِ نظر کرتا ہے۔ مولانا میں یہ بات بالکل نہیں ہے مولانا کے مزاج میں میانہ روی اور اعتدال پسندی ہے مجال ہے کہ کسی ایک طرف پلہ جھک جائے۔ مولانا کا قلم بڑا محتاط ہے۔ حریفِ مخالف کی کتاب پر تبصرہ ہو رہا ہے اور مصنف کے قلم کی لغزشیں دکھا رہے ہیں کہ معاً کوئی پُر لطف۔ خیال انگیز بات یا کوئی لفظی و معنوی خوبی نظر پڑی مولانا مصنف کو داد دینے لگتے ہیں صدقِ جدید میں مختلف النوع کتابوں پر تبصرہ ہوتا رہا ہے اور مولانا کا قلم بے لاگ تبصرہ کرتا ہے مخالف کی خوبیوں کی بھی قدر کرتا ہے۔ یہ نقد و تبصرہ سالہا سال سے جاری ہے۔ اس دوران میں مولانا کے مخالفین بھی پیدا ہوئے۔ قلمی بحث و جدال کے بھی مواقع آئے مگر مولانا کبھی ذاتیات پر نہیں اُترے۔ عقلی و نقلی دلائل سے حریف کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مخالف نے اکثر منھ کی کھائی۔

توازن کی تازہ مثال

یکم جنوری ۱۹۶۲ء کے صدقِ جدید میں سرکاری وفد حج کی شرکت سے معذرت کی ہے اس معذرت خواہی کے جو اسباب بیان کئے ہیں وہ مولانا کی ذاتی خصوصیات یعنی اُن کی انفرادیت کے آئینہ دار ہیں۔ دل شرکت پر بے حد مائل، احباب و اعزا کی فرمائش اور مخلصوں کی کوشش شرکت کی مقتضی مگر دعوتوں اور رسمی ملاقاتوں و گفتگوؤں میں وقت کے ضائع ہونے کا خدشہ، ناواقف دیگر ارکانِ وفد سے ناموافقت کا امکان شیوۂ گوشہ گیری و خلوت گزینی میں خلل کا اندیشہ اور سب سے بڑھ کر ضمیر کی آواز شرکت کے خلاف، غرض معذرت کرنے میں عجب کشمکش کا سامنا تھا۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

مولانا "ایمان" کے روکنے سے رُک گئے اور "کفر" کی کشش نہ کھینچ سکی "کعبہ" کو آگے رکھا اور "کلیسا" کو پیچھے۔

عدم شرکت کا فیصلہ کرنے میں مولانا کی عقلیت شریکِ غالب رہی اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا ہجومِ جذبات میں بھی دماغی توازن برقرار رکھتے ہیں اور یہی مولانا کی عظمتِ شخصی کی بڑی دلیل ہے

پابندیٔ اوقات مولانا وقت کے بڑے پابند ہیں اپنے معمولات میں فرق کسی حال میں

اشفاق احمد عباسی بیرسٹر ایٹ لا (لکھنؤ)

ماجد بھائی

عزیزی شمس صاحب کی تاکید ہے کہ ادارۂ فروغ اردو کی جانب سے جو "مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر" شائع کیا جانے والا ہے اس میں شمولیت کے لئے مولانا دریاآبادی کی زندگی کے کسی گوشہ پر کوئی مضمون میں بھی پیش کروں۔ اُن کا یہ تقاضہ میرے سر آنکھوں پر۔ اُس کا پورا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ پورا کرسکوں تو اپنی سعادت سمجھوں گا۔ شمس صاحب میرے کرم فرما ہیں۔ مجھ سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ پھر بھلا وہ یہ کیوں سوچنے لگے کہ میری علمی اور ادبی صلاحیتیں کچھ یونہی سی ہیں اور مولانا صاحب موصوف کی مقتدر اور متبرک زندگی میں اتنے قابل قدر گوشے ہیں کہ اُن کی انتہا نہیں۔ اور ان میں سے کسی گوشہ کا احاطہ کرنا میری بساط سے باہر ہے۔

بس سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ لکھوں تو کیا لکھوں۔ دو اور دقتیں بھی درپیش ہیں۔ اول تو یہ کہ میں ان کا بہت ارادتمند ہوں۔ دوسرے موصوف سے میرا قریبی رشتہ اور واسطہ ہے اور ان کی اہلیہ مرحومہ میری بہت عزیز اور چہیتی بہن تھیں۔ یہ نسبت اور تعلقات میرے لئے بڑے فخر و طمانیت کی باتیں ہونا چاہئیں۔ لیکن عام دستور کے مطابق مجھکو مولانا کا معتقد اور معترف نہ ہونا چاہئیے۔ میرے نزدیک آدمی کی بڑائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ اُس کے سابقے والے اُس کا احترام کرنے پر مجبور ہوں۔ اُس کے مرتبے اور عظمت کی قدر کرتے ہوں۔ وہ اس لئے کہ جب آدمی کسی پہاڑ کی بلندی کو پوری طرح نہیں دیکھ سکتا۔ اور اگر دیکھ سکتا ہے تو اس کا اعتراف کرنے سے گریز کرتا ہے۔

بہرحال میں نے مولانا صاحب موصوف کو اپنی قرابتداری کی وجہ سے جانا۔ میں ان کو ماجد بھائی کہتا چلا آیا ہوں اور اسی طور پر اُن کا ذکر اور حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ گویا اُن کے اقتدار میں حصہ بٹانا ہوا۔ اور آدمی خودغرض تو ہوتا ہی ہے، مگر میں ان کی علمی اور ادبی زندگی۔ اُن کے دینی اور روحانی اقتدار کا جائزہ تنقیدی نظر سے پیش کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اول تو اس کی قابلیت اور استعداد نہیں رکھتا دوسرے شمس صاحب نے مجھے ڈرا دیا ہے اس ضخیم اشاعت میں ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز ترین ادبا اور علمائے دین حصہ لینے والے ہیں۔ وہ جلیل القدر لوگ اُس کا منصب بھی رکھتے ہیں اور غالبًا کماحقہ قابلیت بھی کہ اپنے فرض کو بحسن کمال پورا کرسکیں۔

اب کوئی یہ پوچھے کہ یہ لمبی سی تمہید کیوں پیش کی گئی

توصاحب سچ بات یہ ہے کہ جب کوئی کمزور آدمی بے سہارا اندھیرے میں چلتے ہوئے خوفزدہ ہوتا ہے تو اپنے دل کو تقویت دینے کے لئے سیٹی بجاتا ہے۔ وہی حالت میری بھی ہے۔ میں مولانا موصوف کے علم و فضیلت کی وسعت سے مرعوب ہوں۔ اور اپنی علمی کم بضاعتی سے خوفزدہ۔

بہر صورت میں جو کچھ لکھ سکتا ہوں وہ ماجد بھائی کی ذاتی شخصیت اور اُس کی بتدریج ترقی کی بابت ہے میرے علم میں ہے کہ موصوف کی تربیت کی اور تعلیمی بنیادیں مستحکم تھیں اور ابتدا ہی سے اُسی مرتبے کی نشاندہی کرتی تھیں جہاں وہ فائز اور سربلند ہیں۔ ماجد بھائی شروع ہی سے بہت اچھے اور محنتی طالبعلم تھے۔ اُنکو علم اور معلومات حاصل کرنے کی [illegible] لگن تھی۔ وہ بےچین رہتے تھے کہ بہترین تعلیم حاصل کرسکیں اور اُن کی طبیعت اور فطرت کا یہ انمول خاصہ تھا کہ وہ جس علم کی طرف توجہ کرتے تھے اُسکو ازابتدا تا انتہا حاصل کرنا چاہتے تھے علمی اور عملی طور پر اُس میں ہمہ تن مصروف اور منہمک ہو جاتے تھے۔ اُنکو ان کو کتب بینی کا ازحد شوق تھا۔ اور تفتیش اور جستجو کا خلقی مادہ رکھتے تھے۔ اُن کو شروع ہی سے تصنیف تالیف اور مضمون نگاری کی صلاحیت حاصل تھی۔ میں نے جب اپنی ہوشمندی کے درجے کو پہونچکر دیکھا تو وہ کالج کے ممتاز طلباء میں شمار کئے جاتے تھے۔ خوشنما اور باوقار شخصیت کے آدمی تھے۔ ان کا جسم بہت سڈول اور دلفریب تھا۔ خوش پوشاک بھی تھے۔ اچھے قسم کا ہندوستانی اور انگریزی لباس پہنتے تھے اور وہ اُنکو زیب دیتا تھا۔ اب اُنکو دیکھئے تو صاف ستھرے کپڑے تو پہنتے ہیں مگر سادے سادے اور ڈھیلے ڈھالے قسم کے۔ لباس کے متعلق یہ بے پروائی اور بے رخی غالبًا اُن کی علمی اور دینی مصروفیات اور معلومات کی وجہ سے ہے۔ وہ اب بھی درستی لباس سے بے نیاز ہونے کے باوجود باوقار معلوم ہوتے ہیں۔

تعلیمی سلسلے میں اُس وقت ان کا رجحان بالخصوص مغربی فلسفے کی طرف تھا اور اس گورکھ دھندے میں کچھ اس طرح پھنسے ہوئے تھے اور اُس کا پرچار اس شد و مد سے کرتے تھے کہ لوگوں کو ان پر بے دینی کا شبہ ہوتا تھا لیکن اللہ نے بڑی خیر کی کہ اُس اسٹیج کو پہونچ کر اُن کی دلچسپی اسلامی اور دینی تعلیمات کی طرف ہوگئی۔ اُس نے اُن کو راہ راست پر لگا دیا۔ مگر وہ اپنی زندگی کے ہر دور میں یہ خصوصیت رکھتے تھے کہ اپنے خیالات اور جذبات کو انتہائی دلیرانہ اور جرأت مندانہ طور پر ظاہر کرنے سے باز نہیں رہتے تھے۔

اس نوبت کو پہونچکر ان کے خیالات اور اعتقادات نے پہلے تو یہ کروٹ لی کہ اُن کی دلچسپی اور دلبستگی تصوف کی طرف مبذول ہوگئی۔ اُس رنگا رنگ زندگی اور صوفیانہ کیفیات کے عالم میں حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ اقدس پر کئی مرتبہ معتکف ہوئے اور اسی دور میں اُنکی دلچسپی قوالی کی والہانہ محافل اور حال و قال کی نشستوں پر بھی مبذول رہی۔ قوالی سے صرف اثر پذیر ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ بسا اوقات اچھے قوالوں کو ساتھ رکھتے تھے۔ اور اکثر مشاہدہ میں آیا کہ اچھے کلام اور اچھی قوالی سنتے ہوئے ان پر کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ خاصکر نعتیہ کلام سے بہت متاثر ہوتے تھے۔

نعت پاک رسول سے لطف اندوز ہونا تو اب بھی باقی ہے مگر اب موسیقی سننے سے پرہیز فرماتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نعتیہ اشعار خود بھی کہا کرتے تھے مگر اس کا اعلان نہیں کرتے تھے۔ میرا قیاس ہے کہ اچھا نعتیہ کلام ریڈیو وغیرہ پر سنتے ہوں گے۔

تو موصوف اب بھی سرمستی کے عالم میں پہونچکر گم ہوجاتے ہوں گے ۔ اسلئے کہ نبیؐ اکرم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں ۔ اور محبت میں معمولی قیود دخل انداز نہیں ہوسکتے ۔

ماجد بھائی بہت جلد علمی اور ادبی دنیا میں شمار کیئے جانے لگے تھے ۔ اور ہندوستان کی تمام سیاسی اور علمی شخصیتوں سے بھی متعارف ہوگئے تھے ۔ جن میں ایسے گراں قدر لوگ شامل تھے جیسے مولانا شبلی ۔ مولانا محمد علی ۔ مولانا شوکت علی ۔ حکیم اجمل خاں ۔ ڈاکٹر انصاری ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ حسرت موہانی وغیرہ وغیرہ جن کو یاد کرنا فی الحال تبرک ہوگیا ہے مگر تاریخ ان کو یاد کرتی رہے گی ۔ الغرض ان لوگوں کے فیض صحبت سے ماجد بھائی نے بہت استفادہ حاصل کیا ۔ اس کے علاوہ موصوف کا براہ راست واسطہ حیدرآباد دکن ۔ اعظم گڈھ اور علی گڈھ کے علمی اور ادبی اداروں سے بھی رہا ۔ ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے بیشتر اساتذہ طلبا ۔ ادبا ۔ شعرا اور علما سے تو ان کا میل جول برابر ہی چلا آیا ہے ماجد بھائی کو ہمیشہ سے اس کا خاص شوق رہا ہے کہ علمی ادبی اور دنیوی موضوعات پر صاحبان فکر و دانش سے تبادلہ خیالات اور بحث و مباحثے کرتے رہیں اس طرح انھوں نے اردو ۔ فارسی ۔ عربی اور جملہ اقسام کے علم و ادبیات میں غیر معمولی استعداد حاصل کرلی ۔ موصوف بہت غیر معمولی حافظہ کے مالک تھے ۔ جو کچھ پڑھتے یا سنتے تھے ان کو یاد رہتا تھا ۔ یہ حالت ان کی بالخصوص اچھے اشعار کے متعلق تھی جو ان کو ازبر ہوجاتے تھے ۔ کتنے اشعار اُن کو یاد ہیں ان کا شمار ناممکن ہے ۔ جب کبھی اُن کے سامنے کوئی مخصوص بات آتی ہے تو وہ حیرت انگیز نکتہ رسی کا پہلو ملالیتے ہیں ۔ اور پھر اس موضوع سے متعلق کوئی نہ کوئی اردو ۔ فارسی وغیرہ کا ہم معنی شعر برجستہ اُس کی سند اور تصدیق کے طور پر پیش کردیتے ہیں ۔ وہ اسقدر برمحل ہوتا ہے کہ اُس موضوع پر اور کسی کے لئے شاید ہی ممکن ہو کہ وہ ایسا شعر پیش کرسکے ۔

اُن کی علمی جدوجہد اور کاوشوں نے ان کی بیش بہا صلاحیتوں نے ایک طرف اور دوسری طرف اُن کی خلقی شائستگی ۔ سنجیدگی ۔ منکسر مزاجی ۔ خوش اخلاقی اور خلوص نے اُن کو ایک لاثانی درجہ کو پہونچادیا ہے جہاں وہ فائز ہیں ۔

تالیف اور تصنیف کی یہ صورت کہ ان کی تحریر اور نثر نگاری میں رنگ رنگ کے پھول نظر آتے ہیں اور اپنی طرز نگارش میں انھوں نے ایک مخصوص شاہراہ اور روش کی بنیاد ڈالی ہے جو کہ بہت مخصوص ہے ۔ اُن کا اسلوب نگارش بہت خوش آئند اور دلفریب ہوتا ہے ۔ اسمیں سچائی ۔ صدق و صفا اور اخلاص کا عنصر بہت دلکش کیفیت پیدا کرتا ہے مستحکم خیالات کے مالک ہیں ۔ مستحکم طور پر خیالات کے اظہار کرنے کی قدرت رکھتے ہیں وہ ہیر پھیر کی باتیں کرنے میں نہیں پڑتے ۔ خالی شاندار الفاظ اور تراکیب سے پرہیز کرتے ہیں ۔ چنانچہ ان کی تحریر گورکھ دھندا نہیں معلوم ہوتی سلجھے ہوئے خیالات اور نظریات کو آسان ترین طرز میں پیش کرتے ہیں جو دلنشین ہوجاتے ہیں ۔ بڑی سے بڑی بات کو تعجب انگیز نکتہ رسی اور اختصار سے بیان کرتے ہیں ۔ اور چونکہ بے حد ذہین اور صاحب فکر و نظر آدمی ہیں اس لئے الجھاؤ کی باتوں میں الجھتے نہیں ۔ اور پھر بات کو ایسے روشن اور ظریفانہ لطافت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اس میں اکبر الہ آبادی کی چاشنی معلوم ہوتی ہے

بو بات کہتے ہیں سوچی سمجھی اور غور کی ہوئی ہوتی ہے۔ بس
یسا معلوم ہوتا ہے کہ بقول خبیر لکھنوی کے۔

"ساتھ مفہوم کے جیسے کسی ذی ہوش کی بات"

غیر یہ سب تو ان کی علمی اور ادبی مشاغل کے متعلق باتیں
ہوئیں۔ اب کچھ ان کی دینی معلومات، ور خدمات دین کا بھی ذکر
ضروری معلوم ہوتا ہے انھوں نے علم دین کی طرف رُخ کیا تو
ین و تدریس کے بہت سے مراکز انھوں نے ٹٹولے۔ مگر ان کو
خصوصی امداد۔ ہدایت اور رہبری مولانا اشرف علی صاحب
ھانوی سے حاصل ہوئی اور اس تمام جدوجہد کا نتیجہ ہوا کہ
ب مولانا دریابادی اپنی جگہ پر بذات خود دینی پیشواؤں میں
ار کئے جاتے ہیں۔ علم تفسیر قرآن علم حدیث و فقہ میں انھوں
نے اپنے آپ کو اس طرح سربلند کر لیا ہے کہ اس کا جواب
ہیں نہ جانے انھوں نے کتنی کتابیں لکھ ڈالی ہیں جو اپنی نظیر
ہیں رکھتیں۔ انھوں نے جو قرآن پاک کی تفسیریں اردو
ور انگریزی میں لکھی رہیں ان کا کیا درجہ اور مرتبہ ہے اُسکو
نیا جانتی ہے۔

یہاں پر ایک دلچسپ گریز کا پہلو یاد آیا ہے اور
س کا بیان کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ وہ یہ کہ عملیات اور
ید دعا تعویذ کے متعلق بھی ان کی معلومات کی انتہا نہیں۔
لیات میں وہ خود مبتلا نہیں ہوتے مگر تعویذوں کے متعلق
صورت ہے کہ وہ تعویذ نہیں دیتے ہیں لیکن اگر کوئی تعویذ
ص صورتوں میں بمشکل عطا کر دیتے ہیں تو وہ بھی ان کی خوش
ی اور بے غرضی کی وجہ سے کارگر ہوتا ہے۔ مگر جو سب سے
یسپ بات ہے وہ یہ ہے کہ ایک زمانہ میں مولانا موصوف
توجہ علم مسمریزم کی طرف بھی مبذول ہوگئی تھی۔ تو حسب

عادت اس سے متعلق پوری علمی اور عملی معلومات بھی حاصل
کرکے چھوڑی۔ اور اس بات کی تصدیق اس واقعہ سے ہوئی ہے
کہ میری بہن مرحومہ جو اُن کی رفیقہ حیات تھیں۔ ان کو ایک زمانہ
میں ہاتھوں پیروں کے درد کی سخت تکلیف رہتی تھی۔ اور وہ
باوجود عام معمولی علاج معالجے کے جاتی نہیں تھی۔ اتفاقاً گھر
والوں کو خیال آیا کہ اس معاملہ کو ماجد بھائی سے رجوع کیا
جائے۔ پہلے تو انھوں نے بہت پہلو تہی کی۔ ٹال مٹول کیا مگر
گھر والوں کے انتہائی اصرار پر وہ رضامند ہو گئے اور انھوں
نے اس درد کو مسمریزم کے عمل سے دور کرنے کی کوشش
کی تو وہ اللہ کی رحمت سے کامیاب ہوا۔ اور اسی زمانہ میں
سابقہ پڑا تو اسی سلسلے میں اُس ازدواجی رشتہ کی بنیاد پڑی
جو اس قدر کامیاب ثابت ہوا۔ اُن کا اپنی رفیقہ حیات سے
واسطہ اور سابقہ کس قدر خوشگوار اور کامیاب ثابت ہوا اُس کا
اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرحومہ کی یاد ماجد بھائی
کے دلنشین ہے اور موصوف اب بھی ان کی یاد سے اسی طرح
سے وابستہ ہیں جیسے وہ ان کی حیات میں محبت کرتے تھے۔
بے موقع نہ ہوگا اگر یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ مرحومہ اپنے خصائل
حمیدہ کی وجہ سے خاندان میں بہت ہر دلعزیز تھیں اور اپنے
رکھ رکھاؤ۔ سلیقہ شعاری اور اپنے شوہر کی خدمت کے لحاظ
سے مثالی بی بی سمجھی جاتی تھیں اسی طرح یاد کی جاتی ہیں۔ اسی
طرح یاد کی جاتی رہیں گی۔

فی الجملہ یہ کہ ماجد بھائی کی گوناگوں شخصیت نہ جانے
کتنے کمالات اور کتنی برکتوں کا خزینہ ہے۔ جو لوگ انکو نہیں
سمجھتے ہیں وہ اپنی ہی نافہمی اور نااہلیت کی وجہ سے۔ صاف گوئی
بے لوث اظہار خیال اور یقین کامل ان کی سرشت کا جزو اعظم ہے

انیس احمد عباسی)

مولانا عبدالماجد دریابادی

آج سے تقریباً تین چار ماہ قبل رسالہ "فروغ اردو" کے سرپرست عزیزی مولوی محمد حسین علوی، شمسؔ کاکوروی نے فرمائش کی کہ رسالہ مذکور کے عبدالماجد نمبر کے لیے میں بھی اپنے پچھلے تقریباً پچاس سال کے "تاثرات قلمبند کرکے اس خاص نمبر کے لیے پیش کروں تو میں نے بہت عذر کیا کہ میں نے یہ اصول بنالیا ہے کہ کسی بزرگ کے حالات زندگی کے بارے میں کبھی اُنکی حیات میں کچھ نہیں لکھتا۔ وجہ یہ ہے کہ پندرہ سال قبل ایسی ہی غلطی کرکے اس کا خمیازہ بھگت چکا ہوں اور وہ اس صورت میں کہ خود راجہ صاحب سلیم پور (مسٹر محمد علیخاں مرحوم) کی فرمائش پر میں نے "حقیقت" میں موصوف کے بارے میں لکھا اور اسکے بعد ہی خان بہادر نواب حامد حسین خاں صاحب رئیس دریا بَاد لکھنؤ کے متعلق بھی مفصل حالات لکھے۔ دونوں صاحبوں کے بارے میں کوئی ایک بات بھی غلط نہیں لکھی تھی۔ لیکن سچائی ہمیشہ تلخ ہوتی ہے خاصکر اپنے معاملات میں اور اسی لیے میں ان دونوں صاحبوں کے متعلق کچھ لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال اس حق گوئی کا نتیجہ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ دونوں صاحبوں کو راقم السطور سے سخت شکایت ہوگئی اور تین چار سال تک ناراض رہے۔ راقم السطور کا سوشل بائیکاٹ کردیا۔ اسی تلخ تجربہ کے بعد اس کا قطعی عہد کرلیا کہ آئندہ کسی عزیز اور دوست کی زندگی میں اُن کے متعلق کچھ نہ لکھونگا چنانچہ میں نے فرمائش کنندہ (شمسؔ صاحب سلمہٗ) سے معذرت کی کہ وہ مجھے اس کے لیے مجبور نہ کریں گے جسقدر میرا انکار بڑھتا رہا اُسی قدر اُن کا اصرار اور زیادہ مکرر اور سخت ہوتا گیا۔ بہرحال پندرہ سولہ سال تک اس عہد کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس عرصہ میں میرے بہت ہی پرانے اور بہت ہی عزیز دوست شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب نے کئی دفعہ باصرار فرمائش کی کہ میں اُن کے بارے میں کچھ لکھوں مگر ہر دفعہ میں نے اپنے عہد سے انحراف کرنے سے انکار کردیا کیونکہ شروع سے میں اپنے ہمنام شاعر میر انیس لکھنوی کے اس شعر پر عمل کرتا رہا ہوں ؎

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

پچاس سال کا یہ تجربہ رہا ہے کہ کسی بزرگ کے بارے میں خواہ کتنی ہی احتیاط کے ساتھ کچھ لکھا جائے مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ قلم کو ذرا بھی لغزش نہ ہو۔ حتیٰ کہ ذاتی معاملہ ہو کسی عزیز کی مدح و تعریف میں ہی کچھ لکھا جائے تب بھی قدم قدم پر یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

میرے بہت ہی عزیز و مخلص بزرگ و مربی مولانا عبدالماجد صاحب جنھوں نے میری پرائیوٹ زندگی اور پبلک لائف کے ہر مرحلہ پر میری مدد اور رہبری کی ہے اور جن کے احسانات کو میں زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتا، اُن کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے معافی مانگ کر یہ عرض کرونگا کہ موصوف بہت زیادہ حسّاس اور نازک مزاج طبیعت کے انسان ہیں اسلیے اگر شروع سے آخر تک اُنکی مدح وستائش میں ہی کچھ لکھا جائے تب بھی اس کا کافی احتمال ہے کہ قلم کہیں پر بھٹک جائے اور میری تحریر مولانا کی ناگواری کا باعث ہو بہرکیف اس تمہید کے بعد عزیزی شمسؔ صاحب کی فرمائش کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔

پچھلے پچاس سال کے اندر میں نے مولانا عبدالماجد صاحب کی زندگی کا ہر دور قریب سے دیکھا ہے۔ راقم السطور کی شناسائی ہا

تعارف بھی عجیب انداز سے ۱۹۰۹ء میں شروع ہوا تھا جب میں لکھنؤ کے سینٹنل کالج کے نویں درجہ کا طالبعلم تھا۔ خوب یاد ہے کہ میرے وطن کاکوری میں کسی عزیز کی تقریب شادی کے سلسلہ میں مولوی محمد احسن صاحب مرحوم سابق نائب دار المہام بھوپال کی کوٹھی میں دعوت ولیمہ تھی جس میں قصبہ کے تمام اعزا و اقربا شریک تھے میں اسی موقع پر منشی اسحاق علی صاحب علوی اڈیٹر رسالہ النّاظر (جو بعد کو ظفر الملک علوی کے نام سے معروف ہوئے) بھی دعوت میں تشریف لائے اُنکے ہاتھ میں النّاظر کی تازہ اشاعت کے چار پانچ پرچے تھے۔ راقم السطور کو ہوش سنبھالتے ہی باوجود اپنی کم علمی کے اخبارات اور رسائل کے پڑھنے کا بے انتہا شوق ہی نہیں بلکہ گویا عشق سا ہوگیا تھا۔ چنانچہ قصبہ بھر میں جن جن اعزا کے یہاں کوئی اخبار یا رسالہ آتا تھا وہ اُن سے لیکر پڑھا کرتا تھا۔ اسحاق بھائی مرحوم (ظفر الملک علوی) کے ہاتھ میں النّاظر کے چند پرچے دیکھ کر دل میں گدگدی ہوئی اور اُن سے بلاتکلف ایک پرچہ مرحمت فرمانے کی فرمائش کردی۔ موصوف نے پرچہ دیدیا۔ اس پرچہ میں کسی گمنام راقم مضمون کا ایک تنقیدی مضمون علّامہ شبلی نعمانی مرحوم کی مشہور تالیف علم الکلام پر تھا۔ مضمون نگار کا نام نہیں درج تھا بلکہ "گمنام دریابادی" لکھا تھا۔ اس سلسلہ کی دو یا تین قسطیں پہلے پرچوں میں چھپ چکی تھیں۔ باوجود اپنی کم لیاقتی کے بڑے شوق سے یہ مضمون پڑھا اور اسی کے ساتھ یہ شوق بڑھا کہ لکھنؤ واپس جاکر اس مضمون کی سابقہ قسطوں کو بھی پڑھا جائے چنانچہ یہی کیا کہ "النّاظر" کے پچھلے پرچے حاصل کیے اور اُن کو پڑھ کر یہ فکر ہوئی کہ یہ معلوم کروں کہ تنقید نگار کون صاحب ہیں۔ دفتر النّاظر میں صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ کیننگ کالج لکھنؤ کے بی۔ اے کلاس کے کوئی نوجوان طالبعلم ہیں جنہوں نے اپنے نام کو مخفی رکھا ہے۔

پورے ایک سال کے بعد یہ راز اسطرح افشا ہوا کہ جالون میں مجھے ڈیڑھ ماہ قیام کا موقع ملا اور وہاں مولانا دریابادی کے بڑے بھائی مولوی عبد المجید صاحب مرحوم اسوقت نائب تحصیلدار تھے جنکے پاس میں روزانہ شام کو جاکر بیٹھا کرتا تھا۔ مولوی عبد المجید صاحب نے بتایا کہ تنقید نگار اُن کے چھوٹے بھائی مسٹر عبد الماجد دریابادی ہیں۔ دو تین ماہ کے بعد جب مولوی عبد المجید صاحب مرحوم تبدیل ہوکر جالون سے لکھنؤ کی تحصیلداری پر ترقی کرکے تشریف لائے اسوقت عبد الماجد صاحب سے میرا نہ صرف تعارف ہی ہوا بلکہ موصوف کو مجھ سے خاص ہمدردی اور محبت ہوگئی۔ میں نے لکھنؤ کے کرسچین کالج میں ایف۔ اے کلاس میں داخلہ کرالیا اور مسٹر عبد الماجد نے میری تعلیم میں خاص دلچسپی لیکر "ایڈمشن" وغیرہ دلوا کر میری مزید تعلیم کے لیے قدم قدم پر راستہ ہموار کردیا۔

یہ مولانا دریابادی کی زندگی کا پہلا دور تھا یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ ملحد ہوگئے تھے مگر الحاد کی منزل کے بہت قریب پہونچ گئے تھے جس کا سب سے زیادہ صدمہ اُن کے والدین کو تھا جو بہت ہی مومن اور بڑے پختہ عقائد کے مسلمان تھے۔ اُن کے والد مولوی عبد القادر صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر حج کے لیے مع اپنی اہلیہ صاحبہ کے تشریف لے گئے اور وہاں حرم شریف میں دونوں صاحبان نے بہت خشوع وخضوع کے ساتھ بیٹے کی قلب ماہیت کے لیے دُعا کی اور یہ دُعا ایسی تیر بہدف ثابت ہوئی کہ مولوی عبد القادر صاحب مرحوم کے حج کے چند ہی ماہ بعد سے عبد الماجد صاحب کے عقائد میں نمایاں تبدیلی شروع ہوئی۔ ابتداً اُنکی عقیدت خواجہ حسن نظامی صاحب مرحوم کے ساتھ بڑھی جنکے اکثر رسالہ اور مضامین کو وہ بڑے شوق وعقیدت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس انقلاب کے نتیجہ میں مذہبی رنگ پختہ ہوتا گیا۔ مولانا محمد علی (کا مرید وہمدرد) کی صحبت اور رفاقت میں گویا وہ پوری طرح مشرف باسلام ہوگئے اور مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تصانیف کا مطالعہ کرکے دو ہی تین سال کے اندر موصوف خود بھی نہ صرف مسٹر سے "مولانا" ہی ہوگئے بلکہ مفسر قرآن بھی ہوگئے۔ موصوف کے بہت سے عقیدتمندوں نے تو یہاں تک کوشش کی کہ اُن کو مفتی بھی بنا دیں لیکن ممدوح اس اعزاز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوے

ہی مسائل میں اپنی دلچسپی صرف مشوروں اور گذارشوں
مرودر رکھی۔

یہ ممدوح کی زندگی کا دوسرا یا تیسرا دور تھا جسکی مزید تشریح
ہی کر سکتے ہیں۔ پہلے "سچ" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار
ظفر الملک علوی مرحوم کی نگرانی و اہتمام میں نکالا۔ لیکن
ت کچھ کامیاب نہیں ہوئی اسلیے سچ کی طباعت اشاعت
مام حاجی عبدالرؤف صاحب عباسی مرحوم اڈیٹر حق اخبار
بر د کر دیا مگر یہ شرکت بھی زیادہ دنوں نہیں چل سکی اس لیے
و بند کر کے "صدق جدید" کے نام سے دوسرا ہفتہ وار اپنے
یے اور خویش حکیم عبدالقوی صاحب کی نگرانی اور اہتمام میں
ں کر دیا جو بہت جلد مقبول ہو گیا۔ صدق جدید کی تحریروں
اثر سے مولانا کے عقیدتمندوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا
اور نہ صرف ہندوستان ہی میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی
صدق جدید" کی کافی اشاعت ہو گئی اور اب تو مالی اعتبار سے
وہ ایک کامیاب اخبار ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب نے کسی عربی مدرسہ میں تعلیم نہیں
ی۔ موصوف نے بی۔ اے عربی میں پاس کیا اور اسکے بعد اپنی
ہانت، وسیع مطالعہ اور ندوۃ العلما، دار العلوم دیوبند دار المصنفین
علم گڈھ اور بعض دیگر عربی اداروں سے رابطہ قائم رکھ کر اپنی
ستعداد علمی میں اتنا اضافہ کر لیا کہ بہت سے عربی کے فاضل بھی
س مرتبہ پر نہیں پہونچ سکے جس مرتبہ پر وہ پہونچ گئے ہیں۔
س اعتبار سے آج ان کا مثل کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اور
اب ایک عالم دین کی حیثیت سے اُن کی عظمت اور وقعت
اتنی بلند ہو گئی ہے کہ آج سے ساٹھ باسٹھ سال قبل کوئی شخص
یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسوقت کے "مسٹر عبدالماجد" کی
ایسی کایا پلٹ ہو جائیگی کہ آجکل کے علمار کی صف اوّل میں
وہ شمار کیے جائیں گے۔
چونکہ فروغ اردو کے خاص نمبر کے لیے غالباً کئی درجن مضامین

ملک کے بہت سے معروف ادیبوں اور اہل قلم کے آ چکے ہیں جنہوں نے مولانا
موصوف کی زندگی کے ہر رُخ پر بہت تفصیل سے لکھا ہوگا اسلیے اس موضوع
پر راقم السطور کو کچھ لکھنے کی نہ ضرورت ہی معلوم ہوتی ہے اور نہ میں
اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتا ہوں جسکی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مذہبی
مباحث و مسائل میں میرے خیالات کچھ اور ہی ہیں اسلیے میں مولانا
کی تقلید کرنے سے قاصر ہوں مثلاً سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
مرحوم کے خلاف وہ انکی زندگی میں بہت کچھ لکھتے تھے اور انکے انتقال
کے بعد بھی اُنکی ذات اور اُنکے اعمال پر اُنکی تنقید بہت دنوں تک
جاری رہی اور میرا خیال ہے کہ اب بھی اگر تنقید کا کوئی موقع آجائے
تو مولانا عبدالماجد صاحب کوئی چشم پوشی اور رعایت نہیں کرینگے
خاص طور سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کا ذکر اسلیے کیا کہ
دہلی، لکھنؤ، کانپور اور شاہجہانپور میں متعدد دوستوں نے جن کو
مولانا کے ساتھ راقم السطور کے پچھلے ساٹھ سال کے بہت گہرے
عزیزانہ، مخلصانہ بلکہ عقیدتمندانہ تعلقات کا علم ہے۔ اس واقعہ کا
شکایتاً ذکر کیا جسکے جواب میں اپنی معذوری اور مجبوری کا اظہار
کر دینے کے سوا اور کچھ کہنے کا موقع ہی نہ تھا ظاہر ہے کہ کبھی بھی افراد
میں سو فیصدی اتفاق رائے نہیں ہو سکتا۔ یہی صورت جو کہ بالکل فطری
تقاضے کے مطابق راقم السطور اور مولانا دریابادی کے مابین بھی ہے
اور یہ کوئی نئی اور عجیب بات بھی نہیں ہے مگر اس کے باوجود میرے
دلمیں موصوف کی جو قدر اور عظمت ہے اُسکا ہر شخص اندازہ نہیں کر سکتا
بہرکیف مولانا عبدالماجد ایسے اعلیٰ اوصاف اور صفات کے
انسان ہیں کہ اُن کا مثل ہمارے ملک میں کہیں نظر نہیں آتا بلکہ یہاں تک
کہا جا سکتا ہے کہ جس نسل میں وہ پیدا ہوئے تھے اس نسل میں کوئی
دوسرا اس مرتبہ کا انسان پیدا نہیں ہوا۔ یہ سطور عقیدت اور محبت ہی کے
جذبہ کے ماتحت نہیں لکھی جا رہی ہیں بلکہ ایمانداری کے ساتھ میرا خیال ہے کہ
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
آخر میں بس یہی دعا کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ قوم اور ملک کو اُنکے فیوض و
برکات سے زیادہ سے زیادہ عرصہ تک مستفیض ہونیکا موقع عنایت فرمائے۔ جن
لوگوں نے انکی علمی، ادبی، مذہبی اور کسی حد تک سیاسی سرگرمیوں کا بھی

[illegible] قوم نے پیدا کیا ہے وہ اپنی اسما [illegible]

بقیہ مضمون صفحہ ۵۳

ا۔ ظفر حسین خاں صاحب

(۱۴) مکالمات برکلے (دارالمصنفین

(۱۵) ہم آپ۔ پاپولر سائیکالوجی۔ (ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد)

(۱۶) منطق قیاسی و استقرائی (سررشتہ تالیف) ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد)

(۱۷) نقص و مسائل (رضا اکیڈمی رام پور

(۱۸) اسلامیہ کالج کے سامنے دو لیکچروں کا مجموعہ

(۱۹) محمد علی مرحوم ذاتی ڈائری کے ورق پہلا ایڈیشن

(۲۰) حکیم الامت نقوش و تاثرات (دوسرا مکمل ایڈیشن تیار)

(۲۱) تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام

(۲۲) تمدن اسلام کی کہانی، اس کی زبانی (مجلس اسلامیات یونیورسٹی علی گڑھ)

اور بہت سے چھوٹی کتابیں اور رسالے اس کے علاوہ ہیں جو طوالت کے خیال سے قلم انداز کئے جاتے ہیں۔ معارف، الناظر، اردو ہندوستانی وغیرہ ہم رسائل میں اردو مضامین اور تھیاسوفسٹ، ماڈرن ریویو، اسلامک ریویو (ووکنگ) میں انگریزی مضامین صدہا صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

بقیہ مضمون صفحہ ۶۸

(جمیل مہدی صاحب)

سیاست کے لئے استعمال کر لیا گیا — لیکن ان کے اس اعتراف نے نہ صرف ان کے وقار اور عزت میں اضافہ کیا بلکہ مستقبل کی تاریخ میں ان کے مقام کو بقائے دوام بخش دی۔

وہ ادب، اور صحافت پر اخلاق و ضمیر کی روشنی ہر حال قائم رکھنے کے نہ صرف خواہش مند اور دعویدار رہے ہیں بلکہ انھوں نے اس کے تحفظ اور بقا کے لئے بہت بڑے بڑے خطروں اور نقصانات کا مقابلہ کیا ہے، آزمائشوں کو دعوت دی اور آزمائشوں سے کامیاب نکلے ہیں۔ فکر، عمل، ادب، صحافت، دین اور تصوف کی الگ الگ دنیاؤں میں انھوں نے اخلاق، کردار، ایمان اور صداقت کی مشعل کو، ایک لمحہ کے لئے بھی بجھنے نہیں دیا، ایک لمحہ کے لئے بھی مشعل برداری کے فرض سے وہ غافل نہیں ہوئے، ایک لمحہ کے لئے انھوں نے اس جذبہ سے محروم ہونا گوارا نہیں کیا جس کی عدم موجودگی، فتوحات کو نمائش میں اور جس کی موجودگی، شکست اور ناکامی کو صبر و شہادت میں بدل دیتی ہے بے اختیار جی چاہتا ہے کہ وہ ابھی مدت تک دنیا میں رہیں، اور اپنے تجربات و رہنمائی سے اس نسل و عہد کی اصلاح و رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہیں، لیکن وہ موجود نہ بھی رہے تو بھی انھوں نے آنے والی نسلوں کے لئے اتنا کچھ کر دیا ہے کہ وہ کسی عہد اور کسی حالت میں فراموش نہیں کئے جا سکتے، وہ لافانی بن گئے، وہ مر نہیں سکتے۔

حکیم عبدالقوی دریابادی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی مکمل فہرست تصانیف

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی تصانیف
کی مکمل فہرست حسب ذیل ہے اس میں بعض
ایسے مضامین یا مجموعہائے مضامین بھی شامل
جو دوسرے ناشروں یا اداروں نے اپنے طور سے
شائع کئے ہیں اور جنھیں مولانا ان کی اشاعت کے
بعد ہی پہلی بار دیکھ سکے تھے اس لئے ان کی تدوین
ترتیب میں وہ کوئی حصہ نہیں لے سکے تھے۔ ان کی
سب سے پہلی تصانیف ان کے دو مضامین ہیں جو اسنے
اپنے عہد طالب علمی (اس زمانہ میں وہ الیف اے کے
طالب علم تھے) میں اس وقت کے کثیر الاشاعت
روزنامہ وکیل امرتسر میں نکلے تھے اور اس اخبار
کے ادارہ نے انھیں چھوٹے سائز پر کتابی شکل میں شائع
کیا تھا اور پہلے پہل اس ادارہ نے ان کتابوں کے سرورق
پر ان کے نام کے ساتھ مولانا کا لفظ ایزاد کیا تھا۔

(۱) غذائے انسانی:- اس رسالہ میں آریہ سماجیوں
وغیرہ کے اعتراضات گوشت خوری کا مدلل جواب دیکر
گوشت خوری کو مطابق فطرت انسانی ثابت کیا ہے)۔

(۲) محمود غزنوی:- (سلطان محمود غزنوی
پر کئے جانے والے متعصبانہ تاریخی اعتراضات کا
مدلل جواب)۔

فلسفیانہ کتابیں:-

اولاً انھوں نے ایک ایسے فلسفی مصنف کی
حیثیت سے شہرت حاصل کی جس نے فلسفہ جدید
خصوصاً اس کی شاخ نفسیات کے مضامین کو اردو
میں انتہائی انشاپردازانہ رنگ میں منتقل کیا۔ اس
سلسلہ کی

(۳) کتاب "فلسفہ جذبات" سب سے زیادہ
مقبول ہوئی۔ اسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع
کیا تھا اس کے تین اڈیشن نکلے۔

(۴) "فلسفہ اجتماع"۔ اس کتاب کا اس کے
بعض الحادی اجزا کے باعث مولانا نے جب ان کا دور
الحاد ختم ہوا اور وہ اسلام کے زبردست مبلغ بن گئے
تو اپنی تصانیف کے زمرہ سے خارج کر دیا یہ کتاب
بھی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام چھپی تھی۔

(۵) "سائکالوجی آف لیڈرشپ" یہ کتاب

کم و بیش انھیں مضامین پر مشتمل تھی جو اُردو والی فلسفۂ اجتماع کے تھے۔ اسے انگلستان کے مشہور ناشر کتب فیشر اَن (لندن) نے اس زمانہ میں شائع کیا جبکہ مولانا بہت نو عمر تھے۔

(۶) "مکالمات برکلے" (مشہور یورپین فلسفی برکلے کے ڈائیلاگس کا ترجمہ۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

(۷) "فلسفیانہ مضامین" مولانا کے ابتدائی فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ جو رسالہ الناظر لکھنؤ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے تھے۔ شائع کردہ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔ کتابی شکل میں ان کی تدوین رسالہ کے اڈیٹر مولوی ظفر الملک مرحوم نے کی ہے خود مولانا نے اپنے فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ

(۱۸) } پُرانے شائع شدہ مضامین پر مکمل نظر ثانی کے بعد
(۱۹) } دارالمصنفین اعظم گڑھ سے مبادی فلسفہ،

فلسفہ کی پہلی کتاب اور مبادی فلسفہ حصہ دوم یا فلسفہ کی دوسری کتاب کے عنوان سے اول الذکر مجموعہ کی اشاعت چند سال بعد شائع کرائے۔ ان میں الناظر والے مضامین کے علاوہ وہ فلسفیانہ مضامین بھی شامل ہیں جو رسالہ ادیب الہ آباد، رسالہ معارف اعظم گڑھ وغیرہ میں نکلے تھے۔

(۱۰) "فلسفہ اور اس کی تعلیم" مولانا کا ایک مضمون جو پہلے رسالہ الناظر (لکھنؤ) میں نکلا تھا۔ اسے الناظر بک ایجنسی نے کتابی شکل میں بھی شائع کیا تھا۔

(۱۱) "ہم آپ" (پاپولر سائیکالوجی پر مولانا کی آخری تصنیف جو ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے زیر اہتمام شائع ہوئی)

(۱۲) "منطق" (یہ کتاب، عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل نصاب رہی تھی اور سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔

تراجم :-

(۱۳، ۱۴) "تاریخ اخلاق یورپ" مشہور مورخ لیکی کی مشہور کتاب ہسٹری آف دی یوروپین مارلس کا ترجمہ دو جلدوں میں۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

(۱۵) "تاریخ تمدن، حصہ دوم" بکل کی انگریزی کتاب کا ترجمہ منشی احمد علی کاکوروی انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام کررہے تھے، حصہ اول مکمل کرچکے تھے، حصہ دوم کا ترجمہ نا تمام تھا کہ ان کا پیام اجل آگیا۔ دوسرے حصہ کے بقیہ بڑے حصہ کا ترجمہ مولانا عبدالماجد نے مکمل کیا

(۱۶) "تاریخ یورپ" (سررشتہ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی شائع کردہ اس ضخیم کتاب کے بعض اجزا کا ترجمہ مولانا عبدالماجد نے کیا تھا)۔

(۱۷) "پیام امن" ایک فلسفی مصنف و امن پسند فلسفی میپو پال رچرڈ کی کتاب کا جو پہلی جنگ عالمگیر کے بعد جنگ کے خلاف اور اس کی تباہ کاریوں سے دنیا کو خبردار کرنے کے لئے لکھی گئی تھی، کا اُردو ترجمہ، اس میں مترجم نے اسلام اور امن وغیرہ کے عنوان سے چند نئے ابواب کا اضافہ بھی کیا تھا۔

تصوف :-

(۱۸) "تصوف اسلام" مولانا کی مقبول ترین کتاب ہے۔ پانچ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسلامی تصوف کی مختصر لیکن جامع تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۱۹) "فیہ ما فیہ" (فارسی) ملفوظات مولانا روم۔ کتاب نایاب تھی، متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد مع ایک پُرمعلومات مقدمہ کے مولانا نے اسے شائع کیا۔ شائع کردہ دارالمصنفین۔

سفرنامے :-

(۲۰) "سفر حجاز" ۱۹۲۹ء میں مولانا نے سفر حج کیا تھا۔ اس کی دلکش روداد اولاً ان کے ہفتہ وار سچ لکھنؤ میں بالاقساط چھپی۔ پھر وہ کتابی شکل میں شائع ہوکر بہت مقبول ہوئی۔ اس کے تین اڈیشن نکل چکے ہیں۔

(۲۱) "ڈھائی ہفتہ پاکستان میں" مولانا نے گورنر جنرل پاکستان ملک غلام محمد مرحوم کی دعوت پر ۱۹۵۵ء میں لاہور و کراچی کا سفر کیا تھا۔ یہ روداد سفر اولاً مولانا کے ہفتہ وار صدق جدید میں نکلی اور بعد ازاں کتابی شکل میں۔

ادبی تصانیف :-

(۲۲) "زود پشیماں" ایک ڈرامہ جو مولانا نے "ناظر" کے فرضی نام سے لکھا تھا، اب ان کی فہرست تصانیف سے خارج سمجھنا چاہیئے۔

(۲۳) "مثنوی سحر المحبت" اُردو کے مشہور شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی ایک نایاب مثنوی کو مولانا نے ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا۔ شائع کردہ دارالمصنفین

(۲۴) "مقالاتِ ماجد" مولانا کے ادبی مضامین کا مجموعہ جو تاج آفس بمبئی نے شائع کیا اس کو نظر ثانی کے بعد۔

(۲۵) انشاء ماجد حصہ اول

(۲۶) " حصہ دوم کے

نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا

(۲۷) نشریات ماجد حصہ اول۔ مولانا کی نشری تقاریر کا دلپذیر مجموعہ

(۲۸) مضامین عبدالماجد۔ اس میں ادبی و مذہبی دونوں قسم کے وہ مضامین شامل ہیں جو مولانا کے اخبارات سچ و صدق میں نکلے تھے اسے حیدرآباد کے ادارۂ اشاعت اُردو نے شائع کیا تھا، اور اُس کی ترتیب مولوی ڈاکٹر غلام دستگیر رشید حیدرآبادی نے کی تھی۔

(۲۹) اکبرنامہ یا اکبر میری نظر میں۔ لسان العصر حضرت اکبر سے مولانا کو ہمیشہ خصوصی تعلق رہا ہے۔ انھوں نے اُن پر متعدد بڑے اور چھوٹے مضامین پیام اکبر، نیا آئین اکبری وغیرہ کے عنوانات سے لکھے تھے۔ ان اکبری مضامین کا یہ مکمل مجموعہ انوار بک ڈپو (لکھنؤ)، ادارۂ فروغ اُردو نے شائع کیا۔

(۳۰) مکاتیب اکبر۔ اکبر الہ آبادی کی وفات کے بعد ان کے خطوط بنام مولانا عبدالماجد دریابادی کا مجموعہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے شائع کرایا تھا اس پر مولانا عبدالماجد نے توضیحی حواشی لکھے تھے۔

(۳۱) خطوط مشاہیر حصہ اول۔ اس میں مولانا کے

له اس کا ایک اڈیشن پاکستان سے بھی عشرت بک ڈپو نے شائع کیا تھا۔

علامہ شبلی نعمانی کے خطوط (شبلی نامہ)، اکبر الٰہ آبادی کے خطوط (اکبر نامہ) اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے خطوط (جوہر نامہ) مع مولانا کے حواشی اور علٰحدہ علٰحدہ دیباچوں کے درج ہیں۔ اس کا پہلا اڈیشن تاج کمپنی کراچی ولاہور نے شائع کیا تھا۔ دوسرا اڈیشن حال میں نظر ثانی اور جدید حواشی و دیباچوں کے ساتھ نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

(۳۱ و ۳۲) مکتوبات سلیمانی (حصہ اول و حصہ دوم) مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے مکتوبات مولانا دریابادی کے نام جن میں مولانا نے بکثرت حواشی دیگران کی افادیت بڑھادی ہے۔ دونوں کے شروع میں ایک مفصل دیباچہ بھی۔ شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی

تفسیر قرآن و متعلقات تفسیر

(۳۳) تفسیر ماجدی انگریزی۔ مولانا کا یہ معرکۃ الآرا انگریزی ترجمہ و تفسیر جو ان کی سالہا سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے، تاج کمپنی کراچی ولاہور کے زیر اہتمام سات منزلوں میں الگ الگ بھی چھپا اور دو حصوں میں پندرہ پندرہ پاروں کے دو حصوں میں بھی۔ ترجمہ کی زبان بائبل والی قدیم انگریزی ہے لیکن حواشی ماڈرن انگریزی میں ہیں۔

(۳۴) ترجمہ قرآن انگریزی بلا حواشی۔ تاج کمپنی کی فرمائش پر مولانا نے یہ ترجمہ دو ڈھائی سال قبل بجائے بائبل کی انگریزی زبان کے جدید و مروج انگریزی میں کیا ہے۔

(۳۵) تفسیر ماجدی — ضخیم اُردو تفسیر تاج کمپنی نے سات منزلوں میں شائع کی اور علٰحدہ علٰحدہ دو حصوں میں بھی اور مکمل ایک جلد میں بھی

(۳۶) تفسیر کا دوسرا اڈیشن مولانا کی مکمل نظر ثانی اور بہت کچھ ترمیم و اضافہ کے (اور اسکے نتیجہ پہلے اور دوسرے اڈیشن میں بہت فرق ہوگیا ہے) صدق جدید بک ایجنسی کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے

پہلی جلد۔ یہ سورۂ فاتحہ سے ختم سورۂ آل عمران تک ہے۔ دوسری جلد جو دسویں پارہ کے ختم تک ہے۔ ابھی تین ماہ ہوئے شائع ہے اس کی ضخامت ۸ سو صفحات سے زائد ہے۔

(۳۷) جغرافیۂ قرآنی یا ارض القرآن۔ قرآن میں جن مقامات کے نام اور اشارے ہیں اُن کے متعلق ضروری معلومات بہ ترتیب حروف تہجی شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی۔

(۳۸) حیوانات قرآن یا الحیوانات فی القرآن۔ قرآن میں جن حیوانات کا ذکر آیا ہے ان کے اور ان کے متعلقات مثلاً گوشت دودھ جلد ناخن وغیرہ سے متعلق ذخیرۂ معلومات بہ ترتیب حروف تہجی۔

(۳۹) شخصیات قرآنی یا اعلام القرآن قرآن پاک میں جو اسمائے آئے ہیں یا جن کا اشارہ ہے اُن سے متعلق معلومات بہ ترتیب لغات۔

(۴۰) جدید قصص الانبیا کے دو باب۔ مولانا کا لکچر اسلامیہ کالج پشاور میں ہوا تھا اور وہاں سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا تھا بعد میں

(۴۱) یہی مضمون مع ایک اور مضمون کے قدیم علم

سائل جدید ردشنی میں جو رضا اکاڈمی رام پور میں
ماگیا تھا۔ قصص و مسائل کے نام سے اولاً نفیس
ڈمی حیدرآباد نے اور پھر صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ
شائع کیا۔

(۴۲) بشریت انبیاء۔ یہ کتاب بھی تمام ترآیات
آن ہی سے مستفاد و ماخوذ ہے اور اپنے موضوع پر
نفل منفرد۔ شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ۔

(۴۳) خطبات ماجدی یا سیرۃ نبوی قرآنی۔ مولانا
ے ان لکچروں کا مجموعہ جو انھوں نے اس موضوع پر
مدراس میں دیے تھے، یہ کتاب خطبات ماجدی کے
ام سے صدق جدید بک ایجنسی نے شائع کی ہے اور یہی کتاب
جوڑی تقطیع پر سیرت نبوی قرآنی کے نام سے مدراس کی ایک انجمن نے
ائع کی۔ بہ اول الذکر میں ایک دیباچہ اور اختتامیہ کا اضافہ ہے۔

حدیث و ادعیہ

(۴۴) ترجمہ و شرح مناجات مقبول تھانوی۔
مولانا اشرف علی تھانویؒ مرحوم کی مرتب کردہ مناجات مقبول
کی شرح۔ اس کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

(۴۵) شرح چہل حدیث ولی اللہی۔ تقطیع جیبی۔
شائع کردہ صدق جدید بک ایجنسی۔

سوانح

(۴۶) حکیم الامت، نقوش و تاثرات، مولانا
اشرف علی تھانوی مرحوم کی ضخیم سوانح، ان کی زندگی
کے آخری اٹھارہ سال کے احوال پر مشتمل اولاً
اسکے اجزاء، اخبار صدق میں قسط وار نکلے۔ بعد میں کتابی
شکل میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔ دوسرا
ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا۔

(۴۷) محمد علی۔ سلسلہ مضامین اخبار سچ لکھنؤ میں
نکلنا شروع ہوا تھا لیکن مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس نامکمل
سلسلہ مضامین کو ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد نے
محمد علی کے نام سے شائع کیا تھا۔۔۔۔ بعد میں

(۴۸، ۴۹) اسی کتاب کو مکمل کرکے مولانا نے محمد علی
ذاتی ڈائری کے نام سے دو حصوں میں شائع کیا۔
دارالمصنفین اعظم گڑھ میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔

مجموعۂ مضامین

(۵۰) مردوں کی مسیحائی۔ مولانا کے وہ مضامین
جو سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر سچ لکھنؤ میں نکلے
تھے۔ ان کا مجموعہ، شائع کردہ ادارۂ اشاعت اردو
حیدرآباد

(۵۱) سچی باتیں۔ اخبار سچ و صدق میں نکلنے والی
سچی باتیں، کا مجموعہ مرتبہ حکیم محی الدین ہلال
(نلگنڈہ دکن)

(۵۲) صابر رسولؐ۔ مولانا کا ایک سیرتی
مضمون جو حیدرآباد کی کسی انجمن نے شائع کیا۔

(۵۳) یتیم کی جیت

(۵۴) یتیم کا راج

مولانا کے دو سیرتی مضامین جو تحریک سیرت
(ضلع لاہور) کے ناظم قاضی عبدالمجید قریشی مرحوم
نے رسالوں کی شکل میں شائع کیے۔

(۵۵) تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام۔

(۵۶) تمدن اسلام کی کہانی۔

مولانا کے دو لکچر جو انجمن اسلامی تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے دو مختلف جلسوں میں پڑھے گئے۔

متفرق

(۵۷) تحفۂ خسروی۔ راعی و رعایا کے تعلقات سے متعلق فارسی کتب اخلاق سے ماخوذ۔ شائع کردہ اودھ بک ایجنسی لکھنؤ۔

(۵۸) فرائض والدین۔ خادم التعلیم کے فرضی نام سے۔ شائع کردہ نولکشور بک ڈپو لکھنؤ۔

(۵۹) مشاہیر سائنس۔ میکملن کمپنی کلکتہ کی شائع کردہ انگریزی سے ترجمہ۔

(۶۰) مولانا کے تازہ قرآنی لکچر مشکلات القرآن یا قرآن کا مطالعہ بیسویں صدی میں ان سطور کی تحریر کے وقت مدارس میں زیر طبع ہیں۔

(۶۱) خطبہ صدارت استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس اجلاس لکھنؤ ۱۹۲۶ء

(۶۲) نورانی جہیز۔ مرتبہ مولوی محی الدین منیری اس میں مولانا کا تحریر کردہ خطبہ نکاح شامل ہے۔

بقیہ مضمون صفحہ ۶۴

نادم سیتاپوری

مولانا نے "یاد رہا" کو بدل کر میری اس "کوتاہ قلمی" پر تڑپا دیا۔ جس نے مسلسل ڈیڑھ دو سال تک مجھے مولانا سے دور رکھا، حالانکہ یہ "کوتاہ قلمی" لاشعوری تھی۔

۹ جنوری ۱۹۷۰ء کا لکھا ہوا یہ کارڈ اسی ہفتے مجھے کراچی میں مل گیا! چنانچہ تڑپ کر تلملا کر اور بے چین ہو کر میں نے فوراً ہی ایک تفصیلی معذرت نامہ لکھ دیا جواب کا منتظر ہوں۔

... ۵ مارچ ۱۹۷۰ء

بقیہ مضمون صفحہ

سید یوسف صاحب

نہیں آنے دیتے اور وقت کے قدردان ایسے ہیں کہ ایک منٹ بھی بیکار نہیں کھوتے۔ اسلئے باری تعالے نے وقت کے قدردان کی قدر کی اور اپنی نوازش خاص سے اُنکے وقت میں برکت دی اور کام کرنے کیلئے طویل عمر ارزانی فرمائی۔ مولانا کے گہر بار قلم کی روانی اور دماغ کی تابانی کے ساتھ تقریباً ساٹھ برس سے جاری ہے۔ خدائے عالم آرا سے دلی دعا ہے کہ مولانا کو تا دیر سلامت باکرامت رکھے۔ اس طویل مدت میں مولانا نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، سب سے بڑا کارنامہ ہے جو مولانا کی زندگی کا جاوید نامہ ہے وہ قرآن مجید کی تفسیر ہے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مزید برآں اردو تفسیر پر نظر ثانی بھی جاری ہے۔ ان میں سے ایک تفسیر بھی اگر کوئی دوسرا مکمل کر لیتا تو وہ اُس کی زندگی کا مہتم بالشان کام ہوتا چہ جائیکہ مولانا نے ایک چھوڑ دو دو تفسیریں مکمل کر لیں

مولانا کا وجود سراپا مسعود وطن کی عزت اور قوم و ملت کا فخر ہے مولانا رموز قرآن کے ماہر اور مشکلات القرآن کے مفسر ابھی حال میں مشکلات القرآن پر کئی خطبے مولانا نے مدراس میں دئیے ہیں۔ ایسا دانائے راز وجامع حیثیات کم پیدا ہوتا ہے۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حکیم عبدالقوی دریابادی :-

انشاءِ ماجد کے مختلف نمونے

مولانا عبدالماجد دریابادی نے زمانۂ طالب علمی ہی سے اولاً اخبارات اور پھر رسائل میں مضمون نگاری شروع کردی تھی اور تصنیف و تالیف و ترجموں کا سلسلہ بھی جلد شروع کردیا تھا۔ ماشاء اللہ اب ۱۹۷۱ء تک ان کی تصانیف اور مضامین کا ذخیرہ ہزاروں صفحات سے متجاوز ہوچکا ہے۔ ان کی تصانیف اور تحریریں مختلف النوع ہیں اور شروع زمانہ سے اب تک اُن میں بہت کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ انشاءِ ماجد مختلف ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے اور ریسرچ کرنے والے ہر دَور کے منتخب نمونے پیش کرکے ان کی انشاء کی خصوصیات پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اس مضمون میں اختصار کے ساتھ ان کے مختلف دَوروں کی اور مختلف موضوعات سے متعلق رکھنے والی تحریروں کے خاص خاص نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

فلسفیانہ تحریریں :-

مولانا عبدالماجد جس زمانہ میں مسٹر عبدالماجد کہلاتے تھے وہ اپنی فلسفیانہ تحریروں کے لئے مشہور تھے۔ اس دَور کی سب سے مشہور و مقبول کتاب فلسفۂ جذبات انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی اس کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۴ء میں نکلا تھا یہ اقتباسات طبع ثانی ۱۹۲۰ء کے ہیں ؛-

" نپولین اعظم جب پہلی بار گرفتار ہوکر جزیرہ البا میں نظر بند کیا گیا اور کچھ عرصہ کے بعد موقع پاکر وہاں سے مفرور ہوا تو اس کے ہمراہ اس کے قدیم سپاہیوں کی ایک مختصر جماعت تھی جو نہ بلحاظ کثرت تعداد نہ بہ لحاظ آلاتِ جنگ اور نہ بلحاظ سامان رسد وغیرہ اس قابل تھی کہ کسی قوی حریف کا مقابلہ کرسکتی، مگر اس باہمت معزول تاجدار نے اس کی مدد سے ملک فرانس بلکہ تمام یورپ کے علی الرغم اپنے سابق تخت پر دوبارہ قابض ہوتا جارہا ہے۔ پہلے ہی معرکہ میں بیس ہزار تازہ دم جوانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ موقع ایسا نازک کہ ذاتی شجاعت تدبر کا اظہار قطعاً بے سود تھا۔ کوئی دوسرا جنرل ہوتا تو بدحواس ہوجاتا۔

لیکن نپولین کی عملی نفسیات دانی کی داد دینی چاہیئے کہ جس وقت دونوں فریق صف آرا ہوگئے وہ تن تنہا اور بالکل غیر مسلح اپنی جماعت سے نکلا اور اس حالت سے بکمال اطمینان فریق مخالف کی صفوں کے سامنے کھڑا ہوا، کوٹ کے بٹن تمام کھول کر اپنے سینہ کو برہنہ کردیا اور ایک پُراثر لہجہ میں اپنے مخالف سپاہیوں سے جن میں سے اکثر ایک زمانہ میں اُس کے ماتحت رہ چکے تھے خطاب کرکے للکارا کہ

"تم میں کون وہ سپاہی ہے جو اپنے باپ کے عریاں سینہ پر فیر کرنے کو تیار رہے؟"

اس آواز کا اثر معجزانہ تھا، "کوئی نہیں، کوئی نہیں" کی صدا بلند ہوئی اور اقرار لسانی کی شہادت زبان عمل نے دی کہ معاً تمام سپاہی اپنی جماعت کو چھوڑ، نپولین کے زیر علم آگئے۔ نپولین جماعات کے اس خاصۂ نفسی سے واقف تھا کہ ان کو مسحور و مسخر کرنے کا راز تین چیزوں میں شامل ہے سطوت داتی (جس کا نپولین بہت بڑا حصہ دار تھا) بلند آواز اور موثر لہجہ

(مقدمہ کتاب صفحہ ۱۶، ۱۷)

دوسرا اقتباس اس فلسفۂ جذبات اصل کتاب کا د۔

"ایک اور وجہ متمدن افراد کے زیادہ متاثر ہونے کی یہ ہے کہ چونکہ ان میں عقل، دوراندیشی، پیش بینی زیادہ ہوتی ہے۔ اسلئے بہ نسبت وحشیوں کے، وہ نتائج افعال کا اندازہ ان کے وقوع سے بہت پیشتر کرلیتے ہیں

اور اس بنا پر یہ بالکل قدرتی ہے کہ وقوع واقعات سے بہت پیشتر وہ انکے نتائج کا اندازہ کرکے انبساط یا انقباض۔۔۔ متاثر ہونے لگیں۔ ایک بکری ذبح کرنے کے لئے خریدی جاتی ہے مگر چونکہ وہ اپنی قسمت سے ناواقف ہوتی ہے۔ عین ذبح کے وقت تک اسے کوئی غم نہیں ہوتا بہ خلاف اس کے انسان کی یہ حالت ہے کہ جس وقت سے اُسے پھانسی کا حکم سنا دیا جاتا ہے وہ اُسی وقت سے گھُلنے لگتا ہے۔ اس طرح انسان جوں جوں علم و عقل میں ترقی کرتا جاتا ہے اس کے ساتھ وہ اپنے آلام و لذات دونوں کے اسباب بڑھاتا جاتا ہے۔ اور اکثر حالات میں اصل واقعات غم و مسرت سے زیادہ ان دونوں چیزوں کا تصور روح فرسا یا خوش آئند ہوتا ہے[1]۔

پھر انسان کی محض عقل یا پیش بینی ہی نہیں بلکہ اس کی تمدن زائیدہ صناعیاں و دستکاریاں، ریل، تار، جہاز، ہوائی جہاز اور آلات حرب، جہاں ایک طرف اس کے اسباب راحت و مسرت میں اضافہ کرتے ہیں وہاں دوسری طرف اس کی تکلیف و بربادی کا سامان بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔

(فلسفہ جذبات صفحہ ۲، ۳)

---

[1] اس کا تجربہ ہر شخص کو اپنی زندگی میں ہوگا کہ اکثر آئندہ کے مصائب کا تصور خود ان مصائب سے بڑھ کر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ غالب نے خوب کہا ہے ؎

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

نمونۂ تراجم

مولانا نے اس دَور میں بعض اہم انگریزی کتابوں کا ترجمہ سلیس اُردو میں کیا تھا۔ جن میں تاریخ اخلاق یورپ (۲ جلد) نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ مکالمات برکلے، پیامِ امن اور تاریخ تمدن حصہ ۲، اور منطق بھی اسی فہرست تراجم میں شامل ہیں۔

تاریخ تمدن:-

سر ہنری بکل کی مشہورِ عام تصنیف ہسٹری آف سویلزیشن کا ترجمہ ہے جو دو جلدوں میں انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام زیورِ طبع سے مرصّع ہوا۔ کتاب کا بڑا حصہ منشی احمد علی مرحوم بی اے کاکوروی کا ترجمہ کردہ ہے۔ انکی وفات کے بعد حصہ دوم کے صفحہ ۱۵۷ سے ۲۳۰ تک ترجمہ مولوی عبدالماجد صاحب کا کیا ہوا ہے۔

یہ حصہ ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ میں چھپا۔ اس کا صرف ایک نمونہ کافی ہوگا:-

"حقیقت یہ ہے کہ بغیر برک کے تذکرے کے جارج سوم کے عہد کی تاریخ سرسری طور پر بھی مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ یہ عجیب و غریب شخص نہ صرف سیاسیات کے اصول و فروع پر حاوی تھا بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ جملہ علوم و فنون کی ایک زندہ دائرہ المعارف تھا۔ اسکے بڑے بڑے نامور معاصرین اُس کے کمالات کی جامعیت کے قائل تھے اور ہمیں تو رابرٹ ہال کا یہ قول حرف بحرف سچ معلوم ہوتا ہے۔

"برک کے کمالات لاتعداد لاتحصیٰ تھے اس کا دماغ عامۃ الورود تھا اور وہ ہر علم و فن سے بہرہ رکھتا تھا"

قانون و فنون لطیفہ بظاہر باہم متناقض نظر آتے ہیں لیکن برک کی ذات ان دونوں کی جامع تھی چنانچہ جہاں ایک طرف وکلا ومقننین کی جماعت اُسے اپنا پیر و مرشد مانتی ہے وہاں دوسری طرف اہلِ صناعت بھی اُسے اپنا ہادی و رہبر تسلیم کرتے تھے تاریخ و علم الالسنہ کو ہم بالکل جدید علم سمجھتے ہیں لیکن برک ان علوم میں امام کا درجہ رکھتا تھا۔ اقتصادیات کا آدم ہم اپنے خیال میں آدم اسمتھ کو سمجھے ہوئے ہیں حالانکہ خود اسمتھ کو اعتراف ہے کہ جب وہ لندن آیا تو یہ دیکھ کر نقش حیرت ہوگیا کہ جن نتائج پر وہ سالہا سال کی مشقت و ریاضت کے بعد پہونچا تھا اور جن نظریات کو وہ تمام تر اپنے اجتہاد فکری کے ثمرات سمجھ رہا تھا، برک وہ سب منازل طے کر چکا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سائنس کے متعدد اصناف کا بھی پورا عالم تھا اور یہ تمام علوم اُس کے خزانۂ دماغ میں صرف محفوظ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب تھے، نظم کی ترتیب اُس کے ذہن کا خاص جوہر تھی، گویا اُسکے دماغ میں متعدد خانے تھے اور ہر خانہ میں ایک ایک علم موجود تھا جس سے وہ جب چاہتا کام کے لئے نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ تدبّر، عاقبت اندیشی و عملیت سے گویا اس کا خمیر تھا، باوجود سخت اصولی و فلسفی ہونے کے وہ سیاسیات میں کبھی یہ نہیں کرتا تھا کہ لفظی اُصول

کے نیچے عملی ضروریات کا خون کردے، وہ اس حقیقت کو خوب سمجھے ہوئے تھا کہ سیاسیات کا مقصود حقیقت شناسی نہیں بلکہ مصلحت بینی ہے۔

(صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵)

سیرتی وسوانحی تحریریں :-

سیرت وسوانح پر مولانا کی دو کتابیں، حکیم الامت نقوش وتاثرات اور محمد علی: ذاتی ڈائری (۲ حصے) خاص طور سے قابل ذکر اور ان کی انشائی خوبیوں کی آئینہ دار ہیں۔ محمد علی حصہ اول شائع شدہ ۱۹۵۴ء کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ تحریک خلافت وترک موالات کے سلسلہ میں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی پر مقدمہ چلا تھا جس کی شہرت سارے ملک میں ہوئی تھی اور بالآخر ۲ سال کی قید سخت کا حکم سنایا گیا تھا اس کا ذکر :۔

"نومبر میں حکم سنایا گیا وہ دو برس کی سزا سب ملزموں کے ساتھ محمد علی کو بھی ـــــ محمد علی بہت گھوم پھر چکے تھے، مارے مارے پھرتے بہت دن ہو چکے تھے، اب مشیت تکوینی کے حاکم کا حکم نافذ ہوا کہ مدت دراز کے لئے ایک جگہ جم کر بیٹھیں ان ہی کی زبان میں ـــ

دیکھئے اب یہ گردش تقدیر
کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

اللہ اللہ کیا سماں تھا آکسفورڈ کا گریجویٹ، آنرز پایا ہوا گریجویٹ، کامریڈ کا ایڈیٹر، ملک کا ایک معروف ترین لیڈر، چوروں، نقب زنوں، ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس میں بند اور جس کے ملنے والوں میں ابھی کل تک گورنر اور لفٹننٹ گورنر، راجے اور مہاراجے، اگزیکیٹو کونسلر اور خود وائسرائے تھا اور تھے آج اس کی عزت جیل کے ادنیٰ پہرہ داروں اور برقندازوں کے رحم وکرم پر تھی، کوچ اور صوفے اور گدّے و قالین کی جگہ زمین کا کھرّا فرش اور غذا وہ مل رہی ہے جو کبھی اس کے چاکروں اور خدمتگاروں نے بھی کیوں کھائی ہوئی۔

اور یہ سب کچھ دعویٰ اسلام کے جرم میں محبت اسلام کی پاداش میں، فرد جرم جو لگی تھی، اس میں آزادیٔ ہند، سوراج کا کہیں نام نہ تھا۔ الزام یہ تھا کہ جو احکام قرآنی اور احادیث رسول قتل مسلم کی وعید میں ہیں ان کو ان کے مسلمان سپاہیوں تک پہونچانے کی کوششیں کیوں کی۔ تاریخ ہلکے پیمانے پر سوا تیرہ سو برس کے بعد اپنا اعادہ کر رہی تھی۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ (الحج ع ۶) اور وما نقموا منھم الا ان یومنوا باللہ العزیز الحمید (البروج) اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی تفسیر کا مشاہدہ لفظ وعبارت کی وساطت کے بغیر ہو رہا تھا ـــ ادھر محمد علی جیل گئے اور ادھر بچے بچے کی زبان پر ـــ

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کا زمانہ آگیا ـــــ جس پر اپنے بیوی بچوں، عزیزوں دوستوں سے دو چار دن کی بھی جدائی شاق تھی اُسے حکم ۲۴ مہینوں تک سب سے الگ قید فرنگ میں بند رہنے کا ملا ـــــ اللہ اللہ کیا شانِ بے نیازی ہے اپنے عاشقوں کے امتحان کیسے کیسے کرائے جاتے ہیں احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون (صفحہ ۱۰۲ : ۱۰۴)

سچ اور صدق کے اقتباسات :۔

مولانا دریا بادی کا ہفتہ وار اولاً سچ کے نام سے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک نکلتا رہا۔ پھر یہی اخبار صدق کے نام سے نکلا۔ دسمبر ۱۹۵۰ء سے یہی اخبار صدق جدید کے نام سے تا ایندم نکل رہا ہے۔ ان تینوں اخباروں کے پہلے صفحہ کی سچی باتیں، شذرات، مقالے اور کتابوں پر تبصرے تمام تر مولانا ہی کے قلم کے رہین منت ہوتے تھے۔ اور علاوہ معنوی مقصد اصلاح کے وہ ان کی فن کارانہ انشا پردازی کے بھی آئینہ دار رہے۔ ان کے ایک مقالہ الفاظ کا جادو (جون ۱۹۳۱ء) کے ابتدائی دو پیراگراف ملاحظہ ہوں :۔

"اگر آپ کا تعلق اونچے طبقے سے ہے تو کسی "سرا" میں ٹھہرنا آپ کے لئے باعث تو ہین، لیکن کسی ہوٹل میں قیام کرنا ذرا بھی باعث شرم نہیں حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ "سرا" مشرقی ہے دیسی ہے اور ہوٹل مغربی ہے، انگریزی ولایتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے سرا کے فلاں "بھٹیارے" سے آپ سے یارانہ ہے۔ تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں۔ لیکن فلاں "ہوٹل" کے "منیجر" سے آپ سے بڑا ربط ضبط ہے۔ اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ "سرا" کے بھٹیارے اور "ہوٹل" کے "منیجر" کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟ کسی مدرسہ میں اگر آپ مدرس ہیں تو آپ حقیر ہیں، ذلیل ہیں، لیکن کسی کالج میں اگر آپ لکچرر یا پروفیسر ہیں تو معزز ہیں۔ صاحب وجاہت ہیں، حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے مدرس اور پروفیسر بالکل ایک چیز ہیں۔ ندوہ کے "دارالاقامہ" میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل کچھ خوش نہیں ہوتا، لیکن اسی دارالاقامہ کا نام جب آپ "شبلی ہوسٹل" سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ ـــــ مدرسہ میں اگر آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ ذلیل و خوار ہیں لیکن اگر آپ کا تعلق کسی کالج سے ہے تو پھر آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر "مدرسہ چشمۂ رحمت" کا تذکرہ تھا، اب وہ "چشمۂ رحمت کالج" ہے اور وہاں کے "صدر مدرس"، "پرنسپل" صاحب ہیں۔ فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ کے سب سے بڑے استاد کو "صدر مدرس" ذرا کہہ کر تو دیکھ لیجئے فوراً آپ کی غلطی کی تصحیح کی جا رہی ہے کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرس کا نہیں پرنسپل کا ہے"۔

'سچی باتیں' کا ایک نمونہ سچ (لکھنؤ) ۱۹۲۸ء سے منقول :۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم

نے فرمایا، اللہ کے نزدیک شہروں کا پسندیدہ ترین حصّہ وہاں کی مسجدیں ہیں اور ناگوار ترین حصّہ وہاں کے بازار ہوتے ہیں۔

آپ نے سنا یہ کس کا ارشاد ہے؟ اُس کا جسے ہم اور آپ اپنی زبان سے سب سے بڑا راہبر اور سب سے بڑا معلّم تسلیم کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، اشارہ کنایہ میں نہیں صاف اور کھلے لفظوں میں ارشاد ہوتا ہے کہ شہروں کا پیدا کرنے والے کی نظر میں وہاں کا محبوب ترین اور بہترین حصّہ کیا ہوتا ہے؟ مسجدیں اور ناگوار ترین حصّہ کونسا ہوتا ہے، وہاں کے بازار۔

یہ رسولؐ کا قول تھا۔ اُمت کا عمل کیا ہے؟ آج ہم کو آبادی کا ہر حصّہ، شہر کی ہر عمارت، مسجد سے زیادہ عزیز ہے۔ سڑک کے کونقطوں کی آبادی ہمارے دم سے قائم ہے۔ تھیٹروں کی سرپرستی ہمارے ذمہ، سنیما اور سرکس دیکھنے والوں میں ہم سب سے پیش پیش میلے ٹھیلوں کی چہل پہل ہماری ذات سے وابستہ، پارک کی سیر ہم کو عزیز، کلب کی حاضری میں ناغہ ہم نہیں کرتے۔ مشاعروں کی شرکت ہمارے لئے فرض عین۔ گھوڑدوڑ کے میدان ہمارے دم سے آباد فٹ بال میچ اور ہاکی میچ شاید ہی ہم سے کبھی چھوٹا ہو، ہوٹل ہم کو عزیز، نمائش گاہیں ہم کو عزیز، مال روڈ ہم کو عزیز، چاندنی چوک ہم کو عزیز، ایڈورڈ پارک ہم کو عزیز، مال روڈ ہم کو عزیز، حسین ساگر ہم کو عزیز، اپالو بندر ہم کو عزیز، چوپاٹی ہم کو عزیز، ایڈنس گارڈن ہم کو [illegible] سنگاس ہم کو عزیز، حضرت گنج ہم کو عزیز، چار

مینار ہم کو عزیز، سودے والوں کی صدائیں ہم کو عزیز، کھانے کی دوکانوں کی خوشبوئیں ہم کو عزیز، [illegible] والوں کے گلاس ہم کو عزیز، آئس کریم کی پلیٹیں ہم کو عزیز اور خیر یہ تو عوام کا ذکر تھا، کتب خانے [illegible] خواص" کو عزیز، کونسل چیمبر ہمارے ممبروں کو عزیز، لکچر ہال اور جلسہ گاہیں ہمارے لیڈروں کو عزیز، مدرسے اور بورڈنگ کی عمارتیں ہمارے قومی کارکنوں کو عزیز، غرض سب کو اللہ کے گھر کے سوا اور سب کچھ عزیز، اللہ کی توحید کا کلمہ پڑھنے والو، محمدؐ کی شفاعت پر ایمان رکھنے والو، اپنے دلوں کو ٹٹولو، فی صدی نہیں، فی ہزار بلکہ فی لاکھ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جنھیں مسجد دل سے عزیز ہے، جن کے دل مسجد میں راحت پاتے ہیں؟"

صدق جدید کے شذرات (نوٹوں) کا انداز الوداع کا عنوان "بے پناہ جنسی ہیجان"۔ صدق جدید، ارمارچ ۱۹۶۸ء کی اشاعت [illegible] نکلا ہے۔

"واشنگٹن ۲۶ر جنوری۔ آج ایوان صدر [illegible] ایک پریس کانفرنس کے دوران ایک لیڈی رپورٹر نے صدر سے مارشل لا کا مطالبہ کرکے صدر جانسن کو کچھ دیر کے لئے حیرانی میں ڈال دیا۔ لیڈی رپورٹر نے کہا کہ ملک میں جنسی جرائم کی کثرت ناقابل برداشت ہوگئی ہے زنا بالجبر کی وہ شدت علانیہ ہوگئی ہے کہ اب ضروری ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے مارشل لا سے کام لیا جائے گویا پولیس تھک کر مایوس ہوگئی۔ عدالتیں نا

جلیں، جیل خانے ناکافی ثابت ہو چکے، اب ضرورت س کی ہے کہ مجرموں کو گولی سے اُڑا دیا جائے ـــــ ـــــ اور یہ مطالبہ وہاں شروع ہو گیا ہے جہاں زانکاروں کے لئے تازیانہ اور سنگ ساری کی سزا پسماندہ ذہنیت کی نشانی اور وحشت و بربریت کی دلیل ہے۔

بہتر ہے مغرب کے دانشورو، اسلام کے تصور عفت و عصمت کی خوب ہنسی اُڑاؤ، اسلامی احکام حیا و حجاب کے ساتھ جی بھر کر تمسخر کرو، شرابیں پی پی کر اپنے معاشرے کو زنا پسندی کے سیلاب میں غرق کر دو، اپنے افسانوں، ناولوں، اخباروں، رسالوں، ناٹکوں، کھیل تماشوں، تصویروں، مجسموں کے راستے سے ہیجان شہوت اور تلاطم نفس پرستی برپا کر دو اور جب اپنے ہاتھوں کے لائے ہوئے ہولناک طوفان کی پوری زد اپنی ہی بہنوں اور بیٹیوں، ماؤں اور بیویوں پر پڑنے لگے اور چوپایوں اور انسانوں کے درمیان کوئی فرق حیا و غیرت کے لحاظ سے نہ رہ جائے تو بے تحاشہ گولیاں چلانے اور مارشل لا کے لئے غل مچانے لگو۔

ادبی مضامین :-

مولانا کے ادبی مضامین، مرزا رسوا کے قصّے، کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے۔ اُردو کا واعظ شاعر، اُردو کا ایک بدنام شاعر، برہم چند وغیرہ۔ اُردو اخبارات و رسائل میں اور پھر مجموعہ مقالات میں شائع ہو کر خوب مقبول ہو چکے ہیں۔ ایک ادبی مضمون 'نیا آئین اکبری' جو ۱۹۳۷ء میں پہلی بار ایک ادبی جلسہ میں پڑھ کر سنایا گیا تھا، کا تمہیدی حصّہ ملاحظہ ہو۔

"آئین اکبری" تو دہی ایک ہے سب کا جانا ہوا، شہنشاہِ اکبر کے انتظامی خط و خال کا آئینہ، اب اس میں کوئی جدت کیا پیدا کرے گا۔ پُرانے کو نیا کوئی کیونکر بنائے گا اور اطلس میں گاڑھے کا پیوند کوئی کہاں سے لگائے گا؟ ـــــ لیکن اکبر اکیلے ایک شہنشاہِ ہند ہی کا تو نام نہیں ہوا ہے اقلیم سخن کا بھی ایک تاجدار اسی نام کا گزرا ہے، صدیوں قبل نہیں، حال میں اور کہیں بہت دور نہیں آپ کے شہر سے نزدیک الہ آباد میں، وہ قدیم آئین اکبری تھا، اقلیم ہند کے ایک فرمانروا کا کوکبۂ جلال ہے آج کا جدید آئینِ اکبری ہے اقلیم معانی کے ایک تاجدار کا پرتو جمال۔ البتہ وہاں داستان گو تھا ایک نام کا ابوالفضل اور یہاں عرض پرداز ہے ایک سراپا جہل ـــــ خیر نمائش کے عجائب زار میں ایک عجوبہ کا اضافہ اور سہی، ادبی کانفرنس میں ادیبوں اور شاعروں کے مجمع میں، سخن گویوں اور سخن فہموں کے جلسہ میں ایک کم سواد قصباتی کی جسارت اللہ اکبر، بس سمجھئے کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں جہاں بازیاں بڑے بڑے شہسواروں کے لگ رہی ہیں وہیں ایک گوشہ میں ایک نعل بند بھی کیل کانٹے سے لیس اپنا ٹھیلا لئے موجود۔

ظرافت کلام اقبال کی سب سے بڑی نقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے حق میں سب سے گہری نقاب بھی

یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کے نام کو قہقہوں نے اُچھالا، ان کی شہرت کو تالیوں نے میں پ۔ لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح کو دنیا انھیں محض ایک دل لگی باز سمجھ کر ان کے لطیفوں پر مٹی رہی، ان کی شوخیوں پر ہنس مسکرا لیا۔ انکے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ گئی اِدھر نظر کسی کی نہ گئی اور کسی ایک آدھ کی گئی تو وہ شمار میں نہیں کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں، وہ خود کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے"

مذہبی اور قرآنی مضامین :-

ادب کے ساتھ مولانا کا دوسرا اہم اور خاص موضوع مذہب خصوصاً قرآنیات ہے۔ ان کی تفسیر ماجدی کا پہلا اور ضخیم اڈیشن تاج کمپنی کراچی کے زیرِ اہتمام عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ اب دوسرا ضخیم تر اڈیشن مکمل نظرِ ثانی اور بہت کچھ ترمیم و اضافہ کے بعد ہندوستان سے شائع ہو رہا ہے۔ دوسری جلد جس میں دسویں پارے تک کی تفسیر آگئی ہے چند ماہ ہوئے شائع ہوئی ہے اس کے علاوہ ان کے قرآنی مضامین پر مشتمل رسائل کی انشا ان کے ادبی مضامین اور صحافتی تحریروں سے خاصی مختلف ہونے کے ساتھ حد درجہ سلیس اور بآسانی ذہن نشین ہونے والی ہے۔ تفسیر کا ایک نمونہ اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو۔ سورۂ فاتحہ میں رب العالمین پر تفسیر حاشیہ کا ایک ٹکڑا :-

"رب العالمین کا لفظ لاکر قرآن مجید نے گویا بتادیا کہ ہر صنف موجودات کا ایک مستقل نظام تربیت ہے اور سب کا آخری سرا اس قادرِ مطلق، واحد و یکتا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بھی صنفِ موجودات اس کے ہمہ گیر نظامِ ربوبیت سے آزاد و مستثنیٰ نہیں یہ تعلیم بھی اس ایک لفظ سے مل گئی کہ اسلام کا خدا کسی مخصوص نسل، مخصوص قوم، مخصوص قبیلہ کا خدا نہیں ـــــ یہ حقیقت تاریخ مذاہب میں نہایت درجہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام سے قبل مذاہب جس صورت میں موجود تھے وہ اس وسیع تخیل ہی سے آشنا نہیں رہے تھے۔ ہر قوم خدا کو صرف اپنا خدا تسلیم کرتی تھی گویا خدا کی حیثیت محض قومی خدا کی رہ گئی تھی، بابل، مصر، ہند، یونان، روم، عرب وغیرہ کی مشرک قوموں کا ذکر نہیں بنی اسرائیل جیسی موحد قوم بھی خدا کے خدائے کائنات ہونے کی پوری طرح قائل نہیں رہی تھی۔ قرآن نے ایک لفظ رب العالمین لاکر ان سارے مشرکانہ و گمراہانہ عقائد کی تردید کردی۔ مشرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفت ربوبیت ہی کے سمجھنے میں لگی ہے اس لئے قرآن مجید نے تصحیح میں بھی اسی کو مقدم رکھا۔

(تفسیر ماجدی حصہ اول ص۶)

حکیم عبدالقوی دریابادی

فتنہ نگار

صدقِ جدید کے نقشِ اوّل ہفتہ وار سچ (لکھنؤ) (دورِ ثانی صدق (لکھنؤ)) نے وقت کے جن اہم فتنوں کا مقابلہ کیا اُن میں سب سے اہم فتنہ رسالہ نگار (لکھنؤ) کا تھا۔ اس کے مدیر شہیر نیاز فتح پوری صاحب (جو اپنے قلم سے اپنے نام کے ساتھ رسالہ کے سرورق پر یہ لقب "علیس التحریر" لکھتے تھے) نے اسلام وعقائد اسلام کے خلاف اپنے مضامین کے ذریعہ گویا ایک جہاد کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا [illegible] کی [illegible] شخصیتوں کی ذاتِ رسالت کے بارہ میں بھی ان کا قلم بے ادبانہ [illegible] سے بُری طرح کھلا کیا تھا اور انکے قلم سے اسلام کے متعلق جو گستاخانہ فقرے کثرت سے نکلنے لگے تھے، [illegible] زیادہ دریدہ دہن آریہ سماجی ناظرین اور گستاخ زبان گستاخی قلم میں [illegible] نہ بازی لے [illegible] تھے۔ اس فتنہ کے خلاف بعض مسلمان اخبار و رسائل نے گاہ بگاہ آواز اٹھائی لیکن اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا اور نیاز صاحب کا قلم اور زیادہ ڈھیٹ ہوتا گیا۔ چونکہ ان کے اس قسم کے مضامین سے گمراہی بہت پھیل رہی تھی خصوصاً اس دور کے نوجوان طبقہ میں جو انتشار 'نیاز' سے بُری طرح متاثر تھا اسلئے ۱۹۳۱ء کی آخری سہ ماہی میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس "فتنہ نگار" رسالہ نگار کے خلاف پوری مہم شروع کی۔ اس سے قبل بھی سچ کے بعض مضامین اور شذرات نیاز صاحب کی ان تحریروں کے رد و جواب میں نکل چکے تھے۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۳۱ء مطابق [illegible] جمادی الاوّل ۱۳۵۰ھ کا جو سچ نکلا وہ پورے کا پورا اس فتنہ کے جواب کے لئے وقف تھا اور آٹھ صفحے کا پورا اخبار صرف ایک ہی طویل مضمون "ایک دشمنِ اسلام مسلمان" (دوسری ذیلی سرخی "اسلام اور مسلمانوں پر جگر خراش حملے) کے عنوان سے مولانا کے قلم سے درج تھا۔ اس میں رسالہ نگار کی فائلوں کا جائزہ لے کر نیاز صاحب کے خرافات اور اسلام اور مسلمانوں پر ان کے قلمی حملوں کے نمونے کثرت سے پیش کئے گئے تھے ان اقتباسات کو آج پھر دُہرانا اس فتنہ کو پھر سے تازہ کرنا ہے، اسلئے صرف پہلے اقتباس پر اکتفا کی جاتی ہے جس سے ناظرین کو اندازہ ہو جائے گا کہ نیاز صاحب اس وقت الحاد کی ترنگ میں خود اپنے

اپنے مسلمان پیدا ہونے پر اظہار تاسف کر چکے تھے۔

"جس وقت میں دیکھتا ہوں کہ بعض اکابر قوم ..... روز بروز تنگ نظر اور رسم و رواج کے پابند ہوتے جاتے ہیں تو میری یاس کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور پھر خود اپنی ذات سے نفرت ہونے لگتی ہے کہ میں کیوں نہ بجائے مسلمان ہونے کے انسان پیدا ہوا۔"

(نگار مارچ ۱۹۲۹ء)

یہ اقتباس نسبتاً ہلکا ہے۔ دوسرے اقتباسات جو اس طویل مضمون میں نقل ہوئے تھے وہ ایک سے بڑھ کر ایک اشتعال انگیز اور اُمتِ اسلامیہ کے لئے صبر آزما تھے۔

مولانا کے سچ کے اس طویل مضمون میں جوانشا ماجدی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا، نیاز صاحب کی عبارتوں کو درج کر کے جو جوابی تبصرے کئے گئے تھے ان کے دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں:۔

"عذرِ گناہ سنتے تھے کہ کبھی کبھی بدتر از گناہ بھی ہوتا ہے، شکر ہے کہ اسکی بہترین مثال نیاز صاحب نے ادب اُردو میں مہیا کر دی۔ عالم اسلامی کے طول و عرض میں کوئی دوسرا مسلمان کسی فرقہ کا بھی سہی، ایسا آپ کی نظر سے گذرا ہے جو سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دوسرے انبیائے کرام کے اسمائے گرامی کو ہر کلمۂ ادب و تعظیم سے معرّیٰ و مخلّیٰ، محض محمد اور موسیٰ اور عیسیٰ لکھے بلکہ اپنی اس خرافت نگاری کو فخریہ پیش کرے، مسلمان تو مسلمان، متیز دار و شائستہ ہندو اور مسیحی، سکھ، پارسی بھی اب اس اسم گرامی کو یونہی بلا تعظیم نہیں لکھتے۔ یہ نام کا مسلمان کیا ان سب سے گیا گزرا ہوا ہے اور بیدینی کے ساتھ بدتمیزی بھی سو تا اپنے اندر پوری طرح پیدا کر لی ہے۔"

حضرت عیسیٰ مسیح کی شان میں نیاز صاحب کے قلم نے جو بدلگامی کی تھی، اس کا اقتباس درج کر کے مولانا لکھتے ہیں:—

"اب مسلمان خدارا بتائیں کہ اگر یہی الفاظ کسی ہندو، کسی آریہ، کسی عیسائی کی زبان سے ادا ہوئے ہوتے تو کیا مسلمان اس طرح بچیں اور خاموش رہتے۔ کیا محض اسلامی نام کی آڑ ہر کفر نوازی کو قابل تحمل، ہر گندہ دہنی کو گوارہ بنا دے گی؟"

سچ کے اس مضمون سے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں اک آگ سی لگ گئی۔ مسلم اخبارات و رسائل نے اس مضمون کو نقل کیا اور اس کی تائید میں پُر زور مضامین اور نوٹ لکھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے رسالہ معارف میں اس پر خاص توجہ کی، حیدرآباد کے رہبر دکن، لکھنؤ کے ہمت اور حق، بمبئی کے خلافت۔ لاہور کے انقلاب، زمیندار۔ بجنور کے مدینہ۔ دہلی کے الجمیعۃ۔ دالامان و ملت وغیرہ نے اس فتنہ کے خلاف مسلسل آواز اُٹھائی، جا بجا احتجاجی جلسے ہوئے، نگار کا بائیکاٹ کیا گیا، اس کے اڈیٹر کے خلاف مقدمے دائر کئے گئے۔ سب شہر لکھنؤ میں خاص طور سے بڑے احتجاجی جلسے ہوئے جن میں مولوی ظفر الملک مرحوم نے خاص

طور سے حصّہ لیا۔ اخبار سیچ میں نہ صرف مولانا کا سلسلۂ
مضامین اس سلسلہ میں برابر ہفتوں بلکہ مہینوں جاری
رہا بلکہ دوسرے مراسلے اس سلسلے کے احتجاجی جلسوں
کی رُوداد یں اور دوسرے اخبارات کے تائیدی مضامین
کثرت سے نقل ہوتے اور "فتنہ نگار اور قوم
کی آواز" "قوم کا مجرم قوم کی عدالت میں"۔ "اللہ کا
مجرم اللہ کے بندوں کی عدالت میں" "نیاز نقاب
ہٹ جانے کے بعد" وغیرہ کے مختلف عنوانوں سے نکلے۔
شروع شروع نیاز صاحب بہت اکڑتے رہے، لیکن
بالآخران کو توبہ نامے پر دستخط کرنے پڑے۔ لکھنؤ کے
جلسۂ عام میں جو توبہ نامہ ان کی طرف سے پیش ہوا تھا
اس کی لازمی شرط یہ تھی کہ وہ اسے اپنے رسالہ میں بھی
نمایاں طور سے شائع کریں۔ اس شرط کی انھوں نے
اچھی خاصی خلاف ورزی کی۔ اول تو توبہ نامہ ان الفاظ
میں نہیں چھاپا جو اصل جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں
خاصی کتر بیونت کر دی تھی اور پھر اُسے غیر نمایاں طور پر
شائع کیا اور ہر پرچہ میں شامل بھی نہیں کیا۔ ان کی اس
بدعہدی پر مولانا اور دیگر حضرات نے سخت احتجاج کیا،
اور اس کی سرگرم کوشش کی گئی کہ ان کے خلاف
توہینِ مذہب کی دفعہ کے تحت حکومت مقدمہ چلائے۔
نیاز صاحب نے توبہ کے بعد توبہ جس طرح نباہی اس
پر مولانا دریابادی کا مضمون "نگار کی تازہ فتنہ نگاریاں"
کے عنوان سے ۲۰ر نومبر کے سیچ میں نکلا اور ماہ نومبر
کے نگار کے بعض مضامین کی نیازی عبارتوں کو نقل کر کے
یہ دریافت کیا گیا تھا کہ آیا یہی ایفا ہے ان صریح وعدوں

کا کہ
"آیندہ میری طرف سے ایسے مقالات کبھی
شائع نہ ہونگے جن سے مذہبی شکایت کا سبب پیدا ہو"
"نگار میں بھی آیندہ سے کسی قسم کے مذہبی
مضامین درج نہ کروں گا۔ واللہ علی ما نقول شہید"
اور نیاز صاحب کی اس کھلی ہوئی توبہ شکنی
پر ان کو یہ عبارت لکھنی پڑی:۔
"مدت ہوئی ایک غزل کا مطلع سنا تھا ؎
کبھی بے توبہ ہم نے پی ہی نہیں
توبہ یوں کی کہ جیسے کی ہی نہیں
شعر شاید حضرت ریاض خیرآبادی کا ہے۔ شعر
پر عمل جناب نیاز فتح پوری کے حصّہ میں آیا اور
عمل بھی اُن حدود تک جہاں شاعر کی فکر رسا
کی بھی رسائی نہ ہوئی ہو۔ شاعر غریب سے
تو صرف اتنا ہو سکا تھا، اور وہ بھی تخیل
ہی کی دنیا میں کہ مے نوشی سے توبہ کر کے پھر
مے نوشی شروع کر دیتا تھا۔ اُس سے بھی نہیں
ہو سکا تھا کہ واقعات کے عالم میں بہ حالت
ثبات و ہوش و سلامت حواس جیتے جاگتے
دن دہاڑے سیکڑوں بھلے مانسوں کے مجمع میں
بھرا رہا۔ شریفوں کی اطمینان دہی کے لئے صاف
و صریح لفظوں میں ایک پختہ تحریری وعدہ
کرے اور جب اس وعدہ کے ایفا کا وقت آئے تو
"توبہ یوں کی کہ جیسے کی ہی نہیں"! شاعر کو بہر حال
اپنی عزت اور اپنی شرافت کا پاس ہو سکتا ہے
یہ ننگ روزِ ازل سے اسی ننگِ اسلام ہستی کے
لئے اُٹھا رہا تھا جسے گراس پر افسوس و ندامت

ہے کہ وہ مسلمان کے گھر کیوں پیدا ہوا، تاہم ضرورتاً ومصلحتاً اس پر بھی اصرار ہے کہ دنیا اسے مسلمان ہی شمار کرے۔ ہے کوئی جو "علامہ" نیاز فتحپوری کو اس تاریخی شرف و اعزاز سے محروم کر دے۔

بہرحال اب معاملہ پھر قوم کی عدالت میں ہے اور فیصلہ ملتِ اسلامیہ کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان کب تک اپنے ساتھ اس کمینی دل لگی کو برداشت کرتے رہیں گے"

اس کے بعد دوسرے پرچے ۲۳ دسمبر میں مولانا نے سچی باتوں والے صفحہ پر سچ کی [illegible] پر زور تحریر "بدعہد دشمنِ اسلام" کے عنوان سے لکھی اور اسی پرچے میں ان کا ایک بڑا مضمون "نیاز توبہ کے بعد" نکلا۔ پھر ۳۰ دسمبر کے سچ میں سچی باتوں والے صفحہ پر ان کی دوسری تحریر "بدسرشتوں کی سرشت" اور متعدد نوٹ ان کے قلم سے نکلے ہیں جن میں [illegible] دیوبند ضلع سہارنپور کے ایک غیور مسلمان نے نیاز صاحب [illegible] سلسلہ میں (توہین مذہب) دفعہ کے تحت مقدمہ [illegible] کر دیا ہے۔ اس پرچہ میں مولانا کا ایک مقالہ "عذرِ گناہ" کے عنوان سے نیاز کے ایک جوابی مضمون کے جواب میں نکلا۔ اور ۱۸ دسمبر کے سچ میں، نیاز صاحب کے رسالہ کے ایک اور مضمون نگار (جو "حق گو" کے فرضی نام سے انکار حدیث کے مضامین نگار میں کثرت سے لکھتے رہتے تھے اور اس فتنہ کے خلاف تحریک شروع ہونے پر اپنے رجوع و توبہ کا پبلک اعلان کر چکے تھے) کا مضمون صفحہ اول پر "ایک حق گو کی حق گوئی" کے عنوان سے نکلا۔ اور خبر بھی چھپی کہ دہلی میں جمعیۃ نے

حسن نقائی ایڈیٹر پیشوا نے نیاز صاحب کے خلاف ایک مقدمہ زیر دفعات ۲۹۵ (الف) اور ۲۹۸ کی ایک عدالت میں دائر کر دیا ہے اور بدعہد دشمن اسلام کے زیر عنوان نیاز کی توبہ شکنی کے خلاف خطوط اور اخبار دوسرے اخبارات سے مضامین نکلے اور اس توبہ شکنی کے خلاف لکھنؤ میں ایک جلسہ عام زیر صدارت [illegible] احتشام علی کاکوروی ہوا جس میں نیاز صاحب کے خلاف ایک تجویز منظور کی گئی اور ان کے خلاف [illegible] کارروائی کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کے کنوینر مولانا ظفر الملک علوی مقرر ہوئے۔

۱۹۳۲ء کے شروع کے سچ میں بھی اس سلسلہ کی بعض چیزیں نکلیں، اور اگرچہ نیاز صاحب کے خلاف قانونی کارروائی اس زمانے کے ہوم ممبر صاحب کی افراط مروت کے باعث عمل میں نہ آسکی لیکن نیاز صاحب کی مذہب کے خلاف ہرزہ سرائی خاصی کم ہو گئی۔ اس کے کئی سال بعد ۱۹۴۲ء میں نیاز صاحب پر الحاد کا دورہ پڑا اور انہوں نے ایک مسیحی پادری ٹسڈیل کی کتاب "مآخذ القرآن" کا نہ صرف اردو ترجمہ اپنے رسالہ نگار میں چھاپا بلکہ اس کے اس خیال کی پوری تائید اپنے مضمونوں کے ذریعہ کی کہ قرآن وحی الٰہی اور منزل من اللہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلعم کی تصنیف ہے۔ انکے ان مضامین کے خلاف مولانا نے اپنے اخبار صدق میں (جو اب سچ کے بجائے نکل رہا تھا) میں زوردار مضامین اور نوٹ لکھے اور انکا ساتھ اسلامی ہند کے رسائل و اخبارات نے دیا۔ اس فتنہ کی پوری سرکوبی کی۔ ان نام نہاد دلائل کا پول کھول کر رکھ دیا۔ اس سلسلہ میں نیاز صاحب

پروفیسر سید احتشام حسین

مولانا عبدالماجد کی تنقیدی بصیرت

تنقید شعور کی ایک ترقی یافتہ منزل ہے اور اپنی اعلیٰ سطح پر فلسفہ و منطق، سائنسی ذوق اور فکری بصیرت کے دائرہ کی چیز بن جاتی ہے جس کا تعلق محض ذوق ادب سے نہیں رہ جاتا۔ ہمہ گیر شعور حیات کا جزو بنا کر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ تنقید اپنے وسیع ترین مفہوم میں کائنات اور اس کے مظاہر کی طرف سوچا سمجھا ذمہ دارانہ رویہ ہے جس کا استعمال ایک محدود پیمانہ پر شعر و ادب کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے اور اسے ہم ادبی تنقید کا نام دیتے ہیں لیکن اسے عام تنقیدی شعور سے الگ نہیں قرار دے سکتے۔ ادبی تنقید کا ملکہ اور رجحان اپنی ابتدائی شکل میں فطری ہوتا ہے لیکن اس کا نشو و نما علم و آگہی ریاضت اور مطالعہ، وسیع النظری اور صداقت نگاہ کی مدد سے ہوتا ہے۔ کسی ادبی مسئلہ یا ادبی تخلیق کے متعلق محض ہیجانی یا جذباتی ردعمل سے عام طور سے تنقیدی بلندی تک نہیں پہنچتا

حالانکہ ایک ذکی الحس نقاد اپنے سرمایۂ فکر کی بنا پر اس صورت میں بھی گہرے اور بصیرت افروز خیالات پیش کر سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذہانت اور وسیع مطالعہ کی مدد سے تشریح، تجزیہ، تعبیر اور محاکمہ کی منزلوں سے گزار کر ایک ہی لمحہ میں طے کر لیتا ہے اور آورد میں آمد کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا عبدالماجد کے ادبی اور تنقیدی مضامین پڑھ کر میرا ذہن انھیں باتوں کی طرف جاتا ہے اور میرے سامنے ان کی وہ تحریریں بھی گھومنے لگتی ہیں جو بہت محدود معنی میں تنقید ادب سے متعلق نہیں کہی جا سکتیں لیکن جو اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور اسی طرز فکر کا ایک پرتو ہوتی ہیں۔

اردو میں شاذ و نادر ہی ایسے ادیب ہوں گے جو قرآن و حدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ و نفسیات، سوانح و سیرت، سفرنامہ اور ڈائری، سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل، شاعری اور تخلیقی نثر، افراد اور

تحریکات کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ اظہار خیال میں تازگی، لطف زبان نشتریت اور بلاغت بھی ہو یہ ساری خوبیاں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے جتنا اور جو لکھا ہے غور و فکر کے پیمانے میں ڈھال کر لکھا ہے یا قلم برداشتہ لکھا ہے۔ وہ نشتر پر لکھا ہے۔ [illegible] کسی مخصوص تخلیقی جذبے کے تحت سب میں ایک [illegible] اور حسین اسلوبی شائستگی نظر آتی ہے۔ یہ قدرت ہر قلم میں نہیں ہوتی کہ وہ مختلف موضوعات کے مناسب زبان استعمال کرے، لیکن ہر ایک کے اندر ایک ایسا آہنگ بھی موجود ہو جو اسلوب اور طرز ادا کی پہچان بن جائے۔ مولانا دریابادی کی تصنیفی عمر بچپن اور ساٹھ سال کے درمیان ہوگی۔ جب انھوں نے اس وادی میں قدم رکھا اس وقت اردو دنیا نثری اسالیب کے متنوع رجحانات کا آئینہ دار بنی ہوئی تھی اور ہر دہائی میں ان کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ سرسید خواجہ حالی، محمد حسین آزاد، علامہ شبلی، سرشار اور مولانا شرر ان میں سے کون ہے جس کے جادو اور اثر کا انکار کیا جا سکے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا سکہ رواں کیا۔ ہر [illegible] ہر ایک نے اردو نثر [illegible] لگائے ہر ایک [illegible] سمجھا گیا [illegible] ممکن تھا [illegible] کی دوسری دہائی میں [illegible] اور جو ادیب بھی کے شوق میں قلم اٹھاتے اور ان میں سے ہر ایک کا دام [illegible] نکل جائے پھر لکھنے والوں کی دوسری کھیپ آئی جو ادبی حسن کاری [illegible] کے پہلے گروہ سے کچھ آگے ہی تھی کیونکہ اس نے ایک طرف تو اپنے پیش رو [illegible] سے اثر قبول کیا تھا دوسری

ہاتھ میں تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، آغا [illegible] نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، ناصر علی، دلگیر، خواجہ حسن نظامی، سجاد انصاری اردو کے وہ نثر نگار تھے جنھوں نے تخیلی اور تخلیقی نثر کے ان گوشوں کو منور کیا جنھیں حالی اور ان کے ساتھیوں کی توجہ نصیب نہیں ہو سکی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کا لہجہ ہے ایک طرز ہے، ایک سلیقہ ہے جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی آوازیں کہیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں، ایک دوسرے سے ٹکراتی بھی ہیں لیکن ان کی انفرادیت ختم نہیں ہوتی۔ اتنا ضرور ہے کہ بعض کا دائرہ عمل محدود ہے، موضوعات محدود ہیں، اور شاید ذہن کی پرواز بھی محدود ہے لیکن بعض وسیع میدانوں میں گشت لگاتے [illegible] بڑھنے اور پرواز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری کو اس نوع میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال مولانا عبدالماجد دریابادی کے سامنے یہی نمونے تھے۔ کیا انھوں نے اس میں اپنے کسی کا[illegible] کیا؟ یہ سوال صرف اسلوب کے متعلق نہیں طرز [illegible] کے بارے میں بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی [illegible] اردو ادب نے مغربی اثرات قبول کرنا بھی شروع کر [illegible] تھا جس کے واضح نقوش سرسید کی تحریک [illegible] ملتے ہیں، بعد میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہو [illegible] اور فکر و خیال، ذوق و اظہار کے مختلف پہلوؤں [illegible] احاطہ کرنے لگا تھا۔ مذہب، اخلاق، ادب، تعلیم، تفریح اور طرز معاشرت، غرض زندگی کا [illegible] اہم شعبہ ایسا نہ تھا جس پر نئے اثرات نے ا[illegible] نہ چھوڑا ہو۔ نئے تعلیم یافتہ طبقے نے کبھی غور سے اور کبھی بدنامی کی حد تک تقلیدی انداز میں [illegible] کوشش کی

معلمی کے دور سے مولانا دریابادی کا مطالعہ بہت وسیع اور ذہن اثر پذیر، اس لئے اگر انھوں نے یورپی ادب اور فکر کے اثرات قبول کئے تو یہ حیرت کی بات نہیں لیکن کیا یہ یقین سے کسی مخصوص ادیب یا نقاد کا نام لیا جا سکتا ہے جس کی پیروی ادبی نقطہ نظر متعین کرنے میں انھوں نے کی ہو۔

ایک اور حیثیت سے بھی کوئی مخصوص اثر قبول کرنے کا سوال زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ آج تو ایک مصنف اور نقاد کے سامنے بہت سے راستے ہیں اور ہر نقاد ادبی نقطہ نظر اختیار کرنے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی مکتب فکر سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تشریحی، تاثراتی، جمالیاتی، سماجی، تاریخی، رومانی، کلاسیکی، نفسیاتی طریق ہائے کار ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے علمبردار مل جاتے ہیں لیکن چالیس پچاس سال پہلے یہ تقسیم واضح نہ تھی۔ حالی، آزاد اور شبلی کے ادبی نقطہ نظر میں ایک دوسرے سے اختلاف تھا لیکن اتنا نمایاں نہ تھا کہ ایک کا اقرار دوسرے کی نفی قرار دیا جائے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا ذوق تنقید اسی فضا میں پروان چڑھا اور جب ادبی موشگافیوں نے کئی مکاتب نقد پیدا کر دیے اس وقت ان کا انداز نظر اور اسلوب دونوں اپنی راہ بنا چکے تھے۔ مولانا دریابادی کی تنقید پر غور کرتے ہوئے یہی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ان کے طریق کار کی لچک انھیں ہر تقلید اور ہر لیبل سے بلند کر دیتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتدا میں انھوں نے آزاد اور شبلی کا رنگ پسند کیا ہو، مہدی افادی کا نامی، سلیمان ندوی نے متوجہ کیا ہو، رسکن، کارلائل، والٹرپیٹر کے اسلوب نے گدگدی پیدا کی ہو لیکن شروع ہی سے ان کی ادبی سوجھ بوجھ اور طرز اظہار میں کوئی ایسی بات ضرور ملتی ہے جو خود انھیں کی ہے۔ اگر کسی جملہ کی ساخت مولانا محمد حسین آزاد سے مل جاتی ہے تو تحریر کا دوسرا حصہ شبلی کی یاد دلاتا ہے اور تیسرے میں ابوالکلام آزاد کی خطابت جھلکتی ہے اور طنز کا نشتر لوگوں میں دور تک اترتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر جب مکمل تحریر پر نظر ڈالی جائے تو وہ اپنا تاثر ایک امتیازی اور انفرادی اسلوب کی حیثیت سے چھوڑتی ہے۔ ہر دوسرے ادیب سے مختلف اور ہر تنقیدی اسلوب سے الگ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تنقیدی بصیرت پر نگاہ کرتے وقت اس بات کا یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایک ادیب کے نقطہ نظر کی تشکیل میں وہ سارے عناصر کام کرتے ہیں جو نقاد کے ذہن پر چھائے رہتے ہیں۔ انھوں نے مذہبیات، علوم اخلاق، نفسیات، سماجی تحریکات، تاریخ افکار، تصوف، ادبیات اور شخصیات ہر ایک سے گہری دلچسپی لی ہے۔ مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ طالب علمانہ دور چھوڑ کر تقریباً ساٹھ سال سے یہ مشغلہ غور و فکر کے ساتھ جاری ہے اور اس کے عملی نتائج ہزارہا صفحات کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں جن کے تنوع کا یہ حال ہے کہ اگر اس میں ایک طرف زود پشیمانیاں ہیں تو دوسری جانب تفسیر ماجدی، ایک جانب ہلکے پھلکے موضوعات پر نثری مضامین کا سلسلہ تو دوسری جانب تصوف اسلام، ایک طرف فلسفہ اجتماع ہے تو دوسری طرف مختصر تبصرے اور کتابوں کے پیش لفظ۔ ان سب کے اندر ایک ہی روح کارفرما ہے، ایک خاص طرح کی تنقیدی بصیرت جو تاثراتی اور شخصی ہوتے ہوئے بھی استدلالی رنگ رکھتی ہے۔ اپنی بات کہنے کے جوش میں حقائق کو نظر انداز نہیں کرتی۔

اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس کے اخلاقی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے بھی تخلیق کے ادبی جمالیاتی حسن پر بھرپور نگاہ ڈالتی ہے اس کی بہت اچھی مثال مرزا شوق کی زہر عشق اور مرزا ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا پران کے خیالات ہیں۔ دونوں تخلیقات کے موضوع وہ نہیں ہیں جن کی طرف مولانا عبدالماجد پسندیدگی کی نظر ڈالیں لیکن جب ان کے فنی اور ادبی محاسن کے ساتھ انصاف کرنے کا وقت آیا تو انہوں نے بخل سے کام نہیں کیا اور ان پہلوؤں کی داد دی جس کی وہ بجا طور پر مستحق تھیں یہ ضرور ہے کہ اپنے مذہبی تصورات، اخلاقی عقائد اور تہذیبی افکار کی وجہ سے انھوں نے تحسین شناسی کے لئے وہ زبان استعمال کی جو عام طور سے تنقید میں استعمال نہیں کی جاتی مثلاً زہر عشق کے ایک درد انگیز منظر سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں" نواب مرزا! تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت کہ تونے کو ٹھا اجڑنے والی ماں کے جذبات کی تصویر کا غذ پر اتار کر رکھ دی ہے۔ ماں کے منھ سے یہ بول نکل رہے ہیں یا دل جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں"

پھر مضمون کے خاتمہ پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

"مشرق کے بدنام سخن گو، اردو کے بدنام شاعر رخصت تو درد بھرا دل رکھتا تھا تیری یاد بھی اردو والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، تونے موت کو یاد رکھا تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی۔ تونے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا شاید کسی رحمت بے حساب پر تکیہ کر کے۔ لیکن انھیں غافلوں اور سرمستوں کو موت و انجام کی یاد دلا کر خوب رلایا۔۔۔۔۔۔"

مرزا رسوا کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ذکر تو مولانا عبدالماجد کی زبان پر محبت اور عقیدت کے ساتھ آیا ہی تھا لیکن جب ان کی ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کا قلم وجد میں رقص کرنے لگتا ہے۔۔ اردو میں ناول بہتوں نے لکھے۔ پر ان کا رنگ سب سے الگ، ان کا انداز سب سے جدا۔ نہ ان کے پلاٹ میں سنسنی خیزیاں" نہ ان کی زبان میں" غرابت زائیاں" نہ ان کے اوراق میں" برق پیمائیاں" اور نہ کوہ تراشیاں" نہ ان کے الفاظ" ترنم ریز" نہ انکی ترکیبیں "ارتعاش انگیز" نہ ان کی تصویر رزم میں" برق پاشیاں" نہ ان کی داستان بزم میں" ابتسام آرائیاں" پلاٹ وہی روزمرہ صبح و شام کے پیش آنے والے واقعات جو ہم آپ سب دیکھتے ہیں، زبان وہی گھر باہر کی ستھری اور نکھری بول چال جو ہم آپ سب بولتے ہیں قصہ کے مقامات نہ لندن نہ ماسکو نہ برلن نہ ٹوکیو، بس یہی لکھنؤ، فیض آباد، دہلی الہ آباد، افسانے کے اشخاص نہ لنز صوبہ نہ سندباد، نہ تاج الملوک نہ گلرزرنگار بس یہی حکیم صاحب، راجہ صاحب اور نواب صاحب میر صاحب اور مرزا صاحب، عسکری بیگم اور عمدہ خانم، امراؤ جان، اور بعد ایک قدم کہتے ہیں کہ صاحب کمال لاولد رہ جاتا ہے۔ اس کی نسل آگے نہیں چلتی اپنے طرز کا موجد بھی وہی ہوتا ہے اور خاتم بھی وہی مرزا رسوا کا بھی خلف معنوی آج تک پیدا نہ ہوا۔"

یہ چند جملے مثال کے طور پر ایسی تخلیقات سے لکھ دیئے گئے ہیں کہ ہمیں ان کے ذوق ادب کی آزمائش بھی ورنہ اکبر یا حالی مولانا محمد علی یا نظیر اکبر آبادی پر اظہار خیال کرتے ہوئے تو ان کے نقطہ نظر کا اندازہ لگا لینا کچھ ایسا مشکل نہیں رہ جاتا۔ خاص طور سے اکبر الہ آبادی مولانا محمد علی کا ذکر آجائے تنقید اور عقیدت مندی کی حد میں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے بھی ہے کہ ان حضرات کے افکار و خیالات سے صرف ان کا جذبہ ہی ہم آہنگ

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی :-

مولانا عبدالماجد دریابادی

ولادت بمقام دریاباد ضلع بارہ بنکی (اودھ)۔ ۱۸۹۲ء اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، عربی حکیم مرزا محمد ذکی صاحب اور مولوی عظمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے پڑھی۔ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے پاس کیا۔ فلسفے میں ایم اے کرنے علیگڑھ گئے تھے لیکن ایک سال کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا ہی سے تھا چنانچہ ۱۹۰۹ء ہی سے وکیل امرتسر وغیرہ جیسے ماہنامے کے رسائل میں مولانا مختلف ناموں سے لکھتے رہتے تھے بعض چھوٹے چھوٹے رسالے مثلاً "پیغامِ انسانی" "محمود غزنوی" وغیرہ بھی اسی زمانے میں شائع ہوئے تھے سب سے پہلی قابل ذکر تصنیف "فلسفہ جذبات" ہے جو ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کی تھی۔ اس کے بعد سے تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری کا سلسلہ مستقل طور پر جاری ہوگیا۔ ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سررشتہ ترجمہ و تالیف میں ملازم ہو گئے تھے لیکن ۱۹۱۸ء میں استعفا دیدیا۔ لکھنؤ میں انگریزی تعلیم کے سلسلے میں فلسفہ سے بیحد شغف رہا تھا۔ جس کے باعث اپنے الحاد اور عقلیت پرستی میں نام پیدا کرلیا تھا۔ حیدرآباد سے واپسی کے بعد ہندو فلسفہ کا شوق پیدا ہوا۔ مسز بسنٹ، ڈاکٹر بھگوان داس، آربندو گھوش اور ٹیگور وغیرہ کی کتابیں پڑھ ڈالیں مسز بسنٹ اور گھوش کی تحریروں سے اور گیتا کی تعلیمات سے زیادہ متاثر ہوئے، مادیت سے روحانیت کیطرف آئے، روحانیت کیطرف آنا تھا کہ مولانا روم نے انگلی پکڑی اور راہ راست پر لگا دیا۔ پھر شبلی کی سیرۃ النبی اور محمد علی لاہوری کے انگریزی ترجمہ قرآن نے اثر کیا، مولانا محمد علی اور اکبر الہ آبادی نے توجہ ڈالی آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی نے سالک کو منزل تک پہونچا دیا۔ صحافت سے تعلق روزنامہ "ہمدرد دہلی" سے شروع ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں تقریباً ۸ ماہ تک محمد علی کا یہ اخبار مولانا کی نگرانی میں نکلتا رہا۔ ۱۹۲۵ء سے "سچ ہفتہ وار لکھنؤ سے نکالا"۔ "سچ کے بعد" صدق اور اب "صدق جدید" (ہفتہ وار) پابندی سے نکال رہے ہیں۔ انکی "سچی باتیں" جو اس پرچہ میں بطور شذرات کے ہوتی ہیں ذکر و فکر دونوں کا لطف دیتی ہیں۔ کُل تصانیف کی تعداد پچاس کے قریب ہے جن میں یہ خاص خاص یہ ہیں۔

۱۔ فلسفۂ جذبات۔ انجمن ترقی اُردو (۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء)
۲۔ سائیکالوجی آف لیڈر شپ (انگریزی) ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء لندن۔
۳۔ فلسفۂ اجتماع۔ انجمن ترقی اُردو ۱۹۱۷ء
۴۔ مکالمات برکلے۔ دارالمصنفین۔ ۱۹۱۹ء
۵۔ تاریخ اخلاق یورپ۔ ۲ جلدیں، انجمن ترقی اُردو ۱۹۱۸ء
۶۔ منطق (دارالترجمہ حیدرآباد) ۱۹۱۸ء
۷۔ تاریخ تمدن۔ جلد دوم۔ انجمن ترقی اُردو ۱۹۱۹ء
۸۔ زود پشیمان (ڈراما) الناظر پریس، ۱۹۱۵ء ناظر کے فرضی نام سے۔
۹۔ فرائض والدین نولکشور ۱۹۲۰ء غلام کے فرضی نام سے۔
۱۰۔ تحفۂ خسروی نولکشور ۱۹۲۱ء
۱۱۔ پیام امن۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۳ء
۱۲۔ تصوف اسلام ،، ،، ۱۹۳۴ء
۱۳۔ فیہ مافیہ (ملفوظات مولانا روم) مطبع معارف
۱۴۔ مبادی، فلسفہ، دو حصے مطبع معارف ۱۹۳۷ء
۱۵۔ فلسفیانہ مضامین الناظر بک ایجنسی
۱۶۔ فلسفہ اور اس کی تعلیم ،،
۱۷۔ مثنوی بحر المحبت (مصحفی) مطبع معارف اعظم گڑھ
۱۸۔ سفر حجاز مطبع نامی لکھنؤ
۱۹۔ مقالات ماجد
۲۰۔ ہم آپ۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد
۲۱۔ ترجمہ و تفسیر ماجدی تاج کمپنی لاہور (انگریزی)
۲۲۔ تفسیر ماجدی اُردو تاج کمپنی لاہور ؎
۲۳۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء

۲۴۔ حکیم الامت، نقوش و تاثرات۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء
۲۵۔ محمد علی، ذاتی ڈائری حصہ اول۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء۔
۲۶۔ قصص و مسائل
۲۷۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں
۲۸۔ جغرافیہ قرآنی یا ارض القرآن
۲۹۔ الحیوانات فی القرآن یا حیوانات قرآنی
۳۰۔ تمدن اسلام کا پیام
۳۱۔ تمدنِ اسلام کی کہانی
۳۲۔ اعلام القرآن یا شخصیت قرآنی
۳۳۔ نورانی جہیز
۳۴۔ نشریات ماجد
۳۵۔ انشائے ماجد حصہ اول
۳۶۔ انشائے ماجد حصہ دوم
۳۷۔ شرح چہل حدیث
۳۸۔ بشریت انبیاء
۳۹۔ ترجمہ قرآن انگریزی (بغیر حواشی کے ماڈرن انگریزی میں۔ شائع کردہ تاج کمپنی کراچی)

دریاباد لکھنؤ کے مضافات میں سے ہے اور پھر آپکی پوری جوانی تو لکھنؤ ہی میں بسر ہوئی اس لئے گویا زبان تو یہیں کھلی ہے اور اب بھی جب جی چاہا یا کوئی ضرورت پڑی "حال وارد لکھنؤ" ہو جاتے ہیں۔ اس لئے آپ اُنھیں دریابادی ثم لکھنوی نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہیں۔

مولانا کو پہچاننا بہت آسان ہے، چہرہ بیضوی، کھلتا ہوا رنگ، جواب گندمی ہونے پر مائل ہے، کھدر کا لمبا کرتا اس پر عبا، کھدر کی گاندھی ٹوپی، جس کی چوڑائی

؎ پہلا ایڈیشن سات حصوں میں نکلا تھا۔ دوسرا ایڈیشن صدق جدید بک ایجنسی نے کرایا۔

ول سے زیادہ رہتی ہے، پاجامہ شرعی، متوسط قد، داڑھی
صبح وشام کی آمیزش، خاموش رہیں تو بزرگ فرشتہ
علوم ہوتے ہیں، بولیں تو منہ سے گویا پھول جھڑتے ہیں۔
چھوٹے چھوٹے فقرے، کٹیلے کڑوے جملے، لیکن جامع مانع
جیسے سعدی کی گلستان۔ طبیعت میں مزاح بھی ہے اور
س سے زیادہ طنز بھی اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی لکھنؤ
الا طنز و مزاح پر اُتر آتا ہے تو رعایت لفظی یا ضلع جگت سے
بے چند لفظوں اور فقروں میں کیا کیا گلکاریاں نہیں کر جاتا۔
یہی خصوصیت مولانا کی ہے جیسے آپ اُن کی تحریر اور تقریر
میں کثر پائیں گے۔ یہ رعایت لفظی بعض جگہ تو بہت معمولی ہوکر
حسن نظامی کی سطح پر آجاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر دُور کی
کوڑی لاتی ہے۔ شدت احساس اور شدت جذبات مولانا
کی طبیعت اور تحریر دونوں میں نمایاں ہے۔ محبت و نفرت
پسند اور ناپسند دونوں میں شدت، محبت بڑھ کر عشق و
عقیدت اور پرستاری کی حدوں کو چھونے لگتی ہے اور نفرت
کراہت میں تبدیل ہو جاتی ہے، عقل سلیم اور صدق طلب
ایسے جذباتی بزرگوں کی رہنمائی نہ کرے تو ان کا بھٹک جانا
یا اُن کو بھٹکا دینا مشکل امر نہیں ہوتا، مولانا بحمد اللہ اب
ان تمام منزلوں سے گزر کر اب راہ مستقیم پر بڑی استقامت
کے ساتھ گامزن ہیں بلکہ اب دوسروں کو راہ بتاتے ہیں
اور بتانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ نوجوان طبقہ اور نوجوان
ادیب ان سے محبت اور عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ خائف بھی
رہتے ہیں اس لئے مولانا کی زبان اور قلم کسی کی غلطی کو
بخشتا نہیں ہے۔ لیکن مولانا نوجوانوں پر شفقت اور ہمت
افزائی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، بشرطیکہ وہ ان سے
رجوع ہوں۔ بڑی خصوصیت مولانا کی جرأت و ہمت ہے
وہ کسی سے ڈرتے نہیں ہیں چاہے وہ کسی کی بڑی شخصیت
ہو یا کوئی بڑی حکومت صاف صاف کہنے کا موقع نہ ہوا
تو طنز و طعن ہی سے کلیجہ چھلنی کر دیں گے۔

مولانا موصوف کے ادبی و مذہبی، صحافتی اور علمی
کارناموں کے متعلق تفصیل سے لکھنا دقت طلب بھی ہے اور
وقت طلب بھی۔ دقت یہ کہ وہی شخص اُن کے گوناگوں
کمالات پر قدم اُٹھا سکتا ہے جو خود تقریباً اتنا ہی صاحب
کمال ہو اور وقت طلب یوں کہ مولانا موصوف کی انشاپردازی
میں ساٹھ سال سے زیادہ مدت پر پھیلا ہے۔ چند ہفتوں یا
مہینوں میں اُن کے کمالات کا احاطہ کر لینا محالات میں
سے ہے پھر اُنکی ذات اور شخصیت کے متعلق بھی اعتماد
کے ساتھ وہی شخص قلم اُٹھا سکتا ہے جسے مولانا کا نیاز
صحبت کافی عرصہ تک حاصل رہا ہو۔

مولانا نے جب سے ہوش سنبھالا اُن کے زمانے
میں شبلی، اکبر الہ آبادی کا ادبی دنیا میں طوطی بول رہا تھا،
مولانا محمد علی اپنی تقریروں اور تحریروں کے باعث
سیاسی بساط پر چھائے ہوئے تھے۔ غیر مسلموں میں بھی
ایک سے ایک عالم و فاضل فلسفی، مدبر اور سیاست
داں موجود تھا۔ (جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) معاصرین
میں ابو الکلام آزاد، مولانا سلیمان ندوی، مولانا عبد الباری
ندوی جیسے جید عالم تھے۔ صحافیوں میں ظفر الملک، مولانا
محمد علی، جالب دہلوی، نیاز فتحپوری جیسے اکابر تھے۔ ان
میں سے بہتوں سے مولانا موصوف کے گہرے تعلقات تھے
اور اُن سے برابر خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ اکبر

الہ آبادی، مولانا سلیمان ندوی کے مکاتیب اور مولانا محمد علی و مولانا اشرف علی تھانوی کے متعلق انھوں نے جو اپنے تاثرات شائع کرائے ہیں اُن سے نہ صرف ان بزرگوں کی سیرت و شخصیت کے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ بلکہ اُس عہد کی علمی و تہذیبی زندگی پر بھی پوری روشنی پڑتی ہے کہیں کہیں سیاست کی ہواؤں کے رُخ بھی نظر آ جاتے ہیں اس لئے یہ خطوط تاریخی اہمیت کے حامل بھی کہے جا سکتے ہیں خیال ہے کہ نیاز فتحپوری کے جو مولانا کے مخالفین میں سے تھے اور جوش ملیح آبادی کے جو طبعاً مسلک رندی کے پیرو ہیں مولانا کے پاس ضرور خطوط موجود ہوں گے اگر یہ خطوط بھی شایع ہو سکیں تو شاید گلشن ادب میں کچھ شوخ رنگ اور تیز بو والے پھولوں کی نمایش بھی دیکھنے میں آ سکے۔

مولانا کی تصانیف پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کی شیفتگی ایک طرف تو مذہبیات سے ہے اور دوسری طرف ادبیات سے۔ مذہبی خدمات میں سب سے افضل آپ کا وہ ترجمہ و تفسیر قرآن پاک ہے جو تفسیر ماجدی کے نام سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کے دوسرے اڈیشن کی دو جلدیں (دسویں پارے تک) ابھی تک منظر عام پر آ سکی ہیں۔ قرآن پاک کے ترجمے بہت سے حضرات نے کئے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ اسی وقت قابل قدر ہو سکتا ہے جب مترجم دونوں زبانوں کا ماہر اور اُن کے صرفی و نحوی نکات پر اسے عبور کامل ہو۔ اُردو ایک کم عمر زبان ہے پچیس تیس سال کے بعد اس کے محاورات و روزمرہ میں موجودہ روز افزوں علمی و ادبی ترقیوں کے باعث نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ مولانا موصوف اُردو زبان (خصوصاً مستند لکھنوی دبستان کی) کے ماہر کامل ہیں اور اُس کی نوک پلک سے بخوبی واقف ہیں اس لئے بلا خوف کہا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک کے کئی اچھے اچھے ترجمے ماضی قریب و بعید میں ہو چکے ہیں لیکن تفسیر ماجدی زبان اور بیان کے اعتبار سے اُن تمام کاوشوں کی نئی زمانہ آخری ترقی یافتہ شکل کہی جا سکتی ہے۔

ادبیات میں مولانا کی دلچسپی تنقید سے زیادہ رہی ہے ویسے جوانی میں کچھ شعر و شاعری بھی کی ہے ایک ڈراما بھی لکھا ہے لیکن جلد ہی تخلیقات سے انتقادیات کی طرف آ گئے۔ اور تنقید میں بھی بیشتر آپ کا انداز تقریظی یا توضیحی ہوتا ہے اور اُس میں تفصیل کے بجائے کوشش اس کی رہتی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفاہیم آ جائیں بعض وقت بعض ادبی کارناموں کی شوخ اور رنگین عبارتوں کی بھی اس انداز میں تعریف کی ہے کہ خود مولانا کے اندر رند اسیر بھی وہ زنجیریں توڑتا نظر آنے لگتا ہے جو محتسب مذہبی نے اس کے گرد لپیٹ رکھی ہیں۔

علمی شوق موصوف کو ہمیشہ رہا اور بحمد اللہ آج تک ویسا ہی ہے۔ صرف فلسفہ منطق وغیرہ علوم ہی نہیں جو ابتدا میں اُنھیں شدت سے مرغوب تھے۔ جدید علوم سے بھی واقف رہنے کی سعی رہتی ہے۔ نئی نئی زبانیں مثلاً عبرانی جرمن وغیرہ سیکھنے کا بھی شوق ہے ہر چند کہ ابھی دو سال ہوئے مولانا کی رفیقۂ حیات کی دائمی جدائی نے انکی دلچسپی خود زندگی سے بہت کم کر دی ہے لیکن اُن

کی پابندی اوقات (جس پر مولانا شدت سے عامل ہیں) اور علمی شغف اس صدمہ جانکاہ کو وقتی طور پر ٹہلائے رکھتا ہے اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ مولانا تحقیق علمی میں کسی بات پر ضد کے ساتھ قائم رہیں ایسا نہیں ہے وہ مخالفین کی بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ مخالفت مذہبی مسالک میں ہو یا ادبی امور میں۔

اگرچہ مذہبی اور خصوصاً فقہی مسائل میں وہ کسی اجتہاد کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو کبھی تیار نہ ہوں گے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ کسی بدعت کو برداشت نہیں کرسکتے اور آجکل جبکہ مختلف تہذیبی اور سیاسی اثرات کے تحت کئی مذہبی، نیم مذہبی بدعتیں سر اٹھانے کو تیار رہتی ہیں مولانا کا قلم ایسے مواقع پر سختی سے سخت محتسب کے فرائض انجام دینے لگتا ہے اور آج کل کے ہندوستان میں جبکہ ملت اسلامی کے گمراہ ہوجانے کے بہت سے خطرات درپیش ہیں مولانا کا وجود بسا غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر مولانا آدمی بڑی محبت والے ہیں کوئی آپ کی طرف ایک قدم بڑھے تو آپ دس قدم بڑھنے کو تیار، آج کل کی روزافزوں مادہ اور مطلب پرستی کی دنیا میں ایسے پابند اوقات اور ایسے صدق و صفا رکھنے والے بزرگ عنقا ہوتے جارہے ہیں۔ خدا موصوف کو عرصہ دراز تک زندہ و سلامت رکھے! ان کی حیات کے پہلو اتنے گوناگوں ہیں کہ "فروغ اردو" کے چند مختصر سے صفحات میں ان کی سمائی ناممکن ہے۔

مولانا عبدالماجد کی تنقیدی بصیرت

بقیہ صفحہ ۱۰۰

پروفیسر احتشام حسین

نہیں ہے۔ ذہن بھی ان کا ساتھ دیتا ہے۔ مولانا عبدالماجد عربی اور فارسی کے عالم ہیں فلسفہ اور نفسیات کے ادق مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن ان کے اسلوب میں دشوار پسندی اور غرابت بیان کا شائبہ بھی نہیں۔ اخباروں کی خبروں پر حاشیہ آرائی ہو کسی "بڑے آدمی" پر نکتہ چینی ہو، کسی کانفرنس کا اجتماع کے لئے چند سطروں کا پیام ہو کسی مشہور ادیب کی تخلیق پر تبصرہ ہو، کوئی معمولی ادبی لطیفہ یا چٹکلا ہو مولانا کے قلم سے چھو کر رنگین اور شگفتہ بن جاتا ہے اسلوب کی یہی ادبیت ہے جو کسی منزل پر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا معاصرانہ چشمکوں میں یہی اسلوب اپنی سادگی اور وقار کے ساتھ تیر و نشتر بنتا ہے اور تعزیت کے پیغاموں میں آنسو اور مرہم، سفرناموں اور ڈائریوں میں، اسی سے مصوری ہوتی ہے اور مذہبی مقالات میں عقیدے کی گرمی سے تابناکی پیدا ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تنقیدی نظر دیانت سے ہاتھ آئی ہے اس میں مطالعہ و ذہانت، ذوق سلیم، قدرت بیان اور صحیح ادبی مذاق کی آمیزش نے ایسی انفرادی شان پیدا کی ہے جسے تخلیقی تنقید کے دائرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ بہت سے دوسرے علمی کاموں سے قطع نظر مولانا دریابادی اپنے اد(بی) اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔

بچوں کا ادب

اُردو میں بچوں کے ادب کی ویسے ہی کافی کمی ہے پھر نظم میں تو گویا بچوں کا ادب نہیں کے برابر ہے صرف دو چار شاعر ہیں جو بچوں کے ادب میں اضافہ کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے ہیں جن میں۔

جناب اخگر مشتاق رحیم آبادی

کا نام بہت نمایاں ہے

"سرفراز" لکھنؤ

پیاری نظمیں

اخگر مشتاق کی دلچسپ نظموں کا خوبصورت مجموعہ جسے بچوں کی دنیا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے

۳۵ پیسے

اچھی نظمیں

بچوں کے لئے "اخگر مشتاق" کا دوسرا مجموعہ جو دلچسپی اور افادیت کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہے

۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو، ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

ضروری اطلاع

ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ کی شائع کردہ وہ کتب جو کہ عرصے سے نایاب تھیں اب طبع ہو کر منظر عام پر آگئی ہیں۔

طلب کیجے

تنقیدی جائزے	سید احتشام حسین	قیمت	٦/٥٠
میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	"	٦/٥
پیسہ اور پرچھائیں	"	"	٦/٥٠
بہادر شاہ ظفر مع	امیر احمد علوی	"	
منتخب کلام بہادر شاہ		"	٥/-
یادگار انیس	امیر احمد علوی	"	٣,٥٠

یعنی انیس کی یاد میں ایک جدید تحفہ

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

مولانا عبدالماجد دریابادی
اکبر کی نظر میں

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت اور نگارشات پر لکھنے کے لئے بڑی قابلیت، علمیت اور صلاحیت کی ضرورت ہے۔ ان کی ہمہ گیر علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، سماجی، قومی، اور اسلامی معلومات اور فلسفہ، منطق، علم کلام، جیسے دقیق علوم پر ان کے تبحر پر قلم اٹھانا مجھ جیسے مبتدی اور ناآشنائے علم و ادب کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ وہ علم و ادب، فلسفہ و مذہب کے بحر بیکراں کے ایسے باکمال غواص ہیں، جنھوں نے اوائل عمر سے اب تک نہ معلوم کتنے بیش قیمت اور نادر موتیوں کو نکالا ہے جن کی آب و تاب سے اردو ادب جگمگا رہا ہے۔ یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے اس دور میں انکی ہستی ہی 'بحر العلوم' کہے جانے کی مستحق ہے۔

ان کا ورثہ اور ماحول دونوں علمی و ادبی رہا۔ اور ان دونوں سے بڑھ کر خود ان کا ذوقِ ادب وشعور ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتا رہا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انھوں نے گرانقدر مقالے لکھ شروع کر دیے۔ مشاہیر ادب، رہنمایان ملک ملت سے ملنے کا انھیں ہمیشہ کا شوق رہا

لسان العصر اکبر الہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کا سبب یہی شوق تھا، مولانا جب بی۔اے کا امتحان دینے مارچ ۱۹۱۲ء میں الہ آباد تشریف لے گئے اسی زمانہ میں اکبر الہ آبادی سے ملنے گئے، مولانا اس ملاقات کا حال خود لکھا ہے، فرماتے ہیں

"مجھے شرف نیاز ۱۹۱۲ء میں حاصل ہوا، مہینہ غا مارچ تھا یا شاید اپریل ہو۔ میں بی اے کا امتحان دینے لکھ الہ آباد گیا ہوا تھا۔ (لکھنؤ اس وقت یونیورسٹی سے محروم تھا ڈگری کے امتحانوں کیلئے الہ آباد جانا ہوتا تھا) وہیں حضرت اکبر کی خدمت میں پہلی بار حاضری دی۔ مرحوم کا سن ۶۶ کا تھا۔ شہرت کا آفتاب عروج کو پہنچا ہوا اور میں اپنی ع بیسویں سال میں سلسلہ مراسلت ایک سال بعد ۱۹۱۳ء شروع ہوا اور آخری سال تک برابر قائم رہا۔ کچھ خطوط ضائع بھی ہو

قریباً دوسو محفوظ رہ گئے مدت مراسلت آٹھ نو سال رہی۔
ابتدائی مکاتبت کے وقت میں فلسفی قسم کا دہری تھا ۱۹۱۹ء سے خطوط کا رنگ بدلا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں حضرت کی وفات کے وقت میں بحمد اللہ پورا مسلمان تھا۔

اس اصلاح حال میں کسی حد تک دخل حضرت اکبر کی شخصیت و تعلیمات کو بھی ہے۔ تبلیغ بڑے مزے سے کرتے رہتے۔ میٹھے، دلنشین اور موثر انداز میں۔ سننے والے کو پتہ بھی نہ چلتا اور وہ دین کی محبت یا وقعت دل میں بٹھاتے چلے جاتے۔ اس کے دلچسپ نمونے ان صفحات میں کثرت سے اور بار بار ملیں گے۔ اکبر شاعر اور ظریف شاعر سے پہلے، کہیں پہلے، مومن اور مومن گر تھے[۵]۔

خطوط کی تفصیل سنہ وار حسب ذیل ہے:۔

- ۲۹ راگست ۱۹۱۳ء تا ۱۲ ر اکتوبر ۱۹۱۳ء = تعداد ۱۳
- چودھواں خط بغیر تاریخ ۱
- ۹ رمئی ۱۹۱۴ء۔ ۲ ردسمبر ۱۹۱۴ء (۱۵ تا ۲۷) ۱۳

ستائیسواں خط بغیر تاریخ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ آخر دسمبر ۱۹۱۴ء کا ہوگا۔

۱- ۵ رجنوری ۱۹۱۵ء۔ ۱۹ راکتوبر ۱۹۱۵ء (معہ تلہ) ۲۸ تا ۴۵ = ۱۸
- ۶ رجنوری ۱۹۱۶ء ۲۱ ردسمبر ۱۹۱۶ء ۴۶ تا ۷۱ = ۲۶
- ۳ رجنوری ۱۹۱۷ء ۲۰ رنومبر ۱۹۱۷ء ۷۲ تا ۹۱ = ۲۰
- ۶ رجنوری ۱۹۱۸ء ۱۳ ردسمبر ۱۹۱۸ء ۹۲ تا ۱۰۸ = ۱۷
- ۲ رجنوری ۱۹۱۹ء ۳۱ ردسمبر ۱۹۱۹ء ۱۰۹ تا ۱۴۷ = ۳۹
- یکم جنوری ۱۹۲۰ء ۱۱ ردسمبر ۱۹۲۰ء ۱۴۸ تا ۱۷۷ = ۳۰
- ۱۲ رجنوری ۱۹۲۱ء ۱۳ راگست ۱۹۲۱ء ۱۷۸ تا ۱۹۷ = ۲۰

۱۹۷

لیکن خطوط کی کل تعداد ۱۹۶ ہے اگرچہ خطوط مشاہیر کے دونوں ایڈیشنوں میں (پہلا مطبوعہ تاج کمپنی لاہور اور دوسرا نسیم بکڈپو لکھنؤ) خطوط کی تعداد ۱۹۷ ہی ہے مگر تاج کمپنی کے ایڈیشن میں خط نمبر ۱۲۴ صفحہ ۵۸ اور خط نمبر ۱۳۶ صفحہ ۱۶۹ حرف بحرف ملتے ہیں۔ نسیم بک ڈپو ایڈیشن میں یہ تکرار نہیں ہے۔ اس کمی کو موخر الذکر ایڈیشن میں خط نمبر ۱۸۴ کے بعد ۱۸۵ کے بجائے ۱۸۶ لکھدیا ہے۔ اس طرح خطوط کی تعداد ۱۹۶ کے بجائے ۱۹۷ ہوگئی۔

یہ خطوط اہم بھی ہیں اور مفید بھی۔ ان سے مولانا عبدالماجد کی سیرت و شخصیت اور علمی و ادبی بصیرت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ شروع ہی سے مولانا کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، فلسفہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ تحقیق و تلاش سے انھیں رغبت تھی، مغربی فلاسفروں کی کتابوں کے ترجمے کرنے اور اُردو میں فلسفیانہ اصطلاحات وضع کرنے میں انھیں خاص انہماک تھا۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا ذہنیت کا غلبہ تھا، اکبر کی مردم شناس نظر نے ذہن و دماغ کے اعتبار سے عبدالماجد فلسفی کو پہچان لیا تھا کہ اس نوجوان کے سینہ کے اندر حقیقت و صداقت کا متلاشی دل موجود ہے، اور ایک نہ ایک دن یہی گمراہ کن فلسفیانہ خیالات اس کو اسلام کی حقانیت اور صداقت پر ایمان لانے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کے محرک ہوں گے۔ ان کو یہ بھی یقین تھا کہ یہ نوجوان مستقبل قریب میں علم و ادب کا نیر تاباں ہوگا اور وہ ادبی و مذہبی دنیا

[۵] دیباچہ خطوط مشاہیر صفحہ ۳۷۔ ۳۸
(تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل ریلوے روڈ لاہور)

روشن کرے گا۔ پہلے ہی خط میں لکھتے ہیں۔

"ایک ایسے قابل اور فاضل اور شائق تحقیق ہونہار نوجوان کی طرف جیسے کہ آپ ہیں کیونکر نہ دل کھنچے۔ آپ کے سامنے نہایت مشکل اور عظیم الشان کام ہے اور اس وقت اور اسی جماعت میں آپ کے مذاق اور آپ کے معلومات نے آپ کو اس کا اہل کیا ہے۔ ہم لوگوں کو حق نہیں ہے کہ بغیر شرکت اور ذمہ داری کے آپ کو ٹوکیں۔ ہاں مشورت مطلوب ہو تو حاضر رہنا چاہئے۔ تو خیر کچھ الفاظ کا مرتب اور یکجا کرنا ہے اللہ آپ کا علم اور آپ کی عمر زیادہ کرے امید تو یہ رکھنی چاہئے کہ عالم معانی میں آپ کے ذریعہ سے طبع انسانی کو فائدہ ہوگا اور بالآخر آپ کسی بڑے اور مفید نتیجے پر پہونچ کر اس کو اپنی صفائی بیان سے روشن کریں گے۔ میں تو آپ سے ملنے کا مشتاق رہتا ہوں بہت سے امور میں جن پر آپ کی توجہ رجوع کروں، اور اپنی تسکین کے لئے آپ سے اظہار خیال چاہوں۔"[1] آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"مغربی فلاسفروں کو (بعض مباحث میں) آپ نے ماشاء اللہ خوب اسٹڈی کیا شاید ہی کوئی آپ کا مقابل ہو۔ آپ کو اتنی فرصت ملے کہ آپ کا باطنی فلاسفر اوراق لیل و نہار کو دیکھ کر ہمارے سامنے ایک ادبی مجمل تصنیف یا کم سے کم مغربی فلسفے یا عام فلسفے کا تعارف کرے۔"[2]

اسی طرح قریب قریب ہر خط میں اکبر مرحوم نے مولانا عبدالماجد کے علمی و ادبی انہماک۔ صحت مند عالمانہ خیالات اور ان کی فلسفیانہ تحقیق و اصطلاحات کو سراہا ہے اور قلبی و روحانی مسرت کا اظہار کیا ہے بہت سے خطوط میں علمی مشاغل کی اہمیت اور تحریر کی ضرورت سے اتنے زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں کہ بے ساختہ دعائیں دینے لگتے ہیں، یہاں کچھ خطوط سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"خدا آپ[1] کو ترقیات ظاہری و باطنی عطا کرے اور آپ اس مصرعہ کے مصداق ہوں ع

ستارہ بدرخشید و ماہ مجلس شد

اکبر مرحوم کی یہ تمنا پوری ہوئی، ستارہ چمکا اور نہ صرف ماہ مجلس بلکہ "زیب انجمن علم و دانش" بھی ہوگیا مولانا فلسفیانہ اصطلاحات انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے رہتے تھے۔ ان ترجموں پر اخبارات و رسائل میں بحث بھی ہوتی رہتی تھی، الہلال میں ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اکبر الفاظ سے زیادہ معانی پر نظر رکھتے مولانا کو لکھ رہے ہیں "خدا کرے آپ جلد الفاظ کے پھندے سے رہائی پائیں۔ آپ کے ذہن کو عالم معانی کے بالاتر درجوں میں مصروف ہونا چاہئے لیکن یہ سچ ہے کہ بغیر الفاظ کے کام نہیں چلتا۔"

اس کے بعد والے خط میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اکبر بعد میں مولانا کی رائے سے متفق ہوگئے مولانا نے اکبر کی تسکین کے لئے خط میں کچھ لکھا ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

[1] اللہ اللہ یہ ۶۷ سال کی عمر کا فاضل فلسفی و شاعر ۲۱ سال کے لڑکے نوخیز سے خطاب کر رہا ہے حد ہے انکسار و تواضع کی (ماجد)

[2] خط نمبر ۱ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۱۳ء صفحات ۴۱ ، ۴۵

[1] نمبر ۴ صفحہ ۵۲ ۱۲ ستمبر ۱۳ء

"آفتابِ[1] علم آپ اب بھی ہیں۔ خدا کا فضل شامل حال رہا۔ تو عمر و عروج کے ساتھ آپ کی شعاعیں زیادہ ہوتی جائیں گی۔ رسائی میں زیادہ ہوں گی۔ اب عقلوں تک پہونچتی ہیں تو آئندہ دلوں تک پہونچیں گی۔"

مولانا نے اپنی پہلی کتاب فلسفۂ جذبات ہدیۃً بھیجی ہے۔ اس کے متعلق اکبر لکھتے ہیں۔

"آپ کی محنت اور توجہ نہایت ستائش کے قابل ہے۔ اُردو زبان میں یہ بہت قیمتی علمی اضافہ ہے خدا آپ کو علمی ترقیاں نصیب کرے۔ سخن دلکش بہت ہیں۔ سخن سنجیدہ کے لئے بہت سمجھ چاہیئے میرا ایک مطلع سن لیجئے۔ ہے تو ادبی رنگ، لیکن کچھ حظ حاصل کر سکیں گے۔ ؎

بہت دشوار ہے شائستہ راہِ طلب ہونا
نظر کو حد میں رکھنا شوقِ دل کا با ادب ہونا[2]

الحمد اللہ کہ آپ صرف تحریر میں خطِ اقلیدس ہیں، برتاؤ میں شاخِ گل ہیں۔ خدا روز افزوں ترقی نصیب کرے۔

آپ کے طالب علمانہ مذاق نے آپ کی طرف دل کھینچا اور آپ کی برادرانہ محبت نے[3]

اکبر نے ۶ر اگست ۱۵ء کو اپنا یہ شعر ؎

دنیا میں جسے جو پیش آیا اکبر
بس اسکے متعلق اسکی حالت بھی ہوئی

لکھ کر بھیجا۔ مولانا نے اس شعر کی بڑی داد دی اور

فلسفیانہ خیالات کو صفائی بیان کے ساتھ شعری سانچے میں ڈھالنے کی تعریف کی۔ مولانا نے غالباً یہ بھی لکھا کہ آپ کے فلسفیانہ اشعار کا انتخاب کر لیا جائے۔ اکبر لکھتے ہیں :۔

"خیال انتخاب[4] جو آپ کے ذہن میں گذرا ہے نہایت اچھا ہے، مفید ہے، ہر پہلو سے فلسفے کے لئے آپ سے بہتر کوئی انتخاب کرنے والا میرے لئے نہیں ہے۔ ملاقات ہوگی (بشرط زندگی) تو مفصل گفتگو ہوگی لیکن آپ لوگ شروع کر سکتے ہیں حصہ سوم جو زیرِ طبع ہے وہ بھی ہوا چاہئے

ان دعائیہ فقروں پر خط ختم کرتے ہیں :۔

"زمانہ مساعدت کرے تو آپ مشاہیر سلف کے برابر ہو سکتے ہیں۔ بہرکیف آپ کا نور باطن آپ کے سرور کے لئے کیا کم ہے۔"[5]

مولانا نے اپنی دوسری کتاب فلسفۂ اجتماع بھیجی تو شکریہ کے خط میں لکھتے ہیں :۔

"فلسفۂ اجتماع کا شکر گزار ہوں۔ جب ملاقات ہوگی تو اس کی نسبت کچھ کہوں گا آخری فقرے خوب ہیں۔ ان کو دیکھ کر میں نے یہ مطلع کیا ؎

زباں پہ کیا ہو تری حمد اور ثنا کے سوا
مجھے تو کچھ نظر آتا نہیں فنا کے سوا[6]

مولانا لکھتے ہیں کتاب ملحدانہ فلسفہ کے رنگ میں تھی لیکن بالکل آخر میں یہ مضمون درج تھا کہ تحفظ و بقا، سطوت کی ساری تدبیروں کے بعد بھی بالآخر فنا ہر بڑے سے بڑے لیڈر کو ہے بقا و ثبات کسی کو بھی نہیں۔"

[1] نمبر ۹۔ صفحہ ۵۹۔ ستمبر ۱۹۱۳ء [2] نمبر ۱۶ صفحہ ۶۴ ۲۸ مئی ۱۹۱۳ء۔ [3] نمبر ۱ صفحہ ۶۵ ۱۳ر مئی ۱۹۱۳ء

[4] خط ۹ صفحہ ۸۰ [5] خط ۱۰، صفحہ ۸۲ [6] ۴ر فروری ۱۹۱۶ء

اس کے بعد دوسرے خط میں اسی فلسفہ اجتماع
کی نسبت لکھتے ہیں :-

"آپ نے مضمون فنا پر خوب خاتمہ کیا ہے۔ یہ رنگ
بہت خوب ہے انشاءاللہ آپ کو اطمینان دے گا امید ہے کہ
آپ کی سمجھ بہت بلندی پر پہونچائے لیکن مشکل ہے کہ
میں اس کی تعریف و توضیح کر سکوں"۔

چند فقرات کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنی
عمر سے زیادہ پختگی دکھائی ہے۔ میرا ایک مصرعہ ہے

سچ ہے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہمسن کر نہیں سکتیں

صحیح ہے کہ آپ میں ڈگری کی برکت نہیں ہے بلکہ فطرتی
نقطۂ ہستی کا ظہور ہے [1]

اکبر مرحوم خوب سمجھ گئے تھے کہ مولانا ماجد سیدھی سمجھ
کے مالک ہیں اور یہی سمجھ ان کو بہت جلد بلندی پر پہنچا دیگی
اس کیلئے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ قرآن پاک کا زیادہ سے زیادہ
مطالعہ کیا جائے۔ مولانا کو مشورہ دے رہے ہیں "قرآن شوق
سے دیکھیے، خوب دیکھیے یہاں تک کہ بلا مدد ترجمہ اسکے ظاہری
معنی سمجھنے لگے۔ تفسیر کی تو حد نہیں۔ مذاق مفسرین کی بوقلمونی حیرت
انگیز ہے قرآن مجید کو بطور تلاوت پڑھا کیجیے۔ ایک سرے سے
پڑھ جائیے ثواب کا عقیدہ نہ صحیح، لٹریری لطف و ذوق کا خیال
کیجیے ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی کسی وقت کوئی آیت دل
کو متوجہ کر سکے گی، مزا آئے گا یا کوئی مسئلہ منکشف ہوگا جو اس وقت
یا اسکے بعد ذہن میں رہے کبھی وقت اسی طرح کوئی اور آیت
دامن دل کو کھینچے گی۔ غور اور اسٹڈی اور کریٹیسزم
(criticism) اور مضمون نگاری کے لئے
قرآن مجید کو خاص طور پر پڑھا۔ بجا حسب مرضی دیکھنے کا
کوئی اور وقت نکالئے۔

پیغمبر صاحب کو اس بات کا یقین تھا یا نہیں
ایک بحث، وہ یقین صحیح تھا یا نہیں دوسری بحث پہلی
بات کا فیصلہ کرنے کے لئے بہت غور ضروری نہ ہوگا۔
لیکن کل پڑھنا چاہیئے اور بار بار خدا قرآن کی رُو سے
قادرِ مطلق اور خالق کائنات ہے۔ ارسطو کے خدا سے
کیا واسطہ ارسطو میں (Generalisation)
اور (classification) کی بے حد
قوت تھی لیکن میں نے کسی فلاسوفر کو نہ دیکھا کہ اس
کے معاصرین نے یا پیچھے آنے والوں نے اس کی تردید
نہ کی ہو۔

صدیوں فلاسوفی کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

میں خدا کا نام تو جانتا ہوں، خدا کا خیال ناممکن پاتا
ہوں، ماسوا پیشِ نظر ہے، جہاں اس کا خیال آیا،
خیالی خدا غائب ہو گیا۔ عزت فنا، اسی سے دل کو ایک
مزا ہے۔ مزا حسب استعداد بہت بڑھ جاتا ہے۔ مُقر
حبیب ہے۔ منکر کو خبر نہیں باقی مشغلِ زندگی ہے، وقت
کی خانہ پُری ہے، داد پانے کا مزا ہے، پیٹ کا دھندا
ہے۔ پھر خط لکھوں گا۔ تھک گیا آپ کی محبت کو اللہ
قائم رکھے، مجھ کو کوئی حق نہیں ہے۔ بے تکلف لکھدیا۔
ورنہ میں آپ سے برسوں سبق سیکھنے کے لئے موجود ہوں
محتاج ہوں [2]

اکبر کے اس خط اور اس کے بعد والے خطوط کے متعلق
مولانا عبدالماجد خود تو شذرہ میں لکھتے ہیں "ان مکتوبات کو پڑھتے
وقت یہ خوب ذہن میں رہے کہ میں اس وقت ایک ملحد بلکہ داعی الحاد کا
فلسفہ کا خوشہ چیں، البتہ عربی زبان تھوڑی بہت کالج میں پڑھ لی۔

---

[1] خط ۹م صفحہ ۸۹ ۹ فروری ۱۹۱۶ء

ہے۔ حضرت اکبر نہایت لطیف انداز سے ایک ملحد کو تبلیغ کر رہے ہیں۔

میں نے الحاد کی ترنگ میں ایک بار یہ لکھ مارا تھا کہ ارسطو کے خیال کے مطابق خدا کو محض علت العلل یا علت اولیٰ ماننے پر کیوں نہ اکتفا کی جائے اور قرآن سے غالباً یہ پہلو نکل آسکے، یہ مکتوب اور اس کے بعد کا اسی لغو خیال کی تردید میں آیا۔

دوسرے ہی خط میں یہ مخلصانہ عذر پیش کیا اور معذرت خواہ ہوئے[1]:

کل میں نے بہت بے تکلفانہ آپکو خط لکھا لیکن معافی چاہتا ہوں۔ بہت کچھ IRRELEVENT غیر متعلق ہے آپ اپنا کورس خود خوب سمجھتے ہیں جو لکھا وہ سب واپس لیتا ہوں۔ بجز اسکے کہ قرآن مجید میں صرف PRIME MOVER نہیں (یعنی محرک اول، علت اولیٰ) بلکہ خدا قادر مطلق ہے۔ سورۂ رحمان میں کُلَّ یومٍ ھُوَ فی شان۔

ملاحظہ فرمائیے اس کے سوا صدہا آیتیں ہیں

نواب کے یہ معنی بھی سمجھئے کہ دل کو انبساط ہوا، کسی مسئلہ کا انکشاف ہوا...... آپ اس دور میں ان چند لوگوں میں ہیں جن کو دنیا امتیاز کے ساتھ یاد رکھے گی۔ خدا آپ کو تندرست رکھے اور اطمینان عطا فرمائیے۔[1]

اسی زمانہ میں خواجہ حسن نظامی نے مولانا کے متعلق اکبر کو خط لکھا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔[5]

اکبر جواب میں لکھتے ہیں :-

ماجد میاں کے باب میں آپ کے خیال سے مجھکو اتفاق ہے۔ ماجد کے اس کہنے پر کہ میں خدا کو نہیں جانتا، اتنا غصہ نہیں آتا، جتنا غیر ماجد کے اس کہنے پر غصہ آتا ہے کہ میں آپ سے زیادہ خدا کو جانتا ہوں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ میں خدا کو جانتا ہوں لیکن مانتا نہیں۔ ادھر مجبول اور ہے، ادھر خیرہ سری خیر صاحب۔

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست[2]

مولانا کا ایک مضمون "حکمار جرمنی اور مسئلہ وا[..]" کے عنوان سے ماہنامہ افادہ حیدرآباد میں شائع [ہوا] اس کی نسبت اکبر مرحوم فرماتے ہیں :-

واجب الوجود میں آپ نے خوب لکھا ہے اگرچہ شلنگ (Shelling) وغیرہ کی باتیں ہیں لیکن آپ کے منہ سے واجب الوجود اور ایسے اور الفاظ کا سننا بھلا معلوم ہوتا ہے۔[3]

فلسفہ کے غلط اثرات اور نتائج سے اکبر کس خوش اسلوبی کے ساتھ خبردار کر رہے ہیں :-

[4] فلسفہ نے اگرچہ آپ کے اجزائے طبیعت کو مستحکم و مضبوط کر دیا ہے، لیکن آپ موتی ہیں پتھر نہیں ہیں۔ خدا موتی کی آب کو برقرار رکھے۔ آمین۔[4]

مولانا اور مولانا سید سلیمان ندوی سے اکبر دور[..]

---

[1] خط ۵۱ - ۹۱، ۹۲ - ۲۲ فروری ۱۹۱۶ء
[5] [..] ۱۳ فروری ۱۹۱۶ء صفحہ ۲۶

[3] خط ۵۵ صفحہ ۹۵
[4] خط ۵۸ - ۹۸ ۱۲ جون ۱۹۱۶ء

تحریک کی تھی اور راجہ صاحب محمود آباد نے شاہانہ
...راد کا وعدہ کیا تھا۔ یہ خبر اخبارات میں شائع
...ئی اور اکبر کی نظر سے گذری۔ اسی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

اس لحاظ سے آپ اور سید سلیمان صاحب ٹھیک
راہ پر ہیں۔ سب کچھ ہو جائے۔ یہ خدا ہی کے ہاتھ
ہے دو شعر بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ۔

خدا نے جو غیرت عطا کی ہو تم پر
تو ملت کے اعلیٰ مقاصد کو دیکھو

(ابو الحرجی) راجہ صاحب کو سمجھو
مذاق سلیمانی و ماجد کو دیکھو

اس کے اول اور آخر اشعار بھی کبھی سنیئے گا۔

کاش ماجد اینڈ کو دو ایک دن کو یہاں
تشریف لاتے، میرے مہمان ہوتے۔ ٹریولنگ اکسپنس
کل میرے ذمہ۔ علمی بحث نہ سہی، شاعرانہ گپ بھی
آپ کی کمپنی کے لئے بالکل بے مزہ نہ ہوگی۔ آپ
میں تو شاید ابھی طالب العلمانہ ترنگ اور بے تکلفی
کچھ باقی ہے۔ سید سلیمان صاحب کا حال معلوم
نہیں۔[۵]

راجہ صاحب نے کسی وجہ سے اُردو انسائیکلوپیڈیا کے
لئے امداد دینے کا خیال ترک کر دیا۔ اکبر مرحوم کو
جب یہ علم ہوا تو انھوں نے مولانا کو لکھا:۔

مجھ کو اسی قدر دریافت ہوا تھا کہ امداد
انسائیکلوپیڈیا کی نسبت راجہ صاحب کی آمادگی
نہ رہی۔ بہر کیف اللہ نے آپ کو ایسی قابلیت
عطا کر دی ہے کہ عمدہ اور معزز شغل میں وقت
کٹے امید ہے کہ ایسی کی محتاجی بھی نہ ہو۔ اہل علم
(لٹریری مین) اکثر زیادہ دولت مند نہیں ہوتے
لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کے اطمینان اور
خوشحالی کا وقت آنے والا ہے۔[۶]

مولانا نے افلاطون کی مشہور کتاب
(Republic) کا اُردو میں ترجمہ کرنے کا
ارادہ کیا چند ورق ترجمے بھی کئے۔ اس مفید شغل پر
اکبر مبارک باد بھی دے رہے ہیں اور دعائیں بھی۔

آپ کو موجودہ شغل مبارک ہو۔ آپ کی قابلیت
دیکھ کر زمانہ رضامند ہو گیا کہ آپ کو ۱۹۱۶ء کی
سیکنڈ دے اور بزم افلاطون میں آرام کرنے کی اجازت دے۔
خدا آپ کو اعلیٰ مدارج ترقی باطنی پر پہنچائے۔[۷] یہ ترجمہ
کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا۔ مولانا لکھتے ہیں اس وقت افلاطون کی
مشہور کتاب (Republic) کے ترجمہ کا ارادہ تھا
چند ورق کے بعد کام رک گیا۔

مولانا نے برکلے کے DIALOGS مکالمات کا
ترجمہ کرنا شروع کیا اکبر کو اطلاع ہوئی، بہت خوش
ہوئے، فوراً خط لکھا:۔

"میں خوش ہوا کہ آپ برکلے کا ترجمہ کر رہے
ہیں آپ کو خود انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچے گا
بشرطیکہ آپ کو اس کی پروا ہو۔ میرا مطلب باطنی
فائدے سے ہے ہم نے اور تم نے کیا قریباً وہ سب
جن کو ہم نے دیا نامہ برکلے کی تقریر کو صحیح دلنشیں

---

[۵] خط ۷۰ ۔ ۱۰۹ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۶ء
[۶] خط ۷۵ ۱۱۳ ۲ فروری ۱۹۱۷ء
[۷] خط ۷ صفحہ ۱۱۴ ۲۲ فروری ۱۹۱۷ء

پاتے ہیں۔ ہمارے تصوف کی کامل تائید ہے کوشش کیجئے گا کہ بیان صاف ہو۔ ابوالکلامی نہ ہو.....

خدا وہ وقت لائے کہ آپ کی تصنیفات الماریوں سے سینوں میں اور سینوں سے زبانوں پر پہونچیں"۔[۱]

مولانا نے اکبر کے اشعار کی داد دی ہے، اکبر فخر کے ساتھ لکھ رہے ہیں:۔

میرے اشعار کی نسبت آپ کا حسن خیال میرے لئے باعث فخر ہے جیسا آپ نے فرمایا انتخاب ہو تو حال کھلے۔ آپ سے ملنا ہوا تو گفتگو ہوگی۔[۲]

مولانا کی خدمات حیدرآباد نے حاصل کرلیں اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کو بھی حیدری صاحب نے بلا لیا اس زمانہ میں اقبال مرحوم، تصوف، پر اپنے خیالات کا اظہار کررہے تھے جو مختلف رسائل میں شائع ہو رہے تھے۔ اکبر مرحوم ان کے خیالات سے متفق نہیں تھے اور مولانا کو اپنے خیالات لکھتے رہتے تھے۔ اس خط میں اقبال مرحوم کے تصوف پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا کو لکھتے ہیں:۔

"آپ حکما اور فلاسفروں کے گروہ میں ہیں۔ ہم لوگوں سے محبت سے پیش آتے ہیں۔ اس سبب سے ایک تعلق دلی آپکے ساتھ ہے ورنہ دنیا ہو چکی۔ بیکار محض ہیں[۳]

اکبر مرحوم کو حیدرآباد کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ خیریت معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے اسلئے انھوں نے مولانا کے بڑے بھائی مولوی عبدالمجید مرحوم کو مبارکباد دیتے ہوئے خط لکھا اور ماجد میاں کا پتہ پوچھا۔

عزیزی عبدالماجد صاحب جا چکے ہوں گے الحمدللہ کہ صورت معقول پیدا ہوگئی۔ عزت ناموری کا کام ہے بشان علم قائم ہوگی۔[۴]

اکبر خط لکھ بھی نہ پائے تھے کہ مولانا کا خط جواب میں لکھتے ہیں۔

علم و دانش کے ساتھ یہ سنجیدگی ہر ایک کے حصہ میں نہیں ہے آپ خوش نصیب ہیں کہ دلوں میں آپکی جگہ ہے.....

مصطلحات علوم و فنون کو جمع کرتے رہئے۔ لاجواب اور ضروری مجموعہ ہوگا۔[۵]

مکالمات برکلے کے ترجمے کی پہلی قسط معارف عظم میں شائع ہوئی، اکبر نے داد دی :۔

"مکالمات برکلے کے ترجمے کی داد دیتا ہوں لیکن میری داد کی کچھ ضرورت نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اسوقت فلسفیانہ رنگ میں آپ سے زیادہ صاف اور سلجھی ہوئی طبیعت کسی کی نہیں پاتا۔ بیان میں کچھ پیچیدگی ہو تو اصل مدعا ہی پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ افسوس یہ کہ پڑھنے والے اور سمجھنے والے اور فائدہ اٹھانے والے بہت کم ہیں، آئیں کہاں سے؟ میں روحانی داد دیتا ہوں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ باوجود ظاہری بیگانگی کے خدا معلوم کیوں آپکی طرف مائل ہوتے اور میں بھی کچھ ایسا ہی ہوں۔[۶]

---

[۱] خط ۸۲ صفحہ ۱۲۱ ۳ جون ۱۹۱۶ء
[۲] خط ۸۵ صفحہ ۱۲۳ ۶ اگست ۱۹۱۶ء
[۳] خط ۸۹ صفحہ ۱۲۹ یکم ستمبر ۱۹۱۶ء
[۴] خط ۸۹ الف ۸ ستمبر
[۵] خط ۹۲ الف صفحہ ۹۱-۱۳۱ ۲۰ نومبر
[۶] خط ۹۳ " ۱۳۲ ۶ جنوری ۱۹۱۷

مولانا کا ایک مضمون "حالی کا رنگِ تغزل" رسالہ حیدرآباد میں شائع ہوا اکبر نے پڑھتے ہی لکھا:

"... آپ نے جو لکھا وہ بات آپ کی تحریر بھی ... آ گئی ہے۔ اس مضمون میں قسلم ... نے آخر میں میرا نام بھی ساتھ ... وشفقت کے ساتھ لکھ دیا ہے"۔ ؎

حیدرآباد کے اخبارات میں مولانا کے ملحدانہ خیالات کی شدید مخالفت شروع ہو گئی تھی۔ مولانا نے اکبر مرحوم کو مطلع کیا۔ جواب میں لکھا:

"آپ ... مخالفت ... کچھ مجھ کو لکھا ہے ... والہ ... دل رفتہ ... اور ... کو ہرگز نہ دخل دیجئے گا۔ ادفع بالتی ھی احسن" ؎

اسی زمانہ میں مولانا نے اردو رسم الخط کی تائید میں انگریزی کے مشہور اخبار نیو انڈیا (New India) مدراس میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اردو اخبارات میں بھی ان کا چرچا رہا۔ اکبر نے ان مضامین کو سراہا اور لکھا:

"اردو پر آپ نے خوب لکھا" ؎

حیدرآباد میں مخالفت کا طوفان بپا ہے۔ اکبر کو تشویش ہے لیکن وہ مولانا کو شریعت و طریقت دونوں سے بیگانہ نہیں سمجھتے، کس محبت اور خلوص کے ساتھ لکھ رہے ہیں:

؎ خط ۹۳ صفحہ ۱۳۳ ۲ مئی ۱۹۱۸ء

؎ خط ۹۶ صفحہ ۱۳۶ ۱۱ جون ۱۹۱۸ء

"عزیز دل ما۔ سلمہ اللہ تعالیٰ ؎

ابھی آپکا خط پہونچا، بے ساختہ مولانا نیاز احمد بریلوی صاحب قدس سرہٗ کے ایک شعر پر میں نے تضمین کی ؎

ماجد کو آپ سمجھیں بیگانۂ طریقت
دل میں مرے تو ہے اک امید کا قصیدہ
ہیں غالباً مصداق وہ اس شعر پاکے
ارشاد کر گیا ہے اک ... برگزیدہ
من ایکبار عشقم ذوقِ فنا چشیدہ
آہوئے دشت ندیم از ما سوا رمیدہ

خواجہ صاحب آپکے محب اور دعاگو ہیں آپ کی نیکی ہے اور سعادتمندی ہے کہ ایسے دلوں میں آپ کو خدا نے جگہ دی ہے کہ ... کے لطف نہاں سے آپ محروم نہ رہیں" ؎

نواب محمد اسماعیل خاں مرحوم نے اکبر کی لائف لکھنے کی خواہش کی، لیکن اکبر مرحوم غالباً چاہتے تھے کہ ان کی لائف مولانا لکھیں۔ اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حاجی نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب نے مجھ کو لکھا ہے کہ میں آپ کی لائف لکھنا چاہتا ہوں۔ میں عشرت منزل میں قیام کروں گا۔ عشرت سلمہ نے اجازت قیام دیدی۔ لیکن میری لائف تو میرے اشعار ہی میں ہے آپکے ریمارک بہت معنی خیز ہیں"

؎ خط ۹۸ صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹-۲۱ جون ۱۹۱۸ء

کاش آپ بھی کبھی کچھ تحریر فرمائیں......

آپ کو میں نے اسی سبب سے موافق پایا کہ فنا پر
آپکی نظر ہے۔ اسی میں سب کچھ ہے آپ کے سوا کسی نے
مجھکو ان اشعار کی داد نہ دی

دنیا میں جسے جو پیش آیا اکبرؔ
بس اسی کے مطابق اسکی حالت بھی ہوئی [1]

ہفتہ وار مشرق گورکھپور میں مولانا کی موافقت میں
اور الزامات کی تردید میں، جوابات شائع ہوتے رہتے
تھے، کچھ مضامین مولانا ہی کے ہوتے تھے جو کسی دوسرے
نام سے شائع ہوتے تھے کچھ مولانا کے ہمدرد اور
احباب لکھتے تھے، کسی نے اکبر کے اشعار تائید میں
لکھے۔ اکبرؔ نے بھی دیکھے اور لکھا ہے :-

مشرق میں میں نے اپنے دو تین شعر جو آپکے
متعلق جوشِ دل سے بے ساختہ زبان پر آ گئے تھے
دیکھے، "آہوئے دشت ہوئیم از ما سوا رمیدہ"
عجب مقام ہے۔ خدا میری بات کو سچ کرے
میں نے سخن سازی نہیں کی۔ یہی Impression
(تاثر، خیال) تھا اور ہے۔" [2]

مولانا لکھنؤ آ گئے ہیں، مخالفت اور موافقت پر
مضامین کا سلسلہ جاری ہے مولانا کے کفر و الحاد پر مضمون
نما فتوؤں کا زور ہے، تائید میں مولانا کو مسلمان ثابت
کیا جا رہا ہے، لیکن اکبرؔ کی نظر میں مولانا کا مرتبہ
، اہل اللہ سے کم نہیں تھا، لکھتے ہیں :-

" میں تو آپ کو ان میں سمجھتا ہوں جن کی نسبت سعدیؔ
صاحب نے فرمایا ہے ؎

گفت خاموش کہ ہر کس کہ جائے دارد
ہر کجا پائے نہد چشم بر آرندش پیش

دوستوں نے آپ کو مسلمان ثابت کرنے کو قلم اٹھایا
میں نے عاشقانِ الٰہی میں داخل کر دیا۔ نباہ
اللہ کے ہاتھ ہے۔

مولانا اس پر نوٹ لکھتے ہیں اللہ اللہ یہ حضرت
اکبرؔ ہی کا کمال تھا کہ عین میرے الحاد کے زمانہ میں میرے
باایمان ہونے کی پیشین گوئی کر دی تھی۔"

مولانا نے کسی مسئلہ پر کچھ ریمارک لکھ کر بھیجے
اکبرؔ نے جواب میں لکھا :-

" آپکے ریمارک صحیح ہیں آپ پر میرا یہ شعر صادق
آتا ہے ؎

ہزار آرائشیں صدقے ہیں انکی سادہ وضعی پر
نہیں محتاج فیشن علم نے جن کو سنوارا ہے

ان فضائل اور سلامت روی کے ساتھ انشاء اللہ
ہمیشہ ممدوح و ممتاز رہئیے گا [3]

مولانا کے اندر اکبرؔ اپنی سابقہ پیشینگوئی کی صداقت
کے آثار نمایاں ہوتے دیکھ کر اپنی قلبی مسرت کا اظہار
کر رہے ہیں :-

میں نے بیساختہ آپ کی نسبت لکھ دیا تھا کہ

---

[1] خط ۱۰۱ صفحہ ۱۴۲ ۱۳ جولائی ۱۹۱۸ء
[2] خط ۱۰۳ صفحہ ۱۴۴ ۸ ستمبر ۱۹۱۸ء
[3] خط ۱۰۶ صفحہ ۱۴۵ ۲۶ ستمبر ۱۹۱۸ء
[4] خط ۱۱۶ ؍ ۱۱۲ ۲۱ مئی ۱۹۱۹ء

آہوئے دشت ہو یم از ما سوار میدہ

میں خوش ہوں کہ اس کی صداقت کے آثار آپ کی صاف اور بلند طبیعت سے نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے مکرم ڈپٹی صاحب مرحوم (پدر بزرگوار ماجد صاحب) کو شائد شبہ و افسوس تھا کہ لڑکا دین سے بیگانہ ہوتا جاتا ہے۔ اب فرشتوں سے یہ سن کر ان کی روح خوش ہو گی کہ وہ لڑکا حقیقت آشنا ہوتا جاتا ہے اور انشاءاللہ بہت جلد کہدے گا ع

بمقام کہ رسیدہ ام میرسی

یہ فلسفہ کہ وجود در حقیقت ذہن ہی میں ہے۔ علم باری میں ہے اور علم باری ہی سب کچھ ہے۔ ایسا صحیح فلسفہ ہے کہ میں اسکو کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام کی ایک صوفیانہ تفسیر سمجھتا ہوں کل من علیہا فان میں لفظ فنا سے ظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ بالآخر ہر شئے کو فنا ہے لیکن ذہن کہتا ہے کہ بالآخر کیا ابھی غور کرو اور حقیقت پر نظر ڈالو تو ... سوا ... ہو کچھ نہیں صرف علم باری رہ جاتا ہے۔ ہمہ اوست یہیں تک ہے اپنے غیر محدود ذہن کے ساتھ اپنی محدود ہستی کو بھی ملا لیجئے [1]

کبر سنی اور مسلسل علالت نے اکبر کو دنیا اور دنیا والوں سے بیگانہ بنا دیا ہے مگر مولانا سے دل کو نہیں روک سکتے، لکھتے ہیں :-

آپ[2] ایسوں سے دل کو نہیں روک سکتا،

کیوں روکوں آپکے باطن کو اس کی راہ سے

اپنے قیاس میں الگ نہیں پاتا۔ یوں تو ابھی

آپ کو دنیا کا کورس پورا کرنا چاہیئے ۔

نفس سے بچنے کی کوئی چارہ جوئی کیا کرے

فطرتی رہبر یہی ہے اسکو کوئی کیا کرے [3]

مولانا کی علالت سے اکبر بے چین ہو جاتے ہیں متعدد خطوط میں ان کی پریشانی کا اظہار ہے صحت کے متعلق تاکید فرماتے رہتے۔ مولانا نے بیماری کی خبر دی ہے۔ اکبر فکرمند ہو کر لکھتے ہیں :-

آپ[4] کے کارڈ نے مایوس کیا۔ خیر خدا کرے آپ پورے طور پر توانا اور تندرست ہو جائیں آپ کی اتنی توجہ بھی (مراسلتی) میری جانب ... [5]

اسی کے بعد متعدد خطوں میں صحت کے متعلق لکھتے ہیں۔

عزیز من ! میں نے آپ کو لکھا کہ عزت افزائی کے لئے آپ کی توجہ کافی ہے۔ یہ لکھنا رہ گیا کہ مسرت اور انبساط دل کے لئے ملاقات ہی کی ضرورت ہے۔ ہم لوگ آپس میں نہ ملے اور تبادلۂ خیالات نہ ہوا تو کچھ نہ ہوا البتہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم لوگوں میں مجھ کو بھی محبوب ہونے کا حق ہے یا نہیں۔ بہرحال صحت مقدم، لکھئے آپ کی صحت ہمیشہ نازک رہی ہے۔ ناتندرستی زندگی تلخ کر دیتی ہے [6]

اپنی خیریت جلد لکھئے، اپنا مشتاق سمجھئے، مشتاق بے معنی نہیں ہے

آپ نے شکایت نادرستی مزاج لکھی تھی اس کے

[1] خط ۱۱۹، صفحہ ۱۵۰ بابت ۱۰ جون اور ۲۸ جولائی ۱۹۱۹ء

[2] خط ۱۲۹، اکتوبر ۱۹۱۹ء

[3] رکھئے خطوط نمبر ۱۳۷، ۱۳۸

لیکن آپ کا کوئی خط نہیں آیا میں نے دو خط لکھے
طبیعت کو تعلق ہے خدا کرے آپ اچھے ہوں ۔۔
آپ سے مراسلت باعثِ انبساط خاطر ہے معاف
فرمائیے گا کہ باعثِ زحمت تحریر ہوتا ہوں۔ [1]

مجھ کو آپ کی اس نادرستی مزاج کا خیال نہ
تھا۔ اللہ تعالیٰ جلد صحت و قوت عطا فرمائے
اس میں شک نہیں کہ جب آپ کے علم و متانت
پر نظر کرتا ہوں تو اپنا آخر سمجھتا ہوں کہ آپ اس
محبت سے پیش آتے ہیں اور ایسا دلی تعلق رکھتے ہیں [2]

اس طرح جب تک خیریت معلوم نہیں ہوگئی، اکبر ہر خط میں لکھتے رہے، اور جب مولانا نے اپنے تندرست ہوجانے کی اطلاع دی تو مطمئن و مسرور ہو کر لکھتے ہیں :۔

عزیزی وحبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ آپکے خط
سے بہت خوشی ہوئی، جب میں نے یہ کہا تھا کہ آپ
اس کے مصداق ہیں ؎

من پاکباز عشقم ذوقِ فنا چشیدہ
آہوئے دشت ہویم از ما سوا رمیدہ

اس وقت میں نے دیکھ لیا تھا کہ آپ کی وہ طبیعت
آپ کو کدھر لے جائیگی آپ ہنوز راہ میں ہیں لیکن سیدھی
راہ پر ابھی آپ نہیں جانتے کیا نعمتیں آپ کو ملنے والی
ہیں انشاء اللہ تعالیٰ ایک شعر قابل داد ہے ؎

دو سہ گام اگر بپے دل برہش و دیدہ باشی
زجہا گذشتہ باشی بجہا رسیدہ باشی [3]

مولانا نے خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے اور قرآن پاک کی کوئی آیۃ ان کی تائید میں پیش کی۔ اکبر اس سے بے انتہا خوش ہوئے۔ تعریف بھی کی اور مشورہ بھی دیا، ان کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی :۔

عزیز من سلمہ اللہ تعالیٰ

ماشاء اللہ چشم بد دور، میں ہرگز گمان نہ
کرسکتا تھا کہ آپ اس بلندی پر پہونچ گئے ہیں آیۂ
علواً فی الارض [illegible] مدت سے میرے پیش نظر ہے
خاموشی کے ساتھ باطنی ترقی میں مصروف رہیے
لقد جئتمونا فرادیٰ کما خلقناکم اول مرۃ
یاد رکھئے کاش آپ [illegible] ملاقات ہوتی ہے ہم
لوگ اللہ کے واسطے، حق کے واسطے، روحانیت
کے واسطے، عقل سلیم کے واسطے، متانت و وقار
کے واسطے ایک جماعت ہوں، ایسے لوگ کم ہیں،
میں اللہ کا شکر کرتا ہوں کہ ابتداء ہی میں اس نے
آپ کی نسبت مجھ کو اس مصرعہ کو متعلق کرنے کا الہام
فرمایا!

آہوئے دشت ہویم از ما سوا رمیدہ

آپ بوڑھے نہیں، معمر نہیں، آیۃ علواً
فی الارض پر پہونچ جانا حیرت انگیز ہے [4]

یہ چند اقتباسات بھی مولانا کی روحانی ترقی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں :۔

"آسمان حقائق و معانی پر آپ کو چمکا رہا ہے" [5]
"علم و حکمت آپ کو دعا دیتے ہوں گے کہ
آپ ان کا حق ادا کرتے ہیں" [6]

---

[1] خط ۱۳۹ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء
[2] خط ۱۴۰ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء
[3] خط ۱۴۸ ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء
[4] خط ۱۵۲ ۔ صفحہ ۱۸۲ ۲۳ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء
[5] خط ۱۵۳ صفحہ ۱۸۴ ۱۱ فروری سنہ ۱۹۲۰ء
[6] خط ۱۵۴ صفحہ ۱۸۵ ۲۳ فروری سنہ ۱۹۲۰ء

الحمد اللہ کہ آپ روحانی ترقی میں سرگرم ہیں"[1]

مولوی صبغت اللہ شہید انصاری فرنگی محلی مرحوم نے اکبر کو خط لکھا اور اس میں مولانا کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے۔ اکبر مطلع فرما رہے ہیں :۔

صبغت اللہ صاحب بیچارے نہیں جانتے کہ کدھر کے ہو رہے ہیں آپ کو تو اب وہ بڑے واصلان حق میں داخل کرتے ہیں، انشاء اللہ یہی ہوگا[2]

مولانا نے معارف میں ترک موالات کے اخلاقی و روحانی پہلوؤں پر توجہ دلائی تھی، اسی کے متعلق اکبر لکھ رہے ہیں :۔

آپ[3] نے معارف میں خوب مضمون لکھا ہے۔ جس میں میری نظم بھی درج فرمائی ہے۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ مدارج عالی پر پہونچائے صفائی بیان، صحت خیال، بلند نظری آپ کے حصہ میں ہے

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :۔

عزیزی[4] ماجد میاں، اللہ آپ کو خوش رکھے اور مدارج عالی پر پہونچائے..... آپ کے صفائے باطنی اور انداز روحانیت کو اللہ قائم رکھے۔

حکمائے مغرب اور فلسفہ تصوف پر معارف میں مضمون شائع ہوا، اکبر نے ملاحظہ فرما کر داد دی:۔

معارف[5] میں تصوف پر آپ کی تحریر دیکھ کر روح تازہ ہوگئی

مولوی محمد کریم صاحب نے لکھا کہ ماجد میاں کو تصوف اور عبادت الٰہی کا شوق ہوگیا ہے، اکبر کس مسرت کے ساتھ لکھ رہے ہیں :۔

مولوی[6] محمد کریم صاحب نے مجھ کو خط لکھا تھا کہ ماجد میاں کو تصوف اور عبادت الٰہی کا شوق ہوگیا ہے۔ میری روح کو بالیدگی ہوئی۔ میں نے لکھ دیا کہ ان سے زیادہ کوئی میرے دل سے قریب نہیں اللہ آپ کو خوش رکھے

آپ روحانی بالیدگی کے متعلق خوش ہو کر بار بار لکھتے ہیں آپ[7] میرے لئے نعمت ہیں، امید ہے کہ آپ کو مجھ سے ذاتی محبت ہے اور آپ ہمدردی کو موجود ہیں یہ نہ بھی ہو تو آپ کا مذاق اور طرز خیال مجھ سے اسقدر موافق ہے کہ مجھ کو راحت محسوس ہوتی ہے بڑی بات یہ ہے کہ آپ طریقت سے بیخبر نہیں ہیں۔ حضرت سلمہ آپکے میلان طبع اور ترقی روحانی پر عش عش کرتے ہیں۔ علم کا بھی اثر ہونا چاہیئے

مولانا نے اکبر کی غزلیں انتخاب کر کے ان کے پاس روانہ کیں۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں :۔

آپ[8] نے میری غزلوں کا انتخاب کیا۔ آپ کی

[1]	خط	۱۵۸	صفحہ	۱۸۸	۲۷ مارچ ۱۹۲۰ء
[2]	"	۱۶۳	"	۱۹۳	۶ جون ۱۹۲۰ء
[3]	"	۱۷۲	"	۱۹۸	۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء
[4]	"	۱۷۸	"	۲۰۳	۱۱ دسمبر ۱۹۲۰ء

[5]	خط	۱۸۳	صفحہ	۲۰۷	یکم اپریل ۱۹۲۱ء
[6]	"	۱۸۵	"	۲۰۹	۱۱ مئی ۱۹۲۱ء
[7]	"	۱۸۶	"	۲۰۹	۲۱ مئی ۱۹۲۱ء
[8]	"	۱۸۸	"	۲۱۱	۲۵ مئی کے بعد جون کا

روحانی ترقی سے ایسی موانست ہوگئی ہے کہ آپکے خیال سے انبساط ہوتا ہے۔ اور اس امید میں کہ آپ سے ملنا ہوگا۔ مزا آتا ہے۔ خدا نے اپنے لئے آپکے مذاق کو منتخب کیا ہے۔ بلا دلیل لگے ہوئے ہیں اس زمانہ میں تو بالخصوص بڑی نعمت ہے۔ [1]

خواجہ حسن نظامی کو لکھ رہے ہیں:۔

آپ کے دوست ماجد میاں نے بڑی ترقی کی ہے۔ خدا کا شکر ہے، کل ان کا خط آیا ہے ملاحظہ کو بھیجتا ہوں، خدا ان کو مبارک کرے اور منزل مقصود تک پہونچائے مجھکو بھی آپ کو بھی ہر بندۂ طالب کو سچ پوچھئے تو طالب ہی ہونا مشکل ہے۔ [2]

مولانا کو دعا دیتے رہے ہیں مسند علم و عزت پر متمکن رکھے

مولانا نے محفل سماع منعقد کی اور قوالوں کو انعام دیا، اکبر کو راجہ میاں نے مطلع کیا۔ اکبر نے مولانا کو لکھا :۔

راجہ میاں نے آپ کے واجد علی شاہی ٹھاٹھ اور مصارف اور انجمن آرائی اور تکلفات کی وہ تصویر کھینچی کہ اگرچہ بہت مسرت ہوئی لیکن یہی سمجھا کہ آپ کو دماغ اور فرصت کہاں کہ میری طرف صرف توجہ کیجئے۔ واجد علی شاہی سے خدانخواستہ عیاشی مراد نہیں۔ [3]

مجھ سے واجد علی شاہی کے لفظ میں شدید غلطی ہوئی، صرف بلحاظ مصارف و تکلف کے یہ لکھ دیا تھا۔ راجہ میاں نے کہا کہ ماجد میاں نے خوب روپیہ قوالوں کو دیا اور مہمانوں کو پُر تکلف

له خط ۱۸۹ صفحہ ۲۱۲ ۱۰ جون ۱۹۲۱ء
سله ” ” ۱۱۳ ” ۱۴ ” ۱۹۲۱ء
سله ” ۱۹۰ ” ۲۱۲ ” ۲۳ ” ۱۹۲۱ء
سله ” ۱۹۵ ” ۲۱۴ ” ۱۷ جولائی ۱۹۲۱ء
ھه ” ۱۹۶ ” ۲۱۸ ” ۲۲ جولائی ۱۹۲۱ء

دعوت دی۔

اگر آپ کی نسبت سوءظن ہوتا تو میں مشتاق طالب کیوں ہوتا! [5]

مولانا اکبر مرحوم سے مل کر واپس آئے مگر خیریت سے پہونچنے کا خط نہیں لکھا۔ اکبر فکرمند ہوکر لکھتے ہیں:۔

عزیزم سلمہٗ۔ آپ نے پھر مجھ کو نہ یاد کیا۔ رسید مع الخیر کا خط بھی نہ آیا۔ خواجہ صاحب سے سنا کہ آپ شاید عید میں ان سے ملنے آئیں خدا ایسا کرے۔ اکبر [5]

اکبر مرحوم کا یہ آخری خط تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں :۔

شکر ہے کہ آپ دعا کر آخری بار دیدار سے مشرف ہوا [illegible] کیا خبر تھی کہ اس حکیم و عارف کی [illegible] ہے۔ اس کے چند ہی ہفتہ بعد وہ وقت آگیا جس کے انتظار میں حضرت اکبر سالہا سال سے تھے [6]

ایک طرف ان خطوط سے اگر ایک طرف مولانا کی سیرت و شخصیت، ان کے علمی و ادبی مشاغل، اور ان کے مذہبی خیالات پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف اکبر کی مردم شناسی نیز ادب و فلسفہ اور مذہب کے متعلق ان کی وسیع معلومات اور صحیح صحیح خیالات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہ آٹھ نو سال کا زمانہ، مولانا کی عمر کا بہترین زمانہ کہا جا سکتا ہے، اسی زمانہ میں وہ دہریت کے غار سے نکل کر روحانیت کے راستہ پر گامزن ہوئے، اسی زمانہ میں انھوں نے فلسفہ کی گراں بہا

ھه خط ۱۹۷ صفحہ ۲۱۸ ۱۳ اگست ۱۹۲۱ء
له آخری خط

کتابیں لکھیں اور ترجمے کئے، جن سے اُردو ادب مالامال ہوا۔ اکبرؔ کی نظر میں مولانا کن کن صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے اور وہ مستقبل میں کن اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں گے؟ اختصار کے ساتھ عرض کر دیا گیا۔

اسی زمانہ میں مولانا کو شعر و شاعری سے رغبت بھی ہوئی اور اکبر مرحوم نے مولانا کو شعر و شاعری کی طرف بھی متوجہ کرنا چاہا۔ ان کی سخن شناس نظر نے مسٹر عبدالماجد کے اندر شعر گوئی اور شعر فہمی کی صلاحیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ اگر یہ نوجوان شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہو جائے تو بہت جلد اعلیٰ پایہ کا شاعر ہو سکتا ہے اسی لئے وہ مختلف خطوط میں شاعری کی طرف رغبت دلاتے رہے، کہیں اشاروں اور کنایوں میں، اور کہیں صاف صاف، وہ چاہتے ہیں کہ ناظر دریابادی مشقِ سخن جاری رکھیں۔ خطوطِ اکبر سے ہی یہ معلوم ہوا کہ زود پشیمان (ڈرامہ) کے مصنف مولانا عبدالماجد دریابادی، شاعر بھی ہیں اور اس ڈرامہ میں جتنی غزلیں ہیں وہ انھیں کی ہیں۔ ملاقات کے ایک سال بعد سلسلہ مراسلت شروع ہوا، اکبر مرحوم کا پہلا خط ۲۶ر اگست ۱۹۱۳ء کا ہے۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر مرحوم مسٹر عبدالماجد کی قابلیت، فضیلت اور تحقیقی لگن سے بے انتہا متاثر ہوئے، اور ان کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ اس نوجوان فاضل کے اندر شاعری کا جوہر موجود ہے اس لئے اپنے دوسرے خط میں کس خوش اسلوبی سے شاعری کے محرکات بیدار کرنے کے لئے لکھ رہے ہیں :-

آپ فلاسفر ہیں، شعر کی قدر زیادہ نہ ہوگی۔ لیکن واقعاتِ موجودہ کے لحاظ سے شاعرانہ اشعار کو ناپسند نہ کیجئے ؎

بھائی صاحب تو ادھر فکرِ مساوات میں ہیں
شیخ صاحب کو سناتے کہ حوالات میں ہیں
قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں
صرف آہ ترک کے مرنے ان کی ملاقات میں ہیں
سر بسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف
بس ہمیں اس ریزولیوشن کی خرافات میں ہیں

افسوس ہے کہ مجھ کو حوادث نے بہت ہی دل شکستہ اور بے تعلق کر دیا ورنہ آپ کا ایک اچھا اسسٹنٹ ہوتا یہ بھی سمجھتا ہوں کہ شعر

ہر کسے را بہر کارے ساختند

میں لکھنؤ آؤں گا تو ضرور آپ کو اطلاع دوں گا۔ خدا آپ کو مدارجِ عالی عطا کرے اور راحت القلوب بنا دے۔[۵۱]

مولانا نے غالب کے فلسفہ پر ایک مضمون لکھا ہے جو انڈین پریس الہ آباد کے رسالہ ادیب میں شائع ہوا ہے اکبر مرحوم نے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد مولانا کو لکھا:

میں آپ کو مذاقِ شعر سے کس طرح بے بہرہ سمجھوں غالب کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دل آویز ہے۔[۵۲]

اکبر مرحوم کے ان الفاظ نے کہ میں آپ کو مذاقِ شعر سے

---

۵۱ خط نمبر ۲ یکم ستمبر ۱۹۱۳ء
۵۲ خط نمبر ۴ ۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء

کس طرح بے بہرہ سمجھوں۔ مولانا کو ضرور متاثر کیا ہوگا اور وہ پہلے "غزل گویم یا نہ گویم" کی کشمکش میں مبتلا رہے ہوں گے بالآخر شاعری کا جذبہ غالب آیا ہوگا اور وہ غزل کہنے پر مجبور ہوگئے اور تقریباً ایک سال بعد مولانا نے اپنی پہلی غزل اکبر مرحوم کی خدمت میں روانہ کی ہے، اکبر مرحوم نے غزل کے متعلق یہ حوصلہ افزا خیالات ظاہر کئے :۔

عزیزی دحبیبی سلمہ اللہ تعالےٰ !

مجھ کو حیرت ہوئی کہ آپ ایسے شعر کہہ سکتے ہیں، جو رنگ سخن ظاہر ہوتا ہے وہ بہت پختہ ہے۔ کیا کہنا چاہیئے اور کیونکر کہنا چاہیئے۔ اول میں کوئی جگہ اعتراض کی نہیں ہے بلکہ آپ کی تقلید مناسب ہے۔ دوم میں البتہ کہیں کہیں کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ بہرکیف میں آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے ؎

رہی ہرچند عقل صبر آموز
نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

کیا خوب کہا ہے۔ آپ انشاء اللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے۔[1]

افسوس ہے کہ یہ غزل باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہوسکی۔ حکیم عبدالقوی دریابادی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ معارف اور الناظر میں کچھ غزلیں شائع ہوئی تھیں۔ میری نظر سے نہیں گذریں۔ اس غزل کے متعلق مولانا ماجد لکھتے ہیں ۱۹۱۲ء سے میرا دور غزل گوئی شروع ہوتا ہے۔ شادی سے دو سال قبل شروع ہوا اور شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد تک رہا۔ پہلی غزل" زاریاں نہ گئیں"۔ "یاریاں نہ گئیں" کی زمین میں تھی، یہی غزل اصلاح کے لئے حضرت کی خدمت میں روانہ کی ہے حالانکہ طبیعت پر رنگ حضرت موہانی کا غالب تھا۔

حضرت موہانی کے رنگ میں پہلی غزل کامیابی کے ساتھ کہہ لینا مولانا کے رنگ طبیعت اور ملکہ شعری پر قدرت انگیز کو ظاہر کرتا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد مولانا نے اکبر مرحوم کی خدمت میں دوسری غزل بھیجی۔ اکبر مرحوم نے اس غزل کی بڑی تعریف کی لکھتے ہیں :۔

[2] آپ کی غزل دیکھ کر کم تعجب ہوا اور زیادہ خوشی ہوئی۔ تعجب اس بات کا کہ ابتدا ہی میں ایسے کھرے شعر آپ کہنے لگے۔ تعجب میں کمی اس لئے کہ اچھی فطرتی سمجھ اور علم نے آپ کی طبیعت کو معنی کا عمدہ سانچہ بنا دیا ہے۔ نقص زبادات کو دخل نہیں۔ خوشی اس بات کی کہ ان خیالات کو میں نے پسند کیا۔ طریقہ اظہار بھی خوب ہے۔ شاعری، پالیٹکس، اخلاق عملی، فلسفہ سب کی جھلک ہے۔ رکاکت سے خالی۔

اہل وفا بھی الخ خوب ہے نہایت صحیح و بامعنی ہے۔

غالب زبان و شوق الخ بہت ہی بلیغ ہے

یہ کیا ہوا الخ اس میں بھی معلوم سے نامعلوم کی طرف کیا لطیف صعود ہے۔

---

[1] خط ۲۵ صفحہ ۷۰-۷۱، ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء

[1] نوٹ ۷۷ صفحہ ۷۱ دسمبر ۱۹۱۲ء

[2] ؍؍ ۲۸ ؍؍ ۷۳-۸۴

نوٹ:۔ یہ دوسری غزل "تسخیر کر چلے" "تدبیر کر چلے" کی زمین میں کہہ کر حضرت اکبر کی خدمت میں اصلاح کے لئے بھیجی گئی تھی صفحہ ۷۳

حیراں ہوں الخ وجد آفریں شعر ہے۔ میرے بھی دل کو بھی۔ اس بجی میں کیا بلاغت ہے۔

ماشاء اللہ چشم بد دور۔

الغرض سب شعر کم و بیش اچھے ہیں۔ اب رہی زبان و طرز بیان اس میں کوئی نقص نہیں البتہ افزائشِ حسن کی گنجائش ہے۔ طبیعت کا نشو و نما خود اس کو پیدا کرلے گا۔ جب عالمِ معنی کے استغراق سے طبیعت آسودہ و بے فکر ہوکر حسنِ صورت کا مذاق پیدا کرے گی۔ تحریر میں ان اشارات سے زیادہ اس وقت میری قوت سے باہر ہے بہرکیف آپ کو داد دیتا ہوں۔ سبحان اللہ کہتا ہوں، ترقی عمر و اطمینان کی دعا دیتا ہوں۔

یہ غزل مولانا کے ڈرامہ زود پشیماں میں موجود ہے، مولانا نے اس غزل کو نظیر جان طوائف کی زبانی سنوائی ہے غزل سنانے سے پہلے نظیر جان نے ماسٹر صاحب (ایک کردار) سے اجازت لی کہ حکم ہو تو ناظر کی ایک تازہ غزل سناؤں

ماسٹر:۔ اللہ! کس مہمل گو کا نام لیا۔ اچھا، خیر یہی سناؤ

اور نظیر جان بصد انداز دلربائی، غزل سنا رہی ہے۔

جانبازیوں کو خبط سے تعبیر کر چلے
تم یہ تو خوب عشق کی توقیر کر چلے

ہر دا نہیں نظارے کا در شوق سے ہو بند
اب دل میں نقش ہم تری تصویر کر چلے

ملتی ہے آپ کی کوئی فردِ قرارِ جرم
مانا کہ ہم شکایتِ تقدیر کر چلے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں مری وحشتیں کہ اب
غم خوار مجھ کو بستۂ زنجیر کر چلے

غالب زبانِ شوق پہ آیا نہ رعبِ حسن
وہ ہم تمھارے آگے بھی تقریر کر چلے

حیراں ہوں ان کے حسن میں کیا ایسا سحر تھا
میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے

اگلا سا غیر سے نہیں اب لطف و التفات
بارے ہمارے نالے بھی تاثیر کر چلے

منسوب کرکے عشق کو اک بوالہوس سے تم
اس جذبۂ لطیف کی تحقیر کر چلے

یہ کیا ہوا کہ ان کی جفاؤں کا ذکر چھوڑ
ناظر بھی شکوۂ فلکِ پیر کر چلے

اکبر مرحوم نے کم و بیش سب اشعار کو بہتر تسلیم کیا لیکن چند اشعار کی انھوں نے بڑی داد دی، اس داد کو 'عارفانہ داد' کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اکبر مرحوم پر مذہب و تصوف کا غلبہ ہوچکا تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ 'مسٹر ماجد' مولانا عبدالماجد' بن جائیں اور ان کا دل نورِ ایمان سے منور ہوجائے۔ داد میں ان کے انھیں خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ کس بلیغ پیرایہ میں تشریح کرتے ہوئے اپنی قلبی تمنا کا اظہار کررہے ہیں

حیراں ہوں ان کے حسن میں کیا ایسا سحر تھا
میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے

وجد آفریں شعر ہے 'میرے بھی دل کو' اس بھی میں کیا بلاغت ہے۔ ماشاء اللہ چشم بد دور۔ اس بھی نے اکبر مرحوم کو اس لئے متاثر کیا کہ اس وقت 'دلِ ماجد'، فلسفہ کے دیوتا کا پجاری تھا اور حسنِ حقیقی کی لذت سے بظاہر محروم، لیکن اس بھی نے یہ ادا

ظاہر کر دیا کہ ایسا بے نیاز دل بھی، سحر آمیز حسن سے متاثر و مسخر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، گویا وہ اس حقیقت کا اعتراف کر رہا ہے ؎

آں دل کہ رم نمودے' از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

یہ شعر حالیؔ نے مسدس کے دیباچے میں، سرسید احمد خاں کی پرکشش شخصیت سے متاثر ہونے کے بعد اپنے لئے لکھا ہے، ناظر بھی حالیؔ کی زبان سے ابھی دبے دبے الفاظ میں یہ کہہ رہے ہیں ؎

بھلا حالیؔ اور الفت سے ہو خالی
یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

اور شاید ان کے دل کے کسی گوشے میں یہ دبی دبی خواہش بھی موجود ہوگی ؎

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

نظیر جان جب غزل سنا چکی تو ماسٹر نے دوسرے کردار مشرف سے غزل کے متعلق رائے معلوم کی۔

ماسٹر:۔ مشرف! یہ غزل بلحاظ شاعری کیسی ہے؟

مشرف:۔ میں کیا بتاؤں کیسی تھی، بہت سی شعریں تو میری سمجھ میں نہیں آئیں۔

ماسٹر:۔ تم نے سچ کہا، واقعی مہمل کلام تھا۔ دلی میں غالبؔ ایک بڑا مہمل گو ہوا ہے۔ مہمل گوئی کی کوئی کیا تقلید کرتا، اس کا رنگ تو اچھا ہوا اس کے ساتھ ختم ہو گیا، مگر اسی زمانے میں مومنؔ، شیفتہؔ، حالیؔ۔ دو چار شخص اور بھی مہمل گوئی کرنے لگے ان سب کے مرجانے کے بعد میں تو خوش تھا کہ یہ رنگ دنیا سے اٹھ گیا مگر حسرتؔ، ناظرؔ، رسواؔ وغیرہ دو ایک شخص اب تک اسی روش پر چل رہے ہیں۔

مولانا نے ڈرامہ میں ماسٹر کی زبان سے ناظر کو مہمل گو کہلایا ہے اور مہمل گویوں میں سب سے بڑا مہمل غالبؔ کو بتایا ہے اور اس کے بعد مومنؔ، شیفتہؔ اور حالیؔ اور دو چار دوسرے شعراء کو بھی مہمل گویوں میں شمار کیا ہے۔ اس دور میں، حسرتؔ اور رسواؔ جیسے مہمل گویوں کے ساتھ ناظرؔ کا نام لیا ہے' اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مولانا خود اپنی شاعرانہ حیثیت سے بخوبی واقف تھے' اور اپنے کو انھیں شعراء کی صف میں شمار کرتے تھے۔ کسی شاعر کے لئے یہ بڑے فخر و انبساط کی بات ہے کہ اس کی غزلیں، طوائف زبانی یاد کر کے محفلوں میں گائے، کیونکہ وہی غزل محفلوں میں گائی جاتی ہے جس میں شاعرانہ حسن اور موسیقیت دونوں موجود ہوں اور جس کا ہر شعر سامعین کے دلوں کو وجد میں لائے۔

دسمبر ۱۴ء سے ستمبر ۱۵ء تک مولانا نے کوئی غزل اکبر مرحوم کی خدمت میں نہیں بھیجی۔ اکبر کلام ناظر کا بھیجنے سے انتظار کرتے رہے، لیکن جب آٹھ نو مہینے گزر جانے کے باوجود ناظر نے کوئی غزل نہیں بھیجی، تو ۱۸ ستمبر ۱۵ء کے خط میں دریافت کرتے ہیں :۔

آپ کا دماغ سائنٹفک اور آپ کا دل ملائم اور لطیف۔ اس سبب سے میں آپ کو بہت زیادہ وقعت کا مستحق سمجھتا ہوں۔ شعر و سخن کا کیا حال ہے آپ کی

غزلیں بہت خوب تھیں[1]

ناظر نے کیا جواب دیا یہ تو معلوم نہیں شائد کوئی عذر پیش کیا ہوگا۔ اس کے چار یا پنچ مہینے بعد فروری ۱۶ء میں کچھ اشعار روانہ کئے جن کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:۔

اب بالکل یاد نہیں آتا کہ یہ اشعار کیا اور کس
مضمون پر تھے۔[2]

اکبر مرحوم نے ان اشعار کو سراہا لیکن غزل گوئی کی طرف توجہ بھی دلائی۔ لکھتے ہیں :۔

آپ کے اشعار کی نسبت لکھنا بھول گیا کہ نہایت معنی خیز
بامزہ لیکن آپ کو غزل کہنا چاہیئے، جیسی غزلیں
آپ نے پہلے کہی تھیں۔[3]

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنے علمی و ادبی کاموں میں اتنے زیادہ مصروف و منہمک تھے کہ انھیں اپنے ناظر ہونے کا خیال نہیں رہا۔ اور وہ باوجود اصرار کے غزل گوئی کے لئے وقت نہ نکال سکے۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا۔ اکبر مرحوم کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ انھوں نے ۳ر نومبر ۱۶ء کو دوبارہ توجہ دلائی:۔

کبھی دو چار شعر ضرور کہہ لیا کیجئے، جوہر قابل
موجود ہے۔[4]

بار بار متوجہ کرتے رہنے سے مولانا کو بھی ناظر ہونے کا خیال آیا اور انھوں نے کچھ پرانی اور نئی غزلیں اکبر مرحوم کی خدمت میں بھیجدیں ہو سکتا ہے کہ غزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا ہو اور مولانا نے کسی وجہ سے ان کو اکبر مرحوم کے پاس نہ بھیجا ہو کیونکہ ۳ر نومبر کو اکبر مرحوم نے توجہ دلائی تھی اور ۳۰ر نومبر کے خط میں کئی غزلوں کے پہونچنے کے متعلق اپنی رائے لکھی:۔

ان غزلوں میں وسعت خیال زیادہ ہے
لیکن بلحاظ قواعد زبان سابق کی غزلیں زیادہ
کھری تھیں اس کا سبب زبانی کہوں گا، اگر زندہ
رہا، جہاں آپ کو بجا شبہ ہے نہ صرف وہاں بلکہ
اور مصرعوں میں بھی تغیر و تبدل کی ضرورت ہے
انشاءاللہ دو چار دن میں واپس بھیجدوں گا۔[5]

اکبر مرحوم نے ان نئی اور پرانی غزلوں کو اصلاح کرنے کے بعد واپس کر دیا ہوگا۔ اس عرصہ میں مولانا نے ایک تازہ غزل کہی اور اکبر مرحوم کے ملاحظہ کے لئے بھیجی۔ اس غزل کے دو شعر اکبر نے پسند کئے۔ افسوس ہے کہ یہ غزل بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ میرے خیال میں یہ پوری غزل اچھی ہوگی، ایسی شگفتہ و شاداب زمین میں بڑے دلکش اور بامعنی اشعار کہے ہونگے اکبر مرحوم لکھتے ہیں :۔

"[6] اپنی خیریت لکھئے طبیعت کو تعلق ہے، ہمدم
میں اُردو کانفرنس کا کچھ حال چھپا ہے آپ کا
نام نظر نہ آیا۔
آپ کے یہ دو شعر بلحاظ معنی بہت خوب ہیں[5]

---

[1] خط نمبر ۴۱ ۱۸ر ستمبر ۱۵ء

[2] نوٹ: مولانا عبدالماجد (جدید اڈیشن) پر یہ نوٹ اس طرح ہے۔
اسی کتاب فلسفۂ اجتماع کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صفحہ ۶۷

[3] خط نمبر ۴۸ ۹ر فروری ۱۶ء

[4] خط نمبر ۶۴ ۳ر نومبر ۱۶ء

---

[5] خط ۶۷ ۳۰ر نومبر ۱۶ء

[6] خط ۷۲ صفحہ ۱۱۱ ۳ر جنوری ۱۷ء

وہ مدّت ہوئی مل چکے ہیں عدو سے

مری آہ اب تک اثر ڈھونڈھتی ہے

نگاہِ کرم اِس ستم گر کی ناظر

فقط آپ کی چشم تر ڈھونڈھتی ہے

اس مقطع کو آپ خود بھی یاد رکھئے۔"

دو تین مہینوں کے بعد، مولانا نے ایک اور تازہ
زل کہہ کر اکبر مرحوم کے پاس بھیجی۔ اس غزل میں کچھ
نعار عاشقانہ رنگ میں تھے، لیکن خیالات میں
ری بجنیلٹی پائی جاتی تھی۔ ترکیب الفاظ میں صفائی
ر صحت بھی موجود تھی۔ اس سے قبل اکبر مرحوم انتخاب
فاظ، اور بندش کے متعلق لکھ چکے تھے۔ یہ غزل ان
، معیار غزل گوئی پر پوری اُتری، فرماتے ہیں :-

آپ کی غزل خوب ہے۔ ترکیب الفاظ بہت صاف
اور صحیح ہے۔ اگرچہ آپ نرے تقلیدی فلاسوفر نہیں
ہیں، لیکن شاعری آپ کو زیادہ تر اوریجینلٹی کی
طرف لے جائے گی۔ ابتداً کچھ عاشقانہ طرز کا
مضائقہ نہیں بلکہ مناسب یہی ہے۔ اس باب میں
پھر کچھ لکھوں گا۔ دو ایک شعر اس غزل میں بالخصوص
داد کے مستحق ہیں۔[۵]

افسوس ہے کہ اس کا علم نہ ہو سکا کہ یہ غزل کس
.یف و قافیہ اور بحر میں تھی۔ مولانا نے کوئی تحریر
بھی ہے اور خیریت دریافت کی ہے، اکبر مرحوم نے
د سطروں میں جواب دیا اور اپنی حالت کے پیشِ نظر
پر کچھ اشعار کہنے کی فرمائش کی۔

الحمد للہ آپ نے خوب لکھا دستخط کر کے واپس

کرتا ہوں۔ اب کسی قدر افاقہ ہے، لیکن کیا اعتبار؟
فنا پر کچھ اشعار کہئے، عبرت کے رنگ میں یا فلسفیانہ
الحمد اللہ آپ کو علم نے عمر سے بہت آگے کر دیا،
لیکن یہ فطرتی سنجیدگی ہے۔[۶]

اس خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے، لیکن یہ خط
۹ مئی ۱۷ء اور ۲۳ مئی ۱۸ء کے درمیان لکھا گیا
جب اشعار کہنے کی ترغیب کرنے پر بھی مولانا نے
خاموشی اختیار کی تو ۲۵ اگست ۱۷ء کو پھر لکھتے ہیں:-

آپ کو تو شعر کہنے کی فرصت نہ ملتی ہوگی۔[۷]

لیکن مولانا اپنی عدیم الفرصتی اور ادبی مشغولیت
کی وجہ سے پھر بھی، اکبر کے حکم کی تعمیل نہ کر سکے اور اشعار
نہیں بھیجے، اکبر انتظار کرتے رہے۔ انتظار کرتے کرتے
نو دس مہینے گذر گئے، بالآخر مجبور ہو کر ۱۱ جون ۱۸ء
کو شعر کہنے کی طرف دوبارہ متوجہ کیا۔

جب آپ کو فرصت ملے دو چار شعر موزوں کر لیا
کیجیے۔[۸]

اور ۶ جولائی ۱۸ء کو پھر شعر کہنے کی فرمائش کرتے ہیں:-

آپ عدیم الفرصت ہونگے ورنہ عرض کرتا کہ کبھی
دو چار شعر کہہ لیا کیجیے۔[۹]

مولانا نے یہ مشورہ بھی ٹال دیا، اس کا سب سے بڑا سبب
علمی و ادبی مشاغل میں ان کا انہماک تھا، شاعری کا جذبہ
فلسفہ اور ادب کے جذبات سے مغلوب سا ہو گیا تھا لیکن
بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔ آخر موقع پا کر ابھرا اور مولانا نے

---

۵ خط ۷۹۔ صفحہ ۱۱۷ ۹ مئی ۱۷ء

۶ خط ۸۰ صفحہ ۱۱۷، ۱۱۸

۷ خط ۸۷   ۸ خط ۱۲۶

۹ خط ۹۹ ۶ جولائی ۱۸ء

ریباً ڈیڑھ سال کے بعد آخر دسمبر ۱۸ء میں ایک غزل
غ کی مشہور زمین میں کہہ کر بھیجی۔ مولانا لکھتے ہیں :۔

مدت کے بعد ایک غزل اور کہہ کر اصلاح کے
لئے روانۂ خدمت کی تھی یہ داغ کی مشہور زمین ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہدا
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

میں کہی تھی [۵۱]

بر نے غزل کو داغ کی غزل سے ہر اعتبار سے بہتر ایا ہے، وہ چاہتے تھے۔ داغ اور ناظر کی غزلوں پر نصیل سے لکھیں، لیکن شدید علالت کی وجہ سے وہ نا ئد لکھ نہ سکے ۴ر جنوری ۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

آپ کی غزل داغ کی غزل سے ہر اعتبار سے بہتر
ہے۔ عشرت سلمہٗ نے اس خیال سے اتفاق کیا بلکہ
ایک شعر کی نسبت انھوں نے کہا کہ یہ نہایت اچھا ہے
میں نے اور اشعار بھی منتخب کئے داغ کے رنگ میں
اگر داغ سے آپ بڑھیں تو آپ کی عالمانہ اور اخلاقی
متانت پر داغ آجائے لیکن اس غزل میں تو میری
نگاہ میں داغ پھیکے رہے .....

صفحہ ۱۴۸ آپ کی غزل اور داغ کی غزل پر
انشا اللہ مفصل ریویو کرکے آپ کو لکھوں گا یا آپ
سے کہوں گا تاکہ وجہ ترجیح آپ کو معلوم ہو اور آپ
تو خود سمجھتے ہیں ..... اسی زمین میں میری بھی ایک
مختصر غزل ہے [۵۲]

شعر و شاعری کے متعلق اکبر مرحوم کا یہ آخری خط تھا۔

اس کے بعد اگست ۲۱ء تک یعنی ڈھائی سال سے زیادہ مراسلت کا سلسلہ جاری رہا اور چھیاسی ستاسی خطوط اکبر مرحوم نے لکھے، ان میں علمی و ادبی اور دیگر مسائل پر اظہار خیال بھی کیا لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ کسی ایک خط میں بھی، اکبر نے شاعری کی طرف نہ توجہ دلائی اور نہ کوئی ذکر کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کو مولانا کے شاعری سے تائب ہونے یا اس سے کنارہ کش ہوجانے کی کسی نہ کسی طرح اطلاع ہوگئی تھی۔ بہرصورت وجہ کچھ بھی ہو، شاعری کا سلسلہ بالکل منقطع ہوگیا۔

ان خطوط میں، تین خطوں کے اندر ایک ایک غزل یعنی کل تین غزلوں کا اور ایک خط میں کچھ نئی اور پرانی غزلوں کا اور ایک خط میں کچھ اشعار کا تذکرہ ہے۔ اس تمام سرمایہ شعری میں سے، صرف ایک غزل زود پشیمان کے ڈرامہ میں موجود ہے بقیہ غزلوں اور اشعار کا پتہ نہ لگ سکا، ڈرامہ زود پشیماں میں پانچ غزلیں اور ہیں، ممکن ہے، نئی اور پرانی غزلوں میں یہ غزلیں بھی شامل ہوں اور اکبر مرحوم نے ان پر اصلاح کی ہو۔ اس طرح کل چھ غزلیں، اس وقت موجود ہیں، زود پشیماں، کمیاب ہو چکا ہے اس لئے اس کی پانچوں غزلیں یہاں پیش کی جاتی ہیں وقت ہوتا تو ناظر کے سرمایہ شعری کی مزید تلاش کی جاتی، یہ سرمایہ مختلف رسائل و جرائد میں ہوگا۔ مجھی حکیم عبدالقوی دریابادی صاحب نے بتایا کہ ۱۷ء، ۱۸ء کے معارف اور الناظر میں کچھ غزلیں شائع ہوئی تھیں، افسوس کہ یہ پرچے نہ مل سکے۔

[۵۲] خط ۲۹ صفحہ ۱۴۷ ۴ر جنوری ۱۹ء

حکیم صاحب کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا کے پاس بھی کوئی غزل موجود نہیں ہے اسلئے انھیں غزلوں پر اکتفا کرنا پڑا۔

مجھ کو محروم کرم میری وفا نے رکھا
ان کو مشغولِ ستم ان کی جفا نے رکھا

دل یہ کیا جانے کہ شمشیر ہے کیا، تیر ہے کیا
اس کو بسمل ترے انداز و ادا نے رکھا

یہ ترا شعلۂ رُخ گیسوئے مشکیں سے چھپا
یا چھپا کر مہرِ تاباں کو گھٹا نے رکھا

ایک دم ہو نہ سکی ہم سے کبھی طاعتِ حق
ایسا پابند ہمیں حرص و ہوا نے رکھا

شوخیاں تیری نہ ظاہر ہوئیں خود تجھ پہ کبھی
تجھ کو دھوکے میں تری شرم و حیا نے رکھا

مرگ و انجام کا بھولے سے بھی آیا نہ خیال
دل کو غفلت میں سدا نشو و نما نے رکھا

کس زباں سے کہہ اپنے تئیں ناظرؔ آزاد
قیدِ اُلفت میں تو اس زلفِ دوتا نے رکھا

ان کے انداز میں اُلفت نہ وفا ہوتی ہے
ہاں اگر ہوتی ہے کوئی تو جفا ہوتی ہے

پھر ہے بیتاب زباں عرض تمنا کے لئے
دیکھئے دیکھئے پھر مجھ سے خطا ہوتی ہے

تجھ کو کھلنے نہیں دیتی کبھی عصمت تیری
شوخیوں پر بھی تری [illegible] ہوتی ہے

مل ہی جاتی ہیں کبھی اپنی نگاہیں اُن سے
وہ بھی جب ایسی ہی تقدیر رسا ہوتی ہے

لذّتِ وصل کے منکر تو نہیں ہم لیکن
لذّتِ کاہشِ ہجر اس سے سوا ہوتی ہے

اُس نے خودداریٔ ناظرؔ کو مٹا کر چھوڑا
یہ محبت بھی عجب سخت بلا ہوتی ہے

شورشِ جوشِ جنوں اَب جلوہ دکھلانے کو ہے
یعنی جو کچھ دل میں تھا، سب لب پہ آ جانے کو ہے

رُخصت اے ضبط و تحمل، الوداع اے پاسِ وضع
بندشوں سے اب زباں آزاد ہو جانے کو ہے

ہو چکی صبر و سکون و خامشی کی انتہا
جامِ ضبطِ آہ و نالہ اب چھلک جانے کو ہے

تو مبارک تم کو اے اہلِ تماشا سیر نو
دستِ بسمل سے عنانِ ضبط چھٹ جانے کو ہے

خوب کر مشقِ جفا، لیکن ستمگر یہ بھی سوچ
کیا وفا کیشی کا جذبہ اس سے مِٹ جانے کو ہے

بے ادب لب، ان سے کچھ کہنے کو ہیں پھر مضطرب
ان کے چہرے پر حیا کی پھر جھلک آنے کو ہے

سچ بتا ناظرؔ مسرت تجھ کو اتنی کیوں ہے کیا
ان کی محفل میں کوئی تیری غزل گانے کو ہے

مدت ہوئی ہے پاسِ نزاکت کئے ہوئے
آہ و فغاں سے شورِ قیامت کئے ہوئے

لو دیکھو آ گیا نہ زباں پر کسی کا نام
مدت سے ہم تھے ضبطِ محبت کئے ہوئے

اگلا سا وہ سکون و متانت کہاں کہ اب
شوریدگی ہے بندۂ وحشت کئے ہوئے

پھرتا ہے پھر نظر میں کسی کا خرام ناز
سامانِ انتہائے قیامت کئے ہوئے
وہ دل کہ جلوہ گاہِ سرور و نشاط تھا
اب غم ہے اس کو مدفنِ حسرت کئے ہوئے
پھر شوقِ دید ہے کہ چلا میں عدو کے گھر
خودداری و غرور سے فرصت کئے ہوئے
پھر دل میں ہے کہ دیکھئے جرأت کا امتحاں
انجام [illegible] قسمت کئے ہوئے
اب دل میں ولولہ بھی نہیں کوئی [illegible]
[illegible] قسمت کئے ہوئے
بیگانہ وار در پہ کسی کے چلا ہوں پھر
سامانِ صد نہفتنِ الفت کئے ہوئے
ناظر کے ہوش و عقل بھلا اب کہاں درست
ہے مست اس کو بادۂ الفت کئے ہوئے

زینتِ حسن ہے خود اپنے پہ نازاں ہونا
[illegible] ہونا
عاشقی کیا ہے بجز کشمکشِ عقل و جنوں
دل کو آفت میں پھنسا آپ ہی حیراں ہونا
زندگی اصل میں ہے اک قفسِ طائرِ روح
موت کیا ہے اسی زنداں سے گریزاں ہونا
نامرادی مری ہمزاد تھی، تو کیوں یا رب
میری قسمت میں لکھا صاحبِ ارماں ہونا
ہم شہیدانِ وفا موت کے خود ہیں مشتاق
کفر اس شرع میں ہے طالبِ درماں ہونا

اے اجل آس ہے تیری ہی دمِ یاس و الم
تجھ سے زیبا نہیں انساں کو ہراساں ہونا
رازِ ہستی وہ گرہ ہے جو کبھی کھل نہ سکی
فلسفی کے لئے آخر ہے پشیماں ہونا
اس جفاکار نے اب کی بھی تلافی تو کیا
اب مقدر میں تو ہے قبر کا مہماں ہونا
میرا انجام ہے دنیا کو اک عبرت کا سبق
دوستو تم نہ کبھی عشق میں غلطاں ہونا
سب کو آخر ہے فنا حسن ہو یا عشق و وفا
اہلِ ہستی کبھی ہستی پہ نہ نازاں ہونا
لذتِ درد کے منکر کو سنا دو یہ شعر
ناظر آساں نہیں غالب سا سخنداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ان چند غزلوں سے ناظر کے رنگ شاعری کا اندازہ ہو جاتا ہے، اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بادۂ الفت سے مست ہونے اور عقل و ہوش کے درست نہ ہونے کے باوجود ناظر نے "آبروئے شیوہ اہلِ نظر" کا ہمیشہ پاس رکھا۔

بقیہ مضمون صفحہ ۴۷ (از اشتیاق احمد عباسی)

اکثر لوگ اُنکی صاف گوئی سے گھبراتے ہیں۔ اُنکو خشک مزاج اور سخت گیر سمجھتے ہیں، مگر جو لوگ ہوش مند، ور سمجھدار ہیں۔ ذی فہم ہیں اور اُن کو قریب سے جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اُن کے مزاج میں سختی ہو تو ہو مگر ریا کاری، ور تعصب اور عناد کا شائبہ نہیں۔ نہ اُن کے مزاج میں کبر ما نہ امتیاز اور تفریق ہی کا مادہ ہے۔ تنقید اور تنبیہ میں وہ ر ورعایت کو دخل نہیں دیتے جب موصوف کسی بات پر معترض ہوتے ہیں تو ان کی نیت اور منشا اور مدعا ہمدردانہ ہوتا ہے مخالفانہ نہیں ہوتا۔ اُنکی دلی خواہش رُشد وہدایت اور رہبری کی ہوتی ہے۔ دستگیری کی ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ پریسیڈنٹ ذاکر حسین صاحب مرحوم سے اُن کے تعلقات بہت دوستانہ اور محبانہ تھے مگر ان کی کوئی بات ناگوار ہوتی تھی تو وہ اُس پر اسی بیباکی سے معترض ہوتے تھے جیسے کسی غیر متعلق آدمی کی بات پر، اور اُن کا یہ اعتراض کبھی ان کے تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوا۔

میرا خیال ہے کہ ان کے دینی خیالات میں جو پختگی آئی ہے وہ اس وجہ سے کہ انھوں نے یہ بھید پا لیا کہ آدمی کا عقیدہ صرف قرآن پاک کی رہبری اور احکام پر ہونا چاہیئے اور تمام لواحقات کو چھوڑ کر مسلمان کو صرف احادیث نبوی کا پیرو ہونا چاہیئے۔ ان کے علاوہ تمام اور باتیں صرف الجھاؤ کی ہوتی ہیں۔ اسلام الجھاوے کی چیز نہیں۔

بالآخر مجھے ایک ذاتی معذرت یہ کرنا ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سہ

نہ مضمون نگاری ہے، نہ آشفتہ بیانی ہے
حقیقت حال، سچا واقعہ، سچی کہانی ہے

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

عبدالماجد دریابادی

دریاباد انگریزی عمل داری کے شروع میں خود ایک ضلع تھا اب ضلع بارہ بنکی میں ایک قصبہ سمجھا جاتا ہے۔ عبدالماجد صاحب اسی قصبہ میں مارچ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد حاجی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر تھے عبدالماجد صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اردو، فارسی، عربی پڑھ کر سیتاپور ہائی اسکول سے ۱۹۰۸ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور ایف۔ اے اور بی۔ اے کیننگ کالج لکھنؤ سے پاس کیا، طالب علمی ہی کے زمانے سے آپ کی تحریریں اخباروں اور رسالوں میں جگہ پانے لگی تھیں، کتب بینی کا اس قدر شوق تھا کہ کسی سے ملنا جلنا بھی نہ پسند کرتے تھے۔

والد کے انتقال کے بعد فکر معاش ہوئی تو مضامین لکھ کر کچھ روپے کمانے لگے، ملازمتیں متعدد ملیں مگر دیر پا بہت نہ ہوئیں۔ بی۔ اے۔ کے بعد حیدرآباد گئے اردو میں فلسفۂ جذبات لکھ کر موصوف نے دنیائے علم پر اپنا سکہ بٹھا دیا، اس کے بعد سے اور بھی علمی اور ادبی کتابیں لکھتے رہے عبدالماجد صاحب کو صحافت سے بھی کافی دلچسپی رہی ہے، چنانچہ اردو کے کئی ایک مشہور اخبار مثلاً ہمدم، ہمدرد، حقیقت وغیرہ آپ کے مرہون منت تھے، آپ نے اپنا ایک اخبار "صدق" (سچ) نکالا اور عافیت کے ساتھ دریاباد میں زندگی بسر کرتے رہے بچپن سے جو کتب بینی کا مشغلہ تھا وہ اس وقت تک جاری ہے۔

عبدالماجد دنیائے اردو میں اپنی فلسفہ دانی کی وجہ سے نہایت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ انھوں نے اس معرکہ میں کارنمایاں کئے ہیں، اردو میں فلسفہ بہت کم تھا جو ذخیرہ تھا بھی اس میں بیشتر حصہ ترجمہ کا تھا، مگر عبدالماجد نے

نہایت جانفشانی و قابلیت کے ساتھ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی، اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھیں اور کارآمد کتابوں کا غیر زبان سے اردو میں بھی ترجمہ کیا۔

آپ کی تصانیف میں "فلسفۂ جذبات" اور "فلسفۂ اجتماع" اور ترجمہ میں "مکالمات برکلے" نہایت قابل قدر کتابیں ہیں، ترجمہ میں سب سے پہلی چیز جہاں لوگوں کو لغزش ہو جاتی ہے وہ زبان کا میدان ہے۔ انگریزی نما اردو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ مترجم کا اہم فرض ادا ہوگیا، لیکن یہ وہ ٹھوکر ہوتی ہے کہ جس کی بدولت قبول عام کا شرف ہمیشہ دور باش کی صدا دیتا ہے۔ عبدالماجد نے اس ترجمہ میں علاوہ اور باتوں کے زبان و طرز بیان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے، محاورہ اور روزمرہ کی چاشنی مناسب مقامات پر دیتے ہوئے مضامین کی دشوار گزار راہوں سے بھی نہایت خوبی و کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی ہر وقت باقی رہتی ہے۔

تصنیفات میں زبان عالمانہ ہے، غالباً فلسفہ کی اہمیت و وقعت پسندی کا خیال رکھ کر وہ عربی و فارسی کے ادق الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن زبان پر عبور رکھنے کی وجہ سے عبارت میں تسلسل اور شگفتگی قائم رہتی ہے۔ ان کے اسلوب بیان کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ جیسا ماحول ہوتا ہے ویسی ہی زبان اور الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، مثلاً فلسفہ کا مضمون لکھنا ہے تو پیرایہ عالمانہ ہوگا، الفاظ بھی عربی اور فارسی کے ذرا مشکل قسم کے صرف ہوں گے۔ مرزا رسوا کی سوانحعمری یا شاعری پر تنقید ہوگی تو بیان کرنے کا ڈھنگ بھی الگ ہوگا اور الفاظ بھی کچھ مشکل ہوں گے، لیکن مرزا شوق کی مثنویوں (زہر عشق وغیرہ) کے متعلق اظہار خیال فرمائیں گے تو زبان اور الفاظ بھی اسی قبیل کے ہوں گے جو مرزا شوق کے کلام اور زبان کو پورا طرح ذہن نشین کرا دیں یعنی اس وقت ان کی تحریر میں عام فہم کسی قدر شوخ الفاظ نظر آتے ہیں، اسلوب بیان بھی اس قسم کا ہوتا ہے کہ عامیانہ فضا کو نہ دن لپیٹ ہونے دے کہ مبتذل نظر آئے اور نہ اتنا بلند ہی کر دے کہ فلسفہ کی طرح دماغ رسائی کے تخیل سے پرے پرواز کا مطالبہ کرے، مختصر یہ کہ بات کو اس کی اصلی حالت پر قائم رکھتے ہوئے مفہوم و نکات کو نہایت آسانی سے ذہن نشین کرا دیتے ہیں باوجود ان باتوں کے بھی طرز بیان کی انفرادیت سے نہیں جانے دیتے۔

ان کے اسلوب بیان کا ایک خاص انداز یہ کہ کے درمیان میں کبھی کبھی سوالات خود ہی کرتے ہیں، اس طرح بحث، مطلب، نکتہ کے متعلق جتنے موافق و مخالف سوال ہو سکتے ہیں سب کا احاطہ کر لیتے گویا یہ خواہش کہ جو ایک سمجھدار آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے نہایت خوبی سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی تحریریں پڑھنے والے کو علاوہ زور بیان کے تاثیر اور زور کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے بہت زیادہ لطف اس جگہ آتا ہے جہاں آپ بول کے وہ الفاظ کبھی کبھی لے آتے ہیں جو غالباً بولنے کے لئے مخصوص ہیں مثلاً "ہا" جو اظہار غم کے زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے، مرزا رسوا قصے میں ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:-

"کیسے کیسے افسانہ گو، افسانہ نویس آئے
اور کیسی کیسی مزیدار کہانیاں سنانے
بیٹھے مگر ہائے" دیکھتے دیکھتے خود ان
ہی کی زندگی افسانہ بن گئی۔"

مولانا شاہ معین الدین ندوی۔ ایڈیٹر ماہنامہ معارف

مولانا کے دو ادبی شاہکار

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی قلمی فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع ہے فلسفہ و معقولات سے لیکر مذہب و تصوف اور ادب تک مختلف اصناف میں ان کے بلند پایہ مضامین اور مختلف تصانیف موجود ہیں لیکن وہ اصلاً ادیب ہیں اور ان میں ادب و انشا کا ذوق اتنا رچا اور بسا ہوا ہے کہ ان کا امتیازی وصف بن گیا ہے جس سے ان کی مذہبی اور فلسفیانہ تصانیف بھی خالی نہیں۔ زبان و ادب کے ہر پہلو پر ان کو حکمرانی بلکہ صاحبقرانی حاصل ہے اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پرانے کلاسیکی ادب میں جو خصوصیات الگ الگ پائی جاتی تھیں وہ مولانا میں یکجا نظر آتی ہیں سنجیدہ علمی ادب، لطف زبان، روزمرہ طنز و ظرافت اور ضلع جگت سب پر ان کے قلم کی حکمرانی یکساں ہے اس لحاظ سے وہ اس دور کے سب سے بڑے ادیب ہیں۔ ایک مختصر مضمون میں ان کی تمام خصوصیات کو دکھانا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے اس لئے مضمون میں ان کے دو ادبی شاہکار "اردو کا ایک واعظ شاعر" اور "مرزا رسوا کے قصے کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے" کی روشنی میں ان کے ادب و انشا کی صرف ایک ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی جائے گی۔

مولانا حالیؔ کی متانت و ثقاہت اور قوم و ملت کے درد میں ان کی غمگینی اور افسردہ دلی اتنی مسلم ہے اور ان کی قومی و اصلاحی نظموں کی اتنی شہرت ہے کہ جس نے ان کے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہ قیاس بھی نہیں کر سکتا کہ مسدس اور مناجاتِ بیوہ جیسی نظمیں کہنے والے شاعر کا قدم تغزل کے میدان میں بھی کسی بڑے سے بڑے غزل گو شاعر سے پیچھے نہیں ہے اور وہ ایسی گرم غزلیں کہہ سکتا ہے جن پر میرؔ، غالبؔ، اور مومنؔ کا دھوکا ہوتا ہے۔

"اردو کا ایک واعظ شاعر" میں حالیؔ کی شاعری خصوصاً ان کے تغزل پر ایسا دلکش تبصرہ ہے کہ وہ بجائے خود ایک ادبی شاہکار بن گیا ہے اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر سے جب پہلی مرتبہ حالیؔ کا یہ مشہور شعر ؎

تعزیر جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

گزرا تو لکھوں نے اس کو شعر سمجھا غالب کا شعر سمجھا مگر مولانا شبلی سے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ غالب کا نہیں بلکہ مولانا حالی کا ہے مضمون کا آغاز اس حیرت سے ہوتا ہے۔

"ہائیں یہ کیا ارشاد ہوا کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر، بیچارے ایک سیدھے سادے واعظ قسم کے آدمی، روکھے پھیکے اشعار کے ناظم انھیں غزل اور پھر غزل کے کسی پھڑکتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا؟ شعر کے سارے تیور استاد غالب کے تخیل وہی بندش، وہی زبان، وہی حالی کے کلام میں نہ حسنِ بیان نہ لطفِ بیان نہ یہ روح نہ جان نہ تخیل میں رعنائی، نہ طرزِ ادا میں زیبائی غرض دل نے کچھ جھنجھلا کر اور کچھ خفیف ہو کر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں لیکن حقیقت بہرحال حقیقت رہتی ہے دیوان اٹھا کر دیکھا تو غزلیات کی ردیف دال میں یہ شعر اپنی جگہ پر موجود۔"

کون حالی وہی جن کے تغزل و تشبیب کی کوئی وقعت دل میں تھی ہی نہیں بس شروع سے یہ خیال جما ہوا تھا کہ غزل کی رنگینیوں اور رنگین بیانیوں سے انھیں واسطہ کیا ایک خشک نظم نویس، کلام میں عاشقانہ مضامین کا قحط، بندشیں سست خدا غریق رحمت کرے دلورا دل کا ودھ پیج لاڈ بھلا کرے اسکے نقادانِ فن اور سخن فہمانِ سخن کا یہ اس کا فیض تھا کہ ایک عامی اور مبتدی طالب علم ہی کے نہیں خدا جانے کتنے پڑھے لکھوں، پختہ کاروں لائق فائق زبان دانوں کے دل میں بھی سوچا ہوا تھا ادھر حالی کا نام آیا ادھر کلام کی بے لطفی، بے اثری اور روکھے پن کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔"

پھر خیال ہوا کہ دو چار اچھے اشعار تو ہر شاعر کے کلام میں نکل آتے ہیں اس کی سند نہیں دیوان حالی کا مطالعہ کرنا چاہیئے مگر جتنا مطالعہ کرتے جاتے ہیں نظر سے پردہ ہٹتا جاتا ہے اور تغزل کے ایک سے ایک ہوش ربا جلوے نگاہ کے سامنے آتے جاتے ہیں اگر ان سب پر مولنا کا تبصرہ نقل کیا جائے تو پورا مضمون ہی نقل کرنا پڑے گا اسلئے اِدھر اُدھر سے کچھ نمونے نقل کئے جاتے ہیں۔

اس کا آغاز الف کی ردیف کے اس شعر سے ہوتا ہے ؎

ہم وقت وداع ان سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

"وداع و رخصت کے بڑے بڑے رقت انگیز مضمون آپ کی نظر سے گذر چکے ہوں گے لیکن حسرت و یاس کی جو تصویر اس رونے میں نہیں ہنسنے میں دکھائی گئی ہے اس کا بھی کوئی جواب ہے؟"

اس کے بعد اس ردیف کی دوسری غزل سامنے آتی ہے ؎

آتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے ہیں ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و کماں نہ تھا

کہیئے خشک نگاروں کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے اور آگے چلئے ؎

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اُترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

بدگمانی کے لئے غیر کا سایہ پڑنا بھی کافی ہوتا ہے یہاں عین بزمِ رقیب میں رونقِ محفل بنا ہوا دیکھتے ہیں اور یہ کمالِ دلربائی ہے کہ جی پھر بھی نہیں ہٹتا کمال اپنا نہیں اپنے وفورِ عشق کا نہیں تمام تر انہی کا ہے انہی کے حسنِ بے پایاں کا "پوچھنا کیا تری زیبائی کا" گویا جمال بھی انہی کا اور کمال بھی انہی کا غالب کا مشہور مطلع ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہی زمزمہ حالی کی زبان سے سنئے اور واہ واہ کرتے رہ جائیے ؎

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

تجلیاتِ حسن کہاں نہیں؟ دکھائی نہ دیں تو قصور اپنی نظر کا ہوا یا حسنِ نامحدود کا۔

شعر یہ کہا ہے اور اپنی ساری متانت و ثقاہت کے باوجود حضرت زاہد کے دامن پر چھینٹے ڈالتے گئے ہیں ؎

حالی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا نے کچھ
ٹھہرا قصوروار اگر بے قصور تھا

شوخی و ظرافت دو الگ کے لئے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ و فحاشی سے مل جائیں۔ حالی تریف بھی متین اور آخر میں بھی متین، ذرا طنز، موجود ان کے یہاں سب کچھ لیکن متانت کی شان سب پر غالب گویا حضرت اکبر الہ آبادی کا پورا جواب یہاں ہر منظر پر متانت کا پردہ پڑا ہوا وہاں ہر چہرہ پر ظرافت کا غازہ لگا ہوا ان کا یہ رنگ کہ روتے ہوئے کو بھی گدگداتے جائیں۔ ان کا یہ ڈھنگ کہ ہنسی آئے بھی تو پہلے منہ پر رومال رکھ دیں ایک کے ہاں تمام تر شوخی و رنگینی دوسرے کے یہاں اک ذرا سی اداسی اور غمگینی ایک کے ہاں قہقہوں اور تالیوں کا شور، دوسرے کے ہاں ادب لحاظ اور قاعدے کا زور، ایک مجلس طرب افروز دوسرے کی صحبت سبق آموز، ان کی پر شراب و کباب ان کے دواخانہ میں بید مشک اور گلاب باتیں بھی عاشقوں کی کہہ جاتے ہیں لیکن وہی

ع نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

زبان سے جو بول ادا ہوتا ہے نیچی نظروں اور شرمیلی نگاہوں کے ساتھ، لغزشِ مستانہ کے بجائے ہر قدم سلامت روی کی تصویر لیکن کلام میں حلاوت اس درجہ کہ پڑھتے جائیے اور دل ہی دل میں مزے لیتے جائیے

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

مطلع تو معمولی ہے لیکن آگے کی گلکاریاں ملاحظہ ہوں

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

ٹھنی ہیں ہم کہ دوست نہ ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہونچے ہیں کہ ؎

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

ذرا ان بزرگ کی کم سخنی ملاحظہ ہو کچھ نہ کہنے پر سب کچھ کہہ جاتے ہیں رات کے نہ ملنے کی وجہ ظاہر ہے وعدہ تھا کس سے اور پورا کہاں ہوا دہی "کہاں تھا" "کہاں نہ تھا" کی پرانی داستان کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو کھل کھیلتا اور "معاملہ" کے پہچان جانے کی علامتیں خدا جانے کیا کیا بیان کر جاتا۔ ایک حالی کی متانت ہے کہ صراحت الگ رہی کسی اشارے کے بھی روادار نہیں، دو ہی چیزیں نگاہ میں اور زبان پر صرف اس قدر کہ

ع، پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا"

پھر آگے کہتے ہیں ؎

"ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا

یہاں استاد مومن کا بھی ایک مطلع یاد کر لیجئے ؎

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے"

ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا آئی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کہئے اب بھی حالی دہلی کے نرے کھرے واعظ رہے؟ وہی خشک اور بے مزہ پھیکی اور بے اثر نظم کہنے والے اور پھر اس غزل کے بعد یہ غزل ؎

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہمان
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت"

دیکھئے دیوان کی جاری جاری ورق گردانی کرتے کرتے ہم اب ردیف میم تک پہونچ گئے ایک غزل پر نظر جم کر رہ گئی۔ معاملہ بندی کی ساری نزاکتوں کے ساتھ ساتھ یہ متانت یہ احتیاط یہ ضبط حالی ہی کا حصہ ہے ؎

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرزِ بیاں سے ہم

یہ اشعار اگر حالی کے دیوان سے نکال کر مومن یا شیفتہ کے دیوان میں لگا دیے جائیں تو کسی کو کچھ پتہ نہ چلنے پائے گا؟ "گرانیاں ہیں" – "کہانیاں ہیں" والی غزل اس زمانے کی ہے جب حالی شاعر حالی واعظ کے قالب میں آ چکے تھے اس پر بھی ذیل کے دونوں شعر دیکھیے شعر کی زمین ہے کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہے ؎

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پہ ہنستے ہیں چار ہم پر
"یاں تک ہماری پہونچیں اب ناتوانیاں ہیں"

ردیف "رہے" میں دو مختصر غزلیں "گمان رہے" "نشان رہے" کی زمین میں ہیں اس زمانہ میں دو ایک شعر ایسے صاف بے جھجک اور گویا سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں کہ بے تکلف زبان پر چڑھ گئے ؎

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گمان رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زبان رہے

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

یاران تیز گام نے منزل کو پا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حسن قبول اگر ایسے کلام کو حاصل ہو جائے تو اس پر حیرت ہی کیوں کی جائے مغز و معنی سے قطع نظر سلاست شستگی روانی، بے ساختگی کسی حیثیت سے بھی یہ کلام کسی بلند سے بلند نمونے سے پست ہے"

اسی طرح مختلف ردیفوں کی غزلوں پر تبصرہ کرتے کرتے ردیف "ی" پر پہونچ کر کہتے ہیں :-

"قلم کا مسافر اب ذرا دم لے شعر اب ایک دم نہیں رہا دس بیس نہیں سو پچاس شعر ہو چکے کوئی تیر کوئی نشتر اب بھی اس کلام سے وہی بدگمانی چلی جائیگی کہ خشک اور نرا واعظانہ ہے؟ خیال اب بھی یہی قائم رہے گا کہ حالی غزلگوئی میں بیٹھے ہیں؟ غالب اور مومن اور شیفتہ آسمان شعر کے آفتاب و ماہتاب ہوئے ہیں انھیں کے معیار پر کسیے جانچ لیجیے اور پرکھ لیجیے"

حالی کے تغزل کی رنگینی دیکھ چکے اب مولانا ہی کے الفاظ میں قومی درد کی تڑپ ملاحظہ فرمائیے :-

"یہ سب کچھ ہے لیکن اس پر بھی حالی کا اصلی میدان غزل کا میدان نہیں، ان کی شاعری واہ کی نہیں آہ کی ہے۔ جوش و ولولہ کی نہیں حزن و حسرت کی ہے۔ نوعمری میں جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن عمر کی پختگی کے بعد تو گل و بلبل کے افسانے چھوڑ اور زلف و ابرو کے جنجال سے نکل بس قوم کے ہو رہے تھے اور اب وہ قوم کا ماتم، ساز کوئی سا بھی ہو تا نغمہ یہی جب نکلتا کسی بڑے سے بڑے زندہ دل ظریف کا جوان جیتا بیٹا آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو [illegible] وقت باپ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی [illegible] کے لیے کھلا رہے گا یا آہ و بکا کے لیے" زبان پر حیرت و یاس کے کلمے ہونگے۔ یا کوئی نئی پھبتی

سوجھے گی؟ بس جو حال ہمارا آپ کا ساری دنیا کا بیٹوں کے لئے بھائیوں کے لئے رہتا ہے حالی کا وہی حال ساری اُمت اسلامیہ کے لئے ساری ملّت کے لئے، ساری قوم کے واسطے تھا۔"

"طبیعت پر حسرت، اُداسی اور غم گینی مستقل طور پر غالب ہوگئی تھی، جو بات منہ سے نکلتی درد کی کسک سے خالی نہ ہوتی دہلی کے طبیب اعظم حکیم محمود خاں کا مرثیہ لکھنے بیٹھے تو لگے بجائے فرد کے قوم کا ماتم کرنے، غم نصیب سانحہ زدہ بڈھیوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ دل پر جب تازہ داغ کھاتی ہیں تو ساتھ ہی پچھلے داغ بھی تازہ ہو جاتے ہیں اور بین آپ نے آج ہی پر نہیں گذرے ہوئے کل اور بھولے بسرے ہوئے برسوں پر بھی کرنے لگتی ہیں۔ حالی کا سینہ بھی داغوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا، محمود خاں کے مرثیے کے آخری بند ملاحظہ ہوں اپنے اصل مذاق طبیعت کی مصوری خود ہی کردی ہے پڑھتے جائیے اور دل اگر درد مند ہے تو سرد آہیں بھرتے جائیے۔"

اس کے بعد مرثیہ کا آخری بند نقل کیا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

"آخری مصرعہ میں واعظ شاعر کی پوری آپ بیتی آگئی ہے۔"

تیر نہ تھا کہ ظرافت نہیں آتی تھی طنز تو ایسا کر جاتے ہیں اور اس کثرت سے کر گئے ہیں کہ کوئی اگر طنزیات حالی کو یکجا کرنے پر آجائے تو طنزیات و مضحکات کا اچھا خاصا رسالہ تیار کرلے جائے لیکن وہی متانت کا طبعی رنگ ظرافت پر چھایا ہوا کھلکھلا کر ہنستا تو جانتے ہی نہیں جو دوسروں کو ہنسانا چاہتے بھی ہیں تو خود محض زیر لب مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔"

اس کی مثال میں کالے اور گورے والی نظم نقل کی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

"ایک کالا پیٹ کے گورے سے جو فوراً مر نہ جائے
تسے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

"اب ایسا کون بے انصاف ہوگا جو اس کے بعد بھی حالی خشک نگاری کا شکوہ سنج رہے چلا جائے گا۔" اب ہو کے قلم سے دلّی کے ایک تاریخی مشاعرہ کا پڑ اثر منظر ملاحظہ ہو:۔

"مشاعرے کی محفل گرم ہے، کاملین فن جمع ہیں دہلی کے دور آخر کے اُستادوں کا مجمع ہے لوگ منتظر ہیں کہ غالب و شیفتہ کے شاگرد رشید کی زبان سے کوئی پھڑکتی ہوئی مزیدار سی عاشقانہ غزل سننے میں آئے گی۔ رندی و ہوسناکی کی روح تازہ ہوجائے گی مگر شاعر کا منہ کھلا تو یک بہ یک یہ معلوم ہوا کہ مشاعرہ نہیں مجلس عزا ہے اور غزل نہیں نوحہ پڑھا جا رہا ہے، اگلے عزیز و رفیق سب ایک ایک کرکے یاد آرہے ہیں اور نام لے لے کر بھڑاس نکالی جا رہی ہے۔ یہ نوحہ آج بھی اور کاغذ پر چھپا ہوا دل والوں کے لئے مؤثر ہے ساٹھ سال پیشتر کیا کچھ رقت انگیز رہا ہوگا۔ خصوصاً جس وقت قدر دانوں کے بھرے مجمع میں شاعر کی زبان سے اسکے پر اثر لہجہ کے ساتھ ادا ہوا ہوگا۔

اسکے بعد وہ مشہور غزل یا نظم نقل کی ہے جس کا
پہلا شعر ہے ؂

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

اور آخری شعر یہ ہے ؂

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

اس پر یہ تاثر ہے بجائے خود ایک دلدوز مرثیہ ہے ؂

"آج اگر ملا رموزی صاحب ٹیک پڑتے تو ہیں دہلی مرحوم کے مرحوم ہونے کا احساس کب ہے آنکھوں میں تو اب نئی دلی بسی ہوئی ہے شاہجہان آباد کو جانتا کون ہے؟ اسمبلی ہال کے سامنے لال قلعہ کو تھا کنے بھی کون جاتا ہے؟ افسانہ ماضی کو تو ہم ماضی کے حوالے کر ہی چکے اب رونا آئے بھی تو کس بات پر؟ بھائی اور بیٹے کی تازہ میت پر سب روتے ہیں مرے ہوئے پردادا پردادا کی موت کے ذکر پر آنسو نکلتے کس کے دیکھے ہیں؟"

مولانا حالی کی دوسری قومی و ملی اصلاحی نظموں پر بھی اسی طرز کے تبصرے ہیں ان سب کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں لیکن مناجات بیوہ پر تبصرہ کے بعض ٹکڑوں کو نقل کئے بغیر یہ مضمون ناقص رہے مناجات خود ہی بڑی دردانگیز اور موثر نظم ہے مولانا کے "مصورِ غم" قلم نے اس کے درد اور تاثر کو اور بڑھا دیا ہے فرماتے ہیں۔ "مناجاتیں آپ نے بہتوں کی سنی ہونگی بڑے بڑے عابدوں اور زاہدوں کی سنی ہونگی اب فریاد ایک بیکس و بے بس بے آس اور نامراد دکھیاری کی بھی سنتے چلئے۔"

"آگے پڑھنے سے قبل اگر خدانخواستہ آپ کے حلقہ میں کوئی بپتا کی ماری نوجوان بیوہ ہو تو اس کا تصور ذہن میں جما لیجئے نوعمری کا زمانہ، شوخی و شرارت کا ہونا کھیلنا کھانا، دوڑنا بات بات پر ہنسنا ہنسانا ماں باپ نے بیاہ کس شوق، کس خوشی سے رچایا۔ ہاتھوں پیروں میں مہندی لگی، نئے نئے بھاری جوڑے، نئے نئے زیور گہنے۔ طرح طرح کی رنگینیاں، نت نئی شوخیاں، دل میں کیسے کیسے ارمان بھرے ہوئے نظروں میں کیا کیا نقشے جمے ہوئے اتنے میں یک بیک سب غائب، سارا منظر خواب و خیال، یہ ہاتھ اب عمر بھر چوڑیوں کو ترسیں گے، یہ کپڑے اب کبھی خوشبو سے آشنا نہ ہوں گے، دنیا اپنے عیش کے کاروبار میں مصروف محلہ اور برادری میں شادی کی دھوم، خاص اپنے گھر میں برسات کی ملاریں جھولے پڑ رہے ہیں کھیل پر کھیل ہو رہے ہیں۔ ساتھ کی کھیلنے والیاں ساتھ کی مانگی بیاہی ہوئی۔ نئی نئی ساریاں باندھے شوخ رنگ کے بلاؤز پہنے کیسے کیسے طرحدار دوپٹے اوڑھے آنکھوں کے سامنے کوئی ہنس رہی ہے کوئی دوڑ رہی ہے ایک یہ مصیبت کی ماری اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔

سہیلیاں زیوروں سے لدی ہوئی کس شوق سے کس چاؤ سے ایک دوسرے کو اپنے اپنے زیور دکھائے جا رہے ہیں؟ ہاتھوں میں مہندیاں رچی ہوئی ہیں پھولوں کے گہنے سر اور گلے کو زینت دے رہے ہیں۔ کہیں ذکر میاں

کی چاہ پیار کا ہو رہا ہے کہیں تذکرے سسرال کی ناز برداریوں کے ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی پر فقرے کسے جا رہے ہیں قہقہوں کا غلُ ہے رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔ ادھر ایک بیچاری اللہ کی بندی ایسی ہے جس کے ہاتھ بھی ننگے اور کان بھی۔ جسم رنڈاپے کی سپید چادر سے چھپا ہوا سن آخر اس کا بھی وہی ہے کیا اس کے دل میں کوئی ارمان نہیں رہا ہے؟ اس کا قلب امنگوں سے، حوصلوں سے، ولولوں سے خالی بنایا گیا ہے کیا اس دُکھیاری کا جی نہیں چاہتا کہ کوئی اس کا بھی ناز بردار ہوتا؟ یہ بگڑتی کوئی مناتا یہ فرمائشیں کرتی کوئی دل و جان سے انھیں پوری کرکے دیتا روتی جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے ؎

اے بڑے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی ہوں تری دکھیاری
دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن
جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری
میکے اور سسرال پہ بھاری
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے
ایک ہنسی نے گُل یہ کھلائے
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک
اور روؤں تو روؤں کہاں تک الخ

حسرت نصیب اپنے دن سن کو دیکھتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھ کر رہ جاتی ہے پھر بلک بلک کر اپنے مالک و مولیٰ سے کچھ عرض کرنے لگتی ہے۔ جو کسک اس کی آواز میں ہے وہ عابدوں، زاہدوں کو کہاں نصیب عمر بھر کے مجاہدے سے ایک طرف اور ایک گھڑی کی شکستگی یہ بیچارگی یہ اپنی بندگی کا مشاہدہ دوسری کہتی جاتی ہے اور سننے والوں کے دل ہلائے لرزا دیتی ہے ؎

اے دین و دنیا کے مالک	اے راجا اور پرجا کے مالک
سب پر کھلا ہے در رحمت کا	برس رہا ہے مینہ نعمت کا
سب کو ترے انعام تھے شامل	میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
رہی اکیلی بھری سبھا میں	پیاسی رہی بھری گنگا میں
ترے سوا اے رتنے بانی	کون سنے یہ رام کہانی
کوئی نہیں اب لاگو میرا	باپ نہ بھائی ساس نہ سسر

اس طریقہ پر نظم کے مختلف اشعار اور نوجوان کے جذبات و تاثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر لکھتے ہیں :۔

"یہ مناجات تو وہ ہے کہ اگر مناسب ماحول میں پڑھی جائے تو تعجب نہیں جو درودیوار جھوم جھوم کر اپنی بولی میں اس پر آمین کہہ اٹھیں پھر انسان کا دل تو آخر انسان ہی کا دل ہے"۔

مولانا موصوف کے قلم سے غم و الم کی یہ تصویر کسی بڑے سے بڑے "مصورِ غم" کی تصویر سے کسی حیثیت سے بھی کم ہے۔

ناظرین ایک واعظ شاعر کے کلام پر مولانا۔ قلم کی گلفشانیاں اور اشکباریاں دونوں ملاحظہ کر

اب ایک ادیب کی ناول نگاری پر اس کی دلآویزیاں ملاحظہ ہوں :-

"مرزا رسوا شاعر بھی تھے اور ادیب ناول نگار بھی مگر اُن کی شہرت ناول نگار کی حیثیت سے ہوئی انھوں نے ذات شریف، افشائے راز، اختری بیگم اور امراؤ جان ادا کئی ناول لکھے ان میں سب سے زیادہ شہرت امراؤ جان ادا کو حاصل ہے مولانا نے مرزا رسوا کی شاعری اور ناولوں پر مختصر اور امراؤ جان پر کسی قدر تفصیلی تبصرہ کیا ہے اور بڑی ادیبانہ نکتہ سنجی سے اس کی خصوصیات دکھائی ہیں۔ مرزا رسوا کے ناول لطف زبان کا نمونہ ہیں۔ مولانا نے بھی اسی زبان میں گفتگو کی ہے بعض بعض مقامات پر امتیاز مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ مولانا کی تحریر ہے یا سرشار اور رسوا بول رہے ہیں۔"

مرزا رسوا کے ناولوں کی خصوصیات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

"مرزا کے پیش رو اکثر اور معاصرین بیشتر تکلفات میں اُلجھ کر رہ گئے۔ رسوا تصنع سے پاک اور آورد سے بے نیاز ابھی ہنسا رہے تھے، ابھی رُلانے لگے، مزاح و گداز، سوز و ساز، شوخی و متانت سبھی اپنے اپنے موقع سے موجود لیکن آمد، بے ساختگی ہر حال میں رفیق، شستگی و روانی ہر گوشہ بساط میں قلم کی شریک، جو منظر جہاں کہیں دکھایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مرقع ساز نے انگوٹھی پر نگ جڑ دیا ہے، ہر نقل پر اصل کا گمان ہر عرض میں جوہر کا نشان، تصویر پر صورت کا دھوکا، الفاظ کے پردے میں حقیقت کا جلوہ، لیکن ناول بہرحال ناول ہی ہوتے ہیں۔ اخلاق کے مسائل اور تصوف کے مقالات نہیں اور پھر ناول بھی وہ جو نہ تاریخی ہوں نہ اصلاحی ..... اسلئے خیال ہوتا ہوگا کہ ان ناولوں میں نوجوانوں کے بھانے اور نوعمروں کے جذبات نفسانی کو بھڑکانے کا سامان افراط سے موجود ہوگا لیکن توبہ کیجئے فحش اور عریانی الگ رہی، رکاکت اور ابتذال تک کہیں آنے نہیں پایا اور کہیں دو ایک جگہ جہاں صحیح مصوری اور سچی عکاسی کو اس کے سوا چارہ نہ تھا، وہاں بھی انداز بیان زیادہ سے زیادہ لطیف اشارے وکنائے کا رکھا ہے پس معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں کوئی گندی نالی پڑ گئی ہے اور آپ ہیں کہ رومال ناک سے لگائے ہوئے لپ جھپ لمبے لمبے ڈگ رکھتے اس سے گذرے چلے جا رہے ہیں تقریباً ہر افسانہ شریف گھرانوں میں بار پانے کے قابل، پڑھتے جائیے اور حیات بشری میں درک و بصیرت حاصل کرتے جائیے۔ آپ ادھر افسانہ کی لذت میں محو رہیں گے اور ادھر عبرت و ہدایت کے گھونٹ بلا تکلف حلق سے اُترتے چلے جائیں گے، کونین کی گولی پر شکر اس طرح لپٹی ہے کہ بڑے ضدی بچے بھی اسے دیکھ کر مچل پڑیں اور مچل مچل کر اس کی طرف لپکیں۔ ناصح کی تلخ نوائیوں کا رونا سب روتے آئے ہیں یہاں حضرت ناصح گھل مل کر رازدار

بن جاتے ہیں اور چپکے چپکے سرگوشیوں میں سب کچھ کہہ سن ڈالتے ہیں کیا مولی کی کرمی اور کارسازی ہے ، غالب نے کہا تھا ع

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

یہاں "ہادی" "رسوا" ہوکر بھی "ہادی" بنا رہا۔

مرزا صاحب نے افسانے کی زبان اور طرز بیان کے متعلق کچھ ہدایتیں دی ہیں جن سے آج بھی نئے لکھنے والے سبق حاصل کر سکتے ہیں ۔ اس مختصر مضمون میں ان سب ہدایتوں کو نقل کرنے کی گنجائش نہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ افسانے کی زبان روزمرہ کی سادہ اور سلیس ہونی چاہیئے اس میں جا بجا ، انگریزی ، عربی اور فارسی کے نامانوس الفاظ اور خودساختہ ترکیبیں ٹھونسنی چاہئیں جن کو سمجھنے کے لئے لغت دیکھنے کی ضرورت پیش آئے اور عبارت کو راشاہی یا "مولویانہ" اردو یا ان زبانوں کا ترجمہ معلوم ہو اور اس کی بڑی دلچسپ مثالیں دی ہیں ۔

مولانا ان کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :۔

"یہ نمونے مرزا صاحب نے اپنی نوجوانی میں لکھے تھے غریب کو کیا خبر تھی کہ ان کی زندگی ہی میں اور ان کے بعد اور بھی ذیل کی ترکیبیں بڑے بڑے اور نچے دعویداروں کے لئے باعث افتخار ہوں گی

اور "نیازی اسکول" کی تحریروں سے اس کی بڑی پرلطف مثالیں پیش کی ہیں جو بجائے خود زعفران زار کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان پر ان کا یہ تبصرہ تو سونے پہ سہاگہ ہے۔

• "ادب لطیف" اور پھر اس کے بعد "ترقی پسند" ادب کے دوہرے دوہرے عذاب اسی زمانہ تک اردو پر کہاں مسلط ہونے پائے تھے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اس قسم کے نمونے مرزا صاحب کی نظر سے چھوٹنے پاتے ۔ اس کی بہت سی مثالیں بھی نقل کی ہیں ۔

"ادب لطیف اور ترقی پسند ادب کے لئے دوہرے دوہرے عذاب کی بلاغت کی داد نہیں دی جا سکتی ۔ مولانا کی یہ تحریر بھی آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کی ہے ۔ اب تو معلوم نہیں اور کتنے نئے نئے عذاب مسلط ہو چکے ہیں ۔ پہلے ادیب کے لئے ادب کی شائستگی اور اس کے لوازم اور شرائط کی پابندی ضروری تھی اس کے بغیر کوئی شخص ادیب نہیں کہلا سکتا تھا ۔ اب ایک نوآموز بھی ان شرائط کا جتنا بڑا باغی ہے اتنا ہی بڑا ادیب ہے ایسے خود رو ادیبوں کو "ٹیڈی" کا ادیب کہنا زیادہ مناسب ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے پرانے برگزیدہ ادیبوں نے اردو ادب کو رفعت و عظمت بخشی اور ہمارے "ٹیڈی" ادیب اس کو ادب کا مزبلہ بنا رہے ہیں ۔

یہ درمیان میں جملہ معترضہ آ گیا تھا اب ناظرین پھر اصل موضوع کی طرف رجوع فرمائیں پہلے ناول ذات شریف کے میر دھکیل صاحب سے ملاقات کر لیجئے اور مرزا صاحب کے قلم سے ان کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے ۔

"میانہ قد گندمی رنگ ، الفربہ ناک نقشہ میں کسی قدر بھدا پن ، گول چہرہ آنکھیں کسی قدر چھوٹی سن شریف چالیس سال سے کچھ اوپر اس نسبت سے تو توند استدارت اور ضخامت کو بھی قیاس کر لیجئے

مگر اپنی صورت شکل پر حد سے زیادہ نازاں تھے اکثر اوقات آئینہ پیشِ نظر رہتا تھا کسی قدر تبریعت مزاج میں تھی اسلئے داڑھی منڈوائی تو نہ جاتی تھی مگر اسقدر باریک کترواتے تھے کہ اگر خورد بین سے دیکھی جائے تو بھی مشکل سے نظر آئے مونچھوں میں سفید بال اس کثرت سے تھے کہ ان کو چنتے چنتے حجام عاجز ہوجاتا تھا۔ خضاب کی کئی مرتبہ صلاح دی گئی مگر اس کی نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی یا تو کوئی مجرب نسخہ دستیاب نہ ہوا تھا یا یہ کہ حکیم صاحب خضاب کو علامت پیری تصور کرتے تھے اور بالوں کی سفیدی ایک امر عارضی تھا ابھی تک حکیم صاحب کا سن ہی کیا تھا خوش غلافی میں بھی حکیم صاحب اہتمام مزید فرماتے تھے کپڑوں کی قطع و برید کا بھی اچھا سلیقہ تھا اچھے اچھے درزی ان کے کپڑے سینو تے ہوئے گھبراتے تھے۔ اگر کھاجوں کی جولی نقاہت اور بانکپن میں حد فاصل ہوا س تناسب کو حکیم صاحب سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا یہ سب سامان اسلئے تھا کہ آپ کو مالدار عورتوں کی صیادی کا نہایت شوق تھا آپ کی ہمت مردانہ ہر وقت اس طرف مبذول رہتی تھی کہ کوئی وثیقہ دار بیگم پھنس جائے تاکہ مدت العمر چین سے بسر ہو اکثر جگہ پیغام سلام تھا مگر ابھی تک کوئی سونے کی چڑیا جال میں نہ پھنسی تھی۔"

اب مولانا کے مصور قلم سے انہی حکیم صاحب کے اوصافِ حمیدہ ملاحظہ فرمائیے اور لطف زبان کی داد دیجئے:۔

"یہ حکیم صاحب بھی ایک ہی جالینوس تھے ذہانت اور معلسا زی کے "معجون مرکب" عیاروں کے عیار اور جعلیوں کے استاد، شہر کے ایک نامی رئیس کا انتقال ہوا، اور آپ نے ان کی ادھیڑ سن بیوہ سے عقد کی ٹھانی بیگم صاحبہ پر نہیں ان کی جائداد پر لٹو ہو کر نفس ناطقہ میاں نبی بخش اس خدمت پر مامور ہوئے کہ ڈیوڑھی جا کر بی امامن مہری کو گانٹھیں اور ان کے ذریعہ نامہ و پیام شروع ہو اور صاحب جائداد بیگم پر ڈورے ڈالے جائیں میاں نبی بخش تقریر کرنے میں بقراط تھے لیکن جوڑ توڑ سوجھ بوجھ میں امامن کے پاسنگ کے برابر بھی نہ تھے، مہری حکمت و فطرت کی بڑیا بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے خادم اور آقا کو خوب خوب سبز باغ دکھائے حکیم صاحب قبلہ مگن رہے کہ پینگ بیگم صاحب سے بڑھ رہے ہیں اور معاشقہ کا ملنڈ ور ا ان کے ساتھ چل رہا ہے اور نکاح ۲۵ ہزار مہر پر بالآخر ہوا کس کے ساتھ بیگم کی ایک پیش خدمت چٹھی نویس کے ساتھ آخر راز کھلتا ہے۔ اور حکیم صاحب کی حکمت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔"

اس زبان اور لکھنؤ کے بڑے سے بڑے اہل زبان میں کوئی فرق ہے؟ معلوم ہوتا ہے سرشار کی روح بول رہی ہے۔

اب امراؤ جان ادا کے تبصرہ سے کچھ ادب پارے لطف زبان و حسن بیان کے پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلے ان کے قلم سے اس ناول سے تعارف حاصل کر لیجئے۔

"مرزا صاحب کے افسانوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول امراؤ جان ادا ہے یہ بیسویں صدی کی بالکل ابتدا کی تصنیف ہے ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل یعنی واجد علی شاہی دور کی ایک شستہ شائستہ، با تمیز خوش گو، خوش فہم شریف طوائف کی آپ بیتی ہے، شریف کے لفظ پر چونک نہ پڑیئے۔ اللہ کی ہر مخلوق کی طرح بازاری کسبیاں بھی کسی درجہ میں شرافت کے معیار پر پوری اتر سکتی ہیں، مرزا صاحب کی فرمائش بلکہ اصرار پر یہ بی صاحبہ اپنی آپ بیتی جا بجا سے سناتی ہیں مرزا صاحب لکھتے جاتے ہیں اور کہیں کہیں حاشیہ بھی چڑھاتے جاتے ہیں بچپن سے نوجوانی، نوجوانی سے جوانی جوانی سے بڑھاپا، ہر دور تفصیل کے ساتھ آئینہ ہو جاتا ہے، اور لطف زبان کے ساتھ، تجربہ، عبرت و بصیرت کے سامان بھی بہم ہوتے جاتے ہیں، طوائف کے نام سے نفرت و حقارت ہی کے جذبات پیدا نہ ہوں اور یہ خیال نہ گذرنے پائے کہ جو بھی اس پیشہ میں ہے وہ بہر حال اور بہر صورت ذلیل و ملعون ہی ہے، خدا جانے کتنی شریف زادیاں اشراف گھرانوں کی بہو بیٹیاں، آفت کی ماریاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں زمانہ کی گردش کسی نہ کسی بہانے سے اس پیشہ میں لا پھنساتی ہے اور وہ بیچاریاں حالات کے منجدھار میں بہتی ہوئی ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی اس ناپاک اور گندی زندگی میں جا پڑتی ہیں جسم شیطان سے بے غیرتی کے سبق لیتا رہتا ہے لیکن ضمیر کی ملامت کی آواز بھی اندر اندر جاری رہتی ہے۔

امراؤ جان کی قسمت میں ناموری بدنامی کے راستہ سے لکھی ہوئی تھی وہ پوری ہو کر رہی مگر وہ کوئی سات پشتوں کی بیسوا نہ تھی فیض آباد میں ایک گھر گرہست خاندان میں پیدا ہوئی نام نہ امراؤ تھا نہ "امراؤ جان" ماں باپ نے امیرن کہہ کر پکارا تھا۔ بچپن کی قلمی تصویر ملاحظہ ہو اگر آنکھیں نم نہ ہو جائیں جب بھی دل میں گداز تو پیدا ہو ہی جائے گا۔"

اس کے بعد ناول سے امراؤ جان کی زندگی کے مختلف مراحل کے مناظر دکھائے گئے ہیں اور ان پر انکے مخصوص رنگ میں سبق آموز تبصرہ ہے اس کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں

"بچپن بھی کیا معصومیت کا زمانہ ہوتا ہے لڑکی تھی، گڑیا کی کلی مگر اپنے حال میں مست اور مگن باپ کی آنکھ کا تارا ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک گناہ کی راہوں سے ناواقف اور بدی کی چالوں سے بے خبر اس غریب پر سیکڑوں امارتیں قربان۔ جھونپڑے کو محل سمجھنے والی اور محل کیا معنی معصوم کیلئے وہی جھونپڑا ساگر نمونہ جنت تھا۔

محلہ کا ایک غنڈا جس کا آبرو درپئے آزار کا خواہاں ہو گیا ایک روز شام دھوکے سے اپنے گھر بلا منہ میں کپڑا ٹھونس بیل گاڑی پر ڈال رات کی اندھیری میں روانہ ہو گیا قسمت نے لکھنؤ پہونچا یا اور چوک کی ایک مشہور ڈیرہ دار کے جواب سے اترنے پر نائکہ بن چکی تھی بکوایا اب امیرن قبل اسکے کہ سن تمیز آئے اور اپنے نیک و بد کی تمیز پیدا ہو، مرا ؤ جان تھیں اور جس چاند سا کو کسی اندھیرے گھر کا اجالا ہونا تھا اس کے

نصیب میں شمع کی طرح گردش محفل آئی ”وکان امراللّٰہ مفعولا“ رنگ نکھرا، دوکان چلی، جنس عصمت بکی نہیں لٹی، رفتہ رفتہ قیامت بنا، نواب زادوں، امیرزادوں کے شہر میں قدردانی کی کیا کمی سرکاروں درباروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، پر دل کا کانٹا آخردم تک نہ نکلا، طبلہ کی تھاپ روح کے زخم کا مرہم نہ بن سکی، پازیب کی جھنکار اور موتیوں کے ہار لٹی ہوئی عزت کے آنسو نہ پونچھ سکے اور میلی اوڑھنی میں مگن رہنے والی لڑکی دل کا چین بھاری بھاری پیشوازیں پہن کر نہ خرید سکی، ماں باپ غریب تھے پر عزت دار تھے اشرفیوں کے توڑے انکے یہاں بیتک نہ تھے۔ پر عزت کے خزانے کے مالک تھے نوٹوں کی گڈیاں اُن آنکھوں نے کب دیکھی ہونگی لیکن یہ آنکھیں وہ تھیں جو شریفوں کے کسی مجمع میں نیچی نہیں ہونے پاتی تھیں۔

یہ غریب امیرن امراؤجان بنکر بے شمار دولت کما کر اور اس قدر لٹا کر عین اپنے شباب شہرت کے زمانہ میں فیض آباد پہونچی ہیں یورپ ہوتا تو خاک وطن خود ایسی قابل فخر ایکٹرس ایسی مشہور زمانہ آرٹسٹ کی بلائیں لینے دوڑتی پریس کے نمائندے انٹرویو لینے کے لئے جھپٹتے خوش آمدید کے تاروں کا اپنا رنگ جاتا کس دھوم دھام سے استقبال ہوتا کیسی کیسی تصویریں چھپتیں، یہاں جو کچھ گذری خود امراؤجان کی زبان سے سنئے اور اگر پہلو میں دل ہے تو پہلے دل کو ہاتھوں سے سنبھال لیجئے :“

یہ ”جو کچھ گذری“ بحث طویل ہے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ:—

امراؤجان وطن چھوٹنے کے برسوں بعد پہلی مرتبہ فیض آباد آئی تھی اسلئے اس کو قدرتاً اپنے گھر اور والدین کے حال کی جستجو تھی، آنے جانے والوں سے مقصد ظاہر کئے بغیر باتوں باتوں میں پتہ چلالیا کہ باپ مرچکے ہیں، ماں اور بھائی زندہ ہیں۔ اتفاق سے اس کا ایک مجرا اس کے محلہ میں اسکے گھر ہی کے پاس تھا اُس نے آس پاس کے آثار سے گھر کا پتہ چلالیا اور بچپن کی زندگی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ گھر سامنے تھا ماں زندہ موجود تھی۔ دل ملنے کے لئے بیقرار تھا لیکن اب اسکی زندگی کسی شریف عورت سے ملنے کے قابل کب رہ گئی تھی پھر ماں باپ کی عزت کا پاس تھا اسلئے دل مسوس کر رہ گیا۔ امراؤجان ہی کی زبان میں ”ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار آڑ ہے ادھر میری ماں بیٹھی ہونگی اور میں انکے لئے یہاں تڑپ رہی ہوں ایک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں“ لیکن دل را بدل راہ است: ماں کو شائد کچھ سن گن مل گئی یا کسی سے امراؤجان کا حلیہ سنکر شبہ ہوا ہو اس کو بھی نووارد طوائف کے حالات کی جستجو تھی، ابھی امراؤجان اسی ادھیڑبن میں تھی کہ ایک عورت نے آکر پوچھا ”تمھیں لکھنؤ سے آئی ہو۔

میں: ہاں اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اُچھلنے لگا)۔

عورت: اچھا تو ادھر چلی آؤ تمھیں کوئی بلاتا ہے۔

میں: اچھا کر کے اسکے ساتھ چلی ایک ایک پاؤں سو سو من کا ہو گیا تھا قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ وہ عورت اس مکان کے دروازے پر کھڑی لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی اس مکان کی ڈیوڑھی میں ایک چارپائی پر مجھکو بٹھایا اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا اسکے پیچھے دو تین عورتیں آکر کھڑی ہو گئیں۔

ایک: لکھنؤ سے تم ہی آئی ہو۔

میں: جی ہاں۔

دوسری: تمھارا نام کیا ہے؟

میں: (جی میں آیا کہدوں امیرن مگر دل تھام کے) عراق

پہلی: تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے۔

میں: (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنسو نکل پڑے) اصلی وطن

تو یہی ہے یہاں کھڑی ہوں۔

پہلی: تو کیا بنگلہ کی رہنے والی ہو۔

میں: (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے مشکل جواب دیا)

جی ہاں۔

دوسری: کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

میں: ذات کی پتریا نہیں ہوں تقدیر کا لکھا پورا کرتی ہوں۔

پہلی: (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو آخر ہو تم کون ہو؟

میں: (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں تم جیسے ... بڑا تھا

اتنی باتیں میں نے دل سنبھال کے کی تھیں اب

بالکل تاب ضبط نہ تھی بیٹی تھی دم رکنے لگا تیزی میں دو

عورتیں پردے کے باہر نکلیں ... کے ہاتھ میں چراغ تھا

اُس نے میرے منہ کو ہاتھ لگا کے کہا ہم کہاں ... غور سے

دیکھا اور دوسروں کو دکھایا اور کہا کیوں ہم نہ کہتے تھے

کہ وہی ہے۔

دوسری: ہائے میری امیرن کہہ کے لپٹ گئی دونوں مار

بیٹھیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں ہچکیاں بندھ

گئیں آخر اور عورتوں نے آ کر چھڑایا اس کے بعد میں نے اپنا

پورا قصہ دہرایا میری ماں بیٹھی سنا کی اور رویا کی باقی

رات ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے، صبح ہوتے ہی رخصت ہوئی

ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے دیکھا وہ مرتے

دم تک نہ بھولے گی مگر مجبوری اور رسوائی نہ ہونے پایا

تھا کہ سوار ہو کر اپنے گھرے پر چلی آئی۔ دوسرا مجرا صبح

کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آ کے کل روپیہ مجرے کا واپس

اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا۔ دولھا کے باپ نے

روپیہ پھیر دیا اس دن دن بھر جو میرا حال رہا خدا

خوب روشن ہے کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر

رویا کی۔

اب درد انگیز اس بیان پر مولانا کا عبرت

تبصرہ ملاحظہ ہو:

"اللہ اللہ! یہ مشرق کی بیسوا ہے کوٹھے

پر بیٹھنے والی عصمت فروش یہ غیرت اس کی ...

جس نے ایک ضرب بے غیرتی کی روٹی کھائی ... در

دربار گناہ کی تباہ کاریوں سے خاک سیاہ ...

دل کی گہرائی میں خشیت الٰہی اب بھی بیدار ...

... ہے لطافت ... نہیں لعنت ہے مرکزی ...

... کی ملاقات کا منظر آپ دیکھ چکے ...

جوانی بہن کی ملاقات بھی اسی طرح کلیجہ تھامے ...

ملاحظہ ہو۔"

بھائی کی ملاقات میں غیرت و تمیز ...

حقارت اور خون کی محبت کے ملے جلے منا ...

بھی زیادہ موثر ہیں۔ بھائی جلی کٹی باتیں سنا کے

وفور غیرت میں بہن کی جان تک لینے کیلئے تیار

ہے اور اس کے گلے پر چھری رکھ دیتا ہے پھر خون کا

جوش مارتی ہے اور چھری ہٹا کر کہتا ہے کہ کیا

کیا ماروں پھر عورت بھی بڑی بہن، یہ کہہ کر ڈاڑھ

مار کر رونے لگتا ہے امیرن پہلے ہی سے رو رہی تھی

دونوں خوب رو چکے تو بھائی نے بہن سے ہاتھ جوڑ

کر کہا "اب اس شہر سے چلی جاؤ"، بہن نے جواب دیا

...ہاؤں گی مگر ایک مرتبہ پھر ان کو دیکھ لوں" بھائی نے
...اس کو دل سے دُور رکھو، معاف کرو کل اماں نے
...گھر پر بُلا لیا میں نہ ہوا نہیں تو اس وقت وارا نیارا
...تا محلہ بھر میں چرچے ہو رہے ہیں"۔ بہن نے جواب دیا
...نے دیکھ لیا جان سے تو میں ڈرتی نہیں مگر ہاں تمھاری
...ن کا خیال ہے تم اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو
...کر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں
...بھائی برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

مولانا کا تبصرہ :—

"یہ زندہ احساس غیرت و شرافت بگڑے
ہوئے لکھنؤ اور فیض آباد کا ہے، اُجڑے ہوئے
اسلامی ہند کا ہے۔ اس خزاں کی بہار کا اندازہ
کرنا کسی کے لئے کچھ بھی مشکل ہے"

...بیٹیہ و رطوائف کی اب نہیں ختم ہو چکی اور کتاب
...نیات ختم ہونے پر ہے اس وقت ان کے منہ سے جو بول
...نکلے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ہم سنیں، آپ سنیں، نور کے
...بنے ہوئے فرشتے سنیں جنھوں نے کچھ نہیں سنا ہے وہ سنیں
...جو بہت کچھ سن چکے ہیں وہ بھی سنیں" اس کے بعد امراؤ جان
...کی توبہ و انابت میں ڈوبی ہوئی عبرت آموز تقریر نقل کرنے
...کے بعد لکھتے ہیں :—

"آغاز جیسا بھی ہوا ہو انجام تو بہ انابت
خشیت رجوع الی اللہ پر ہو رہا ہے اس
انجام پر ہم کو آپ کو کس کو رشک نہ آئے گا"

مولانا کے قلم کی جولانی ادب کی کسی خاص صنف
تک محدود نہیں اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ انھوں نے
مختلف النوع ادبی پہلوؤں اور ادبی مسائل و مباحث پر
مضامین لکھے ہیں ان میں شعر و ادب پر تنقید بھی ہے۔ ادبی
شخصیتوں اور ان کے کارناموں پر تبصرہ بھی ہے۔ ادبی مجالس
کے خطبے بھی ہیں، علمی و ادبی پیامات بھی ہیں ریڈیو کے
نشریات بھی ہیں۔ مرنے والوں کی موت پر تاثرات بھی ہیں
کتابوں کے مقدمے اور ان پر نقد و تبصرے بھی ہیں
رقص علی نغذا، اور یہ سب اپنے اپنے رنگ میں فرد اور
مولانا کی ادبی نکتہ سنجی کا نمونہ ہیں اور ان کا خاص طرزِ
نگارش اور مخصوص اصلاحی نقطہ نظر سب میں نمایاں ہے
دائرہ کوئی بھی ہو اس کا مرکزی نقطہ اصلاح اور عبرت
و بصیرت ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ ایک طوائف کی زندگی اور
مرزا شوق کی مثنویوں سے بھی عبرت کا سبق دیتے ہیں۔
مولانا کے ادبی کارنامے اتنے گوناگوں ہیں
کہ کسی ایک مضمون میں اس کی ایک جھلک دکھانا بھی دشوار
ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کے لئے ایک مستقل کتاب درکار
ہے اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی ریسرچ اسکالر اس کو
تحقیقات کا موضوع بنائے۔ آجکل یونیورسٹیوں میں
جس درجہ کے ادیبوں پر تحقیقات کرائی جاتی ہے ان کے
مقابلہ میں مولانا کی شخصیت کہیں زیادہ قد آور ہے اور
ان کے ادبی کارنامے کہیں زیادہ وسیع ہیں، اس کے لئے
مرحوم ہونا ضروری نہیں ہے۔

منوّر بسکوی ———

مولانا دریابادی

بزم در بزم چھڑا ذکر اسمِ ماجد کا
اللہ اللہ کھلا آج بھرم ماجد کا
آپ کی ذات سے پایا ہے فروغ اُردو نے
گویا اُردو پر بہت کچھ ہے کرم ماجد کا
یوں تو دیکھے گئے عالم میں بہت سے فنکار
کوئی ثانی نہیں اللہ کی قسم ماجد کا
نور سے جس کے منور ہے شبستانِ خیال
اللہ اللہ وہ ہے فیضِ اتم ماجد کا
کائناتِ ادب و دین سے آتی ہے صدا
ختم ہوگا نہ کبھی جاہ و حشم ماجد کا
آنکھ وہ آنکھ ہے ماجد کی ہو جس میں تصویر
قلب وہ قلب ہے جس میں کہ ہو غم ماجد کا
کارواں راہِ محبت میں نہ بھٹکا کوئی
رہنما ایسا بنا نقشِ قدم ماجد کا
کیا تعجب کہ ملے اس میں حیاتِ ابدی
آؤ کچھ دیر کریں تذکرہ ہم ماجد کا
واقفِ منزلِ مقصود بنا ہر کوئی
کچھ نہیں ملک پہ احسان یہ کم ماجد کا
جب بھی اُٹھا تو اُٹھا ظلم و تشدد کے خلاف
ایک تلوار سے بڑھ کر ہے قلم ماجد کا
ہر طرف علم و ادب کی ہیں منوّر کرنیں
"بقعۂ نور" منوّر ہے حرم ماجد کا

مولانا اسرار رمزی آلہ آبادی۔ جودھپور

پیرِ دانا!

جا رہا ہے علم و فن کی دھوپ میں
کارواں "اک راہرو" کے روپ میں
وادیِ حکمت میں ہیں جس کے قدم
بڑھ رہا ہے سوئے منزل دمبدم
عالمِ دیں، فلسفہ دانِ حرم
اک صحافی، پیرِ دانائے عجب
بارہ بنکی کا وہ سرخیلِ عجیب
وہ مدیرِ صدق پاکیزہ ادیب
ذہن جس کا کہکشاں بردوش ہے
جس کی تحریروں میں نور ہوش ہے
درسِ قرآں دو زبانوں میں دیا
ترجمہ انگریزی اُردو میں کیا
عطرِ گل صہبائے شبنم بھر دیا
دونوں پیالوں میں زمزم بھر دیا
ایسا سمجھایا ہے رب کی بات کو
دن بنا کر رکھ دیا ہے رات کو
یہ قصیدہ گوئی تو ہے نام کی
قدر کرنی چاہیئے اس کام کی
کر رہا ہے خدمتِ دین و ادب
ہو میسر ہم کو بھی ایسی طلب
یہ لکھا ہے آگہی کے واسطے
طالبوں کی دل دہی کے واسطے
بن گئے ذرے بھی جب نیّر لقب
کیوں نہ ہم اس کو کہیں شمسِ ادب
ہے تہِ دل سے یہ رمزی کی دعا
دے خدا ان کارناموں کا صلہ

ضیا احمد بدایونی ایم اے

مولانا دریابادی
کی طنزنگاری

جب سے دنیا میں ادب کا وجود ہوا اُسی وقت سے یا اُسی کے لگ بھگ طنز بھی معرضِ ظہور میں آئی۔ یونان کی تاریخِ ادب سے پتا چلتا ہے کہ حضرت مسیحؑ سے سات سو سال پہلے آرکی لوکس نے یہ صنف شروع کی۔ اور پھر ہر کر آمد بر آں مزید کر دا طنز کو دیوتاؤں کا آرٹ اور جادو کا کاروبار سمجھا جاتا تھا۔ لوگ ضرورت کے وقت اِس سے کام لیتے اور اپنے حریفوں پر وار کرتے تھے، یہ پہلے شخصی ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اجتماعی ہوئی اور اس میں تخیل کے ساتھ ادبی اور اخلاقی عناصر شامل ہوتے گئے۔ انگریزی کا لفظ satire جو satura کی مبدّل شکل ہے ہجو۔ طنز۔ طعن۔ تعریض۔ رمز۔ کنایہ۔ اور ایک حد تک خوش طبعی۔ مزاح۔ ظرافت سب پر حاوی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں باہم بہت فرق پایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہجو و طنز میں اکثر خوش طبعی، مزاح یا ظرافت کی آمیزش ہوتی ہے خود ہجو اور اسکے امثال۔ اور خوش طبعی اور اس کے اشباہ میں بھی خاصا فرق مدارج ہے۔ سب سے مقدم سٹائر میں ادبیت یعنی حسن کاری اور فن کاری کی شرط ہے۔[۱] ظاہر ہے کہ اگر اُس میں ادبیت کا فقدان ہے تو اُس کی حیثیت گنوارو فقرہ بازی سے زیادہ نہ ہوگی۔ علیٰ ہذا اگر اُس میں خوش طبعی یا مزاح کا عنصر موجود نہیں تو دشنام طرازی یا ہجو قبیح کی مترادف یا متجانس ٹھہرے گی۔

سٹائر کی یہ تعریف[۲] کی گئی ہے کہ وہ کسی مضحک یا نازیبا واقعے سے متاثر ہو کر ظرافت یا کراہت کا اظہار ہے جو موزوں الفاظ میں کیا جائے۔ بشرطیکہ اُس میں خوش طبعی اور ادبیت نمایاں ہو۔ دوسروں[۳] کی رائے یہ ہے کہ سٹائر ایسے جملے سے عبارت ہے جو کسی واضح مفروضے کی مدد سے امتیازی تاریخی جزئیات کے خلاف کیا جائے۔"

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا

[۲] عربی کے ناقدین نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ... میں یہ شرط لگائی ہے کہ اس پر آدمی کے وہی اوصاف بیان کئے جائیں جو عقلاً قبیح ہوں۔ اور وہ جسمانی معائب اور اسلاف کے ذمائم کے ذکر سے خالی ہو۔ (جرجی زیدان)

[۳] برٹانیکا۔ [۴] ماخوذ از جان رسل والیشلی براؤن

مگر ہم آج جس صنف سے بحث کر رہے ہیں SATIRE وہ کی ایک مخصوص نوع ہے یعنی طنز جس کے لئے IRONY کی اصلاح زیادہ موزوں ہے۔ IRONY کیا ہے؟۔ اہل ادب کا بیان ہے کہ IRONY کلام[1] کا وہ اسلوب ہے جس میں استعمال شدہ عبارت کے اندر اصل معنی چھپے ہوئے ہوں اور ظاہرا اس کی نقیض یا متضاد ... ہو۔ اس کا خاص مقصد کسی کی تحقیر یا استہزا ہوتا ہے"۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ طنز ایک طرح کا عمل جراحی ہے بشر طیکہ لطافت کے ساتھ ہو۔ اُس میں مواد کو اصل اہمیت ہے اس کا روپ خواہ کچھ بھی ہو۔ سوفٹ کا کہنا[2] ہے کہ طنز کا مقصود کبھی ذاتی تسکین کا جذبہ ہوتا ہے پبلک اسپرٹ جو طنز نگار کے گرد و پیش کی بے عنوانیوں یا حماقتوں کی اصلاح چاہتی ہے۔ اپنے ہدف کو کلیتہً برباد کرنا اُس کا مقصد نہیں ہوتا۔ صرف تضحیک مراد ہوتی ہے طنز کرنے والا اپنی طنز و ظرافت سے سامعین (یا قارئین) کو متوجہ کر لیتا ہے وہ مسلّات کو بے کراں ... دیتا ہے۔ جس پر ہم اول ہنستے ہیں اور پھر سوچتے ہیں۔ ہم اُس (طنز کرنے والے) کی ذاتیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں حتیٰ کہ جب وہ خود اپنی ذات پر طنز کا وار کرتا ہے تب بھی اس کی اخلاقی پوزیشن پر حرف نہیں آتا سوکا کام sophistication

[1] برٹانیکا
[2] ماخوذ۔

اندلیس یا ایک طرح کی تحریف) ہوتا ہے جس کو ہم سب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ وہ متعصب یا تنگ نظر ہو مورد اعتراض نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں وہ خطرہ تو مول لیتا ہے۔ مگر سزا سے بچ جاتا ہے۔ اور شاید یہ امر بھی طنز کے محرکات میں سے ایک ہو۔ آیئے۔ دیکھیں مولانا عبدالماجد دریابادی کی طنز کی کیا نوعیت ہے۔

مگر اس سے پہلے موصوف کی زندگی کا اجمالی جائزہ لے لیا جائے۔ تاکہ ان کے نقطۂ نظر کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ مولانا کی ولادت ۱۸۹۲ء کی ہے۔ اور وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی۔ مولانا کا خاندان اُردو کے معزز اور ممتاز خاندانوں میں ہے موصوف نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کیا۔ اور شروع ہی سے تصنیف و تالیف کی جانب میلان پیدا ہو گیا۔ اول اول الناظر (لکھنؤ) وغیرہ سے قلمی وابستگی رہی۔ اب معارف (اعظم گڈھ) کے اعزازی نگراں ہیں۔ مولانا کے ادبی ہفتہ وار صدق اور اُس سے پہلے سچ اُردو صحافت میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ انکی فلسفیانہ تصانیف و تراجم ہماری زبان کا اہم سرمایہ ہیں۔ لیکن اب عرصہ سے مذہبی تصانیف پر تمام تر توجہ مبذول ہے۔ جن میں ترجمہ و تفسیر قرآن مجید (اردو انگریزی) ارض القرآن۔ سیرت نبوی۔ حکیم الامت۔ اکبر نامہ۔ محمد علی وغیرہ موصوف کے فضل و کمال کی آئینہ دار ہیں۔ آغاز میں مولانا فلسفے کی مزاولت کے باعث آزاد خیالی کی وادیوں میں سرگرداں رہے لیکن توفیق الٰہی نے دستگیری فرمائی اور صراط مستقیم دکھائی۔ چند روز سیاست کی

راہ پر بھی گام زن ہوئے۔ مگر مدّت ہوئی کنارہ کش ہو گئے۔۔۔

معاصرین میں شاید ہی کوئی ہو جو مولانا کی دیانت و [illegible] وسعت معلومات اور اصلاحی خدمات مدلل تحریر اور مؤثر اسلوب کا معترف نہ ہو۔ سنجیدگی اور صدق کی بدولت اُردو اہل قلم میں ان کی پوزیشن طنز نگار کی حیثیت سے مسلّم ہو گئی ہے، جس کے نمونے آگے آئیں گے۔

مولانا کو قدرت نے غائر نگاہ، زبردست قوت [illegible] اصلاح پسندانہ ضمیر اور دلیرانہ طرز تحریر عطا [illegible] موصوف جس ماحول میں ہیں، اس میں ہر طرف [illegible] نمایاں نظر آتی ہیں۔ [illegible] کے سب [illegible] استثنائے چند [illegible] اصلاح [illegible] ایک طرف [illegible] ہے، دوسری طرف [illegible] اکثر [illegible] جادۂ حق سے قدم ہٹا [illegible] مولانا کا حق نگار [illegible] جنبش میں آیا۔ مگر اس کی محرک سیاست نہیں کیونکہ [illegible] ایک سیاسی آدمی نہیں ہیں جس کو یا اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے یا اپنے گروہ کا۔ ان کا محرک صرف جذبۂ اصلاح اور داعیۂ اخلاص ہوتا ہے اور ان کی طنز کا نشانہ فرد نہیں، جماعت ملت، اور شخصیت نہیں، جماعت ہوتی ہے۔ وہ اظہار حق میں اپنے بڑے سے بڑے دوست یا محترم کی رعایت کرنا، یا کسی عظیم لیڈر یا وزیر سے مرعوب ہونا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس فرض کے ادا کرنے میں اپنے کی برائیاں یا غیر کی خوبیاں حائل نہیں ہو سکتیں۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک پر چشم پوشی یا دوسرے پر خاموشی روا رکھیں۔ ان کا قلم دراصل شمشیر برہنہ ہے جو مسلمان۔ ہندو۔ سنی شیعہ۔ عالم۔ عامی۔ امیر۔ غریب کسی میں امتیاز نہیں کرتی۔ وہ کسی کی اچھی بات دیکھیں گے یا سنیں گے تو بے اختیار تعریفوں کے پھول برسائیں گے۔ اور اگر کوئی بے راہ روی دیکھ پائیں گے تو سخت طنز کا نشانہ بنائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کا روئے سخن شخص کی طرف نہیں، بلکہ شخصیت کی طرف ہوتا ہے۔ [illegible] اپنا فرض جانتے اور طنز کے حدود پہچانتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ ایک ماہر سرجن کو خطرناک پھوڑے، [illegible] لیے نیز نشتر ہی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مثالیں بکثرت ہیں جن کا استقصا دشوار [illegible] تاہم بالا پُڑک کلمہ لا بُشرک کلمہ۔

مثلاً[2] سائنس کی ہلاکت آفرینیاں کے تحت وہ فرماتے [illegible] حادثہ ہندوستانی فوج کے ایک تربیتی طیارہ [illegible] شہر کی گھنی آبادی میں ٹوٹ پڑنا نمونہ ہے اس حقیقت

نوٹ۔ [1] اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مولانا کی دوسری تخلیقات کسی لحاظ سے ادب و انشا یا زور بیان یا لطف زبان میں کم ہیں لیکن وہ اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ چونکہ ہم کے شمارے پیش نظر نہیں ہیں۔ اس بنا پر یہاں صدق ہی میں انتہا دکیا گیا ہے۔

نوٹ۔ [1] عنوانات اور نیچے کی عبارات مولانا کے قلم [illegible] اور بریکٹ کے اندر تو ضیحات (ایضاً) خاکسار مضمون نگار کی طرف

کا کر سائنس جہاں حیات آفریں ہے وہیں ہلاکت آفریں بھی کتنی ہے یوں بالکل بیٹھے بٹھائے ختم ہو جانا اب تک تو صرف زلزلے یا بجلی وغیرہ گرنے کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ اب اس مرگ ناگہاں کے امکانات کتنے زائد وسیع ہو گئے ہیں۔

صدق جدید ۷ اگست ۶۷ء

"قوت خرید میں اضافے کا نسخہ"

اس ساری زحمت اور دردِ سری کی آخر ضرورت کیا ہے ہندوستان کے ایک نیم ملا قسم کے ماہر معاشیات کو کیوں نہ بطور ماہر خصوصی کے بلا لیا جائے اور وہ جا کر ملکۂ ذی اقتدار (ملکۂ برطانیہ) اور ان کے شوہر نامدار کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کر دیں کہ آپ حضرات بھی کس وہم کے شکار ہو گئے (گرانی سے) زیر باری جو کچھ بھی ہو رہی ہے یہ آپ حضرات کی مفلسی کی دلیل کسی درجہ میں بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو عین دلیل آپکی قوت خرید میں اضافے کی ہوئی۔

ایضاً

یہ سخت جان دو قومی نظریہ: (ایک معاصر کے جواب میں)

اچھا تو گویا خوشی اس پر ہو رہی ہے کہ وہ دو قومی نظریہ اب اقلیت کے تنگ و محدود حلقے سے منتقل ہو کر اکثریت کے بڑے اور وسیع حلقے تک پہنچ گیا ہے۔ رہا صدق کا ایک عرصے سے (نظریہ مذکور پر) نہ لکھنا، وہ تو ایک ہی موضوع پر مسلسل لمبے لمبے ادارئیے دہرانے میں معاصر موصوف کا حریف کیسے ہو سکتا ہے ہاں وہ زبانی اور ٹیلی فونی بحثیں، اگر کسی تو تصنیف

ناول یا افسانے کا ٹکڑا ہیں۔ جب تو تخیل قابل داد ہے یا اگر خشک واقعاتی زندگی سے متعلق کوئی سنجیدہ بیان ہے تو اب اس پر کیا عرض کیا جائے۔

ایضاً

"سیکولر علی گڑھ" (کتابچۂ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی کے متعلق)

"اس کتابچے کی تعریف یہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک نہ اسلام کا نام آنے پایا ہے نہ خدا و رسولؐ کا، نہ کہیں شعبۂ دینیات کا نہ خود وائس چانسلر صاحب کے شعبۂ اسلامیات کا۔ بلکہ الفاظاً اس درجہ سیکولر ہیں کہ انھیں ملک کی جس درسگاہ پر چاہے چسپاں کر لیجئے۔

ایضاً

"سوشلزم کی بانگی" (وزیروں وغیرہ کے اخراجات کے اعداد و شمار دکھانے کے بعد)

اور یہ وزیر صاحبان کسی ہز ہائی نس کے نہیں کسی والیٔ ریاست اور جاگیردار کے نہیں، عین سوشلسٹ ادارے کے سردار اعلیٰ (یعنی گاندھی) کی پرستار حکومت کے وزیر ہیں۔

(ایضاً)

"از مکافات عمل غافل مشو" (نکسلیوں کی بڑھتی ہوئی جسارتیں)

ہندوستان ذرا تو سوچے کہ اپنا مزاج کیا بنا لیا ہے۔ اور حالت کہاں سے کہاں پہنچی چلی جا رہی ہے آزادی کے محض منتر پڑھ لینے اور اپنے کو اخلاقی دباؤ اور ذمہ داری سے آزاد سمجھ لینے کے نتیجے کیا اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتے تھے۔ ۱۴ اگست ۶۷ء

…س اِنتدار کا جہنم زار" (پارلی منٹ کی تماشائیوں کی گیلری
… گولیوں کا اندیشہ)
لیکن یہ گولی چلا دینے کا خدشہ کس کو کس کے ہاتھوں
… ہے۔ کیا ہندوستانیوں کو روس، چین .... والوں سے
… بھی نہیں، ہندوستانیوں کو اپنے ہی ہندوستانی بھائیوں
… سے ہے۔

(ایضاً)

… ہونے کے بعد" (گاندھی جی کے ذخیرۂ متروکات سے
… کی دو لٹیاں چوری گئیں)
چلئے جو قوم گاندھیت کی لٹیا ۲۲، ۲۳ سال قبل
… رہی تھی ———— آج اُس نے گاندھی
… لٹیاں چُرا کر بھی دکھا دیں۔ ہاتھ کی اس صفائی کو ترقی
… تعبیر کیجئے یا ترقیٔ معکوس سے بہرحال قدر دانی اور
… قوم نے ایک تازہ مثال قدر شناسی اور ہنرمندی
… پیش کر دی۔

(ایضاً)

"سپاٹ اور سادہ لوح غالب" (غالب پر ایک کتاب کا
ڈیڈی کیشن جس میں غالب کو خالص سیکولر دکھایا گیا ہے)
یہ سیکولرزم نہیں، سیکولرزم کا ہیضہ ہے۔ گویا غالب
اتنے سادہ لوح اور سپاٹ تھے کہ ان کے نزدیک زہر اور
تریاق سب ایک اور یکساں تھے۔ خوب ہے یہ غالب
شناسی اور غالب فہمی، ان کے ہزاروں محکمات کو چھوڑ کر
ایسے ایسے نادر متشابہات ڈھونڈ نکالے۔

(ایضاً)

"جاسوسی ڈھول کا پول" (کشمیر میں پاکستانی جاسوسوں کی ٹولی)
خلاصہ یہ ہے کہ کشمیر میں پانچ پاکستانی سازشی و
جاسوس پکڑے گئے۔ اور ان پانچ میں مسلمان ایک بھی
نہیں، مسلم لیگی، مشاورتی، مجلسی ایک بھی نہیں۔ پانچوں کے
پانچوں راشٹریا سنگھ والوں ہی کے ہم مذہب ہیں۔

(ایضاً)

"امریکہ آپ اپنی نظر میں" (ہر سال ۵۰ ہزار خودکشی اور ۴ لاکھ
اقدامِ خودکشی کے واقعات)
اور یہی حاصل و ثمرہ جس تہذیب و تمدن کا ہے آپ
اُسی کو لینے کے لئے اپنے سر اور آنکھوں سے تیار رہتے ہیں۔

(ایضاً)

"خوش نصیب بدھسٹ" (حکومت ہند کی طرف سے بدھ
زیارت گاہوں کے لئے مصارف جن کے دیکھنے کو زائرین
سیلون، برما، جاپان، تھائی لینڈ سے کثرت سے آیا کرتے ہیں)
لیکن ان چاروں ملکوں میں یقیناً نہ کوئی جماعت
جن سنگھ کی قسم کی ہے نہ راشٹریا سنگھ کے طرز کی۔ ورنہ
ان یاتریوں کے خلاف ایک شدید قسم کا ایجی ٹیشن شروع
ہو جاتا کہ یہ ایک غیر ملک کے تیرتھ کو جا رہے ہیں۔ انکے
مقامات مقدسہ ان کے وطنی حدود سے باہر ہیں اور
یہ لوگ اپنا منہ بیرونِ ملک کی طرف اُٹھائے ہوئے ہیں
یقیناً ان کی وفاداری مشتبہ، ان کی وطن دوستی ناقص ہے
اور عجب نہیں کہ یہ بیرونیوں سے سازباز، آشنائی اور
دوستی رکھے ہوں۔

۲۱ اگست ۱۹۷۰ء

"مزخ بالا کن" (یوپی کی وزارت میں اضافہ کُل تعداد ۴۶)
جب ہر ممبر کا منتہائے نظر وزارت یا نائب وزارت ہو۔

تو وزارت کے عہدوں کی سیری اور آسودگی اتنی تعداد سے بھی کیونکر ہو سکے گی۔ اور نا ممکن نہیں کہ آگے چل کر وزیروں کی تعداد خود ممبروں کے کچھ برابر سرا بر ہی ہو جائے آہ گاندھی جی اور ان کا دیس!

(ایضاً)

"دو قومی نظریئے کا پارلیمنٹ میں چرچا" (ایک مسلمان ممبر پارلیمنٹ کی تقریر کہ "اگر مشرقی پاکستان سے آنیوالے ہندوؤں کی آباد ساری کے سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں پر کوئی ٹیکس لگایا گیا تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا")

گویا پاکستانی ہندوؤں کی اس برآمد اور پاکستانی حکومت کے اس فعل کے ذمہ دار ہندوستانی مسلمان ہیں۔ کیا کہتے ہیں اس منطق آرائی کے! دو قومی نظریئے کی تبلیغ اس دھڑلے کے ساتھ اس سے قبل ہندوستان کی پارلیمنٹ میں کیوں ہوئی ہوگی۔

(ایضاً)

وگنہ کیجئے ثواب ہے آج "زمین ہتھیاؤ" تحریک کا زور درگرفتاریوں کا شور)

آج سے چند مہینے پیشتر بھی اگر کوئی یہ صدا لگاتا جیب کتر لینا انسان کا پیدائشی حق ہے یا کوئی ...رت ..... تو ایسے ایسے پاگلوں کا علاج بجز جیل کے پاگل خانے کے اور کیا تجویز ہوتا .... لیکن اب ...ملک یہ آوازیں ..... بہ صورت تحریک اٹھی ہیں تو کس مجال ہے جو اُن پر ہنس سکے۔ اب یہ دیوانگی نہیں۔ ...فرزانگی۔ اور جنون نہیں، خالص عقل و خرد ہے۔

۲۸ راگست ۱۹۷۰ء

"ثمرات تہذیب" (ملک کے کم سن (از ۱۶ تا ۲۱ سال) جرائم کے اعداد قتل رہزنی ڈاکہ سے متعلق) کیا اچھا ہو کہ ترقی تعلیم و تہذیب کے دوسرے ثمرات ونتائج کی طرح یہ مجرمانہ پیداوار بھی برابر شائع ہوتی رہے

"نئے ڈاکو" "زمین ہتھیاؤ" تحریک میں ڈاکوؤں کی بھی شرکت

(ایضاً)

غالب نے اپنے ایک محبوب عزیز کے مرثیہ میں کہا تھا

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

(ایضاً)

"۳۰ سال کے اندر" (خواتین میں جرائم کا رجحان)

کیا اچھا ہو کہ جہاں یہ فہرستیں چھپتی رہتی ہیں کہ ۳۰ سال کے اندر اتنی عورتیں گریجوایٹ ہو کر نکلیں... وہیں کوئی یہ اعداد بھی شائع کر دے کہ اتنی ڈکیتی فحش کاری، اسقاط حمل، جیب تراشی میں پکڑی گئیں۔

(ایضاً)

(زمینوں کے بعد مکان (تحریک اب تک دیہاتوں تک محدود تھی اب شہری علاقے میں مکانات بھی زد میں آئیں گے)

خوب ہوا جو اس کا بھی اعلان کیا گیا، اور دن دہاڑے اب لاکھوں گھر والوں کو وطن دوستی اور قوم پروری کے نام پر بے گھر کر دیا جائے گا۔ دیکھئے اب نقدی زیور۔ فرنیچر اور کاٹھ کباڑ کا نمبر کب آتا ہے۔ اور پھر زر و زمین دونوں کے استحصال بالجبر کے بعد زن

کے اشتراک و تصرف کا۔

ایضاً

اہل نظر کی نظر میں "ایک پروفیسر کی تازہ امریکی سیاحت کی روداد جس میں بعض پُر لطف جھلکیاں بھی ہیں۔ کا نی...... صاحب اب اپنے وقت کا بڑا حصہ نہیں پُر لطافت و پُر معنی سیاحوں اور سیاحت ناموں کی نذر کرتے ہیں۔ ۴ ستمبر ۱۹۶۷ء

احساس برتری کے کرشمے "ایک ذمہ دار افسر نے کہا کہ ہندوستان کے اسکولوں میں سنسکرت کو بطور لازمی مضمون پڑھایا جائے۔ جو لوگ اب اسے جانتے ہیں وہ تو کبھی سکتے ہیں۔ لیکن کسی غیر مروج زبان کو لازمی طور پر پڑھانا کسی کے لئے بھی فائدہ بخش نہ ہوگا) ...... لسانیات کی رائے پر چھنا کون ہے اور تحریک کی معقولیت و افادیت ...... بحث ہی کس کو ہے ...... یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے یہ مطالبہ اٹھایا ہے وہ اس کو عملاً نافذ بھی کر سکتے ہیں۔ بس یہی احساس برتری تو ہے جو یہ سارے تماشے دکھلا رہا ہے اور دیکھئے کب تک دکھاتا رہے گا۔

ایضاً

"جاہ و شہرت کی بے ثباتی" ایک انگریزی کتاب "ونسٹن چرچل کا قتل" جو چرچل کی ہزاروں ہجوؤں کے جواب میں بطور ...... شائع ہوئی ہے (پیرا لے زنی کرتے ہوئے) چرچل کون ہیں جنگ عظیم ثانی میں برطانیہ کے سب سے بڑے ہیرو ...... فطرت بشری کے تلون مزاج اور جاہ و شہرت کی ناپائیداری کی یہ کسی عبرت ناک مثال ہے اور خود ہندوستان کے اندر گاندھی جی مہاتما اور باپو کی شہرت کا زوال کچھ کم عبرت انگیز ہے؟ ایضاً۔

"وحدت ادیان کا زہر" مولانا نے ملک کی ایک نامور شخصیت پر اُن کے بعض "صلح کُل" اقدامات کے سلسلے میں تعریض کی تھی۔ حالانکہ ویسے دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ یہاں موصوف کے عقائد کے ماخذ کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں۔

وحدت ادیان کا بیج نہیں پڑا اور کہیں سے جھوٹا اور کفر و اسلام کی یکسانی کا عمل نہیں سے ہاتھ آیا۔ اور ...... آخر میں جو شدید بے احتیاطیاں ظاہر ہونے لگیں ان کا حل بڑی حد تک اسی کی روشنی میں ملجاتا ہے اللہ ہم سب کی یہ ایمانی کمزوریاں معاف فرمائے

ایضاً

"علی گڑھ ہٹاؤ تحریک" "جن سنگھ کا مسلم آزار مطالبہ کہ مسلم یونیورسٹی کی ملی حیثیت کو ختم کیا جائے۔ اور اس کو ایک قومی سیکولر ادارے میں تبدیل کر دیا جائے ضرور۔ ضرور۔ لیکن اس کے لئے آخر اتنی دور دراز راہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے سیدھی۔ مختصر اور کھلی ہوئی تو کی رائے یہ ہے کہ "زبان ہٹاؤ" تحریک کی طرح "علی گڑھ ہٹاؤ" اور "مسلم ادارے ہٹاؤ" کی براہ راست ایک تحریک شروع کر دی جائے اور آناً فاناً یہ قلعہ بھی فتح کر لیا جائے۔

ایضاً

"بچوں کا نا قوم کے بچپانے مشغلے" (ہڑتال مظاہرے گھیراؤ بند وغیرہ کا طوفان بے تمیزی)

جی ہاں، اور بغیر اس چٹخارے کے شاید نہ ہضم آتی ہے نہ کھانا ہضم ہوتا ہے خوب ہے یہ بچکانا قوم اور اس کے بچکانا لیڈر، انگریز بیچارے اپنے دورِ حکومت میں ان نعمتوں کو ترستے ہی رہے! (ایضاً)

"سوشلزم کی آمد آمد" (لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی کیوں کہ لڑکے والے فلیٹ، کار، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ کا مطالبہ کرتے ہیں)

اور آپ یقین کیجئے، پورا یقین کیجئے، ذرا بھی شک و شبہہ دل میں نہ لایئے کہ سوشلزم آرہا ہے، مالدار اور مفلس کی سطح ایک ہو رہی ہے۔ افلاس کا مرض دور ہو رہا ہے، سعدی، رومی اور ان کے ہم عقیدہ احمق تھے جو پریشانیوں کا علاج قناعت کو بتا گئے تھے۔ اصل اور اکسیری علاج تو یہ ہے۔ اسراف، دنیاوی اسراف، شاہانہ اسراف۔

"قناعت کے مرحلے" (مسلم یونیورسٹی میں جرّاجی کمیٹی نے مسلم و غیر مسلم طلبہ کا تناسب ۷۵ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء اور ۲۵ لکھا تھا) گویا یہ نام کی مسلم یونیورسٹی اپنے اندر مسلم طلبہ ۱۰۰ فی صدی کیا معنیٰ ۹۰ بلکہ ۸۰، ۷۵، ۷۰ فی صدی بھی نہ رکھ سکے، بلکہ کل ۶۵ فی صدی پر قناعت کرنے پر مجبور رہو۔ اور ہماری مرعوبیت اور خود فراموشی کا یہ کمال ملاحظہ ہو کہ ہم اتنے پر بھی مطمئن ہو رہے ہیں۔

یوں گمرہانِ عشق ہیں رہزن کے ساتھ خوش
گویا کہ ہو لئے ہیں کسی رہنما کے ساتھ

ایضاً

وہ وعدہ فراموش رہی تجھ کو جفا یاد (وزیر تعلیمات ہند کا بیان کہ ہم نے "ساتھ ہی ساتھ طلبۂ علی گڑھ کو۔ اطمینان بھی دلایا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کا نام تبدیل نہ ہوگا۔ جب تک کہ ہندو یونیورسٹی بنارس کا نام تبدیل نہ ہو جائے")

تو اس (اطمینان دلانے) کی بنیاد کل یہ ہے کہ شعر کے دونوں مصرعوں کا ہم وزن ہونا ضروری ہے۔

ایضاً

"جمہوریت میں جدّت" (یو، این، آئی کے جائزے کے مطابق وزیروں کی تعداد ۱۹۶۷ء میں ملک کے اندر ۲۹۴ تھی، اب ۱۹۷۰ء میں ۵۴۴ ہے۔ مرکزی وزرا پہلے ۴۷ تھے اب ۵۶، مرکزی وزرا کے سالانہ مصارف ایک کروڑ ۵۰ لاکھ سے بڑھ کر ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ)

گاندھی جی کے نام کی دُہائی کوئی کب تک دے اور ان کے نام اور ان کی یاد سے فریاد کب تک کئے جائے۔

ایضاً

غرض یہ صرف سوا مہینے، ڈیڑھ مہینے کے تراشے تھے جن سے ہر شخص مولانا کی طنزیہ نگارش اور اس کے لہجے کے بارے میں رائے قائم کر سکتا ہے۔ ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جن سلیم الطبع حضرت کو تعصب کی بیماری نہیں ہے اور جن کے ضمیر فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضا کے مصداق نہیں ہوئے ہیں وہ اس نگارش کی ضرور داد دینگے جو سیاسی نوک جھوک اور دشنام طرازی سے

پاک اور کلمۂ الحق کے اظہار میں بے باک ہے اور جس کی بنیاد خود حکومت سے مسلمہ اعداد پر قائم ہے مواد کی صحت کے ساتھ عبارت کا زور اور اختصار و جا بجا برمحل اشعار مزید برآں۔ اس پر بھی اگر کوئی منہ آئے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا مرض علاج کی حد سے گزر چکا ہے۔

مولانا کی طنزیہ تحریروں پر بعض حلقوں سے اعتراضات بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے مزاج میں حدت بجے بے تلخی۔ اور تلخی میں شدت زیادہ ہے۔ نیز یہ کہ وہ مولویت سے بے طرح مانوس اور اصلاح سے بالکل مایوس نظر آتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ ان اعتراضوں میں کسی قدر صحت لیکن عموماً شدت پائی جاتی ہے۔ چند اصحاب دبی زبان سے ان کے طرز کی یکسانیت کا گلہ کرتے ہوئے ان کے ... کی خرابیوں کا اشارہ تو ہے مگر حل نہیں۔

اس سلسلے میں اگر چند حقائق پیشِ نظر رکھے جائیں تو مناسب ہوگا۔ ان کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد ہمارے خیال میں بہت سے اعتراضات خود بخود اٹھ جائیں گے اور بہت سے شکوک آپ دفع ہو جائیں گے۔

اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ سخت مرض کے لئے دوا بھی تلخ ضروری ہے مگر ٹھہریے مولانا نے معالج ہونے کا کبھی دعویٰ بھی نہیں کیا۔ ان کی حیثیت ایک معالج کی نہیں۔ ایک مُشہر کی ہے۔ وہ بیمار کو کبھی نرمی سے اور کبھی گرمی سے صرف اتنا بتا دیتے ہیں کہ اُس کا مرض کتنا خطرناک ہو چلا ہے۔

ہو سکتا تھا کہ وہ گاہے گاہے اپنے مشوروں میں ظرافت کی چاشنی ملا دیتے تاکہ وہ تلخی گوارا ہو جاتی مگر ایک اصلاحی آرگن اور اودھ پنچ کی حیثیت یکساں نہیں ہوتی۔ دونوں کے منصب و مقاصد جدا دونوں کے ... و وظائف جدا۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ یہ ایک کو خوش ... ممکن نہیں اس کے علاوہ یہ ... کی تاثیر گھٹ جاتی ہے اور ان کا اصلی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے شروع میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ طنز میں مواد کی اصل اہمیت ہے۔ اُس کا ادب خواہ کچھ بھی ہو۔ لہٰذا منصفی نہ ہوگی اگر موصوف پر فردِ جرم تو لگا دی جائے اور ان کو جائز رعایت کا فائدہ نہ دیا جائے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ انھوں نے ادبیت کی شرائط کو برتتے ہوئے مواد اور ہیئت دونوں میں طنز کو جس ... کے ساتھ برتا ہے اُس کی مثال اُردو میں ... ہے۔

بقیہ مضمون صفحہ ۱۳۲

بقیہ مضمون صفحہ ۱۳۲

اس کو قدامت پسندی کہئے یا وضعداری کہئے کہ عبدالماجد کی عبارت میں کبھی کبھی ایسے الفاظ بھی آجاتے ہیں جو اب زیادہ پسند نہیں کئے جاتے مثلاً تئیں اور پس وغیرہ اور کبھی کبھی عبارت کا مقفّیٰ ہونا بھی آپ کی نثر میں نظر آجاتا ہے لیکن باوجود متروک ہونے کے بھی یہ چیزیں اس خوبصورتی سے عبارت میں جگہ پاتی ہیں کہ بدمزگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔

ذکرِ ماجد

(جناب پروفیسر اختر بستوی)

عاشقانِ نثر کی نظروں میں جو محبوب ہے — جس کی انشا میں زباں کی سحر کاری خوب ہے
جس کا اندازِ بیاں ناقد کو بھی مرغوب ہے — جو قلم کا ہے دھنی اور صاحبِ اسلوب ہے

ابتدا میں فلسفے کی سمت جس نے کی نگاہ — بعد ازاں جس نے چنی اپنے لئے مذہب کی راہ
دونوں ہی ادوار میں قائم رہی بے اشتباہ — جس کے قلبِ بے ریا میں خدمتِ اردو کی چاہ

جس کے تحقیقی مقالے ہیں ادب کے شاہکار — جس کے تنقیدی مضامیں بن گئے ہیں یادگار
جس نے گلزارِ صحافت کو دیئے ہیں گل ہزار — جس نے صد ہا طور سے اردو کو بخشا ہے وقار

جس کی عظمت بے نیازِ گردشِ ایام ہے — جس کا دریا باد گھر ہے، جس کا ماجد نام ہے
آج اس کا ذکر اہلِ علم و فن میں عام ہے — میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اک ضروری کام ہے

محمد جمال پاشا

صاحبِ ''صدق'' کا نثری اسلوب اور طنز

مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی اردو کے تعلّی شمار ہمارے بیش قیمت کلاسیکی سرمایہ میں ہے جو کمیاب بھی ہے اور نایاب بھی۔ کمیاب اس اعتبار سے کہ ہمارے نثری سرمایہ کی اساس جن صاحبِ طرز انشاپردازوں پر ہے ان کی تعداد ان گنت اہلِ قلم میں مانی گئی ہے۔ اور تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ رجب علی بیگ سرور۔ سرسید احمد خاں، مولوی محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی۔ مولانا شبلی نعمانی۔ سید سلیمان ندوی۔ مہدی افادی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی۔ سید احتشام حسین۔ آل احمد سرور۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ ڈاکٹر خورشید السلام اور انتظار حسین تک ہماری اعلیٰ ترین نثری روایت کا جز۔ مولانا شبلی نعمانی سے انتظار حسین تک مولانا عبدالماجد دریاآبادی نظر آتے ہیں۔ بقیہ اہم نثرنگاروں کو اس فہرست میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ان اہم ادبی نثری ستونوں میں سے کسی نہ کسی کے سائے تلے نظر آتے ہیں یا اپنی راہ الگ نہیں بنا پاتے ہیں۔ شاید اس فہرست میں بھی مزید اختصار و دو ایک ناموں کی حد تک ممکن ہو۔

نایاب اس اعتبار سے کہ گزشتہ نصف صدی سے زائد کی مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی ادھر ادھر کتب و رسائل میں منتشر ''سچ'' اور ''صدق'' میں محفوظ نثر عالیہ کو ابھی تک یکجا اور محفوظ نہیں کیا گیا ہے۔ ''مقالاتِ ماجد''۔ ''انشائے ماجد''۔ ''نشریاتِ ماجد'' اور ان کی متعدد دیگر تصانیف میں محض ان کا عطر پیش کیا گیا ہے۔ ورنہ ان کی بیشتر عالمانہ، فلسفیانہ، ادبی اور ہلکی پھلکی شوخ و شنگ تحریریں نہ ابھی تک انتخاب کی گئی ہیں اور نہ یکجا۔

صاحبِ صدق بے باک ترجمانِ مشرق ہیں — اکبر الٰہ آبادی۔ مولانا شبلی۔ اور علامہ اقبال کی اس عظیم روایت کا تسلسل انھوں نے نہ صرف برابر قائم رکھا ہے بلکہ اسے آگے بھی بڑھایا ہے۔ ان کے یہاں ملّت کا گہرا درد ہے۔ جس نے ان کے قلم کو بے لاگ، نڈر اور باغی بنا دیا ہے۔ حریتِ فکر ان کے یہاں سرفروشی کی حد تک ہے۔ وہ ایک انتہائی جری اور بے باک ادیب اور صحافی ہیں۔ ان کے ایک ناقد نے لکھا ہے کہ ''ان کے طنز میں خشونت

سے[1] شاید کسی بھی طنز نگار کو اس سے زیادہ خراج تحسین نہیں پیش کیا جا سکتا۔ خشونت درازی اور بیباکی کی وہ منزل ہے جو طنز نگار کو پوپ اور سوئفٹ بناتی ہے۔ خشونت کی نمو حرّیتِ فکر سے ہوتی ہے جو ہمارے ادب میں ان کے علاوہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میخانے کے ساقی اور سارے میخوار سب مصلحتِ وقت کے اسیر ہیں اور تقریباً سبھی بادۂ خودغرضانہ سے سرشار اور مدہوش نظر آتے ہیں نفسی نفسی کی اس تاریک گھٹا میں کبھی کبھار حق گوئی کے کوندے لپک جاتے ہیں۔ جن کی روشنی میں اعجاز صدیقی، ڈاکٹر آصف قدوائی، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اُردو یا دوسرے اقلیتی حقوق کے لئے بلا کسی طمع کے صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آجاتے ہیں۔ ورنہ مطلع ادب و صحافت پر "صدق" کی احتجاجی بجلیاں ہی چمکتی رہتی ہیں۔

صاحب "صدق" کا نثری اسلوب موضوع کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اپنی مذہبی، دینی تحریروں اور تفسیر القرآن میں ان کا انداز عالمانہ، دقیق اور پُرشکوہ ہوتا ہے۔ لیکن سادگی اور سلاست کے ساتھ۔ عالمانہ، فلسفیانہ اور تحقیقی مضامین میں ایک عالم ایک فلسفی یا ایک محقق کی شانِ تصنیف وہ برقرار رکھتے ہیں۔ اپنی ادبی اور صحافتی تحریروں میں وہ سادگی اور سلاست سے کام لیتے ہیں۔ ان کے نپے، تلے، چھوٹے چھوٹے جملے، برجستہ فقرے، محاورے، اشعار اور مصرعے، تراکیب بولتے ہوئے رواں دواں الفاظ۔ پھر الفاظ بھی کیسے کہ جو لفظ جہاں رکھ دیا ہلائے نہیں ہٹ سکتا۔ انگشتری میں نگینہ کی طرح اپنی جگہ جما تا ہے۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عبارت چست اور متحرک ہوتی ہے۔ جامد اور بے جان نثر، ڈھیلی ڈھالی اور کلیکی تحریر کا اس لبستانِ ادب میں گذر نہیں۔ بہار شوخی و تازگی ہے تراوٹ اور جدّت ہے۔ ندرت اور ایجاز ہے، طباعی ہے۔ حکیمانہ اُپج ہے۔ سرخی ایسی جمائی جاتی ہے کہ طبیعت پھڑک اُٹھے، چٹکی ایسی ہوتی ہے کہ بے اختیار تڑپنے والے کے منھ سے واہ! واہ! سبحان اللہ! نکل جائے۔ اظہارِ مدعا میں ایسے بے باک اور منھ پھٹ کہ دوسرا جو دل میں سوچتے ڈرتے وہ ان کے خنجرِ قلم کی نوک پر دھری ہوتی ہے۔ "ترکوں کی طرح" سے ڈرنے کا سوال نہیں مگر یہ تو "آجکل" بیگم کی توزح" سے بھی نہیں ڈرتے۔ اس نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نثر نگار کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلتی ہے۔ یہ جدھر اور جیسے چاہے اسے موڑ دیتے ہیں۔ اس نثر میں شگفتگی اور شادابی ہے۔ بشاشت اور خوش فکری ہے۔ سادگی اور روانی ہے۔ یہ نثر دل میں جاکر بیٹھ جاتی ہے، یا اس کے دھماکے دل اور دماغ میں محسوس ہوتے ہیں۔ اس میں کسک، اثر اور دھمک ہے۔ یہ بالکل اُن کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو جہاں چاہیں خوش یا اُداس کر دیں یا سوچنے اور سر دھننے پر مجبور کر دیں۔

---

[1] تنقیدیں۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام

ن کا لہجہ ان کے موضوع پر منحصر ہے۔ اگر تحریر ادبی
ہے تو لہجہ انتہائی شیریں، سبک اور ادبی ہوتا ہے۔
لیکن اگر تحریر صحافتی ہے۔ تو پھر اس میں لہجہ احتجاجی
لبند اور شوخ ہوتا ہے۔ لہجے میں طنز اور طراری ہوتی
ہے۔ یا محاسبے والا انداز ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کا
لہجہ بلند بانگ، پُر شکوہ یا پھر یاسیت اور کرب میں
ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اس لہجے میں درد والم اور
فکرِ جنوں کی آمیزش ہوتی ہے۔

صاحبِ "صدق" کے ادبی مضامین کا دائرہ
بہت وسیع ہے اور جملہ نثری اصناف اپنے پورے
علمی اور ادبی طمطراق کے ساتھ "سچی باتیں" کے
کالم میں یا شذرات کے تحت نظر آتی ہیں، یہ مضامین
مذہبی، تحقیقی، فلسفیانہ، علمی یا ادبی ہوتے ہیں۔
ان میں طنزیے، مرقعے، انشائیے، خاکے، آپ بیتی،
سفر پارے، تقاریر، معاشرتی جھلکیاں، منظر کشی،
تراجم اور تبصرے وغیرہ ہوتے ہیں۔

صاحبِ "صدق" کے عنوانات دیکھئے
کیسے پرلطف ہوتے ہیں ؛۔

"سچی باتیں" "خوشامدیوں کے نرغے میں"
اندر سبھا کی ایک جھلک، "فتح سنگھ کی فتح"، "کاغذی
سیکولرزم"۔ "قانون کی دھجیاں، تعصب کی یلغار،
"گئو بھگتوں سے"، "جدت کی قدامت"، "بلندیوں کی
پستیاں، عزت مآب سے مسخر، بے غیرتی کی منطق،
"نظامِ خوش انجام"، "چھا گلاازم"، "بیجا بندشیں"،
بچکانہ منطق، در مدح خود می گوید، ایک سادہ چیک،
"حکومت قہری"، بزدل سورما"، منصب کا جرمانہ،
"ایسے ویسے کیسے کیسے ہوگئے"۔ "خیر سگالی جج
تک، "مہا خوشامد، تیز مرچ کی چائے"،
"ناگفتنی پر گفتگو"، "ہوا کے رُخ پر، پرسنل لا پر عقبی حملہ"،
دیر ہے اندھیر نہیں۔ دیر و حرم کی یکجائی،
"جہاں بات بنائے نہ بنے"۔ "پرانے ذاتِ شریف"۔
"روشن خیالوں کی ہٹ"۔ "پہاڑ کھودنے کے بعد"
"بڑوں کی ہاتھا پائی"، "بے خبری کا ریکارڈ"،
"شکاری اپنے ہی جال میں"، "بھیڑیے پاسبان کے
روپ میں"۔ "شرفائے شہر کی ڈھیلے بازی"۔

صاحبِ "صدق" عُریانیت، اردو دشمنی،
مسلم بے زاری۔ مذہبی مقامات کی بے حرمتی،
منافقت۔ سائنسی استحصال۔ تہذیب سے عاری
فلموں۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات سے بے اعتنائی۔
مغربی ریشہ دوانیوں، ممالک اسلامیہ کی بے عملی۔
بے دینی۔ فرقہ واریت۔ تخریب کاری، خوشامد،
اربابِ نشاط۔ جنسی بے راہ روی۔ فرقہ وارانہ
فسادات، فرقہ پرست تنگ نظر جماعتوں،
اسرافِ بے جا، جدید جرائم۔ کاغذی سیکولرازم
ماضی سے بے تعلقی۔ اُردو، فارسی اور عربی تعلیم
سے بے پروائی۔ مسلم اداروں پر تعصب کی یلغار
قانون کی بے حرمتی۔ اور بے دینی کے خلاف ایک
مسلسل احتجاج ہیں۔

صاحبِ "صدق" کا اصلی رنگ مذہبی
یہ رنگ ان پر کھلتا بھی ہے اور کھلتا بھی ہے

"بے گانگئ مذہب"، "مسلم پرسنل لا"، "ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں"، "رنگین جھوٹ وہ ہے تو یہ ہے سفید جھوٹ"، "بلا تبصرہ"، "گائے جیسے گلزاری لال"، "کچھ جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے"، "این گل دیگر شگفت"۔ "ایک خوشخبری جو خوشخبری نہیں۔" "اپنا چہرہ اپنے آئینے" میں۔ "محمود و ایاز ایک صف میں"۔ "ایک سادہ چیک"۔ "ایک بے وقار قوم"۔ "خیر سگالی سے رحم تک"۔ "بہ یک گردشِ چرخِ نیلوفری"۔ "نئی بپر۔" "ایک حادثۂ ملی۔" "پھر وہی نیش زنی اور تعصب کی رو میں"۔ اس کی روشن مثالیں ہیں۔ "سچی باتیں" میں یہ رنگ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

"واعظِ دین کی ذمہ داری یوں بھی بڑی ہوتی ہے۔ دین کے نام سے زبان بہت سوچ سمجھ کر اور اپنے بول کو تول کر، کھولنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ جب وہ بیان حرمِ کعبہ میں ہو رہا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدائے پاک کی قسم کھا کر ہو رہا ہو۔ !" (ایک ہندوستانی عالم نے ایک دوسرے ہندوستانی عالم کو مدینہ منورہ میں یہ ارشاد فرماتے سنا کہ "ٹیکہ لگوانا بہت بڑا کام ہے اس لئے کہ یہ توکل کے منافی ہے۔" اس پر صاحب "صدق" فرماتے ہیں)۔۔۔۔۔۔ اور علاج ہی ہر صورت میں ناجائز ہے تو پھر اس دنیا میں اسباب سے تمسک و توسل۔ اور تدبیر سے کسی شعبۂ زندگی میں بھی کام لینا کس طرح جائز ٹھہرے گا۔؟ ـــــ کیا مصیبت ہے۔

کہ جہاں ایک طرف ہر جدید چیز لذیذ ہے عزیز ہے۔ ممدوح ہے۔ اندھا دھند لے لینے بلکہ اُچک لینے کے قابل ہے وہاں دوسری طرف ہر جدید چیز مردود ہے۔ اچھوت ہے۔ بچنے اور وحشت کھانے کے قابل ہے۔ اور دینداری مرادف ہے۔ قدامت پرستی کے۔!"

(صدق جدید ۲ جنوری ۱۹۶۷ء ص ۱ و ۲)

صاحب "صدق" کی وسعتِ نظر اور دقتِ نظر کی ایک جھلک اِن کے تحقیقی مضمون "اِنسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ جدید اڈیشن۔" میں ملاحظہ ہو:۔

"۔۔۔۔۔۔ جہاں تک کوشش و کاوش ۔۔۔ تلاش و تفحص کا تعلق ہے مغربیوں کے یہ کارنامے ہمارے لئے قابلِ رشک ہیں۔ معلومات کن کن گوشوں سے اور کہاں کہاں سے لے آتے ہیں، کہ ہم مشرقیوں کا تو ذہن بھی وہاں تک نہیں پہونچتا۔ اور ان کے یہاں کے سے نادر کتب خانے ہماری دسترس میں کہاں ہیں۔ جو مصیبت اور شامت یہ ہے کہ چونکہ انکی تحقیقات کی بنیاد کج ہے۔ اس لئے نتائج کی دیوار سر بہ فلک کھڑی کرتے ہیں تو وہ جو ٹیڑھی ہی چلی جاتی ہے اور عقائد اور تمدن اور جزئیات سیرت نبوی سے متعلق یہ کجی اتنی شدت سے نمایاں ہو جاتی ہے کہ انکی تحقیقات کا پڑھنا ہی صبر آزما ہو جاتا ہے۔

(صدق جدید ۲ دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۵ کالم ۱)

صاحبِ "صدق" کے فلسفیانہ مضامین
ایک جھلک "تخلیق کا سدا بہار کاروبار"
ملاحظہ فرمائیے :-

"کائنات پھیل رہی ہے اور وسیع سے وسیع
ہوتی جارہی ہے۔ ستارے ہم سے دور ہوتے جارہے
ہیں۔" "کائنات کسی انجانی منزل کی طرف
بڑھتی جارہی ہے۔ بڑے بڑے سائنسی مضمون اور
مقالے آج کل اسی قسم کے فقروں سے بھرے ہوئے
دکھائی دیے بلکہ کسی کسی مقالے کی تو سرخیاں بھی
پائی گئیں۔ گویا سائنسی دنیا کے لئے یہ کوئی اہم
اور نئے انکشاف ہیں! خیر وہ سائنسی دنیا کے
لئے جو کچھ بھی ہوں۔ مذہبی دنیا کے لئے تو یہ کھلی
ہوئی اور بیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں۔ خالقِ کائنات
کی قوتِ تخلیق جب معطل نہیں ہوئی ہے تو آخر جس
طرح چرند و پرند ہر قسم کے جانور اور شجر و حجر ہر طرح
کے نباتات و جمادات ہر روز نئے نئے وجود میں
آتے رہتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ نئے نئے ستارے
اور چاند اور سورج نہ پیدا ہوتے رہیں؟ آسمانوں
اور کہکشانوں کی آفرینش کیا اب بند ہوگئی ہے؟
آخر یہ فرض ہی کیسے کرلیا گیا؟ کل یوم ھو فی شان
میں کیا کوئی استثنا بھی ہے۔"
(صدق جدید ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۲ کالم ۱)

صاحبِ صدق سراپا علم ہیں ان کے علمی مضامین
کی سچ پوچھئے تو اک زمانے میں دھوم ہے۔ ان کی
بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو :-

"...... تاریخ طب یونانی۔ اس میں تفصیل
کے ساتھ دکھایا جائے کہ فن کی ابتدا کس ملک سے
کس زمانے میں ہوئی۔ دنیا میں اور کون سی طبیں
اس وقت رائج تھیں یا نام طب یونانی کیوں ہوا؟
اور کب سے پڑا؟ بانی، امام، مجدد، مجتہد کون
کون سے گزرے ہیں؟ ترمیم، ترقی تکمیل کے مدارج
کیونکر طے ہوتے رہے ہیں یا موجودہ دور میں فن کس
منزل پر ہے وغیرہا اور اسے اس کے موجودہ مرتبہ
تک پہونچانے میں کتنا بڑا حصہ اطبا ہند کا رہا ہے؟"
(تاریخ اطبا ہند۔ صدق جدید ۱۳ جنوری ۱۹۶۳ء
ص ۵ کالم ۱)

صاحبِ صدق کی ادبی تحریروں میں بڑا
رچاؤ اور اسلوب کا بانکپن ہوتا ہے۔ ان کی انشا
کے چٹخاروں کا اگر مزا لینا ہو تو "علیگڑھ مرحوم"
"ایک آرٹسٹ"، "ایک پرانی خانقاہ"، "ہڑتالیں"،
"دودن بھوپال میں"، "یہ نانیاں دادیاں"،
"پرانی جینتگ"، "دور الہلال کے مولانا ابوالکلام"،
"جدت کی قدامت"، "بحرہ مردار"، "نظام خوش انجام"،
"عمر کا پچھترواں سال"، "قصبہ گدیہ"، "گرڈ فرائڈے"،
"موسم"، "سرکاری تقریب میں"، "مسلمان صدر جمہوریہ"،
"انسان کی بے بساطی"، "اثر لکھنوی مرحوم"،
"جوش وساقی"، "سید حسین مرحوم کی ایک یاد"،
"اقبال کا شکوہ"، "خاندانی قبرستان"، "محمڈن
ایجوکیشنل کانفرنس"، "احمد غریب مرحوم"،
"ریل کا سفر"، "راجہ ہمارا ہے"، "نئی دنیا والے

عظیم باپ اسٹالن، تخلیق کا سدا بہار کاروبار"
"گنگوے کا مقابلہ" "تقریر بے تاثیر" اور دوسری
سبھی باتوں اور ان کے دیگر شذرات کا مطالعہ
کرے۔ ایک نمونہ "چند گھنٹے علی گڑھ میں"
دیکھئے :۔

"سرور صاحب (صدر شعبۂ اردو) کا ساتھ
سفر میں لکھنؤ ہی سے ہو گیا تھا۔ اور کہنے والے
کی زبان پر اس وقت آ گیا تھا کہ ۔ "جب
"سرور" رفیق سفر ہو، تو اب "غم" کیا"۔
۔ اور بات ٹھیک ہی نکلی سرور صاحب کے
معلومات سے اردو ادب کی کتابوں سے متعلق نہ
صرف اثنائے سفر میں استفادہ ہوتا رہا۔ بلکہ
علی گڑھ پہونچ کر دوسری صبح کو انھوں نے اچھا
خاصا وقت میرے لئے نکالا اور آزاد لائبریری اپنے
ساتھ لے جا کر اردو لغت کی کمیاب و نایاب کتابوں کا
نادر ذخیرہ میرے لئے نکلوایا اور اس کے متعلق اپنے معلومات
سے پوری مدد فرماتے رہے۔ جتنا وقت ان کے ساتھ گذرا، ایک،
طالب علم کا ایک صاحبِ علم کے ساتھ گذرا اور
دل ان کے شکریہ سے لبریز رہا ۔ "

(صدقِ جدید ۹ دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۵ کالم ۲)

لطیفہ نہیں خبر "نئی دہلی ۱۸ مارچ ۔
صدر جمہوریہ نے آج اپنا
ابتدائی افتتاحی پارلیمنٹ کے سامنے شستہ انگریزی
میں سنایا اور اس کا ہندی ترجمہ نائب صدر
ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے کیا ۔"

• ڈاکٹر صاحب کا تعارف ناتمام رہا۔ اس
لئے ان کے ہندی ترجمہ میں کچھ لطف نہ آیا۔ پورا
تعارف یوں کرانا تھا۔ سابق صدر انجمن ترقیٔ اردو
اور اب ان کی زبان سے ہندی ترجمہ لطف دے گیا۔
آزادی کے کچھ ہی روز بعد ایک معروف
و مشہور و کہنہ مشق ہندو اہلِ قلم نے ایک مزاحیہ
مضمون شائع کیا کہ میں عالمِ خیال میں دہلی پہونچا
اور مولانا ابوالکلام سے ملنا چاہا۔ ایک ایک سے
پتہ "وزیرِ تعلیم" اور "ایجوکیشن منسٹر" کا پوچھا
کوئی میری بات ہی نہ سمجھا۔ بڑی ٹھوکریں کھانے
کے بعد بالآخر ایک رہنما ہاتھ آئے انھوں نے کہا
کہ "اچھا آپ" "آپ انکلام آجاد" کو پوچھتے ہیں۔
تو "شکشا منتری" کہہ کر پوچھئے۔ خیر یہ صاحب کسی طرح
مولانا کے کمرے تک پہونچے۔ انھیں یقین تھا کہ جب
کمرے میں پہونچیں گے تو مولانا کو خالی وقت میں دیوانِ
نظیری یا کلیاتِ عرفی کا مطالعہ کرتے پائیں گے،
جب کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مولانا سر جھکائے
تلسی داس کی ہندی راماین کے مطالعہ میں لگے ہوئے
ہیں۔ ۔۔۔ یہ تازہ خبر کہیں اسی مبتدا کی خبر تو نہیں۔
سنجیدہ واقعیت پرانے لطیفہ کے ٹکر کی ۔۔۔!"

(صدق جدید ۳۱ مارچ ۱۹۶۷ء ص ۲ کالم ۲)

اس کو کہتے ہیں طنز، ایک تیر سے دو شکار اور
ایک ہی بار میں سارے حساب صاف، سابق وزیر
خارجہ مسٹر چھاگلہ پر "عزتمآب" کی پھبتی "عزتمآب
سے متحر" میں اس کارٹون کے بارے میں ملاحظہ ہو

کے ممتاز ہفتہ وار " ٹھاٹ " نے شائع کیا تھا۔

" درمیان میں نئی حسینۂ عالم[1] سر پر تاج دیے
...میں ملبوس رقص کر رہی ہے۔ داہنے پر امریکہ
...ہو مسخرہ ایکڑ باب ہوپ ہے۔ اور اس کے بائیں پر
...ے عزت مآب وزیر خارجہ سر کے سرپوش سے
...پیر کی جوتیوں تک ٹھیک مسخروں کی وضع و لباس
...ملبوس رقص کرتے جاتے اور زبان سے فرماتے جاتے
...کہ " اگر مسخرے کے ساتھ ہی ناچنا ہے تو مجھ سے بہتر
رقص کہاں ملے گا "

(صدق جدید ۲۰ر جنوری ۱۹۶۷ء ص ۳ کالم ۱ و ۲)

صاحب صدق کے طنز کی ایک خارا شگاف جھلک
" فطرت کا گہرا طنز " میں دیکھیے :۔

" صدر جمہوریہ ہند مسٹر گری کا خیر مقدم ازبکستان میں۔
" کثرت اولاد پر وزیر اعظم ازبکستان کی طرف سے
دلی مبارکباد " " مسز سرسوتی گری اگر ازبکستانی
ہوتیں تو انھیں بہترین ماں کا اعزاز ملتا۔

اور یہ سب عین اسوقت جب ہندوستان میں ہفتہ
خاندانی منصوبہ بندی منایا جا چکا تھا اور جہاں ولادت کی
بندش اور حد بندی پر چھپنے والے بے شمار سرکاری پوسٹروں
ہینڈ بلوں، کتابوں اور اعلانوں کی سیاہی ابھی خشک
نہیں ہوئی تھی !۔

(صدق جدید " ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء ص ۲، کالم ۲)

صاحب صدق کے مرقعے بھی قابل دید و تحسین ہیں۔
جس چیز کا بیان کرتے ہیں اس کا نقشہ آنکھوں کے
سامنے کھینچ دیتے ہیں۔ " محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس "
کے سالانہ اجلاس کی سیر آپ ان کی چشم قلم سے فرمایئے :۔

" .... وہ دیکھیے، نواب محسن الملک فصاحت
کے دریا بہا رہے ہیں۔ اور اب دیکھیے، شمس العلماء مولانا
نذیر احمد دہلوی خطابت کے جوہر دکھا رہے ہیں وہ
دیکھیے قاری شاہ سلیمان پھلواروی آئے، اور آپ
جب چاہیں گے رلا دیں گے! پردہ اور ہٹا۔ اب اسٹیج
پر علی امام کا قبضہ ہے۔ اور اب صاحبزادہ آفتاب احمد
خاں اپنی تقریر سے دل ہلائے دے رہے ہیں۔ ادھر
شوکت علی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گرج رہے
ہیں۔ اُدھر محمد علی دلوں کو گرما رہے ہیں۔ مولانا شبلی
کا فاضلانہ تاریخی خطبہ ابھی ختم ہوا ہے۔ اور
اب حالی کی زار نالی ہے۔ دلوں کے پتھر موم کی
طرح پسیجیں گے ـــــــ صدر ہمیشہ کوئی نہ کوئی
چوٹی ہی کا منتخب ہوتا۔ سر آغا خاں، جسٹس سید
امیر علی۔ نواب صاحب ڈھاکہ، راجا صاحب محمود آباد،
سید حسین عماد الملک بلگرامی۔ جسٹس بدرالدین طیب
جی سب اپنے اپنے جلوے دکھا کر رخصت ہو گئے۔
ایک ایک صدر کے خطبۂ صدارت کے سننے کو
لوگ ایک دوسرے پر پلے پڑتے۔ "

(صدق جدید ۱۴ر جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱ کالم ۲)

صاحب " صدق " بڑے معرکے کے انشائیہ نگار
ہیں، " اکنّی "، " جانگھیا "، " ریل کا سفر "، " قصبۂ گدیا "،
" قرض "، " عدالت "، خاندانی قبرستان، ایک مثالی
اسٹرائک، " اتوار "، " موسم " اور " اٹھارویں دن "
وغیرہ ان کے ایسے شاہکار انشائیے ہیں جو نہ صرف

---

[1] یعنی رقا[illegible]

" ایسے "۷۰ Essays) کی مغربی تعریف پر پورے اُترتے ہیں بلکہ مشرق اور مغرب کے کسی بھی انشائی انتخاب کے مقابلے میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر " اکنّی ، جانگھیا ، باورچی اور اتوار اُردو کے انشائی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

اکنّی

" نئی دہلی سے ایک سرکاری اعلان " اکنّی " بطور قانونی سکّہ کے یکم جنوری ۱۹۶۴ء سے ختم کر دی جائے گا "

دنیا کی ہر چیز کی طرح سکوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ دینار، درہم ٹنکہ، فلوس، دھیلی، پاؤلی، کو آج کون جانتا ہے اور آنہ اور پائی اور ادھنا اور دُونی اور پیسے اور گنڈا اور دھیلا اور کوڑی تو ہمارے آپ کے سامنے ہی مردہ ہوئے ہیں۔

اکنّی کا شمار کوئی بہت پُرانے سکوں میں نہیں بلکہ زیادہ عمر لوگوں کو تو ابھی اس کا اجرا یاد ہوگا ۱۹۰۷ء ہی سے تو چلی تھی (لارڈ کرزن نے رفاہِ خلق کے خیال سے اس کے اجرا کی تحریک ۱۹۰۶ء میں کی تھی) پہلے کوڑی اور پھر بعد کو دھیلے کا دَور ختم ہونے کے بعد اب غریب غربا بلکہ متوسط الحال لوگوں کا بھی سب سے زیادہ محبوب اور مرغوب، کارآمد اور چلتا ہوا سکّہ یہی تھا۔ اور کتنی خوشگواریادیں ...ین سے لیکر اب تک کی، نکل کے اس چھوٹے سے ...ہ سے وابستہ ہیں۔ ایک آنہ کی مونگ پھلی سے ...ب کیسی بھر جاتی تھی۔ ایک آنہ کی مٹھائی اتنی مل ...تی تھی کہ کئی کئی حصے اس میں لگ جاتے تھے۔ ایک پلیٹ فارم ٹکٹ ایک آنہ کا اخبار کا پرچہ ایک آنہ میں، ریلوے ٹائم ٹیبل ایک آنہ میں، کباب روٹی کا ناشتہ ایک آنہ میں، لسی کا گلاس ایک آنہ میں چائے کی پیالی ایک آنہ میں، برف کی قفلی ایک آنہ میں۔ نمائش میں داخلے کا ٹکٹ ایک آنہ میں قلی کی مزدوری ایک آنہ، یکہ کا کرایہ ایک آنہ سے غرض ہما شما کا حاجت روا ایک آنہ!

اشرفی اور ساورن اور گنّی جس طرح دیکھتے دیکھتے عنقا ہو گئیں، اسی منزل کی طرف اکنّی بھی چلی اور چند روز بعد بس اس کا نام ہی سکوں کی تاریخ میں باقی رہ جائے گا اور شکل شاید عجائب خانوں کی الماریوں کے اندر ہی نظر پڑے۔

غم اس کے جانے کا نہ کیجئے، جو چیز آتی ہے جانے ہی کے لئے تو آتی ہے۔ خواہ جلد، خواہ بدیر! سوچئے یہ کہ بے شمار اکنیاں جو آپ کے ہاتھ سے نکلیں وہ کس مد میں اُٹھیں؟ موقع خیر پر یا اس کے برعکس؟ ایسی کہ جو آپ کے لئے دائمی راحت و مسرت کا باعث ثابت ہوں گی (یا کم سے کم یہ کہ ان کے صرف سے متعلق کوئی بازپرس نہ ہوگی) ۔ یا یہ کہ خدا نخواستہ آپ کے لئے وبالِ جان اور موجب حسرت و حرمان نکلیں گی ——— تلافی و تدارک کا موقع تو انسان کی آخری سانس تک باقی رہتا ہے "

(صدق جدید اگست ۱۹۵۳ء)

جانگھیا:— جانگھیا بھی لباسوں میں کوئی

رہے؟ محض رانیں ڈھکی ہوئیں۔باقی ساری
یں کھلی ہوئیں۔کسی بھلے آدمی سے محض
لیا پہن کر باہر نکلنے کی فرمائش کیجئے اُردو خطوں میں لکھا جائے
ب نہیں کہ وہ منہ نوچ لے۔ لیکن جانگھیا کے
ئے نیکر (NICKER) بول دیجئے تو دیکھئے
عادی اہانت عزت میں اور وہی گنوار پن
زندگی میں تبدیل ہوا جاتا ہے ۔ اس لئے
ارا ور محض اس لئے کہ "جانگھیا" دیسی ہے
"نیکر" ولایتی! — آج کوئی ہمارے سامنے
ترخوان پر صبح ناشتہ کے وقت گھی میں چپڑی ہوئی روٹی
ل کردے تو ہم اپنے دل میں کہیں ورمعلن ہے کہ زبان پر
رے آئیں کہ یہ کیا واہیات کھانا اور کیسا گنوار پن ہے
اگر ہمارے باپ دادا تو بڑی خوشی سے کھاتے تھے
یکن اگر کہیں بریک فاسٹ کے وقت میز پر نان یا
ٹکڑے مکھن کیساتھ آجائیں تو پھر دیکھئے ہم کس رغبت
شوق سے اس پر ٹوٹتے ہیں! کیوں؟ اس لئے کہ گھی چپڑنا
کہنگی کی یادگار اور قدامت داستی کی علامت ہے۔
مکھن لگانا خاص ماڈرن ازم کی دلیل آپ ذرا کسی
سفید پوش کو موچی کہہ کر پکاریئے پھر دیکھئے وہ آپ
پر کس طرح برس پڑتا ہے لیکن اسی کو اگر شو مرچنٹ کہہ کر
مخاطب کیجئے۔ تو دیکھئے وہ کس نیازمندی سے آپ کا
استقبال کرتا ہے۔ حالانکہ دونوں لفظوں کے مفہوم میں
کیا فرق ہے۔ بجز اس کے کہ ایک میں صاحبیت کی جھلک
ہے اور دوسرے میں ہندوستانیت کی بو! — گلی ڈنڈا

آپ کھیلئے تو وحشی ہیں۔ جانگلو ہیں۔ غیر مہذب ہیں —
لیکن کرکٹ کے لئے گیند بلا ہاتھ میں لے لیجئے تو ماشاء اللہ
ہیں مہذب ہیں، کلچرڈ ہیں۔

کھانے پینے، کھیلنے کودنے، اوڑھنے پہننے، رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے غرض معاشرت و معشیت کا کوئی سا بھی شعبہ لے لیجئے۔ ہر جگہ آپ ظہور اسی کا پائیں گے۔ کہ آپ اپنے کو بے اختیار بھولتے جاتے اور "صاحب" کے دامن کو بے ساختہ پکڑتے جاتے ہیں! "صاحب" ملک چھوڑ کر چلے بھی گئے جب بھی صاحبیت کا بول بالا اور اقبال ترقی پہ پایستہ رہے۔!"

صاحبِ "صدق" کے خاکے بھی خاصے چیز کے ہیں۔ انھوں نے جو خاکے اُڑائے ہیں اُن میں عمومی کردار بھی ہیں ہماری روزمرہ کی زندگی کے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے، مشینی زندگی کا پرزہ بنے بھاگتے دوڑتے اور خصوصی بھی اور غیر مرئی بھی — اِن کے مشہور کردار "پیرو میاں" اور "بابو جی" سے ملئے:—

"میاں پیرو قصبہ کے جانے پہچانے جراح ہیں۔ بوڑھے، بچے سب اُن کے معتقد ہیں ہندو مسلمان سب اُن کے کمالِ فن کے قائل ہیں۔ صبح منہ اندھیرے اپنا بقچہ جراحی بغل میں داب کر نکل جاتے ہیں اور دو دو تین تین میل کے دیہات کا پیدل گشت لگا دوپہر سے قبل اپنے کچی دیوار دل

اور کچی چھت والے گھر واپس آ جاتے ہیں۔ اور اس
وقت دو چار روپے ان کی جیب میں ہوتے ہیں
کبھی کبھی اور دُور جانا ہوا تو قسمت سے یکّہ کی سواری
بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ آلاتِ جراحی میں ان کے
پاس .... بس ایک نشتر ہے وہ بھی نیا نہیں
بلکہ انھیں کی طرح سال خوردہ اسی سے وہ پھوڑے
پھنسیوں میں شگاف لگا دیتے ہیں اور بقچے کے
اندر خانہ دار بکس میں تین چار طرح کے مرہم ہوتے ہیں
کوئی لال، کوئی سفید۔ کوئی زرد، ایک مرہم "زنگاری"
ہوتا ہے۔ اس کی وہ خود اور ان کے مریض بڑی تعریف
کیا کرتے ہیں، زخم کیسا ہو، اس سے بھر جاتا ہے۔
یہ سارے مرہم بھی جڑی بوٹیوں ہی کے بنے ہوتے ہیں
اور انھیں میں جراح صاحب کی حذاقت اور مسیحا نفسی
کا راز چھپا ہوا ہے۔ جراثیم کش اور (Antiseptic)
صابن اور عرق سے وہ ہاتھ دھونا جانتے ہی نہیں
اور نہ شائد یہ ان کے کان تک پہونچے ہوں۔ یہ سب
اس لئے کہ وہ محض "جراح" ہیں۔

شہر کے مشہور سرجن ڈاکٹر صدیقی کا نام تو
آپ نے بھی سنا ہوگا۔ شہر میں بھی فیس معقول ہے۔
اور باہر جانے کی تو کئی سو روپیہ ہے۔ ذاتی کوٹھی کے
علاوہ مطب کی بھی عالی شان عمارت در و دیوار
اتنے شفاف کہ گمان آئینہ کا ہونے لگے۔ فرش اتنا
چکنا کہ پائے نظر کو پھسل جانے کا احتمال ہو۔ چھوٹے
بڑے۔ نازک و نفیس اور خوفناک و خونخوار دونوں
قسم کے آلات جراحی کا وہ ذخیرہ کہ کنسلٹیشن روم
کے ڈانڈے میوزیم سے مل مل جائیں۔ دور و کمپاؤ
ہر وقت کمر بستہ سفر عموماً فرسٹ کلاس میں کبھ
ایر کنڈیشنڈ ڈبے میں۔ اور زیادہ دُور کا سفر
ہوائی جہاز پر۔ ماہانہ آمدنی کا اوسط کئی ہزار کا
—— یہ سب برکت اس کی کہ وہ "جراح" نہ
ماشاء اللہ "سرجن" ہیں۔!"

(صدق جدید۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۱)

" دفتر کھلا، اور بابو جی اگر بہت جلد
آ گئے، تو بھی اُس کے آدھے گھنٹے بعد تو بہر حال آ
اور کم سے کم ۱۰ منٹ تو اپنی ڈسک کے کاغذا
اور فائلوں کے ٹھیک ٹھاک کرنے میں صرف کئے
سست روی و سست رفتاری تو جیسے ان بابو
پر ختم ہے —— اور یہ بظاہر اب کام چالو
لیکن معاً چائے نوشی کے دَور اول کا وقت آ گ
اور ۲۵ منٹ اسی دَور نے لے لئے اور یہی رفتار کا
کی، آفس کے آخر وقت تک چلتی ہے۔ ہر تھوڑی دیر
کے بعد چائے کا نیا دَور چلتا ہے۔ کچھ دیر اور گذر ا
ہے کہ "لنچ آور" (کھانے کا گھنٹہ) آ جاتا ہے۔
خدا جانے انگریزی دَور میں عملہ والوں کی یہ بھوک
کہاں چلی گئی تھی۔ اس کی مدت کہنے کی تو آدھ گھنٹے
ہے۔ لیکن عملاً یہ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ لمبا ہوتا ہے
پھر ساتھیوں اور دوستوں کے پاس اُن کے ڈسک پر
جانا اور گپ زنی بھی تو ضروری ہے۔ اور گفتگو سیاس
سے لیکر جنسیات تک دنیا کے ہر پبلک اور نجی موضو
پر ہوتی ہے بجز اپنے کام کے۔ اور ذمہ داری کے

غ اُردو لکھنؤ

ے تفریح، لاء بابی پن بے فکرے پن کا سایہ شروع
آخر تک چھایا رہتا ہے ـــ !"

دفتر کے بند ہونے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہوتا
اور کل پلے ہم ہی بجا ہوتا ہے کہ بابو صاحب فائلوں
ٹھائیں اور گھر چلنے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں
دن بھر کی کاہلی اور سستی کا کفارہ اس وقت
بنی اور مستعدی سے کر دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی
امت کا مارا ضرورت مند اس وقت نازل ہو گیا
اس کے لئے یہ ترشا ترشایا جواب رکھا ہوا ہے
بس اب کل آئیے گا آج تو بہت دیر ہو گئی ہے
ضری کے رجسٹر بھی دفتروں میں رکھے رہتے ہیں
بن ان کی خانہ پُری صحت و دیانت کے ساتھ کرانا
ن کے بس کی بات ہے ـــ ؟ افسروں کا تجربہ ہے
ڈانٹ ڈپٹ اور سمجھاؤ، بجھاؤ کی ساری حکمتیں
کام اور بے اثر ثابت ہوئی ہیں۔ اور آخر میں
و ا انھیں کو تھک کر ہتھیار ڈال دینے پڑتے ہیں۔
یادہ ضابطہ برتئے تو خود افسر صاحب کی خیر نہیں۔
آخر بابو صاحب کی رسائی کسی نہ کسی ممبر اسمبلی یا
ممبر پارلیمنٹ تک ہے ہی۔ اور ہر ایک کوئی نہ کوئی
مضبوط ہی پایہ تھامے ہوئے ہے ـــ ! ـــ اور
ایک کھلا ہوا جواب۔ تو ہر بابو کی زبان پر رکھا ہی ہوا
ہے کہ صاحب کام ہو تو کیسے، افسروں کو کانفرنسوں
اور کمیٹیوں ہی سے کہاں چھٹی ملتی ہے ـــ"

(صدق جدید ۹ فروری ۱۹۶۸ء ص ۱)

ہل خدمت

نے اگلے وقتوں کے لوگوں کے جو خاکے کھینچے ہیں اُ شعرا
اگر مرقع کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ان خاکوں
میں اختصار ہے وہی اختصار ہی صدق کا طرۂ
امتیاز ہے۔ اثر لکھنوی، اشا لن، عطیہ فیضی،
مولوی مسعود علی ندوی ـ علی عباس حسینی، شفاء الملک
حکیم عبد اللطیف ـ مولانا اختر علی تلہری ـ شفاء الملک
حکیم خواجہ شمس الدین اور احمد غریب مرحوم وغیرہ
کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر ان کا
مقابلہ ان طویل ترین ماتمی مقالات سے کیا جائے
جو ان سب پر لکھے گئے ہیں تو یہ بہت بھاری
پڑیں گے دوسروں کے مضامین کے بارے میں
اس وقت کچھ عرض نہیں کرنا ہے مگر نمونتاً ان کی
زعفران کی ایک پڑیا کھولتا ہوں :ـــ

"مولوی مسعود علی ندوی مرحوم......
شہرت نے لڑکپن ہی سے قدم لینے شروع کر دیئے
تھے۔ آج طلبا کی اس ٹولی کے سردار، کل اسٹرائک
کے علمبردار، مولانا شبلی پر اپنے حسنِ خدمات سے
سکہ بٹھا دیا تھا۔ استاد کی وفات کے وقت
جب علمی جانشینی کی دستارِ فضیلت سید سلیمان
کے سر بندھی، تو دار المصنفین کے پریس اور سارے
کاروبار کی مینجری کا خلعت انھیں کے جسم پر راس
آیا اور مدتوں اسے خوب ہی انھوں نے نباہا۔
ٹینس کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے
تھے، شکار کے شوقین اور دوڑ دھوپ کے ہر کام
[illegible]

اور کبھی چھت

وقت

فی ۱۱ اور جفاکشی کے
شگفتہ مزاجی کے بادشاہ۔
دیا۔ روٹھوں کو جب چاہا
سبت سے پورا نام
"سالارِ مسعود غازی" ہم نیاز مندوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا ــــ مزاحاً مجھے "میاں" کہہ کر مخاطب کرتے رہے اور میں نے بھی جواب میں انھیں "اُستاد" کہنا شروع کر دیا تھا۔"

(صدق جدید، ۸ ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۲، کالم ۱)

"آپ بیتی" بہتوں نے لکھی ہیں اور کتنوں کی آپ نے پڑھی بھی ہوں گی مگر یہ البیلا انداز کا ہے کو نظر سے گذرا ہوگا :۔

عمر کا پچھتروَاں سَال

"...... پیدائش وسط مارچ ۱۸۹۲ء کی ہے۔ اس حساب سے آج عمر کا پچھتروَاں سال شروع ہوگیا ! ــــ بات کہنے میں پانچ سکنڈ میں ختم ہو گئی، حسرتوں کا دفتر جو اس کے عقب میں ہے۔ اس کی شرح و بیان پر اگر آئیے تو گھنٹوں اور دنوں، ہفتوں اور مہینوں کا کیا ذکر ہے۔ ساری عمر کی عمر کو ناکافی پائیے !

بچپن میں کسی کا سن ۴۰۔ ۵۰ کا سُنتا تو یقین کر لیتا کہ وہ پورے بڑھاپے کو پہونچ چکا جب اپنا سن چالیس کا ہوا تو دل نے کہا کہ یہ سب غلط ہے ابھی تو پورا جوان ہی ہوں۔ جب ۵۰ کا ہوا تو نفس نے ایک بار پھر تاویل کی کہ بڑھاپا دُور ہے۔ اب تو ادھیڑ سن کا ہوا ہوں۔ دس کی لمبی اور بہ ظاہر بہت بڑی مدّت بھی آنا اور گذر گئی۔ اور اب واقعہ کی تکذیب کی مزید سکت نہ رہی۔ پھر بھی دل (اور دل بہ معنی نفس) جوا کا جوان ہی رہا۔ کسی حرص و ہوس میں۔ غفلت م حُبِّ دنیا میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ ۶۵ کی منز آئی۔ اور پھر ۷۰ کی۔ یہاں تک کہ اب ۷۰ و پر شروع ہو گئی اور بس نہیں چلتا کہ عمر گریزاں کی تیز روی کو روک دیا جائے۔ ماہ و سال کے حساب کو آگ لگا دی جائے اور دنیا بھر کی جنتریو اور کلنڈروں کو پھاڑ کر پھینک دیا جائے ـــ !

بڑھاپا کیسا ! ہر آرزو تازہ ! ہر ہوس زندہ ! نفس کا ہر شعلہ بدستور دہکتا ہوا ـــ !

پیدائش ایک کھاتے پیتے اور دین دار گھرانے میں ہوئی۔ نعمتیں بے شمار حاصل ہوئیں۔ دنیا کے لطف ہر طرح کے دیکھے۔ بہار کے ساتھ خزاں بھی آئی اور گذرتی رہی۔ پڑھنے لکھنے کی ہوس گویا مادر زاد تھی۔ اسی کے طفیل نوجوانی میں فرنگی علوم کا نشہ سوار ہوا۔ اور بدمستی، الحاد، عقلیت اور لا ادریت کے دروازے تک کھینچ لائی۔ عمر عزیز کے دس سال اسی گمراہی اور برگشتگی کی نذر ہوگئے۔ اس کے بعد اسم ہادی کی تجلیات نے پھر زور باندھا اور جس طرح دبے پاؤں دیان کی روشنی رخصت ہو گئی تھی اسی طرح تشکک و انکار

تاریکیاں بھی کافور ہوئیں۔ اور پھر قسمت نے دستگیری کی مرشد تھانوی کے آستانہ تک پہنچا دیا۔ طبعی دنے اور المیے جیسے سب کو دیکھنے پڑتے ہیں، اپنے ہے میں آتے رہے۔ جیسے ماں باپ کو بھائی بہن کی۔ رچھوٹی اولاد کی مفارقت اور ہر زخم اپنی جگہ بھر رہی بڑا عقلی دینی اور ایمانی نوعیت کے صدمے جو ٹھانے پڑے۔ وہ ہوش ربا بھی تھے۔ کون جان سکتا تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا شرعی منصب جو تیرہ سو سال سے نسل بہ نسل مسلسل چلا آ رہا تھا۔ یوں خاموشی کے ساتھ اور دفعتۃً ختم ہو جائے گا۔ اور ادارہ خلافت رسول کی دنیائے اسلام یوں بھول جائے گی کہ جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں! ـــــ اور رہا ہندوستان کے اندر کا انقلاب در انقلاب تو کوئی اس کے تاثرات لفظ و عبارت ضبط و قید میں کیوں کر لے آئے ـــ!

ان آنکھوں سے اپنے سامنے اٹھتے ہوئے پیکر ایمان و صدق محمد علی اور حسرت موہانی کو دیکھا۔ شبلی کو دیکھا اقبال کو دیکھا، بہادر یار جنگ کو دیکھا۔ قساوتِ قلب کا یہ عالم رہا کہ قدر ان میں سے کسی کی بھی نہ کی، مرتبہ ان میں سے کسی کا نہ پہچانا ـــ جو کچھ بھی دیکھا۔ اس کے بعد شاعر کی ہدایت تو یہ تھی ؎

وقتِ طلوع دیکھا۔ وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

یہاں فکرِ آخرت مرتبہ "خوب" میں کیا ہوتی، معمولی اور درجہ اوسط کی بھی نصیب میں نہ آئی! ـــ اور حقوق کی ادائی کی توفیق نہ خالق کے مقابلے میں ہوئی نہ مخلوق کے، سے حق ادا نہ بڑوں کے ہوئے۔ نہ چھوٹوں کے، نہ شاگردوں کے، نہ پڑوسیوں کے، نہ اہل خدمت کے ـــ طاعتوں سے کورا، اور عبادتوں سے معرا جس طرح آغاز میں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انجام تک وہ نقشہ نہ بدلا!

لکھنؤ میں ایک شاعر تھے ـــ (۱) ... اور غزل سے بڑھ کر ہزل سے ذوق رکھنے والے ـــ لیکن قادر مطلق جس کی زبان سے جو چاہے سنوا دے۔ ان کا یہ شعر جب پہلی بار سننے میں آیا۔ تو جسم پر ایک سناٹا سا چھا گیا ؎

محشر میں جو شیخ آئے تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

اور دل نے کہا کہ یہ اور کسی کے حق میں ہو یا نہ ہو اس کم نصیب کے حق میں تو ضرور ہے ـــ اس برخود غلط کو تھوڑا بہت بھروسا اپنی خدمت قرآن کا ہے ـــ حالانکہ اس سارے دفتر میں اس کے سوا اور ہے ہی کیا، کہ کچھ اس کتاب سے نقل کر دیا۔ اور کچھ اس کتاب سے تو جب یہ عوامی زبان میں "شیخ کہلانے والے محشر میں لائے گئے ـــ تو وہاں قدرتاً پرسش اقوال کی نہیں، الفاظ کی نہیں، اعمال کی ہو گی ـــ یہاں ان کا سرمایہ تھا ہی کہاں۔ جو پیش ہوتا ـــ "اعمال ندارد" جو کچھ تھا۔ وہ تو صرف مال تجارت تھا ـــ کہ دوسروں کو کچھ سنا دیا ـــ کچھ بتا دیا۔ اس کاروبار سے اپنی اصلاح کیا ہوتی۔ اپنے قلب

---

۱ ماچس لکھنوی ...

میں تزکیہ و تصفیہ کیا ہوا۔ اپنی روح میں جلا کہاں سے پیدا ہوئی۔ "جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد"

عین اس وقت تفسیر کا مسودہ نئے ایڈیشن کے لئے صاف ہو رہا ہے۔ بلکہ کچھ حصہ کی کتابت بھی ہو چکی ہے اس جدید مسودہ کی تیاری میں ___ ترمیم و اضافہ میں حک و اصلاح میں، مہینوں کی نہیں، برسوں کی مدت لگی ہے ___ لیکن یقین کیجئے کہ جب بھی کسی پچھلے مسودہ پر نظر پڑ تی ہے ___ بس جی یہی پکار اُٹھتا ہے کہ اسے تو ردی کر دیجئے ___ یہ چھپنے کے قابل ہی نہیں! ___ بس ایسے تنگ خلائق کے کام کی لاج رکھنا تو بھی اسی کا کام ہو سکتا ہے جو اگر چاہے۔ تو مقہوروں کو مقبولیت سے نواز دے۔ اور ارادہ کرلے .... تو ابلیس تک کو پروانہ مغفرت سنا دے۔!

(صدق جدید ۱۷ مارچ ۱۹۶۷ء ص ۱، ۲)

صاحب "صدق" کے سفرنامے خاصے دلچسپ ہیں ان کی نگاہ سیاح کی اور جزئیات کے بیان میں داستان طرازی کا انداز عام ہے۔ "سرکاری تقریب" جس میں "عربی اسکالر" کی سند اعزاز انھیں پیش کی گئی تھی۔ اس کے بارے میں دیکھئے ان کا قلم کیا گل کھلاتا ہے:-

"...... دربار میں حاضری کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا ...... اللہ اللہ! کیا شان و آن، کیا جاہ و جلال ہے! زینت و جمال کا کمال اگر شاہی محل میں بھی نہ ہوگا۔ تو اور کہاں ہوگا ___ ؟

کمروں کی تعداد...... برآمدے، ہال، گیلریاں، صحن، چمن، نشاط خانے۔ کھیل گھر، تالاب، حوض، غسل خانے، باورچی خانے خدا معلوم کتنے، وسیع و بلند برآمدے ..... قدم قدم پر چوکی پہرے، باہری پھاٹک سے ایک دربانوں، محل داروں کی پلٹن، علم بردار، مسلح سپاہیوں، محافظوں کی فوج کی فوج۔ اور انھیں کے درمیان وہ رہ رہا ہے جو "جمہوریہ" ہند کا صدر ہے ..... قیام کل ڈیڑھ دن رہا۔ دلی کے سے "غدار" شہر میں یہ مدت ہی کیا ہوتی ......"

("صدق جدید" ۵ مئی ۱۹۶۷ء ص ۵، ۶)

"چند گھنٹے علی گڈھ میں" لکھتے ہیں،

"...... رقبۂ یونیورسٹی کی توسیع۔ شاندار عمارتوں کی افزونی، لائبریریوں کے اندر کتابوں کا اضافہ ان سب چیزوں کو نہ پوچھئے چلتے، چلتے تھک جائیے۔ اور عمارتوں کا سلسلہ ختم نہ ہو، یہ میڈیکل کالج وہ پالی ٹکنیک، یہ فلاں ہوسٹل وہ فلاں لیبوریٹری اور بڑی آزاد لائبریری کے علاوہ نسبتۃً "چھوٹی" اسلامک اسٹڈیز لائبریری کے حدود میں اگر پہونچ جائیے تو سامان اپنے انداز و شوق سے بھی کہیں بڑھ کر پائیے، آنکھیں پڑھتے پڑھتے تھک جائیں اور کسی ایک شعبہ کا ادنیٰ جزو بھی احاطہ میں نہ آنے پائے "علوم و فنون" جیسے کہ وہ ہیں۔ ان کی تحصیل اور ان میں تکمیل کے لئے بہترین اڈے "

(صدق جدید ۹ دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۵ کالم ۲)

"دو دن بھوپال میں" بھی اس سلسلے کی خاص
چیز ہے مگر اس میدان میں ان کا اصل کارنامہ
حج کا سفرنامہ ہے۔

صاحبِ صدق کے بڑے کارناموں میں ان کی
[illegible] تقاریر کا بھی شمار رہے گا "ملتی سجاد حسین اور
[illegible] "اکبر الہ آبادی" "مرزا رسوا اور
[illegible] اور اس طرح کے نہ جانے کتنے علمی
اور تہذیبی گوشے ہیں جو نشریاتِ ماجدی میں
[illegible] ہیں عام طور سے وہ علمی و ادبی جلسوں میں وہ
[illegible] کرتے ہیں لیکن عرصہ بعد ۳ ستمبر ۱۹۶۲ء طلبہ
ندوہ کی مجلس اصلاح کے جلسہ توسیع خطبات میں انہیں
تقریر کرنا ہی پڑی اس "تقریر بے تاثیر" کی جھلک ملاحظہ
ہو: ..... "صورتیں اتنی ثقہ، سیرتیں اتنی
پاکیزہ۔ لیکن جب زندہ دلی کا شگوفہ چھوڑنے پر آئیں
تو اچھے اچھے دنگی بازوں کو نیچا دکھا دیں ......
علی گڑھ اور ندوے کے درمیان نہ وہ بیگانگی ہے اور
نہ دوری جو فرض کر لی گئی ہے۔ راہیں الگ الگ ہوں۔
درمیانی منزلیں بھی الگ ہوں لیکن دونوں کی ایک ہی
منزلِ مقصود اور وہ کیا؟ یہی امت کی فلاح و بہبود!
بس فرق اتنا کہ ایک نے لائبریری اور لیبارٹری کو
اپنایا اور دوسرے نے اپنا دل محراب و منبر سے اٹکایا"
...... پیام دینا تو ندوے کا کام تھا۔ خوشی ہوئی کہ
آج اسے دوسرے کا پیام سننے کی توفیق ہو رہی ہے
گفت سے کچھ کم نعمت یہ شنودِ حق کی بھی نہیں!"

(صدق جدید ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۵ کالم ۱'۲)

صاحبِ صدق مشرقی تہذیب و تمدن کے
ترجمان اور پاسبان ہیں۔ ان کی تحریروں میں معاشرتی
جھلکیاں ہر رنگ میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ
نظر آتی ہیں۔ کس بے باکی کے ساتھ لکھتے ہیں:-

جگت گرو کے چرنوں پر

"نئے صدر جمہوریہ جب کرسی صدارت پر بیٹھنے سے
کچھ قبل جگت گرو شنکراچاریہ (سرنگیری) کی خدمت
میں اشیرباد لینے کے لئے حاضر ہوئے تو شنکراچاریہ جی
کے پیر بھی چھوئے — یہ موقع فخر و مباہات کا یقیناً
ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کس کے لئے؟ آیا خود شنکراچاریہ
جی کے لئے کہ ملک کے صدر کا سر ان کے آگے یوں جھکا؟
یا صدر محترم کے لئے جنہیں ملکش ہو کے بھگت گرو کے پیر
چھونے کی اجازت مل گئی۔!"

(صدق جدید ص ۳ کالم ۲۶ مئی ۱۹۶۷ء)

اہل سیاست کی بدعنوانیوں پر لکھتے لکھتے ان کا
بداخلاقی کے بارے میں "شرفائے شہر کی ڈھیلے بازی"
کا کیا نقشہ کھینچ دیا ہے:-

"راجدھانی یعنی دہلی کی میونسپل کارپوریشن
کے جلسہ منعقدہ ۱۷ اکتوبر (میں) دس منٹ تک
کانگریسی اور جن سنگھی ممبر ایک دوسرے سے گتھم گتھا۔
گھونسے اور مکے چلتے رہے۔
ایک دوسرے پر پیپر ویٹ پھینکے گئے۔ ایک
چپراسی زخمی کارپوریشن میں لیاڈگی کا بے مثال
منظر۔ ایک ممبر کی شرٹ چیتھڑے چیتھڑے۔

کاغذات اور میزیں ڈسک اور مائیکروفون
سب اُلٹ پلٹ دیے گئے۔

"آزادی" ملک میں آئی لیکن آزادی بن کر نہیں، یکسر "طوفان بے تمیزی" بن کر! ملک کا کون سا خطہ اور زندگی وطن کا کون سا شعبہ اب بھرپور نفرت انگیزیوں سے خالی ہے؟ کاش یہ آزادی نہ ملی ہوتی ملک سرا محکوم ہی رہتا۔ لیکن ہماری شرافت ہماری خودداری، ہماری تہذیب و شائستگی کو دھبا تو نہ لگتا اور ہمارے آباد شہر ایک دوسرے پر ڈھیلے بازی تو نہ سیکھی ہوتی۔!"

(صدق جدید ۳ نومبر ۱۹۶۷ء ص ۴ کالم ۱)

منظر کشی میں صاحب صدق کا قلم فوٹو کیمرے کے مترادف ہے۔ جس چیز کا بیان کرتے ہیں اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رقصاں ہوجاتا ہے۔

انسان کی بے بساطی کا نقشہ کھینچتے ہوئے مدھیہ مدھیہ پردیش اسمبلی میں کارروائی کے دوران معزز ممبروں پر شہد کی مکھیوں کے حملے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

(جائے کے لئے) "آگ جلی تو دھواں پیدا ہوا اور دھواں چھتے تک جا پہنچا، مکھیاں بھڑکیں اور بگڑیں اور غضبناک ہو کر حملہ آور ہو گئیں۔ ان کا حملہ! معاذ اللہ! گولی اور گولے سے بھی بڑھ کر بے پناہ!! ابھی چپراسی کو کاٹا، ابھی دربان کو جھنجھوڑا یہ آئیں، وہ آئیں، اور لیجئے اب حملہ خود وزارت مآبوں پر شروع ہو گیا۔ نہ چوکیداروں کی لاٹھیاں کام آئیں۔ نہ کانسٹبلوں کے ڈنڈے۔ نہ منصب و مرتبہ کا رعب سپر بن سکا...... وزیر با تدبیر اعزاز و وقار کا خیال کئے بغیر بے تحاشہ بھاگے کسی نے کمل کے اندر گھس کر جان بچائی۔ کسی نے غسل خانے کے اندر اپنے کو بند کر لیا۔ جب کہیں مصیبت سے جان بچی......"

(صدق جدید ۱۷ جون ۱۹۶۶ء ص ۱ کالم ۱)

ترجمہ صاحب صدق کا خاص میدان ہے وہ اس کے مرد میدان بھی ہیں اور سالار کارواں بھی۔ عربی، فارسی، انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے ان کے اردو تراجم ادبی اور علمی حلقوں میں گزشتہ نصف صدی سے داد و تحسین کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ صاحب صدق کا کارنامہ "تفسیر ماجدی" ہے۔ فلسفہ، مذہب اور دوسرے علوم و فنون کے بارے میں ان کے بیگرانقدر تراجم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی ایک سرسری جھلک شائد کافی ہو:۔

"خلائی جہاز" کے سلسلے میں اس حدیث نبوی کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:۔

...... ویبعث اللہ یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون فیتبرون لقد قتلنا من فی الارض فلنقتل من فی السماء فیرمون الی السماء	اسی حال میں اللہ قوم یاجوج کو اٹھا کھڑا کرے گا اور یہ اوپر بلندی سے پھیلتے جھپکتے چڑھ دوڑیں گے (دنیا میں قتل و غارت کے بعد) پھر کہیں گے کہ زمین والوں کو تو ہم ختم کر چکے۔ اب آسمان والوں کو ختم کریں۔ پھر آسمان کی طرف اپنا تیر چھوڑیں گے۔
(جمع الفوائد میں یہ روایت صحیح مسلم ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالے سے نقل ہوئی ہے)	

سب باتوں کو چھوڑیئے سردست خیال اس جزئیے پر جایئے۔
ں جدید ترین و بے پناہ حربے پر اطلاق "تیر"
س خوبی و صفائی کے ساتھ نگاہ کشتنی لے کر دیا ہے۔

(صدقِ جدید ۱۰ر فروری ۱۹۶۲ء ص ا کالم ۲)

صاحب صدق کے مختصر مگر جامع اور پر معنی تبصرے
ن کے ادب اور صحافت کے باب میں ایک خاص اہمیت
رکھتے ہیں "تین مسافر" مصنفہ ڈاکٹر قطب النسا ہاشمی
کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"...... ساحل و سمندر کتاب میں اصل
موضوع سے ہٹ کر غیر متعلق باتیں بہت سی آگئی ہیں اور
مولانا شبلی کے باب میں تو ہر ایرے غیرے نتھو خیرے
کے قول کو قابلِ اعتماد اور کسی حد تک مستند سمجھ لیا گیا ہے
واقعات اور زبان دونوں میں اصلاح و نظرِ ثانی کی
گنجائش رہ گئی ہے۔ واقعات میں مثلاً یہ کہ آرنلڈ انگریزی
کے پروفیسر تھے۔ (انگریزی کے نہیں فلسفہ کے تھے) یا یہ کہ
ان کی کتاب پریچنگ آف اسلام "عربی کی تحقیق"
میں ہے یا یہ کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی تکمیل ۱۴
جلدوں میں ہوئی ہے ، یا یہ کہ سرسید کے ایک ہم عمر مفکر
مولوی وحیدالدین سلیم بھی تھے۔ یا یہ کہ مسلم لیڈروں
میں محمد علی، ابوالکلام کی طرح کوئی صاحب "مولانا"
انصاری بھی تھے اور زبان میں اسی طرح کے الفاظ و
ترکیبیں "علماؤں" "واقعات کی کھوج"
ذہین، تبسم وغیرہ "

(صدقِ جدید ۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۶ کالم ۱)

صاحب صدق کی "سچی باتیں" ہوں "شذرات"
یا دیگر کالم ان سب کا ایک بہت ہی واضح موقف اور
بہت نمایاں پالیسی ہے اور وہ ہے مشرقی اقدار و
روایات کی ترجمانی ، ان کی نظریں ہمیشہ تلخ تر حقائق
پر رہتی ہیں اسی لئے ان کی صحافتی تحریروں میں
ادبیت کے ساتھ ساتھ اصلاحی طنز کی خار خشگانی
نمایاں رہتی ہے جس سے نہ اپنوں کو پناہ ملتی ہیں اور
نہ پرایوں کی ۔

"سچ" اور پھر "صدق" کا ایک دلچسپ
پہلو صاحبِ صدق کے ادبی معرکے ہیں۔ نیاز
فتحپوری، جوش ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی سے
لے کر حیات اللہ انصاری تک۔ ان کے یہ معرکے
ہماری ادبی، تہذیبی، مذہبی، ثقافتی اور
صحافتی زندگی کا ایک بہت ہی باغ و بہار پہلو ہیں
جب بھی اُردو ادب کے ادبی معرکوں کی تاریخ مرتب
کی جائے گی تو یقین ہے کہ اس کا یہ باب، اس اعتبار سے
ضرور عجیب و غریب ہوگا کہ معرکے کوئی بھی ہوا مگر
آخر میں میدان ان ہی کے سر رہا۔ اس کی شاید وجہ
یہ ہے کہ صدق میں ادبی معرکے کی سبح دھج اودھ پنچ
سے کم نہیں ہوتی اودھ پنچ کے یہاں توازن کا اہتمام
ذرا کم ہی نظر آتا ہے مگر یہ اس کے تمام فنی آداب
برتتے ہیں اور کبھی جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹتے ۔

اودھ پنچ کا پورا توپ خانہ میدان سر کرنے کے لئے
اُتر پڑتا تھا۔ مگر صاحبِ صدق خود توپ خانے کی
کمان ایک ماہر جنرل کی طرح سنبھال لیتے ہیں اور
ضربیں مارنے میں عجلت سے کام لینے کے بجائے موقع

کی تاک میں رہتے ہیں۔ ان کا حملہ ہمیشہ غیر متوقع اور فوری ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ حریف کو زک دینے کے لیے ان کی محض ایک پھبتی کافی ہو جاتی ہے اور پسپا ہونے والے کا بیان صفائی، چینیں اور چیاں ہفتوں بلکہ مہینوں جاری رہتی ہے مگر پھر بھی وہ مولوی صاحب والی بات نہیں آپاتی۔

آخیر میں اس اہم پہلو کی جانب اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اُردو نثر اور اُردو طنزیہ ادب میں صاحب صدق کی مستقل اہمیت اور حیثیت ہمیشہ اس لئے رہے گی کہ ان کی تحریریں ادبی ہوں یا صحافتی، طنز و ادب کی دلاویز آمیزش اور فنی جوہروں کے باعث وقتی یا ہنگامی ہونے کے باوجود مستقل اور دائمی حیثیت رکھتی ہیں۔ ظفر علی خاں کو شاعری میں جو ملکہ اور درجہ حاصل ہے کہ ہنگامی اور لمحاتی موضوعات کو انھوں نے ابدیت بخش دی، وہی شان صاحب صدق کی صحافتی اور ادبی نثری تحریروں میں ہے ان کا قلم لمحے اور لمحے کی سچائی کو ایسا اسیر کر لیتا ہے کہ اس کو نہ وقت کی گرد ماند کر سکتی ہے اور نہ ہنگامہ کے گذرنے سے کوئی ہنگامہ کی شدت اور تاثیر متاثر ہوتی ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس نے ان کی تحریروں کو آبِ حیات بخشی ہے اور کلاسیکی کا بلند درجہ عطا کیا ہے۔

اُردو ادب کی طرح اُردو صحافت اور طنز و ظرافت کے بقائے دوام کے دربار میں اسی لئے وہ ہمیشہ صفِ اول میں نظر آئیں گے اور وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں سے دلچسپی، مقبولیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔ مشرقی تہذیب و تمدن، ادب و صحافت، مذہب و ثقافت کا کوئی تذکرہ ان کے بغیر نہ مکمل سمجھا جائے گا اور نہ مستند ۔۔۔ ان کی تحریروں کی روشنی میں یہ ایک حقیقت ہے۔ ان کے طنز کی طرح تلخ، مگر حقیقت کی یہ تلخی بڑی خوشگوار، عزیز اور گوارا ہے۔

ماہر القادری مدیر فاران کراچی

معیارِ ادب

مولانا عبدالماجد دریابادی کیا ہیں اور کیا نہیں
اس پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تو یہ مضمون یقیناً
ایک کتاب بن جائے گا، اور میں مضمون لکھ رہا ہوں،
اس لیے ایجاز، اختصار، اجمال اور کنایات و اشارات
سے کام لیا جائے گا۔

علم و ادب میں مولانا موصوف کی متعدد حیثیتیں
ہیں۔ وہ فلسفی ہیں، معلمِ اخلاق ہیں، مترجم ہیں، مصنف
ہیں، تنقید نگار ہیں، مفسر اور مبلغ ہیں، اور اپنے دور
کے سب سے بڑے طناز ہیں۔

مولانا دریابادی پر دہریت اور تشکیک کا دور
بھی گزرا ہے اس دور میں اُن کا قلم فلسفیانہ افکار کا
ترجمان رہا ہے۔ فلسفے کے وہ مترجم نہیں شارح بھی ہیں۔
راقم الحروف نے اپنے لڑکپن میں اُن کا ایک مضمون
"فلسفہ توبہ" پڑھا تھا، جس کا نقش آج تک دھندلا
بھی نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ شرح و ترجمہ کے ساتھ مولانا
موصوف نے خود اپنے ذاتی فلسفیانہ افکار بھی اردو ادب
کو دیے ہیں۔

فلسفہ کی انگریزی مصطلحات کا مولانا دریابادی
نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس سے اُن کی خوش مذاقی کا پتہ
چلتا ہے۔ مثلاً

نفس اجتماعی	Collective Mind
تہیج	Impulse
مہیج	Stimulus
اثر آفرینی	Suggestion
اثر پذیری	Suggestibility
فعل ارادی	Voluntary action
نخاعِ مستطیل	Medulla oblongata

انگریزی سے ترجمہ کا ایک نمونہ

"نپولین کے جنرلوں اور سرداروں کی اُس کے
سامنے وہی حیثیت تھی جو آفتاب کے گرد
سیاروں کی ہوتی ہے۔ بجز سیناٹ دیووٹ اور
ردمولٹ کے اس کے افسرانِ فوج میں ایک متنفس بھی
اس قابل نہ تھا کہ بذاتِ خود کسی فوج کی کمان
کر سکتا، وہ شہنشاہ کی فرمانبرداری کے اس قدر
خوگر ہو گئے تھے کہ خود اعتمادی اور قیادت کی

یہ جو صلاحیت ان سے سلب ہو گئی تھی، وہ سپاہی بے شک اعلیٰ درجہ کے تھے مگر لیڈر نہ تھے۔

نپولین درحقیقت خود ہی اپنا وزیرِ خارجہ بھی تھا خود ہی اپنے مالیہ کا نگراں تھا اور خود ہی فرانس کی عدالتوں کا بھی مہتمم تھا..... شمپینی اور مورٹ تو اس کے ہاتھ میں آلات بیجان تھے۔"

(فلسفۂ اجتماع)

یہ مولانا دریابادی کے دَورِ جوانی کا ترجمہ ہے، اس کی سلاست کا یہ عالم ہے جیسے یہ عبارت مولنا نے اُردو میں لکھی ہے۔

جب مولنا مولانا موصوف کے ترجمہ کا ذکر چھڑ گیا ہے تو لگے ہاتھوں یہ بھی عرض کردوں کہ راقم الحروف نے وہ بھی بحث پڑھی ہے۔ جس میں مولانا دریابادی کے (PAIN AND PLEASURE) کے ترجمہ "حظ و کرب" پر مولانا ابوالکلام آزاد نے گرفت فرمائی تھی کہ ان لفظوں کا صحیح اور جامع ترجمہ —— لذت و الم —— ہے اگرچہ یہ علمی معرکہ مولانا آزاد کے ہاتھ رہا مگر دو بڑے اہلِ قلم کی بحث ونزاع کی بدولت زبان و لغت کے نکات کاغذ پر آ گئے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے رئیس الاحرار مولنا محمد علی اور حکیم الامت حضرت مولنا اشرف علی تھانوی کے سوانح حیات شخصی مشاہدے اور ذاتی تجربے کو جس مؤثر و دل نشین انداز میں پیش کیا ہے وہ "سیرت نگاری" کا شاہکار ہے، ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بزرگ ہمارے سامنے چل پھر رہے ہیں۔ انتہائی عقیدت کے باوجود سچ کو "بیجا مبالغہ" نہیں بننے دیا۔ یہ تجربات اور نقوش و تاثرات اخلاق کے گلدستے ہی نہیں زبان و ادب کے مرقعے بھی ہیں۔

مولانا دریابادی نے بہت سی کتابوں پر مقدمے، دیباچے اور "پیشِ لفظ" لکھے ہیں، یہ ادبی اعتبار سے اس قابل ہیں کہ ان تحریروں کو کتابی صورت میں یکجا کیا جائے۔ خاص طور سے مثنوی زہرِ عشق پر مولنا موصوف کا مقدمہ اسقدر دلچسپ ہے کہ بار بار پڑھنے کے بعد بھی جی سیر نہیں ہوتا۔ یہ مثنوی اخلاقی اعتبار سے ہوا و ہوس کی عکاس و ترجمان ہے۔ مگر مولانا موصوف کی خیر پسندی اور صفائے باطن نے قصہ کے ہیرو اور ہیروئن کی ہوس کاری سے بھی اخلاق اور غیرت و حیا کے نکتے پیدا کئے ہیں! اور کاغذ پر لفظوں کے موتی بکھیر دیے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی بیٹی کی شادی پر جو خطبہ دیا تھا۔ وہ نہ صرف اُردو ادب بلکہ عالمی لٹریچر میں اپنی آپ ہی مثال ہے، شباب کا زمانہ کس قدر عارضی ملکہ مشغلۂ مستعجل ہے —— صنفی تعلقات کی لذتیں بھی آنی ہیں۔ جوانی چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ جوان بیٹی اور عفت پروردہ دوشیزہ کو یہ باتیں سمجھانی کسقدر دشوار نازک، اور خطرناک کام ہے مگر مولانا دریابادی کا راہوار خامہ آبگینوں اور دبابوں سے جس احتیاط سے گزرا ہے اُسے کرامت نہ کہیے تو اور کیا کہیے، یہ خطبہ زبان و ادب کا دستور و اخلاق کا منشور ہے۔

صاحب طرز ادیب | ہفتہ وار "سچ" اور

صدق جدید" میں مولانا موصوف کے شذرات
مبالغہ" ادب پارے" ہیں۔ مغربی تمدن و تہذیب
طنز کرتے ہیں وہ "نثر کے اکبرالہ آبادی" ہیں!
انگریزی اخباروں، رسالوں اور کتابوں سے
خذ و اقتباس خود اپنی جگہ علمی ریاضت اور ایک طرح
ریسرچ ہے۔ ان اقتباسات سے پڑھنے والوں کی
معلومات میں کسقدر اضافہ ہوتا ہے۔ پھر ان اقتباسات
سے مولانا موصوف نے جو نتائج نکالے ہیں اور جس
چھوتے انداز میں ان پر طنز کی ہے وہ پند و نصیحت
اور تبلیغِ اخلاق میں "کیمیائے سعادت" "گلستانِ
سعدی" اور "اخلاقِ جلالی" کا عکسِ جمیل ہے۔
قاضی عبدالغفار۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اور
رشید احمد صدیقی کی طنز نگاری مشہور بھی ہے اور
مقبول بھی ہے۔ مگر مولانا دریابادی کی طنز کے مختلف
روپ ہیں وہ کہیں نشتر ہے، کہیں چٹکی ہے، کہیں طمانچہ
ہے اور کہیں گدگدی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے
کہ مولانا موصوف کی طنز نگاری، دین و اخلاق کی
دعوت ہے۔ وہ صاحبِ پیغام اور صاحبِ دعوت
طنز نگار ہیں۔

مولانا دریابادی نے طنز و تنقید میں جس جرأت
ایمانداری، حق گوئی اور عزیمت کا مظاہرہ کیا ہے اُس
نے اُن کے کردار کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ع
یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

مولانا دریابادی کی زبان معیاری زبان ہوتی ہے
جسے سند میں پیش کیا جا سکتا ہے، صحت، زبان اُن کی تحریر
کی ممتاز خصوصیت ہے۔ نثر میں شعروں کا برمحل استعمال
یہ اُن کی خوش ذوقی کا ثبوت ہے، اُن کی تحریروں میں
مصرعے اور اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے
شاعر نے اسی موقعہ کے لئے یہ شعر کہا تھا۔

مولنٰا عبدالماجد دریابادی صاحب طرز ادیب
ہیں اُن کی تحریریں انشاء پردازی سکھاتی ہیں۔
"ادبِ عالیہ" کی تعریف اُن کی تحریروں پر صادق آتی
ہے زبان، ادب اور اخلاق۔ غرض ہر اعتبار سے وہ
مصلح انشاء پرداز اور معیاری ادیب ہیں۔

اس دور کے دو انشاء پرداز ایسے ہیں جن کی کتابیں
اور مضامین پڑھنے کے لئے راقم الحروف کھانا اور سونا
چھوڑ سکتا ہے ـــــ اور یہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔

مولانا دریابادی نے اپنی تحریر و نگارش میں کہیں
کہیں اجتہاد بھی کیا ہے۔ مثلاً
غرض تعلقات اب ہر جہت سے بالکل عزیزانہ
ہوتے چلے گئے۔ (حکیم الامت صفحہ ۲۹۹)
"دوستانہ" تو بولتے اور لکھتے ہیں مگر "عزیزانہ"
کا اردو میں رواج نہیں ہے، یہ مولانا کا اجتہاد ہے۔
"اس پر بھی واقعہ اتنا سخت تھا کہ قلب میں
ایک دھچکا سا لگا" (حکیم الامت صفحہ ۲۰۶)
"قلب کو دھچکا سا لگا" کی جگہ "قلب میں دھچکا سا
لگا" یہ مولانا موصوف کا تصرف ہے، ایسے مقامات جو
"محلِ غور" ہوتے ہیں اُن سے کوئی بڑے سے بڑا شاعر

اور ادیب بھی نہیں بچ سکا۔ "کمال" جہاں سہو ونقص کا سرے سے امکان ہی نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ سبحان اللہ عما یصفون۔

بہت پہلے اور بہت بعد

مولانا دریابادی کی تصنیف فلسفہ اجتماع ۱۹۱۵ء میں جیسی تھی اُس کا ایک اقتباس :-

"دنیا کا کاروبار ارسطو یا مل کے وضع کردہ اصول منطق پر نہیں بلکہ طبعی اور خودرو احساسات وجذبات کی رو پر چل رہا ہے۔ منطق کے قوانین سے واقفیت محدود ہے، مدارس اور کالجوں کی چار دیواری کے اندر اور اُن پر عمل تو شاید تمام دنیا میں خالص حکیمانہ مذاق کے چند ہی افراد کرتے ہوں ورنہ کائنات کی مشینری جس کمالی سے چل رہی ہے وہ جذبات کی قوت ہے۔ جذبات کی جدھر رفتار ہوتی ہے، اسی طرف انسان جاتا ہے، جذبات کا جو تقاضا ہوتا ہے، اسی کے مطابق انسان سے افعال و اعمال صادر ہوتے ہیں"۔

"حکیم الامت" میں مولانا لکھتے ہیں :-

"جی میں آیا مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگائیے عقل نے کچھ اور ہی سمجھایا، روتی ہوئی آنکھوں اور روتے ہوئے دل کے ساتھ سلام رخصت عرض کیا اور اپنے کو خانقاہ تک پہونچایا۔ خانقاہ۔ آہ! وہ روح بے جسد، وہ مکان بے مکین، وہ انگشتری بے نگین، مدرسہ چل رہا تھا۔ لیکن سہ دری خاموش، ویران، بجھی ہوئی شمع، ایک ہو کا عالم سناٹے کا مقام، نہ دری نہ جاجم، نہ تکیہ نہ مسند۔۔۔"

یہ دونوں اقتباسات اس لئے درج کئے ہیں کہ قارئین اس کا اندازہ کر سکیں کہ مولانا کی ابتدائی تحریروں میں بھی مشاقی کا رنگ جھلکتا ہے جو کہ تابناک ادبی مستقبل کا نقیب ہے اور پچاس سال کے بعد اُن کا طرزِ نگارش کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ ترقی کی یہ معراج ہر انشا پرداز کو کہاں میسر آتی ہے۔

اعتراف

راقم الحروف کو مولانا موصوف سے خط وکتابت کا شرف بھی حاصل رہا ہے، کراچی جب وہ تشریف لائے تھے تو ایک دفعہ (عصرانہ) میں اُن سے ملاقات بھی ہوئی۔ صدق جدید میں کئی بار راقم ناچیز کا مولانا موصوف نے ذکر بھی فرمایا۔ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ بعض مسائل میں قلمی بحث وتمحیص اور تناتنی کی نوبت بھی آگئی۔ انسانوں کے باہمی روابط وتعلقات میں مد و جزر آتے رہتے ہیں۔ کس نے کیا کہا؟ اور کیوں کہا! اس تفصیل کا یہاں محل نہیں ہے۔

میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ کی کتابوں اور تحریروں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان کی خوردہ چینی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ اُن کو زیادہ سے زیادہ عمر عطا فرمائے، میں اُن سے دعائے خیر کا طالب ہوں۔

الدین حسن علوی کاکوروی۔ ایم اے، بی ٹی

مولانا عبدالماجد — بحیثیت ادیب و ناقد

بہ عالیہ نا ذات اپنے ملک کی تاریخ ادب میں ایک زندہ نام و مقام حاصل کرتا ہے اور جریدۂ عالم میں نقش دوام چھوڑ جاتا ہے۔ اس کی تخلیقات نہ صرف حسن خیال اور حسن ادا کی حامل ہوتی ہیں بلکہ اس کی روح کی پاکی اس کی ذات کے آرائش اور نکھار کی بھی آئینہ دار ہوتی ہیں وہ اپنی غیر معمولی قوت مشاہدہ، ذوق جمال اور حسن کردار کے باعث اپنے عصری رجحانات کو دیکھتا رہتا ہے۔ فکر و تفکر سے واقعات گزراں سے سبق حاصل کرتا ہے اور اپنے تاثرات قلبی اور احساسات دلی کو شیریں الفاظ دلکش انداز سے اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی تحریر کی لذت سے قارئین کے دلی جذبات کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔ اردو کے اربعہ عناصر یعنی آزاد، شبلی، حالی اور سرسید نے اردو کو اخلاقی، معاشرتی اور تاریخی ادب عطا کیا، اس کے بعد صاحب طرز ادیبوں میں تین حضرات نمایاں ہوئے جن میں نیاز، آزاد، اور مولانا عبدالماجد سرفہرست ہیں آزاد نے فن خطابت کا حق ادا کر دیا۔ نیاز کے پر شعریت اور ادب لطیف میں فارسیت کی چاشنی گھول دی۔ مولانا ماجد نے تراجم، تنقید، انشاء، سوانح، تفسیر میں اپنے مؤثر قلم سے وہ تصویریں بنا ڈالیں کہ مانی و بہزاد کے نقوش ماند پڑ گئے جس طرح ایک چابک دست مصور کی ایک جنبش قلم ابروئے کشیدہ اور خال کے نکتے میں ہزار معانی پیدا کر دیتی ہے اسی طرح مولانا ماجد کا قلم چھوٹے چھوٹے جملوں، مختصر فقروں میں ہمارے روبرو ایک دنیائے خیال و تخیل پیش کر دیتا ہے۔ ہم ان کے طرز ادا کی دلکشی و انداز بیان کی رنگینی میں کھو جاتے ہیں۔

مولانا ماجد کی تصانیف اپنی جگہ علم و ادب کا وہ گنجینہ ہیں کہ جن سے پوری ایک نسل بہرہ یاب ہوتی ہے ادب کی غالباً کوئی صنف ایسی نہیں کہ جسے انھوں نے نہ اپنایا ہو اور جس موضوع پہ قلم اٹھایا اسے اس طرح سنوار کر نکھار کر نک سک سے درست کر کے پیش کیا ہے کہ ان کے بے پناہ سلیقہ بیان و زبان پر عقل حیران اور قوت ادراک و تنقید دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

مولانا ماجد صاحب نے تقریباً پچاس ساٹھ سال تک اردو ادب کی ان تھک خدمت کی، پڑھنا لکھنا ان کی زندگی کا مقصد رہا۔ اس دنیا کو اگر انھوں نے دیدہ عبرت نگاہ بخشنے کی کوشش کی تو دوسری طرف حیاتِ اُخروی کے لئے تفسیر قرآن کریم "سوانح عمری" حکیم الامت" اور سیرت نبوی پر مضامین لکھ کر خود اپنی ذات کو منجلی کیا بلکہ ہزاروں کے قلوب سے بے یقینی اور بے مقصدی کے زنگ کو دور کر کے ان پر اس طرح صیقل کر دی کہ کردار چمک اُٹھے، اور چہرے نورِ ایمان سے فروزاں ہو گئے۔ ان کی تحریروں میں عصر حاضر کی ہنگامہ خیز، حشر بپا اور مضطرب زندگی کا پورا نقشہ ملتا ہے۔ اس پورے دور میں اُردو زبان و بیان کا ارتقا منزل بہ منزل کہاں سے کہاں پہونچ گیا ایک صدی بیشتر تک اُردو کا اسلوب بیان، فارسی اور عربی طرزِ نگارش سے متاثر رہا۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم اور مغربی علوم نے خاکِ ہند پر قدم رکھا۔ اس نے فانوسِ خیال میں نئی شمعیں فروزاں کیں، نئی روشنی نے بہتوں کو ظلمات میں لا ڈالا اور بہتوں کو نئی روشِ فکر دکھائی۔ انگریزی ادب کا نہایت گہرا اثر ہندوستان کی ثقافتی، معاشرتی، عمرانی اور ادبی زندگی پر پڑا۔ اگر ایک طرف انگریزی اور یورپین مدبرین نے ہماری سیاسی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا شعور عطا کیا تو دوسری طرف انگریزی ادب کے زورِ بیان نے ہمارے ادیبوں کو اظہارِ خیال کا ایک باثر، اور زوردار آلۂ اظہار بھی دیا۔ انگریزی کے بلند پایہ مصنفین کی طرز تحریر، انداز بیان نے نہ صرف ہمیں نئے اسلوب سے آشنا کیا بلکہ انکے بلند خیالات، ارفع تخیلات، فاضلانہ قوت استدلال نے وہ زورِ بیان عطا کیا کہ جس سے ہماری زبان میں مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال آسان ہو گیا۔ وہ معاشی مسائل ہوں کہ سیاسی مسائل سب پر اُردو میں کتابیں تصنیف ہوئیں اور یہ زبان صرف محدود مجلسی زبان نہیں رہی کہ جس میں صرف معاملات، حسن و عشق کی رنگین اور نمکین بیانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حالی، شبلی، آزاد اور سرسید نے تصنع و تکلف، عبارت آرائی، مسجع اور مقفیٰ عبارت کو ترک کر دیا۔ اصلاح اخلاق اور معاشرت کے لئے سادہ اور سلیس زبان میں دلنشین انداز میں وعظ و حکمت کے دفتر کھولے گئے۔ ان بزرگوں کی تحریروں نے سادگی جوش اور خلوص بیان کا سبق دیا۔ عبارت آرائی، رنگین بیانی، الفاظ کی جادوگری کا طلسم ٹوٹا۔ ایرانی تکلف تصنع کی جگہ عبارت میں سلاست اور روانی کی طرف توجہ کی گئی۔ اس دور کے ادیب اور انشا پرداز انگریزی ادب سے اس حد تک متاثر نظر آتے ہیں کہ ان کے جملوں کی ساخت اور بناوٹ، بندش کی چستی، لفظوں کی ہم آہنگی، سب انگریزی ادیبوں کا نقشِ ثانی معلوم ہوتی ہے۔ حیدرآباد میں دارالترجمہ قائم ہوا جس میں مختلف علوم اور سائنس کی اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ مستند شعبوں کے لئے مستند کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ جامعہ عثمانیہ میں ذریعۂ تعلیم اُردو رکھا گیا۔ انجمن ترقی اُردو قائم ہوئی اور عبدالحق صاحب کی بے پناہ لگن نے جو اُن کو اُردو کے ساتھ تھی، اُردو کے ایسے ایسے ادیب ڈھونڈھ نکالے جنھوں نے اُردو کو علمی ذخیرہ سے مالامال کر دیا۔ تاریخ تمدن کا اُردو ترجمہ

صد علی صاحب کاکوروی نے کیا جس کا آخری حصہ
عبدالماجد نے پورا کیا، اور یہ ترجمہ اس قدر
نہ اور سلیس ہے کہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ ترجمہ
طبع زاد تحریر۔ مولانا نے فلسفہ پر بھی انگریزی کتابوں
جمے انجمن ترقی اُردو کی فرمائش پر کیے۔ ایک انگریزی
ب سائکالوجی آف لیڈرشپ
ف کی۔ موجودہ کارنامہ تفسیر قرآن انگریزی میں بھی
مولانا کو نہ صرف اُردو پر بلکہ انگریزی پر بھی عبور ہے اور
صدہا مضامین عرصہ تک رسالہ ماڈرن ریویو میں
چھپتے رہے جو کلکتہ سے نکلتا ہے۔

مولانا عبدالماجد کے تبحر علمی کا جائزہ لینے سے
ترملک نے اس سیاسی اور عمرانی پس منظر کو بھی دیکھنا
دری ہے کہ جس میں ان کی شخصیت کی تخلیق ہوئی۔
یہ کیسے دانشوروں کے ساتھ ان کا وقت گذرا اور انھوں
کس طرح کسب و اکتساب علم کیا۔ ان کی تمام تحریروں سے
یہ چلتا ہے کہ وہ علم کی پیاس میں ہمیشہ تشنہ دہاں رہے
ور زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے اور اپنا انداز بیان
وب سے خوب تر بنانے میں مشغول رہے۔ اٹھارھویں
صدی کا آخری ربع اور انیسویں صدی کی صدی ہندوستان
کا نشاۃ الثانیہ کہی جا سکتی ہیں۔ روح ایشیا اپنے برسوں
اور قرنوں کے دور غلامی و محکومی سے انگڑائی لے کر بیدار
ہو رہی تھی۔ خود اعتمادی کا جذبہ جاگ اُٹھا تھا۔ طوفان
مغرب نے احساس اور ضمیر ایشیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا،
مغرب کی مادیت کا طوفان اٹھا اور اس نے ہندوستان
کی روحانیت کو اپنے نرغے میں لینا چاہا لیکن ہر "شر"

"خیر" کا نقیب ہوتا ہے۔ آزادئ وطن کا نعرہ بلند ہوا
اس کی کڑک نے دلوں میں ولولوں کی بجلیاں دوڑا دیں۔
جذبہ حب قومی نے دلوں میں آگ لگا دی اس بے چارگی
اور بے بسی، غلامی اور پسپی کے دور میں بھی شعلہ بیان
مقرر، پُراثر ادیب، بلند پایہ شاعر اور بیدار مغز
سیاستداں پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے بلند خیالات
سے ایک پوری اُبھرتی ہوئی قوم کے ذہنوں کی تربیت
کی۔ اگر ایک طرف مولانا محمد علی، ہمدرد اور کامریڈ کے
کالموں میں، جذبات سے بھری زوردار الفاظ میں ملبوس
تقریروں سے بے حس دلوں کی دنیا ٹھوکر لگا لگا کر بیدار
کر رہے تھے، تو دوسری طرف مولانا آزاد الہلال اور
البلاغ میں بے مثال خطیب کی آن دکھا رہے تھے۔
اس غلامی کے دور میں بھی "ذوقِ عمل" "حب انسانیت"
جذبۂ یقین روح اور روحانیت کی رفعت، آربندو
گھوش، وویکانند، ٹیگور، کے پیکر میں مجسم ہو کر عوام
کی ذہنی اور جذباتی تربیت کر کے ان میں ایک خاموش
انقلاب لانے میں برسرِ پیکار تھی۔ اس جہادِ آزادی میں
مسلمان بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔
دیوبند کے مولانا محمود الحسن صاحب عبداللہ سندھی اور
ہندوستان کی سیاسی آزادی کے ہاتھوں نے قید جلاوطنی
اور قید بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے اس
ماحول میں مولانا
ذہنی
ماجد نے آنکھیں کھولیں۔ مولانا شبلی کی تربت نے
تحقیق و تدقیق کی صلاحیت عطا کی۔ اکبر الہ آبادی کی
بظاہر مزاحیہ لیکن عقل کو اپیل کرنے والی شاعری

نے الحاد کی ظلمت سے نکال کر "نورِ ایمان" کی روشن تابناک اور حرارت زا اور حیات آفریں دنیا میں در آنے کی توفیق عطا کی، فلسفے نے جو اوہام و شکوک پیدا کر دیے تھے۔ فکر میں جو گتھیاں اور گرہیں ڈال دی تھیں ان کو منطقی ہی نے سلجھانے میں مدد دی۔ باتوں ہی باتوں میں قرآن شریف کی عظمت کا احساس دلانا اور اس کے مطالعہ کی دعوت دی جس صاف ذہن اور صاف دماغ سے اس کا مطالعہ کیا تو حق کی حقانیت کا جلوۂ زیبا نے فکر و خیال کی قندیل کو روشن کر دیا اور وہ ان کے ہمنوا ہو گئے کہ ؎

تمھاری مجنوں سے پیرے شبہہ خدا کی نسبت کم نہ ہوتے
مگر ہو گیا یہ یقین ہم کو خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے

یا کون ذی ہوش ہوگا جو اس شعر کے منطقی استدلال سے انکار کر سکے کہ ؎

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

مسٹر عبدالماجد، مولوی عبدالماجد ہوتے۔ سوٹ بوٹ نے جبہ و عمامہ کو جگہ دی۔ عقل کی نارسائی اور خام خیالی رخصت ہوئی اور یقین کی شمعیں دل میں جل اٹھیں اور یہ دور صلاح و صلاحیت ہی ایک حیاتِ نو کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے حلقہ عقیدت بیعت میں اور زندگی تصوف کے رنگ میں ڈوب کر نکھرتی اور سنورتی ہے۔ اسلامیات پر ایک دفتر کا دفتر ہے کہ جس کا اندازہ لگانا، اور اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو پہنچنا اس محدود مضمون میں نہایت مشکل ہے فلسفہ کے مطالعہ نے منطقی استدلال میں کمال عطا کیا ایک موضوع پہ ایک مستقل [illegible] اور حقائق ہیں بے لاگ تبصرہ مولانا کی خصوصیت ہے آپ کے مضامین دل و دماغ دونوں کے لئے سامان [illegible] اپنے دامن میں چھپائے ہیں وہ چاہے تنقید ہو یا کسی پر اظہار خیال وہ کوئی تحقیقی موضوع ہو یا واقعات اور دورِ حاضر پر تبصرہ سب سے آپ کی بے پناہ قوت مشاہدہ، بصیرت، نگاہ کی گیرائی اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی سے عقیدت نکا دکھا ان کی شخصیت کی تصویر وہ کامیاب ترین تصویر ہو کے قلم سے کھینچی ہے وہ مولانا محمد علی کی ڈائری میں آج تک نہ جاوید بن گئی ہے۔ نفسیات کا گہرا مطالعہ، ظاہر سے باطن، اسرار و علوم، کرداروں کا مطالعہ اس انداز سے کیا ہے کہ افسانہ فراق عدم اس طرح ہنستے بولتے نظر آ رہے تھے جیسے اس دنیائے آب و گل کو پُر رونق بنائے تھے۔ قوت حافظہ کا یہ عالم کہ گزشتہ ساٹھ سال کے واقعات جو تاریخ کا ایک جزو بن گئے ہیں ان کے تذکرہ میں بکھرے ہوئے ہیں اور طلبا تحقیق اور تنقید ادب و تاریخ کے لئے مختلف موضوعات کا مواد فراہم کرتے ہیں اور دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں۔ مشاہدے کے ایسے بھی واقعات جو کبھی پردۂ اظہار پر عکس فگن نہ ہو سکتے مولانا نے بیان فرما کر ان کے کردار کے مختلف پہلو کو اجاگر کر دیا ہے اور علاوہ تالیفات اور تصنیفات کے ان کا یہی احسان علم و ادب اور تاریخ پر ایسا عظیم ہے کہ جس کے سپاس گذاری کے لئے اظہار بیان کی ساری

تین محض ہیچ ہیں —

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا تعارف ملاحظہ ہو:۔

"مولانا شیروانی کے دولت کدے پر کوئی کمیٹی
نظر ایک نئے چہرے پہ پڑی۔ اور جی چاہا کہ اب پڑی
تو پڑی رہے، ہٹنے نہ پائے۔ نرم اور روشن چہرے
ریشم کی طرح نرم اور ملائم داڑھی دل نے کہا کہ
س چہرے کو دیکھتے ہی چلے جائیے۔ بتانے والے نے
بتایا کہ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں۔ اللہ اللہ کیسا
دھوکا ہوا۔ نام سے عرصہ سے واقف تھا ایک خیالی
صورت بھی ذہن میں تھی۔ لیکن صورت، سیرت
ہر چیز سے متعلق خیال اور اندازہ کتنا مختلف نکلا خیال
تھا کہ مُسن ہونگے یہ تو جوان نکلے۔ خیال تھا کہ بڑے
"سجّادہ" بڑے مُناظر ہونگے اور خشکی اور کرختگی کے پتلے
مشاہدہ نے بتلایا کہ ایک لطیف جسم، لطیف تر روح
کو چھپائے ہوئے، خندہ رو، نرم خو، نہ کرختگی نہ ثقالت
برعکس اسکے ایک پیکر لینت و لطافت، قال کے
موقع پر قال اور حال کے موقع پر حال۔ صورت پر
نورانیت برستی ہوئی، گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی۔
ذرا چھوٹے چھوٹے جملوں کے چٹکتے ہوئے شگوفے کھلتے
ہوئے فقرے، الگ الگ پڑے دہک رہے ہیں۔ اگر مل
جائیں تو شعلہ بن کر خیال کی دنیا میں آگ لگا دیں"۔

زورِ بیان کا اندازہ پوری عبارت سے ہوتا ہے۔ ایک
ایک لفظ روح میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے اور پوری
عبارت پڑھ کر شخصیت میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور یہ
اعجاز بیانی۔ یہ طرزِ ادا کا بانکپن بس انھیں کا حصہ ہے
جس کی تعریف کے لئے تمام الفاظ پست ہیں اور جس کا
لطف بس دل ہی دل میں لیا جا سکتا ہے۔ اور جس کو
پڑھ کر سر دُھنیے اور مرحبا مرحبا کے نعرے لگائے جائیے
بقول ذوق ؎

مزے نہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے
کہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

مولانا محمد علی کے سلسلے میں پیش لفظ کی ابتدائی
عبارت ملاحظہ ہو:۔

"دو سروں کی آوازیں اور کبھی پست تر رہیں
اور تنگ تر دائروں سے ان کی گونج آگے نہ بڑھی
ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی آئی
تھی جس کی آواز شمال نے بھی سنی اور جنوب نے
بھی ہمالہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی وادیوں
نے بھی۔ خواص نے بھی اور عوام نے بھی، اور
عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی۔ بوڑھوں
نے بھی اور بچوں نے بھی۔ آسام نے بھی اور
سندھ نے بھی ....

اس کا کلام سن کر ڈرائنگ روم کے
صوفے کھل کھلا کر ہنسے اس کا پیام سن کر مسجد
کے در و دیوار بلبلا کر روئے۔ خانقاہیں اور
درس گاہیں، ہوٹل اور بازار، دفتر اور کارخانے
آزادوں کی کانگریس اور رجعت پسندوں کی
کانفرنسیں، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند
اور ندوہ، فرنگی محل اور جمعیۃ العلماء۔
مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور ہاتھ
چپہ چپہ پر اس کے نقشِ قدم کے نشان۔ ذرہ

ذرہ اسکے خیر مقدم سے لطف اندوز ہ۔"

ایک پیراگراف میں محمد علی کی بے چین روح کی تصویر کھینچ کر رکھدی ہے۔ عبارت کا یہ اعجاز "اعجاز ادب" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ عبارت کی روانی، لفظوں کی دلکشی قلب پر وہ تاثیر اور تاثر ڈال رہی ہے کہ جس کی ثنا و صفت بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانا "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مطابق۔ مولاناؒ کی تحریروں میں وہ موہنی ہے، وہ جان ہے کہ دل آپ ہی آپ اس طرف کھنچتا ہے۔ اردو سے اگر کسی کے دل میں عشق پیدا کرنا ہو تو کسی حب کے تعویذ کی ضرورت نہیں بس "گفتہ" ماجد ایک بار پڑھ کے اسے سنا دیا جائے اور پھر ذوق مطالعہ اور شوق مطالعہ تو پیدا ہونا یقینی اور لازمی ہے۔

ایک صاحب طرز ادیب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص لہجہ اور ترانہ کے ساتھ ساتھ ہر موضوع کی نوعیت اور طرز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسکے رنگ میں اپنی تحریر کو سمو دے۔ بلاغتِ کلام یہ ہے کہ ہر سخن موقعہ اور ہر نکتہ ایک مقام رکھتا ہے۔ اب دیکھئے مثنوی زہر عشق سراسر ایک عشقیہ اور رنگین موضوع ہے اور جس عہد میں وہ لکھی گئی وہ عہد بھی اپنی رنگینی میں لاجواب تھا یعنی واجد علی شاہ کا عہد۔

اب اس کے نقد و تبصرہ کا آغاز ملاحظہ ہو۔

"لکھنؤ اور واجد علی شاہ جان عالم کا لکھنؤ جس کے گل گل کا افسانہ ہر زبان پہ بلبل کا ترانہ ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینہ میں روز تمنا

ہر شام میلے ٹھیلوں کا ہجوم، ہر رات گانے بجانے کی دھوم"

اب دیکھئے عبارت رنگین بھی ہے اور کہیں کہیں مقفیٰ بھی لیکن خوبی بیان دیکھئے کہ کہیں تصنع و بناوٹ نام کو نہیں، رنگینی میں بھی سادگی ہے اور پرکاری پر بھی سادہ کاری

تنقیدات میں ایک نیا طرز ایجاد کیا، کلاسکی ادب پر نفسیاتی تنقیدیں لکھیں جن میں شاعر یا مصنف کو اس عہد کے عمرانی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ مثلاً زہر عشق پر ایک بالکل اچھوتے پہلو سے بحث کی، جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ کتاب ایسی مخرب اخلاق نہیں ہے جیسا کہ اسے عام طور پر سمجھا گیا ہے بلکہ وہ اس دور عیش و تعیش میں بھی شاعر جذبۂ محبت اور شورش الفت کے طوفان میں بھی آرِ محبت بھی دیکھ رہا ہے۔ رازو نیاز اور معاملات وصل و دصار کا حال لکھنے کے بعد وہ بے ثباتی حیات کا بھی درس دے رہا ہے۔ وعظ کا یہ دفتر شعریت سے بھر پور ہے۔

اس پر مولانا ماجد صاحب کا تبصرہ یا تنقید ملاحظہ ہو۔

"غریب مشرقی کا تخیل بھی یہاں تک نہیں پہونچ سکتا عمل میں کیسی ہی شرمناک کوتاہیاں ہوں لیکن عقیدہ میں فحش اور بے حیائی کا جواز داخل نہ تھا۔ اپنے شہدپن کی کہانی سنانے کو تو سنا ڈالی لیکن معاً یہ خیال سامنے آگیا کہ خود خیر رسوا ہو چکے ایسا نہ ہو کر داستان فسق دوسروں کے لئے سامان تباہ کاری بن جائے ... تو ... رات گوا شام تک پہونچانے

ڈاکٹر ریاض الحسن ایم اے، پی ایچ ڈی۔

اُردو کا چسٹرٹن

راہ چلتے کبھی کبھی ایک بزرگ نظر آجاتے ہیں۔ بڑا نورانی چہرہ، لمبا قد، شگفتہ خد و خال، گورا رنگ، کھادی پہنے، اونچی سی ٹوپی سر پر، عجیب سی دھن میں مست...... مگر ناواقفیت کی بنا پر بس بار بار انھیں دیکھ کر رہ جانے کا کئی بار اتفاق ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ یہ حضرت مسجد تبرماموں بھانجہ میں خدائے وحدہٗ لاشریک کے سامنے سر بسجدہ ملے، وقت تھا مغرب کا، بجلی کی ہلکی سی روشنی میں خدائے لم یزل کے سامنے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کی اور ہزاروں برکتیں دامن میں سمیٹ کر روانہ ہو گئے۔ پھر ایک دفعہ بہت عرصہ بعد کچہری کی نئی عمارت میں نظر آئے۔ ایک کرسی پر بڑے طمطراق سے بیٹھے تھے۔ ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ یہی حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کہلاتے ہیں پنشن لینے آئے ہیں یہ معلوم ہو جانے کے بعد اب ان کو بار بار دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔

ہوا وقت گزرتا گیا۔ عرصے تک نظر نہیں آئے پھر ۸ جنوری ۱۹۶۴ء کو غریب خانے پر دعوتِ ولیمہ میں جہاں میرے بہت سے دوسرے کرم فرما محترم اساتذہ اور احباب جمع تھے۔ انھیں میں وہی شکل اچانک نظر آئی۔ میں بڑھا اور بڑے ادب اور احترام کے ساتھ مصافحہ کیا۔ تھوڑی دیر تک مجھے اپنی خوش قسمتی پر سخت حیرت ہوتی رہی۔ رہ رہ کر دل ہی دل میں یہ غصہ بھی آرہا تھا کہ یہ حضرت اتنی خموشی سے کیوں کام لے رہے ہیں، اس کم سخنی کی کیا وجہ ہے جب کہ لکھتے وقت زمین آسمان کے قلابے ملا ڈالتے ہیں۔ حق کو ہمیشہ حق اور باطل کو سدا باطل کہہ کر ببانگِ دُہل اپنے خیالات کا پرچار کرنے میں ذرہ برابر بھی جھجک سے کام نہیں لیتے۔ سیدھی سادی بات کو لگا کر کچھ آڑا ترچھا کر کے تیر و نشتر اور نیزہ و [illegible] سے کام لیتے ہوئے اپنے نزدیک اور اپنے خدا کے نزدیک جس بات کو درست اور جائز سمجھتے ہیں بے محابا کہہ دیتے ہیں۔ صداقت خلوص اور دیانت

داری حق پرستی، حق گوئی اور حق جوئی ان کا خمیر ہیں۔ اور کیوں نہ ہو، تحریک خلافت کی پھڑکتی رگ، ترکِ موالات کی روحِ رواں، علوم مشرقیہ ـــ عربی، فارسی، اردو علوم دین ـــ تفسیر، حدیث، فقہ، انگریزی ادب، فلسفہ، عمرانیات، مذاہب کا تقابلی مطالعہ...... الغرض ان میں سے ہر صنف پر عمیق نظر اور ہر میدان میں ایک مجاہدانہ شان کے حامل ہیں۔

مولانا کی اکثر تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مضامین جو مختلف رسائل میں ملے۔ بلا شرکت غیرے اپنی باتیں "صدقِ جدید" میں چلا چلا کر کہتے رہتے ہیں وہ بھی اکثر پڑھا کرتا ہوں۔ اگر یہ کہوں کہ مولانا کے قائم کردہ عنوانات قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بہت کافی ہوتے ہیں۔ تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔ سماج کی برائیاں، معاشرے کی کمزوریاں، سیاسی بے چینیاں، ہندوستان میں ہوں یا پاکستان میں، عرب میں ہوں یا عجم میں، مصر میں ہوں یا برطانیہ میں، مولانا کو مزدور بے چین کر دیں گی۔ بات ناگوار ہوئی اور تو بیلٹ شاہی کی پروانہ کی پنڈت بنت کی۔ برائی، خواہ کسی شکل، کسی جگہ اور کسی حالات کے تحت انھیں نظر آجائے تو وہ ایک ہنگامہ ضرور پیدا کر دیں گے۔ چاہے کوئی مانے یا نہ مانے، یہ ایک بار انجام سے ضرور آگاہ کر دیتے ہیں اور پھر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب ان کا فرض ادا ہو گیا۔ ایسا شخص لاکھ دبایا جائے دب نہیں سکتا، نہ اسے جیل کا ڈر رہتا ہے، نہ جلاوطنی کا، وہ نہ فرد سے ڈرتا ہے نہ جماعت سے، وہ صرف برائی سے ڈرتا ہے اور اسی کو دور کرنا چاہتا ہے۔ اس کی گردن بڑی سی بڑی طاقت اور بڑے سے بڑے اقتدار کے آگے جھک نہیں سکتی۔ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں مولانا خالص اسلامی طرز زندگی کے دلدادہ ہیں۔ ان کے قول و عمل میں بہت یکسانیت ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنھا نہیں سکتے

اردو زبان میں "چسٹرٹن" کہلانے کا مستحق یہ صاحبِ سیف و قلم نہیں تو کون ہے؛ الفاظ اس کی سیف ہیں اور اس تلوار میں عام تلوار سے زیادہ کاٹنے کی صلاحیت موجود ہے۔

صاحبِ طرز انشا پرداز، بہترین صحافی، زبردست عالمِ دین، بہترین مفسرِ قرآن، بہترین انسان، سب کا بہی خواہ اور سب سے بڑھ کر خود اپنا ہمدرد اور دوست، کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ اچھے بے لاگ قلم سے انسان دوستی کا حق ادا کرتا ہے، خلوص کا معیار بتاتا ہے، وہ وفاداری ایثار اور مروت کا ایک چلتا پھرتا مرقع ہے۔ اگر ان صفات کا حامل انسان تقریر کرنے پر اتر آئے تو اس کا ہر جملہ دل کی گہرائی میں تیر کی طرح اتر جائے اور لکھنے پر کمر باندھ لے تو ہر نقش فریادی ہو جائے اس کی شوخئ تحریر کا۔

ہ پیکرِ تصویر کا پیراہن کاغذی نظر آتا ہے۔
سٹ‍ن کی طرح اکثر چاک سے کچھ ہلکے نقوش
یربن بناتا ہے۔ پھر اُنھیں نقوش اور لکیروں
ری پوری قدِ آدم تصاویر اپنی تمام رعنائیوں
ساتھ سامنے آجاتی ہیں۔ بشرطیکہ قاری اپنے
ن پر ایمانداری سے زور دے اور اس کے
ری صلاحیت موجود ہو کہ وہ تمام کڑیاں
سکے۔ مولانا کی تحریروں میں اکثر مشہور طنز
رسوفٹ Jonathan Swift رچرڈ اسٹیل
Richard Steele اور جوزف اڈیسن Joseph
Addison کا اصلاحی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے
درجن دو درجن کتابوں کا مصنف، مؤلف
امرتب ہونا کوئی بڑی بات نہیں مولانا نے نہ
معلوم کتنی کتابیں تصنیف کیں بات تو جب ہے
لہ ہر کتاب اپنی جگہ لاثانی ہو اور سب کا معیار
یکساں ہو، ہر جملہ اور ہر پیراگراف بجائے خود ایک
کتاب معلوم ہو۔ "محمد علی ذاتی ڈائری" اکبرنامہ
یری نظر ہیں ــــ اردو زبان کے سوانحی ادب
یں گرانقدر اضافے نہیں تو کیا ہیں؟ انگریزی ادب
یں کوئین وکٹوریا Queen Victoria لیٹن اسٹریچی
Lytton Strachey کی بہترین دین سمجھی جاتی
ہے کیوں؟ محض اس لئے کہ اس میں مصنف نے
موضوعِ کتاب یعنی ملکہ وکٹوریا کی بالکل صحیح عکاسی
کی ہے۔ حقائق سے چشم پوشی نہیں کی ہے اور
نہ مبالغہ میں زمین سے آسمان پہ پہنچایا ہے۔

اس ارضی اور خاکی ملکہ کی، جس کے اندر بشریت
کے تمام تقاضے پوری شدت کے ساتھ موجود
تھے، تمام خوبیوں اور خرابیوں کو بڑی صداقت سے
پیش کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس سوانح حیات
کا اُس زبان کے ادب میں ایک خاص مقام ہے
مولانا نے بھی محمدؐ علی جوہر کے سارے جوہر کھول
کے رکھ دئے ہیں۔ زمانۂ خلافت میں برسوں
رگِ جاں سے بھی نزدیک تر رہے ہیں، اٹھتے
بیٹھتے، چلتے پھرتے دیکھا ہے، عالمِ خوشی اور
قیامت والی تقریروں ــــ دونوں کے مزے لے
چکے ہیں۔ جلوت اور خلوت میں جوہر کو اچھی طرح
دیکھا بھالا ہے۔ مدتوں ہم پیالہ و ہم نوالہ رہ
چکے ہیں۔ ایسے شخص کی تصویر کشی آسان بھی ہے
ور مشکل بھی۔ ذاتی تاثرات اور بے جا ستائش سے
کام لے سکتے تھے مگر وہ اخلاقی بے ادبی اور ادبی
بے انصافی کے کب روادار ہو سکتے تھے۔ "محمد علی
ذاتی ڈائری" میں سوانح نگار نے پوری صداقت
سے کام لیا ہے اور اسی لئے یہ کتاب تاثیر کے لحاظ
سے بہت مقبول ہے۔ اکبر الہ آبادی بھی مولانا کے
رہینِ منت ہیں کہ ان کے قلم نے اُن کا ایک ایسا
جیتا جاگتا مرقع بنا دیا ہے جو امتدادِ زمانہ کے
ساتھ ساتھ اپنی دلکشی اور دل آویزی میں
برابر اضافے کرتا رہے گا۔ سونے پر سہاگہ تو
یہ ہوا کہ دونوں حضرات یعنی محمد علی جوہر اور اکبر
الہ آبادی اول بھی مشرقی تھے۔ اور آخر بھی مشرقی

دریابادی صاحب کا پوچھنا ہی کیا، سر سے پیر تک مشرقی روح سمادی، بدن ارض ہند کا، تعلیم و تربیت اور ذہنیت علی گڈھ کی، قرآن کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے، اقوال و احادیث نبویؐ کے حافظ، اسلامیت کے ماہر، وقت کے بہترین مفسر..... ایسا شخص اپنی پسند کا موضوع پاکر کیا کیا کمالات نہ دکھاوے گا۔

اُردو ادب کا یہ چسٹرٹن مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح بہت سی اعلیٰ صفات کا مالک ہے۔ وہ "وادیٔ غیر ذی ذرع" میں تو نہیں پیدا ہوا مگر اس مقدس وادی سے اس کا ضرور کوئی ازلی رشتہ ہے۔ "عِندَ بَیتِکَ المُحَرَّم" تو اس کا مولد نہیں، مگر اس مبارک گرد و نواح سے وہ ضرور فیض یاب ہوا ہے۔ مولانا آزاد مرحوم نے قرآن پاک کو اپنی رگ و پے میں سمو لیا تھا، اس سے الگ ہو کر وہ ایکدم نہیں چل سکتے تھے، ایک جملہ نہیں لکھ سکتے تھے، اس کے بغیر وہ کچھ سوچ نہیں سکتے تھے، انھیں جو کچھ نصیب ہوا وہ محض قرآن پاک کے وسیلے سے ملا۔ عبدالماجد کو بھی یہی سعادت حاصل ہے۔ وہ ہر عمل کو میزانِ قرآنی میں تو لتے ہیں، سیرت نبویؐ کے پیمانے سے اُسے ناپتے ہیں، اُسوۂ حسنہ کے معیار کو اعلیٰ معیار گردانتے ہیں، سیاست کے داؤں پیچ سے بخوبی واقف ہوتے ہوئے بھی عبدالماجد نے اپنے دامن کو اس سے پوری طرح بچایا۔ ایسا شخص کرسیٔ وزارت پر فائز ہونا اپنی توہین سمجھتا ہے اور یہ

اچھا ہوا کہ عبدالماجد کسی وزارت میں شامل نہ ہوئے ورنہ خدا جانے کتنوں کے سیاسی بلبل دن ا[ور] کھلا کرتے۔ کتنوں کی پگڑیاں اچھلتیں اور کتنی برداریاں آئے دن ہوتیں اور نہ معلوم کتنی عدالت العالیہ میں حق بنام باطل مقد[مے] پیش ہوتے رہتے جن کو فیصل کرنے کے لئے ان سے بڑا عبدالماجد درکار ہوتا۔

مولانا اب آپ ہی بتائیں کہ مذکورہ صفات سے موصوف ہوتے ہوئے کیا آپ ا[س] لئے اس سے بہتر کوئی طرز نگارش اختیار کر[سکتے] تھے؟ انسانی مزاج میں سرد و گرم کے جو عنا[صر] پیدا کرنے والے نے جس مناسبت سے پیدا [کئے] ہیں۔ اسی تناسب سے لب و لہجہ کی یہ سرد و گرمی آپ کے قلم سے نکل کر دو آتشہ بن جا[تی] ہے۔ میں نے انگریزی ادب کا جو ناقص مطالعہ کیا ہے اور اپنے پسندیدہ شعرا و دیگر اہلِ قلم کے بارے میں جو تاثرات قائم کئے ہیں وہ مجھے اس پر مجبور کرتے ہیں کہ میں آپ کو چھوٹا منھ بڑی بات کے مصداق "اُردو کا چسٹرٹن" کہوں۔ آپ کے مضامین میں، آپ کے اداریوں میں، آپ کے عنوانات [...]ling, Paradaxical statements، Criticisms اور Light Remarks اُرد[و] نگاری کا بہترین سرمایہ ہیں۔ یقیناً [...]le is [...] man کا اطلاق آپ پر ہوتا ہے۔ اس طرز تحر[یر] اور ان اخلاقی اقدار کو جمع کر کے وقت کے ساتھ اُردو ادب میں نہ معلوم کتنے اور چسٹرٹن پیدا ہو[ئے] ہیں۔ بہر حال فی زمانہ تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

از غلام دستگیر ایم اے حیدرآباد

عرضِ نیاز[1]

مقدمہ کتاب مُردوں کی مسیحائی

(مولانا دریابادی کے نعتیہ و مذہبی مضامین کا مجموعہ)

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اس نعمت عظمیٰ کا شکر کس زبان سے ادا ہو کہ توفیق الٰہی کی رفاقت نے صدق لانے والوں کے ساتھ تصدیق و تائید کی نسبت بخشی ؎

بریں مژدہ گر جان فشانم رواست

پندرہ سولہ سال پہلے جامعہ عثمانیہ میں میں علم کا طالب بن کر داخل ہوا تو اخبار "سچ" بھی میرے لئے اس علم کا چشمۂ فیض ثابت ہوا جسے قرآن کی زبان میں صدق کہتے ہیں اور جس کے قائل و حامل کو صدیق۔ یہ استفادہ اَب تک بہ فضل ایزدی جاری ہے۔ اس کا جو پہلو جاء بالصدق (سچی بات لے کر آیا) کا مصداق ہوتا ہے بفضلہٖ دل میں صدّق بہٖ (سچ مانا) کی کیفیت بڑھاتا ہے زادہ اللہ فیوضہٗ۔

دیگر مباحث کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً مدیر محترم مولانا عبدالماجد صاحب کے قلم سے سیرت نبوی پر چند نہایت بلیغ اور ایمان پرور مقالات شائع ہوتے رہے دل کی دیرینہ تمنّا تھی کہ یہ سدا بہار پھول ایک بصیرت افروز گلدستہ کی صورت میں ناظرین کے سامنے آجائیں آج محترم مدیر صدق کی اجازت سے مجھے اس کی ترتیب اور ادارۂ اشاعت اُردو کو اس کی اشاعت کی سعادت حاصل ہوئی ہے ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

زندگی کا حقیقی جوہر حسنِ سیرت ہے۔ زندگی کی رفعت اور عظمت کا مدار صرف سیرت ہے۔ انسانی فطرت کا بہترین مظہر سیرت ہی ہے۔ سیرت فطرتِ انسانی کے لوازم کا ایک

---

[1] یہ تحریر ۱۹۴۲ء کی لکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر رشید صاحب نے خاص نمبر کے لئے ایک تازہ مضمون مرحمت فرمایا تھا۔ افسوس ہے کہ کاتب کی غفلت سے کتابت شدہ مضمون مع اصل کے غائب ہوگیا۔ اس کے بجائے موصوف کی یہ تحریر درج کی جا رہی ہے (فروغ اُردو)

اخلاقی نظام ہے جس کا اعلیٰ نمونہ ایک متوازن، مربوط اور مرصّع شخصیت پیش کرتی ہے۔ سوسائٹی اور انسانی اجتماع کا خمیر ایسی ہی سیرت و شخصیت سے عبارت ہوتا ہے ؎

جوہر طینت آدم ز خمیر دگر است
تو توقع ز گلِ کوزہ گراں می داری

سیرت کی تکمیل بڑی صبر آزما ہوتی ہے، زندگی کی قدر و ہمت کا معیار، سیرت کی بلندی اور اس کا وزن ہے۔ زندگی میں حقیقی کامیابی کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور اہم استوارِ سیرت ہے۔ پاکیزہ سیرت ہی نے بڑوں کی یاد کو دوام اور ان کے ذکر کو رفعت بخشی ہے۔ کمالِ سیرت کیا ہے؟ علم و عمل کے اعلیٰ صفات کا توازن۔ انبیا علیہم السلام کی سیرت ہی تاریخ انسان کا بہترین باب ہے۔ محاسنِ انسانی کا جامع ترین نمونہ سیرت محمدیؐ یعنی "خلق عظیم" ہے۔ آنحضرت صلعم کا اسوۂ حسنہ انسانیت کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے جس کی اطاعت و اتباع کے بغیر صحیح انسانی تربیت ممکن نہیں۔ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سیرت نگاری کا نازک ترین مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔ سیرت نگاری بقول شخصے عبارت ہے آئینہ کی عکس ریزی اور مصور کی قلم کاری سے۔ یوں بھی سیرت نگاری سارے فنونِ لطیفہ سے کہیں زیادہ اہم اور بلند ہے لیکن "خلق عظیم" نقش و نگار بنانے میں اندازہ فرمائیے کہ سیرت نگار کی ذمہ داری کس حد تک بڑھ جاتی ہے ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

توفیق الٰہی سے مولانا عبدالماجد صاحب (زاد اللہ اخلاصہ) نے یہ نازک مرحلے بڑی کامیابی سے طے فرمائے ہیں۔ ایک سچے سیرت نگار کی طرح آپ کا مطالعہ سیرت نبوی بڑا گہرا ہے۔ صاحب سیرت کے ظاہر و باطن کے مشاہدہ اور احساس میں آپ نے کمال پیدا کیا ہے۔ علم دین اور معرفت کا یہی منتہائے مقصود ہے۔ سیرت مبارک کے جن پہلوؤں پر آپ نے قلم اٹھایا ہے اُن سے آپ کی دقتِ نظر اور عمقِ فکر صاف ظاہر ہے تلاش و تحقیق کا کمال آئینہ ہے۔

آپ نے اس مایوس کن ماحول کی تصویر کے اہم خط و خال بڑی خوبی سے پیش کئے ہیں جس میں "خلق عظیم" کا انقلاب انگیز فیض تربیت شروع ہوا۔ تبلیغ و تعمیر میں آنحضرت صلعم کی آواز کے خلاف کیونکر دولت، امارت، حکومت اور مذہبی اجارہ داری کا اکٹھا تھا۔ اس کے مقابلہ میں تنگ دستوں، ضعیفوں اور شکستہ حالوں کی ایک جماعت کو کامیابی و کامرانی کی بشارتِ الٰہی کیونکر ملی۔ اس پر ان کے ایمانِ محکم ہی نے کیونکر ان کو کامرانی کی منزلوں تک پہونچا دیا جب ہم ان مقامات سے گذرتے ہیں جہاں افضل ترین رسول اِس حال میں پیش کیا گیا ہے کہ لوگ لڑ رہے ہیں وہ صلح کرا رہا ہے قوم چھیننے میں مصروف ہے۔ یہ بانٹنے میں دنیا تحصیل و خواہی میں لگی ہے۔ یہ عطا و بخشش میں۔ عالم مخلوق پرستی میں مبتلا ہے اس کے دل کو خالق کی لو لگی ہے تو سیرت نگار کے احساسِ صداقت اور کمالِ ہنر کا پتہ چلتا ہے۔

ان میں سے اکثر مضامین قرآنِ پاک کے بعض سُورتوں کی تفسیر ہیں۔ واقعات سیرت کی روشنی میں، یہی اِس تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ یہ رسول ﷺ واجب التعظیم کے "خلقِ عظیم" کا زبانِ عائشہ رضؓ نے کان خلقہ القرآن کے الفاظ میں ترجمانی فرمائی۔ اس مجموعہ کے بعض مقالات اُس حقیقت کے نہایت بلند پایہ نمونے ہیں۔

قرآن اور سیرت نبوی کا ربط دین کی معرفت کا انتہائی مقام ہے ؎

آشکارا دیدنش اسرائے ما

در ضمیرش مسجد اقصائے ما

خدا کی یہ کتاب حاملِ کتاب کی صداقت میں دلیل شاہد ہے تو حامل کتاب اصل کتاب پر گواہ ؎

ایں دو شمع اندکا از یکدگر افروختہ اند

جو کچھ علوم قرآن کی بابت بربنائے حقیقت کہا جاتا ہے، وہی سیرت نبی کی بابت حرف بحرف صحیح ہے جس طرح حکمتِ قرآن انسانی ترقی کا سارے ممکنات کو حاوی ہے، سیرت نبویؐ بھی اپنی جامعیت میں سیرت انسان کی ترقی کے سارے مدارج پرحاوی ہے۔ قرآن علم الٰہی کی لامحدود کائنات ہے اور سیرت نبویؐ اس عمل کا ایک لامحدود عالم۔ اس باب میں اجتہاد اور نئے نئے نتائج کا استنباط نہ ختم ہوا ہے، نہ کبھی ہوگا۔ رسول ﷺ اسلام کے ذکر کی رفعت نہ کسی نقطہ پر ٹھہری ہے نہ ٹھہرے گی۔ ہر اداشناس نبوت کی نظر عبدیت کی اس پیکر کامل (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چند خاص خط و خال پر پڑتی ہے۔ اہلِ نظر اس سے فیض یاب ہوتے ہیں، ذکرِ رسول ﷺ کا یہ مجموعہ لطیف بھی گوناگوں خصوصیات وامتیازات کا حامل ہے۔

ان مقالات میں بڑی خوبی سے اس ہمہ گیر انقلاب کی تشریح کی گئی ہے جو رسولِ ﷺ اسلام کی نظر کیمیا اثر کی بدولت ظہور میں آیا، جس عظیم الشان انقلاب سے فیض پانے والوں کی کایا پلٹ کر دی گئی جس انقلاب کا اثر یہ ہوا کہ مُشرک توحید الٰہی کے داعی بن گئے، جو بدمستی کے دل دادہ تھے وہ دنیا میں مذمت شراب کے علم بردار بن گئے جو چور اور اُچکے تھے اُن کا احساسِ دیانت اتنا نازک ہوگیا کہ دوستوں کے گھر کھانے میں بھی ان کو تامل تھا؛ جو لٹیرے تھے وہ اس درجہ متدیّن ہوگئے کہ ان کے معمولی سپاہی ہزاروں اور لاکھوں کا مالِ غنیمت کمال دیانت سے اپنے اپنے سپہ سالاروں کے یہاں پہنچا دیتے تھے لوٹ کھسوٹ پر بسر کرنے والے سُود کو حرام اور زکوٰۃ و صدقات کے نظام کے قائم کرنے والے بن گئے۔ زر پرست سرمایہ داری کو اس طرح مٹانے لگے کہ لوگ زکوٰۃ لے کر پھرتے تھے اور لینے والا نہ ملتا تھا۔ وہ جن کی نظر میں انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی اور اپنی بیٹیوں تک کو زندہ دفن کرتے تھے، وہ جان کا ایسا احترام کرنے لگے کہ کسی مُرغ کا بھی بغیر حق قتل ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ ظلم جن کی اُفتادِ طبیعت تھی اپنے جان و مال کے دشمنوں تک کے ساتھ عدل کا لحاظ رکھتے تھے۔ اس حیرت انگیز انقلاب کی تفسیر کی بدولت اس کتاب کا نام "مُردوں کی مسیحائی

تجویز ہوا، اس کے اولین مقالہ کا عنوان بھی ہے۔
درحقیقت یہ اِسم بامسمیٰ ہے۔

مقالات نکاح و طلاق، سیرت نبوی کے درحقیقت
متعلقہ پہلوؤں اور اس ہمہ گیر انقلاب کے ان اقدار
کو واضح کرتے ہیں جو بظاہر حیات ازدواج میں نمودار
ہوئے۔ ایک مضمون مستشرقین کی اُن دقیق
تلبیسات اور خفی و جلی کید کو بے نقاب کرتا ہے، جو
سیرت نگاری کے سلسلہ میں وہ اختیار کرتے ہیں۔ غیروں
کی تصانیف سیرت کے مطالعہ میں یہ ایک رہنما ہے۔
اپنے نمایاں واقعات کے ساتھ سیرتِ پاک کے کئی
ایسے اشاروں کو بھی الفاظ کا جامہ پہنایا ہے جن کی رُوح
پرور کشش کا بھولنا ناممکن ہے۔ اس کے بغیر بے شمار خفیف
شائبے اور جلوے ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتے۔
اس کی اہمیت اور دلکشی آپ کی بصیرت کی اداشناسی
اور مہارتِ نفسیات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ
ساتھ صاحبِ سیرت کے اصلی اور بنیادی اجزا ہمیشہ
آپ کے پیشِ نظر رہتے ہیں جن کے باعث دیگر اجزاء
سیرت کا اصلی محل و مقام پہچاننے میں حقیقی رہبری حاصل
ہو جاتی ہے۔ سیرت کے اسی تنوع کی بابت بے اختیار زبان
پکار اٹھتا ہے کہ ع

من نسیمِ حاضری شوم تصویرِ جاناں در بغل

معنوی محاسن کے علاوہ ادبی نقطۂ نظر سے یہ مقالات
انشاء اور حسنِ بیان کے نہایت بلند پایہ نمونے ہیں جگہ
جگہ آدابِ نبوت کی شایانِ شان تعبیر کے انداز مصنف
بیانی کے کمالات کے آئینہ دار ہیں۔ سیرت نگاری کا
ایسا ہی کمال اپنی صداقت سے پڑھنے والوں کے ایمان
و یقین کو بڑھاتا اور مضبوط کرتا ہے۔ حسنِ عقیدت، کمال
تحقیق، اور حسنِ تعبیر کا یہ نادر مجموعہ اُردو کے سیرتی ادب
کے ذخیرہ میں نہایت گراں بہا اضافہ ہے، دوامی قدر و
قیمت کا حامل ہے۔ خدا مصنف کو ہم سب کی طرف سے
بہترین جزا دے آمین! بحق طٰہٰ و یٰسین۔ یہ تو
سیرت نگاری کے انسانی ممکنات و کمالات کا ذکر ہے
ورنہ ع

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

نجم الحسن صاحب انجم ادیب :

مولانا عبدالماجد دریابادی

بچپن میں مجھے والد صاحب مرحوم مولانا شاہ ابوالحسن ادیب کے پاس "سچ" کے شمارے دیکھنے کو ملتے مجھ میں اس وقت سمجھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اس پرچہ کا نام ہی کچھ ایسا تھا! "سچ" پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آجاتی تھی۔ کیونکہ بچپن میں "سچ" نہ بولنے پر ایسی ایسی پٹائی ہوتی الله ہی یاد آجاتا تھا۔ میں سمجھتا تھا میرے والدین یہ "سچ" پڑھ کر ہی میری پٹائی کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے والد صاحب سے پوچھا ابا جان اس میں کسی قسم کا جھوٹ نہیں لکھا گیا ہے تو والد صاحب نے جواب دیا تھا۔ چلو ابھی بچے ہو کیا سمجھ سکوگے۔

تب میرے جی میں آتا تھا کہ "جھوٹ" نکالا کروں چھوٹے چھوٹے کاغذات پر "جھوٹ" لکھ کر اپنے دوستوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔

جوں جوں عمر بڑھنے لگی سمجھنے اور سوچنے کا کچھ شعور حاصل ہوا تو مولانا عبدالماجد صاحب کی عظمت کا اندازہ ہونے لگا۔ مولانا کی تصانیف فلسفئہ ماجد۔ فلسفہ جذبات وغیرہ پڑھ چکنے کے بعد میں مولانا کا مداح ہو گیا۔

اُردو میں فلسفۂ جدید پر بہت کم مواد تھا۔ مولانا نے اپنی قابلیت کے زور سے اس کمی کو پورا کیا۔ اور اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں۔ اور کارآمد کتابوں کا غیر زبان سے اُردو میں ترجمہ بھی کیا

آپ کے اسلوب بیان کی خاص خوبی یہ ہے کہ مضمون میں تسلسل اور شگفتگی قائم رہتی ہے۔ اور آپ کی خاص چیز یہ ہے کہ جیسا ماحول ہو ویسی ہی زبان اور الفاظ استعمال کیا کرتے ہیں۔ مضمون کے درمیان کبھی کبھار سوالات خود کرتے چلے جاتے ہیں۔

ایک طویل عرصہ سے یہ سوچ رہا تھا کہ مولانا کی خدمت میں خط لکھ بھیجوں آخر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ لکھوں تو کس سلسلہ میں لکھوں۔ ایکدن میرے دل کی مراد بر آئی۔

۱۹۶۶ء میں انجمن ترقی اردو و مصنف علیگڑھ
کا ہفتہ وار ترجمان ہماری زبان پڑھ رہا تھا۔
اس میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ مولانا عبدالماجد
صاحب کو انکی عربی خدمات پر سرکاری اعزاز ملا ہے"
میں نے اسے خط لکھنے کا سلسلہ بنا کر ایک مدحیہ نظم
لکھ کر مولانا کی خدمت میں بھیجی تھی اور میں نے یہ
سمجھ رکھا تھا کہ اتنے بڑے اور معروف آدمی کی طرف سے
مجھے کچھ جواب نہیں آئے گا۔ چار یا پانچ دن بعد
چند مدیروں کے خطوط کے ساتھ مولانا عبدالماجد
صاحب کا یہ خط ملا۔

مورخہ ۳۰ نومبر ۶۶ء

مہربان بندہ۔ وعلیکم السلام
آپ شاعر ہیں داد مبارک باد میں آپ نے شاعری
سے کام لیا۔ آپ کو اپنی محبت و حسن ظن کا اجر
بیشک مل جاوے گا۔ باقی حق و استحقاق کا تو میں
شائبہ بھی نہیں رکھتا " من آنم کہ من دانم"
دنیوی اعزاز و اکرام کی قدر و قیمت ہی کیا!
کچھ ہو بھی اس کی عمر کتنی! اعزاز و اکرام تو بس آخرت
کا ہے دعا فرمائیں کہ وہاں آبرو اور خالق کے
سامنے فضیحت نہ ہونے پائے۔

والسلام
دعا گو
عبدالماجد

مولانا کا جواب پا کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دونوں جہاں
کی نعمتیں مجھے مل گئی ہیں۔ تب سے میں آج تک
مولانا سے کبھی کبھار خط لکھ کر کچھ پوچھ لیا کرتا
ہوں۔ اب مولانا کی مختصر سوانح درج ذیل ہے
مولانا عبدالماجد صاحب ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء
میں بمقام دریا باد ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے
والد کا نام عبدالقادر صاحب تھا۔ جو ڈپٹی کلکٹری
کے عہدہ پر مامور تھے۔ آپ اپنے والد صاحب
کی چھوٹی اولاد تھے...... آپ سے بڑے
ایک بھائی عبدالمجید اور ایک بہن بھی تھیں۔ گھر
پر قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ فارسی
میں گلستاں۔ بوستاں اور سکندر نامہ پڑھ لیا
اور امام غزالی کی فارسی کتاب کیمیائے سعادت
بھی کم سنی ہی میں پڑھ لی اور عربی کی تعلیم مولوی
عظمت اللہ صاحب فرنگی محل سے حاصل کی۔
ہائی اسکول کی تعلیم ختم ہونے کے بعد کیننگ
کالج لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ انٹرمیڈیٹ میں
انگریزی مضمون نگاری اور منطق میں اول رہے
۱۹۱۲ء میں بی۔ اے سکنڈ ڈویژن
میں پاس کیا ـــ انگریزی میں مضمون نگاری
اور سائیکالوجی میں اچھے نمبر حاصل کئے تھے۔
ایم اے فلسفہ کا انتظام لکھنؤ میں نہ تھا۔ ۱۹۱۳ء میں
ایم اے کرنے دہلی گئے۔ اور سینٹ اسٹیفنس
کالج میں داخلہ لیا والد صاحب کی بے وقت موت
کی وجہ سے ایم اے مکمل نہ کر سکے۔

تلاش معاش شروع ہوئی اچھا خاصا فاضل و راسخ ہونے کے باوجود کہیں کامیابی نہ ہو سکی۔ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے بعض انگریزی کتابوں کے ترجمے معقول اجرت پر کرانے شروع کئے جب سنہ ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کی داغ بیل تو وہاں بہ حیثیت مترجم فلسفہ آپ کا تقرر ہوا۔

پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا والد صاحب کے ڈر کی وجہ سے "اودھ اخبار" لکھنؤ میں فرضی نام سے مراسلے بھیجا کرتے تھے۔ آپ کی شہرت کا آفتاب سنہ ۱۹۱۰ء سے طلوع ہوا جب کہ آپ نے لکھنؤ کے رسالہ الناظر میں "مولانا شبلی کے الکلام پر تنقیدی نظر" کے عنوان سے مقالہ ایک فرضی نام سے شائع کرایا تھا۔ اس کے قریب پر چھپے ہوئے سنہ ۱۹۱۲ء ۱۹۱۳ء میں الندوہ سنہ ۱۹۱۶ء سے معارف میں مضامین مسلسل لکھنے لگے۔ اور محمد علی جوہر کے ہمدرد کی نگرانی بھی کچھ دنوں تک آپ کے ذمے رہی سنہ ۱۹۲۵ء میں آپ نے اپنا ہفتہ وار پرچہ "سچ" نکالا۔

اپنے ایک مضمون "غبار کارواں" (شائع شدہ آج کل جولائی سنہ ۱۹۴۷ء) میں مولانا عبدالماجد صاحب اپنی تصانیف سے متعلق یوں رقمطراز ہیں "حیدرآباد میں جب یکم ستمبر ۱۷ء سے آخر جولائی ۱۸ء تک رہا تو ایک خاص ضخیم کتاب منطق پر تیار کر دی۔ نام تھا ایک پرانی کتاب کی نظر ثانی کا لیکن نظر ثانی ہی میں گویا وہ ایک نئی کتاب ہی بن گئی وقت بچ رہا تھا اس میں اپنے فن سے باہر ایک تاریخ یورپ کا ترجمہ کا تکملہ کر دیا دونوں کتابیں سررشتہ تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے چھپیں۔

اگست سنہ ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ واپس آ گیا اور اب یہیں مستقل تصنیف و تالیف کا دور شروع ہو گیا پہلے ایک چھوٹی سی کتاب تحفہ خسروی چھپی ہے یہ محض ایک مجموعہ قرآن حدیث اور سعدی وغیرہ کے اقتباسات کا تھا شعر و ادب کے علاوہ تمام تر مغربی فلسفہ کے ماہرین کے افکار زیر مطالعہ آئے برطانوی فلسفی وغیرہ تو گویا نوک زبان تھے سنہ کے لگ بھگ آخر میں مطالعہ غیر مسلم فلسفہ و تصوف کا شروع ہوا ہندو فلسفہ بدھ مت فلسفہ وغیرہ انگریزی کے ذریعہ سے۔

ہندو فلسفہ میں علاوہ گیتا کے انگریزی ترجمہ کے [illegible] بھگوان داس [illegible] آر بندو گھوش وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ رہا۔ [illegible] امیر لکھنؤ میں کچھ مضمون نگاری اسی رنگ کی شروع کی اور پھر مثنوی رومی کے مطالعہ نے تو گویا اس پر مہر لگا دی اور مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی جلد اول بھی اس میں بڑی معین ہوئی۔ اب قلم کا رنگ ہی دوسرا ہو گیا لغویات مغربی کا عنصر صفر اور صالح حصہ اب بھی قلم کا موضوع تھا۔ مبادی فلسفہ یا فلسفہ کی پہلی کتاب اور فلسفہ کی دوسری کتاب [illegible] آپ [illegible] اسی رنگ

کی نکلیں پھر چھوٹے چھوٹے مقالے رام پور پشاور علی گڑھ میں پڑھے ہوئے رسالوں کی صورت میں شائع ہوئے قصص مسائل تمدن اسلام کا پیا تمدن اسلام کی کہانی جدید قصص الانبیاء وغیرہ انگریزی ترجمہ تفسیر دونوں کا ولولہ یاد ہو دا اپنی بے علمی وکم استعدادی کے پیدا ہو گیا۔ چھ سات سال کی مدت میں کام ختم ہوا اور تاج کمپنی لاہور نے اس کا کاپی رائٹ ... کر خرید لیا پھر اُردو تفسیر کی نوبت آئی اور پہلے ایڈیشن کے بعد توفیق الٰہی نے کامل نظرثانی اور معقول ومعتدبہ اضافہ کے ساتھ دوسرے ایڈیشن کی دستگیری کی پہلی جلد اسکی نکل چکی ہے اور دوسری جلد بھی انشاء اللہ آج ہی کل میں نکلنے والی ہے یا پنچ جلدیں اس کے بعد بھی باقی رہیں گی اور اس کی طبع و اشاعت کا اللہ ہی مالک ہے۔ مطالعہ قرآنی کے سلسلے میں چھوٹے بڑے رسالے بھی کئی نکل چکے ہیں، تاج کمپنی (کراچی) نے انگریزی میں محض ترجمہ قرآن (بلا تفسیر) کی فرمائش ابھی دو ہی چار سال ہوئے کی اور جوں توں فرمائش پوری کر دی گئی۔ ترجمہ کی آخری قسط یہاں سے اکتوبر ١٩٦٩ء میں روانہ کی گئی۔ شروع ١٩٣٠ء میں افضل العلما ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے مدراس مدعو کیا کسی قرآنی موضوع پر چھ لکچر دیجئے چنانچہ موضوع تقریباً اچھوتا اور جدید "سیرت نبوی قرآن سے" اختیار کیا گیا۔ اور فرمائش پوری کر دی گئی لکچروں کے دو ایڈیشن

نکل چکے ہیں ایک اور کتاب بھی تمام تر قرآن سے ماخوذ اسی زمانہ میں اور تیار ہو گئی "بشریت انبیا" کے نام سے یہ موضوع ابھی تک اچھوتا ہی رہا ہے اور عین ان سطور کی تحریر کے وقت ایک دوسری فرمائش بھی پانچ لکچروں کی مدراس سے آئی ہوئی ہے اب موضوع اختیار کیا گیا ہے "مردان القرآن" یا "قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں" یہ انتخاب اپنی تفسیر ہی سے ہوگا اور اس کے نمونے نکتے ان لکچروں میں ترمیم و تصرف کے بعد پیش کر دیئے جائیں گے۔

تفسیر ماجدی کے دوسرے ایڈیشن کی باقی جلدیں اپنی زندگی میں دیکھ لوں یہی بہت بڑی اور غیر معمولی سی بات ہوگی ہر جلد پر مصارف اتنے آرہے ہیں کہ اللہ اگر ایک مخلص و درد مند با خیر بندے کو آگے نہ کر دیتا کوئی صورت ہی طبع و اشاعت کی نہ تھی"۔

مولانا کی تصانیف اس وقت تک بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جائیں گی جب تک کہ اُردو زبان زندہ ہے مولانا کو عربی فارسی انگریزی اور اُردو ادب پر اچھا خاصہ عبور حاصل ہے آپ ایک بلند پایہ ادیب انشاپرداز ممتاز نقاد اعلیٰ صحافی بے مثل طنز نگار اور منفرد صاحب طرز مصنف ہیں۔ آج کل آپ ہفتہ وار صدق جدید نکال رہے ہیں جس میں "سچی باتیں" کے زیر عنوان حالات حاضرہ پر آپ کے مختصر تبصرے اور شذرے

(باقی صفحہ ٢٢١ پر)

ڈاکٹر سلام سندیلوی

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نثری مرثیے

نظم میں مرثیہ گوئی کا رواج قدیم عہد سے چلا آرہا ہے۔ غالباً نظم میں پہلا مرثیہ وہ ہے جس کو یعرب بن قحطان نے پیش کیا ہے۔ جب حضرت آدم کے بیٹے قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا، اس وقت انھوں نے کچھ غمگین خیالات کا اظہار کیا۔ انھیں خیالات کو یعرب بن قحطان نے سریانی سے عربی میں نظم کر دیا۔ اس کے بعد عربی میں مرثیہ گو شعرا کی تعداد کافی نظر آتی ہے۔ ہشام بن عقبہ، تابط شرا، لقیط ابن ایاس، عیشی بن مالک، نابغہ، حفص بن الاحنف، نائلہ بنت الاجحم، ابوجنش الہلالی، نبتہ الجرمی اور اخت المتعصص الباہلیۃ وغیرہ نے عربی میں مرثیہ کہے ہیں۔ اس کے بعد عبدالمطلب، حسان بن ثابت، خنسا اور متمم بن نویرہ نے بھی مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی۔ دورِ عباسی کی مشہور مرثیہ گو شاعر دعبل خزاعی گذرا ہے۔ غرضیکہ عربی زبان میں منظوم مرثیہ بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔

فارسی زبان میں بھی منظوم مرثیے کہے گئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں سلطان محمود، ذخی، خاقانی، انوری، سعدی، خسرو، محتشم کاشی، مقبل، طالب آملی، سلیم اور کلیم وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان لوگوں نے فن مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی ہے۔ مگر ان کے مرثیے نظم میں ہیں۔

اردو نظم میں بھی مرثیہ گوئی کا رواج رہا ہے۔ چنانچہ دکن میں اشرف، وجہی، غواصی، لطیف، کاظم، افضل، شاہی، مرزا (گول کنڈہ) نوری، ہاشمی اور مرزا (بیجاپور) نے مرثیے کہے ہیں۔ شمالی ہند میں مسکین، حزیں، غمگین، میراں، میر عاصمی، میر آل علی، درخشاں، صبر، قادر، سودا، میر، ضمیر، خلیق، دل گیر، فصیح، افسردہ، سکندر، گدا، میر انیس، مرزا دبیر، مرزا اوج، میر مونس، میر نفیس، عارف، جلیس، مرزا انس، عشق، تعشق، احمد میرزا، صابر، اور پیارے صاحب رشید نے مرثیہ کے فن کو بلند کیا ہے۔ مگر یہ سارے مرثیے مذہبی ہیں۔

اُردو میں مذہبی مرثیوں کے علاوہ شخصی مرثیے بھی کہے گئے ہیں۔ مثلاً غالب کا مرثیہ عارف اور حالی کا

مرثیہ غالب۔ یہ دونوں مرثیے فکر و فن کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔ مگر شخصی مرثیوں کو سب سے زیادہ ترقی چکبست نے دی ہے۔ انھوں نے بشن نرائن در، گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک، گنگا پرشاد ورما اور اقبال نرائن وغیرہ پر نہایت پُر درد مرثیے کہے ہیں۔

اگرچہ اُردو نظم میں مختلف انداز کے مرثیے موجود ہیں مگر اُردو نثر اس صنف سے تقریباً عاری ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے "انشائے ماجد" حصہ دوم میں "چند مرثیے" کے عنوان سے ان کے پندرہ مرثیے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ ۱۔ عبدالرحمٰن کی موت ۲۔ محمد علی ۳۔ راجہ علی محمد خاں۔ ۴۔ تم نام نامور ۵۔ خوش نصیب گول کیپر۔ ۶۔ شوکت علی۔ ۷۔ طبیب کی موت۔ ۸۔ ماں کے قدموں پر۔ ۹۔ سر سکندر حیات۔ ۱۰۔ نئی نویلی ۱۱۔ قائد ملت ۱۲۔ ہمشیر کی رخصتی۔ ۱۳۔ ایک قوال۔ ۱۴۔ جشن نوشابہ ۱۵۔ یادِ غم۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مرثیے مختلف نوعیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ چار مرثیے انھوں نے اپنے قریبی عزیزداروں پر کہے ہیں "ماں کے قدموں پر" مرثیہ اپنی والدہ کی وفات پر ۱۹۴۱ء میں لکھا ہے اور "یادِ غم" مرثیے میں اپنی والدہ کی یاد میں آنسو بہائے ہیں یہ مضمون ۱۹۴۶ء میں لکھا ہے۔ "ہمشیر کی رخصتی"

مرثیے میں انھوں نے اپنی بڑی بہن کی موت کا واقعہ

"نئی نویلی" مرثیہ اپنی قریبی رشتہ کی بھتیجی پر لکھا ہے جس کی شادی کے دس گیارہ مہینے کے بعد وفات ہو گئی۔ مولانا صاحب نے آٹھ مرثیے قومی لیڈروں پر لکھے ہیں۔ اس زمرہ میں عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا محمد علی، راجہ علی محمد خاں، مولانا عبدالماجد بدایونی، نصرت اللہ خاں شیروانی، مولانا شوکت علی، سر سکندر حیات اور بہادر یار جنگ حیدرآبادی شامل ہیں۔ دو مرثیے اپنے دوستوں پر تحریر فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک مرثیہ شفاء الملک حکیم عبدالحمید لکھنوی پر ہے۔ دوسرا مرثیہ افضل حسین قوال پر ہے جن سے ان کے چوبیس پچیس سال سے تعلقات تھے۔ ایک مرثیہ ایک پڑوسی لڑکی کی وفات پر لکھا ہے جس کا عنوان ہے "جشنِ نوشابہ" جو عبدالرؤف عباسی مدیر "حق" کی دختر تھی۔ یہ سارے مرثیے غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور پڑھنے والے کے دل کو ہلا دیتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مرثیے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان مرثیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان سے خود مولانا کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے "ماں کے قدموں پر" جو مرثیہ لکھا ہے، اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی والدہ مرحومہ کس قدر پاکیزہ اور مقدس ہستی تھیں۔ ان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"نماز کی پابندی کا نہیں، نماز کے ساتھ عشق کا یہ عالم تھا کہ اس دور میں اکابرین میں بھی بس چند ہی مثالیں ایسی ملیں گی۔ اشراق،

جانشت۔ تہجد کا وہ اہتمام کہ ہم جلیسوں کو تو فرض کے لئے بھی شائد ہی نصیب ہو۔ یہ سِن و سال اور تہجد کا یہ التزام کہ کسی موسم میں بھی ناغہ نہونے پائے۔ گرمیوں کی مختصر راتیں کہ فجر تک بھی نیند پوری ہونی مشکل۔ یہ ابھی لیٹیں نہیں کہ ابھی تہجد کے لئے اٹھ بیٹھیں۔ جاڑے کے جاڑے پڑ رہے ہیں۔ صبح ہونے پر لحاف کے اندر سے نکلنا دشوار ہے اور یہ رات کے ایک بجے اور دو بجے اور تین بجے تہجد کے لئے وضو کر رہی ہیں۔"

اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی والدہ ماجدہ کسقدر مذہب کی پابند تھیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مولانا صاحب نے نہایت مقدس، پاکیزہ اور مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے جس کا اثر ان پر اس وقت تک گہرائی کے ساتھ ثبت ہے۔

یہ مرثیے مولانا صاحب کی شخصیت پر ایک اور انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ انھوں نے جن لوگوں کا ان مرثیوں میں ذکر کیا ہے۔ وہ سب کے سب نمازی، پرہیزگار، نیک اور صالح ہیں۔ ان سب کے دلوں میں اسلام کی محبت جاگزیں ہے۔ یہاں تک کہ افضل حسین قوال کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنی جوانی کے زمانے میں قوالی میں بہت شہرت حاصل کی تھی۔ آواز میں درد واثر موجود تھا مگر پیری میں نماز اور تلاوت کے شدت سے پابند تھے۔ جن لوگوں کا ذکر مولانا صاحب نے اپنے مرثیوں میں کیا ہے۔ یہ سارے کے سارے خدا اور رسولؐ کے پرستار تھے۔ ان لوگوں کے ذکر سے خود مولانا عبدالماجد صاحب کے رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی چونکہ وہ خود ایک مذہبی انسان ہیں اسلئے اپنے مرثیوں کے لیے اشخاص کو منتخب کیا ہے جو انھیں کی طرح مذہبی تھے۔

ان مرثیوں سے مولانا عبدالماجد دریابادی کی ایک اور خوبی پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ ایک عالم وفاضل مشہور ومعروف اور مہذب انسان ہوتے ہوئے بھی منکسر مزاج ہیں۔ ان کی انکساری کا ثبوت یہ ہے کہ وہ افضل حسین قوال سے بھی ربط ضبط رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"قوال کا ذکر اور صدق کے صفحات میں۔ جی ہاں، صدق عالموں اور زاہدوں، عابدوں کا پرچہ کب ہے۔ نامہ سیاہ صدق نویس خود ہی ایک عامی اور عاصی ہے۔ اپنے ہم جلسوں کا ذکر چُن چُن کر کرتا ہے۔"

اس عبارت سے مولانا صاحب کا انکسار واضح ہوجاتا ہے۔ قوال سے ان کو اتنا انس تھا کہ جب وہ عالم نزع میں تھا تو انھوں نے اس کو آبِ زمزم پلایا۔ اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی میت میں شرکت کی۔ اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔

یہ مرثیے مولانا عبدالماجد دریابادی کی ایک اور خوبی کو منکشف کرتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ایک سنی مسلمان ہیں مگر وہ نہایت منصف مزاج ہیں اگر ان کو شیعہ حضرات میں بھی خوبیاں نظر آتی ہیں تو ان کا ذکر وہ نہایت فراخدلی کے ساتھ کرتے ہیں۔ انھوں نے راجہ علی محمد خاں والی ریاست محمود آباد کی بہت

سی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے جو مذہباً شیعہ تھے مولانا صاحب نے ان کی ایک یہ خوبی بھی بیان کی ہے کہ ان کے ذہن میں شیعہ سنی کا تفرقہ نہیں تھا۔ انھوں نے ثبوت میں ایک واقعہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کوئی سنی مسلمان حج کرنے جا رہا تھا۔ چلتے وقت اس نے اپنے لڑکے کو راجہ صاحب کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اس کی خبر گیری کریں۔ وہ لڑکا ایک کالج میں زیر تعلیم تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی تعلیم کے اخراجات کے ضامن اب راجا صاحب ہو گئے۔ انھوں نے اس فرض کو نہایت وسعتِ قلب کے ساتھ ادا کیا اور اس لڑکے کے نام بینک میں ۸۰۰ روپے اس کے اخراجات کے لئے جمع کر دیے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی ایک تنگ نظر سنی مسلمان ہوتے تو اس طرح ایک شیعہ رئیس کی تعریف نہ کرتے مولانا صاحب نے انھیں راجا صاحب کے متعصب رویہ کی ایک اور جگہ تعریف کی ہے ان کا قول ہے کہ لکھنؤ کی کسی اہل سنت بیوہ کی ایک جوان لڑکی تھی جس کی شادی کا وقت قریب تھا اس لئے وہ بیوہ بہت پریشان تھی۔ راجا صاحب کو کسی کے ذریعہ خبر ہو گئی۔ انھوں نے ایک معتمد خاص کے ذریعہ ایک معقول رقم چپ چاپ اس بیوہ کو بھجوا دی اور اس طرح اس کی مشکل آسان کر دی۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ راجہ علی محمد خاں کی تعریف کی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مرثیہ ایک طرف تو خود ان کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہیں اور دوسری طرف دیگر حضرات کی سیرت کے مختلف پہلو واضح کرتے ہیں۔ انھوں نے ان مرثیوں میں مختلف لیڈروں اور معروف ہستیوں کی سیرت کا ذکر فراخدلی کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ بہادر یار جنگ کی سیرت پر مندرجہ ذیل سطور میں روشنی ڈالی ہے۔

"وہ قائد ملت جس کسی نے اسے کہا، اس نے کوئی شاعری نہیں کی۔ ادبی صنعت گری، لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا۔ ایک حقیقت بیان کردی۔ تاریخ کی طرح خشک۔ سائنس کی طرح بے لوث۔ ریاضی کے اعداد کی طرح کھری۔ قائد ملت (اور آج یہ لفظ پہلی بار صدق استعمال کررہا ہے) کاش بجائے دکن کے انگریزی ہند کو نصیب ہوا ہوتا تو محمد علی کی جانشینی کا سوال لاینحل نہ رہا ہوتا۔ ہندوستان نے دوسرا محمد علی اگر کوئی پیدا کیا تھا تو وہ یہی تھا۔ وہی اخلاص۔ وہی دینی جوش۔ وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ۔ وہی نبض شناسی۔ وہی ہمت و عزم۔ غرض بجز محمد علی کی انگریزی انشاء پردازی کے اور سب کچھ وہی۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی نے راجا علی محمد خاں کی بھی تعریف کی ہے وہ تحریر فرماتے ہیں :-

"دسترخوان کی وسعت ہر مسلمان کے استقبال کو موجود۔ خزانہ کی تھیلیاں ہر کلمہ گو کے لئے کھلی ہوئی دولت کی تمنا تھی تو مسلمانوں پر زرپاشی کے لئے۔ اعزاز کی طلب تھی تو مسلمانوں کی نفع رسانی کی غرض سے۔ ایک فیض کا چشمہ تھا قوم کی سیرابی کے لئے۔ ایک کرم کا دریا تھا افراد قوم کی آبیاری کے لئے۔ ایک جود و عطا کا بادل تھا جو اُمنڈ اُمنڈ کر برسا اور اس طرح برسا کہ اپنے رقبہ حدود میں تشنہ لب نہ قوم کو چھوڑا نہ افراد قوم کو۔"

اس عبارت سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ راجا صاحب نہایت فیاض، سخی اور مسلمان دوست انسان تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا عبدالرحمن کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"وہ صحیح معنوں میں درویش تھے۔ گو کبھی اپنی درویشی کی نمائش نہیں کی۔ صبر و ضبط۔ فطرت ثانیہ بن گئے تھے۔ ماسوا سے بے تعلقی و بے نیازی رگ رگ کا جزو تھی۔ بڑی سے بڑی ترغیب نے بھی پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کی۔ بارہا بڑے بڑے کٹھن وقت پڑے اس کا پتہ خاص خاص دوستوں تک کو نہ چلنے دیا۔ کلکتہ کے زمانۂ قیام میں ایک مدت تک معاش کی یہ عسرت تھی کہ گویا نیم فاقہ کشی تھی۔ یہ سارا زمانہ ہنسی خوشی گذار دیا۔"

یہ سطور نہایت وضاحت کے ساتھ عبدالرحمن کے صبر و استقلال پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ مولانا عبدالماجد صاحب کو سیرت نگاری پر عبور حاصل تھا۔ دراصل انھوں نے ہمارے سامنے سیرت نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو مرقع نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ انھوں نے مختلف لوگوں کی شکل و صورت اس انداز سے بیان کی ہے کہ ان کا صحیح نقشہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گوشت پوست کے انسان ہمارے سامنے موجود ہیں۔ وہ تصدق احمد خاں شروانی کی شکل و شباہت یوں بیان کرتے ہیں۔

"علی گڑھ کے کھلنڈرے ایک سے بڑھ کر ایک

لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علی گڈھ کے گول کیپر پر جمی ہوئی ۔ ایک سرخ و سفید۔ قوی و تنومند۔ خوشرو نوجوان ۔ پہاڑ کی طرح اٹل اور چٹان کی طرح مضبوط معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری ہی کے فرائض کے لئے خلق ہوا ہے ۔ لکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ بپھر بپھر کر کیسے کیسے حملے کرتی ۔ اور ہر حملہ اسی گول کیپر کے تصدق میں ناکام ۔ بس یوں سمجھئے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں ۔ یہ تھا علی گڈھ کالج کا ہونہار نوجوان اور شروانی خاندان کا چشم و چراغ تصدق ۔"

اس بیان سے تصدق احمد خاں ہمارے نظروں کے سامنے اپنے خط و خال کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے موجود ہو جاتے ہیں ۔

مولانا صاحب نے اسی طرح کی مرقع نگاری مولانا عبدالماجد بدایونی کے سلسلہ میں بھی پیش کی ہے ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیے :۔

"تقریر با اور مؤثر تقریر ہر موضوع پر کر سکتے تھے سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے اور مجلس کو لٹا دیتے تھے لیکن اصلی ذوق اور فطری شوق کی چیز محفلِ میلاد تھی ۔ حبیب رب العالمین کا ذکر پاک کرنے کو اٹھتے تو آپے میں نہ رہتے ۔ کھڑے ہو کر بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے ۔ خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتیں اور خوش بیانی مست ہو ہو کر منھ چومتی ۔"

اس عبارت میں " بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے ۔" فقرے بھری پیکریت کی حسین مثالیں ہیں ۔ مولانا صاحب نے بدایونی صاحب کی گفتار کو بلبل سے اور ان کی حرکات کو شاخ گل سے تشبیہ دی ہے ۔ اس تشبیہ نے مرقع نگاری کو مکمل کر دیا ہے ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی جذبات نگاری میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ۔ وہ جذبات نگاری میں اس وجہ سے بھی کامیاب ہیں کیوں کہ وہ مرنے والوں کے عزیز واقارب کے جذبات کی عکاسی کر رہے ہیں ۔ جو بذات خود غم واندوہ کا جنازہ بنے ہوئے ہیں ۔ چنانچہ جب مرشد آباد پیلس کی کم سن لڑکی نوشابہ کا انتقال ہوا تو اس کی ماں کا حالِ زار مولانا صاحب نے یوں بیان کیا ہے ۔

"اور پردہ نشین غم زدہ ماں ! لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو رو بھی نہیں رہی ہیں ۔ محض سکتہ کا عالم طاری ہے ۔ بے شک آنسو سلب ہو گئے ہونگے ۔ لیکن کلیجے کی کھرچن کو کیا کر رہی ہونگی ۔ ہر لمحہ جو زبردست ہوک سینے میں اٹھتی ہو گی اس کا کیا علاج ہے ۔ پتھر کی نہیں آخر گوشت پوست ہی کی بنی ہوئی عاجز و ناتواں مخلوق ہیں ۔ آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو لٹتے ہوئے دیکھ کر خود زندہ کیسے رہیں؟

غم زدہ ماں کے دل کے اندوہ و ملال کی جو موجیں اٹھ رہی ہیں، ان کی صحیح مصوری مولانا عبدالماجد دریابادی

کے قلم نے کر دی ہے۔ ان کا یہ بیان جذبہ غم کی مکمل تصویر ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب کے یہ مرثیے گوناگوں دو قلموں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان مرثیوں میں فلسفۂ حیات بھی مضمر ہے مولانا صاحب کو حیات و کائنات کا وسیع تجربہ حاصل ہے چونکہ وہ ذکی و ذہین واقع ہوئے ہیں اسی لئے سطحِ گیتی کے واقعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اُنھوں نے "یادِ غم" میں ایک زبردست فلسفۂ حیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا۔ اسی وقت وہ بے حد غمگین تھے۔ مگر جوں جوں وقت کے جھونکے آگے بڑھتے گئے غم کی موجوں کو دُور فضاؤں میں بکھراتے گئے۔ رفتہ رفتہ مولانا صاحب کا غم گھٹ گیا۔ اب وہ ۱۹۲۶ء میں "یادِ غم" عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

"پہلے محض مٹی کے ڈھیر کا نظارہ دل کو بے قرار کر دیتا تھا۔ اب آنسو مدت ہوئی خشک ہو چکے غفلت انسان پر کس درجہ مسلط رہتی ہے۔ عبرت پذیری کی عمر کتنی مختصر ہوتی ہے۔ بڑے بڑے حادثے گزر جانے کے بعد یوں معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے کبھی گذرے ہی نہ تھے مرنا جیسے اوروں ہی کے لئے مقدر تھا۔ اور اپنے لئے تو صرف جیتے رہنا اور اسی طرح چلنا پھرنا۔ کھانا پینا پہننا اور کھیلنا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ وقت غم کو بھلا دیتا ہے۔ اور دل کے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ عرفیؔ نے کیا حسین شعر کہا ہے۔

گماں مبر کہ چو تو بگزری جہاں بگذشت
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست

مولانا عبدالماجد نے فلسفۂ موت پر بھی روشنی ڈالی ہے چونکہ ان مرثیوں کا تعلق موت ہی سے ہے، اس لئے فلسفۂ موت کے رموز و نکات کی وضاحت ضروری بھی ہے۔ مولانا صاحب سر سکندر حیات کی موت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"جاہ و حشم کی خوش تدبیری، طبیبوں کی حذاقت تیمارداروں کی دردمندی، اگر کہیں سپر بن سکتی تو ماضی میں سکندر یونانی اور حال میں سکندر پنجابی یقیناً موت کی گرفت سے باہر رہے ہوتے۔"

حقیقت یہ ہے کہ موت سے کسی کو نجات نہیں۔ "کل من علیھا فان" کی صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

مولانا صاحب نے حکیم عبدالحمید لکھنوی کی وفات کے سلسلہ میں بھی فلسفۂ موت پر روشنی ڈالی ہے۔

"مریضوں کے پھیرے گلی میں روز ہی لگتے رہے تھے اور یہی وقت لبی ہوتا تھا۔ آج کے مجمع کا رنگ سب دنوں سے الگ تھا۔ آج قدم اُٹھ رہے تھے افسردگی سے اور دل بیٹھ رہے تھے عبرت کی گرمیوں سے۔ آج نبض دکھانی نہ تھی۔ نسخہ لکھانا نہ تھا۔ خود حکیم صاحب کا جنازہ

پڑھتا تھا۔ قبر میں اتارنا تھا، اور وہ جو دوسروں کے جسم کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ خود اس کے جسم کو ایک گہرے گڑھے میں دفن کرنا۔ تربت پر فاتحہ پڑھنا ——— طبیب موت کے پنجہ میں۔ چارہ گر قضا کے شکنجہ میں۔ تقدیر سے تدبیر کی شکست کی بے شمار مثالوں میں لاتعداد نظیروں میں ایک اور اضافہ۔"

اس عبارت کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور عبرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ حکیم جو دوسروں کی زندگی کا ضامن تھا۔ آج خود اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور سعدی کا یہ شعر پڑھتا ہوا تربت کی طرف بڑھ رہا ہے ؎

دنیا زنے ست عشوہ دہ و دلستاں ولیک
باکس بسر نہ می برد او عہد شوہری

مولانا عبدالماجد دریابادی کے وہ بیانات بہت موثر ہیں جن میں انھوں نے مریض کی جان کنی کا عالم دکھایا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی ہمشیرہ کا انتقال ہو گیا۔ جو ان سے عمر میں چار یا پانچ سال بڑی تھیں۔ مولانا صاحب نے ان کے انتقال کا ذکر نہایت درد انگیز لہجہ میں کیا تھا۔ انھوں نے ان کے انتقال پر جو مضمون لکھا اس کا عنوان "ہمشیر کی رخصتی" ہے۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"دوپہر کے وقت تقدیر کا نوشتہ پورا ہوا۔ اور جو صابر و شاکر بندی۔ شاید جنت ہی کے لئے بنی تھی، جنت کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ عم نصیب ناکارہ سورۂ یٰسین سنا رہا تھا۔ اور ایک جوان صالح منہ میں آب زمزم ٹپک رہا تھا۔ گزرنے والی کی پیشانی پر پسینے کے قطرے دیکھے گئے اور کمرہ میں رونے کی بے اختیار آوازوں اور سسکیوں کے ساتھ کلمۂ شہادت کی صداؤں سے گونج اٹھا۔"

جانکنی کے عالم کی یہ مکمل اور موثر تصویر ہے۔ اسی قسم کی ایک اور تصویر ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا صاحب کی قریبی رشتے کی بھتیجی کا انتقال ہو گیا ہے جس کی شادی کو صرف دس گیارہ مہینے گذرے ہیں۔ اس کا عالم نزع انھوں نے "نئی نویلی" مضمون میں پیش کیا ہے۔

"موت کا وقت عجب پُر اثر پُر درد تھا۔ لکھنؤ کے ایک بڑے حاذق طبیب۔ بورڈ آف میڈیسن کے پرانے ممبر اور شفاء الملک کے خطاب سے سرفراز۔ جو اتفاق سے عزیز قریب بھی تھے ابھی ہاتھ نبض پر رکھے ہوئے ہیں۔ ابھی جواہر مہرہ حلق سے اتارنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی آنکھوں کی پتلیوں کا معائنہ کر رہے ہیں کہ زندگی کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں"۔۔۔۔

جسم رنجور۔ روح مسرور" اب کوئی نہیں پہچان پڑتا۔ مرنے والی نے ہراس واضطراب سے نہیں۔ سکون و اطمینان سے کہا۔ سکرات شروع ہو چکا تھا بصارت اپنا فعل چھوڑ چکی تھی۔ اور معاً زبان بھی بند ہو گئی۔ ہونٹ دوبار اللہ اللہ کہنے کے

لئے ہلے اور ایمان والی کی روح راضیۃ مرضیہ کی بشارت پر دوڑتی روانہ ہوگئی۔"

عالم نزع کی یہ تصویر کشی بھی نہایت جگر پاش ہے۔ مولانا صاحب نے جاں کنی کی مکمل کیفیت اس عبارت میں پیش کر دی ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب کے مرثیوں سے ایک اور نکتے پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ ایک بیدار مغز انسان معلوم ہوتے ہیں۔ جو حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہے۔ اگرچہ وہ کوئی سیاسی لیڈر نہیں ہیں۔ اس کے باوجود عالمی سیاست سے آگاہ ہیں۔ دنیا کے اندر جو انقلابات رونما ہوتے ہیں مولانا صاحب کی نظریں ان کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی پر جو لفظوں نے مرثیہ لکھا ہے، اس کے ایک پیراگراف میں سارے عالم کی سیاست ملفوف ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"پچھلے زمانہ میں ۱۵۔۲۰ سال کے اندر مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری۔ کیسے کیسے اکابر اٹھالئے گئے۔ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا پڑا۔ انگریزوں نے رنگیا۔ ہندوؤں نے دبایا۔ ترکوں پر اتحادیوں کا نرغہ ہوا۔ شریف نے بغاوت کی۔ مدینہ کی بستی تباہ ہوئی۔ مکہ لٹا۔ خلافت مٹی۔ افغانستان تہ و بالا ہوا۔ عراق میں خاک اڑی۔ مصر کا سردار اٹھ گیا۔ شام پر آسمان رویا۔ فلسطین میں زمین تھرائی۔"

اس مختصر پیراگراف کے کوزہ میں ایک وسیع و بسیط سمندر بند ہے۔ اس دور میں جتنے تغیرات پندرہ بیس سال کے اندر ہوئے، مولانا صاحب نے ان کا احاطہ کر لیا ہے۔

چونکہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو فلسفہ سے شغف ہے اور اسی موضوع پر وہ مکمل طور سے حاوی ہیں۔ اسی لئے ان کی تحریریں جا بجا منطقی دلائل بھی نظر آتے ہیں۔ جو ان کے بیانات کو مضبوط اور مستحکم بناتے ہیں مثلاً وہ مولانا محمد علی کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"بے شک محمد علی بہت بڑا ہندوستانی تھا۔ اسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا۔ لیکن اس کی ہندوستانیت بھی ماتحت تھی، اس کی اسلامیت کے "وہ خدا" اور "وطن" دونوں کا قائل نہ تھا۔ قائل صرف خدا کا تھا اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی بتائی ہے اس لئے وہ وطن کا خادم تھا"

اس عبارت میں مولانا صاحب نے ایک منطقی انداز میں مذہب اور سیاست کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے چونکہ مولانا محمد علی خدا کے قائل تھے، اس لئے خدا کی مخلوق کی خدمت ان پر فرض تھی اور چونکہ ہندوستان میں بھی خدا کی مخلوق آباد تھی، اس لئے ہندوستانیوں کی خدمت بھی ان کے فرائض میں داخل تھی یہ منطقی استدلال صرف مولانا عبدالماجد دریابادی کا حصہ ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مرثیے نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے اہم ہیں بلکہ اسلوب کے اعتبار سے بھی وہ اعلیٰ درجے کے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے مرثیوں میں موثر اسلوب اختیار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مرثیوں میں اثر نہ ہوگا تو وہ قارئین کے دل کو کس طرح پگھلائیں گے۔ مولانا صاحب نے اپنے مرثیوں میں تاثیر کی بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ وہ اپنے مرثیوں میں اثر پیدا کرنے کے لئے بعض وقت تخاطبی پہلو اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً مولانا شوکت علی کی موت پر ان کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔

"دیکھ اے شوکت ملت! کہ آج کتنی بیوائیں تیرے فراق میں بلک بلک کر رو رہی ہیں۔ کتنے بچے تیری یاد میں تڑپ رہے ہیں کتنے سفید ریش پیرمرد خود اپنے کو یتیم سمجھ رہے ہیں کتنے جوانان صالح روتے پیٹتے تیرا جنازہ کاندھوں پر اُٹھائے میلوں پیدل چل رہے ہیں ہزارہا ہزار کے اس مجمع سے دور ملک کے گوشہ گوشہ میں، شہر میں، قصبوں میں، دیہات میں، جہاں کہیں بھی ایک اللہ کے ماننے والے آباد ہیں۔ گھر گھر تیرا ماتم کس اخلاص و دردمندی کے ساتھ برپا ہے۔ کروروں کی آبادی کس دردِ دل کے ساتھ تیرا سوگ منا رہی ہے۔ کتنے ایسے جنھوں نے کبھی تیری شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ آج بھی اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ گویا خاص اُنھیں کا گھر بے چراغ ہوگیا ہے۔"

اس بیان میں زور تخاطبی لہجہ کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ماتم کا ایک سیلاب ہے جو چٹانوں کو توڑ کر آگے بڑھ رہا ہے۔

اسی قسم کا تخاطبی انداز اُنھوں نے عبدالرحمٰن کے مرثیے میں بھی اختیار کیا ہے۔ اس بیان کو پڑھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو چھلک اُٹھتے ہیں۔

"جس شخص کو تمھارے خلوص، تمہاری برگزیدگی، تمھارے ایمان پر اس درجہ اعتماد تھا، کیا خبر تھی کہ تم اس قدر جلد اس کو شکست کر دو گے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس بدنصیب کو آہ تمہاری تعزیت و ماتم میں اشکبار ہونا پڑے گا۔ بیوہ اور مصیبت زدہ ماں کے اکلوتے فرزند عبدالرحمٰن جس ماں نے اپنی بیوگی اور پھر کم سنی کی بیوگی، تمہیں کو دیکھ دیکھ کر پار کر دی اور جس نے اپنی ساری خوشیوں اور آرزوؤں حوصلوں اور ارمانوں کا مرکز تمھارے مکھڑے کو رکھا، آج اُس دُکھیاری کے کلیجے کے ٹکڑے کس طرح کٹ کٹ کر اس کی آنکھوں سے بہ رہے ہیں کیا یہ حسرت وہ اپنے ساتھ قبر ہی میں لے جائے گی۔ کہ ایک بار تم اپنے ہاتھ سے آنسو آکر پونچھ دو۔ نوجوانی میں ایک عصمت مآب پردہ نشین کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی

کردینے والے عبدالرحمٰن! جس دُلاروں کی پالی کو تم اس کے وطن سے بے وطن کرکے، اس کے ماں باپ سے چھڑا کر اس کے بچپن کی سہیلیوں سے جدا کرکے اس کا ڈولا بڑے شوق وارمان سے اپنے ہاں لائے تھے، جس کا لباس عروسی ابھی میلا نہیں ہونے پایا تھا، اور جس حسرت نصیب کو آخری وقت میں تمھاری خدمت کا موقع بھی نہ مل سکا۔ آہ آج اس کے دل پر کیا گذر رہی ہے؟"

اس عبارت کا ایک ایک لفظ تیر و خدنگ کی طرح دل میں چبھ رہا ہے۔ اس اندازِ بیان میں تلوار کی کاٹ موجود ہے جس سے دل کے ہزاروں ٹکڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ سچ مچ مرثیہ ہے۔

تاثیر و خلوص پیدا کرنے کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے تخاطبی لہجہ کے علاوہ استفہامیہ لہجہ بھی کہیں کہیں اختیار کیا ہے جس کی بنا پر ان کے بیان میں بجلی کی تڑپ سما گئی ہے۔ وہ تصدق احمد خاں شیروانی کی موت پر لکھتے ہیں: —

"مرنے والا مر چکا۔ جینے والے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحان میں ثابت قدم نکلیں گے؟ ماں باپ نے تعلیم میں ہزارہا روپے بیدریغ اسی دن کے واسطے اٹھائے تھے؟ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے؟ ولایت اسی خاطر گئے تھے؟ ..... کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے اور یونہی ساری عمر بسر کر دینی تھی؟"

یہاں سوالیہ انداز نے عبارت میں جوش، زور اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ تاثیر پیدا کرنے کے گُر سے مولانا صاحب بخوبی واقف ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تحریر میں تاثیر پیدا کرنے کا ایک اور ذریعہ استعمال کیا ہے۔ وہ کبھی کبھی تضاد سے کام لیتے ہیں۔ میر انیس نے بھی اپنے مرثیوں میں بعض اوقات تضاد سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اپنے بعض مرثیوں میں صبح کا حسین منظر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس حسین منظر میں اہلِ بیت شہادت کی تیاری کر رہے ہیں۔ مولانا عبدالماجد نے بھی تضاد کے ذریعہ اپنے بیان میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً وہ مولانا محمد علی کی موت کے سانحے پر لکھتے ہیں: —

"شب برات ایک خیر و برکت والی رات ہے کسے خبر تھی کہ یہ شب شبِ قیامت بھی بن سکتی ہے مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اسی رات کو ان کا نصیبہ سُلا دیا جائے گا۔ زندگیاں مانگتے ہیں صحتوں کے لئے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اسی وقت وہ اٹھا لیا جائے گا جس کے وجود سے ملتِ اسلامیہ کا وجود تھا۔"

مولانا صاحب نے اس عبارت میں تضاد سے کام لیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ شب برات کے موقع پر لوگ جاگتے ہیں مگر اسی مبارک رات میں مولانا محمد علی سو گئے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی تضاد کے ساتھ ہی مقابلہ کا حربہ بھی استعمال کرتے ہیں اور اس طرح اپنی

عبارت میں زور پیدا کرتے ہیں۔ ان کا یہ حربہ بھی کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی کے مرثیہ میں انھوں نے ایک جگہ مقابلہ کی صنعت کا استعمال کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی
خبر رکھنے والے مالک! انصاف کر کہ تیرے حبیب و
محبوب کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر
جب فاروقؓ پُر جلالت کا قلب تاب نہ لا سکا
تو تیرے حبیب پاکؐ کے ہم نام غلام کے غم مفارقت
میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں
ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے؟"

اُنھوں نے بتایا ہے کہ اس سے قبل رسول اکرم کی وفات پر حضرت عمرؓ تڑپ اُٹھے تھے، اس لئے مولانا محمد علی کی موت پر اگر ہم مسلمان تڑپ اُٹھیں تو حیرت کی کیا بات ہے؟

مولانا عبدالماجد صاحب نے اپنے بعض مرثیوں میں انشا پردازی کے بھی اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں اگرچہ اُنھوں نے زیادہ تر مذہبی ادب کی تخلیق کی ہے جس میں انشا پردازی کی گنجائش کم ہے مگر جہاں اُنھوں نے دنیاوی ادب پر قلم اُٹھایا ہے وہاں انشا پردازی کے جوہر دکھلائے ہیں وہ عبدالرحمن کا مرثیہ اس عبارت سے شروع کرتے ہیں۔

"پہاڑ اور پہاڑوں غاروں میں پتھر کے ٹکڑوں اور سنگ ریزوں کی تعداد حد شمار سے خارج پڑی ہوتی ہے۔ جنھیں انسان اور جانور ہر وقت پامال کرتے رہتے ہیں لیکن اُنھیں میں کوئی سنگ ریزہ لعل و یاقوت بن کر نکلتا ہے جس کی قیمت ساری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ اس کو کوئی اگر توڑ ڈالے تو کیا گزر جائے گی۔ سمندر میں بارش کے بے شمار قطرے ہر سال گرتے رہتے ہیں جو کسی حساب میں نہیں آتے لیکن اُنھیں میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوش صدف میں پل کر موتی بن کر نکلتے ہیں اور تاج سلطان کا زیور بنتے ہیں ان کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیوں کر صبر آئے گا۔ جنگل میں خودرو پھول اور پتے، درخت اور پودے، بوٹیاں اور پتیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں لیکن گلاب کی تازہ اور شاداب کلی بزم ہستی کو معطر کرنے کے لئے ہوتی ہے یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں کی دست برد کی نذر ہو جائے تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا اور قابو میں رکھا جا سکتا ہے؟"

اس عبارت میں حسن و جمال کی موجیں رقص نظر آتی ہیں۔ اس کو پڑھنے سے ہم پر سرور کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انشا پردا کے لحاظ سے مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ ع مولانا ابوالکلام آزاد کی سرحد میں داخل ہو جا ہے۔۔۔۔

مولانا عبدالماجد صاحب کے مرثیوں میں کہیں منظر نگاری کے بھی اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں ں نے "یادِ غم" میں ایک جگہ منظر کشی سے کام لیا س منظر کشی میں صداقت و اصلیت موجود ہے کیونکہ ظر کا انحصار ان کے مشاہدہ پر ہے۔ ان کی عبارت لاحظہ ہو۔

"مزار کے پائنتی ایک نیم کا درخت ہے۔ ہر سال اپنے موسم میں نئے پھول لاتا ہے نئے سرے سے سرسبز شاداب ہو جاتا ہے۔ اب کی بھی اس وقت اس پر بہار ہے۔ ابھی کل تک کیسا سوکھا بے رونق ٹھونٹھ ایسا کھڑا تھا۔ آج کیسا گلزار ہے۔ کیا مہک دے رہا ہے نرم نرم ہلکی ہلکی پتیاں کیسی آنکھوں میں کھبی جا رہی ہیں سفید سفید پھول کیسے خوش نما کھلے ہوئے ہیں۔"

نیم کے درخت کی بہار اور اس کی ہری اور نرم پتیوں کی شادابی کا یہ ایک حسین منظر ہے ، ادبی مصور کے قلم کار ہینِ منت ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب کے مرثیوں میں تلمیحات ستعمال ہوا ہے۔ تلمیحات میں ادیب اشاروں الیتا ہے اور مبہم انداز میں گزشتہ مشہور ر ت کا ذکر ہوتا ہے۔ مولانا صاحب نے مولانا ں کے مرثیہ میں تلمیحات کا استعمال کیا ہے:۔

"جس نے دعویٰ محبت کا کیا اس کا امتحان ی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی آرے سے چروایا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی، کسی کے خاک و خون میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشہ دکھایا گیا۔ کسی کو جلا وطنی نصیب ہوئی۔ کسی کا جسم کوڑوں سے لہو لہان کر دیا گیا۔"

ان لطیف اشاروں سے ان کی عبارت کا حسن بڑھ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے اصل بیان میں زور بھی پیدا ہو گیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اہلِ محبت کو ہمیشہ امتحان کی منزل سے گزرنا ہوتا ہے۔ اسلئے مولانا محمد علی کو بھی امتحان کا مرحلہ پیش آیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی عبارت میں زور اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے مصرعوں اور شعروں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ مگر ان کے اشعار اور ان کی عبارت میں کسی قسم کا خلا نہیں واقع ہوتا ہے بلکہ عبارت شعر سے چسپاں نظر آتی ہے۔ اس وجہ سے اصل عبارت کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ سر سکندر حیات کے مرثیے میں دیکھتے ہیں:۔

"روح عرفانی لطافتوں کے پانی سے دھل کر اور نکھر کر ان آلائشوں سے پاک ہوئی اور ان قیدوں سے آزاد، ایمان کے بازوؤں سے چڑھی اور یقین و اعتماد کے پروں سے عالمِ بالا کی سمت بلند ہوئی۔ ہزارہا دل والوں کی دلی دعاؤں کے ساتھ، ہزارہا آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ع

تا نہ پنداری کہ تنہا می روی"

شیخ سعدی کا یہ مصرع اوپر کی عبارت سے کس قدر

چھپا ہے۔ یہ سکندر حیات تنہا عالم بالا کی طرف نہیں جا رہے ہیں بلکہ ان کے ساتھ دعائیں اور آنسو بھی ہیں۔

اسی طرح مولانا شوکت علی کے مرثیے میں انھوں نے ایک مصرع نہایت برجستگی کے ساتھ استعمال کیا ہے:

"محض جیل جانے والے، بلکہ تختۂ دار پر چڑھ جانیوالے اب بھی یقیناً بہت سے پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کے فروغ و برتری کے لئے، دین الٰہی کی نصرت کے لئے، اپنا کاروبار مٹا دینے والا۔ اپنے جاہ و مال دونوں کو ذبح کر ڈالنے والا، اپنے سینے کو گولیاں کھانے کے لئے پیش کر دینے والا اب کون اٹھے گا
وہ بات کہاں کی گئی کہاں کے ساتھ"

عبدالرحمٰن کی موت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ ہم سب اسی کے ہیں اور سب اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔"

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد انا الیہ راجعون

بہرحال مولانا صاحب مصرعوں اور شعروں کا استعمال بہت برمحل کرتے ہیں۔ ان اشعار کی وجہ سے ان کی نثر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جا بجا عربی کے فقرے استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ وہ عربی زبان و ادب کے فاضل ہیں اسلئے عربی کے فقروں کا استعمال ان کے لئے فطری ہے۔ مگر یہ عربی کے فقرے اُردو کی عبارت میں بوجھل ثابت نہیں ہوتے ہیں بلکہ مفہوم کی وضاحت میں مدد دیتے ہیں۔ وہ تصدق احمد خاں شروانی کے مرثیے میں لکھتے ہیں:۔

"قوم کے سرداروں کا حکم ہوا کہ پریکٹس چھوڑ دو۔ بڑھتی ہوئی آمدنی سے سوالات ترک کرو، جو اس حکم کے آگے سب سے پہلے جھکے "ان السابقون الاولون" میں ایک یہ بھی تھے۔"

اسی طرح عبدالرحمٰن کے مرثیے میں لکھتے ہیں:۔

"اس کی عظمت و کبریائی کا صدقہ کہ لھم ما یشآءُ ون عند ربھم کے مرتبہ پر فائز ہو کر اور رضا ضیہ مرضیہ کے خلعت سے سرفراز ہو کر اور لھم ما یشآءُ ون فیھا و لدینا مزید کے انعامات سے مالا مال ہو کر اپنے گنہگار اور بدنصیب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔"

راجہ علی محمد خاں کی موت پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"جس حکمت کاملہ نے عالم کے سرور و سردار کو مخاطب کر کے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ کی منادی کر دی، اس کی مشیت کے آگے ظاہر ہے محمد علی کی ہستی اور علی محمد کی بساط ہی کیا ہو سکتی تھی۔"

ان عربی کے فقروں سے اُردو عبارت میں زور پیدا ہو گیا ہے۔ اور مفہوم کی وضاحت میں بھی مدد ملی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کا اسلوب بعض

...مات پر بالکل بے تکلفی اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے موقع ...وہ قواعد یا الفاظ کی ترتیب کا خیال نہیں رکھتے تھے ...بڑی حد تک تعقیب رونما ہو جاتی ہے۔ اس کے ...وجود عبارت میں نقص نہیں پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ...بے تکلف انداز کلام معلوم ہوتا ہے" خوش نصیب ...ال کبیر" کا مرثیہ یوں شروع ہوتا ہے :

"تاریخ اور مہینہ تو بھلا اب کسے یاد"!

...ہی نہیں کہ اس فقرے میں الفاظ بے ترتیب ...ہیں بلکہ اس میں فعل ناقص بھی غائب ہے مگر یہ ...بے ترتیبی اور بے ربطی اس موقع پر حسن پیدا کر رہی ہے مولانا صاحب کی بے تکلفی کے انداز میں لفظ "تو" بار بار آتا ہے جو عبارت میں لطف پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک ...ال کے مرثیے میں لکھتے ہیں۔ "کل دن میں جاکر نزع کی حالت میں آب زمزم بھی تو پلایا تھا"۔ اسی طرح وہ ...ی نویلی" مرثیے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"شادی کو پورا سال بھی ابھی کہاں گزرا۔
دس ہی گیارہ مہینے تو ہوئے"!

"یہاں تو" کا لفظ لطف دے رہا ہے۔

غرضیکہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے مرثیے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں۔ سب سے نمایاں خصوصیت ان مرثیوں کی یہ ہے کہ ان میں رثائی کیفیات بھرپور طریقے سے موجود ہیں اور یہی عناصر ان مرثیوں کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مرثیے انشا پردازی کے بھی اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں منظر نگاری بھی اپنی ساری رعنائی اور دلربائی کے ساتھ موجود ہے۔

بہرحال مولانا عبدالماجد صاحب نے نثر میں بہت کامیاب مرثیے لکھے ہیں جن کو ہم اردو کے ادب العالیہ میں اعلیٰ مقام دے سکتے ہیں۔

معین الدین حسن صاحب

بقیہ مضمون صفحہ ۱۸۱

پہونچاتے خود اپنے انجام کا بھی خیال آگیا۔
اٹھتے تھے شیطان پردہ کی دلالی کرنے، رخ
خود بخود خانقاہ کی جانب پھر گیا"۔

اعجاز بیان کا کمال دیکھئے کہ ایک رنگین عیش و تعیش سے بھرپور داستان میں بھی اخلاق و اخلاقیات کا پیغام دے رہے ہیں اور یہی مولانا ماجد کی خصوصیت ہے کہ وہ چاہے عجیب سے عجیب تر کوائف و واقعات ہوں "سچی باتوں" کے پیرایے میں۔ چاہے تنقید ہو۔ کسی کتاب پر تبصرہ ہو، تقریر ہو، کوئی موضوع ہو مولانا کی پُر سلیقہ، نکھری ستھری پر متانت تحریریں نہ صرف اچھا ادیب بنا سکتی ہیں بلکہ اچھا انسان بھی اور اس ادیب کامل کہ جو ادب آموز بھی اور بصیرت افروز بھی جو دماغ کو تو روشن کرے ہی لیکن دل میں بھی سوز ایمان کی حرارت پیدا کر دے بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم سے آئے اور شہر کے خوگر کو وسعت صحرا عطا کر دے۔ وہ ادب جو روح کو تڑپائے۔ دل کو گرمائے اور دماغ کو اپنی منطق و استدلال کی صلاحیت عطا کرے اسے حقائق کے عرفان کی توفیق عطا کرے۔ یہ تمام خوبیاں مولانا کے بے شمار تصانیف میں موتی کی طرح بکھری پڑی ہیں اور آنے والی نسلوں کے تہذیب کردار اور تہذیب نفس کے لئے سامان مہیا کر رہی ہیں۔

زمانۂ حاضر کا انسان

تضمین بر پیغام حکیم مشرق علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ

(از ضیا رہانی)

اس کی تحقیق کی گو تیز ہوئی ہے رفتار		وہ بلندی پہ سمجھتا ہے خرد کا معیار
اس کو یہ زعم کہ ہے واقفِ کانِ اسرار		عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار
عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا

ارض سے اس نے خلاؤں کو تو تسخیر کیا!		مصنوعی چاند میں انسان سفر کرنے لگا
منزلِ چاند پہ رکھا ہی قدم اس نے ضیاؔ		ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنے ایوانِ تصور کو سجایا ایسا!		اپنے افکار و خیالات میں ڈوبا ایسا
اپنی دانش سے تباہی کو بلایا ایسا!		اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سیاروں کی دنیا سے خبردار کیا!		جس نے اونچا خرد و عقل کا معیار کیا
جس نے دشوار ہر اک راہ کو ہموار کیا!		جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

پروفیسر عبدالاحد خاں صاحب خلیل (لکھنؤ)

عبدالماجد کی صدق گفتاری

صدق گفتاری ایک ایسی نعمت اور سعادت ہے کہ بغیر توفیقِ الٰہی کسی کو حاصل نہیں ہوا کرتی۔ بالخصوص جب صدق گفتاری، صدق نگاری کی صورت اختیار کرے تو مسئلہ اور بھی مشکل اور راستہ اور بھی دشوار ہو جاتا ہے، نوشتہ بمانَد سیہ بر سفید، اور کسی وقت بھی گفت و شنید کا موضوع اور بازپرس و مواخذہ کا سامان بن سکتا ہے۔

راستی کو موجبِ رضائے خدا کہا گیا ہے لیکن جب یہ حق گوئی و رضاجوئی کسی فرد یا جماعت کے لئے دل پذیر اور حسبِ دلخواہ نہ ہو تو صورتِ حال بہت پیچیدہ اور خطرناک ہو جاتی ہے۔ اور سیدھی سادی صاف ستھری اور مخلصانہ باتوں کو بھی طرح طرح کے معنی پہنا دیئے جاتے ہیں۔ بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور شبہات و شکوک کے لامتناہی مواقع نکل آتے ہیں۔

ایسی صورت میں قلبِ مومن کو تسکینِ خاطر و اطمینانِ دل صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ اس کی نیت بخیر ہے۔ اور اس کو یقینِ کامل ہے کہ شورشِ اغیار و فتنہ پردازیِ لیل و نہار اس کو کوئی گزند نہیں پہونچا سکتی۔ سانچ کو آنچ نہیں، اور جس کا حساب صاف ہے اسکو محاسبہ سے کسی وقت بھی کوئی خوف نہیں ہو سکتا۔

مولانا عبدالماجد کی صدق گفتاری اور صدق نگاری کا بھی یہی عالم ہے۔ اگرچہ وہ سچی باتیں، سپردِ قلم کرکے بعض اوقات کچھ لوگوں کے لئے تلخی کا کام و دہن کی آزمائش کا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کچھ افراد جھلا بھی اٹھتے ہیں۔ لیکن نیت بخیر ہونے کی وجہ سے ان کو کبھی نادم یا منفعل ہونے پر مجبور ہونا نہیں پڑتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کی رنجش بیجا کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے ناکردہ گناہوں کو بھی اپنی خطاؤں کی فہرست میں شامل کر لینے پر آمادہ ہو جائیں۔ اور کسی کی دل آزاری یا رعنائی خیال کی کوتاہی

کو مناسب نہ سمجھیں۔

مرزا غالب کو بھی ایک موقع پر ایسی ہی صورت حال پیش آئی تھی کہ جب انھیں از راہ امتثال امر ایک سہرا لکھنا پڑا تھا۔ اور پھر گذارش احوال واقعی میں کہنا پڑا تھا۔

آزردہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب گواہ خدا
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھی جھوٹ کی عادت نہیں ہے۔ اور ان کا قلم ہمیشہ ان کی ضمیر کی آواز اور الہامی صداقتوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے بطور رہنما اصول کے اپنے ہفتہ وار انگریزی جریدہ "کامریڈ" کے صفحہ اول پر ایک انگریزی شاعر کا یہ مقولہ لکھ رکھا تھا۔

Stand upright, speak thy thought, declare.
The Tru thou hast, That all may share,
Be bold. proclaim it everywhere.
They only live who dare.

یعنی راست اندام کھڑے ہو۔ اپنے خیالات کو کہہ ڈالو۔ اس صداقت کا اعلان عام کر دو جو تمھارے پاس ہے تاکہ سب اس سے مستفیض ہو سکیں جرأت سے کام لو۔ اور ہر قدم پر امر بالمعروف کا اعلان کرتے رہو۔ صرف وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو باہمت اور صدق گفتار ہوتے ہیں۔

یہی جرأت و بے باکی صداقت راست گفتاری بصورت اعلاء کلمۃ الحق جو مولانا محمد علی کے جوہر تھے۔

مولانا عبدالماجد کی صحافت و انشاء، تصنیف و تالیف، تنقید و تفسیر کے یہی رہنما اصول ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے اور ان بفضلہ دوسری چہل سالہ منزل کی تکمیل کی طرف گامزن ہیں۔ ادام اللہ ظلہ العالی۔ ان کی ابتدائی تعلیم زمانہ کے مروج انداز میں گھر ہی پر ہوئی اور ثانوی تعلیم سیتاپور کے اسکول میں۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں کیننگ کالج (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی) سے بی اے کیا اور خدمت خلق و تنقید روزگار کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔

مضمون نگاری کا سلسلہ اودھ اخبار لکھنؤ. وکیل اور پیسہ اخبار، لاہور سے شروع ہوا۔ اور الناظر، لکھنؤ ادیب، الہ آباد۔ افادہ، آگرہ، کانفرنس گزٹ، علی ذخیرہ، حیدرآباد، ہمدرد (دہلی)، اور متعدد انگریزی ماہنامو پہونچا۔ اب یہ سلسلہ صدق جدید کی بدولت قائم ہے ادبی دنیا میں غیر معمولی مقبولیت و شہرت کا حامل

مولانا عبدالماجد نے تقریباً نصف صدی پہلے کیا کہ سچ، جو کسی طرح نو ڈالی جائے۔ اور اس مکرر آئج الوقت بنایا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں نے سچ کے نام سے ایک دینی اور اصلاحی ہفتہ کی ادارت کا کام سنبھالا۔ اس کے پروان چڑھ ان کے شعور کی بیداری، فطری دینداری اور صلح پسندی، تینوں برابر کی شریک تھیں یہ اخبار ۱۹۲۸ء تک سات سال جاری رہا تقریباً دو سال کے بعد ۱۹۳۲ء میں انھوں نے "صدق" کے نام اسی کوشش کو دوبارہ لکھنؤ سے شروع کیا صدق پہلے وہ روزہ تھا، پھر ہفتہ وار ہو گیا۔ "کی سچی باتوں" اور تنقیدی نوٹوں نے ہر شخص کو طرف متوجہ کر لیا۔ ان میں جدید فتنوں اور آ

کی خامیوں کے تذکرے بھی ہوتے تھے اور ان فرکرتہ چینیاں بھی "سچ" اور "صدق" میں شائع ہونے والی "سچی باتوں" کا ایک مجموعہ "سچی باتیں" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکا ہے۔

سچ بولنے اور ضمیر کی آواز کو کاغذ پر قلمبند کرنے میں جو مشکلات ہوتے ہیں انہی کی بنا پر مولانا کو مجبور ہو کر ۱۹۵۰ء میں یہ اخبار بند کرنا پڑا لیکن چند ماہ کے اندر ہی "صدق جدید" کے نام سے یہ سلسلہ پھر شروع کر دیا گیا اور الحمد للہ اب تک جاری ہے۔ بقول حکیم عبد القوی دریا بادی "مولانا عبد الماجد اخبار صدق جدید لکھنؤ کے مدیر کی حیثیت سے ہندوستان پاکستان دونوں میں نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ سچی باتیں اور نوٹ دونوں ملکوں کے اخبار کثرت سے نقل کرتے ہیں۔ اس اخبار میں مولانا کے قلم سے کتب و رسائل پر تنقیدیں بھی وقتاً فوقتاً نکلتی رہتی ہیں جو اعلیٰ تنقید اور انشاء ماجد کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں"
(نقوش لاہور شخصیات نمبر ۱۹۵۵ء)

مولانا عبد الماجد نے اپنی علمی اور ادبی، سیاسی اور نفسیاتی، مذہبی اور اخلاقی زندگی کی تہذیب اور تربیت میں جن بزرگوں اور مشاہیر کی صحبت اور ارتباط سے فیض اٹھایا، ان میں مولانا شبلی نعمانی، عبد الحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، مولانا محمد علی جوہر، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، سید سلیمان ندوی، مولوی عبد السلام ندوی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مہدی افادی، مولوی عبد الحق، مسز اینی بیسنٹ، مہاتما گاندھی، مولانا ابو الکلام آزاد شامل ہیں علاوہ ازیں مولانا کے ذہن رسا اور فکر بلیغ نے غیر معمولی طور پر مولانا روم اور امام غزالی کے اجتہاد اور صاحب نظامی سے اکتساب فیض کیا ہے اور اب اس مقام پر پہنچ گئے کہ ان کا قلم اہل بصیرت کو مکرر صلائے عام دے رہا ہے کہ میری باتیں سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو۔

مولانا عبد الماجد کے طرز انشاء کے ارتقا کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ ابتدا میں انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کا تتبع کیا۔ پھر انگریزی انشا پردازوں کی شیوا بیانی اور تاثیر سے اپنی عبارت کو اور اشارت کو آراستہ کیا۔ اور طنز و مزاح کو نمک خوان تکلم بنایا رفتہ رفتہ صورت حال یہ ہوئی کہ ایک صاحب طرز انشا پرداز بن کر دنیائے ادب کے سامنے آئے اور اب باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ زور بیان و جوش اظہار کے ساتھ ساتھ مرصع نگاری و ندرت استدلال، سادگی و بے ساختگی، رنگینی و احساس و تاثیر، مصوری جذبات و دلکشی، متانت و شگفتگی، لطافت و شائستگی، دل آویزی و معنویت، دل گدازی و بیت و اشاریت، حسن آفرینی و لطافت، کج ادائی و اجتہاد تجر علمی و شائستگیت، صداقت و انفرادیت ان کے طرز تحریر کی خصوصیات ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ مولانا کی طرز انشاء اور ادبیات عالیہ کے نمونے پیش کئے جا سکیں لیکن پھر بھی عید الاضحیٰ کے موقع پر فروری ۱۹۶۹ء میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر شدہ ایک مختصر تقریر کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"پھر دن چڑھا اور نمازیوں کی ٹولیاں
صاف ستھرا نفیس لباس پہنے عیدگاہ اور
مسجدوں کی طرف چل پڑیں۔ بوڑھے اور
بچے سب ساتھ ہیں اللہ اکبر اللہ اکبر
لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر اللہ اکبر
و للہ الحمد کے زمزموں اور نغموں
سے راستے بھی گونج رہے ہیں اور مسجدوں
کے در و دیوار بھی ...... کیا دھن ہے
اور کیا مستی ہے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی

نعرہ خدا پرستی ہے ۔۔۔۔۔۔ مسلمان ہے
تین دنوں میں گوشت جتنا کھائے گا
اس سے بڑھ کر دوسروں کو کھلائے گا
اور غریبوں اور مفلسوں کو بھی امیروں
رئیسوں کے دسترخوان کا مزہ ایک
بار تو حاصل ہو ہی جائے گا۔"

مولانا کے قلم نے ہمیشہ صاف نگاری سے کام لیا ہے اور یہی طریق کار ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ کالج کے زمانۂ طالب علمی میں جب ان پر فلسفیت کا غلبہ ہوا تو فلسفیانہ مضامین میں وہ سب تاثرات و اندیشہ ہائے دور و دراز ہو بہو ظاہر ہو گئے اور جب ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۹ء تک دس سال الحاد و غفلت نے زور باندھا تو اس عہد کی نگارشات و تصنیفات میں اس کی ترجمانی ہو گئی۔ پھر "ہر بار اگر توبہ شکستی باز آ" کی آواز پر جب مذہبیات و الٰہیات کی طرف ان کی بازگشت ہوئی تو یہ سب کیفیتیں تصوف، اسلام و تفسیر ماجدی، نیز دیگر مذہبی و تحقیقی رسائل میں جلوہ پذیر ہو گئیں۔

مولانا صدق گفتار ہیں، ایک اصولدار ہیں، استقامت، استقلال اور وضعداری ہے۔ نوجوان کی قوت ایمانی، راسخ الاعتقادی اور غیرت لازوال عزم کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے "غذائے انسانی" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون اپنے زمانۂ طالب علمی میں آریہ سماجیوں کے رد میں لکھا تھا جس میں گوشت کو انسان کی فطری غذا ثابت کیا گیا تھا۔ آج بھی اس دور "ترکاریت" میں جب موقع ملتا ہے مولانا اپنے اس نظریے کی تائید میں برابر نوٹ لکھتے رہتے ہیں، جو بالعموم برادران وطن کی مذہبی کتابوں، قابل اعتماد اشخاص کے اقوال یا غیر ملکی رسائل سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ مولانا جو قدم اٹھاتے ہیں یا جو تحریک شروع کرتے ہیں اس کو تکمیل تک پہونچانے میں پوری تن دہی اور حکمت عملی سے کام لیتے ہیں۔ اور منزل مقصود پر پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور ایک واقعہ بیان کرتے ہیں (نقوش، لاہور، شخصیات نمبر بعنوان رشید احمد صدیقی) کہ ان کی سفارش پر پروفیسر رشید احمد صدیقی، صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سجاد انصاری کی کتاب "محشر خیال" ایم۔ اے، اردو کے نصاب میں داخل کر لی۔ نصاب پر اتفاق سے مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر پڑ گئی۔ "مجتبیں ہیں رعنائی خیال" کو گھناؤنا ٹھہرانے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ انھوں نے رشید صاحب کو خط لکھا کہ یہ کتاب ... خدا اور مذہب کی توہین ... ہیں، ہرگز مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں نہ رکھنی چاہئے۔ رشید صاحب نے مولانا کا خط مجھے دکھایا اور خاموش ہو رہے۔ مولانا نے صدق میں مضامین لکھنے شروع کئے ... آخر مولانا نے صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو توجہ دلائی جو دینیات کی کمیٹی کے صدر تھے۔ انھوں نے وائس چانسلر اے بی اے حلیم کو ایک خط لکھا، اور اس کتاب کے نصاب سے خارج کئے جانے پر زور دیا۔ حلیم صاحب نے شعبۂ اردو کا جلسہ بلایا اور مشورہ دیا کہ کتاب نصاب سے خارج کر دی جائے۔ بالآخر مولانا عبدالماجد کی بات مان لی گئی اور "محشر خیال" نصاب سے خارج کر دی گئی۔

مولانا عبدالماجد کو ریاضیات سے بھی دلچسپی ہے اور فلکیات سے بھی۔ نفسیات سے بھی لگاؤ ہے اور اجتماعیات سے بھی۔ تجلیات سے بھی واسطہ ہے اور روحانیات سے بھی۔ تصوف سے بھی علاقہ ہے اور حکمت سے بھی۔ منطق سے بھی رابطہ ہے اور الٰہیات سے بھی۔ سیاست سے بھی تعلق ہے اور ادب سے بھی۔ درباروں سے بھی،

...ہے۔ اور خانقاہوں سے بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے
...انی رجحانات اور خاندانی معمولات، زندگی کے تجربات
...اور قدیم شریفانہ روایات ان کے انداز حیات کے دوام
...کے ضامن ہیں اور ان کے نزدیک قوس و قزح
...کی رنگینیاں اور کہکشاں کی نظر فریبیاں پیدا کر دیتی ہیں
مولانا کی سچی باتیں، بالخصوص اردو، مسلم یونیورسٹی
سیکولرزم، اقلیتیں، تعلیمات دین، احتساب نفس، تزکیہ
...ن پر مشتمل ہوتی ہیں۔ وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے ہیں
...کسی کی خوشامد کرتے ہیں۔ نہ کسی سے کوئی توقع رکھتے
...ہیں نہ کسی کی شکایت کرتے ہیں۔ فقر و درویشی، گوشہ
...نشینی اور مطالعہ کتب ان کا دلپسند مشغلہ ہے اور
...گوشہ نشینی کا نتیجہ بہرحال خویشتن اندازی کا طریقِ حیات
...طرز زندگی ہے۔ ان کا پیغام ہے کہ "جب موقع ملے اپنے
...اندرون کا جائزہ بار بار لیجئے۔ اور احتساب نفس
...پوری بے مروتی کے ساتھ کیجئے۔ بار بار کرتے
...رہئے جب شاید کہ نفس کی کج روی کچھ قابو میں آئے۔"

مولانا عبدالماجد، صدق جدید کے اداریے
...ٹوں یعنی سچی باتوں، میں برابر مسلمانوں کو بہت مخلصانہ
...انداز میں تنبیہ و تہدید کرتے رہتے ہیں۔ اور تعلیمات اسلامی
...کے وہ نکتے بیان کرتے ہیں کہ جو دوسرے فلسفیوں اور
...فلسفیوں کے بیان کردہ مسائل سے بہت مختلف ہوتے
...ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ "انضمام مذاہب وادغام ادیان
...کی تبلیغ و کوشش غلط ہے اس طریق کار و انداز استدلال
...سے قومی یک جہتی اور میل ملاپ حاصل نہیں ہو سکتا
...میل جیسا ایک دوسرے کے عقائد و جذبات مذہبی کا
...احترام ہے کثرت نہیں اور وحدت اور یگانگت میں یکجہتی
...پیدا کرنا، زندہ رہو اور زندہ رہنے دو، کے اصول انسانی
...میں مدد دے سکتا ہے۔ مولانا کو شکوہ ہے کہ قرآن کی
...تعلیم سے ہم لوگ کوسوں دور ہیں۔ ورنہ اس کتاب

لاریب فیہ، میں مسلمانوں کے خوف و حزن کا علاج
بھی موجود ہے اور ان کی "بدحالی و شکستہ پائی" کا تدارک
اور مداوا بھی۔

مولانا عبدالماجد شاعروں اور قصہ گویوں کی لفاظیوں
کے خلاف بھی برابر آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے
کہ ہمارے شعراء بہ استثنائے چند شہدوں کی بولی بولتے
ہیں۔ شراب خوری کی دل کھول کر ترغیب دیتے ہیں۔
عشق بازی کا شوق دلاتے ہیں اور فرشتوں، انبیاء
حتیٰ کہ خدا کی شان میں بھی گستاخانہ بے احتیاطیوں سے
کام لیتے ہیں۔ ملت کے مزاج فاسد کی اصلاح کے لئے
وہ اسلامی قدروں کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں
شاعرانہ ہرزہ سرائیوں نیز شاعروں کو درجہ اسفل میں
جگہ دینے کے قائل ہیں۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی
کے رسالہ کلیم دہلی بابت ۱۹۳۶ء میں ان کا تبصرہ ملاحظہ
ہو:-

"جوش صاحب اب تک شاعر انقلاب تھے اب
کلیم کے صفحات میں داعی انقلاب، کی حیثیت سے نظر آ
رہے ہیں۔ پہلے ہی نمبر میں ادبیات میں انقلاب
کی ضرورت پر ایک پرجوش مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے
اس کو شرح یوں فرماتے ہیں:-
نوع انسان کے مسیح بننے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز
خیال ہے۔ دعوت انقلاب کو خیر کی اور حقیقت
سے کس قدر تعلق ہے "دعوت انقلاب" بار بار پڑھنے
کے بعد انقلاب ادبی کا نمونہ اس صحیفۂ انقلاب میں نہیں
ملتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
کی جگہ یہ نام قوت حیات کو رائج کر دینا کیا کوئی
تھوڑا انقلاب ہے تو عرض ہے کہ قوت یا شکتی اور
حیات کو مستقل دیوتا ان مشرک قومیں مدت سے مانتی
چلی آرہی ہیں اور ہندوستان میں ان کی پرستش ہزارہا

سال سے چلی آرہی ہے، "انقلاب" کی کیا بات ہوئی، زیادہ سے زیادہ ارتجاع یا ارتداد ذہنی کہہ لیجئے۔ رہیں نیم برہنہ زنانی تصویریں، سو یہ شرف بھی لاہور، دہلی وغیرہ کے بعض رسالوں کو مدت سے حاصل ہے۔ انقلابیت اس میں ابھی کچھ نہ ٹھہری، مدیر کلیم کی نثر میں تازہ کلام کا اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا۔ ہندو مسلمان دونوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

"میں تمہاری صفوں میں آندھی کی طرح گزروں گا۔ تمہارے بے مغز سروں پر کڑکی کمانوں کی طرح کڑکوں گا۔ اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجوں گا۔ تم پر میرا غیظ و غضب بھڑ سکتے دلوتاؤں کا غیظ و غضب ہے اے مورکھ ہندوؤں اور اے نادان مسلمانو! دین دین دھرم دھرم کا کلیجہ بیٹ ہوا جاتا ہے ان جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے۔ اے دھوتی اور پاجامہ کے گرد ہو۔ لوٹے اور بدھنے کی انجمنو۔ اے ڈاڑھی اور چٹیا کے ادارو۔ تمہاری کس کس حماقت پر رحم کروں"

یہ جوش و خروش، غیظ و غضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے۔ اور یہ گرج اور چمک اور یہ ہوشربا تجلیات آتشیں اور سب سے بڑھ کر بقول یک صاحب کے یہ لن ترانیاں "اگر اسم "کلیم" کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی ہو تو اتنا رسا دماغ کوئی کہاں سے لائے۔

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر کے اور بعض دوست صاحبوں کے ادبی مضامین اچھے ہیں۔ خود جوش صاحب بھی تو بہت اچھے ادیب بن سکتے ہیں"،

فی الحقیقت جو شاعری اتباع نما ؤدن میں کی جائے مولانا کو اس سے لفرت ہے وہ اس کے عیب سے بھی واقف ہیں اور اس کے ہنر کے مداح بھی ہیں۔ مولانا کی سخن فہمی، نکتہ رسی اور شعر و سخن سے دلچسپی کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ نعیم صدیقی کی ایک غزل کے متعلق سچی باتیں کرتے ہوئے لکھتے ہیں (صدق جدید جلد ۱۸ نمبر ۹)

"نگینی گفتار سے مسحور ہے محفل اور غایت گفتار خدا دیکھ رہا ہے"

"اور اس نے آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کے کتنے نقشے نظر کے سامنے کر دیئے! — گفتار، حسن گفتار، بلکہ صدق گفتار سے بھی غایت گفتار کس درجہ مختلف ہوتی ہے! —— قوال سماع میں بہترین شاعر کا بہترین کلام پیش کر رہا ہے۔ کلام دل میں نشتر چبھو رہا ہے۔ ساری محفل لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی ہے لیکن قوال کی نظر اہل محفل کی جیب پر ہے۔ اس کا مطلوب و مقصود جو کچھ ہے بس محفل کی نذریں ہیں! —— واعظ خوش بیان بہترین نکتہ بیان میں لگا ہے۔ منھ سے نکلے ہوئے بول دلوں کو کھائے جا رہے ہیں۔ واعظ کی دل کی گہرائیوں میں نہ اللہ کا خوف ہے نہ اللہ کی رضا کی طلب۔ سامعین خود قبلہ مقصود بنے ہوئے ہیں معتقدین کا حلقہ جتنا ہی بڑھ جائے اچھا ہی ہے۔ اور حصول جاہ کے ساتھ ساتھ اضافہ مال کی بھی کوئی صورت نکل آئے تو کیا برا ہے!"

پچھلے دنوں ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی صد سالہ [illegible]ی کے سلسلہ میں ہر طرف بڑی بڑی تقریبات منائی [illegible]ں اور ادبی و سیاسی، ملکی و غیر ملکی حلقوں اور [illegible]دوں میں غالب کے کمالات و کرامات پر خوب خوب خامہ [illegible]سائیاں ہوئیں اور [illegible] جن سے غالب کی شخصیت [illegible]ن، ان کی معنی آفرینی، دراخلیت، نرگسیت، [illegible]قصادیت، دیوانگی، انفرادیت، عظمت، انگریز [illegible]وز اصطلاحات، انداز بیان، حسن ادا، طنز و مزاح [illegible]نجی، تکلف، تصرف، شعلہ نوائی، کج ادائی، کم[illegible] [illegible]ی، صاحب نظر وغیرہ وغیرہ سب کچھ زیر بحث [illegible]ولانا عبدالماجد صاحب نے سب باتوں کو بغور سنا [illegible]ب پہلوؤں کو بامعان نظر دیکھا لیکن جب مرزا غالب [illegible]ی پرستار یا شیدائی نے [illegible] سے جب، توہمی یا [illegible]لا بی سرگرمیوں پر قلم اٹھایا، یا ان کو نقیب انقلاب [illegible]ب [illegible] اہل محفل کو گرمایا تو [illegible]لانا کی صدق گفتاری اس کو برداشت نہ کر سکی اور [illegible]کتف صدق جدید کی سچی باتیں اس کی تردید میں کرنا [illegible]ا ہو گئیں۔ مولانا عبدالماجد کو ادیبوں اور شاعروں [illegible]سے بھی محبت ہے لیکن اس قسم کا الزام یا اتہام وہ [illegible]ا نہیں کر سکتے۔ وہ خوش فکری کی قدر کر سکتے [illegible]یکن دروغ صداقت کسی حال میں بھی جائز قرار [illegible]نہیں دے سکتے۔ مولانا کے مزاج میں خوش طبعی و [illegible]شگفتہ مزاجی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ نہ لطیفے [illegible]افت کے خواہش ہیں اور سنجیدہ فصاحت کے شناور وہ سرایا [illegible]انت و سنجیدگی ہونے کے باوجود بعض اوقات اپنے [illegible]کین جملوں، دلکش فقروں اور معنی خیز الفاظ سے محفل [illegible]حباب کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ خود بھی محظوظ [illegible]ہوتے ہیں اور دوسروں کو خوش وقت کرتے ہیں۔ [illegible]عایت لفظی، ضلع جگت، ایہام اور ترصیع سے جو کام

عہد رفتہ میں لیا جاتا تھا وہ بذات خود ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا عبدالماجد کی تقریر و تحریر میں اکثر اس فن کاری کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور بہت لطف دے جاتی ہے۔

ہمارے ملک میں جب قومی دھارا کا زور و شور ہوا تو مولانا نے اس کو امرت دھارا کے قسم کی چیز قرار دیا۔ اس مضمون میں مولانا کی صدق گفتاری اور طنز نگاری اپنے نقطہ عروج پر نظر آتی ہے۔ اور بہت خوبصورتی کے ساتھ اس تحریک کی بنیاد کمزوریوں پر اور فتنہ پردازیوں کو طشت از بام کر دیتی ہے۔

میرے محترم کرم فرما مولانا ہاشم فرنگی محلی روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک مرتبہ کچھ پنیر کی جس کو انگریزی میں چیز کہتے ہیں، مولانا کو بطور تحفۂ درویش بھیجا۔ اس کے جواب میں مولانا نے عند الملاقات فرمایا کہ

"آپ نے کیا چیز (اس نا چیز کو بھیجی"

ایک موقع پر میاں جرأت کے دیوان کا ایک نسخہ جس کا سر ورق نہایت خوبصورت اور جاذب نظر تھا مولانا عبدالماجد کو پیش کیا گیا۔

مولانا نے ارشاد فرمایا

"ایک اندھے کا دیوان اور اتنا ایڈیشن"

ایک شادی کی تقریب کے موقع پر بعد مغرب ہم لوگ گفتگو میں مصروف تھے۔ اتفاق سے اس وقت بجلی کا نظام گڑبڑ ہو گیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اتنے میں محبی امیر حسن نورانی بھی اس طرف آ نکلے، صاحب سلامت ہوتے ہی مولانا نے فرمایا۔

"نورانی کی موجودگی میں یہ تاریکی"

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے جلسہ تقسیم اسناد میں جو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم صدر جمہوریہ ہند کی صدارت میں ہو رہا

تھا "اردو" کی زبوں حالی کا شکوہ بہت کھلے الفاظ میں کیا مولانا عبدالماجد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے "صدق جدید" میں لکھا۔

"خوب ہوا جو "رشید" کے یہ ارشادات "مرشد" کے سمع ہمایوں تک براہ راست پہنچ گئے۔"

کناڈا کی تجارتی دنیا کی خبر جب مولانا کی نظر سے گزری کہ وہاں کے کھلونے بنانے والے ایک کارخانے نے گڈے اور گڑیا کے جنسی فرق کی پردہ داریوں کو ختم کر دیا اور کھلونوں میں برہنگی کی کیفیت پیدا کر دی، تو مولانا نے ۴ اکتوبر ۱۹۶۸ء کے صدق جدید کی سچی باتوں میں لکھا۔

"اس کاروبار کی ترقی اور پھیلاؤ کا کیا کہنا جس میں نفس کے لئے لذت اور منفعت دونوں کے سرچشمے ابل پڑے۔ گاہک کے لئے لذت کی دولت۔ اور دوکاندار کے لئے دولت کی لذت۔"

مولانا عبدالماجد اسلامی، ادبی، نفسیاتی اور اخلاقی دنیا کے علاوہ صحافتی دنیا میں بڑے وسیع مطالعے اور سوجھ بوجھ کے مالک ہیں۔ ان کی نظر میں ملکی و غیر ملکی، اردو اور انگریزی اخبارات و رسائل سب پر رہتی ہیں۔ اور ان میں سے کام کی باتوں کے اقتباسات اکثر و بیشتر بڑے جاذب توجہ عنوانات کے ساتھ، سچی باتوں کا موضوع ہوا کرتی ہیں۔ مولانا کے تبصرے اور تنقیدیں ان اخبارات کے تراشوں میں موعظہ حسنہ اور برمحل نصائح کے مواقع نکال لیتی ہے اور روزمرہ کے پیش پا افتادہ واقعات سے ایسے اخلاقی نکتے اور سحتمند نتائج اخذ کرتی ہیں کہ عقل انسانی دنگ رہجاتی ہے اور ان کے زاویہ نگاہ کی تعریف میں صداقت و حسن استدلال مرحبا سبحان اللہ کہہ اٹھتے ہیں۔

نومبر ۱۹۶۸ء میں لکھنؤ کے ایک قابل مخیر اور مقبول احمد لاری صاحب نے اپنی طلائی جبلی کے موقع پر تعلیمی اور سماجی اداروں کو بیش قیمت عطیات سے سرفراز کیا۔ لیکن اس فہرست میں علی گڈھ مسلم کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ اس فروگذاشت سے ہو کر مولانا نے تبصرہ فرمایا۔

"بنارس کو یاد رکھنا اور علیگڈھ کو بھول جانا اس دور میں سوائے ایک مسلمان کے اور کون کر سکتا ہے۔ کیا اس کا بھی امکان تھا کہ کوئی ہندو دادو دہش کے موقع پر بنارس کو بھول جاتا اور علیگڈھ کو یاد رکھتا۔"

صحافت میں جانبداری یا ملکی سیاسیات میں عملی رہ مولانا کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بالخصوص بقول "غیر ملکی سیاسیات پر کوئی رائے زنی صدق کے مسلک داخل نہیں ہے۔" لیکن پھر بھی اگر وہ کوئی ایسی خبر ہیں جس سے اندیشہ گزرتا ہے کہ غیر ملک اپنے ملک کے معاملات میں دخل اندازی کا مرتکب ہو رہا ہے تو پر تنبیہ و تہدید کو وہ فرائض صحافت میں شمار کرتے مسٹر بھٹو کی سیاسی پارٹی کے منظور کردہ اس کہ "پاکستان کو آسام کی حکومت اور عوام سے خصوصی قائم کرنا چاہیئے۔" مولانا صدق جدید میں "غلط راہ زیر عنوان لکھتے ہیں۔ (۵ جنوری ۱۹۶۸ء)

"ایک دوست کے اندرون ملک کے معاملہ میں مداخلت کرنا خصوصاً جب کہ اسباب رنجش پہلے سے موجود ہوں، ہرگز اپنے ساتھ خیر خواہی نہیں۔ رنجش کو گھٹانے کا یہ راستہ نہیں۔ یہ تو اس کو بڑھانا ہوا۔ مشرقی پاکستان جس طرح معاملہ خالص پاکستان کا ہے ہندوستان کو اس میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ ٹھیک

ی طرح آسام معاملہ ہندوستان کا ہے۔ پاکستان کیوں
ں میں دخل در معقولات کرے۔"

مولانا عبدالماجد کی صدق گفتاری کی زد میں ایوب
اں اور یحییٰ خاں بھی آتے ہیں اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی
یات اللہ انصاری بھی آتے ہیں اور آل احمد سرور بھی۔
لی یاور جنگ بھی آتے ہیں اور ڈاکٹر علیم بھی۔ ڈاکٹر احسن
ردقی بھی آتے ہیں اور جوش ملیح آبادی بھی۔ آر۔ ایس
یں۔ اور جن سنگھ کے منتظمین اعلا بھی آتے ہیں اور مجلس
شاورت کے قائدین ملت بھی لیکن ان کی طنز نگاری
حق گوئی میں ذاتی حملوں یا شخصی کمزوریوں کا کوئی بھی
شائبہ یا تذکرہ نہیں ہوتا۔ نہ مقصد کسی کی تذلیل و توہین
ہوتی ہے۔ وہ بے لاگ تبصرے کرتے ہیں اور غیر
راعاتی انداز میں صاف صاف اپنی رائے لکھتے ہیں
ملک و قوم کی خدمت اور انسانی برادری کی سیوا
گویا فرائض منصبی میں سمجھتے ہیں اور صحافت و
انشا کو ایک باوقار اور جرأت مندانہ مشغلہ بنائے
ہوئے ہیں۔

مولانا اپنے پچاس سالہ طویل تجربہ کو جو بڑی باتیں
کرنے سے انھیں حاصل ہوا ہے "ہفتہ وار صحافت
کے آداب" کے زیر عنوان محفوظ کر دیا ہے۔ بات
لمبی تو ضرور ہو جائے گی لیکن جس وضاحت کے
ساتھ مولانا ہی کے الفاظ ان بنیادی اصولوں پر
جن پر وہ عرصہ دراز سے عامل ہیں، روشنی ڈال سکتے
ہیں ان اصولوں کو اپنے الفاظ میں مختصر بیان کرنے
سے وہ بات نہیں پیدا ہو سکتی۔ لہٰذا مناسب معلوم
ہوتا ہے کہ ان "آداب" کو صدق جدید کے شمارہ (۱۸)
جلد (۱۸) سے من و عن نقل کر دیا جائے۔ تاکہ براہ راست
مولانا کی داخلی کیفیات و تنقیدی نظریات کو سمجھنے
میں آسانی ہو۔ حدیث کی دلکشی اور حکایت کا لذت
ہونا اس طویل کے لئے معذرت خواہ ہے۔

ہفتہ وار صحافت کے آداب' ملاحظہ ہوں:۔

۱:۔ مقصود خدمت دین ملت رکھئے۔ عام خدمت خلق بھی اس کے تحت میں آجاتی ہے۔

۲:۔ وطن کا بھی بڑا حق ہے جس طرح' پڑوسی کے' اُستاد کے' اور اہل خاندان کے ہوتے ہیں۔ البتہ مسلمان "پرستار" وطن کا نہیں ہو سکتا عبودیت کا یہ خصوصی تعلق تو صرف ذات حق کے لئے مخصوص ہے اس کے مخلوق میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آسکتا۔

۳:۔ خبر برائے خبر کا روزناموں میں جو بھی درجہ ہو ہفت روزہ میں تو یہ ایک تقریباً مہمل چیز ہوگی۔ ہفت روزہ میں اپنے تبصرے سے' یا کم از کم خبر کی سرخی ہی سے' ہر خبر کو با مقصد بنا کر پیش کیجئے۔

۴:۔ پبلک کے جذبات کی محض نمائندگی پر ہرگز اکتفا نہ کیجئے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کی اصلاح کی کوشش جاری رکھئے۔

۵:۔ اپنی مقبولیت اور مرجعیت کا خیال کسے نہیں ہوتا؛ ایک حد تک یہ خیال بالکل قدرتی ہے۔ لیکن اس جذبہ کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھئے اور اپنے اوپر غالب ہرگز نہ آنے دیجئے۔

۶:۔ صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں ایک قسم کی عبادت ہے۔ بس اسی کو نصب العین بنا کر ہمیشہ اپنے سامنے رکھئے۔

۷:۔ دوسروں کا احتساب ہر پبلک معاملہ میں ضرور کیجئے لیکن اپنے کو احتساب سے بالاخیال نہ کیجئے۔ احتساب نفس کو سب پر مقدم رکھئے۔

۸:۔ بلا وجہ معقول کے' کسی کی دل آزاری کیا معنی' دل شکنی کو بھی گوارہ نہ کیجئے اور مروت کے بھی حدود

قائم کر لیجئے۔ ان سے آگے قدم نہ رکھیئے۔

۹:۔ ملک کی اکثریت کا، اور حکومت وقت کے قانون کا لحاظ ضرور رکھئے۔ حتی الامکان راہ سلامت روی کی اختیار کیجئے۔ لیکن مرعوبیت اور احساس کمتری کی حد تک ہرگز نہ پہونچ جائیے۔ صلح و سازگاری دوسری چیز ہے، اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری۔

۱۰:۔ بلا وجہ کسی سے نہ الجھئے، نہ خواہ مخواہ تکرار پیدا کیجئے، لیکن دوسری طرف جھکئے اور گرئیے بھی نہیں۔

۱۱:۔ پبلک تنقید آزادی سے لیجئے، لیکن ذاتیات پر اتر آنے سے اپنے کو اہتمام کے ساتھ بچائیے۔ کسی کے نسب پر وطن پر یا شکل و صورت پر طنز کرنا سب ذاتیات ہی کی شکلیں ہیں۔

۱۲:۔ مزاج شگفتگی، خوش طبعی علامتیں شرافت نفس کی ہیں اور تفضیح، تضحیک، اور پھکڑ بازی، علامتیں دناءت اور سفلہ پن کی۔ اس فرق عظیم کو ہمیشہ نظر میں رکھئے۔

۱۳:۔ آپ بھی بہر حال انسان ہی ہیں، اور سارے بشری جذبات رکھنے والے غصہ سے آپ کبھی بھڑک اٹھتے ہیں ایسے موقع پر نفس کو قابو میں رکھنا ہی آپ کی بلند کرداری کی دلیل ہو گی۔

۱۴:۔ دیانت کے امتحان بھی اس راہ میں سخت سخت آتے رہتے ہیں۔ اپنے کو بچانے کا اہتمام خاص رکھئے۔

۱۵:۔ غلطی کا امکان ہر بشر کی طرح آپ کے لئے بھی ہے غلطی کا علم ہو جانے پر اس کے اعتراف سے، اسے واپس لینے سے، اس پر معذرت کرنے سے ہرگز شرمائیے جھجکئے نہیں۔

۱۶:۔ جس طرح زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات محل گرفت ہو سکتی ہے، اسی طرح قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی جراح کی زد میں آسکتا ہے۔ خیال کرتے

اور ڈرتے رہیئے اس وقت جب آپ کا سارا دفتر کے سامنے ہوگا۔ اور آخری اور حقیقی عدالت میں کے ایک ایک لفظ پر سوال ہو رہا ہوگا۔

یہ ہیں وہ سوانح احوال عادات ... پر مولانا عبدالماجد گذشتہ پینتالیس سال ... ان کی تحریر بردل ... آموزی بھی ... پر دری بھی حکمت آمیزی بھی ہوتی ہے ... بھی جرأت بھی ہوتی ہے اور ... بوسی اور خرقہ بردوشی ان کی ضمیر کی شرافت ... کی پاکبازی کی آئینہ دار ہے انھوں نے ... شعر و ادب کو حیات در دلینا نہیں ... فکر آخرت کو لذت حیات پر مقدم رکھا ہے ... سے بھی تعلق برقرار رکھے ہوئے ہیں اور ... بھی وہ مرد مومن بھی ہیں اور مرد آہن بھی ... قلم و عرفان بھی ہیں اور لشکر و ایقان بھی ... بھی ہیں اور ماہر نفسیات بھی۔ اکبر الٰہ آبادی ... پچاس سال قبل جو الزام عائد ہوا تھا اور جس ... رقیبوں نے ... میں لکھنوا ... وہی الزام آج ... لگایا جا رہا ہے کہ ماجد نام لیتا ہے خدا کا اس ... لیکن مولانا کو اس کی قطعی پرواہ نہیں ہے۔ وہ ... ہواؤں میں اپنا چراغ جلائے ہوئے ہیں اور صدق کو آئینہ حق نما بنائے ہوئے ہیں۔ انکی انشا کے ... ایک بلند معیار اور باوقار نمونہ ملک و قوم کے سامنے کردیا ہے جس میں مجد بھی ہے اور وجد بھی۔ وہ ... صاحب طرز انشا پردازوں کے سلسلہ کی آخری ... ہیں اور ان کی انفرادیت خود ہویدا کی دلیل ... ان کی تقریر و تحریر کا ممتاز انداز ... دوسرے ... جاتا ہے اور قرآن واحد میں واضح کر دیتا ہے کہ ...

مزاہا فی ملت پر دیکھئے۔

ابو الاسرار رمزی اٹاوی جودھپوری

مولانا دریابادی کی بعض امتیازی خصوصیات

تقریباً ۳۰ سال ہو گئے عبدالماجد دریابادی کے
م سے آشنا ہوں میر لائق علی دہلوی مرحوم ریاست
. دھپور (مارواڑ) میں ملازم تھے۔ محکمہ برقیات میں
بنیر تھے۔ مرحوم بڑے دیندار علم دوست انسان تھے
ں ان کے یہاں اکثر جایا کرتا تھا "صدق" پہلی مرتبہ
ن کے ہاں دیکھا میں اس وقت ریڈیو اسٹیشن جودھ
ر پر اپنی فرائض انجام دیتا تھا۔

ہی زمانہ تھا کہ مولانا تھانوی کا مرثیہ بعنوان
سفیر غیب" لکھا تھا۔ ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۳ء کے "صدق"
ں دریابادی موصوف نے تبصرہ کیا تھا اسوقت
آج تک ان کی محبت دل میں لئے ہوئے ہوں
ں سے پہلے بھی ۲۵ر جولائی ۱۹۴۲ء کے "صدق" میں
تعارفی سطریں رقم فرمائی تھیں ان کی ان سطروں
جو حوصلہ افزائی کا کام کیا۔ ملکی شاعروں
واب دیتا رہا۔

موصوف انگریزی، فارسی، عربی ہر سہ زبانوں میں
م ہیں لہٰذا معاملہ فہمی میں انھیں دیر نہیں لگتی۔

ایسا ہی شخص ہماری صحیح نمائندگی اور ترجمانی کر سکتا ہے
اگرچہ مولانا موصوف میدان سیاست میں نہیں اترے
مگر تبصرہ نگاری اور نبض شناسی میں کسی مدعی سے
کم نہیں۔

مولانا محمد داؤد راز کی چھپائی ہوئی شاہی
ترجمہ والی قرآن کی جلد جب سامنے آئی تو جہاں موضح
القرآن۔ تفسیر ابن کثیر، ترجمان القرآن آزاد۔ احسن
التفاسیر وغیرہ تفاسیر کے اقتباسات سے
حاشیہ کو مزین پایا وہاں تفسیر ماجدی کے پیراگراف
بھی جلوہ گر نظر آئے۔

کسی کا مافی الضمیر جاننا چاہو تو اس کی نثر و شعری
تخلیقات کا مطالعہ کرو وہ روشن ہو جائے گا دریابادی
کا دل و دماغ ان کی تحریروں میں صاف نمودار ہوتا ہے
کام کی نوعیت بھی خود بدل دیتی ہے کہ فن کار کس
چیز کی اہمیت کو مدنظر رکھتا ہے۔ مولانا کو قرآن و حدیث
سے جو شغف ہے وہ آج بھی بدستور باقی ہے۔ انگریزی
اور اردو دو زبانوں میں وحی الٰہی کی آخری قسط یعنی

(قرآن مجید) کا ترجمہ کیا۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے طالبانِ حق گمشدہ منزل سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔

خدا کی ہدایت بندوں تک پہونچانا حق نیابت رسولؐ کا ادا کرنا ہے۔ راقم الحروف نے اپنے جذبات کو ایک مختصر نظم میں سمویا ہے جسے آپ "پیر دانا" کے عنوان سے اسی نمبر میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ان کی تالیفات و تصنیفات کیا گناؤں مولانا کی شخصیت خود ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ جو لوگ شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں وہ اپنے لئے سوینیر (SOVENIR) لکھاتے ہیں جب ان کو سرکاری انعام جاتا ہے یا لقب یا تمغہ سے نوازہ جاتا ہے تو وہ اسے معراج سے کم نہیں سمجھتے غور کرو جو انعام منعم حقیقی کے طرف سے عطا کیا جائے گا وہ کیسا پائیدار و نجات بخش ہوگا ہمیں اسی کی امید ہے۔

مولانا کی صحافت تعمیر سیرت میں حصہ رکھتی ہے چند خصوصیات ذیل میں درج ہیں۔

(۱) چھوٹے چھوٹے روزانہ کے واقعات سے عبرت و نصیحت کے پہلو پیدا کرنا۔

(۲) مہلک عوامل کا تعاقب کرنا۔

(۳) مذاہب عالم کا تقابلی درس دینا۔

(۴) جدید انکشافات سائنس کی ایجادات سے مطلب کو روشناس کرنا۔

(۵) علوم جائزہ کی روشنی میں قرآنی پیام کی قیمت اور جانداری ثابت کرنا۔

بقیہ مضمون صفحہ ۲۲۴

قلم کاری کی سحر طرازی ہے اور کس نابغہ روزگار کی جادو بیانی ان کے مقالات میں علامہ شبلی اور مولانا محمد حسین آزاد کی اردو خاصہ نگاری اور زریں نگاری کی جھلک بھی موجود ہے اور مولانا محمد علی جوہر کی جرأت و بیباکی بھی۔ وہ لکھنؤ کے دبستان ادب کی گذشتہ عظمتوں کی یادگار ہیں اور وضعداری کی زندہ مثال۔ وہ اس پیرانہ سالی میں بھی "آئین جوانمردان" پر قائم ہیں اور "خودی" کی سربلندی کے قائل۔ ان کی زندگی اور صحافت نگاری کی مصداق اس شعر کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

آئین جوانمردان حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

انصار الحسن صدیقی

صحافت نگاری میں مولانا عبدالماجد کی انفرادیت

★★★★★★★★★★★★★★★★★

حقیقی شاعر اور پیغمبر کی طرح حقیقی صحافی بھی دلوں کی تسخیر کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ شاعر اپنے احساسات کی اور پیغمبر اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انہیں اس سے قطعاً بحث نہیں ہوتی کہ عوام کیا پسند کرتے ہیں اور کیا ناپسند۔ ان کے پاس ایک مخصوص پیغام ہوتا ہے اور وہ اس کی اشاعت میں ہمہ جان و تن مصروف رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک صحافت نگار کو اپنے خریداروں کے چشم و ابرو پر بھی نظر رکھنا پڑتی ہے۔ اس کا مطمح نظر ان کی تعداد میں اضافہ یا کم از کم ان کی اس تعداد کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ مزاج شناسی پر منحصر ہوتا ہے اور یہی مزاج شناسی فن صحافت کا ایک اہم جزو بن گئی ہے۔ مختلف طرز فکر اور مختلف رجحانات رکھنے والے لوگوں کی مانگیں مختلف ہوا کرتی ہیں اور ان سب کو بہ یک جنبش قلم مطمئن کر لینا ایک صحافی کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے یہ بات دیگر ہے کہ نئے خریدار بنانے اور نئے و پرانے دونوں خریداروں کو مطمئن رکھنے کی کوشش میں "معیار" عموماً پست تر ہوتا چلا جاتا ہے اور صحافی مشہور سے مشہور تر۔

آج کے اس دور ہماہمی میں لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت، اور سن و سال کے تقاضوں کو فراموش کر کے "ذہنی غذا" تلاش کرتے رہتے ہیں کیوں کہ ایٹمی دور کی مصروفیات اور "ذہنی غذائیں" لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تمام دوسرے فن کاروں کی طرح صحافت نگار بھی عوام کی اس مانگ سے اغماض نہیں برت سکتا اور اگر بدقسمتی سے وہ اتنی جسارت کرتا ہے کہ "ذہنی غذا" کی فراہمی میں اخلاقی قدروں کا خونِ ناحق کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنا دامن بچا لے تو نہ صرف یہ کہ عوام کی عقابی نگاہیں اس کا پیچھا کرتی ہیں بلکہ اس کے ہم پیشہ معاصرین کی گرفت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور وہ غریب ہمیشہ کے دیا تلوں

لیس کر رہ جاتا ہے. یہ حال تو ان کا ہوتا ہے جو خاموشی
دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں پھر ان کا تو پوچھنا
کیا جو بابانگ دہل اس "عوامی مانگ" کی مخالفت
رتے ہیں اور اپنی پیش کش کو BEST SELLER
سے زیادہ فروخت ہونے والی) بنانے کے بجائے
ن کا معیار بہترین بنانے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔
یسے صحافی اگر اپنے پیشہ میں ناکامی کا سامنا کریں
حیرت انگیز بات ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی ایسے ہی ایک صحافی
ہیں۔ ذہنی غذا یکسر فراہم نہیں کرتے، نمک مرچ لگا کر
اور الفاظ کی تراش خراش کا سہارا لے کر فریب
حقیقت اور حقیقت کو فریب بنانا ان کو نہیں آتا،
معاصرین پر کیچڑ اچھالنا اور معززین کے وقار کو دھکا
پہونچانا ان کے ضابطۂ اخلاق کی رو سے نازیبا، حکومت
دعہدہ داروں کی خوشنودی کے لئے فن اور اخلاقی
قدروں کو قربان کر دینا ان کے لحاظ سے نامناسب
حق پرستی اور راست گوئی میں انھیں باک نہیں۔
..... آخر وہ کیسے صحافی ہیں؟ کیا وہ صحافت کے
اصولوں سے نابلد ہیں؟ کیا انھیں یہ نہیں معلوم کہ عوام
سنسنی خیزی کے شائق ہوتے ہیں؟ کیا انھیں انگریزی
صحافت کا کوئی نمونہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی؟ نہیں ایسا
نہیں ہے، دنیا انھوں نے بھی دیکھی ہے۔ زمانے کے
سرد و گرم سے خوب واقف ہیں، بھولے اور ناسمجھ
عوام کو بہلانے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے فن
ان کی دسترس سے باہر نہیں، پھر بھی وہ ان سب
ہتھکنڈوں سے قطعی اجتناب کے قائل ہیں۔ کوئی صحافت
اگر بے لوث کہی جا سکتی ہے تو وہ مولانا کی صحافت
ہے، سیاسی اغراض سے انھیں کوئی واسطہ نہیں وہ
جو کچھ لکھتے ہیں خلوص دل کے ساتھ لکھتے ہیں، عوام

کے لئے لکھتے ہیں، خود اپنے لئے لکھتے ہیں
جی ہاں! اپنے لئے!! ایک مصلح
دوسروں کی اصلاح کے ذریعہ اپنے لئے روحانی سکون
کا سامان فراہم کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ مادی
ناکامیوں سے دل برداشتہ نہیں ہوتا۔ اگر اس
کی کوششوں سے دو چار ہی کی اصلاح ہو جاتی ہے
تو اس کے لئے یہ بات انتہائی خوشی کا باعث ہوتی
ہے۔ مولانا کا صحافتی کردار ایک مصلح کا کردار ہے اور
مصلح کو بہت کم لوگ قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔
"صدق جدید" مولانا کا جاری کردہ ہفت روزہ
ہے جس کا اڈیٹوریل خود مولانا لکھتے ہیں اڈیٹوریل
کیا ہوتا ہے ایک مجموعہ کا دفتر ہوتا ہے جس میں
موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ مقصد کی یکسانیت
بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں تک مقصد کا تعلق ہے وہ
ایک ہے اور واضح ہے ...... وہی جو ایک مصلح یا دیگر
پیغمبری اور عامۃ الناس کے قائد کا ہوتا ہے ...
بے غرضانہ مشوروں اور بے لاگ تبصروں کے ذریعہ
معاشرے کی گرتی ہوئی اقدار کو سنبھالنے کی سعی
کی جاتی ہے اور قصر ملت کی مانند پڑتی ہوئی آب
و تاب کو نیا رنگ و روغن دے کر جاذب نظر بنایا جاتا ہے
ایسے بلند مقصد کے حصول کے لئے لازمی طور پر متنوع
اور رنگارنگ کے ساز و سامان کی ضرورت پڑتی ہے
لہٰذا کبھی تو قرآن و حدیث کی مشعل ہدایت سے مشعل
جلائی جاتی ہے اور کبھی اسلامی تاریخ کے زریں ابواب
سے کسب فیض کیا جاتا ہے، کبھی کسی مشہور واقعہ یا
کسی تازہ واردات کو بنیاد بنایا جاتا ہے کبھی معاصرین
کی کالموں سے اقتباسات لے کر بصیرت افروزی کی
جاتی ہے، غرض جہاں کہیں بھی کوئی چیز نصیحت آمیز
نظر آتی ہے، مولانا اسے "تحریری درس" کی شکل دے

دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں اس کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے کہ جس واقعہ یا بات کو اپنے اداریہ کا محور بنا رہے ہیں وہ مادی اعتبار سے کتنی اہم یا کتنی حقیر ہے۔ یا اقبال مرحوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ پیغمبری کی تھی یا مولانا اپنی صحافت کے ذریعہ کر رہے ہیں کیفیت اور نوعیت کو کمیت پر ترجیح دے کر وہ ادنیٰ سے ادنیٰ چیزوں سے سامانِ درس حاصل کرتے ہیں اور بیسویں صدی کے صحافتی تقاضوں سے بے نیاز ہو کر تیز گام معاصرین کی انگشت نمائی کی پرواہ کئے بغیر اپنے مقصد کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔

مولانا کی جدید صحافتی تقاضوں سے روگردانی ان تقاضوں سے لاعلمی اور ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ ہوتی ہے۔ دیکھئے ۲۰ فروری ۱۹۵۵ء کے صدق جدید میں نیو اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر مسٹر کنگسلے مارٹن کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جھوٹ اپنے ملک سے متعلق بولنا تو ذرا دشوار ہوتا ہے اس لئے کہ فوراً قلعی کھل جاتی ہے لیکن دوسرے ملکوں سے متعلق بولنا کیا مشکل ہے۔ بالخصوص ان ملکوں سے متعلق جن سے اپنی لاگ ڈانٹ اور رقابت چلی آرہی ہے۔ اور جن کے بارے میں ہر بڑے سے بڑے مبالغہ بلکہ صریح جھوٹ کو قبول کرنے کے لئے اپنی قوم ہر وقت تیار ہے ــــ جو اخبارات اپنی قوم کی اس ذہنیت کو پا گئے ہیں وہ اس سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی اشاعت کو محتاط قسم کے اخبارات کے مقابلے میں دوگنے تگنے تک پہونچاتے رہتے ہیں۔ "کامیاب" اخبارات نے اس راز کو پہچان لیا ہے کہ پُرمنفعت کاروبار اپنی قوم کو تلخ حقیقتوں سے آگاہ کرتے رہنے سے نہیں چلتا، بلکہ اسے ہر حال میں خوش رکھنے اور اس کی خوشامد کرتے رہنے ہی سے چلتا ہے۔"[1]

اس کے بعد ہی مولانا کا تبصرہ ہے۔ یہ مغز، ہوش اور رمزیت سے بھرپور ہے:-

"اخبارات کا فائدہ جنگ کے دنوں میں جھوٹ ہونے میں نہیں، لیکن اس میں ضرور ہے کہ خبریں برابر جنگی قسم کی، اور جنگ کو قریب لانے والی سنسنی خیز قسم کی برابر نکلتی رہیں۔ روس جنگ عظیم ثانی کے زمانہ میں برطانیہ کا بہترین دوست و حلیف تھا۔ جنگ کے ختم پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تو خبیث ترین قسم کا انسان دشمن بالشویک ہے! جن درسگاہوں خصوصاً ابتدائی درسگاہوں میں تاریخ کا مقصد ہی یہ ہو رہے کہ اپنی قوم کے جن لوگوں نے جنگ میں زبردست حصہ لیا ان کو "ہیرو" سمجھا جائے اور انھیں کی عظمت دلوں میں بٹھائی جائے، وہاں کے فارغ طلباء میں جنگ جوئی اور جنگ پسندی پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ ساری قوم میں اسی طرح دوسری قوم کے خلاف تعصب اور بغض کا زہر پھیلا اور پھیلتا رہتا ہے، اور اخبارات اس آگ کو ہوا دینے کو ہر وقت آمادہ اور کمربستہ رہتے ہیں۔"[1]

[1] صدق جدید صفحہ ۱، ۲۰ فروری ۱۹۵۵ء

دیکھئے کتنی بے لاگ اور سچی تنقید ہے لگاوٹ خا ئبہ بھی نہیں۔ ان سطور کو پڑھ کر کوئی قوم پرور یا شخص یہ اعتراض یقیناً کر سکتا ہے کہ ہم تو قوم پرستی کا درس دیتے دیتے عاجز ہو گئے یا رہے ہیں اور یہ ہیں کہ خالص قومی معاملات اور "دلیش بھگتی" کے خلاف زہر اگلنے سے باز نہیں آتے۔ یہ یقیناً پاکستانی ایجنٹ ہوں گے ورنہ کسی شریف "اور" وطن پرست" مسلمان کی بھلا یہ مجال ہو سکتی تھی! خوب! اچھی رہی اپنے بچوں کو قوم کے عظیم سپوتوں کے حالات اگر درسی کتب میں نہ پڑھائیں گے تو ان میں وطن پرستی کے جذبات کس طرح بیدار ہوں گے ....

اس طرح کے معترضین قطعاً نفس مضمون پر نگاہ نہیں ڈالتے وہ "جے جگت" کا ورد تو کر سکتے ہیں وہ عالمی اخوت کے نقیب تو بن سکتے ہیں لیکن "عالمی اخوت" کا مطلب ہرگز نہیں جانتے کوئی ذرا یہ تو بتلائے کہ اس تحریر میں یہ کہاں درج ہے کہ قوم پرستی کے جذبات کو بیدار کرو بیدار نہ کرو اور ضرور بیدار کرو لیکن اس ڈھنگ سے کہ قوموں کے مابین تفرقہ کی بنیاد ڈالنا پڑے۔ اس طرح نہیں کہ باہمی مناقشات کو ہوا دینا پڑے۔ حب وطن ایک اچھا جذبہ ہے اور اسلامی تعلیمات اس سلسلہ میں پوشیدہ نہیں لیکن اس کے حصول کا ایک طریقہ نفرت، بغض اور حسد کی جذبات ابھارنا ہے اور دوسرا طریقہ امن عالم کی دعوت ہے۔ اگر عالمی امن و اخوت پنپتی ہے تو وطن اس سے مستفید ہوئے بغیر کب رہ سکتا ہے اقبال کے ع

"مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

[illegible] مولانا کی مذکورہ تحریر بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ مولانا کو "کامیاب صحافت" نہیں آتی لیکن "محتاط صحافت" ان کا خاصہ ہے لوگ لاکھ انہیں طعن و تشنیع کے حصاروں میں لے لیں لیکن ان کے خیالات کو بیڑیاں نہیں پہنا سکتے۔ وہ جو کچھ دل میں سوچتے ہیں زبان سے ادا کرتے ہیں کسی کو ناگوار خاطر گذرے یا کسی کی خاطر جمعی ہو انھیں اس سے کچھ سروکار نہیں۔

"وحدت ادیان" کی تلقین آج کل کے دور میں بلا کم و کاست ہر مذہب کے پیرو کاروں نے اختیار کر رکھی ہے۔ یہ ایک نظریہ ہے اور بڑی حد تک عالمی اخوت کا داعی بھی لیکن اس کے پوشیدہ مضمرات پر رائے زنی کون کرے؟ کون ہے جو خود کو اس جرم کا مرتکب کہلوانے پر تیار رہے کہ انہیں عالمی اخوت کی دشمنی کی جسارت کرے؟ دیکھئے اقبال کی تبلیغ گوسفند والی حکایت بیان کرنے کے بعد مولانا یوں رقم طراز ہیں:-

"کچھ ایسا ہی افسوں شیطان نے وقت کے
بڑے بڑے اسلامی قوتوں کے کان میں
پھونک دیا ہے اور اچھے اچھے دانایان
روزگار نے وحدت ادیان کی نہتی نوری
کے اثر میں آکر جھومنا اور ڈگمگانا شروع
کر دیا ہے ___ وحدت ادیان کا مسئلہ
بجائے خود جتنی بھی حقیقت رکھتا ہو
آج جس سیاق میں چلایا جا رہا ہے۔
اس کے لحاظ سے تو اسلامیت کے حق
میں قطعی پیام ہلاکت ہے"[1]

آپ اسے مذہبی کٹرپن کا نام دیجیے یا شاہین زادوں کے دشمن [illegible] دعوت قرار دیجیے یہ ایک حقیقت [illegible] جاتا اپنی

---

[1] صدق جدید صفحہ ۲ - ۲۹ جنوری ۱۹۵۴ء

دلی کیفیتوں کی پردہ پوشی کریں بلکہ اسی جگہ وہ دین کمیونزم کی نقابیں اوڑھ لیں لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وحدت ادیان محض ایک خیالی نظریہ ہے اسے تحریروں اور تقریروں میں تو خوب اچھالا جا سکتا ہے لیکن عملی صورت میں یہ ہم سب کے لئے ناقابل قبول ہے۔

مولانا صاحب فسق و فجور کے بدترین دشمن ہیں اور اس سلسلہ میں ہر قابل دست انداز بات ان کی تنقید کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔ اس میں وہ رعایت کسی کے ساتھ نہیں کرتے مروت انھیں ذرا بھی نہیں آتی۔ وہ بے خوفی سے سب کچھ کہہ گذرتے ہیں بات چاہے جس کے بھی خلاف پڑے۔ پاکستانی وزیر اعظم کے ایک بیان پر جس میں اشارہ ہوا تھا کہ یکم جنوری سے پاکستان ایک خود مختار جمہوریہ اسلامیہ ہوگا۔ مولانا کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

" یقیناً یہ دنیائے اسلام کے لئے ایک بڑی خوشخبری ہے۔ آج جب ایک نہیں متعدد بڑی بڑی مسلم حکومتیں اپنے کو مسلم کہتے ہچکچاتی ہیں اور اپنی اسلامیت سے شرماتی ہیں ...... کسی ملک کا اپنے کو ہانک پکار کر مسلم اور اسلامی کہہ دینا بڑی جرأت کا کام ہے اور یہ جرأت ہر طرح قابل مبارکباد ہے۔ اللہ اس نام کی برکت عمل میں ظاہر کرے ــــ لیکن خدا کرے اس "اسلامیت" کی ذمہ داریوں کو بھی خوب سمجھ لیا گیا ہو اور پاکستان کے حکمرانوں نے، امیروں وزیروں نے بڑے اور چھوٹے افسروں نے علما، و مشائخ نے، سیاسی لیڈروں نے قانون ساز مجلسوں کے ارکان نے، اہل قلم نے عام رعایا نے، اور سب سے بڑھ کر اہل صحافت نے اور روزناموں اور ہفتہ واروں کے ایڈیٹروں نے بھی سمجھ لیا ہو کہ اسلامی حکومت کے، اسلامی معاشرت کے، اسلامی سیاست کے اور اسلامی برادری کے کیا معنی ہوتے ہیں اور اس ایک اقرار کے بعد کیا کچھ ترک کرنا ہوگا کیا کچھ اختیار کرنا۔"

اس کے آگے برائیوں کی ایک طویل فہرست ہے، شراب، فحش کاری، سودی کاروبار، مخرب اخلاق تحریروں اور ایمان سوز اشتہارات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ سب اس کے بعد بھی اسی طرح جاری رہے گا؟ آخر میں صاف الفاظ میں کہتے ہیں۔

" سوال پاکستان نامی جغرافی خطہ کے اندرونی اور خانگی معاملات کا نہیں بلکہ ایک اسلامی "اسٹیٹ" کا ہے جو دنیا کے کسی حصہ میں بھی ہو اور جس پر اخلاص کے ساتھ رائے زنی کرنے اور مشورہ دینے کا حق دنیائے اسلام کے ہر بڑے اور چھوٹے کو حاصل ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ اس "اخلاص" سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ بات اور ہے کہ جب مفادات ٹکراتے ہیں تو دوست دشمن کی تمیز باقی نہیں رہتی دیکھئے پاکستان میں سینما بینی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے سلسلہ میں ایک خبر پا کر کہ روزانہ تماشائیوں کی تعداد اوسطاً ڈیڑھ لاکھ ہے:۔ لکھتے ہیں:۔

" لیکن سینما بینی کا جو زور ہے اس کے لحاظ سے یہ ڈیڑھ لاکھ روزانہ تماشبینوں کی تعداد سارے پاکستان کے لئے تو

زیادہ نہیں، کم ہی معلوم ہوتی ہے۔
بہرحال اسی اندازے کو بنیاد قرار دے کر
کاش کوئی حساب لگا کر یہ بھی دکھا
دیتا کہ سال میں کتنے گھنٹے اور کتنے دن
اپنی عمر عزیز کے، اور اپنی دولت کا کتنا
حصہ پاکستانیوں نے اس ایک شغل پر
ضائع کردیا!"

بھلا کوئی اس خلوص سے انکار کرسکتا ہے! نہیں
نہیں۔ اس تحریر کا ایک ایک لفظ بربادیٔ ملت
ون کے آنسو روتا ہوا نظر آتا ہے۔ اللہ اللہ اس
کی وسعتیں! جو نظر پڑتا ہے تو اس لئے کہ ایک
اسلامی اسٹیٹ کے باشندے اپنا قومی نقصان کر
رہے ہیں اور اپنے آپ کو اخلاقی انحطاط کا شکار بنانے
درپے ہیں لیکن نہیں۔ یہ خاص صرف اسلامی اسٹیٹ
لئے مخصوص نہیں۔ ایک سگریٹ ساز کمپنی کی اس
بات پر کہ لکھنؤ میں ہر سال ساٹھ لاکھ روپیہ کی سگریٹ
باقی ہے۔ مولانا کی پر درد طبیعت بے چین ہو اٹھتی
ہے:

"گویا تمباکو نوشی کی بھی صرف ایک مد
سگریٹ نوشی پر ضلع لکھنؤ ۶۰ لاکھ روپیہ
سالانہ خرچ کرتا ہے! بیڑی نوشی
حقہ نوشی وغیرہ کی مدیں سب اس حساب
سے خارج ہیں! یہ "مفلس" ملک
افلاس زدہ گرانی زدہ ملک کے صرف
ایک ضلع کا نقشہ ہو! اسی سے اندازہ
کر لیجئے کہ اسراف کی اور ساری مدوں،
آتشبازی، سینما بینی وغیرہ پر ہر سال
ہر ضلع میں، پھر سارے اضلاع مل کر کتنا
پھونک دیتے ہوں گے۔"

فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والے قوم و ملک
کے دشمن کیا ایسی ہی طرز فکر کے مالک ہو سکتے ہیں!
نہیں کبھی نہیں یہ مسلک تو صرف صلح کل ہستیوں کا
ہی ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کا ہو سکتا ہے جو صرف
سنسنی خیز خبروں سے عوام کو مغالطہ میں ڈال کر ان
سے روپیہ پیدا کرنے کی نہیں ڈالتے بلکہ اس کے برعکس جو
مواد فراہم کرتے ہیں اس میں عوام کی منفعت کا پہلو
نمایاں رہتا ہے۔ اگر ایسا شخص جو اپنوں بیگانوں سب
کے لئے دل میں جگہ رکھتا ہو۔ غیر مسلموں کی فلاح چاہے
تو درست ہے لیکن معاذ اللہ اس سے یہ حق کب حاصل
ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ عدم مساوات کی
طرف توجہ مبذول کرائے یا اردو کے حقوق کے سلسلہ
میں خامہ فرسائی کرے۔ یہ تو ناقابل نظر انداز جرائم ہیں
اور ان پر گرفت کرنا ہر نیشنلسٹ کا فرض اولین
ہو جاتا ہے۔ ۲۴، ۲۵ اور ۲۶ جولائی ۱۹۵۸ء کے
قومی آواز کے اداریوں سے چند اقتباسات جو خود
مولانا نے "قو میانوسی" ایڈیٹر ناؤرن ایڈیٹر کی نظر
میں" کے زیر عنوان نقل فرمائے ہیں ملاحظہ ہوں۔

"عوامی مسائل سے ناآشنائی کی وجہ
سے مولانا کی تحریریں صرف ایک محدود
طبقہ کے لئے جاندار ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ دو ایک چھوٹے چھوٹے
گروہ اور بھی ہوں جو ان تحریروں سے
کچھ پا سکیں لیکن باقی ۹۰ فیصدی کے
لئے چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں
مولانا کے ہاں کچھ نہیں۔"

"مختصر یہ کہ جن مخصوص طبقوں کا ہم
نے تذکرہ کیا ہے ان کو چھوڑ کر باقی طبقوں
میں مولانا کی تحریروں کی کوئی قدر نہیں۔"

"مسلم لیگ کے دور میں جب مولانا دو قومی نظریہ کی حمایت کرتے تھے تو ہم نے ان کے خیالات پر کافی لکھا ہے لیکن تقسیم کے کچھ دنوں بعد جب حالات کا رخ بدل گیا تو ہم نے مولانا پر لکھنا چھوڑ دیا۔ وجہ یہ کہ مسائل روشن ہو گئے تھے اور مولانا کی تحریروں کا اثر محدود ہو گیا تھا۔ اس بات کو دیکھ کر ہم نے یہ راہ اختیار کی کہ مسائل کو اجاگر کر دو۔ جو لوگ مسائل کو سمجھ جائیں گے وہ مولانا کی تحریر کا شکار نہیں بنیں گے ہمارے خیال میں مولانا کو پاکستانی قرار دینا انکی تحریروں کی اسپرٹ نہ سمجھنے کے مترادف ہوگا۔ ہمارے نزدیک قصور ان کی نیت کا نہیں، ان کے نقطہ نظر کا ہے ان باتوں کو دیکھ کر ہی اپنی پالیسی یہ رہی کہ

"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو"

اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ اداریے مولانا کی مخالفت کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک اور معاصر اخبار کے ان الزامات کی تردید میں سپرد قلم ہوئے ہیں جو اس نے مولانا پر عائد کئے ہیں۔ تعریف کا یہ انداز کتنا انوکھا ہے؟ اگر غور سے دیکھا جائے تو مولانا کی "نیم جان" تحریروں کی جانداری کا بین ثبوت ہے۔ "صدق کی صفائی قومی آواز کے قلم سے" لیکن آخر کیا ہوا؟ تاریخ میں یہ بھی تو آتا ہے کہ قاتلان حسین کے انتقام اور شہیدان کربلا کی حمایت و نصرت میں مختار ثقفی نے اپنے علم کو حرکت دی تھی۔

اس لمبی چوڑی صفائی نے یہ بات واضح کر دی کہ مولانا کے حریفوں کی صفیں ایک ان جانے خوف کے ماتحت خود ہی متزلزل رہتی ہیں اور اس گھبراہٹ ہی کی بنا پر مولانا کی ذات کو ہدف ملامت بنایا جاتا ہے۔

"صدق جدید" خود کیا ہے یہ مولانا ہی کی زبان سے سنیئے۔

"صدق کا مسلک و مزاج اچھا ہے یا برا جیسا کچھ بھی ہے واضح و ظاہر ہے اور حیرت ہے کہ کوئی شخص اس کے چند پرچے بھی پڑھے اور غلط فہمی میں مبتلا رہ جائے وہ سیاسی پرچہ تو کسی معنی میں بھی نہیں اصلاً ایک دینی، اصلاحی، اخلاقی صحیفہ ہے اس کی اصل دعوت ایک دینی و اصلاحی دعوت ہے۔ پھر اس کا ایک مخصوص علمی و ادبی معیار ہے اور اس کا خاصہ حصہ کتابوں کے نقد و نظر کے لئے وقف رہتا ہے اس سب کے بعد اگر کچھ جگہ بچتی ہے تو وہ سیاسی رائے زنی بھی کر دیتا ہے۔ وہ بھی صرف اپنے ملک سے متعلق جس سے وہ سیاسی، آئینی، قانونی جغرافیائی طور پر وابستہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اخلاقیات و ایمانیات کا معاملہ دوسرا ہے اس میدان میں اگر صدق کا تعلق ساری دنیا خصوصاً اسلامی دنیا سے قائم ہو جاتا ہے، اور زندقہ فسق و الحاد پر لکھتا ہے تو اپنی بساط کے موافق دنیا بھر پر کیا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ صدق کے پاس اس "بدقسمتی" کا کیا علاج کہ پاکستانی پریس اس کے شذرے کثرت سے نقل کرتا رہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

---

* صدق جدید صفحہ ۸ / اگست ۱۹۵۸ء

.... صدق کی فرد جرم میں ذکر تلخی و تنگ نظری کا بھی آیا ہے۔ تلخی سے اشارہ اگر دعوت صدق کی جانب ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تو ناگزیر ہے اور کوئی دعوت آج تک ایسی نہیں ہوئی جو کسی نہ کسی طبقہ کو تلخ نہ محسوس ہوئی ہو .... رہا دوسرا الزام تنگ نظری کا تو اس سے اگر تعصب مراد ہے تو بحمد اللہ شریف ہندوؤں کی داد و تحسین میں تو صدق نے آج تک بخل سے کام نہیں لیا ہے ....لہ

یہ طول طویل اقتباس صدق کا زعم باطل نہیں بالکل درست و برحق بجانب ہے۔ درحقیقت اس میں یہی صفات ہیں اور اگرچہ بقول ایڈیٹر قومی آواز مولانا کی تحریریں صرف ایک محدود طبقہ کے لئے جاندار ہیں، لیکن پھر بھی یہ محدود طبقہ وہ ہے جو کھلا ذہن رکھتا ہے اور گوہر شناسی میں کسی سے پیچھے نہیں ان کی تحریروں کے جاندار ہونے میں تو کوئی شبہ کا محل ہی نہیں لیکن ایک بات ضرور ہے مولانا کا انداز تحریر سادہ ہونے کے باوجود گاہے بہ گاہے ادق الفاظ اور عربی تراکیب کے استعمال کی بنا پر کبھی گراں سا گزرنے لگتا ہے اور کم تعلیم یافتہ حضرات تک ان کی "صدائے صدق" پہونچنے میں حارج ہو جاتا ہے۔ صدق کے محدود حلقہ کی چند وجوہ میں اس کا بھی شمار کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے قطع نظر صدق کے پیغام میں جو خلوص و یگانگت ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مضمون کچھ طویل ہو گیا ہے اور باوجودیکہ سمند قلم ابھی مزید جولانیوں پر کمربستہ نظر آتا ہے اختصار سے کام لینا ناگزیر ہو گیا ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا کی منفرد صحافت نگاری کے کچھ پہلو تشنۂ تحریر رہے جاتے ہیں لیکن صفحات کی تنگ دامانی کا کیا علاج؟ آخر میں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ صدق کے بارے میں یا مولانا کے بارے میں جو کچھ بھی سپرد قلم ہوا ہے اس میں کسی قسم کی مرعوبیت کو قطعی دخل نہیں صرف ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ ؎

سجدے سے اٹھ کے نور چھپنے پا کر داغ ہو
اب تیری ملک ہو چکی میری جبیں نہیں

لہ صدق جدید صفحہ ۴ تا ۵۔ ۸ راگست ۱۹۵۹ء

سراج الحسن صدیقی ایم۔ اے

مولانا عبدالماجد بحیثیت سوانح نگار

اُردو زبان میں فنِ سوانح نگاری کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ ظاہر ہے خود اُردو زبان کی عمر تین سو سال سے کچھ زیادہ ہے جو کسی زبان کے ارتقا کے لئے بہت مختصر مدت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اُردو زبان نے اپنی مختصر زندگی میں ہر صنف میں غیر معمولی ترقی کی اُسی طرح سوانح نگاری کے میدان میں بھی اُس نے تیز گامی دکھائی۔

اُردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز مولانا الطاف حسین حالی نے کیا "حیاتِ جاوید" اور "یادگارِ غالب" ان کے سوانحی شاہکار ہیں اس اعتبار سے سوانح نگاری کے باقاعدہ آغاز پر ساٹھ ستر سال سے زمانہ نہیں گزرا۔ مگر اس قلیل عرصہ میں اُردو زبان کو چند باکمال سوانح نگار بھی ملے۔ اور کچھ ایسی سوانح عمریاں بھی۔

سوانح نگاری کے فن کو ترقی دینے والوں میں مولانا شبلی نعمانی اور ان کے تلامذہ کی حیثیت نمایاں ہے۔ اس کے بعد سوانح نگاری عام ہو گئی اور لکھنے والے بھی بے شمار پیدا ہوئے لیکن معیاری اور صاحبِ طرز سوانح نگار گنے چنے ہیں۔

سیرت نگاری کا جو اعلیٰ شاہکار شبلی نعمانی کی "الفاروق" ہے یہ کتاب قدیم اور جدید اندازِ سوانح نگاری کا دلکش اور مناسب امتزاج ہے اور عہدِ حاضر کی بہترین سوانح عمریوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس میں شبلی کا فنی شعور درجۂ کمال پر نظر آتا ہے۔ وہ ایک مشکل تکنیک سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

مولانا راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد، غلام رسول مہر وغیرہ نے اچھے سوانحی خاکے پیش کئے۔ اس عہد کے دوسرے ممتاز سوانح نگاروں میں عبدالحلیم شرر، مرزا حیرت دہلوی، قاضی سلیمان منصور پوری، عبدالرزاق کانپوری (مصنف "البرامکہ")، حکیم محمد حسین الہ آبادی، منشی محمد دین فوق وغیرہ۔

حالی اور شبلی کے بعد سوانح نگاری نے

مختلف مراحل طے کر کے بیسویں صدی میں قدم رکھا۔ اور اُن کے بعد اُردو ادب میں چند اچھے سوانح نگار منظرِ عام پر آئے۔ "سیرت عائشہؓ" لکھ کر مولانا سلیمان ندوی نے اُردو میں "کسی عورت کی پہلی سوانح عمری" لکھنے کا فخر حاصل کیا۔

اس دور میں اسلم جے راج پوری۔ حبیب الرحمٰن شیروانی، رشید احمد صدیقی۔ قاضی عبدالغفار (مؤلف آثار جمال الدین افغانی) و آثار ابوالکلام، شوکت تھانوی، (مصنف شیش محل) نے اچھے سوانحی خاکے پیش کئے ہیں۔ ان حضرات نے اس صنف کو بہت کچھ دیا اور اسے آگے بڑھایا۔

شبلی نعمانی کے سلسلہ کے ایک صاحب طرز انشا پرداز اور باکمال سوانح نگار مولانا عبدالماجد دریا بادی ہیں، جو علمی و ادبی دنیا میں متعدد حیثیتوں سے بہت ممتاز ہیں اور موجودہ دور میں اردو کے مصنفین کی صف اول میں ہیں جب وہ طالب علم تھے۔ اس وقت مولانا حالی زندہ تھے اور جب اُنھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ تو اُن کو شبلی نعمانی کی رفاقت اور رہنمائی حاصل تھی۔ ایسی حالت میں اُن کو سوانح نگاری کے اُصول و ضوابط سے جو واقفیت ہو سکتی ہے وہ دوسرے کے لئے اس حد تک ممکن نہ تھی۔ اس کے ساتھ ان میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مغربی علوم اور انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہیں اُنھوں نے مغربی سوانح نگاروں کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس لئے ان کے سامنے اس فن کی راہیں بہتوں سے زیادہ روشن ہیں۔ مشرق و مغرب کی روایات سوانح نگاری کو پیشِ نظر رکھ کر مولانا عبدالماجد نے جو بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ اُن سے اُنھوں نے اُردو میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ بحیثیت سوانح نگار ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو اس سے اُردو میں سوانح نگاری کے معیار پر بھی روشنی پڑے گی۔ اور اس فن میں خود مولانا کی مہارت، اور دوسرے پہلوؤں کا بھی اندازہ ہو جائیگا

مولانا عبدالماجد نے زمانۂ طالب علمی سے مضمون نگاری شروع کی تھی۔ اور جب وہ کالج کے طالب علم تھے اس وقت ایک اچھے مضمون نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی اُنکے مضامین میں کبھی کبھی سوانحی خاکے بھی ہوتے تھے۔ اور اُن کے اندازِ تحریر اور حالات پیش کرنے کے ڈھنگ میں کسی قدر ندرت ہوتی تھی، جس کا اندازہ ایسے مضامین سے بہ خوبی ہوتا ہے رفتہ رفتہ اُنھوں نے سوانح نگاری میں بھی مہارت حاصل کی، مغربی سوانح نگاروں کی مشہور کتابوں کا مطالعہ کیا، جس کی بدولت اُن کو جدید سوانح نگاری کے اصولوں سے بھی واقفیت حاصل ہوئی

مولانا نے بعض ادیبوں اور شاعروں

پر جو سوانحی مضامین لکھے ہیں اُن میں بعض بہت ہی مقبول ہوئے۔ بلکہ اپنی فنی خوبیوں کے باعث اُن کو "ادبی جواہر پارے" کہا جا سکتا ہے، نواب مرزا شوق لکھنوی اور اُن کی مشہور مثنوی زہرِ عشق پر اُن کا مضمون اب بھی نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کرتا ہے، اکبر الہ آبادی پر مولانا کے مضامین حرفِ آخر کہے جا سکتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد نے فنِ سوانح نگاری میں جو مہارت حاصل کی اس کا پورا اندازہ عام طور پر اسوقت ہوا جب ان کی لکھی ہوئی چند سوانحی کتابیں منظرِ عام پر آئیں اُن میں مولانا کے طرزِ تحریر کی انفرادیت بھی پورے طور پر نمایاں ہے اور حالات کو پیش کرنے کا خاص ڈھنگ نظر آتا ہے

سوانحِ حیات کے سلسلے میں مولانا کی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات:۔ یہ مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات و کمالات پر مشتمل ہے۔

۲۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ اکبر الہ آبادی کے حالات اور شاعرانہ کمالات پر مضامین کا مجموعہ۔

۳۔ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق:۔ مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کے اہم حالات اور کارناموں کا ذکر۔

۴۔ سیرتِ نبوی قرآنی:۔ قرآن شریف کی آیات کی مدد سے آنحضرت صلعم کی زندگی کے مختلف گوشوں کو پیش کیا ہے اور نہایت مربوط طریقہ سے ان کتابوں کے علاوہ مولانا کے مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں سوانحی مضامین بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کو سامنے رکھ کر سوانح نگاری کے اہم اصولوں کی کسوٹی پر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں اُنھوں نے جو تکنیک اختیار کی ہے اس میں کیا خوبیاں اور کیا خامیاں ہیں۔

حکیم الامت نقوش و تاثرات: یہ مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات اور کارناموں کا مرقع ہے مولانا اشرف علی بیسویں صدی کے علما و صوفیا میں۔ بہت ممتاز تھے۔ اسی لئے وہ اپنے تجدیدی کارناموں کے باعث "حکیم الامت" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس آخری دور میں اُن سے بہتر اور عام تصوف و سلوک کا باعمل مرشد شائد ہی کوئی دوسرا نظر آئے۔

مولانا عبدالماجد نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں مولانا تھانوی کا تعارف اور اپنی کتاب کا سببِ تصنیف جس انداز میں تحریر کیا ہے اُس سے نہ صرف یہ کہ کتاب کے مواد پر روشنی پڑتی ہے بلکہ خود مولانا عبدالماجد کے انداز سوانح نگاری

ور اس کے مقاصد پورے طور پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان کے انوکھے طرز تحریر نے لطیف اشارات و کنایات کی مدد سے ساری اہم باتوں کو مختصر الفاظ میں سمیٹ لیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"حکیم الامت امام اشرف علی تھانوی بزرگ کس مرتبہ اور ولی کس پائے کے تھے، اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو۔ اپنے کو تو اس کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی اس لئے اگر کسی صاحب نے اس کتاب کو اس ارادے سے کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبۂ معرفت و ولایت کی تفصیل درج ہوگی۔ یا ان صفحات میں حضرت کے مناقب عرفانی و مدارج روحانی کا بیان ہوگا تو خیر اسی میں ہے کہ آگے وہ ورق گردانی کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائیں اور کتاب کو بے پڑھے بند کی بند رہنے دیں .... یہ مجموعہ اوراق نہ کتاب المناقب ہے نہ ملفوظات مرشد، یا سیرت الشیخ اس کا موضوع ان سب سے الگ ہی نہیں سب سے پست بھی ہے حضرت شیخ کے کمالات و فضائل جو کچھ بھی ہوں بہرحال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بھی تو اس صدی میں ہوئے ہیں۔ اُن کی عمر کے آخری پندرہ سولہ سال کے زمانہ میں اس نامہ سیاہ" کو اُن سے نیاز اور گہرا نیاز حاصل رہا۔ اور اُس نے اپنے ہلکے تجربے اور سابقہ میں اُنھیں ایک بہترین انسان پایا۔ ان کی اسی انسانی زندگی کا ہلکا سا عکس ان نقوش و تاثرات کے اندر بند کر دینے کی کوشش اُلٹی سیدھی آپ کو یہاں ملے گی۔ اور چونکہ اُن کی انسانیت اُن کے مفتی و فقیہ اور درویش ہونے سے الگ کی بھی نہیں جا سکتی اس لئے ضمناً ذکر اُن کے علم و فضل، تفقہ، سلوک کا لانا بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔

ع:۔ بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر"

مولانا عبدالماجد نے نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اپنے مقصد کو بڑے پُر اثر انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے اُن کے اُصول سوانح نگاری پر روشنی پڑتی ہے۔ اور با مقصد سوانح نگاری کے خد و خال بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اُنھوں نے پوری کتاب میں اُنھیں مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے جس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے حالی کی سوانح نگاری کے سلسلہ میں لکھا ہے:۔

"سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ حالی کے یہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے اُن کی کتاب کو مذاقی مداحی" "کتاب المناقب" اور یک رُخی تصویر" کہا گیا ہے مگر اس قسم کے اعتراضات تو باسویل (BASWEL) کی کتاب "لائف آف

جانسن" (LIFE OF JOHNSON) پر بھی کئے گئے ہیں۔ حالانکہ سوانح نگاری میں یہ دلیل راہ کا کام دیتی ہے۔ سرور صاحب کے اس حقیقت افروز بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد کے اندر ہمدردی کا وہ وصف پوری طرح موجود ہے جس نے ان کو ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد دی۔ حالی کی حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب کو بعضوں نے "مدلل مداحی" قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ "یک رُخی تصویریں" ہیں۔ لیکن اس دعوے میں صداقت جتنی بھی ہو یہ بہرحال تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہیرو کے فضائل و مناقب سوانح حیات کا لازمی جزو ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تصویر کا ایک ہی رُخ دکھانے سے سوانح نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مولانا عبدالماجد نے "حکیم الامت" میں مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات ایک خاص زاویۂ نگاہ سے پیش کئے ہیں۔ اُنھوں نے مولانا کو ایک مکمل رہنما اور محسنِ انسانیت کی حیثیت سے پیش کیا ہے نہ یہ کہ اُن کے نام و نسب اور طول طویل خاندانی حالات لکھ کر اصل مقصد کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ سوانح نگاری کے عام اصولوں سے ذرا ہٹ کر چلنے کی پہلی کوشش ہے۔ اُنھوں نے حکیم الامت کے متعلق جن جذبات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے ان کی روشنی میں "مدلل مداحی" والا جو الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ اُن پر بھی صادق آسکتا ہے۔ وہ اپنے مرشد تھانوی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اپنی اس چھپن سال کی زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے، اللہ والوں میں خود اپنی والدہ اور ہمشیرہ ہی کو دیکھا، بڑے بڑے عابد زاہد، متقی، تہجد گذار نظر سے گزرے یہاں تک کہ سرسید کی زیارت ملا کہ حرم میں وقت کے مجاہد اعظم شیخ سنوسی ثانی کی بھی نصیب رہی، لیکن اصلاح و ارشاد کی مسند نشین کا حق دار اپنے پندرہ سولہ سال کے تجربہ میں جیسا حضرت تھانوی کو پایا کسی اور کو نہ پایا۔"

ع: عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں"

مولانا عبدالماجد نے مذکورۂ بالا عبارت میں جس گہری عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے اور مختصر الفاظ میں جو مداحی کی ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی بہ حیثیت ایک انسان متعارف کرانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اُنکی مداحی کی بنیاد اُس غیر معمولی عقیدت پر ہے جو اُن کی عملی زندگی کو دیکھ کر مولانا عبدالماجد کے دل میں پیدا ہوئی۔

اس کتاب میں مولانا عبدالماجد نے سوانح نگاری کے عام اصولوں سے انحراف کر کے ایک نیا انداز اختیار کیا ہے۔ مولانا حالی نے سوانح نگاری

ا تنقید کو بھی شامل رکھا ہے۔ "حیاتِ سعدیؔ" ر یادگارِ غالبؔ" دونوں میں سوانح اور تنقید دونوں موجود ہیں۔ لیکن "حیاتِ جاوید" جو بعد میں ھی گئی ہے ایک ایسی مکمل سوانح عمری ہے جس ں صرف حالات ہیں، تنقید نہیں ہے۔ حالیؔ کا صول یہ تھا کہ وہ حالات پر بہت زیادہ ور نہیں دیتے ہر چیز کا جائزہ تنقیدی نقطۂ ظر سے لیتے ہیں۔ اُن کی سب سے زیادہ توجہ پنے ہیرو کے کارنامے نمایاں کرنے میں رہتی ہے۔ ولانا عبدالماجد نے حقائق و دلائل کے ساتھ ولانا تھانوی کی زندگی کے حالات اور روزمرہ کے معمولات کو اپنے مشاہدات کے بعد بیان کیا ہے۔ اس میں اُن کے اندازِ بیان نے مزید دلکشی پیدا کر دی ہے۔ جب مولانا تھانوی سے اُن کی پہلی باقاعدہ ملاقات ہوئی اور ان کی مجلس میں شریک ہوئے تو اس وقت کے تاثرات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"یہ نشست حضرت کی خاص سہ دری میں ہوئی۔ درمیان میں شرقی غربی دیوار سے متصل ڈیسک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر حضرت تشریف فرما۔ ہاتھ میں تسبیح، ایک چھوٹی گھڑی سامنے، ڈیسک پر قلم دان وغیرہ کے ساتھ رکھی ہوئی۔ دوسری بڑی گھڑی، دھوپ گھڑی کے حساب والی دیوار میں لگی ہوئی داخلہ والے در پر حضرت کا نظامِ عامہ اوقات لگا ہوا۔ غافل انسان کو وقت کی قیمت اور اہمیت کا سبق دینے والا۔ بائیں طرف مولانا بٹھائے گئے اور اُس کے بعد ہم لوگ .... بیٹھنے بٹھانے سب کے آداب، قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے، ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ ہر بات میں نظم و آہنگ۔ یہ تو مجلس خاص اور خصوصی تھی، بعد میں بعد ظہر "مجلس عام" میں بھی قاعدہ یہ تھا کہ حضرت کے داہنے ہاتھ پر سہ دری میں جو جگہ پڑی ہوئی تھی" وہ عام طالبین و واردین کے لئے تھی۔ ہر شخص جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے۔ کسی دوسرے کو نہ اُٹھائے نہ کھسکائے۔ بائیں طرف جگہ نسبتہً تنگ تھی کوئی سات آٹھ شخصوں کے بیٹھنے بھر کی، اُدھر مخصوص بٹھائے جاتے تھے، دو چار شخص سامنے بھی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک ایک در کی دیوار کی آڑ میں بغیر دوسرے کے حق میں حجاب بنے۔

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

مصرعہ سُنا یا ہوا ہزار مرتبہ کا تھا۔ "شنیدہ" اور "دیدہ" کے درمیان فرق کا درجہ اب بالکل واضح ہوا رعب و ہیبت کی کیفیات میں اب خاصا فرق آ گیا تھا۔ اور حاضری کے بعد معلوم ہو گیا تھا کہ مولانا محض نور کے بنے ہوئے اور تقدس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے فرشتے نہیں، آب و گل سے ترتیب پائے ہوئے

انسانی دل، بشری جذبات رکھنے والے انسان ہیں۔"

سوانح نگار کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کے اچھے بُرے افعال کا محاسبہ کرے یا اُس کی پردہ داری کرے، بلکہ اُس کا فرض یہ ہے کہ دیانت داری کے ساتھ اور سلیقہ مندی سے اپنی معلومات و مشاہدات کو اچھے پیرائے میں پیش کرے۔ اس اصول کی روشنی میں مولانا عبدالماجد کی لکھی ہوئی سوانح کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اُنھوں نے اس اصول کی کتنی پابندی کی ہے۔ ایک اچھے سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تفصیلات کے انتخاب میں کسی اہم پہلو کو نظر انداز ہونے دے۔ "حکیم الامت" میں لکھتے ہیں۔

.... کوئی سوا نو ساڑھے نو پر خانقاہ پہونچ جاتا۔ گھر سے دو قدم پر تھی۔ ہی، حضرت سہ دری میں تشریف فرما ہوتے، ہاتھ میں تسبیح کبھی ہوتی کبھی نہ ہوتی۔ بائیں طرف دیوار میں دھوپ گھڑی کے حساب سے وقت بتانے والی بڑی گھڑی لگی ہوئی ... اس کے نیچے بیٹھنے کا ایما فرمایا جاتا۔ ایک جیبی گھڑی کھلے ہوئے کیس Case میں حضرت کے سامنے ڈیسک پر رکھی رہتی، دو چار لوگ اور آجاتے، عموماً اہل تخصیص ہی ہوتے، بڑا مجمع کبھی نہ ہوتا۔ نشست کوئی ڈیڑھ گھنٹہ رہتی، باتیں ہر قسم کی ہوتی تھیں، گفتگو کا بیشتر حصہ مولانا خود فرماتے، لیکن ہم لوگوں کو بھی بے تکلف بولنے چالنے، پوچھنے پاچھنے، سوال جواب کرنے کی اجازت تھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی مسائل کے سوال پر، یا خود مولانا کسی فقہی، کلامی، تفسیری، یا سلوکی مسئلہ پر کوئی مستقل اور مسلسل تقریر ذرا لمبی شروع فرما دیتے جسے حاضرین بڑے انشراح قلب کے ساتھ سنتے لیکن ایسا بہت کم ہوتا عموماً اور بیشتر یہ تھا کہ معمولی طرز پر دو دوستوں کے درمیان جیسے گفتگو ہوا کرتی ہے یہی رہتی بغیر اس کے سننے والوں کے دماغ پر کسی قسم کا بار پڑے

"حکیم الامت" میں مولانا نے مختلف پہلوؤں سے مولانا تھانوی کی زندگی کے حالات اور شخصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اُنھوں نے سوانح نگاری کے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر جو واقعات اور حالات جہاں مناسب سمجھا بیان کر دیئے ہیں۔ کتاب کا بیشتر حصہ اُن کی باہمی خط و کتابت پر مشتمل ہے جو دونوں کے درمیان ہوتی رہی اُن کو مرتب نے اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ وہ سوانح عمری کا ایک جزو معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد کے ایک خط کا اقتباس

مولانا کے ایک خط کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

تو پچھلے زمانۂ حاضری کی ممنونیت کی داستان
یہاں تک پھیلاؤں البتہ اتنی شکر گزاریوں کے
ساتھ ایک شکایت بھی ہے اُسکا اظہار ضروری ہے
(الف) شکایت یہ ہے کہ ابکی جب حاضر ہوا۔ تو
تاریخ و وقت حاضری صرف ظن غالب کے طور پر
عرض کیا تھا لیکن جناب نے اسٹیشن تک زحمت
فرمائی۔ میں اُس گاڑی سے پہنچنے سے معذور رہا
اس کا علم مجھے ایک عرصہ کے بعد محض اتفاقاً مولوی
محمد محمود صاحب سے ہوا (ب) دل کو بڑی
ندامت و تکلیف ہوئی۔ (ج) آئندہ کے لئے ادب
کے ساتھ دست بستہ اس قسم کے اخلاق سے
معافی چاہتا ہوں۔ (د) مجھے اس سے بجائے
راحت کے تنگی ہوتی ہے۔"

اس طویل خط کا جو مختصر جواب مولانا تھانوی
نے دیا تھا اُس کے وہ حصے درج ذیل ہیں۔
جو مذکورہ بالا اقتباس کے متعلق ہیں۔ ہر جواب
مختصر اور ایک جملہ میں ہے۔"

(الف) "بہت ضروری ہے۔ ع:۔ بے شکایت
نہیں ذوق محبت کے مزے۔ مگر جیسے شکایت
میں مجھکو مزہ آیا، اُمید ہے کہ اس روایت کے
خلاف واقعہ ثابت ہونے سے آپ کو اس سے
زیادہ مزہ آئے گا۔

(ب) یہ آپ کا اجتہاد تھا۔ نہ میں نے اُن سے ظاہر
کیا نہ واقعۃً اس مقصد سے گیا تھا اس وقت یہ تو
مجھے یاد نہیں رہا کیوں گیا تھا۔ خاص کر جب اپنے
دوست پر بار پڑنے کا احتمال ہو۔

(ج) "اس کے ذمہ دار سر دفتر صاحب ہیں۔
(محمود صاحب) میں نہیں۔"

(د) "میں تو واقعی آپ کے دست بستہ ہونے سے
پہلے ہی پابستہ ہوں، میں کبھی تکلیف دینا نہیں
چاہتا۔ اطمینان فرمائیں۔"

دونوں خطوں کے اقتباسات سے مولانا تھانوی
کی زندگی کے کئی گوشے سامنے آجاتے ہیں۔
اُسی کے ساتھ سوانح نگار کی عقیدت، محبت
اور احتیاط کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس کو سوانح
نگاری کا ایک انوکھا طرز کہا جا سکتا ہے۔

مولانا عبدالماجد کی یہ کتاب شروع سے
آخر تک اسی طرز اور نرالے انداز میں لکھی ہوئی ہے
اس کتاب کو دیکھنے والا پہلی نظر میں مضامین
کی بے ربطی اور عدم تسلسل کو دیکھ کر اکتاہٹ
محسوس کرتا ہے۔ کیوں کہ مولانا عبدالماجد نے
عام سوانح نگاروں کی طرح کتاب کو نہ تو ابواب
و فصول پر تقسیم کیا ہے نہ مضامین کی ترتیب کا
کوئی نظام ہے۔ اس کو ان کی سوانح نگاری کی
ایک خامی بھی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جب ہم کتاب
کا مطالعہ کرتے ہیں تو مولانا کی دل کش انشاء
پردازی اور انوکھے طرز تحریر کی کشش ہمیں آگے
آگے بڑھنے کی دعوت دیتی ہے اور پوری
کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو مسرت
ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ سب اس کے

سامنے آگیا۔

حکیم الامتؒ کا انداز ایک داستان کا سا نظر آتا ہے کہ جس میں بات سے بات اور قصہ سے قصہ پیدا ہوتا ہے۔

ایک بار مولانا عبدالماجد جب اپنے مرشد مولانا تھانوی سے ملنے تھانہ بھون گئے تو اس وقت کے حالات سفر لکھتے ہوئے اُنھوں نے تھانہ بھون پہنچنے پر اپنی دلی مسرت کا اظہار دل کش انداز میں کیا ہے اور اُسی کے بعد مولانا تھانوی کے معمولات کو اس طرح بیان کیا ہے، کہ مختصر الفاظ کو میں ان کی زندگی کی بہت سی اہم باتیں معلوم ہو جاتی ہیں لکھتے ہیں:۔

معمول یہ تھا کہ طالبین و سالکین کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ لوگ آتے اور اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کرتے خانقاہیں ٹھہر جاتے اُن میں اچھے اچھے ذاکر و مشاغل ہوتے اور ان میں سے بعض بعض تو اپنے زہد و ریاضت کی بنا پر خود قابل زیارت ہوتے لیکن یہ لوگ ملنے ملانے کے ڈھب سے زیادہ واقف نہ ہوتے دن کو دن رات کو بھی اگلے اور پچھلے حصوں میں اپنے کام میں لگے رہتے کام سے مراد محض نوافل و اوراد ہی نہیں بلکہ تدبیر کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں بھی ان حضرات کو تامل نہ ہوتا۔ سادگی، اخلاص، بے طمعی، بے نفسی کے بیسوں سبق اُن لوگوں کی زندگیوں کو دیکھ کر سیکھے جا سکتے تھے

حکیم الامت اسی انداز کی سوانح عمری ہے۔ جس کا کچھ انداز مذکورہ بالا اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے اُردو میں سوانح نگاری پر یقیناً اپنے طرز کی یہ پہلی کتاب ہے جس کو ایک صاحب طرز انشا پرداز اور ماہر فن سوانح نگار نے اپنے مخصوص انداز میں مرتب کیا۔

محمد علی ۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق

رئیس الاحرار مولانا محمد علی ہندوستان کے محبوب سیاسی رہنماؤں میں گزرے ہیں اور بقول مولانا عبدالماجد وہ مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے سردار تھے۔ یہ کتاب مولانا عبدالماجد نے اپنی ذاتی یادداشتوں کی مدد سے مرتب کی ہے اسی لئے اُنھوں نے اس کا نام "ذاتی ڈائری کے چند ورق" رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس عظیم ہندوستانی رہنما کی زندگی کا حقیقی مرقع ہے۔ اور اس کے اندر وہ بہ حیثیت کہ انسان ایک عظیم سیاسی رہنما اور بے مثل قائد کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس طرح اس کتاب کو سوانح نگاری کا ایک انوکھا شاہکار کہا جا سکتا ہے کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد نے کتنی محنت اور کاوش سے یہ کام انجام دیا ہے۔

مولانا عبدالماجد کو جس طرح اپنے مرشد حکیم الامت اور مولانا اشرف علی تھانوی سے بڑی عقیدت تھی اُس طرح اُن کو مولانا محمد علی سے بے پناہ محبت تھی۔ جس کا اظہار اُنھوں نے خود ان الفاظ میں کیا ہے:-

"عقیدت دینی، مذہبی، روحانی رنگ کی بس زور و قوت، جوش و ولولہ کے ساتھ حضرت حکیم الامت کے ساتھ ہوئی کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ تھی۔ لیکن عقیدت سے ذرا ہٹ کر ایک شئے محبت بھی ہے یہ جذبہ اُسی جوش و قوت کے ساتھ محمد علی سے تھی، گویا ایک مقتدا تھے تو دوسرے محبوب رہا"[۱۵۰]

مولانا عبدالماجد کو پہلی بار انیس سو بارہ میں مولانا محمد علی سے ملاقات کا موقع ملا اس کے کچھ دنوں بعد خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا تعلقات بڑھتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۳۱ء تک (یعنی محمد علی کا سال وفات) یہ تعلقات قائم رہے عبدالماجد صاحب کو اُن کی رفاقت میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اُن کی زندگی میں اُنھوں نے بہت قریب سے مولانا محمد علی کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ اس لئے ان کے حالات اور کارناموں کو پیش کرنے والا ان سے بہتر کوئی دوسرا شائد نہیں ہے۔ یہ کتاب اصطلاحی معنوں میں ایک باضابطہ سوانح عمری نہیں کہی جا سکتی۔ کیوں کہ اس کی ترتیب سوانح نگاری کے مروجہ اصولوں پر نہیں کی گئی۔ بلکہ ایک سن وار ڈائری کی صورت میں مرتب کی گئی۔ لیکن مولانا عبدالماجد نے اس کی ترتیب میں سوانح نگاری کے بعض اہم اصولوں کو برتا ہے اور یہ کتاب اُن بنیادی مقاصد کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے جو سوانح نگاری کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ حالانکہ خود مولانا عبدالماجد اسکے سوانح عمری ہونے کی تردید کی ہے وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"آئندہ صفحات میں میں نے اپنے تاثرات و مشاہدات کو یکجا قلمبند کر دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بالکل الگ چیز ہے کوئی صاحب اس ذاتی ڈائری کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمائیں۔"

مولانا عبدالماجد کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ مولانا محمد علی کے حالات اور کارناموں کو سوانح نگاری کے اصولوں پر نہیں لکھا گیا ہے اس لئے اس کو ایک مکمل سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا اور کسی حد تک درست بھی ہے نہ اس میں ان کا نام و نسب ہے اور نہ خاندانی حالات نہ ابتدائی تعلیم و تربیت اور نہ دوسرے ضروری واقعات و حالات لیکن اس میں مولانا محمد علی کی شخصیت انھیں تمام خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر

نظر آتی ہے اور حقیقت میں سوانح عمری کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ صاحبِ سوانح کی زندگی کے اصل خد وخال سامنے آئیں اور مولانا عبدالماجد کی کتاب اس مقصد کو پورا کرتی ہے۔

کامیاب سوانح نگار وہی ہوتا ہے جس کو اپنے ہیرو کے ساتھ دلچسپی بھی ہو، اور ہمدردی بھی ہو، وہ اس کی نفسیات کو بخوبی سمجھتا ہو، یہ بات اس وقت ممکن ہوتی ہے جب لکھنے والے کو ہیرو کی قربت و رفاقت حاصل بھی ہو۔ اور اس کے حرکات وسکنات کا اس نے بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہو، اس کے خلوت وجلوت کے مشاغل اُس کی نگاہ کے سامنے رہے ہوں۔ مولانا عبدالماجد کو برسوں مولانا محمد علی کی رفاقت حاصل رہی، ان کے رفیق کار بھی رہے، اس لئے بلاشبہ ان سے بہتر محمد علی کی زندگی پر روشنی ڈالنے والا اور کون ہوسکتا ہے پھر اُن کے مخصوص ومنفرد اندازِ تحریر نے حالات وواقعات کے بیان میں جان ڈال دی۔ اور حد درجہ دلچسپ ہونے کے ساتھ عبرت ناک اور سبق آموز بھی

مولانا عبدالماجد کی پہلی ملاقات مولانا محمد علی سے ۱۹۱۲ء میں ہوئی، ملاقات تو سرسری تھی لیکن اس کو جس انداز سے مولانا عبدالماجد نے بیان کیا ہے وہ اُنھیں کا حصہ ہے اور اس سے ان کی فنِ سوانح نگاری میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے مولانا محمد علی لکھنؤ آئے تھے۔ راجہ محمود آباد کی کوٹھی میں ان کے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے عبدالماجد صاحب نے اُن کی جو قلمی تصویر کھینچی وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

"علی محمد خاں وسیع ڈرائنگ روم کے صدر میں تشریف فرما، سامنے ایک بڑی لمبی میز، دور دور کرسیوں کی قطار، میز کی ایک سمت میں ایک جوان رعنا، تندرست و تنومند کوئی ۳۳، ۳۴ سال کی عمر کا۔ اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا۔ داڑھی تازی مُنڈی ہوئی، مونچھیں ذرا گھنی اور نوکیلی، ذہانت بشرہ سے جھلکتی ہوئی۔ شوخی و ذکاوت چہرہ سے برستی ہوئی، ممبروں میں ایک سے ایک قابل و فاضل، اس کے بڑے اور مخدوم بھی لیکن نظر بار بار اسی کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ اور کان اُسی کی آواز پر لگے ہوئے۔ وہ بولا تو سب سننے لگے، وہ ہنسا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا، مگر متوجہ سب ہی ہو گئے۔

یہ تھا کامریڈ کا شہرۂ آفاق اڈیٹر محمد علی رام پور کا باشندہ اور علی گڑھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ، جس کا جادو نگاری اور انگریزی انشا پردازی کا سکہ اس وقت بھی لوگوں کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا، حالانکہ کامریڈ کو نکلے ہوئے ابھی سال ہی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا اور اردو روزنامہ ہمدرد کا ابھی وجود بھی نہ تھا۔"

ایک اور موقع پر مولانا محمد علی کی وضع قطع

[redacted]

س، اور بعض عادات پر اختصار کے ساتھ اس طرح
شنی ڈالی ہے کہ جس سے اُن کے ذاتی حالات
بہت سے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور ان
سوانح عمری کے کئی پہلو نظر آتے ہیں:۔
جوانی میں بڑے خوش رُو، وجیہ، تندرست
توانا، کلے ٹھلے کے تھے، اپنے بڑے بھائی
ولانا شوکت علی سے تو بہرحال کم لیکن پھر بھی
چھے خاصے تنومند، چہرہ ہشاش، بشاش،
بُشرہ سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ آنکھیں بڑی
چمک دار۔ بڑے خوش وضع، بڑے خوش لباس
پوشاک زیادہ تر انگریزی سُوٹ، لیکن کبھی کبھی
ٹھیٹھ ہندوستانی اور مشرقی بھی، ڈاڑھی منڈی
ہوئی، مونچھیں کسی قدر چڑھی ہوئی، جنگ بلقان
۱۲ء اور پھر انجمن خدام کعبہ ۱۳ء کے زمانہ سے
وضع و لباس سب میں تبدیلی شروع ہوئی،
سن اس وقت ۳۴۔ ۳۵ کا ہوگا مونچھیں کتری
گئیں۔ داڑھی رکھائی گئی۔ اور پھر بڑھائی گئی،
لباس رفتہ رفتہ سادہ اور خالص مسلمانوں
کا سا ہوگیا، جاڑوں میں سیاہ رنگ کی بالدار،
اور گرمیوں میں سفید کھدّر کی اُونچی کشتی نما ٹوپی
جس کا نام بھی "محمد علی کیپ" مشہور ہوگیا۔
گاندھی کیپ کی دوگنی، کھدّر کا سادہ جیب
دار کرتا، اور پاجامہ، اُوپر سے ڈھیلی ڈھالی
رنگین عبا۔ یعنی یہی وہ سادہ لباس تھا جس
پر پنڈت مدن موہن مالوی نے دانستہ یا نادانستہ

پھبتی "بیگم صاحبہ بھوپال کے لباس" کی کہی تھی۔)
بَلا کے جامہ زیب تھے، جو بھی کپڑا پہن لیا بس
وہی پھب گیا۔ آخر میں عینک بھی مستقل حاجت
ہوگئی تھی۔ بال بہت جلد سفید ہونے لگے، سر کے
بال بڑے اور پٹوں کی شکل میں تھے "ذیابیطس"
اور فکروں سے گھُل گھُل کر دُبلے ہو جانے کے باوجود
بھی چہرے کی وہ پھبن آخر دم تک قائم، تقویٰ
و عبادت الٰہی سے چہرہ پر جو خاص قسم کی
نورانیت پائی جاتی ہے۔ وہ اس کے علاوہ آواز بلند،
جس محفل میں ہوتے سب پر چھا جاتے، صد درجہ
بذلہ سنج، حاضر جوابی میں اپنا جواب آپ،
ہنسنے ہنسانے میں برق، ساتھ ہی رونے
رُلانے میں بھی فرد۔ ہنسی اور آنسو دونوں
معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے
ہوئے ہیں ـــــ محبت کی آنکھ اندھی ہی
کیوں نہ کہی جائے۔ بہرحال اپنا حال تو یہ تھا
کہ صورت بھی محبوبیت میں سیرت سے کچھ کم
نہ تھی۔

ترکِ من ایں مہ غلام رُوئے تو
جملہ ترکانِ جہاں ہندوئے تو"

مولانا عبدالماجد کی یہ کتاب مسلسل اور مکمل
سوانح عمری نہیں ہے، جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا
ہے لیکن اُنھوں نے اپنی یادداشتوں کو اس
خوبی سے مرتب کیا ہے کہ اسی کتاب کے اندر
ہمیں مولانا محمد علی کی ساری زندگی کا پورا عکس

نظر آتا ہے۔ کتاب میں بیشتر حالات اور واقعات
سیاسی اور نیم مذہبی نوعیت کے ہیں جن کا تعلق محمد علی
مرحوم کی زندگی سے ہے اس میں ہندوستان کی سیاست
ہندوستانی لیڈروں کے پوست کندہ حالات
بھی ضمناً آگئے ہیں، اور اسی میں جا بجا سوانح
نگاری کے دلکش مرقعے بھی نظر آتے ہیں عبدالماجد
نے عام حالات کے ساتھ اپنے ہیرو کی زندگی
کے بیشتر نجی و ذاتی حالات کو بھی بڑی خوبی سے
پیش کر دیا ہے۔ ایک اور اقتباس پیشِ نظر ہے۔

"قیدی جب جیل سے چھوٹتے ہیں تو سیدھے
اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں، اور غریب سے غریب قیدی
بھی کوئی نہ کوئی اپنی جھونپڑی رکھتا ہے... محمد
علی "غریب" کا گھر اب تھا کہاں؟ رام پور وطن
تھا۔ وہاں اُن کی پختہ حویلیاں تھیں۔ وہاں اُن
کا بچپن گزرا تھا، لڑکپن گزرا تھا، جوانی کا ایک
حصہ گزرا تھا۔ گھر کے صحن میں یہ دوڑے [illegible]
کھیلے کودے تھے، گھر کے مکتب میں یہ [illegible]
بیٹھے تھے، وہیں شادی بیاہ ہوا تھا، دعوتیں [illegible]
ضیافتیں، جلسے سب ان ہی گھروں میں ہوئے
تھے۔ رام پور کے چپہ چپہ سے گلی گلی سے محمد علی
کا دل اٹکا ہوا تھا۔ اب وہاں قدم رکھنے کی
بھی اجازت نہ تھی، اسلامی ریاست [illegible] کے
فرمانروا ہز ہائی نیس نواب حامد علی خاں بہادر
والی رامپور کا فرمان قضا توام یہی تھا۔ محمد علی
کے ہی دردانگیز لفظوں میں سے

پھر گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے
ہم نہ تھے اُن کے آستانے کے

گھر والوں پر کچھ بھی گذر جائے، بیوی، بچیاں،
ماں، بہن کوئی بھی بستر مرض پر کیا معنی بستر مرگ
پر بھی ہو مجال نہ تھی کہ محمد علی اور شوکت علی
رام پور اسٹیشن سے آگے شہر کی طرف قدم اُٹھا
سکیں۔ بیچاری کو جس طرح بن پڑتا۔ لاد پھاند
کر شہر سے اسٹیشن کے ویٹنگ روم تک لے
آئے۔ اللہ کے گھر کی خدمت کا عزم و حوصلہ
رکھنے والے کو سزا اس دنیا میں یہ خوب ملی کہ
خود اُسی کو بے گھر بے در کر دیا گیا۔

بیمار بدقوق لڑکی جب اُسی نومبر ہی کے
مہینہ میں پہاڑ سے حالتِ یاس میں واپس لائی گئی
تو یہی سوال ایک مہیب صورت کے ساتھ منہ
کھولے، آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا کہ اُس
دُکھیارے قافلہ کو لے کر آخر کہاں جایا جائے
ناظرین آگے بڑھنے سے قبل ذرا اس صورتِ
حال کا تصور و مشاہدہ کے ساتھ اپنے ذہن
کے سامنے لے آئیں کہ خدانخواستہ اگر اس طرح کا
کوئی واقعہ ہم کو پیش آ جائے تو کیا گذر گئی ہے
اللہ کی شان کہ سات کروڑ مسلمانوں کا مقبول
ترین، اور محبوب ترین لیڈر اور خود ملک
ہندوستان کا بھی نامور لیڈر اور کانگریس
کا صدر، اس کے اوپر وطن کی سرزمین یوں تنگ۔
خیر جوں توں علی گڑھ پہونچے۔ جامعہ ملیہ

بھی تک علی گڑھ ہی میں تھی، دہلی منتقل نہیں ہوئی تھی۔ اُسی کے احاطہ میں ایک بنگلہ لے کر رہنے لگے تھے۔ س خانہ بدوشی میں یہی اُن کا وطن تھا۔ معاش کا سہارا بھی کہیں سے بھی نہ تھا۔ نورِ نظر کی مُہلک علالت سب پر مستزاد، بے چارے کو قومی و ملّی مصروفیتوں سے مہلت اتنی بھی نہ ملتی کہ تیمار داری جی بھر کر کر سکیں۔ کہا کرتے تھے کہ قومی و ملّی مصائب نے میرے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا ہے جیسے موسیٰ کا عصا ساحروں کے سانپوں کو نگل گیا تھا۔"

اچھے سوانح نگاروں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہیرو کے اخلاق و عادات اور اُس کی گھریلو زندگی کے صحیح حالات سے پوری طرح واقف ہو تاکہ اُن کی روشنی میں اس کی شخصیت کا جائزہ لے سکے۔ اور اُس کی سیرت کے اچھے بُرے پہلو سامنے آ سکیں۔ جس کے بغیر کسی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

مولانا محمد علی ذاتی ڈائری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد اپنے پورے طور سے محمد علی کی نجی زندگی سے بھی واقف تھے اور انھوں نے کتاب میں موقع بہ موقع ہر قسم کے حالات کو ضمناً پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ذاتی ڈائری حالات کے سلسلہ میں ایک موقع پر کتنی معلومات نہایت دل آویز پیرائے میں پیش کی ہیں:۔

"بیگم محمد علی رہیں ہمیشہ برقع میں اور پورے شرم و لحاظ کے ساتھ، چہرہ نقاب سے چھپا ہوا لیکن رہتیں ہر جلسہ میں، ہر سفر میں، ہر مجمع میں، خلافت کانفرنس میں، برابر ساتھ ساتھ، اور جلسوں کی کارروائیوں میں بھی تھوڑا بہت حصہ لے لیا کرتیں۔ عورتوں کے مجمع میں تقریر بھی کبھی کبھی کر دیتیں — اور دو ایک بار مردوں کے جلسوں میں بھی بول دیں۔ انتقال غالباً ۱۹۴۶ء میں فرمایا ——— تجدد کی رَو میں بہی ہوئی روشن خیال بیویاں کاش بی اماں مرحومہ (مولانا کی والدہ ماجدہ) اور اُن کی اہلیہ امجدی بیگم صاحبہ کی مثالوں سے سبق لیتیں کہ قومی کاموں کے لئے بے حیائی کیا معنی، بے پردگی بھی ہرگز لازمی نہیں، آئینِ حجاب کی پابندیوں کے ساتھ بھی سارے قومی کام بے تکلف انجام پاتے رہے۔"

"محمد علی کی مہمان داری بھی قابلِ دید تھی، میں جب کبھی مہمان ہوتا خاطر داریوں کو حدِ اسراف تک پہونچا دیتے رکھانے ضرورت سے بھی زائد ہوتے، میری حیثیت سے بھی زائد اور اُن کی جیب کی گنجائش سے بھی زائد حق گوئی و حق نگاری میں تو یوں بھی محمد علی اپنی نظیر آپ تھے ہی، مہمان نوازی اور سیر چشمی بھی اس درجہ کے کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ کھانا اکیلے میں کھانا جانتے بھی نہ تھے۔ اور پھر کھانا بھی "نا پ تول" اور "تنگ طعام" نہیں دسترخوان اچھا خاصہ چھوٹے

مونے رئیس کا معلوم ہوتا تھا اچھے سے اچھے سالن،
قورمہ، قیمہ کباب کی متعدد پلیٹیں، طرح طرح
کے لذیذ اور پر تکلف، نمکین اور میٹھے کھانے
کبھی مرغ، کبھی مچھلی خشک میوے، تازے
پھل خود کھاتے اور دوسروں کو زبردستی کرکے
کھلاتے۔"

اس کتاب کی نوعیت بھی لگ بھگ "حکیم الامت" سے ملتی جلتی ہے اور دونوں کو جدید فن سوانح نگاری کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ مولانا عبدالماجد جہاں اردو کے صاحب طرز انشاپرداز ہیں وہاں فن سوانح نگاری کی ٹکنیک اور اس کے حسن و قبح سے پوری طرح واقف ہیں اور انھوں نے اردو میں سوانح نگاری کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔

"اکبر نامہ" مولانا عبدالماجد نے اردو کے باکمال شاعر اکبر الہ آبادی پر متفرق مضامین لکھے ہیں، یہ ان کا مجموعہ ہے اکبر کو ظرافت اور طنزیہ شاعری میں جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہ ہوسکی وہ اپنے رنگ میں یکتا تھے اور ان کے بعد کوئی ان کی تقلید نہ کرسکا۔

اکبر نامہ سوانح عمری نہیں ہے مگر اس میں جابجا ایسے سوانحی خاکے موجود ہیں جن کی مدد سے اکبر کی زندگی اور ان کے فن سے خاصی واقفیت ہوجاتی ہے۔ اکبر کا تعارف عبدالماجد ان الفا[ظ] میں کراتے ہیں:۔

"لسان العصر حضرت اکبر مغفور زمانہ حال [کے] ان چند بزرگوں میں تھے۔ جن کا نظیر مدتو[ں] میں جا کر پیدا ہوتا ہے ان کی ذات ایک طر[ف] شوخی اور زندہ دلی، اور دوسری طرف حکمت اور روحانیت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی۔ یا یوں کہئے کہ معجون۔ آخر میں نہ ان کی شاعری شاعری رہی تھی نہ ان کا فلسفہ فلسفہ، اُس کا سب کچھ بلکہ خود ان کا وجود حکمت و معرفت [کے] سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ ان کی گفتگو جا[مع] تھی۔ ادب و حکمت و ظرافت کی، روزمرہ کے معمولی فقروں میں وہ وہ نکتے بیان کر جاتے ک[ہ] دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھتے اور باتوں باتوں کے چٹکلوں میں ان مسائل کی گرہ کشائی کر جاتے جو سالہا سال کے مطالعہ [سے] بھی حل نہ ہو پاتے۔"

ایک اور مقام پر جہاں اکبر کی شاعری پر نقد و تبصرہ کیا ہے وہاں ضمناً محض نجی حالات کا مرقع اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"آخر زمانہ میں حالت ٹھیک اس کے برعکس ہوگئی تھی پہلے چہیتی بیوی نے داغ مفارقت دیا پھر نوجوان محبوب بیٹا ہاشم رخصت ہوا جج صاحب کی پنشن ہوچکی تھی۔ آنکھیں خراب ہوگئیں، عاصہ [illegible] نے جواب دیا تھا

بزادے پردیس میں ملازم، مکان سُنسان،
باغ ویران، سامان آرائش غائب، ہرطرف
کا چھایا ہوا، ہُو کا عالم ایک حضرت اکبر خود یا
ھیٹر مرد ملازم، ایک بوڑھی ماما بس کل اتنی
دی۔ اس طرح ان متفرق مضامین میں جابجا
لی سیرت کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے
خلوت وجلوت دونوں کے حالات معلوم ہوتے
تاہم یہ ان کی سوانح عمری نہیں لیکن مولانا
بدالماجد کے اندازِ سیرت نگاری کو سمجھنے کے لئے
ں سے مدد ضرور ملتی ہے۔

قرآنی سیرت نبوی | پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی سوانح

ری قرآن کی آیت کی مدد سے مولانا عبدالماجد
نے بڑی محنت سے مرتب کی ہے اور اُردو میں
سوانح نگاری کے فن کو ایک نئے طرز سے واقف
کیا ہے قرآن کی مدد سے سیرت النبیؐ کی ترتیب
قرونِ وسطیٰ کے عرب عالموں کی ایجاد ہے۔ اور
اس سلسلہ میں فضیل بن عیاض کی کتاب "الشفا"
بہت مشہور ہے۔ جس میں آنحضرتؐ کی سیرت کو
بڑی تفصیل کے ساتھ قرآن کی مدد سے پیش کیا
ہے اس لئے مولانا عبدالماجد کے سامنے اس
طرز کے کافی نمونے عربی زبان میں موجود ہیں اور
اردو میں بعض کتابوں کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔
تاہم مولانا نے اُردو میں اس طرز کو اپنے مخصوص
اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اس نے ان کی یہ کوشش

اُردو میں فن سوانح نگاری کو ترقی دینے کی طرف
ایک کامیاب قدم ہے۔

سیرت النبیؐ قرآنی میں مولانا نے جو حالات
و واقعات پیش کئے ہیں ان کا انداز بے حد دلکش
اور متاثر کرنے والا ہے۔ اور ان کے طرز سوانح
نگاری کا ایک نہایت حسین مرقع کہا جاسکتا ہے
اور عام سوانح نگاری کی رہنمائی کے لئے ایک
نمونہ ہے لیکن اس پر بھی مکمل سوانح نگاری کا
اطلاق نہیں ہوتا۔

مولانا عبدالماجد کی سوانح نگاری کا ایک مختصر ناقدانہ جائزہ | مولانا عبدالماجد بہ حیثیت سوانح نگار

کس حد تک فنی نقطۂ نظر سے کامیاب رہے ہیں اس
کا کچھ اندازہ گذشتہ بحث سے ہو جاتا ہے، تاہم
اُن کے فن اور معیار کو کامیاب "عالمی سوانح نگاری"
کے اصولوں کی روشنی میں بھی جانچنا اور پرکھنا ضروری
ہے۔ مولانا عبدالماجد نے محمد علی اور مولانا اشرف علی
کے حالات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس پر
ایک اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اُنھوں نے
باقاعدہ ان دونوں کی ولادت سے وفات
تک کے حالات، جائے پیدائش، خاندان،
وغیرہ کا کہیں باقاعدہ ذکر نہیں کیا جو عام طور
پر سوانح نگاری کے لازمی اجزا ہیں لیکن حقیقت
میں یہ اعتراض درست نہیں کہا جاسکتا۔ جدید
نقطۂ نظر سے یہ ضروری نہیں اس انداز کی سوانح

لکھی جائے جس طریقہ پر آزاد نے آبِ حیات میں شعرا کے حالات لکھے ہیں اور پھر حالی نے "یادگار غالب" اور "حیاتِ جاوید" لکھنے میں اختیار کیا ہے۔ اس دَور میں ایسی سوانح نگاری زیادہ کامیاب نہیں جس کی بنیاد صرف خاندانی اور نجی حالات پر ہو، اس سلسلہ میں قاضی عبد الغفار کی یہ رائے قابل ذکر ہے۔ "میں خود ایسی سوانح نگاری کا قائل نہیں جس کا احساس زندگی صرف ایسے واقعات ہوں کہ کب پیدا ہوئے اور کس کے بیٹے تھے، کہاں تعلیم پائی۔"

درحقیقت سوانح نگار کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ زندگی کے حوادث اور علائق کے پسِ منظر ...... میں ایک بڑے انسان کے ذہنی اور نفسیاتی وجود کا سراغ لگانے کی کوشش کرے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے "حکیم الامت" کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبد الماجد کا نقطۂ نظر بھی یہی رہا۔ اور وہ بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے۔ یہ بات جا بجا ضرور کھٹکتی ہے کہ مولانا جوشِ محبت و عقیدت اپنے مرشد کے ساتھ کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو عام و خاص انسانوں کی سطح سے بہت اونچا اٹھانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ مگر جب ہم دوسرے اشارات پر یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مولانا اشرف علی تھانوی کو ایک عام سادہ زندگی بسر کرنے والا بزرگ سمجھتے ہیں اور ان کی طرف سے دل میں شکوک و شبہات کو بھی جگہ دیتے ہیں تو اس وقت ان کا جوش و جذبۂ محبت غیر معمولی نظر نہیں آتا۔

"حکیم الامت" میں مولانا عبد الماجد نے مولانا تھانوی کے گھریلو اور ذاتی قسم کے حالات پر بھی حسبِ موقع روشنی ڈالی ہے۔ ان کو سوانح نگاری کا خاص سلیقہ ہے۔ انھوں نے مولانا تھانوی کو صرف ایک مصلحِ قوم، مذہبی رہنما اور مجدّدِ ملت کی حیثیت سے نہیں دیکھا ہے۔ بلکہ ان کے انسانی مشاغل اور خصائل پر بھی نظر رکھی ہے اور ان کو احساس ہے کہ کسی شخصیت کی تعمیر میں اس کے گھریلو ماحول عادات اور نجی مشاغل کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

"حکیم الامت" میں مولانا عبد الماجد نے اس دَور کے اصلاحی، تاریخی اور سیاسی پسِ منظر کو بیشتر نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ اس پسِ منظر کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ جس میں کسی ہیرو کی شخصیت اور کردار کی تشکیل و تعمیر عمل میں آئی ہو یہ سیرت کا اہم پہلو ہے لیکن متفرق طور پر بعض مقامات پر اس عہد کے پسِ منظر کی جھلک کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے لیکن اس میں جو ربط ہونا چاہیئے وہ نہیں ہے۔ بہ خلاف اس کے مولانا محمد علی کے حالات میں ایسا نہیں ہے بلکہ ان کی سیرت اور کردار کی تعمیر و تشکیل کے

اصل اور ان کا پس منظر دونوں موجود ہیں یہ
رہات ہے کہ وہ یک جا اور مربوط نہیں ہیں
سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے
اپنے ہیرو کے ساتھ اس کو طبعی مناسبت بھی
سی حد تک ہو تاکہ سوانح میں فن کارانہ محاسن
جاگر ہوسکیں۔ مولانا عبدالماجد کو طبعاً اور عقائد
کے اعتبار سے مولانا تھانوی سے خاص مناسبت
رہی ہے۔ اس لئے اس پہلو سے وہ کامیاب
گزرے ہیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا
جاسکتا کہ مولانا عبدالماجد کے لئے "حکیم الامت"
لکھتے وقت ایک مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے مرشد
کی سوانح عمری لکھ رہے تھے جس سے ان کو بے
پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ اس لئے انھوں نے
اپنے موضوع کو اس زاویہ سے دیکھا جس سے
ان کو کام لینا تھا۔

سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ٹھوس اور
جانے بوجھے حقائق کو سلیقہ سے اس انداز سے
پیش کرے کہ ہیرو کی زندگی میں دلکشی اور
انوکھاپن پیدا ہو جائے۔ اس اصول پر جو سوانح
عمری لکھی جائے گی۔ وہ کامیاب اور مفید ہوگی
مولانا عبدالماجد نے سوانح نگاری کے اس اصول
کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ان کے ہیرو کی شخصیت
میں ایک خاص نقطۂ نظر سے تو یوں بھی دلکشی
اور انوکھاپن پایا جاتا تھا مگر عبدالماجد کے طرز
تحریر اور مواد پیش کرنے کے سلیقہ نے اس اصول
کو کم و بیش سامنے رکھا اور توقع سے زیادہ
دلکشی اور ندرت پیدا کر دی۔

مولانا عبدالماجد کا تعلق سوانح نگاری
کے شبلی اسکول سے ہے لیکن انھوں نے سید سلیمان
ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ کا طرز
نہیں اختیار کیا۔ شبلی اور ان کے تلامذہ میں مورخانہ
انداز بھی پایا جاتا ہے کیونکہ شبلی نعمانی ایک پایہ کے مورخ
بھی تھے اور سوانح نگار بھی۔ مولانا عبدالماجد
کی راہ بالکل الگ ہوگئی۔ انھوں نے مورخانہ
انداز بالکل اختیار نہیں کیا ان کا طرز ایسا ہے
کہ جس سے ایک مورخ اور سوانح نگار کا فرق
خود بخود واضح ہو جاتا ہے

ایک سوانح نگار اور مورخ میں جو فرق ہوتا ہے
اس کو بعض لوگوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔
کہ دونوں کا فرق پوسٹ مارٹم کرنے والے
ڈاکٹر اور آپریشن کرنے والے سرجن کا سا ہے
اوّل الذکر بے دردی اور بے رحمی سے
کانٹ چھانٹ کرتا ہے اور موخر الذکر احتیاط
اور نرمی سے نازک رگوں کو چھیڑتا ہے اور اپنے
جذبۂ ہمدردی کے ساتھ کام لیتا ہے۔

مولانا عبدالماجد نے مورخانہ انداز اختیار نہیں
کیا۔ نہ وہ مورخ ہیں، وہ سیرت نگار ہیں۔ اور
جدید سیرت نگاری کے بیشتر اصولوں کو اپنانے
کے علاوہ ان کا اپنا ایک الگ رنگ اور ڈھنگ
ہے۔ جس کا اندازہ پڑھنے والے کو خود بخود ہو جاتا ہے

ویسے بھی جو لوگ مولانا کے طرزِ تحریر سے واقف ہیں اور ان کی کتابوں اور متفرق تحریروں کا مطالعہ کر چکے ہیں، اُن کو اگر بغیر نام بتائے مولانا کی کوئی تحریر دے دی جائے تو عموماً پہچان لیں گے، اس سے بڑھ کر انفرادیت کا اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔؟

خطوط کی مدد سے سوانح نگاری

سوانح نگاری کے سلسلہ میں خطوط کی بہت زیادہ اہمیت ہے خطوط ادبی و علمی شخصیت کے انکشاف کا بہترین ذریعہ ہیں۔ خطوط کے ذریعہ سوانح نگاری میں مدد لینے کا سلسلہ یورپ والوں نے شروع کیا تھا ۱۸۶۲ء میں ٹوالش نے سوانح نگاری کے سلسلہ میں خطوط سے مدد لی۔ اُس نے واضح کیا کہ بے تکلف دوستوں کے نجی خطوط سوانح نگاری میں بہت مدد دیتے ہیں۔ انگریزی میں اسی اصول پر لکھی ہوئی کتابوں میں لائف آف جانسن" (LIFE OF JOHNSON) بہت اہم ہے۔ یہ کتاب ۱۷۹۱ء میں شائع ہوئی تھی، اس کا مصنف باسویل (BOSWEEL) ہے یہ سوانح عمری بہت مقبول ہوئی اور یورپین سوانح نگاروں نے اس کو نمونہ بنایا۔ بعد میں کارلائل (Karl) لکھا، نے اس پر نکتہ چینی کی اور کچھ نئے رجحانات کا اضافہ بھی کیا جن کا تعلق علم النفس سے تھا۔ اس اضافہ نے اس فن کو اور پختہ کر دیا اور یورپ میں اٹھارویں صدی کے اندر سوانح نگاری میں خطوط اور آپ بیتی کی اہمیت مسلم و مستحکم ہو گئی ہمارے یہاں اُردو میں مرزا غالب کے خطوط کو سوانح نگاری میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کے خطوط سے اس حقیقت کی بھی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ سوانح نگاری میں خطوط کی کیا اہمیت ہے مرزا غالب کے سوانح حیات جو آج ہمارے سامنے ہیں وہ اُن کے خطوط ہی کی مدد سے مرتب ہوئے ہیں۔ غالب کے فکر و فن اور رجحاناتِ طبع کے متعلق ساری معلومات ان کے مکاتیب ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ غالب کے بعد خطوط نویسی نے ایک نیا رُخ پایا اور اُن کے طرز نے اُردو میں خطوط نویسی کے فن کو بلند کر دیا۔ سوانح نگاری میں خطوط کی اہمیت اور افادیت بڑھنے لگی۔ اور اس سے کام بھی لیا جانے لگا۔

اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط کام کیا اُنھوں نے خطوط کو اُردو میں سوانح نگاری کا اہم جزو بنا دیا۔ "حکیم الامت" اور "محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق" دونوں کتابوں میں سوانح نگاری کے جو کرشمے نظر آتے ہیں وہ سب مکاتیب کی بدولت ہیں۔ مولانا عبدالماجد نے مولانا اشرف علی کو خطوط لکھے اور ان کے جوابات جو اُن کو موصول ہوئے اُن کو "حکیم الامت" میں بڑے سلیقہ سے شامل کر دیا ہے۔ بلکہ اس کتاب کا بڑا حصہ دونوں کے

خطوط پر مشتمل ہے۔ اور خطوط کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس سے صاحبِ سوانح کے حالات، معمولاتِ زندگی، مقاصدِ حیات نجی واقعات و حالات پورے طور پر روشنی میں آجاتے ہیں یہ مولانا کا بڑا کمال ہے۔ حالانکہ اُردو میں سوانح نگاری کے سلسلہ میں یہ۔ عام طور پر رائج نہیں ہوا ہے۔ کچھ غیر مربوط کوششیں ضرور ہوئی ہیں۔ اُردو میں سوانح نگاری مغرب سے متاثر ہوئی، اگرچہ دیگر اصناف کی طرح اس نے ابھی زیادہ ترقی نہیں کی ہے لیکن مولانا عبدالماجد نے روشِ عام سے ہٹ کر جدید و قدیم اُصولوں کا ایک ایسا سنگم بنایا ہے جو بعض جزوی نقائص سے قطع نظر قابلِ تحسین و تقلید ہے

مولانا محمد علی کے حالات اپنی یادداشت کی مدد سے مولانا عبدالماجد نے مرتب کئے ہیں اس لئے اس کا نام بھی "ذاتی ڈائری" رکھا ہے لیکن اس میں بھی، سوانح نگاری کے کمالات خطوط کے سہارے ظاہر ہوتے ہیں ایسے خطوط جو مؤلف کتاب اور محمد علی نے ایک دوسرے کو لکھے یا اُن کے متعلق اُس عہد کے بعض اکابرین نے مؤلف کے نام لکھے ان کی مدد سے محمد علی کے حالات کارنامے اور اس عہد کا علمی ادبی خصوصاً سیاسی پس منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور اسی کو سوانح نگار کا کمال کہا جاسکتا ہے مولانا عبدالماجد کی ان دونوں کتابوں کو سیرت نگاری کا اچھا نمونہ قرار دینا بجا طور پر درست ہوگا لیکن یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ دونوں کتابوں میں مولانا عبدالماجد نے اپنے دو اہم شخصیتوں سے صرف اپنی ذاتی وابستگی زیادہ دکھائی ہے اور سارے مضامین جس محور پر گھومتے ہیں، اس میں مولانا عبدالماجد نمایاں نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دونوں ہیروں کے سہارے اپنی شخصیت کو بھی اُبھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہا جاسکتا ہے کہ دونوں سے اُن کی وابستگی خصوصی تھی اس لئے ایسا ہوا لیکن یہ کس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمد علی جوہر کو جس نظر سے مولانا عبدالماجد دیکھتے تھے اور جس طرح وہ دونوں سمجھتے تھے۔ بعینہٖ اُسی طرح دوسرے بھی سمجھتے ہوں گے۔ جب تک دوسروں کے مکاتیب اور روایات سے مدد نہ لی گئی ہو سوانح نگاری کا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا یہ ایک اہم خامی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ان دو ذاتی کتابوں کے علاوہ مولانا عبدالماجد نے "سیرت نبوی قرآنی" لکھی ہے جو اُنکی وسعتِ علم اور اعلیٰ انشا پردازی کا ثبوت ہے لیکن اس کو فن سوانح نگاری کے عام اصولوں پر معرضِ نقد و نظر بنانا مناسب نہیں۔ اکبر الہ آبادی کے حالات پر مولانا کے متفرق مضامین اور اُن میں اچھے سوانحی خاکے موجود ہیں۔ اُن میں وہ خصوصیات بھی ملتی ہیں جن پر مولانا کا انفرادی رنگ جھلکتا ہے۔

الحاج پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل ایم۔اے (پٹنہ)

مولانا عبدالماجد دریابادی

مفسرِ قرآن و مدیرِ صدقِ جدید کی حیثیت سے

خبر ملی کہ ادارہ فروغِ اُردو و بعنوان (لکھنؤ) کا مولانا عبدالماجد (دریابادی) نمبر جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔ مولانا کی ادیبانہ، عارفانہ، واعظانہ نگارشات، اور بیباکانہ تحریر و تنقید و تبصرہ کی بصیرت افروزی اور حق آموزی کے اعترافِ دلی کا تقاضا ہوا کہ میں بھی "اُن مقتدر اور ادبی شخصیتوں" کے "صفِ آخریں سے بھی دُور تر" کہیں جگہ بیٹھ جاؤں، جو اس خاص نمبر کے لئے مشہور و معروف، مفسرِ قرآن، عالمِ دین، عارف شرع متین محبوبِ خالق، و خلائق مولانا عبدالماجد دریابادی کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کرنیوالے ہیں۔

مگر اس تقاضائے دلی کو پورا کرنے کی نہ صلاحیت سینہ میں پائی نہ جرأت محروم بصیرت تو ہمیشہ ہی سے ہوں اب تو بصارت کی کمی بھی روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہے۔ بہرکیف مولانا ماجد سے جو دیرینہ عقیدت مندی اس نیازمند کو ہے اس نے آواز دی کہ اللہ کا نام لے کر کلام اللہ کے مستند مفسر کی نگارشات کو اُن ہی کی تالیفات سے نقل کر کے ایک مقالہ جیسی چیز لکھ ڈالو، اس کارِ خیر میں نہ محنت ہے نہ مشقت۔ اس طرح مولانا ماجد کے فرمودات کے مطالعہ کی برکت تو ضرور حاصل ہو جائیگی ——— یہ "آواز" کام کر گئی اور ذیل کا "مضمونِ منقول" اسی کا ثمرہ صحت بخش ہے۔

اگر آپ نے مولانا کی نگارشات، تالیفات اور تخلیقات کا مطالعہ ان کے اندازِ بیان، اسلوبِ تحریر اور طرزِ ادا کو سمجھنے کے لئے کیا ہے تو آپ کو مولانا کی ممتاز و مفید خصوصیتوں سے ضرور واقفیت ہوگئی ہوگی۔

مولانا ماجد کی آیات قرآنی کی تفسیر پڑھ کر، حدیث نبوی کی تشریح پڑھ کر، یا حکایت و واقعاتِ عالم کی تفصیل پڑھ کر، آپ یہ محسوس کرینگے کہ مولانا کا محبوب مقصود نگارش پند و نصیحت ہے یا تفہیم رُموزِ شریعت ان کی لکھی ہوئی کسی کی سوانح حیات کو پڑھئے

یا تاریخ کے واقعات پڑھئے یا کسی مشہور عالمِ دین یا شاعر کے شعر کی شرح پڑھئے، یا کسی خبر کی سرخی پڑھئے یا کسی کے قول و فعل پر اُن کی بے لاگ تنقید پڑھئے آپ کو احساس ہوگا کہ آپ کا وقت ضائع نہیں ہوا، آپ کا دل اُن کی شگفتہ بیانی سے صرف بہلتا ہی نہیں، ان کے فلسفیانہ دلائل سے صرف آپ کی تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ ہر وہ دولت سرمدی مل گئی جو صرف ہوشمند تاریوں کے حصے میں آتی ہے میرا مقصد مولانا کی نگارشات کی خوبیوں کی تفصیل پیش کرنا نہیں ہے۔ صرف بطور ہیتیں گفتار کے چند جملے زبانِ قلم سے بے ساختہ نکل پڑے ہیں۔ اب ملاحظہ فرمائیے چند مقالاتِ ماجد یا اقوالِ ماجد، جن کو بلا کسی ترتیب و تبویب کے ان کی تفسیر قرآن اور اخبار صدق جدید سے نقل کر کے پیش کر رہا ہوں

— عام طور سے دورِ جدید کے "سائنس داں" منکرینِ خالقِ کون و مکاں ہیں، کہتے ہیں کہ دیکھئے سائنس کے زور سے ہم لوگوں نے چاند پر قدم جما لیا، مریخ ستارہ بھی اب ہماری دسترس کے اندر ہے، کوہ و دریا کو تو ہم پہلے ہی مسخر کر چکے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر غور سے دیکھئے تو بڑے سے بڑے صناع، سائنس داں کا سائنس دانوں کا کمال یہ بزبانِ مولانا "کمال بجز اس کے کیا ہے کہ اس نے نظامِ تکوینی کے ضابطوں اور قاعدوں کی مزاج شناسی میں کمال پیدا کر لیا ہے۔ سائنسدانوں کا کمال بڑے سے بڑے ماہرین سائنس میں یہ کسی کے امکان میں ہے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی فضائے کائنات سے باہر ایک گز ایک فٹ ایک انچ جگہ اپنے لئے تلاش کر سکے؟ کون ایسا ہے کہ اللہ نے زمان و مکاں کی جو حدیں مقرر کر دی ہیں اُن سے قدم باہر نکال سکے؟ کون ایسا ہے جو اس کے خلق کئے ہوئے قانونِ حرارت، برودت، رطوبت سے بے نیاز رہ سکے؟ کون ہے جو اس کے باندھے ہوئے قانونِ کششِ اجسام سے بغاوت کر سکے، عدد، وزن، مقدار کے جو ضابطے خدا نے مقرر کر رکھے ہیں۔ کس میں اتنی ہمت ہے کہ گنجائش ان سے عدول و انحراف کی پا سکے؟"

اغیار سے ربط و رشتہ کے ضوابط

غیر مسلموں، کافروں، مشرکوں، ملحدوں اور منکرین خدا سے ربط و رشتہ کس قسم کا اور کس حد تک روا ہے، اس عہدِ اسلام فروشی اور خدا فراموشی میں جاننے اور سمجھنے کی سخت ضرورت ہے۔ مولانا ماجد عارفِ کلامِ ربانی، سورہ ہود کی آیت ۱۱۳ کے نوٹ ۱۵۵ میں تحریر فرماتے ہیں کہ — "علمائے محققین کے حسبِ تصریح بلا ضرورت — کفار کی وضع اختیار کرنا۔ باوجود قدرت ان پر نکیر نہ کرنا — اُن کی تعظیم و توقیر کرنا — بلا ضرورتِ شرعی ان کے ساتھ مصاحبت و مجالست اور ان کے ساتھ مداہنت ..... یہ سب مثالیں "رکون الی الکفار" کی ہیں۔

یاد رکھئے کہ ارشادِ خداوندی عام مسلمانوں

کہ یہ ہے کہ وہ کافروں کی طرف مائل نہ ہوں۔ ان کے احوال و اعمال میں شرکت سے بچیں اور انکی محبت و دوستی کو حدود و ضروری شرعی تک محدود رکھیں۔ اور غیر مسلموں منکروں، معاندوں اور اسلام کے دشمنوں سے "ربط ضبط" قائم نہ کریں اور اپنے غیر اسلامی اور غیر شرعی افعال و اعمال پر "مصلحت وقت" "مروت" "صلح پسندی" "آشتی اور رواداری" جیسے الفاظ کا پردہ پھینک کر نہ ڈالیں۔

سورۂ فاتحہ کی آخری آیت کی [illegible] تشریح کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ "جس طرح مقصود و مطلوب محبوبین و مقربین کے طور طریقوں کی اتباع ہے اسی طرح ممنوع و ناجائز منکروں اور نافرمانوں کی ہم مسلکی ہے"

(دَورِ جدید کا جاہ طلب مسلمان، غیر مسلموں کے ووٹوں کا طلبگار مسلمان، سیاست باز مسلمان مولانا کے بیان بالا کی روشنی میں دیکھے کہ اس کا شمار کہیں اعدائے دین میں تو نہیں ہو جاتا ہے)۔

رواداری کا مفہوم

رواداری کا وہ مفہوم جو سیاست بازوں اور جاہ طلبوں اور حکومت پرستوں نے خود سمجھا ہے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں بالکل غلط ہی نہیں بلکہ سراسر خلافِ مصلحت و دانش بھی ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۳ کی شرح کے سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی' عارف رموز قرآنی نے کچھ اپنے خاص انداز میں لکھا ہے اُسے بغور اور بار بار پڑھنے کی آج کل زیادہ ضرورت ہے فرماتے ہیں۔

"آج کل کے دورِ دجل و تلبیس میں لفظ رواداری [illegible] پھیلا ہوا ہے۔ اسلام ہرگز اس کا قائل نہیں [illegible] دوستوں، حق سے دوستوں [illegible] کا حکم دیتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں اور دشمنوں سے حق ہے اس سلوک کا جس کے وہ لائق ہیں" [illegible] اسی سلسلہ میں آگے چل کر مولانا لکھتے ہیں کہ [illegible] انسان بعض جانوروں کو کھلاتا ہے پالتا ہے، عافیت پہنچاتا ہے، اور بعض کو بلا تامل مار ڈالتا ہے [illegible] عقل کی تعلیم ہرگز ہرگز نہیں کہ جو جانور [illegible] برابر ہیں اور یکساں [illegible] [illegible] پیش آنا چاہیے
[illegible]

طاعت و اطاعت بھی باعث راحت دنیوی ہے

قرآن پاک کی مختلف آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعات کو راحت دنیوی پر بھی دخل ہے اور مشاہدہ بھی ہے کہ — طاعت وحسن عمل کا پھل اسی دنیا میں — برکتوں فائدوں نتیجوں کی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے — گو اصل دارالجزاء عالم آخرت ہی ہے"

"جس طرح فرماں برداری اور اطاعت

ونوی سے دینوی راحت ملتی ہے۔ اُسی طرح [illegible] کے مقابل میں ارتکاب عصیان اور اصرار [illegible] کی سزا دنیا میں بھی ہو جاتی ہے۔ آخرت میں [illegible] رہے گی۔"

فرعون اور قوم فرعون کی غرقابی کے ذکر [illegible] سے معلوم ہوتا ہے کہ عصیان و طغیان کی [illegible] دنیا میں بھی ملتی ہے [illegible] آخرت [illegible] ہیں [illegible] دنیا میں بھی قہر و غضب کے ساتھ [illegible] ب نے دیکھ لیا۔"

گمراہی کی منزلیں

سورۂ یونس کی آیت [illegible] کا ترجمہ [illegible] مولانا ماجد [illegible] کا ترجمہ اور [illegible] آیت کی تفسیر پڑھئیے [illegible] گمراہی [illegible] اور [illegible] ملاحظہ ہو۔

[illegible]

[illegible] اعظم ہے [illegible]

[illegible] اور [illegible] ایک بہت [illegible] حقیقت

کا اعلان ہے۔ آیت کا ترجمہ ہے:۔

دُنیا طلبوں کا اجر

جو کوئی دنیا ہی کی زندگی اور اس کی رونق کو مدنظر رکھتا ہے تو ہم اُن لوگوں کو اُن کے اعمال کی جزا اسی دنیا میں پوری طرح دیتے ہیں۔ اور اُن کیلئے اس میں ذرا کمی نہیں ہوتی ـــ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں کچھ بھی نہیں بجز آگ کے اور جو کچھ انھوں نے کیا کرایا تھا آخرت میں [illegible] اس آیت کی تفسیر [illegible] کی گئی ہے۔

"جو لوگ [illegible] دنیا ہی کی ترقیوں کو اپنا منتہا [illegible] بنائے ہوئے ہیں اور اپنی ساری [illegible] کا مرکز اسی کو قرار [illegible] انھیں مایوسی [illegible] ان کی ساری جد و جہد کا صلہ یہیں [illegible] دولت چاہتے ہیں۔ [illegible] اقتدار و قوت ہو کر رہے گا [illegible] دنیا کے سارے [illegible] انھیں کے درمیان تقسیم ہو کر رہیں گے۔

[illegible] کی چاٹ ہے تو [illegible] اپنے دل کا ارمان نکال لیں"

[illegible] مولانا عبدالماجد [illegible] حیات و زینت حیات [illegible] طبعی ہے اور انسان بڑے سے بڑا متقی انسان بھی کسی درجہ میں اس کا [illegible] رہتا ہے۔

البتہ حیات دُنیوی اور زینتِ دنیوی کو آخرت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنا مقصود بنا لینا اور اپنے وقت اور قوت کو اسی میں خرچ کئے جانا یہ ایک بالکل دوسری چیز ہے۔"

"خوش حالوں کی بدحالی"

وہ لوگ جن کو عرف عام میں "خوشحال" کہتے ہیں۔ اور جن کو عام طور سے لوگ خوش مآل سمجھتے ہیں اُن کے متعلق سورہ یونس کی آیت ۷۰ کے ایک جزو کی تفسیر لکھتے ہوئے حقیقت بین مولانا ماجد تحریر فرماتے ہیں کہ ــــ "متاع فی الدنیا ــــ کہہ کر قرآن مجید نے منکر و مکذب قوموں کی بالکل صحیح تصویر کھینچ دی ہے ــــ تفصیل کے لئے مطالعہ ہو روس اور امریکہ اور بڑی بڑی "مہذب" اور "ترقی یافتہ" اقبالمند قوموں کا حال ...... ان کے آپس کے رشک و حسد کا حال۔ ان کی حرام کاری کا حال۔ ان کی شراب نوشیوں کا حال۔ ان کی سود خواریوں کا حال۔ ان کے جرائم کا حال ان کے ہاں کے امراضِ خبیثہ کا حال۔ ان کے ہاں کی ہڑتالوں کا حال ان کے ہاں کے کثرتِ طلاق اور کثرتِ فواحش کا حال .... اور پھر فیصلہ کیجئے کہ ــــ متاع دنیا کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ رکھنے کے بعد بھی ان منکرین حق کو باوجود اپنی انتہائی ترقیوں کے فلاح کسی معنی میں بھی حاصل ہے؟ آج جو کچھ فہم "ہمدردانِ قوم" قوم و ملت کو انہیں "ترقی یافتہ قوموں" کی روش پر چلانا چاہتے ہیں وہ ملت کو فلاح کی جنت کی طرف لئے جا رہے ہیں یا دنیا ہی میں دوزخ کے عذاب کی طرف؟ ــــ

"ــــ قرآن مجید تو ہر جگہ اور بار بار یہی بتا رہا ہے اور ہمارے مشاہدہ سے اس کی تصدیق کر رہا ہے ــــ جو قومیں ایمان صحیح اور تقویٰ سے عاری ہیں وہ عیش ابدی سے تو محروم ہی ہیں دنیا بھی اُن کا تنعم محض ظاہری اور سطحی ہوتا ہے۔ اندر سے بالکل کھوکھلا۔"

لفظ فلاح کا مفہوم ہے آخری حقیقی اور مستقل کامیابی۔

"فوری فانی اور عارضی کامیابی تو بس ذرا دیر کے لئے گرمی مقابل ضرور پیدا کر دیتی ہے مگر آخرکار!!! یاد رکھئے کہ مستیوں کا صدور نقصان فلاح کا باعث ہوتا ہے۔"

مال و دولت میں عدم مساوات فطری اور طبعی ہے

آج کل ہر طرف ہر جگہ یہ تحریک چل رہی ہے کہ ــــ دولت کی تقسیم مساوی ہونی چاہیئے، یہ نہ ہو کہ کوئی تختِ طلائی پر آرام کرے اور کوئی زمین سخت پر چین سے لیٹ بھی نہ سکے۔ کوئی ۲۴ گھنٹوں میں جب جی چاہے جی بھر کے لذیذ غذائیں کھا سکے اور کسی کو محنت و مشقت کے باوجود سوکھی روٹی اور نمک بھی پیٹ بھر کر کھانے کو ہر وقت نہ مل سکے۔ ــــ بیشک ایسا نہ ہونا چاہیئے ــــ

اسی لئے تو قرآن کریم میں زکوٰۃ، صدقہ، خیرات، حسن سلوک، یتیم پروری، مفلس نوازی، غربا پروری وغیرہ وغیرہ کی تعلیم دی گئی ہے تلقین کی گئی

...غریب دی گئی ہے جس پر بتائی گئی ہے اور
...م دولت سے منافع دینوی و آخروی کی
...یل سمجھائی گئی ہے۔

اگر اسلامی اصول و احکام زکوٰۃ و صدقات
...ل کیا جائے تو جائز شکایات کا موقع شاید
...سے کم نظر آئے گا رہا یہ نظریہ کہ ہر شخص کے
...ن مساوی دولت ہو خلاف فطرت ہے، خلاف
...یقت ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ ناقابل عمل ہے
سورہ نحل کی آیت ۷۱ کا ترجمہ پڑھیے

اور اللہ نے تم میں سے کسی کو کسی پر رزق
میں فضیلت دے رکھی ہے۔ سو جن لوگوں
کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنے حصہ کا
مال اپنے غلاموں کو کبھی اس طرح دینے
والے نہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں

...ت مذکورہ صدر سے یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ مصلحتِ
...راوندی یہی ہے کہ دنیا میں کوئی امیر ہو کوئی
...یر --- کوئی دولت مند ہو کوئی غریب۔

مولانا ماجد فرماتے ہیں کہ: --- "آیتِ مرقومہ
...صدر سے اس حقیقت پر روشنی پڑ گئی کہ ---
...ل دولت میں عدم مساوات فطری و طبعی
ہے اور تقسیم دولت میں مساوات کا دعویٰ
بجائے خود بے بنیاد اور خلافِ فطرت ہے
--- آیتِ مرقومہ بالا نے جڑ کاٹ دی
ہے اہل باطل کے اس نظام معاشی کی جس کا پرانا
نام مزدکیت تھا اور جدید نام سوشلزم یا
یا انتہائی صورتوں میں کمیونزم ہے

تفسیر ماجدی ص۔

غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات

(۱۱) سورۃ المائدہ کی آیت ۵۱ کا ترجمہ ہے:۔

اے ایمان والو یہود و نصاریٰ کو دوست نہ
بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں
اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا
وہ انہی میں شمار کیا جائے گا۔

مولانا ماجد فرماتے ہیں کہ --- "غیروں بیگانوں
اللہ کے دشمنوں سے دوستی ہو نہیں سکتی جب تک
ان کی عظمت یا محبت کا نقش دل پر نہ بیٹھ لے
اور مسلمان اپنی پختگی سے کچھ نہ کچھ ہٹ نہ لے۔
قومی تشخص اور ملت کی خودی کے لئے لازم ہے
کہ ملتِ اسلامی کے دوستانہ رازدارانہ، برادرانہ،
تعلقات غیر مسلموں سے بالکل ممنوع قرار دیے جائیں
یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ دشمنانِ دین کے
ساتھ خلا ملا، میل جول زیادہ رکھتے ہیں ان کے اندر
سے فہمِ دین اور دینی تصلب اور ملی خودداری رخصت
ہو جاتی ہے۔ حدیثِ نبوی میں دوسری قوموں کے
وضع و لباس اختیار کرنے، ان سے تشبہ پیدا کرنے
کی جو ممانعت آئی ہے وہ عجب نہیں کہ انہی حکمتوں۔
مصلحتوں پر مبنی ہو" آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں:۔

"یہ ممانعت جب اہل کتاب سے دوستی اور
یگانگت کی ہے جو توحید، مسئلہ نبوت اور

جزائے آخرت کے عقائد میں کم از کم اُصولی
طور پر تو مسلمانوں سے متحد ہیں تو ظاہر ہے
کہ مشرکین کے مقابلہ میں یہ ممانعت کتنی مؤکد
اور اشد ہوگی جو مسلمانوں کے ساتھ کچھ بھی
قدرِ مشترک نہیں رکھتے۔ آیت مذکورہ صدر کا یہ
حصہ (من یتولھم منکم فانہ منھم)
یعنی جو کوئی ان سے دوستی کریگا وہ اُنہی میں
شمار ہوگا) ایک ڈانٹ ہے ایک ڈپٹ ہے۔
ان لوگوں کیلئے جو "مصلحتِ وقت" کے فلسفہ
کے حامل ہیں۔"

اس آیت کی مزید تشریح کرتے ہوئے مولانا ماجد
لکھتے ہیں کہ :۔

"اس آیت میں جس چیز کی ممانعت کی گئی ہے
وہ تعلقِ دوستی، محبت، قرب اختصاص کا ہے۔ رہا
عدل و حسنِ سلوک تو اس کا تعلق کفر و اسلام سے نہیں
وہ تو ہر بشر بلکہ ہر مخلوق کے حق میں لازمی ہے۔
ایک درمیانی صورت مصالحت اور معاملت
کی رہ جاتی ہے تو وہ تو اہلِ اسلام کی اپنی مصلحت کے
تابع ہے۔ صلح و عہد و پیمان ہر کافر جماعت سے مشروع
طریقہ پر کرسکتے ہیں۔ ممانعت قطعی صرف مُوالات ۔ یا
دوستانہ اتحاد اور برادرانہ مُناصرت کی ہے"

سورۂ المائدہ کی آیت ۵۷ کی تشریح کرتے
ہوئے مولانا عبدالماجد فرماتے ہیں کہ ـــ

"جو لوگ دینِ حق سے استہزا کو اپنا شعار بنائے
ہوئے ہیں خواہ وہ کتابی کافر ہوں یا غیر کتابی ان سے

انقطاعِ تعلقات و دوستی کے باب میں یہ آیت
ایک اور لفظِ قطعی ہے۔ اس آیت سے فقہاء نے
یہ بھی نکالا ہے کہ

"مشرکین سے امورِ دین میں مدد لینا ناجائز ہے"

سورۂ النساء کی آیت ۱۲۸، ۱۲۹ اور ۱۴۴
کا ترجمہ تفسیر ماجدی میں دیکھئے اور مضمون آیاتِ مرقومہ
صدر پر مولانا کے تشریحی اور تفسیری نوٹ پڑھئے آپ
کو اپنی [illegible] اور [illegible] ہر قسم کے متعلق صحیح رائے
قائم کرنے میں انشاء اللہ مدد ملے گی۔

"منکروں اور کافروں سے بلا ضرورت میل
جول، خلا ملا، ان کی وضع قطع بلا ضرورت بنانا،
ان کے فیشن اختیار کرنا، ان کے لباس، تمدن،
معاشرت کو فخر و عزت کی چیز سمجھنا یہ سب داخل
نفاق ہے"

[illegible] انکم اذا
مثلھم [illegible] کا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ ـــ ان کی
مجلسوں، گھروں میں مسلمانوں کی شرکت [illegible]
کا نتیجہ ہوتی ہے"

"[illegible] دین کی [illegible] کا ہر مظاہرہ اور
[illegible] ہیں [illegible]"

"[illegible] مشغلہ [illegible] ہنسا خواہ وہ
اسکولوں اور کالجوں میں ہو یا بازاروں اور میلوں میں
یا تھیٹروں اور سینماؤں میں ہر صورت بڑی [illegible]
کی بات ہے"

"فقہاء نے [illegible] فاسقوں کی مجلس میں [illegible]

...رت وہ فسق میں نہ مشغول ہوں جائز تو ہے مگر کراہت کے ساتھ" سورۃ النساء کی آیت ۱۴۴ پر مولانا ماجد کا تفسیری نوٹ جو درج ذیل ہے ہمارے لئے ایک لمحۂ فکریہ پیش کرتا ہے ۔۔۔ "اتنی [illegible] وعیدوں کے باوجود ہم لوگ بلا ضرورت ہر قسم کے غیر مسلموں، بے دینوں، بد دینوں سے دوستی اور محبت کے تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں تو ہم لوگوں کا کیا انجام ہونا ہے"۔ سورۂ ہود کی آیت ۱۱۳ [illegible] ان لوگوں کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں ۔۔۔ یعنی کافروں اور مشرکوں کی طرف مت جھکو اور اگر ایسا کروگے تو ارشاد ہوتا ہے ۔ تمہیں بھی دوزخ کی آگ چھو جائے گی۔

مولانا ماجد فرماتے ہیں کہ ۔۔۔ [illegible] رکون یا جھکنا بہ اعتبار دوستی اور محبت اور شرکتِ احوال و اعمال کے ہے" آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں کہ ۔

"۔۔۔ علمائے محققین کے حسب تصریح بلا ضرورت کفار کی وضع اختیار کرنا، باوجود قدرت ان پر نکیر نہ کرنا، اُن کی تعظیم و توقیر کرنا، بلا ضرورت شرعی ان کے ساتھ مصاحبت و مجالست اور ان کے ساتھ مداہنت یہ سب اسی نہی کے تحت میں آ جاتا ہے اور یہ سب مثالیں رکون الی الکفار کی ہیں"

(تفسیر ماجدی ص [illegible])

سورہ آلِ عمران کی ایک آیت کا یہ ٹکڑا کہ ۔۔
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ
(اے ایمان والو اپنوں کے سوا کسی کو گہرا دوست مت بناؤ) ایک گہری حقیقت کا آئینہ دار ہے

مولانا ماجد، حقیقت بیں اور حقیقت شناس عارف دریابادی، فرماتے ہیں کہ ۔۔۔ "قانونِ اسلام کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت کسی مسلم کو یا مسلم اسٹیٹ کی رعایا کو نہیں کہ اس سے ذو ملت دونوں کو ضرر کے اندیشے اور خطرے کھلے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح کی، معقول اور مناسب اور ضروری انتظام کا نام بعض عقل کے دشمنوں نے تنگ نظری رکھا ہے۔ فقہاء نے آیت کے ذیل میں لکھا ہے۔ کہ کافروں سے تشبہ تک جب جائز نہیں تو ان کے ساتھ مصاحبت تو بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگی"

اسی آیت مذکورہ کا ایک چھوٹا سا جزو ہے ۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۔۔۔ (تمہارے دکھ پہونچنے کی آرزو رکھتے ہیں) مولانا ماجد فرماتے ہیں کہ ۔۔۔ "یہ فقرہ کافرانہ ذہنیت کا پورا ترجمان ہے اسکے اندر گہری تعلیم اس بات کی ہے کہ کوئی غیر مسلم کسی حال میں مسلموں کا حقیقی دوست اور بہی خواہ ہو نہیں سکتا"

جس طرح مشرکوں، منکروں، کافروں سے موالات ناجائز ہے اسی طرح فاسقوں، فاجروں خود پرستوں، خدا فراموشوں کی طرف جھکاؤ اور لگاؤ ممنوع ہے گو اس میں بظاہر قوم مسلم کا مالی یا معاشی یا اقتصادی فائدہ ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا ماجد غیر مسلموں سے تعلقات رکھنے یا قائم کرنے کی تین صورتیں بتاتے ہیں ۔
(۱) موالات یا دوستی (۲) مدارات یا ظاہری خوش خلقی

(۳) مواسات یا احسان و نفع رسانی اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ——" پہلی صورت ہمارے علماء کے نزدیک کسی حال میں جائز نہیں تیسری صورت بھی زیادہ مشکل نہیں، مواسات اہل حرب کے ساتھ ناجائز اور غیر اہل حرب کے ساتھ ناجائز اور غیر اہل حرب کے ساتھ ناجائز ہے۔ دوسری صورت یعنی مدارات تفصیل طلب ہے مدارت تین حالتوں میں درست ہے —— ایک دفع ضرر کے لئے ہے دوسرے خود اُس کافر کی مصلحت دینی کے لئے یعنی توقع ہدایت کے موقع پر تیسرے اکرام ضیف کے طور پر جب کافر مہمان ہو اس وقت اُس کے لئے۔

ان تین صورتوں کے سوا اپنے نفع یا حصول مال و جاہ کے لئے مدارت درست نہیں۔ بلکہ جب اس سے ضرر دین کا اندیشہ ہو تو یہ اختلاط بدرجہ اولیٰ حرام ہو گا۔

(تفسیر ماجدی صد ۱۲۹)

غیر مسلموں کے مال و اولاد کا راز

(۱۲) سورہ توبہ کی آیت ۵۵ کا ترجمہ مولانا ماجد یوں کرتے ہیں۔

"سو ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں، اللہ کو بس یہ منظور ہے کہ انہی (نعمتوں) کے ذریعہ سے اُنھیں دنیا کی زندگی میں ہی عذاب دیتا رہے اور ان کی جان ایسی حالت میں نکلے کہ وہ کافر ہوں۔

دورِ جدید کے کور باطن اور ظاہر بین حکمت الٰہی سے ناآشنا مغرب زدہ مسلمانوں کے دلوں میں کافر قوموں کی خوش حالی اور فارغ البالی دیکھ کر اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نافرمانوں، باغیوں، بدکاروں پر عنایتیں کیوں ہیں اور فرماں برداروں، اطاعت مندوں اور نیکو کاروں کی قسمت میں دنیا وی نعمتوں سے محرومی کیوں ہے۔

مولانا ماجد لکھتے ہیں کہ —— "جو حرکتیں وہ کر رہے ہیں (یعنی کفر اور آخرت فراموشی) ان کا انجام یہی ہوتا ہے کہ یہ نعمتیں ان کے حق میں عذاب بنکر رہیں"۔

مولانا اشرف علیؒ تھانوی فرماتے ہیں کہ کفار و فجار" جس سامان کو راحت کے لئے جمع کرتے ہیں اس میں اُن کو راحت نہیں، محض جمع و حفاظت کی مشقتیں ہی ہیں اور بعد چونکہ اعتقاد اجر اور تعلق خدا سے محروم ہیں اس لئے اُن مشقتوں میں تسہیل بھی نہیں ہوتی۔

ایک صوفی کے بعد ایک فقیہ کا قول پڑھئے "کافروں فاسقوں کی ظاہری نعمتوں کو دیکھ کر ان کے حال کو اچھا سمجھنا اور ویسی ہی کیفیت کی تمنا کرنا حرام ہے۔ (تفسیر ماجدی صفحہ ۳۰۹)

آج کل کثرت سے ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو اپنے کو مختلف منصوبوں میں کامیاب پاکر اپنے کو برسر حق سمجھنے لگتے ہیں، اور بہت سے اُن کے دیکھنے والے پوچھتے ہیں کہ غیر مسلم، آخرت فراموش اگر برسر حق نہیں ہیں تو اُن کو دنیاوی کامیابی اور کامرانی ملی ہی کیوں؟

اس سوال کے جواب میں پڑھئے سورہ بنی اسرائیل
کی آیت ۱۸ کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ (جو کوئی
دنیا کی نیت رکھیگا ہم اُس کو دنیا میں سے جتنا
چاہینگے، جس کے واسطے چاہینگے، فوراً ہی دیدینگے
پھر اس کے لئے جہنم رکھینگے") ارشاد یہ ہو رہا ہے
کہ جو اپنی زندگی کا مقصد اسی دنیا کو بنا لیتا ہے
دنیا ہی سے لپٹا رہتا ہے۔ اور دنیا ہی سمیٹنے
کی کوشش کرتا رہتا ہے، اُس کو اسی دنیا
میں اس کی کوشش و تدبیر کا پھل "آئینِ تکوینی
کے مطابق" دے دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ
یہ بھی ارشاد ہو رہا ہے کہ ہر طالبِ دنیا کو
اس کے خاطر خواہ دنیا نہیں دی جاتی ہے بلکہ صرف
اسی قدر دی جاتی ہے۔ جتنی مشیتِ الٰہی اور مصلحت
خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ اور اس عارضی
فانی کامیابی کے بعد صرف دنیا چاہنے والوں
کا حال کیا ہوگا؟ ۔۔۔ جہنم کی سزائے سخت۔
حاصل کلام یہ ہے کہ اپنا مطمحِ نظر صرف
اس عارضی اور فانی دنیا کو، فوری کامیابیوں
کے فریب میں آکر بنائے نہ رکھو"
(تفسیر ماجدی ص ۵۸۹)

دورِ جدید کے "روشن خیالوں" کے خیالات
بھی دنیاوی دولت و ثروت کے متعلق وہی ہیں
جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں
کفارِ قریش، بلکہ کفارِ مکہ کے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ
"مسلمانو! دیکھو ہم لوگوں کے پاس دولت ہے، ہمارے
مکان بڑے اور بلند ہیں، ہمارا معیار
بھی تم مسلمانوں سے بہت بلند ہے، ہمارے
جتھے بہت بڑے ہیں، ہماری مجلسیں بارونق ہیں
۔ مگر تم مفلس و مجبور مسلمان ان نعمتوں سے محروم
ہو۔ اور اس اپنی ظاہری دنیاوی دولت اور
شان کو اپنی مقبولیت اور حق پر ہونے کا ثبوت
سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ۔۔۔ اگر تم حق پر
ہوتے تو اس طرح خستہ و خراب نہ رہتے۔

مولانا عبدالماجد اس کافرانہ ذہنیت کے
متعلق تفسیر ماجدی کے ص ۶۲۳ پر تحریر فرماتے
ہیں کہ ۔۔۔ "یہ جاہلی استدلال آج جس زور
شور سے پیش کیا جا رہا ہے بیشتر شاید کبھی
نہ ہوا ہو ۔۔۔ صرف اہلِ باطل ہی نہیں بلکہ ان سے
مرعوب بہت سے مسلمان بھی مشرک قوموں
مسیحی قوموں، لا مذہب قوموں کی مثالیں
پیش کر کے پکار پکار کر مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں
کہ ان کی ترقیاں دیکھو، ان کی دولت حکومت
ثروت عظمت جاہ و عزت دیکھو۔ ان کی اقبال
مندی پر نظر کرو اور تم اگر اپنی ترقی اور رفاہ
چاہتے ہو تو انہی کے طریقے اختیار کرو، انہی
کی روش پر چلو، اور وہی کرو جو یہ "ترقی یافتہ"
اور "اقبال مند" قومیں کر رہی ہیں ۔۔۔ ترقی و
فلاح نام انہی دنیا پرست قوموں کی تقلید کا ہے
مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ارشاد
ہو رہا ہے کہ یہ ظاہری ساز و سامان، یہ دولت و

حکومت یہ زرق برق لباس، تہذیب و تمدن ہی اگر دلیل حقانیت اور ثبوت صداقت ہوتا تو آخر بڑی بڑی پُرشوکت پُرقوت پُرثروت، نافرمان قومیں کیوں غارت ہوگئیں۔ بابل و کلدانیہ کا تمدن کیا ہوگیا؟ اہرام مصر والی، عمارتیں کیوں زمین کے برابر ہوگئیں؟ شاہانِ عجم کا کروفر کیا ہوا؟ یونانیوں کا دم خم کہاں چلا گیا، قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کیوں تاراج ہوکر رہے؟ زار روس کی حکومت کا تختہ کیسے اُلٹ کر رہا؟ قیصر جرمنی کے آہنی ارادے کیوں کمزوری کی نذر ہوگئے؟ ہٹلر کی ہیکڑی کا کیا حشر ہوا؟ قانون تکوینی کے ماتحت فاسق و فاجر اور ظلم و ستم کرنے والی قوم کو مہلت بہرحال ملتی ہے اور اس کی گرفت فوراً نہیں ہوتی مگر جب پکڑ ہوجاتی ہے تو پھر اس سے نجات کی کوئی صورت ممکن نہیں۔" اور یہ ہیں مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلزم معرفت، حقیقت اور صداقت کے چند انمول موتی۔

"مظلوم و مغلوب ہونا یقیناً حد درجہ بُرا لیکن ظالم و غاصب ہونا تو اس سے بھی بدتر ہے۔"

(غصہ میں، جوش انتقام میں، عداوت میں اکثر لوگ جو اپنے کو مظلوم و مجبور سمجھتے ہیں خود بھی دانستہ ظالم بنجاتے ہیں۔ حدودِ انتقام سے گزر جاتے ہیں اور یہ حالت پہلی حالت سے زیادہ قابل نفریں اور موجب بربادی دین و دنیا ہے۔ انتقاماً بھی حق تلفی اور ناانصافی حکم شریعت کی رُوح کے خلاف ہے۔ مظلوم کی نجات ممکن ہے ظالم کی نجات کی کوئی اُمید نہیں])

"شیطان کا اصلی حربہ تزئین معاصی ہے" دورِ جدید کے ناعاقبت اندیش "مہذب" "متمدن" "تعلیم یافتہ" "مغرب زدہ لوگوں سے، جی ہاں مسلمانوں سے شراب کی خوبیاں سُن لیجئے، قماربازی کی مصلحتیں سن لیجئے، اور یہ بھی سُن لیجئے کہ مردوں اور عورتوں میں آزادانہ اختلاط سے کیا کیا فائدے ہوتے ہیں۔ رقص و سرود سے کیسی "معصوم فرحت" دنیا کے دھندوں سے تھکے ہارے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ بے پردگی ملّی ترقی کے لئے کتنی ضروری ہے۔ وغیرہ وغیرہ غرض یہ کہ جب شیطان کسی انسان کو فسق و فجور میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو عصیان و طغیان کے کریہ چہرہ پر نقابِ نظر فریب ڈال دیتا ہے پردہ نقاب میں کیا ہے ہر وہ شخص دیکھ سکتا ہے۔ جس کو دیکھنے کی کد ہو، تلاش ہو تڑپ ہو۔

"اللہ میاں انتظام کائنات میں مروت کسی فرقہ کی اُس کے نام کی بنا پر نہیں کرتے۔ جو ان کو ان کے قانونِ تکوینی کے جتنا زیادہ مطابق بنائے گا اس کا نتیجہ بھی دم نقد یہیں دیکھ لیگا" اقبال کا شعر ہے:-

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اس شعر کا مفہوم کالج کے پڑھنے والے جو بھی سمجھیں اس کی صحیح تشریح اور روح مقصود یہ ہے کہ دنیاوی حیثیت سے اغیار، غیر مسلم، بددین بے دین اچھے ہیں اور بیچارے مسلمان اکثر دینی، دنیاوی حیثیت سے بدحال اور پریشان روزگار ہیں کیوں؟ اس لئے کہ اغیار نے اُن طریقوں کو اپنایا، اُن اصولوں پر کام کیا جن پر عمل پیرا ہونے سے ہی دنیا ملتی ہے اور مسلمانوں نے اُن اسباب اُن ذرائع سے قطع نظر کر لیا جن کے واسطہ سے ہی اکثر دنیاوی مال و منال کا حاصل ہونا ممکن ہو جاتا ہے۔ مسلمان اگر صرف اُس اُمید پر حصول دنیا میں سعی کرنے سے کتراتے رہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس لئے خدا بلا کد و کاوش سب کچھ دیدیگا تو قانونِ قدرت اس طرزِ زندگی کو، اس رویہ کو پسند نہیں کرتا اور کاہلی، بے عملی کے لئے سخت سزائیں رکھدی ہیں۔

"مخالفین کے عناد و مخالفت کے نتائج سے محفوظ رہنے کا آسان نسخہ قرآن پاک میں یہ ملیگا کہ ——— "تم اپنے کام سے کام رکھو، اپنی اصلاح میں لگے رہو، استقامت علی الحق کا دامن ہاتھ سے نہ دو، کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا" (ماجدی ص۳۵) (ایسے کام کی بات ہے اور اطمینان سے کام کرنے کا کیسا بہتر طریقہ ہے؟)

"ایک آیت قرآنی سے یہ ہدایت حاصل ہوتی ہے کہ ——— دشمنوں سے مقابلہ کی ہر طرح کی جنگی تیاریاں، عصرِ جدید کے تقاضوں کے ماتحت کرتے رہنا چاہیئے" (تفسیر ماجدی صفحہ ۴۹۰)

اگر مسلمان اس ہدایت پر عمل کرتے ہوتے تو اُس ظلم و جور، تباہی و بربادی سے بچ جاتے جس کا قصہ وہ آج بھی موقع بے موقع دُہرایا کرتے ہیں۔ اور اگر اس ارشاد باری پر اب بھی عمل نہیں کرینگے تو ڈر ہے کہ پھر وہی کالے دن دیکھنے پڑ جائینگے۔

"قرآن پاک کی ایک آیت میں 'مشورہ' کی جو ہدایت اور اہمیت ہے اور جس کی فضیلتیں حدیث میں آئی ہیں اس کی نظیر دنیا کی بڑی بڑی آزاد جمہوریتیں نہیں پیش کر سکتیں۔ اسلام کے نظام سیاسی کو شخصی اور جمہوری (یا عمومی) دونوں سے الگ، جو نظام شورٰی قرار دیا گیا ہے۔ اس کی اہم بنیاد یہی آیت قرآنی ہے" ——— (تفسیر ماجدی جدید ص۶۶۶)

"اجتماعیت کی اہمیت قرآن و حدیث دونوں کی دعاؤں میں کثرت سے جلوہ گر ہے" (ایضاً ص۹)

"عبادت کرتے ہیں تو "ہم سب" طلب اعانت کرتے ہیں تو "ہم سب" درخواست ہدایت کرتے ہیں تو "ہم سب" اُمت و ملت کی یہ ہمہ وقتی شیرازہ بندی اسلام ہی کا حصہ ہے۔ (ایضاً ص۱۱)

(اگر مسلمان اجتماعیت کی اہمیت پر غور کرنے لگیں، اور اجتماعیت کے مقتضیات پر عمل سچے دل سے شروع کر دیں تو دیکھ لیں گے کہ ان کے دن کس طرح اور کتنی جلد پھر جاتے ہیں)

"خالق کائنات نے بندوں کو جو آزادی و اختیار دے رکھا ہے ـــــ اس میں وہ خواہ مخواہ دست اندازی کبھی نہیں کرتا ـــ سانپ کو کاٹنے کی، زہر کو ہلاک کرنے کی بنیادی اجازتیں اور آزادیاں اسی کے قانون تکوینی کے مطابق ہیں"۔ (ایضاً ص۳۳۱)

"مشیت الٰہی بندوں کو مسلوب الاختیار بنا کر رکھنے کی نہیں (ایضاً ص۳۳۴)

(کسی کا یہ کہنا کہ اگر خدا چاہتا تو میں اس گناہ کا ارتکاب نہ کرتا خلاف انصاف اور خلاف حقیقت ہے۔ ہر شخص کو پوری آزادیٔ عمل حاصل ہے۔ سوچ سمجھ کر عمل بد سے بچنا ہر انسان کے اختیار میں ہے)

"تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ ــــ اللہ کی منع کی ہوئی اور حرام ٹھرائی ہوئی چیزوں سے ڈرا جائے، بچا جائے"۔ (ایضاً ص۳۴۹)

"اصل تقویٰ ہے، احکام الٰہی کے خلاف ورزی کا خوف" (ایضاً ص۳۵۰)

بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی متقی ہے پرہیزگار ہے۔ اس لئے بڑا بزرگ ہے تو میرے خیال میں ہر مسلمان کسی نہ کسی درجہ میں ضرور متقی ہوتا ہے۔ مسلم غیر متقی ہو ہی نہیں سکتا۔ جس کو احکام خداوندی کی خلاف ورزی کا خوف ہی نہ ہو وہ اپنے کو مسلمان کہنے کا حق ہی کیا رکھتا ہے

"دشواریوں اور پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ تقویٰ الٰہی ہے" (تفسیر ماجدی ص۱۱۱) تقویٰ الٰہی سے مراد یہ ہے کہ خدا کے حکموں کی پابندی زندگی کے ہر شعبہ میں بلا استثنا کیجائے

"قربان جایئے اس رحمتِ بے حساب اور رحمتِ بے پایاں کے کہ وعدۂ مژدہ وصلہ رسانی و یافت پر نہیں مجرد سعی و تلاش پر رکھ دیا ہے۔ داد و انعام کے لئے شرط کامیابی و فائز المرامی کی نہیں صرف ہمت و اخلاص نیت پر رکھی ہے ـــ اجر و صلہ کے دروازے اپنی طرف سے کھول دئے ہیں اور انتظار صرف اس کا رہتا ہے کہ کوئی قدم طلب و سعی کا اُٹھے تو سہی ....

داد حق را قابلیت شرط نیست" (ایضاً ص۱۰)

(اس رحمت و مرحمت ربانی کے باوجود اگر کوئی زمانہ کی ناسازگاری، اغیار کی دشمنی اپنوں کی بے اعتنائی، اپنی بے بضاعتی سے ڈر کر گھبرا کر مایوس ہوکر، ہمت ہار کر، ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہے اور تبلیغ دین، تفہیم و تقویت دین اور اعانت ملت کے کاموں میں دل سے، خلوص نیت سے حصہ لینے سے رُکے سہمے، ڈرے تو اس سے بڑھ کر بیوقوف اور بدنصیب کون ہوگا)

"شکر کی بہترین تعریف یہ ہے کہ ـ اللہ کی

ہوئی نعمتوں کو اللہ ہی کے کاموں میں لگایا جائے۔" (ایضاً ص٣٦٦)

(صحت، دولت، عزت، علم، غرض یہ کہ جو بھی نعمت اللہ نے دی ہے اس پر صرف اتنا کہہ دینا کہ ——— اللہ کا شکر ہے۔ اس کا احسان ہے کہ اس نے یہ نعمت ہمیں دی ——— ہرگز کافی نہیں اور شکر کا اصلی مفہوم ہرگز محض زبانی اقرار واعتراف نعمت شکر کی تعریف میں نہیں آتا ہم لوگوں کو جو بھی نعمت جتنی بھی ملی ہے اس پر شکر یوں ہی کیا جانا چاہیئے کہ اس کو خدا کے کاموں میں خدا اور اس کی کتاب کی ہدایت کے مطابق صرف کریں اور اس طرح مزید نعمتوں کے حاصل کرنے کا سامان بھی مہیا کر لیں)

"ناشکری کا اصلی مفہوم یہی ہے کہ ——— اللہ کے دیئے ہوئے قوتوں کو اللہ کی نافرمانی میں صرف کیا جائے۔" (ایضاً ص٣٦٦)

[آپ کو زور ملا اور آپ نے ظلم شروع کر دیا آپ کو علم اور زور بیاں ملا۔ اور آپ نے لوگوں کو بہکانا اور بھٹکانا شروع کر دیا، آپ کو حکومت ملی اور آپ نے لوگوں کو ستانا شروع کر دیا۔ تو اسی کو ناشکری کہتے ہیں اور اس کی سزا ہے عذابِ شدید۔]

"مولانا ماجد لکھتے ہیں کہ ——— "ایک حدیث میں ہے کہ جس کے لئے دعا کا دروازہ کھل جاتا ہے یعنی دعا کی توفیق ہو جاتی ہے، اس کے لئے رحمت کا بھی دروازہ کھل جاتا ہے" (ایضاً ص٣٣٣)

(مسلمانوں کو ہر وقت، ہر حال میں اپنے لئے اپنوں کے لئے، مسلمانوں کے لئے، تمام انسانوں کے لئے دعاء خیر کرتے رہنا مفید بھی ہے اور باعث اجر بھی اگر کوئی دعا فوری طور پر قبول نہ بھی ہو تب بھی مانگتے رہنا چاہیئے۔ عدم قبول دعا سے مایوس ومغموم نہ ہونا چاہیئے ؎

از گراں قدریست گر دیر آید مطلب بدست
از تہی برگشتن دستِ دعا غمگیں مباش (صائب)

"سورہ البقرہ کی آیت ٢١٣ کی تفسیر کے سلسلہ میں مولانا ماجد کی درد بھری آواز گوش دل کو سنائی دے رہی ہے:۔

"اللہ کی عطا کی ہوئی ہر دینی ودنیوی نعمت کے ساتھ آج ہمارا کیا معاملہ ہے؟۔ کس نعمت کا حق ہم ادا کر رہے ہیں؟ کون سی نعمتِ الٰہی ہے جس کی روح ہم نے نہیں بدل ڈالی ہے؟ ہماری نمازیں، ہمارے روزے ہمارے حج ہماری ساری عبادتیں تک مغز و روح سے خالی محض ان عبادتوں کے ڈھانچے رہ گئے ہیں۔ اخلاق واتحاد کی دولت ہم نے الگ برباد کر ڈالی۔ نتیجہ جو نکلا وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے پاکستان، عراق انڈونیشیا وغیرہ مسلم مملکتوں کا آج جو عبرت انگیز حشر ہو رہا ہے ان سب کی تہ میں یہی خدائی نعمتوں کی ناقدری ہے۔" ——— (ایضاً ص٣٩٢)

"اللہ والوں کو اپنی اولاد کے لئے فکر اُن کے دینی و اخلاقی تحفظ کی ہوتی ہے"۔

(تفسیر ماجدی ص۵۶۹)

آج کل مسلمانوں کو اپنی اولاد کے لئے فکر اُن کی مادی تعلیم اور حصولِ دولت کے طریقوں کی ہوتی ہے)

"اسلامی نظام معاشیات کی بنیاد مادیات سے کہیں بڑھ کر انسانیت و روحانیت و تقویٰ پر رکھی ہے اور یہ خصوصیت اُسے دنیا کے قدیم و جدید سارے معاشی نظاموں سے ممتاز کئے ہوئے ہے۔ (تفسیر ماجدی جدید ص۱۰۵) (تجربہ شاہد ہے کہ معاشیات کا ہر وہ نظام جو مادیات پر بنایا جائے گا، ناکمل اور غیر مفید ہوگا۔)

مفکر دریا بادی فرماتے ہیں کہ — "ایک شور برپا ہے کہ اب زمانہ اس کا نہیں کہ مذہب خصوصاً اسلام کو عقائد معاد سے پرکھا جائے، اب تو دیکھنا یہ ہے کہ اس دنیا کے لئے سب سے زیادہ عملی مذہب کون ہے؟ اور روزانہ کے مسائل زندگی کے حل کرنے میں کون مذہب سب سے زیادہ زور دے رہا ہے؟ یہ معیار بجائے خود کس حد تک صحیح ہے یہ تو ایک الگ سوال ہے، لیکن بہرحال جو لوگ اسی معیار کو مانے ہوئے ہیں کم سے کم وہ تو خلوئے ذہن کے ساتھ غور کریں کہ ساری شریعتوں میں اسلام سے بڑھ کر کسی شریعت نے روزانہ زندگی کے چھوٹے بڑے تمام مسائل کے حل کرنے کا اہتمام رکھا ہے

(ایضاً ص۵۲۳)

"فلاح و کامیابی یا دنیا میں عافیت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا راز احکامِ تقویٰ پر عمل کرنے میں ہے"۔ (تفسیر ماجدی ص۴۲۳)

"دنیا میں کوئی بدترین بدعت بھی ایسی نہیں جو نفع کے پہلو سے یکسر خالی ہو، یا جس کی بنیاد اخلاص و حسنِ نیت پر سرے سے نہ ہو"۔ (مذہب کا پرچار کرنے والے مسلمان غور کریں کہ ان کی اکثر مذہبی تقریبات کی بنیاد بدعت پر ہے کہ نہیں اور انکی تقریبات منانے کا طریقہ صحابہ یا تابعین کسی کے زمانہ میں تھا؟ (صدق جدید ۱۴ اگست)

"خوب یہ ترقی ہے کہ ایک طرف چاند اور زہرہ پر کمندیں ڈالی، اور دوسری طرف یہ بے بسی کہ پیٹ بھر کر کھانا حاصل ہو جانے پر بھی قدرت نہیں" (صدق جدید جلد ۱۲ ۱۴۷)

(معاش و معیشت کی گرانی کا حال روزناموں میں پڑھ کر دیکھئے)

"گلستاں اور بوستاں کا دور ختم ہوئے مدت ہو چکی اور گرو اور استاد کی قدر و قیمت ایک زمانہ ہوا کہ دنیا سے رخصت ہو چکی "مساوات" کے نعروں کے بعد اب فرقِ مراتب کا لحاظ رکھنا اور "احترام و تعظیم" کے لفظ رٹے جانا خود اپنی فرسودہ خیالی اور کہنہ دماغی کا اشتہار دینا ہے"

(ایضاً)

[...لموں کا، پروفیسروں کا، وائس چانسلروں کا ...ھانا جان سے مار دیا جانا، یونیورسٹیوں کا جلا ...جانا، اسکولوں کی عمارتوں پر سنگ باری ...ا، نہ خود پڑھنا نہ پڑھانے دینا کیا روزانہ کی خبریں ...ں ہو گئیں ہیں]

"عورت کی آزادی، حقوقِ نسواں، مساواتِ ...وزن کے بلند نعرے تجدد و روشن خیالی کی ...نچی اونچی دکانوں سے آپ روز ہی سنتے رہتے ...، زندگی کے ایجاد کئے ہوئے گراموفون سے ...آوازیں تو ہر صبح اور ہر شام آپ کے کانوں ...ں پڑتی رہتی ہیں ــــ کبھی اپنے آقا و مولا کی ...نے والے اور حقائق کی منادی کرنے والے معلّم ... کے ...ناد کی طرف بھی دھیان گیا ہے؟"

(ایضاً)

[کیا دورِ جدید کا جوان مسلمان مولانا ماجد کی ...ایت و نصیحت پر عمل کرنے کو تیار ہے؟]

"دورِ جدید کی مسلمان قوم کا "مشغلہ صرف ...شور و ہنگامہ اور ہائے ہُو کی طرف لپکتے رہنا ...ر ہر مفید اور ٹھوس کام سے بچتے رہنا ہے۔"

(ایضاً)

[کیا اس تلخ حقیقت کو بار بار دہرانے کی ...ضرورت بھی اب باقی رہی ہے؟]

"آزادی کی یو اندھا دھند مدح سرائی دورِ جدید ...نے ہر طرف سے شروع کر دی اس کا قدرتی نتیجہ یہ ...نکلا کہ انسان کی نظر میں سیاسی آزادی مقصودِ اعظم

بن کر رہ گئی ہے اور تمام مقصود اس سے مغلوب ہو گئے ہیں ــــ حالانکہ مسلمان کا مقصودِ اعظم تو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے ــــ عبدیتِ الٰہی اور وہ غلامی اسیری آزادی کی ہر صورت میں یکساں ہے"۔ (صدق جدید جلد ۱۴ ۲۴)

[آزادیٔ وطن، وطن پرستی مطلوب ضرور ہے مگر مسلمان کا مقصود اصلی ہرگز نہیں]

"بھانڈ اور بیسوا تو شاید آج بھی وہی ہے لیکن اس بے پناہ اور بے خطا حربہ کا توڑ کس کے پاس ہے کہ اب طائفہ کا نام "کلچرل وفد" ہے۔ ناچ مجرے کے بجائے اصطلاح "ثقافتی شو" کی چل پڑی ہے"۔ (صدق جدید جلد ۱۴ ۲۰)

[خوش نما ناموں سے فسق و فجور میں مبتلا کر دینا شیطان کا آزمایا ہوا حربہ ہے]

"ہرجائی پن" کا نام کسی زمانہ میں منافقت رہا ہوگا اور کسی ماضی بعید میں اس کا شمار عیبوں میں ہوتا ہوگا ــــ اب وہ عین ہنرمندی ہے ـ اور بہترین سیاست کاری یا ڈپلومیسی"۔

(ایضاً)

[منافقت، دروغ گوئی، وعدہ شکنی دورِ جدید کے چلے ہوئے سکے ہیں]

"ہندوستان کے اونچ نیچ چھوت چھات کے گورکھ دھندے کو تو گاندھی جی اپنے خون کے قطروں سے بھی حل نہ کر سکے"۔ (صدق جدید جلد ۱۴ ۲۵)

[مساوات کی چیخ پکار کے باوجود کیا آج بھی یہ

یہ تلخ حقیقت موجود نہیں ہے۔

"ہر تہذیب اپنا ایک خاص سیٹ رکھتی ہے یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ معاملات تو آپ تہذیب فرنگ سے لے لیں، اخلاق اپنے دین قدیم اسلام سے قائم رکھیں، معاشرت و معاملت، وضع و لباس، آداب و اخلاق سب ایک ہی سانچے اختیار کر لیں گے۔"

(صدق جدید جلد ۱۲ ۱۶)

[اس تلخ تاریخی حقیقت پر ہم مسلمانوں کو ٹھنڈے دل اور صاف دماغ سے غور کرنا چاہیئے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب کوئی کسی تہذیب کی کسی بھی چیز کو قبول کر لیتا ہے تو رفتہ رفتہ اُس تہذیب کے تقریباً سارے لوازمات کو اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔]

"سارے تقویٰ، ساری اخلاقی بلندیوں، ساری احتیاطوں کی جڑ ہے خوفِ خدا اور وہی اب ہم سے رخصت ہو چکا ہے۔ کم سے کم اجتماعی زندگی میں تو بدیہی طور پر + اور اس کو اپنی ملی و اجتماعی زندگی میں از سر نو داخل کئے بغیر ہم کسی بھی خوش اقبالی کا خواب دیکھ سکتے ہیں؟" (صدق جدید جلد ۲ ۲)

"اس عالم ناسوت میں فرماں روائی کسی بندے کی نہیں بلکہ ایک حکیم کلُ و علیم کلُ کی ہے تکوینی مصلحتیں بے شمار ہیں، اور ان کو نظر میں صرف حکمت کامل اور علم کلُ ہی رکھ سکتا ہے اور رکھتا ہے حالات کے اُتار چڑھاؤ سے، خوشی و ناخوشی سے، کسی بندہ کو کسی حال میں مفر نہیں اولیائے کاملین ہی نہیں انبیائے مقربین تک کو قدم قدم بلکہ ہر طرح کی ناگواریوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ساری عمر امتحان کی نذر ہو جاتی ہے۔ بس ہر ایک کے درجے دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ـــ سارا اجر و ثواب اُنھیں خلاف مزاج و طبیعت حالات پر صبر و ثابت قدمی کا ہے۔"

(صدق جدید جلد ۱۶ ۱۱)

[اگرچہ یہ حقیقت دل میں اُتر جائے اور ہر وقت مستحضر رہے تو یاس و حرمان سے واسطہ ہی نہ پڑے وہ حکیم مطلق کا قانون تکوینی قدم قدم پر آپ کے عمل و کردار کو دیکھتا ہے رسمی کلمہ گوئی اور محض لفظی و زبانی انتسابت عالیہ کی بنا پر مروت نہیں کرتا

(صدق جدید جلد ۱۷ ۱)

[محض مسلمان ہونے کی بنا پر بغیر محنت، جد و جہد اور جفاکشی آپ کو وہ دنیاوی نعمتیں کیوں ملیں جو محنتی اور جفاکش لوگوں کا خاص انعام ہے۔]

"دین کو اگر دنیا سے بالکل الگ فرض کیا جائے تو اس کے کوئی معنی نہیں باقی رہ جاتے لوگوں سے اچھا برتاؤ رکھو، ماں باپ کی خدمت کرتے رہو اللہ کو ایک ہی کارساز خالق و مربی سمجھو، یہ سب طریقے دنیا ہی کے تو برتنے کے ہوئے۔ دین نام ہی دنیا کے صحیح استعمال کا ہے۔"

(صدق جدید جلد ۱۳)

"اسراف" اور مزید اسراف، کی تاکید کرتے

(و دا) انانیت کو شرم آنے لگتی ہے۔ اس لئے نفس نے اس کے لئے ایک خوش نما لفظ 'معیارِ زندگی کی بلندی' کیسا گڑھ لیا اور اس کی بلا تکلف تبلیغ و تلقین شروع کر دی۔"

(صدق جدید جلد ۱۴ ص ۴)

"اگر صرف نام کی تبدیلی حقیقت کو بدل سکتی ہے تو جتنا جی چاہے معیارِ زندگی کو بلند کئے جایئے اور فلاں اور مزید فلاں مرض میں مبتلا ہو کر ناگفتہ بہ برائیوں کا ارتکاب کرتے جایئے اور کبھی نہ شرمایئے!"

"انقلاب جب آتا ہے تو محض سیاسی حدود تک محدود نہیں رہتا، اور طرزِ حکمرانی کے تغیر پر کفایت نہیں کرتا۔ اس کے لئے ناگزیر سا ہے کہ وہ زندگی کے مشغل (معاشرتی) پہلوؤں کو بھی اپنے لپیٹ میں لے اور اس کے بعد یہ کہ قوم کے اخلاقی دینی روحانی نظام پر بھی ہاتھ ڈالے اور بہت سی اعلا قدروں کو پامال کر کے رکھ دے۔"

(صدق جدید جلد ۱۱ ص ۲)

(ہندوستان پاکستان کے معاشرہ میں جو غیر شریفانہ اور مجرمانہ جراثیم پیٹھ گئے ہیں پھیل گئے ہیں اور گھستے چلے جا رہے ہیں کیا آنکھ والوں کو دکھائی نہیں دیتے اور کیا عقل و دانش والے انکو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے نہیں ہیں۔ کیا فرنگی تمدن کی نقل اور پیروی نے ان ملکوں کے رہنے والوں کو تباہ نہیں کر دیا ہے اور کیا ان کے اعلا قدروں اور خوبیوں کو پامال نہیں کر دیا ہے؟)

سرکارِ ہند کے وزیرِ قانون کے پارلیمنٹ بیان کے اس فقرہ پر کہ "بہت سے مسلم ملکوں نے مسلم پرسنل لا میں وحدتِ ازدواج کے لئے گنجائش نکال لی ہے" مولانا ماجد تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"اول تو جب تک حالات قیود و شرائط کی تفصیل نہ معلوم ہو یہ کسی مسلم ملک کے عمل سے سند پا کر کسی درجہ میں بھی صحیح نہیں ہو سکتا ہے اصل سوال یہ ہے کہ کیا کسی مسلم ملک سے یہ خبر ملی ہے کہ اس نے اپنے ہاں کی اقلیت کے قانون میں دست اندازی روا رکھی ہے؟ . . . کیا مسلم ملکوں کی پارلیمنٹ میں عیسائیوں اور یہودیوں ہندوؤں کا نام لے کر مشترک سول کوڈ پر بحث کی گئی ہے؟ کیا پاکستان کے عائلی قوانین کا اطلاق غیر مسلم اقلیتوں پر بھی کیا گیا ہے؟ کیا مصر میں عیسائیوں اور یہودیوں سے کہا گیا ہے کہ حکومت ایک عام سول کوڈ بنانے کی زبردست خواہش رکھتی ہے؟" اسی کو کہتے ہیں "زبردست کی منطق۔"

(صدق جدید جلد ۱۶ ص ۲)

مولانا ماجد کے ایک کرم فرما نے حج سے واپسی پر ایک خط مولانا کو بھیجا۔ اس خط کے چند جملے آپ بھی دل کڑا کر کے پڑھ لیجئے۔ لکھتے ہیں کہ:-

"حجاز کو دیکھ کر دل کو دکھ ہوا...... جدہ کو اگر حجاز کا پیرس کہا جائے تو مبالغہ نہیں... خواتین کے میک اپ اور ننگے سر... فحشی کو دیکھ کر یورپ کی عورتیں شرما جائیں۔ عوام کا معیارِ زندگی تیز در

بڑھ گیا ہے۔ لیکن معیار اخلاق حد درجہ گر گیا ہے
یہ لعنتیں ہیں دولت کی بہتات کی"۔

خط مذکور کو پڑھ کر مولانا ماجد فرماتے ہیں:۔

"جی ہاں: دولت و ثروت کا فتنہ تو دنیا کے شدید ترین فتنوں میں ہے..... اور جب مال کے ساتھ جاہ متحد ہو جائے جب تو فتنہ قدرتاً دگنی قوت اختیار کر لیتا ہے۔ اور شراب دوآتشہ ہو جاتی ہے اور جاہ و مال کے ساتھ تیسرا فتنہ جب شہوانیت وجنس پرستی کا بھی اکٹھا ہو جائے جب تو پھر اس قوت کی کیا کہنا چاہیئے کہ انتہا ہی نہیں رہتی اور اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا معمولی انسانوں کا کام نہیں.... معیار زندگی کی بلندی اور معیار اخلاق کی پستی کے درمیان ہرگز کوئی تضاد نہیں اور تضاد کیسا یہ تو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہے اور دونوں میں ساتھ چولی دامن کا ہے۔ الفاظ واصطلاحات سے دھوکا نہ کھایئے معیار زندگی کی بلندی کے کھلے ہوئے معنی اسراف نمائش وخود پرستی کے ہیں جو قناعت خودداری اور ضبط نفس کے دشمن ہیں"۔

(صدق جدید جلد ۱۶ ٢٤)

ایک عزیز کو، جس کے یہاں حادثے پر حادثے کی خبر معلوم ہوئی تھی۔ مولانا یوں تسلی دیتے ہیں

"ایک ہی حادثہ بشر کے لئے کیا کم ہے چہ جائیکہ یک کے اوپر دوسرا حادثہ! ——— انسان کی ساری عمر ہی امتحانوں میں گزرتی ہے اور ہر شخص اپنے ہی صدمہ کو سب سے بڑھ کر سمجھتا ہے حالانکہ ذرا نظر دوڑائیے۔ تو معلوم ہو جائے کہ اپنے گرد و پیش ہی ایک سے بڑھ کر ایک دکھی اور مصیبت زدہ پڑے ہیں۔ اور پھر مصیبت کے عوض راحتیں اور نعمتیں کیسی کیسی رکھ دی ہیں۔ لازوال اور بے انتہا ایسی کہ انسان اگر انھیں خواب میں بھی دیکھ پائے تو مصیبتوں کا الٹا طالب و راغب ہو جائے ——— امتحان بھی ہمیشہ ہر بندہ کے ظرف کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔ جس کا امتحان جتنا زیادہ سخت ہو وہ یقین کرے کہ اس کا ظرف بھی اسی درجہ عالی و وسیع ہے اور صلہ و اجر بھی اسی مناسبت سے اور اسی پیمانے پر مل کر رہے گا"۔

(صدق جدید - جلد ۱۶ ٢٤)

(تسکین و تسلی، صبر و سکون کا کتنا بڑا سرمایہ اور سامان مولانا کے ارشادات بالا نے غم زدوں اور مصیبت کے ماروں کے لئے فراہم کر دیا ہے!)

"معیار حیات کی بلندی" کا کھل کر صاف وسیس ترجمہ 'اسراف پسندی' کر دیا جائے تو شاید دنیا کا احمق ترین شخص بھی اس کے فریب میں نہ آئے۔ گو اسی کو خوش نما اور نظر فریب قالب 'معیار زندگی کی بلندی' کا ایسا دیدیا گیا ہے کہ اچھے اچھے ہوش مندوں اور دانشوروں کی عقل چکرا گئی۔ اور سب اسی کے دام میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ جیسے یہ کوئی بڑی اونچی چیز ہے قناعت پسندی کو اس نے نظروں میں حقیر و ذلیل بنا دیا ہے اور حرص و ہوس کی وہ آگ سینوں

ہی ہوا کاری ہے جس پر ہر جدید ترقی، تیل کا کام دیتی ہے۔ اور آگ بجائے بجھنے کے اور زیادہ ہی بھڑکتی ہی چلی جاتی ہے۔"

(صدق جدید جلد ۱۲ ۵۲ـ)

(خوبصورت شاندار الفاظ کی سحرکاریوں کی، تباہ کاریوں کی، مثال عصر جدید کے ادبیات اور خطبات میں بکثرت ملتی ہے)۔

"دنیا میں اچھا بُرا جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب ہی تقدیر الہٰی یا علم الہٰی کے مطابق ہو رہا ہے اور اس کو عام بول چال میں قسمت یا نصیب کہا جاتا ہے۔ خوب سمجھ لینے کی بات یہ ہے کہ "علم الہٰی بالکل الگ چیز ہے جو مرضی الہٰی کے مرادف ہرگز نہیں۔"

(صدق جدید جلد ۱۲ ۵۳ـ)

(اکثر لوگ مرضیٔ الہٰی اور علم الہٰی میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے خطرناک غلط فہمیوں میں مبتلا ہوکر برباد ہوجاتے ہیں اور اپنے کفر و فسق کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرا لیتے ہیں۔ نگارشات مرقومۂ صدر سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی تفسیر و تشریح آیات قرآنی کے ذریعہ سے رموز و حقائق حُکم و حکمت الہٰی پر روشنی ڈال کر اہل بصارت کو صاحب بصیرت بنانے کی کوشش کرتے ہیں —— اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اپنے جریدہ صدق جدید کے ذریعہ سے جو کچھ بھی "سچی باتیں" یا مشورے اور گزارشیں" کے زیر عنوان، یا کسی سیاسی خبر کے سلسلے میں لکھتے ہیں، یا عصر حاضر کے فتنوں اور غیر شرعی تقاضوں پر تبصرہ کرتے ہیں، یا یورپ کی مُہلک نظر فریبیوں کا ذکر کرتے ہیں سب کا مقصد دینی دشواریوں کا حل کرنا، حقائق کی رونمائی کرنا حقیقتوں کو سمجھانا، اخلاقی قدروں کی صحیح تعریف کرنا، مغربی ذوق والوں کی ذہنیت کے پیش نظر مناسب پند و نصیحت کرنا ہے۔

تفسیر ماجدی کا مطالعہ کیجئے یا سچ، صدق اور صدق جدید کے پرچوں پر نظر ڈالئے آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مسلمانوں بلکہ انسانوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنا اور سدھارنا چاہتے ہیں، آپ محسوس کریں گے کہ احوال لکھنؤ کے ماتحت خبریں چھاپ کر، سند و دلیل کا اُنھیں سہارا دے کر، مظلوم کی آہ و کراہ کو کوشش ظالم تک نہایت ہی دلکش رنگ و آہنگ سے پہونچانے میں خاصہ ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کے طعن و تعریض میں بھی لطف و لطافت نمایاں رہتا ہے۔

یہ ناقص مقالہ اگر مکمل کیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تفسیر ماجدی اور صدق جدید کے اکثر و بیشتر نگارشات کو نقل کرنا ہوگا اور اس کا نہ موقع ہے نہ اُس کی فرصت۔

مولانا سید امیر حسن نورانی ندوی

مولانا عبدالماجد دریابادی بحیثیت مفکرِ اسلام اور مصلحِ ملت

مولانا عبدالماجد کی شخصیت اور اُن کے کارناموں کا جائزہ لینا آسان نہیں۔ اُن کی شخصیت پہلو دار ہے ان کی مختلف اور متنوع حیثیتیں ہیں اور ہر حیثیت میں وہ کامل نظر آتے ہیں بلند پایہ طنز نگار، صاحبِ طرز ادیب، ممتاز صحافی، انوکھے سوانح نگار ماہر فلسفی، جدید و قدیم علوم کے عالم کی حیثیت سے علمی دنیا میں انھیں کون نہیں جانتا لیکن ان سب سے قطع نظر عالم اسلام میں ایک مفکر و مصلح کی حیثیت سے ان کا مقام بلند ہے مولانا اسلامی علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں مفسر قرآن بھی ہیں اور تصوف و سلوک کے اسرار و رموز سے بھی آشنا ہیں۔

عصر حاضر میں جن بلند پایہ علمائے دین و ملت کی خدمت اور رہنمائی کے لئے خلوص کیساتھ گرانقدر خدمات انجام دیں ہیں ان میں مولانا عبدالماجد بلاشبہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جس جہت سے ان کے کارناموں پر نظر ڈالئے وہ اپنی انفرادیت کے باعث ممتاز نظر آئیں گے۔ ایسے صاحب علم و بصیرت صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد کے ذہنی و فکری ارتقا کی تاریخ دلچسپ اور سبق آموز ہے، ان کی زندگی کے نشیب و فراز کو خود ان کی تحریروں کی روشنی میں مرتب کیا جائے تو ایک اہم علمی و دستی کارنامہ ہو گا۔

مولانا عبدالماجد کا مرتبہ بحیثیت مفکر اسلام اور مصلح ملت کیا ہے، اس کا تعین صحیح طور پر مستقبل قریب میں کیا جائے گا، جب ان کی خدمات اور کارناموں کے اثرات واضح طور پر مرتب ہوں گے۔ اس وقت اسلامی دنیا بلند پایہ مفکرین جلیل القدر علما و

معترین اور قدیم وجدید علوم کے ماہرین سے خالی نہیں ہے اسلام اور مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی رحمت ہے کہ آغاز سے ابتک کوئی دور بھی علما، فضلا صوفیا کرام اور مبلغین اسلام سے خالی نہیں رہا۔ رشد و ہدایت کے علمبردار ہر زمانے میں رہے، اعلائے حق کے لئے جان و مال کی بازی لگانے والے ہر عہد میں ہوتے رہے ہیں ہر ایک نے اپنے حلقہ اور ماحول کو اصلاحی نقطۂ نظر سے کم و بیش متاثر کیا۔ اسی طرح جاہ پرست متملق پسند اور دنیاوی عزت و عظمت کے شیدائی علما کا ایک بڑا گروہ بھی ہر زمانے میں نظر آئے گا، ایسے لوگ پہلے بھی تھے، آج بھی ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ان کا یہاں ذکر نہیں۔ بیسویں صدی کا ایک تہائی عرصہ گذرنے کے بعد عالم اسلامی کو جن علما و مفکرین نے اپنے افکار و نظریات سے متاثر کیا اور ان کو دین خالص کیطرف متوجہ کیا ان کی تعداد محدود ہے، ان میں سے برصغیر ہند و پاک کے چند علما بھی شامل ہیں اور ان کی عظیم خدمات نے انھیں سارے عالم اسلام میں متعارف کرادیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی اور خدمات کا تذکرہ یہاں بے محل ہوگا، مولانا عبدالماجد کا شمار بھی ان چند اکابر ملت اور مفکرین اسلام میں کیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالماجد نے جدید علوم وفنون کی ترویج اور تیز رفتار اشاعت اور ترقی کے زمانہ میں جب ہر طرف مذہب و اخلاق کے زوال کا چرچا اور ان کو ختم کرنے کا پرچار ہو رہا تھا، اسلامی تعلیمات کو جدید انداز میں پیش کیا، انھوں خاص تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنا مخاطب بنایا اور خالص سائنٹفک طریقوں سے مذہبی تعلیمات کو مدلل انداز میں پیش کیا۔ غلط تحریکوں اور مذہب کے مخالف عناصر کی مدلل مخالفت میں پیش پیش رہے ہیں اس سلسلہ میں حق گوئی اور بے باکی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کسی شخصیت سے تو کیا حکومت سے بھی وہ مرعوب نہیں ہوتے۔

مولانا عبدالماجد کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ [illegible] میں [illegible] شامل ہو گئے [illegible] علما میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی، حالانکہ انھوں نے ابتدا سے جدید تعلیم حاصل کی۔ دینی تعلیم سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا، کسی مدرسہ میں انھوں نے مروجہ درسیات میں شرکت نہیں کی، وہ دنیاوی علوم پڑھتے رہے، اور اعلیٰ تعلیم کے دوران انھوں نے فلسفہ کو ایک خاص مضمون کی حیثیت سے پڑھا اس میں مہارت حاصل کی، اسی کے نتیجہ میں [illegible] مذہب سے بیزار ہو گئے، عرصہ تک الحاد و بے دینی میں شہرت حاصل کرتے رہے کون جانتا تھا کہ جو شخص وجود باری تعالیٰ کا منکر ہے، جو اپنی بعض تصانیف میں اسلام کی بیخ کنی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اسی سے تجدید دین اور اصلاح امت کا کام لے گا۔ ایسی مثالیں تو بہت کم ملتی ہیں کہ دینی علوم کی باضابطہ تحصیل کے بعد ایک عالم دنیاوی علوم میں مہارت حاصل کرتا ہے لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ ایک شخص

نے ابتدا سے عالم شباب تک باضابطہ دینی تعلیم نہ حاصل کی ہو بلکہ اس کی مخالفت پر کمربستہ رہا ہو اور پھر یکایک اس کی ایسی قلب ماہیت ہو کہ وہ اپنے ذوق و شوق، محنت و لگن سے دینی علوم میں بھی اتنی نمایاں مہارت حاصل کرے کہ بلاشبہ اکابر علماء اس کو نہ صرف اپنی صف میں جگہ دیں بلکہ وہ اس صف میں نمایاں نظر آنے لگے۔ یہ معاملہ مولانا عبدالماجد کے یہاں نظر آتا ہے اور اسی لئے میرے نزدیک یہ ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ ہے۔

مولانا عبدالماجد کا تعلق ایک علمی خاندان سے ہے اُنھوں نے علم و دانش کے علاوہ حق گوئی بھی ورثہ میں پائی۔ ان کے دادا مفتی مظہر کریم احمد اپنے دور کے بڑے عالم تھے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے زمانہ میں اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا جس کی پاداش میں ان کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی تھی۔ ان کی روح یقیناً مسرور ہوئی کہ ان کے پوتے نے ظلم و جبر اور مغربی تہذیب کی گندگی کے خلاف مؤثر قلمی جہاد کیا، اور ملت اسلامیہ کو تہذیب حاضر کی خامیوں اور اس کے مضر اثرات سے باخبر کرکے الحاد و بیدینی سے دور رہنے کی بھرپور جد و جہد کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا۔

بی۔ اے۔ کرنے کے بعد مولانا عبدالماجد نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جاکر ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ ان کا پسندیدہ مضمون فلسفہ تھا۔ لیکن فلسفہ اور موشگافیوں نے ان کے مذہبی عقائد میں تزلزل پیدا کر دیا۔ دینی علوم کا اُنھوں نے اس وقت تک گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ تلاش کی جستجو ان کو مزید مگر راہ میں بھٹکتے رہے، اور الحاد و بیدینی کی راہ اختیار کی۔ پہلے انگریزی زبان میں ایک کتاب "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" کے نام سے لکھی جو لندن سے شائع ہوئی۔ اس کا اردو ملخص فلسفہ اجتماع کے نام سے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ اس کتاب کے بعض حصوں سے ان کے الحاد کا پورا ثبوت ملتا تھا علماء نے ان کی مخالفت کی بعض نے ان پر کفر کے فتوے بھی دیئے۔ اسی زمانہ میں مولانا کو دارالترجمہ حیدرآباد میں ملازمت مل گئی، حیدرآباد کے قیام میں بھی ان کے افکار و نظریات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کو راہِ حق کی تلاش تھی، ذوق و جستجو میں خلوص تھا وہ مطالعہ کو وسعت دیتے اور علم کو بڑھاتے رہے۔ اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے بعض جلیل القدر علماء علوم و فنون میں مہارت کے بعد مدتوں تشکیک کا شکار رہے، شبہات کی وادیوں میں بھٹکتے رہے لیکن تلاشِ حق کی تڑپ نے اُنھیں بیچین رکھا اور اپنے دورِ تشکیک و انتشار میں وہ عوام و خواص کے مورد طعن و تشنیع رہے امام غزالی کا واقعہ اہل علم کے سامنے ہے۔ اسلامی علوم کے علاوہ یونانی فلسفہ کے زبردست عالم تھے جب مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس مقرر ہوئے تو اس زمانے میں [illegible]

انھوں نے تھوڑے عرصہ بعد عالم اسلام کی سب سے بڑی درس گاہ کی مسند صدارت ترک کر دی اور دشت نوردی و صحرانشینی کی زندگی اختیار کی، پھر جب ان کی محنت عرصہ کے بعد ٹھکانے لگی اور حق و صداقت کی روشنی نظر آ گئی۔ تو دوبارہ مسند درس کو بھی زینت بخشی اور تصوف و سلوک کی راہ پر بھی عظیم رہبر کی حیثیت سے نظر آنے لگے، یونان کے فلاسفہ کی غلطیوں اور ان سے پیدا ہونے والی گمراہیوں پر بے مثل بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ انھیں امام غزالی کے تبلیغی و اخلاقی نظریات سے یورپ نے روشنی حاصل کی۔ ایسی مثالیں اور بھی ہیں

مولانا عبدالماجد کے ملحدانہ خیالات میں تبدیلی کا آغاز ۱۹۱۸-۱۹ء سے ہوا، اس زمانہ میں انھوں نے ہندو مذہب کی روحانیات و اخلاق کا مطالعہ بھی شروع کر لیا تھا، اس کے بعد مثنوی مولانا روم کو غور و فکر سے پڑھا۔ جس نے ان کی بڑی رہنمائی کی۔ مولانا سچائی کے متلاشی تھے، اللہ کو ان سے اسی دین کی خدمت لینا تھی جس کے وہ باغی تھے۔ بہرحال ان کی قلب ماہیت ہو کر رہی، یہ ان کی زندگی کی اہم اور سبق آموز داستان ہے، علم کی گہرائی اور گیرائی نے انھیں وہ روشنی دکھا دی جس کی انھیں تلاش تھی اس سلسلہ میں اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا ذکر ضروری ہے، اکبر مولانا کے والد ماجد کے دوستوں میں تھے، ان کو اس گمراہی سے دکھ تھا جس میں مولانا عبدالماجد مبتلا تھے اکبر اپنے مخصوص انداز میں کبھی کبھی ان کو نصیحتیں کرتے رہتے تھے۔

مولانا محمد علی سے تعلقات اس وقت شروع ہوتے جب لندن سے مولانا عبدالماجد کی انگریزی کتاب شائع ہوئی، اس کتاب کے سبب سے محمد علی، مولانا کی علمی بصیرت سے بہت متاثر ہوئے۔ لیکن اسی کے ساتھ کتاب کے قابل اعتراض حصوں پر مولانا محمد علی نے خطوط کے ذریعہ دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی اور ان کے بعض نظریات کی تردید کی، مولانا محمد علی بڑے حق گو اور نڈر رہنما تھے، ان کے دلائل اور خیالات سے مولانا عبدالماجد بہت متاثر ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دونوں میں قریبی روابط پیدا ہو گئے، محمد علی نے مولانا عبدالماجد کو اپنے مشہور اخبار ہمدرد کے مضمون نگاروں میں شامل کر لیا۔ خلافت کمیٹی کے کاموں میں بھی شریک کیا، محمد علی ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم رہنما اور حق گوئی میں بے مثال شخصیت تھے، ان کی معیت میں کام کرنا اور ان کے جذبات سے متاثر ہونا ناگزیر تھا مولانا عبدالماجد نے حق گوئی اور بیباکی کا بڑا حصہ محمد علی کی صحبت میں پایا۔

مولانا عبدالماجد علامہ شبلی نعمانی کے فیض تربیت سے بھی بہرہ یاب ہوئے۔ سیرت النبی کے مصنف اور عالم اسلام کے زبردست عالم شبلی نعمانی، ہماری علمی، ادبی اور دینی زندگی میں عظیم و قدآور شخصیت تھے ...... ہندوستان میں اسلامی علوم کے احیاء و ترویج کے سلسلہ میں شبلی نعمانی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں مولانا عبدالماجد نے ان کے فیض صحبت سے استفادہ ۔

جب علامہ شبلی نے سیرت النبی جیسی معرکۃ الآرا تصنیف کا کام شروع کیا تو مولانا عبدالماجد کی خدمات بحیثیت مترجم حاصل کیں، یہ حوالہ کی انگریزی کتابوں کے مطلوبہ قباسات کا اُردو میں ترجمہ کرتے تھے۔ علامہ شبلی مورخ بھی تھے اور سوانح نگار بھی، فارسی ادبیات و تاریخ کے ماہر، اُردو کے صاحب طرز انشا پرداز، علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھنے والے عالم، اُردو و فارسی کے شاعر، جدید علوم سے بھی خاصی حد تک واقف تھے ظاہر ہے ان کے ساتھ رہنا اور ان کی رہنمائی میں علمی و ادبی کام انجام دینا نہ صرف ایک سعادت تھی بلکہ یہ "صحبت صالح ترا صالح کند" کے مصداق مولانا عبدالماجد کو علامہ شبلی کے افکار و نظریات اور علم سے استفادہ اور ذہنی تربیت کا کیسا اچھا موقع نصیب ہوا، شبلی سے وابستگی کی بدولت ان کے تعلقات علامہ سید سلیمان ندوی، اور دیگر ممتاز علمائے ندوہ سے بھی قائم ہوئے اور یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری ہے آج مولانا عبدالماجد بھی دارالمصنفین کی مسند صدارت پر فائز ہیں۔ شبلی کے فیض صحبت، اور محمد علیؒ کی صحبت اور تربیت نے ان مولانا عبدالماجد کے قلم کا جادو جگایا، اُردو کا ذوق مولوی عبدالحق مرحوم سے ملا جن سے مولانا کے روابط خصوصی تھے۔ ندوۃ العلماء کے اکابرین سے ربط وضبط کے باعث ان میں جدید علوم کے ساتھ علوم اسلامیہ کے مطالعہ کی رغبت بڑھی اور آخر میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے استفادہ کر کے تصوف وسلوک کی منزلوں کی طرف بڑھے۔

اس طرح رنگین مزاج ڈرامہ تھیٹر سے لگاؤ رکھنے والے الحاد و بیدینی سے ہم کنار مسٹر عبدالماجد، کتنے نشیب و فراز طے کر کے مولانا عبدالماجد، مفکرِ اسلام اور مصلح ملت، کی حیثیت سے اُبھرے اور گمراہی کی دلدل سے نکل کر بے شمار گم کردہ راہوں کو، راہ راست دکھائی، باہمی تفرقوں کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اسلام کو اس کی اصل شکل وصورت میں مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کی جدوجہد کی، غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات کی خوبیوں اور برکتوں سے دلنشین انداز میں واقف کرانے میں انھیں ملکہ حاصل ہے جس کا ثبوت ان کی بے شمار تحریریں ہیں۔

بیسویں صدی میں جتنی سیاسی، اسلامی، اور اخلاقی تحریکیں برصغیر ہند و پاک میں چلیں اتنی شاید ہی کسی اور زمانہ میں چلی ہوں، ان میں بعض تحریکوں راستے طرح طرح کی گمراہیاں پھیلیں اس فضا میں حق و صداقت کے نشان کو اُجاگر رکھنا، کھرے کھوٹے کا فرق سمجھانا کسی بڑی ہستی کا کام تھا اس سے قبل علمائے جو اصلاحی اقدام کے لیے ان کے سامنے اتنی زیادہ تحریکات نہ تھیں۔ خود مسلمانوں کے اندر جو اصلاحی تحریکیں تھیں ان میں جو غلط اور گمراہ کن چیزیں ان کی نشاندہی کرنا بھی کسی بڑے حق گو عالم و مفکر کا کام تھا کیوں کہ موجودہ دور کی تمام تحریکات کا پیش رو طبقہ تعلیم یافتہ ہے۔ بہرحال یہ خدمت بھی مولانا عبدالماجد نے انجام دی۔ اُنھوں نے سب سے زیادہ خطرناک تحریک کمیونزم اور نام نہاد سوشلزم کی خامیوں اور ان کے مضر اثرات سے

ملانوں کو خبردار کیا۔ دلائل دیکر ان سے ان جدید نظریات
ہر پہلو کا جائزہ لیا، علماء کے اختلافات، مذہبی فرقوں
، نزاعات کی علانیہ مذمت کی، اور ان مصلحین اور
صلاحی جماعتوں کی حمایت کی جو صالح روایات کی حامل
ں۔ حق بات کہنے میں مصلحت و مروّت کو مولانا نے بہت
ہ پیش نظر رکھا مولانا اُردو میں لکھتے ہیں اور ان کا اپنا
سلوب نگارش الگ ہے، طنز نگاری میں ان کو ملکہ حاصل
ہے ان کا انداز بیان نہایت دلکش ہے ان کی بیشتر تحریریں
خلاقی و اصلاحی ہوتی ہیں، لیکن زبان و ادب کیلئے
ہ گرانقدر سرمایہ بن جاتی ہیں۔ حالانکہ ان کے لکھنے کا
اب صرف یہی مقصد ہے کہ دین حاصل ہو اور اخلاقی
اور سماجی اصلاح کی تحریک کو آگے بڑھائیں نوجوان تعلیم
یافتہ طبقہ کو جدید علوم سے پیدا ہونے والی گمراہیوں اور
غلط فہمیوں سے دور رکھیں۔

مولانا عبدالماجد نے اپنی اصلاحی تحریک میں
سارا زور قلم قرآن حکیم کی تعلیمات کو پھیلانے اور ان کی
دلنشین پیرایہ میں تشریح و تعبیر میں صرف کیا اس کے
بعد احادیث اور اسوۂ صحابہ کو نئے رنگ ڈھنگ سے
اس طرح پیش کیا کہ تعلیم یافتہ دل و دماغ نے اس کے
اثرات کو خوشگواری کے ساتھ قبول کیا۔ احادیث
نبوی کی حکمتوں کو دنیا کے فلاسفہ و عقلا کی تعلیمات
و اقوال سے دلائل کے ساتھ برتر و بہتر ثابت کرنے
میں سارا زور قلم صرف کر دیا۔ گذشتہ چالیس سال
سے قرآن کا مطالعہ اور اس کے مطالب پر غور و فکر
مولانا کا محبوب مشغلہ ہے۔

مولانا عبدالماجد نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں
اور دنیا کے غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس
کرانے کے لئے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور
اور تفسیر لکھی یہ ان کا عظیم کارنامہ ہے انگریزی اسوقت
دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے اور اس کو بین الاقوامی
حیثیت مکمل طور پر حاصل ہے۔ انگریزی میں قرآن مجید
کے ترجمے پہلے بھی ہوئے ہیں۔ لیکن جدید علوم کے ارتقا
کے ساتھ ساتھ جو نئے نئے مسائل اور الجھنیں پیدا
ہو گئی ہیں ان کے پیش نظر قرآن مجید کی تعلیمات کی
تشریح کی عصر حاضر میں جیسی ضرورت تھی، اسکو بلا شبہ
مولانا عبدالماجد نے پورا کیا۔ ان کی یہ خدمت تجدید
و اصلاح کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسی کے ساتھ
انھوں نے اُردو زبان میں بھی قرآن مجید کی تفسیر لکھی
ہے، مولانا ابوالکلام کی تفسیر ترجمان القرآن اُردو میں
نئے انداز کی بہترین تفسیر ہے خالص مذہبی مسائل کو
سامنے رکھ کر جو تفسیریں اُردو میں لکھی گئیں ان کی
تعداد بہت ہے لیکن ان میں مولانا اشرف علی تھانوی
بیان القرآن یا مولانا امیر علی ملیح آبادی کی تفسیر
مواہب الرحمٰن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جدید علوم
کی روشنی میں قرآن کی جو تفاسیر اُردو میں لکھی گئی ہیں
ان میں مولانا مودودی کی تفہیم القرآن ایک شاہکار
کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان سب تفاسیر کی موجودگی میں
مولانا عبدالماجد جیسا ذہین، صاحب بصیرت فلسفی و
مفکر قرآن کی تفسیر اسی وقت لکھنے پر آمادہ ہوا ہوگا۔ جب
اس کی بڑی ضرورت محسوس کرے گا اور یہ حقیقت ہے کہ

مولانا کی تفسیر اپنے رنگ میں منفرد ہے۔ قوم کی بدنصیبی ہے کہ اس کا تعلیم یافتہ طبقہ ابھی تک خاص طور مولانا کے اس عظیم کارنامے سے مستفید ہونے کی طرف متوجہ نہیں۔

مولانا نے سیرت النبی کو قرآن مجید کی روشنی میں مرتب کیا۔ قرآنی علوم کے متعلق بے شمار مضامین لکھے، متعدد چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔

مولانا عبدالماجد، سیاسی رہنماؤں کے ساتھ بھی رہے، مگر سیاست سے اپنا دامن بچاتے رہے۔ ان کا اصل مطمح نظر مسلمانوں کی اخلاقی و دینی اصلاح، اور ان کے حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں سیاسی رہنماؤں اور حکومت وقت کو متوجہ کرنا رہا ہے اس مسئلہ میں انھوں نے بغیر کسی خوف و جھجک کے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی ان تحریروں پر حکومت کے ارباب حل و عقد نے اعتراضات کئے اور ان کو دھمکیاں دیں، لطف و کرم کے ذریعہ بھی ان کو حق گوئی سے باز رکھنے کی کوشش کی آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ان کا قلم یکساں روانی کے ساتھ چلتا رہا، پاکستان کے حکمرانوں، عالموں اور سیاسی رہنماؤں کی غلط اور غیر اسلامی اعمال کا محاسبہ بھی کیا اور اسلامی کردار کو جن لوگوں نے داغ دار کرنے کی کوشش کی ان پر بھرپور طنز کرتے رہے مولانا نے اپنے افکار و نظریات کی اشاعت کے لئے پہلے سچ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا کئی برس بعد وہ بند ہوگیا دوبارہ صدق کے نام سے اخبار جاری کیا جو آج صدق جدید کے نام سے برصغیر ہند و پاک کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد کے تمام تحریری کاموں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو صرف 'سچ'، صدق اور صدق جدید میں انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اسلام اور ملت اسلامیہ کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔

یہ ضرور ہے کہ ان کے اخبارات کی اشاعت زیادہ نہیں رہی لیکن ان کے خیالات و نظریات کی تشہیر بہت ہوئی، ہندوستان و پاکستان کے تمام مقامی اخبارات و رسائل نے ہمیشہ ان کی اہم تحریروں کو نقل کیا اور ان کی آواز ان ملکوں کے گوشہ گوشہ میں پہنچی، تاہم وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایک مخصوص گروہ اثر انداز ہوئی، یہ افسوسناک حقیقت ہے کوئی قوم اپنے اتنے بڑے مفکر و عالم کی وہ قدر و منزلت کرنے میں دریغ کرے جو اس کی شایان شان ہو، صدق جدید کی اشاعت بڑھائی جاتی اور اس کا انگریزی اڈیشن بھی نکلتا تو ساری دنیا میں مولانا کی تحریروں کا چرچا ہوتا اور ان کے افکار و اصلاحات اور نظریات سے سب ہی کو استفادہ کا موقع ملتا۔

مولانا فکر و فن کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں، ذہنی بیداری، فکری دسترس میں ان

"سچ صدق اور صدق جدید" میں شائع شدہ شذرات مولانا کی متفرق تحریروں کا ایک نمائندہ انتخاب بہت ضروری ہے تاکہ آنے والی نسلیں مولانا کے فکر و فن سے واقف ہو سکیں ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ نادر ذخیرہ کچھ بعد دستیاب نہیں ہو سکے گا۔

قابلِ مشکل سے ملے گا۔ ان کی ذات اسلامی افکار و اصلاحات کا سرچشمہ ہے، ان میں اعلیٰ صلاحیتیں ہیں اُنھوں نے اسلامی تعلیمات کے چمن کی مسلسل آبیاری کی ہے۔

جب مولانا نے ہوش سنبھالا تو اس وقت ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے اعلا نمائندے اور نمونے موجود تھے، جن کے فیوض و برکات سے ملک کے در و دیوار منور ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے معاصر علماء و فضلاء سے رابطہ قائم کیا، جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے اسی طرح اُنھوں نے مختلف تحریکوں کا گہرا مطالعہ کیا، پسندیدہ نظریات کو سراہا، اور مُضر و ناپسندیدہ افکار و نظریات کی واضح طور پر مخالفت کی۔

مغربی تہذیب اور سائنس کی غیر معمولی ترقیوں نے جن نظریات اور تصورات کو جنم دیا ان کو مذہب و اخلاق کے لئے ایک چیلنج سمجھا جانے لگا۔ احیاء علوم اور اصلاح مذہب کی بعض تحریکات نے فتنوں کی صورت اختیار کی، خود مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"شاہ ولی اللہ سے سرسید تک مذہب و معاشرت کے تصور میں جو تبدیلیاں راہ پاتی رہیں"

"وہ آزادیِ افکار کی الحفیس گیتی نوردِ تحریکوں کا پرتو ہیں"[1]

مولانا عبدالماجد نے جو علوم جدیدہ سے بخوبی واقف تھے اسلام کی تعلیمات کی برتری کو سائنسی نقطۂ نظر سے بھی ثابت کرنے کی کامیاب جد و جہد کی، اسلامی تعلیمات کے متعلق ان کے نظریہ اور اعتقاد کا عکس ان کے مندرجہ ذیل الفاظ میں نظر آئے گا۔

"اسلام خدا کیطرف بندوں کے حق میں کامل ترین جامع ترین" پیام رحمت ہے۔ انسان کے ذہنی عقلی، اخلاقی، معاشرتی، جسمانی، روحانی، انفرادی، اجتماعی عام مزورتوں کا کفیل اور ہر شعبہ حیات" میں ترقیوں کا حامل خدا رسی اور خدا شناسی کی تعلیم اس کا اصل مقصود تھی اس پر اس نے خاص طور سے زور دیا اور اس کے ذرائع و وسائل اس نے اس جامعیت کے ساتھ بیان کیے کہ کسی قسم کے تغیر، ترمیم تخفیف، و اضافہ کی گنجائش نہ چھوڑی۔"[2]

جب سائنسی علوم کی ترقی نے مذہب و اخلاق کے رشتوں کو بظاہر کمزور کرنا شروع کیا یا ایسا سمجھا جانے لگا تو مولانا نے اپنی فکر و بصیرت سے قرآن و احادیث کی روشنی میں ثابت کیا کہ سائنس کی ترقی اسلام کے مخالف نہیں بلکہ اس کی صداقت کو دوبالا کرنے والی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کی بے شمار تحریریں موجود ہیں جو بیشتر سچ، صدق، صدق جدید اور ان سے قبل سچ کی فائلوں میں بکھری ہوئی ہیں اور احاطہ کرنا بھی مشکل ہے۔

مولانا کا بڑا کمال یہ ہے وہ علم و حکمت کے نکات دلکش اسلوب شگفتہ انداز میں بیان کر دیتے ہیں

[1] دیباچہ تصوف اسلام صفحہ ۱۳

[2] تصوف اسلام، صفحہ ۱۳

مشکل مسائل کو منطقی انداز سے اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق حل کر دیتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی صداقت و برگزیدگی کے بہترین ترجمان ہیں، وہ انسانی فطرت کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہیں، صراط مستقیم کے پرکھنے اور اس کی طرف رہنمائی کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم ان میں موجود ہے۔

اسلام کی حقانیت کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کا آغاز اسوقت سے ہوا جب یونانی فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے ترجمے عربی زبان ہوئے۔ یہ عباسی دور خلافت میں ہوا مامون الرشید کے عہد میں یونانی منطق وفلسفہ کا ہر طرف چرچا تھا، مسلمان علماء کا ایک بڑا گروہ اسلامی تعلیمات کو یونانی فلسفہ و منطق کے پیمانے سے ناپنے لگا اور ان میں توافق پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی مدد سے عقیدہ توحید پرکھا گیا تاکہ مضبوط دلائل کے ساتھ دوسروں کے لئے اسلام کی حقانیت و برتری کا ثبوت بہم پہنچائیں، مدارس میں بھی اسی فلسفہ کا رواج ہوا پھر اس میں اختلافات پیدا ہوئے جس کے نتیجے میں علماء کا طبقہ کئی گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور ہر ایک نے دوسرے کو غلط راہ پر ثابت کرنے میں اپنی ساری علمی قوت صرف کی، اس طرح علمائیں، معتزلی، اشعری، ماتریدی اور بعض دوسرے گروہ نمودار ہوئے، ان کے اختلافات نے اسلام کو بہت زیادہ نقصان پہونچایا۔ انھیں اختلافات کی بدولت یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں علماء اسلام نے علم کلام کی بنیاد ڈالی، نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی مسائل و معاملات میں بحث و مباحثے اور مناظرے کثرت سے ہونے لگے علما کا ایک بڑا گروہ دن رات اسی چکر میں رہتا تھا۔ لیکن صوفیاء کرام کا ایک گروہ ایسا ہے جس نے عقل کو صحیح ذریعہ علم ماننے سے انکار کیا۔ علماء نے صوفیا کے طریق معرفت کی مخالفت کی۔

امام غزالی پہلے اسلامی مفکر تھے جنھوں نے اسلامی علوم کے ساتھ یونانی منطق کو منطبق کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ منطق کے بغیر کوئی علم مکمل نہیں ہوتا۔ انھوں نے اسلامی اخلاق کے مبادیات کو نہایت سلیقہ کے ساتھ مدون کیا جسکو علماء نے سراہا ہے علامہ ابن تیمیہ نے ان کی اہمیت تسلیم کی ہے لیکن بقیہ علوم کے سلسلہ میں وہ امام غزالی کی رائے سے متفق نہ تھے بلکہ ان پر شدید تنقید کی ہے۔ امام غزالی نے یونانی فلسفہ کے بہت سے نظریات کو دلائل کے ساتھ رد کیا لیکن ایک بڑے حصے کو درست بھی تسلیم کیا اور اسلامی مسائل میں ان کے ذریعہ استدلال کو اپنایا۔ بہرحال یہ سلسلہ بڑھتا رہا۔ ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ ہجری) نے اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں اس طرز و اسلوب کی پرزور وکالت کی جو قرآن نے اختیار کیا۔ انھوں نے ارسطو کی منطق پر تنقید کی اور کہا کہ اسلامی علوم کے لئے منطق کی اصطلاحات کو استعمال نہ کیا جائے جبکہ ہمارے سلف صالحین بھی ان سے واقف نہ تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ آغاز اسلام اور نزول قرآن کے بعد سے تمام مسلمان ہر معاملہ میں قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ قرآن کا اسلوب بیان اور طرز استدلال

ہر مسلمان کا جزو تھا۔ مسلمانوں کے فکر و عمل کو اسی سے روشنی ملی تھی۔ یہی اسلامی تہذیب و ثقافت کی پاکیزگی کا ضامن تھا اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ بھی۔ ہر مسلمان کے لئے خدا، قیامت، توحید و رسالت پر ایمان و یقین کے لئے وہ دلائل کافی تھے جو قرآن مجید نے بیان کر دیئے ہیں۔ اگر مسلمان اسی راہ پر چلتے اور عام مسلمانوں کو چلاتے تو نت نئے فتنے نہ پیدا ہوتے، مگر جب یونانی فلسفہ و منطق کا نفوذ ہوا تو قرآنی طرز استدلال اور اسلوب بیان سے اکثر نے قطع نظر کر لیا۔ یونانی فلاسفہ نے اسلام سے پہلے ایک فلسفہ مرتب کیا تھا۔ اسی قدر جتنا انسانی عقل کے حدود میں آسکتا ہے۔ ظاہر ہے، اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے طرز استدلال پر ایسے انسان ساز فلسفہ کو کیسے ترجیح دی جاسکتی ہے تاہم عقل و استدلال کی یہ بدعت ایسی جاری ہوئی کہ اس دور سے اس زمانہ تک اس کا سلسلہ کم و بیش جاری ہے۔ ایک مختصر گروہ علماء و صوفیا کا ہر دور میں ایسا موجود رہا ہے جس نے قرآن ہی کو اسلامی تعلیمات کا منبع سمجھا اور اپنے فکر و فن کا محور اسی کو بنایا۔ یہ بدیہی سی بات ہے جو شخص اللہ و رسول پر ایمان رکھتا ہے، توحید کا قائل ہے اس کے لئے قرآنی استدلال کافی ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ وہ فلسفہ و سائنس کا سہارا لیکر مذہب پر یقین کرے۔ ظاہر ہے اس کو یقین نہیں کہا جاسکتا ہے۔

اس طویل تمہید کا مقصد یہ بتانا تھا کہ مذہبی عقائد کو عقلی دلائل اور فلسفہ و منطق کے سہارے ثابت کرنے کا وہ سلسلہ جو عباسی دور سے زور و شور سے شروع ہوا تھا وہ آج بھی ختم نہیں ہوا بلکہ پہلے سے دراز ہوگیا۔ مولانا عبدالماجد فلسفہ و منطق کے عالم تھے اس لئے انھوں نے بھی عقلی دلائل سے مذہبی صداقتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ علمی زندگی میں انھوں نے مذہبی مسائل و مباحث کے لئے بہت سے عقلی دلائل پیش کئے۔ سائنس کی جدید ایجادات سے بظاہر مذہبی روایات و عقائد پر جو ضربات پڑتی نظر آتی تھیں مولانا ان پر قرآن و احادیث کے حوالوں سے روشنی ڈالتے ہیں لیکن عقلی دلائل بھی اس کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں۔ بے شمار تحریروں میں انھوں نے بڑی اہم گتھیوں کو سلجھا دیا ہے۔

مولانا عبدالماجد نے اسلام کی خدمت اور ملت اسلامیہ کی اصلاح کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اندازہ اس دور میں اتنا نہیں ہوسکا جتنا آنے والے زمانہ میں ہوگا۔ ان کی خدمات تحریری ہیں لیکن ہر تقریر و خطبہ سے زیادہ موثر۔ عمر کے اس آخری دور میں کئی سال سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ مولانا نے اسلام کی حقانیت اور عقائد و مسائل کی اہمیت کے سلسلہ میں عقلی دلائل کو ترک کر دیا ہے اور ہر معاملہ میں انھوں نے قرآن و احادیث سے استدلال شروع کیا ہے، جیسا کہ ان کی تازہ تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کو قرن اول سے علماء و صلحا نے اپنایا تھا اور جو ہر مسلمان کے لئے جب اللہ پر یقین ہے [illegible]

مخالفین اسلام اہل قلم خواہ وہ دنیا کے کسی ملک میں ہوں جب اسلام کے خلاف کچھ لکھتے ہیں تو مولانا عبدالماجد اس کا نہایت مناسب، مدلل اور منھ توڑ جواب دیتے ہیں۔ یورپ کے اکثر معروف مصنفین اور رسائل کے اڈیٹروں نے اسلام یا پیغمبر اسلام پر کوئی مخالفانہ کتاب یا مضمون لکھا۔ اور مولانا کی نظر سے وہ گزر گیا تو اس کا جواب دینا وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا صدق جدید سے دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوتا رہتا ہے۔ مولانا ملت اسلامیہ کو ان فتنوں سے بڑے دلچسپ انداز میں باخبر کر دیتے ہیں جن کے پھیلنے سے مسلمانوں اور اسلام کو نقصان پہونچانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اور جو فتنہ سر پر آ گیا اس کے تدارک کے طریقے بھی اشاروں و کنایوں میں بتا دیتے ہیں۔

موجودہ دور میں دنیا اسلام کے اسلامی مفکرین و مصلحین اُمت میں کئی قابل قدر شخصیتیں موجود ہیں، ہم کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے کا حق نہیں کر لیتے صرف چند مخلص علماء کا ذکر ہے لیکن یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ مولانا مذکورہ اہم شخصیتوں کی صف اول میں نمایاں ہیں اور ان کی عظیم خدمات کو بقائے دوام حاصل ہونا باعث تعجب نہ ہوگا۔

ف افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے مولانا عبدالماجد پر لکھنے کے لئے جو عنوان خود تجویز کیا تھا اس کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ اس مضمون کے سلسلہ میں بے شمار کتابیں پڑھیں طویل نقوش لکھے۔ حالانکہ مواد جمع کر کے لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ شدید علالت کی زد میں آ گیا جس نے جسمانی اور دماغی دونوں حیثیتوں سے کمزور کر دیا الغرض ادھر زیر کتابت تھا۔ اور اختتام کی منزل میں اور بہت تھوڑی زیادہ محنت ممکن نہ تھی۔ اس لئے اختصار کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کر دی۔ حوالے اور اقتباسات حذف کر دیئے۔ انشاء اللہ آئندہ اس عنوان پر تفصیلی مضمون لکھوں گا۔ اور اس خامی کو پورا کرونگا جو پیش نظر مضمون میں رہ گئی ہے۔

از:۔ ضیاء رہانی صاحب

مولانا دریابادی
ایک صداقت نگار قلم

"اردو کی تاریخ اور اردو ادب" کا مطالعہ کرنے کے ذوق و شوق نے مجھے اردو کی بعض اہم فطری خوبیوں سے بھی آشنا کیا ہے۔ اردو کبھی سیاسی مقاصد کا "آلہ کار" نہ بنی ہے اور نہ بنے گی۔

اردو اپنے لسانی، فطری کشش اور خوبیوں کی بنا پر اپنا ایک خاص مجلسی اور اخلاقی اثر رکھتی ہے جسے آج کی زبان میں اردو کا کلچرل اثر کہہ دیا جائے... اس کا مشاہدہ اردو کی ابتدائی نشو ونما سے لیکر اس کے عروج اور ارتقا کے تمام مقامات پر حاوی و مستولی نظر آتا ہے۔

اردو کی ترقی و اشاعت کی ان کوششوں نے ہر انقلاب میں اپنی حفاظت و بقا کے اسباب خود پیدا کئے ہیں اس لحاظ سے اس زبان کے باکمال اور مخلص خدمت گزاروں کے ادبی اور لسانی خدمات کا جائزہ لینا ہر دور میں مستحسن ثابت ہوگا۔

اس زبان کا "ادب" اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ایک مکمل زبان کی حیثیت سے ترقی و ارتقا کے مقام اعلیٰ پر ہے اور اس قابل ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اس کی تخلیقی کاوشوں کو پیش کیا جائے اور ا[س] کے مشاہیر اور بلند مرتبت شخصیتوں کا تعارف کرایا جائے ان م[یں] ایک قدیم کہنہ مشق "عالم" صاحب طرز انشا پرداز نامور صحافی، بلند پایہ ممتاز ادیب، و نقاد عظیم و مقبول شخصیت بھی ہے۔ جسے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کے نا[م سے] یاد کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے [کہ] علمبردار صداقت مولانا عبدالماجد صاحب نے ایک حق[گو] نڈر اور بیباک صحافی کی حیثیت سے محنت و شفقت [کے] ساتھ تقریباً ستر سال سے ادبی و قومی تعمیر میں دو[ن]ا [حصہ] حصہ لیا ہے جس کا اعتراف ہر محب اردو کو ہوگا۔ ان کا عالمانہ، ناقدانہ اور مفکرانہ بصیرت افروز کارنامہ [علمی] و ادبی حیثیت سے آج ہر طالب ادب کی رہنمائی کر رہا ہے۔

مولانا نے محترم جیسے "صدائے حق" بلند کرنے والے اور دلیر صحافیوں کی کمی نہیں لیکن مولانا اپنا مخصوص اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ حق بات "قارئین صدق" کی خدمت میں پیش کرنا، کھوٹوں کو کھری کھری سنانا "چھپی ہوئی بات کو منظر عام پر لانا" یہ صدق کے مسلک میں داخل ہے بقول حضرت سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ

راستی موجب رضائے خدا است
کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

دنیا میں حقیقت شناس لگا ہوں کی کمی نہیں قارئین صدق حق بات پسند فرماتے ہیں۔ مولانا ماجد صاحب تو بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

"کہتے ہیں وہی بات سمجھتے ہیں جسے حق"

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کھری کھری اور سچی باتیں تلخ و ترش ہوا کرتی ہیں جنہیں سن کر تنگ نظر، فرقہ پرست، کم ظرف، متعصب اور منافق تو برا مانتے ہی ہیں۔ لیکن بیگانوں کے ساتھ ساتھ بعض اپنے بھی ناراضگی کا دبی زبان میں اظہار فرماتے ہیں۔ اس کی صحیح ترجمانی علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا "قند"

حقیقتاً مولانا نے زہر ہلاہل کو کبھی "قند" نہیں کہا اس کے ثبوت میں ہم مولانا کی سچی باتوں میں سے سیکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں پیش کر سکتے ہیں میں صرف ان کی سچی باتوں کی روشنی میں اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں گا

(۱) "شیخ الہند کی نظروں میں"

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے "دور بچپن" میں محسبہ غالب ہو کے نصب ہونے پر فرماتے ہیں۔

"جانشین شیخ الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی صاحب کے قلم سے سنہ ۱۹۴۶ء میں رسالہ جوہر کے جشن سیمین نمبر میں "میں اراکین جامعہ کے پر زور رامی ہوں کہ وہ علوم اسلامیہ اور اخلاق و سنن نبویہ کے احیا میں اپنی پوری کوشش جاری رکھ کر اسلام و مسلمانوں کو ترقی اور ارتقاء کے کمالات پر پہونچائیں (صـ) جو جامعہ کے دور بچپن" کے کمالات کے علم خصوصاً غالب کی مورتی کے نصب ہونے کے بعد برزخ" میں مولانا کی امیدوں اور دعاؤں پر کیا ہوگا!"

مولانا ماجد صاحب کے تاثرات "جامعہ ملیہ" کے بنیادی مقاصد کی ترجمانی کرتے ہیں۔

(۲) "جواہر لال کی گواہی!"

پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک تحریر سے ۔۔۔ کی: مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب سنہ ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا تھا اور میں خاص طور سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دیکھنے علی گڑھ گیا تھا مولانا محمد علی جوہر کی زیر قیادت، اس تعلیمی ادارہ کی زندگی جوش اور ولولہ سے بھری ہوئی تھی۔

(رسالہ جوہر جشن سیمین نمبر صـ۱۳)

جامعہ کے موجودہ وائس چانسلر کو کاش اتنی ہی حق گوئی کی توفیق ہو گئی ہوتی؟

اگر غور کیا جائے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دونوں پہلو پر کتنا بھرپور مدلل اور بے لاگ تبصرہ ہے۔ کاش مجیب صاحب پر اس کا اثر ہوتا!

(۳) "انجام بخیر"

قاہرہ ۱۴ اکتوبر۔ صدر جمال عبدالناصر کو مسجد الناصر کے مرمریں صحن میں دفن کیا گیا ہے۔ دس ہزار مربع میٹر کے رقبہ میں یہ مسجد عرب فن کا نادر نمونہ ہے۔ یہ مسجد دو منزلہ ہوگی پہلی منزل میں بچوں کے حفظ قرآن کا مدرسہ ہوگا جس میں ایک ہزار بچے

بہشتی ہو کے لیے داخل ہو سکیں گے دوسری منزل میں
ان کے ساتھ عورتوں کے لیے بھی جماعت نماز کے لیے
ہوگی جس میں پانچ سو عورتیں نماز پڑھ سکیں۔"

وہ مذہب نے تو دل بالکل ہی سرد کر دیا ہے
[illegible]
[illegible] قسم کا مظہرہ اور ... اور ...
... فنا ... ترقی پسندی۔"

[illegible]
[illegible]
[illegible]

جمال عبدالناصر کی حکومت کا آغاز تو حق پامالی
رہنمایان جید عالموں کے قتل عام اور اخوان المسلمین کی
تباہی ... اور ... کی اسرائیل اور متحدہ
... کی چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد اپنے اعلان
... بھگتنا پڑا۔ تب کہیں جا کر جمال عبدالناصر صاحب
... سے روحانیت کی طرف مائل ہوئے اور
... اس عبرتناک انجام سے ترقی پسند گمراہ
... کو سبق لینا چاہئے۔

(۱۴) "سندھ بہار"

"مشہور انگریزی ہفتہ وار سوراجیہ" (مدراس)
میں ... ہندی بعد یوں سے دنیا کے کسی حصہ میں بھی
حکومت کی زبان نہیں رہی ہے۔ اپنی موجودہ حالت میں
... تو پوری طرح ایک نئی تلی زبان ہے اور نہ بعض علاقائی
زبانوں کے مقابلہ میں ایک مکمل ترقی یافتہ زبان کہی جا سکتی
ہے اور یہ تو یقینی ہے کہ آج کے سارے قوانین کا ہندی
ترجمہ انہیں خاصہ ناقص و مبہم بنا دے گا اور ہندی کی
موجودہ ابتر حالت کی ذمہ داری ایک خاص حد تک
ہندی بولنے والوں ہی پر ہے۔ مہاتما گاندھی کی پسندیدہ
زبان ہندوستان میں ایک خاصہ بڑا ذخیرہ اردو لفظوں

کا تھا اب ان سے بعض شدھ ہندی کے خطیبوں کے اقبال سے
ہندی کو صاف کر دیا گیا ہے چنانچہ اب پڑھے لکھے
ہندی مقرروں کی زبان سے ہر ادنیٰ معاف ... سے بڑھ کر
لیکن ... الفاظ ذمہ دار قسم کے الفاظ خارج ہو گئے
ہیں۔ یہ الفاظ ہندی مقرروں کے لیے کسی طرح اجنبی
نہ تھے اگر ان کے خیالات کی جڑوں میں تھے علمی جد و جہد تھا
دوسری زبانیں باہر کے لفظوں کو لیتی اور اپنے میں سموتی
رہی ہیں، ہندی والے اپنے ہاں سے قدیم اور رچے
ہوئے الفاظ کو نکالتے ہیں اور پنڈتوں کے کہنے میں
آ کر ہندی والوں نے اپنی زبان کو "مفلس" بنا دیا ہے۔

(۱۷ اپریل ۱۹۶۵ء)

ان حقیقتوں کا یاد دلانے والا کوئی اردو والا ہے اور
نہ کوئی اقلیت والا — بلکہ ایک "بنگالی" ہندو مسٹر
... ہیں۔"

دو ... نے جو تبصرہ فرمایا ہے وہ حقائق
... کرنے والے ... غور و فکر دے
...

(۱۵) "دیدہ ہا نہ ہضم نہیں۔"

مدراس ... ۱۹۶۵ء یہاں کے وزیر اطلاعات
نے آج اعلان کیا کہ یہاں کی "آکاش وانی" کے ہندی
نام کے بجائے آئندہ سے "آل انڈیا ریڈیو" ہوگا اور
تامل زبان کا "وانولی" اس اسٹیٹ میں چار ریڈیو اسٹیشن
موجود ہیں۔

نتیجہ مدراس تو پہلے ہی جا چکا تھا اور دراوڑستان
نے جو کچھ کرا لیا اور جانے کیا کیا اسی طرح کراتا رہے گا اور
شمالی آریہ ورت منہ دیکھتا رہ گیا جس طرح اس سے
پہلے بھی رہ گیا تھا۔ ہندی والوں کو اب شاید اس کا
کچھ احساس ہوا ہو کہ آج سے چند سال پہلے جب اردو
کے عام فہم اور خوب جانے پہچانے ہوئے نام محفوظ

کھرچ کھرچ کر اد حیل کر مٹائے جا رہے تھے تو اس
ت اُردو والوں پر کیا گزر رہی تھی، دل آخر ان
بوں کے بھی ہیں اس کار خانہ قدرت میں "دیر ہے اندھیر
ہیں"

نشدہ ہندی کے چند سال بعد، مدراس کا
عمل" تو عملی شکل میں ہندی پریمیوں کے سامنے
۔ اور دوسرے صوبوں میں بھی دیکھا ہو رہا ہے جو
اس میں ہوا۔

مولانائے محترم نے سچ فرمایا ہے کہ
"اس کارخانہ قدرت میں دیر ہے اندھیر نہیں"۔

(۶) اپیل برائے مسجد جامعہ

"اس نام سے ایک کتابچہ ڈاکٹر سعید انصاری
م مجلس تعمیر مسجد جامعہ نے ملک کے مشہور عالموں نے
ر جمعیۃ العلماء، مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند
م صاحب ندوۃ العلماء ہند اور جامعی عالموں
طرف سے شائع کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مطلوب ۵ لاکھ ہے اور اس میں سے ابھی تک
۔ لاکھ ۵ ہزار وصول ہو چکی ہے ظاہر ہے کہ مسجد
ایسے اہم تعلیمی مرکز سے ملحق مسجد کے لئے اپیل کی
ید، کون نام کا مسلمان، بھی نہ کرے گا لیکن ڈاکٹر
ید انصاری صاحب نے موجودہ شیخ جامعہ سے
زت بھی لکھ کر اس کی لے لی ہے اور ان شیخ وقت کے
میں اب ضرورت بھی کسی مسجد کی تعمیر کی رہی ہے
پچاس سال کی مدت بغیر مسجد کے گزر گئی تو اب یہ
لاکھ کی گرانقدر رقم اس "پرستش گاہ" پر لگانے
یا ضرورت واقع ہو گئی۔؟
محض پرستش گاہ نہ کوئی میوزیم، نہ کوئی لیبورٹری
یا کوئی لائبریری، نہ کوئی کالج، نہ کوئی اکیڈمی، نہ
آرٹ کی یا سائنس کی۔؟

بڑا دلچسپ مطالعہ کے قابل ہوگا، شیخ صاحب
تحریری اجازت نامہ، جو پبلک میں نہ آسکا"

اس تبصرے کی داد نہیں دی جا سکتی یہ تو "دور جدید" پر "ضرب کاری" ہے!

(۸) جواز طلاق"

"روما ۱۱ر اکتوبر ۱۹۷۰ء آج اٹلی کے سینیٹ (ایوان بالا) نے جواز طلاق کا مسودہ قانون چودہ ووٹوں کی اکثریت سے منظور کر لیا۔ اطالوی حکومت ۔ سال کی ۲۲ سال سے کر رہی تھی۔ اب جا کر کامیابی ہوئی ۔ ۔ اسے ایوان زیریں میں پیش ہونا ہے جہاں اس کی منظوری کی توقع سو فیصدی ہے"

"الحمد للہ کہ ایک قلعہ اور ٹوٹا۔ ورنہ یہاں کے دینی عالموں، پادریوں، مورخوں اہل سیاست ۔ ۔ کا متفقہ پروپیگنڈہ تو یہ تھا کہ یہ ۔ ۔ اسلام کے ۔ ۔ گندے عقائد میں سے ایک شرمناک بات ۔ ۔ تعدد ازدواج ۔ طلاق بھی ہے!"

"دیکھئے خدائی کے کتنے ٹھوس واقعات وحقائق اس گڑھ کے ٹوٹنے پر قابل تسلیم نظر آتے ہیں"

اسلامی قانون تو ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے جسے دنیا نے تسلیم کیا لیکن مغرب کے سیاست داں متعصب مورخ اور پادریوں نے ہر دور میں اپنے ذاتی اور اپنے سیاسی مفاد کے لئے غلط انداز میں پیش کرنے کی ناکام کوشش کی اور ہر وقت بری طرح شکست کھائی۔ مولانا نے بالکل درست فرمایا ہے کہ

"خدائی کے کتنے ٹھوس واقعات وحقائق اس گڑھ کے ٹوٹنے پر قابل تسلیم نظر آتے ہیں"

(۹) بنیادی مغالطہ"

ایک تازہ ادبی رسالہ میں ایک ادبی مقالہ نویس کے مقالہ ۔ ۔ ۱۰ انھوں نے ایک خطرناک بات کہی ہے۔

مولانا محمد ہاشم فرنگی محلی

مفسرِ قرآن کی نثری نعت

اردو اور فارسی میں بڑے بڑے نعت گو شعرا گزر چکے ہیں اور ماشاء اللہ اس دور میں بھی موجود ہیں لیکن نثر میں نعت نبوی کے موضوع پر سحر کار ادب کا نمونہ پیش کرنے والے گنتی کے چند ہی ملیں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس موضوع پر "الہلال" متعدد سحر انگیز مقالے مخصوص رنگ میں تحریر فرمائے تھے۔ اسکے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے اس موضوع پر سنجیدہ علمی رنگ میں جو خطبات مدراس میں پڑھے وہ بعد میں "خطبات مدراس" کے نام سے شائع بھی ہوکر ملک کے طول و عرض میں انتہائی مقبول ہوئے۔ انھیں کے معاصر اور ہم صوبہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے باغ و بہار قلم سے "النبی الخاتم" ایک اچھوتے البیلے انداز کی سیرت طیبہ نبوی پر شائع ہوئی تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے جب فلسفہ و حکمت کے بجائے مذہب کی خدمت کے لئے اپنا قلم وقف فرمایا تو اس موضوع پر خصوصی توجہ فرمائی۔ اُن ہفتہ وار "سچ" (لکھنؤ) جس نے بعد میں "صدق" اور "صدق جدید" کے قالب اختیار کئے (صدق جدید ماشاء اللہ ۴۲ سال سے مسلسل دین و ملت کی بہترین خدمت بے نظیر ادبی رنگ میں انجام دے رہا ہے) میں اس سیرتی موضوع پر بہت سے مقالے شذرے نکلتے رہے جو ہر اعتبار سے اُردو کی نعت کے شہپارے قرار دئے جا سکتے ہیں مضامین و شذرات کے علاوہ ایک مستقل بھی اسی سیرت کے موضوع پر "خطبات ماجد" "سیرت نبوی قرآنی" کے نام سے چھپ کر مدراس لکھنؤ دونوں جگہ سے شائع ہو چکی ہے یہ اُن چھ خطبات کا مجموعہ ہے جو مدراس میں پڑھے تھے۔ اُردو میں اپنے موضوع پر یہ جامع ترین کہی جا سکتی ہے۔ لیکن ان خطبات اور اس کے زمانے کے سیرتی مقالات و مضامین میں اد

کا بڑا فرق نظر آئے گا۔ پچھلے مضامین میں ذوقی و شوق
کا غلبہ ملے گا نئے نئے حسین و جمیل تشبیہات و استعارات
نظر آئیں گے ۔ انکے پڑھنے اور سننے سے طبیعت میں وجد
وحال کی کیفیت طاری ہو کر رہے گی ۔ خطبات کی زبان
اس کے برعکس انتہائی سلاسہ اور سلیس ملے گی اور
کا رنگ بھی دعائی و ذوقی نہ ہوکر علمی و تحقیقی نظر آئیگا۔

ان نعتیہ مضامین کا مجموعہ" ادارہ اشاعت
اُردو حیدرآباد دکن" (جو مرحوم حیدرآباد کے ساتھ
کبھی کا مرحوم ہو چکا) کی طرف سے "مُردوں کی مسیحائی"
کے نام سے ۱۹۴۳ء کے آغاز میں شائع ہوا تھا اور
اب نایاب ہے ۔ اس میں مندرج مضامین نثری خدمت
میں مولانا کے کمال فن کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

یہ مجموعہ ۔ اس سلسلہ کے ایک اہم مضمون
"مُردوں کی مسیحائی" (جس میں سورہ فرقان کے
رکوع آخر و عباد الرحمٰن الخ کی تشریح و تفسیر ایک
البیلے انداز میں کی گئی ہے) جو بلا شبہ اس مجموعہ مضامین
میں سرفہرست رکھے جانے کے قابل ہے کے عنوان
سے موسوم کیا گیا ہے یہ مضمون نہ صرف نعت رسول
کے موضوع پر بے بہا ہے بلکہ منقبت صحابہؓ کے سلسلے میں
بھی حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے ۔ اس کا صرف
آخری ٹکڑا آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

"صحابہ کرام کی زندگی نہ اُس وقت راز
تھی نہ آج راز ہے ۔ ابولہب و ابوجہل اور اُن کے
سارے ہم نشینوں نے اس وقت دیکھا کر بدبودار
ریت عفونت کھاد گیلے میں پڑی اور اُنکی آنکھوں
کے سامنے شاداب وخوش رنگ مہکتے ہوئے گلاب
کے پھول میں تبدیل ہوگئی ، حق کی قوت ہر
و تغلیط کے خطرے سے بے پروا ہے زندہ معجزہ
زندہ معجزہ کا جواب نہ اس وقت بن پڑا اور
آج حق کے جھٹلانے والوں ، محمد کے دشمنوں
ابولہب و ابوجہل کے موجودہ جانشینوں میں
کسی کے بس کی بات ہے ۔

اللہ مراتب بلند کرے اکبر الہ آبادی کے سا
مضامین نعت کا عطر ایک شعر میں کھینچ کر رکھ د

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

دوسرا مضمون "یتیم کا راج" جو سورہ "الم نشرح"
تفسیر پر مشتمل ہے اس کا تمہیدی حصہ پڑھ کر آ
زور بیاں جدت ادا اور شدت تاثر کا اندازہ لگا
سکتے ہیں ۔ "کچھ کم چودہ سو برس کا زمانہ گزرتا ہے
تمدن کی نمائش گاہوں سے کوسوں دور تہذیب
کے سبزہ زاروں سے الگ ایک ویران و بے رونق
بستی میں چلچلاتی دھوپ والے آسمان کے نیچے
خشک پتھریلی زمین کے اُوپر ایک شریف لیکن ان
پڑھ اور بے زر خاندان میں ایک بچہ عالم آب و گل
میں آنکھ کھولتا ہے ۔

شفیق باپ کا سایہ پہلے ہی اُٹھ چکا ہے ۔
ماں بھی کچھ ہی روز بعد سفر آخرت کرلیتی ہیں ۔
تربیت کے جو ظاہری قدرتی ذریعے ہیں وہ یوں گم
ہو جاتے ہیں ۔ بوڑھے دادا اپنے آغوش تربیت میں

لیتے ہیں لیکن بچے کا بچپن ابھی ختم نہیں ہو پاتا وہ بھی ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔ گھر میں نقد نہ جائیداد نہ حکومت ہے نہ ریاست نہ خاندانِ ویرانی یہ عالم ہے کہ نہ ماں ہیں نہ باپ، نہ دادا ہیں نہ دادی، نہ بھائی ہیں نہ بہن، تن تنہا بے ساز و سامان یار و مددگار، ایک تو عبداللہ کا بندہ ہے جسے بازیب تو اس نظروں سے اوجھل مولا کا، اور ۔۔ ہے تو اس نگاہوں سے غائب مالک کا۔

ملک کی حالت یہ کہ شرک کی گھٹا ہر طرف چھائی ہوئی، ساری قوم مخلوق پرستی میں ڈوبی ہوئی، بدمستی کی ۔۔ میں داخل، انسانی ہمدردی کے مفہوم سے دماغ ناآشنا، ہر قسم کے فسق و فجور کی گرم بازاری، بات بات پر لڑنا اور پشتہا پشت تک لڑتے رہنا، حق تلفی، غریبوں کے ساتھ بے دردی، اخلاقی بیماریاں اور روحانی بیماریاں گھر گھر مسلط۔"

یہ مضمون "یتیم کی جیت"، سورۃ انا اعطینٰک الکوثر کی تشریح اور تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس میں ادبیانہ رنگ اور بھی نکھرا ہوا ہے۔ چند اقتباسات آپ بھی ملاحظہ کریں۔

"یہ خبیث طعنہ زن ہیں کہ تیری نسل ختم ہو رہی ہے، تیرا سلسلہ منقطع ہو رہا ہے۔ تیری نسل بھلا کبھی ختم ہونے والی اور تیرا سلسلہ کبھی قطع ہونے والا ہے؟ یہ بدباطن دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہیں گے لیکن ان کے جانشین دیکھیں گے، زمین و آسمان دیکھیں گے، جن و بشر دیکھیں گے، آفتاب و مہتاب دیکھیں گے کہ تیری نسل قائم اور تیرا سلسلہ دائم ہے بادشاہتیں بنیں گی اور بگڑیں گی، حکومتیں قائم ہوں گی اور مٹیں گی، شہر بسیں گے اور اجڑیں گے قومیں ابھریں گی اور فنا ہوں گی۔ لیکن تیرا نام زندہ اور تیرا کام پائندہ، قیامت تک قائم اور قیامت کے بعد بھی قائم! دنیا میں تیرے نام کی وہ عزت ہوگی جو نہ آج تک کسی بندہ کی ہوئی نہ کبھی ہوگی، اونچے اونچے میناروں سے تیرا نام ہمارے نام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔ دشت و جبل، صحرا و دریا، بحر و بر، شہروں ۔۔ ۔۔ ۔۔ دیہاتوں، جزیروں، سمندروں، پہاڑوں، وادیوں اور خطائیوں میں سب کہیں تیرے نام کی منادی ہو گی، حجاز و عراق، یمن و شام، حبش و مصر، ایران و توران، بخارا و ہندوستان چین و جاپان، روس و افغانستان، جرمن و انگلستان فرانس و امریکہ، دنیا کا گوشہ گوشہ اور ہماری وسیع زمین کا چپہ چپہ تیرے نام سے گونجے گا: ذرہ ذرہ تیرے نام کی گواہی دے گا، اور تیرا نام ان کانوں تک پہونچے گا، جو اوا تیرے ہر بادی کے نام سے ناآشنا ہوں گے۔ آج تو ان کو رہبروں کی نگاہ میں حقیر ہے کل تو ہی بلند کیا جائے گا، کل تیری ہی عزت ہوگی اور اس وقت ہوگی جب ۔۔ ۔۔ تیری پامال اور سب کی شہرتیں خاک میں مل چکی ہوں گی، جو اپنی شامت اعمال سے تجھے مانیں گے نہیں وہ بھی کم از کم جان ضرور لیں گے۔"

اور اسی مضمون کے خاتمہ کا ٹکڑا بھی پیش خدمت ہے۔

ہر ملک، ہر دور کی تاریخ کو دیکھ ڈالئے محمدؐ
سے جس نے دشمنی کی اس کا کیا انجام ہوا؟ کس کی
قسمت میں عزت و ناموری آئی؟ جس کی مدح خود
اللہ نے کی جسے اللہ نے "مدح کیا گیا" کہہ کر پکارا
اسکی ہجو کو جو بھی اٹھا لڑکھڑا کر گرا جو اس سے
ٹکرایا پاش پاش کر دیا گیا جس نے اس سے گستاخی
کی جرأت کی اسے پامال کر دیا گیا ہے"
"لاولدی" کی بنا پر گمنامی دبے نشانی کا طعنہ دیا
گیا تھا. دنیا دیکھ رہی ہے اور ہزار ڈیڑھ ہزار سال
سے دیکھتی چلی آرہی ہے کہ سب سے زیادہ وسیع
العیال اور کثیر الاولاد ہے، جس کی بے کسی و
گمنامی پر ہنسی اڑائی گئی تھی. وہی ناموروں کا
سردار، شہرت والوں کا سرتاج ہے جسکے نام کو مردہ
سمجھ لیا گیا تھا. اسی کے نام پر درود ہیں، اسی کا
توسل باعث نجات ہے. اسی کا نام اللہ کے نام کے
ساتھ بلند ممتاز؟

تمھارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

چوتھا مضمون "دوراستے" کے عنوان سے ہے
جس میں دو چھوٹی سورتوں سورہ نصر اور سورہ لہب
کی تشریح ایک انوکھے پیرایہ میں اور نرالے اسلوب
سے کی گئی ہے اسکی تمہید (متعلق سورہ نصر کی تشریح
سے ہے) کا ایک اقتباس :۔

"مہینوں کی تپش و تابش، لو اور لپٹ کے
تڑاقے اور چلا چلا کی لو، جب برسات کی ہوائیں چلتی
ہیں تو کالے کالے بادل منڈلا کر آتے ہیں اور جل
تھل بھر جاتے ہیں. سالہا سال کی سختیوں وا
کے بعد جب مشیت مطلقہ کو، اس مشیت کو جسکے
کوئی مشیت نہیں منظور ہوا کہ مردوں میں جا
اور سوکھی ہوئی کھیتی لہلہانے لگے تو نیتوں
پلٹ دئے اور دلوں کے اقلیم میں انقلاب بر
جو گردنیں اکڑی ہوئی تھیں وہ جھکیں اور ج
انکار پر اڑی ہوئی تھیں وہ اقرار کا کلمہ پڑھ
جو قلوب اپنی سختی و قساوت میں پتھر کو شرما
تھے وہ پانی پانی ہو گئے. اور جو جہنم کے شعلو
لئے تیار ہو رہے تھے وہ جنت کے ٹکٹ کی خ
کو لپک لپک کر بڑھے، مکہ کی سرزمین جو توح
منادی کرنے والے پر تنگ ہو چکی تھی اب اس
بس دیکھیں یتیم کے جاہ و جلال فتح و اقبال
سامنے اپنی ساری وسعتوں اور پہنائیوں سا
پیش ہوئی اور خانہ کعبہ کا دروازہ اس ہجرت
والے پردیسی کے ہاتھوں نہیں بلکہ اس کے خا
اور خدمت گاروں کے ہاتھوں کھل کر رہا جس
نام زبان پر لانا منع تھا. اب اسکی بڑائی کی پکا
کے گوشہ گوشہ میں گونجی اور اسکے جس بندے
نے حقیر جانا اور طائف نے جس پر تمسخر کیا تھا
کی سچائی اور عظمت کی شہادت دینے پر اب
طائف، نجد و حجاز، یمن و عمان، دشت و د
پیر و جوان زن و مرد غول کے غول، خیل کے
جھپٹ جھپٹ کر آگے بڑھنے لگے"

اس کے بعد مضمون "ورفعنا لک ذکرک" کے عنو

ہے اس کا اختتامی پیراگراف ملاحظہ فرمایئے۔
کے دن عند اللہ اس بندہ کا جو مرتبہ ہوگا وہ تو
ہی گا اس سے قطع نظر کرکے ذرا صرف اس مرتبہ
صور کیجئے جو محض اس بلندیٔ ذکر کے لحاظ سے
روز حاصل ہوگا۔ فوج کی فوج انبوہ در انبوہ
مرسے ملوک و سلاطین چلے آ رہے ہیں ادھر بڑے
سے نامور جنرل اور سپہ سالار ایک طرف سے
دثین کرام جوق جوق چلے آ رہے ہیں دوسری طرف
ے مفسرین عظام، اہلِ فقہ، اہلِ اصول، اہلِ کلام
تصوف، اہلِ لغت، اہلِ سیر، اہلِ رجال، اہلِ معانی
بیان، اہلِ فلسفہ، اہلِ منطق، اہلِ اخلاق، جس
کو بھی لیجئے اسکے ائمہ و ماہرین ادب سے آنکھیں
ی کیئے ہاتھ باندھے ہوئے خادمانہ انداز سے
رد پیش حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ ایک اسی انعام کی
وری وسعت کا تصور کس کے بس کی بات ہے "

س مجموعہ کے ایک اور مضمون "محبوبِ خلاب" میں
اسی انداز میں سورۂ "والضحیٰ" کی تفسیر کی گئی ہے اس
کا ایک درمیانی ٹکڑا:۔

والضحیٰ۔ دن نکل آیا، ہدایت و نورانیت کا آفتاب
طلوع ہو چکا، بشارت ہو کہ اس آفتاب کی کرنیں پھوٹ
چکیں اس کا اجالا گھر گھر پھیل چکا، وہ رب رحیم جو
عالم کے جسمانی نشو و نما اور حیاتِ مادی کی تکمیل کے
لئے روزانہ آفتاب کو چمکاتا رہتا ہے کیا انسان
کی ربوبیتِ روحانی کے لئے آفتابِ ہدایت کی
روشنی [illegible] کر اُجالے

کا ظہور خود تیرے منبع نور و ہدایت ہونے پر، تیری
صداقت پر اور تیری رسالت پر گواہ ہے۔ محض شعاعوں
والا دن ہی نہیں بلکہ سکون والی رات وہ رات جس کا
کام (واللیل اذا سجیٰ) سکون دینا ہوتا ہے وقت
کا وہ تاریک حصہ میں ساری جاندار مخلوق سکون و آرام
لیتی ہے وہ بھی تیری ہی سچائی کا ایک نشان ہے حکیم مطلق
جو جانداروں کے آرام و آسائش کے لئے یہ وقت نکالتا ہے
وہ انسانوں کی ابدی راحت و روحانی سکون کا سامان
نہ کرے گا "؟

درازیٔ عمر کی ہزاروں دعائیں اس مفسرِ قرآن نثری لنت گر کیلئے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

قمر بینوادی

کشورِ علم کی اک قدرِ گراں ہیں یارو
اہلِ فن، اہلِ قلم، اہلِ زباں ہیں

اُن کے ہی دم سے صحافت کا بھرم قائم ہے
عہدِ حاضر کے وہ تابندہ نشاں ہیں

ہم نے خوب اُن کو بہ عنوانِ خرد دیکھا ہے
شہرِ منطق میں سیاست کی دکاں ہیں

اتنا حکمت کو کیا نجم و ثریا سے بلند
چہرے اب فلسفہ دانوں کے دھواں ہیں

لکھ دیے دفترِ اظہارِ حقیقت کیا کیا
ایسے اب محسنِ مذہب بھی کہاں ہیں

طرزِ نثاریٔ غالب کے ہیں قرباں لیکن
وہ بھی اک موجدِ اسلوبِ بیاں ہیں

اُن کا اندازِ نگارش ہے شگفتہ اب تک
اس ضعیفی میں بھی وہ جیسے جواں ہیں

کوئی منظر ہو نگاہوں میں کھپا جاتا ہے
وہ بہ ہر رنگ محاکات کی جاں ہیں

آج اُنھیں سارا جہاں صبحِ یقیں کہتا ہے
پھر بھی وہ اپنی نگاہوں میں گماں ہیں

اُن کا دِل آئینۂ صدق و صفا لگتا ہے
وہ حقیقت میں حقیقت کی زباں ہیں

ہم اُنھیں مردِ حق آگاہ بجا کہتے ہیں
لاکھ وہ معترفِ حسنِ بتاں ہیں

ملک میں سیکڑوں اربابِ ادب ہیں لیکن
کتنے پہونچے ہیں وہاں تک وہ جہاں ہیں

جب بجا اُن سے تو پایا ہے کسی نے فن میں
سب قدح خوار ہیں وہ پیرِ مغاں ہیں

مطلعِ علم و ادب پر اُنھیں دیکھو تو سہی
ہو بہو صورتِ خورشید جہاں ہیں یارو

مولانا اختر علی تلہری (مرحوم)

مولانا عبدالماجد

۱۹۱۵ء کا ذکر ہے کہ میں رامپور کے مدرسہ عالیہ میں زیر تعلیم تھا اور میرا شمار ان معدودے چند طلبہ میں ہوتا تھا جنھیں منطق اور فلسفہ سے خاص لگاؤ تھا اور اس نے میری طالب علمانہ عبارتیں بہت بڑھا رکھی تھیں۔ چنانچہ میں کبھی کبھی اپنے مشفق استاذ مولانا فضلِ حق رام پوری سے بھی الجھ پڑتا تھا۔ مولانا فضلِ حق رام پوری مشہور منطقی اور فلسفی میری ان علمی آویزشوں سے منغص نہیں ہوتے بلکہ خوش ہوتے تھے اور کلمات تحسین اور آفرین سے نوازتے رہتے تھے۔ میں اپنی عقل اور ذہن کی خامی کی وجہ سے جو ہیں اور ناپختہ کاری کا مقتضا تھا اپنے کو بھی کچھ سمجھنے لگا تھا کہ اچانک کسی صاحب نے فلسفہ جذبات اور فلسفہ اجتماع پڑھنے کو لئے دیں۔ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے فکر و ذہن کی پرواز کو بہت سی نئی فضائیں مل گئی ہیں۔ فکر و نظر کے زمین و آسمان بدل گئے اور میں اس وقت کے مسٹر عبدالماجد، آج کے مولانا عبدالماجد دریابادی کو اپنا پیشوا سمجھنے لگا

اب تک مسٹر عبدالماجد صاحب سے نیاز حاصل نہ ہوا تھا پھر بھی ان کے فلسفیانہ خیالات اور افکار کو اپنی فکر و نظر کا سدرۃ المنتہیٰ قرار دیتا تھا اور ان کی تحریریں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پڑھتا تھا۔ اسی دوران میں "نوائے پشیمان" بھی پڑھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دریابادی صاحب نرے کھرے دیو جانس کلبی قسم کے فلسفی نہیں بلکہ ایسے فلسفی ہیں جو دنیا اور دوسری دلچسپیوں سے بالکل منحرف نہیں ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے فلسفی نے ایسی مختلف قسم کی کروٹیں لینی شروع کیں جن سے مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ اور میں سمجھنے لگا کہ میرا محبوب فلسفی اپنے خیالات میں مستقل نہیں اور اسی زمانہ میں دیکھنے میں آیا کہ انھیں خواجہ حسن نظامی دہلوی سے عقیدت ہوگئی اور خواجہ حسن نظامی کی بارگاہ سے فلسفی شاہ کا خطاب بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں مولانا کے سفر کی اس منزل میں ان کی رفاقت اختیار نہیں کر سکتا تھا لیکن خیریت یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنے پیر طریقت کی تقلید سے کنارہ کشی کر لی اور

وہ کسی دوسرے ہمسفر کی تلاش میں گم ہوگئے ہ
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہ دور وہ تھا جب گاندھی جی کی راہبانہ اور متصوفانہ فلسفہ ہندوستان پر چھایا ہوا تھا میں خود بھی اسی کا اسیر تھا اور ینگ انڈیا کو برابر پابندی سے پڑھا کرتا تھا ینگ انڈیا کا سادہ مگر پرکار عبارتوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود میں گاندھی جی کے فلسفہ کا پورا اور پکا پرستار نہ بن سکا۔ مولانا دریابادی اس سلسلے میں بہت آگے بڑھ چکے تھے یہاں تک کہ اس زمانہ میں ایک طبیعاتی منظر مختلف درختوں پر ایک خاص قسم کی مادی چیز ان سے ملتی جلتی نمودار ہونے لگی تو مولانا دریابادی نے اسے بھی گاندھی کے روحانی تصرف کے ذیل میں درج کرنے سے گریز نہیں کیا۔ مولانا کی یہ بات مجھے بہت ہی عجیب و غریب نظر آئی کہ "فلسفہ جذبات" اور "فلسفہ اجتماع" کا مصنف، اسقوٹالین سوسائٹی لندن کا ممبر ان اوہام کا شکار ہو۔ مجھے مولانا دریابادی کے ان ذہنی انقلابات سے برابر دھکا پہونچتا رہا اور میری سمجھ میں یہ بات قطعی نہیں آتی تھی کہ ایک ذہین فلسفیانہ دماغ ان توہمات کے دام میں کیوں کر گرفتار ہو سکتا ہے۔

مولانا دریابادی اور مولانا ظفر الملک ایک زمانہ میں ہفتہ وار اخبار "سچ" لکھنؤ کے مشترکہ مدیر تھے، میں "سچ" تو نہیں لیکن مولانا ظفر الملک کے لکھنؤ کے بہت سے ادبی رسالوں "الناظر" کے لیے مضامین لکھا کرتا تھا۔ مولانا ظفر الملک اپنی ہر بات میں حد سے بڑھے ہوئے جذبات پسند تھے۔ معمولی واقعہ پر بھی اپنی تقریر و تحریر سے انگارے برساتے تھے۔ چنانچہ ایک زمانہ ایسا بھی آگیا کہ انھوں نے شیعوں سے مذہبی عصبیت کے غالیانہ جوش کی بنا پر تمام تعلقات منقطع کر لئے۔ یہاں تک کہ مسعود حسن رضوی تک کا انھوں نے مقاطعہ کر دیا۔ چنانچہ لکھنؤ کے ایک ادبی جلسہ میں جس میں میں بھی موجود تھا رضوی صاحب کی طرف انھوں نے ایسی بے رخی برتی جس سے میں بھی متاثر ہوا۔ رضوی صاحب نے مولانا صاحب سے کہا "کیا آپ اپنے مخلص دوستوں کا بھی خیال نہ کریں گے۔ مولانا ظفر الملک نے جواب میں فرمایا "بالکل میں آپ سے بھی مکالمہ جاری نہیں رکھ رکھتا۔" میں نے تو اسی وقت سے بلا کسی تمہید کے مولانا ظفر الملک سے تعلقات کم کر دیا اور ان کے رسالہ میں لکھنا بند کر دیا۔ مولانا ظفر الملک کے افتاد طبع سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان سے اور مولانا دریابادی سے نہیں نبھ سکتی۔ چنانچہ اخبار "سچ" کی کشتی بیچ دریا میں ڈوب گئی اور مولانا عبد الماجد نے علیحدہ لکھنؤ سے "صدق" ہفتہ وار نکالا۔ اخبار صدق میں جب مولانا کی سچی باتیں اور شذرات کا جستہ جستہ مطالعہ کرنے کا موقع ملا تو محسوس ہوا کہ فلسفہ اجتماع اور فلسفہ جذبات کے مصنف نے فلسفہ کے خشک علمی اور محدود دائرے سے نکل کر اردو کے صحافتی ادب کو ایک نیا افق دیا ہے۔ "صدق" میں مولانا کی عبارت کا طرز "فلسفہ جذبات" یا "فلسفہ اجتماع" کی طرح نہ تھا۔ اس میں مخصوص نوعیت کا لطیف طنز و مزاح نمایاں ہو چلا تھا اور اس مخصوص طرز نگارش میں کر مولانا کا کوئی شریک و سہیم نظر نہیں آتا تھا۔ مولانا کے چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں میں بھرا ہوا گہرا طنز اردو ادب کے لئے خاصہ کی چیز بن گیا اور بہت سے لوگ لطف اندوز ہونے لگے۔ اور مولانا کا یہ ادبی مشغلہ اپنی سبک گامیوں کے ساتھ چل رہا تھا اور دوسری طرف ان کی مذہبیت مولانا اشرف علی تھانوی کی تربیت میں رہ کر قرآن مجید

از مولوی محمد ایوب صاحب واقف ایم اے

ماجد صاحب — الحاد سے اسلام تک

دین اسلام قرآن مجید رسول اللہ اور اسلامی تہذیب و روایات پر ہمیشہ اور ہر دور میں حملے ہوتے رہے ہیں، ان حملوں کی نوعیت دو طرح کی رہی ہے ایک تو یہ کہ عیسائی مشنریوں نے اپنے مسیحی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی راہ سے اسلام پر نکتہ چینی کیا۔ اگرچہ ان مشنریوں نے انسانی خدمات کو اپنا مسلک قرار دیا تھا لیکن ان کی کارگذاریوں نے عالم اسلام و تمام مذہبی انسانوں کے اذہان پر ایسے پر خطر اور مضر اثرات چھوڑے۔ اور خرافات و اباطیل کا ایسا انبار لگایا کہ جن کے تصور سے بھی روح انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ اسلام کو ہدف طعن و مذمت بنانے کا دوسرا گمراہ کن راستہ یہ اپنایا گیا کہ یوروپین مستشرقین و فضلانے ایک نوایجاد تحقیقی و سائنٹفک طریقے پر عمل شروع کیا۔ یہ کام ایک خاص پلان کے تحت کیا گیا یوروپین مستشرقین نے سب سے پہلا اور ضروری کام یہ انجام دیا کہ انھوں نے عربی زبان پڑھنا شروع کیا۔ اس لئے کہ عربی زبان سیکھے بغیر اسلام کے خلاف کوئی تحریری محاذ قائم کرنا مشکل تھا۔ جب انھوں نے عربی سیکھ لی تو اس زبان کی قدیم مذہبی کتابوں کو تلاش کرکے اپنی مرضی و منشا کے عین مطابق اس میں ترمیم و تحشیہ کرکے الگ سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ عربی زبان کی بہت سی مذہبی کتابیں نایاب مخطوطوں کی شکل میں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں انگریزوں کو نادر و نایاب اشیا خصوصاً ایسی کتابیں جو مذہبی و تاریخی مواد فراہم کرتی تھیں ان کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہا کرتے تھے اور چونکہ ان کے پاس وسائل کی کمی نہیں ہوتی تھی اس لئے انھیں حاصل کرنے میں ان کو کسی طرح کی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ برٹش میوزیم اور انگلینڈ کی دوسری لائبریریوں میں دوسرے ملکوں خاص طور پر اسلامی ممالک کی بہترین مذہبی علمی تاریخی اور ادبی کتابوں کا عظیم ذخیرہ انگریز مورخین اور محققین کے جذبہ ذوق و جستجو کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ بہت سے یوروپین مستشرقین نے ایسی بہت سی کتابوں میں غیر معتبر و نامناسب واقعات کی شمولیت اور غیر صحیح واقعات کی شمولیت اور صحیح واقعات میں تدلیس و ملمع سازی کرکے اپنے نام سے یا پھر ایسے اداروں کے نام سے جہاں اس طرح کا

تحقیقی وعلمی کام ہوتا ہے شائع کر دیا ہے۔ ان کتابوں میں قرآن کے تقدس، نبوت اور اسلامی فرائض پر طرح طرح کے اعتراضات کئے گئے ہیں۔ بعض مستشرقین ایسے بھی ہیں جنھوں نے دفعتہً عربی تمدن اور مسلمانوں اور مسلمانوں کے رسم و روایات کا گہرا مطالعہ لیا لیکن چونکہ ان کے اذہان پر اسلام دشمنی کا جادو بری طرح چھایا اس لئے وہ صحیح واقعات اور روایات کے صحیح خد و خال کو منظر عام پر لانے سے قاصر رہے۔ اے۔ جے۔ آر۔ بری A.J. Arberry ولیم میور William Muir الفریڈ جیوم A. Guillaume آر۔ اے۔ نکلسن R.A. Nicholson ڈی۔ مارگولیس (D.S. Margoliouth) اور فلیپ حتی (P.H. Hitti) وغیرہ مستشرقین نے اسلام، قرآن اور ختم المرسلین محمد صلعم کے خلاف محاذ بنا کر دنیا کے سامنے زہریلی تحریریں پیش کرنا اپنا نصب العین قرار دیا اور حیف کی بات یہ ہے کہ انھیں خرافات پیشہ مصنفین کی کتابوں کو دنیا کی بیشتر تعلیم گاہوں کے نصاب میں شامل کر لیا گیا۔ ظاہر ہے طلبا جب اس طرح کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو ان کے ایمان و اعتقاد میں تزلزل پیدا ہوگا۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور کی زندگی میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈاکٹر وائل (Dr. W) کی کتاب تاریخ اقوال اسلامیہ (History of Islamic Peoples) نصاب میں شامل کر لیا تھا۔ اس کتاب میں آنحضرت اور صحابہ کرام کے متعلق بہت سی بے بنیاد دل شکن اور توہین آمیز باتوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ مولانا سلیمان ندوی صاحب نے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی توجہ اس طرف منعطف کی اور اس طرح وہ کتاب یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کی گئی۔

اسی طرح فن تصوف اور فلسفہ کی مغربی مفکرین نے اپنی تحریروں میں جو تصویریں کھینچی ہیں۔ اور ان میں اپنے جو نظریات پیش کئے ہیں وہ نعوذ باللہ اچھے خاصے مذہبی انسانوں کو دہریت اور بے دینی کی راہ پر لگا سکتے ہیں۔ ان کے نظریات و خیالات کے مطالعہ سے زندگی کے عقائد اور اخلاق کے تمام تر اقدار بے معنی معلوم ہوتے ہیں کانٹ (Kant) ہیگل (Hegel) نٹشے (Nietzsche) برکلے (Berkeley) آئن سٹائن (Einstein) فرائڈ (Freud) ایڈلر (Adler) اور یونگ (Jung) وغیرہ کے فلسفہ و فکر نے مذہب، عقائد اور اخلاق پر بے پناہ حملے کئے۔ ان کے خیالات و افکار کا شکار ہو کر بہت سے مسلمان بھی الحاد و تشکیک کی طرف مائل ہو گئے۔ غرض یہ کہ یورپین علما، فضلانے ہر ممکن طریقے سے اسلام کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا انگنت اذہان کو حق کے راستے سے ہٹا کر باطل کی اس راہ پر پہونچا دیا جہاں معبود اور معبد بیکار محض ہوتے ہیں۔ یہاں پر ہم ایک ایسے ہی متبحر عالم کے مذہبی نشیب و فراز سے بحث کریں گے جو مغرب کی ذہنیت اور اس کے مزاج کا فریب کھا کر عرصہ تک شک و ریب کی وادیوں میں بھٹکتا رہا اور دیار مغرب سے اٹھی ہوئی اس باد سموم کی روک تھام اور اس کا مقابلہ کرنے کی بجا الٹا اسے ہوا دیتا رہا۔ میری مراد مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب سے ہے جی ہاں یہی عبدالماجد دریابادی جنھیں آپ موجودہ دور کا عظیم اسلامی مصلح اور صوم و صلوٰۃ کا پابند اور برگزیدہ پا رہے ہیں۔ اور اب جو شاعر کے اس قول پر دل و جان سے عامل ہے کہ ؎

اک موج نفس بیش برس ہے نہ صدی ہے
جو دم کہ تری یاد میں گذرے ابدی ہے

اسے خدا کی قدرت کا کرشمہ ہی سمجھئے کہ لاادریت کے فلسفہ اور عمل کا خوگر، تشکیک کے دریا کا شناور اور اسلام اور مسلمانوں کے علم و فضل کو ناقص و لغو قرار

والے یورپین مستشرقین کا ہم خیال و ہم عمل اسلام
[illegible]ی اور اس کی عظمت کا ایسا قائل ہوا اور اسلام کے
میں خود کو اس طرح رنگ ڈالا کہ جیسے اس نے کبھی دریئے
مذہب کی شناوری کی ہی نہیں ، مگر ناظرین کرام شاید
حقیقت سے بے خبر نہ ہوں کہ جھوٹ اور مکر و فریب
اور یہ وہ نکش تصویر کی اصلیت و حقیقت سے جب
انسانی آگاہ ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن کی کیفیت و سرد
جب بیزاری پیدا ہو جاتی ہے تو انسان حق اور انصاف
[illegible] اس تیزی سے بھاگتا ہے اور اس گرمجوشی سے
[illegible] مزاجی سے اس پر عمل کرتا ہے کہ وہ اس نئی فیلڈ
[illegible] طرح نیا نہیں معلوم ہوتا ۔ اور پھر زندگی میں ایمان
یقان کی اتنی تیز لو پیدا کرتا ہے کہ دوسرے برسوں
محنت اور عمل سے اس درجہ تک رسائی حاصل نہیں
پاتے ۔ مولانا عبدالماجد صاحب کی زندگی کچھ اسی طرح
واقعات سے مزین ہے ۔ جس دقت نظر سے انھوں نے
مغربی علوم و فنون اور وہاں کے نظریۂ زندگی اور انسانی
فطرت کا مطالعہ کیا اور اس کے اثرات قبول کئے اس سے
زیادہ ژرف نگاہی سے انھوں نے علوم اسلامیہ میں دستگاہ
حاصل کی اور خود کو اس لائق بنایا کہ اسلامی علوم کے گہرے
مطالعہ اور غور و خوض سے مغربی علوم و نظریات کی تغلیط
و تکذیب کر سکیں ۔ اس مشکل کام میں وہ پورے طور پر کامیاب
ہوئے ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب سچ اور
جھوٹ دونوں کی راہ سے گزرے لیکن پہنچے وہ اسی منزل
پر جہاں انھیں پہونچنا تھا ۔ یعنی حق و انصاف کی منزل
پر جہاں خدا کی برتری ، قرآن کی تقدیس اور رسول اللہ
کی زندگی کے فیوض و برکات ان کے عفو و کرم اور اسلام
کے روحانی نظام کو مسلم الثبوت پایا ۔ دل نے اقرار کیا اور
زبان و خامہ نے اس کی شہادت دی اس کے بعد ماجد
صاحب خاموش نہیں بیٹھے بلکہ اپنا مشن بنا لیا کہ جب تک
جسم میں جان باقی ہے قرآن و سنت کی تعلیم کو خاطر خواہ طریقہ
سے دنیا والوں کے گوش گزار کرتے رہیں گے ۔

اس سے قبل کہ میں ماجد صاحب کی اسلامی خدمات کے
اعلیٰ ناموں کا ایک ہلکا سا تعارف کراؤں ضروری معلوم
ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے اس افسوسناک دور کا بھی اجمالی
خاکہ پیش کرتا چلوں جسے ان کے [illegible] ماجد صاحب
نے الحاد پرستی کا [illegible] ماجد
صاحب اپنے ابتدائی ایام میں مطالعہ کے بے حد شوقین تھے ۔
اچھی خراب کوئی کتاب [illegible] تو اسے [illegible] نظر دیکھ
ضرور لیا کرتے تھے ۔ غالباً ۱۹۰۸ء ہی کی بات ہے کہ میٹرک
کو امتحان پاس کر کے لکھنؤ آئے تھے ۔ اپنے جس عزیز کے گھر میں
انھوں نے قیام کیا وہاں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی
کتابوں کے رسیا تو ماجد صاحب تھے ہی ۔ ڈھیر سی کتابیں
ایک جگہ نظر آئیں تو مکھی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے ۔ انھیں
کتابوں میں انھیں ایک انگریزی کتاب
(Elements of Social Science)
ملی اس کتاب کو ماجد صاحب نے شروع سے آخر تک پڑھ
ڈالی ۔ کتاب کا انداز بیان بڑا ہی خطیبانہ ، پرجوش اور پر
ہوائے نفس کے [illegible] ۔ [illegible] کتاب کا خلاصہ یہ تھا کہ
اخلاقی بندشیں [illegible] ۔ [illegible] رکھی ہوں جب
اپنے میں اتنی جسمانی قوت آ جائے تو ہر نفسانی خواہش آزاد
سے پوری کی جا سکتی ہے اس کتاب نے انھیں یہ بھی سکھایا کہ
[illegible] وغیرہ کی کوئی معنی نہیں طبیعت کو دبانا [illegible] رکھنا
[illegible] مضر ہوتا ہے ۔ ایسی اور [illegible] اسی طرح کی کتنی باتیں
اس کتاب [illegible] درج [illegible]
گئیں ۔ نفس مذہب کے خلاف [illegible]
کو پڑھ کر قبول کیا ۔ پھر کچھ دن بعد جب لکھنؤ میں مستقلاً رہنے
لگے تو وہیں کے کالج میں ایف ۔ اے میں داخلہ لے لیا ۔
انگریزی لازمی کے ساتھ ساتھ تاریخ منطق اور

عربی اختیاری مضامین لیے۔ ان موضوعات پر وہ جگہ جگہ کتابیں تلاش کرتے پھرتے ایک روز اتفاق سے لکھنؤ ہی کی کسی لائبریری میں انھیں ایک کتاب ملی جو کئی حصوں پر مشتمل تھی اس کتاب کا نام تھا (International Library of Famous Literature) (شہرۂ آفاق ادب کی بین الاقوامی لائبریری) اس کتاب میں یورپین مصنفین و مقالہ نویس کے چیدہ مضامین شامل کئے گئے تھے۔ انھیں مضامین میں سے ایک سیرت نبوی کے متعلق تھا اس مضمون کا لکھنے والا واشنگٹن اروِنگ Washington Irving نامی شخص تھا۔ مضمون کے ساتھ ہی مواد کی صحت کے ثبوت کے طور پر ایک پورے صفحہ پر رسول اللہ صلعم کی تصویر چھپی ہوئی تھی مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کا بیان ہے کہ یہ تصویر انتہائی غضبناک تھی نعوذ باللہ چہرے سے خشونت برستی تھی۔ نہ کہیں سے ترحم جھلکتا تھا اور نہ شفقت کمر سے تلوار لٹکتی ہوئی تھی۔ اور شانہ ترکش و کمان سے آراستہ رحمتہ اللعالمین کے تخیل سے کوئی دور کی بھی مناسبت نہ تھی۔ ماجد صاحب کو اس بات کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکا کہ تصویر جعلی ہے اور دشمنانِ اسلام نے محض قرآن مجید کے اس بیان کو کہ وما ارسلناك الا رحمة للعالمین (ہم نے آپ کو (رسول اللہ کو) سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر) اور اپنے متعلق خود رسول اللہ کے اس قول کو

انی لم ابعث لعانا وانما بعثت رحمة

(میں لعنت کرنے کے لئے نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں) محض دنیا کی نظر میں جھوٹ اور بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے ایسی جعلی اور فرضی تصویر شائع کی گئی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ کی زندگی دیانتداری، راست بازی حلم، ضبطِ نفس اور محاسنِ اخلاق کا ایک نمونہ تھی۔ عمر بھر انھوں نے مصالحت، تحمل، رواداری، راست بازی امن پسندی، عافیت دوستی اور بھائی چارگی کا درس دیا۔ مشرکین عرب خصوصاً قریش کے افراد نے ان پر ظلم تشدد کی بارش کی انھیں اس قدر تکلیف دی کہ وطن عزیز کو خیر باد کہہ کر مدینہ منورہ کو ہجرت کرنا پڑی تھی۔ لیکن زبان پر بد دعا کا ایک لفظ بھی نہ آنے دیا اور در خدا کی بارگاہ میں دستِ دعا دراز کرتے ہوئے تو یہی کہتے کہ

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون

(اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ حق و باطل کو پہچان سکتے۔)

بہر حال نفسِ مذہب کی طرف سے تو Elements of Social Science (Elements of Social Science) والی کتاب جو ایک ملحد ڈاکٹر ڈرسڈیٹ (Dr. Drysdale) کی تصنیف کی ہوئی تھی۔ پڑھ کر پہلے ہی ماجد صاحب کا اعتقاد متزلزل ہو چکا تھا جب انھوں نے محمد صاحب کی ایسی ڈراؤنی تصویر دیکھی تو ان میں رہی سہی ایمانی قوت بھی ضائع ہو گئی۔ اب وہ پورے ملحد تھے روزہ نماز اور دیگر اسلامی فرائض سے قطعاً و مطلقاً منحرف

خیر و شکر کی بات یہ ہوئی کہ بے دینی کے اس بھیانک دور میں بھی علماء و مصلحینِ اسلام سے ان کے تعلقات باقی تھے۔ مولانا محمد علی کی صحبت، علامہ سید سلیمان ندوی کی رفاقت اور سب سے بڑھ کر مجدد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی دینی حمیت اور جذبہ ایمان داری اور ان کی ہدایتوں اور صلاحوں نے انھیں زیادہ دنوں تک کفر و الحاد کی وادی میں بھٹکنے نہ دیا۔ مولانا شبلی نعمانی اور دوسرے مفکرینِ اسلام کے ملفوظات نے ان کے ذہن کے دریچوں کو وا کیا۔ ۱۹۱۸ء کے ابتدا سے ہلکی ہلکی روشنی انھیں ہدایت کی نصیب ہونے لگی۔ لیکن جوشِ ایمانی نے اور شدت اختیار کی تو حیدرآباد، دکن لکھنؤ، اجمیر، دیوبند، کلیر، بانسہ، ردولی ا

انے کہاں کہاں زندہ بزرگان دین کی تلاش میں ٹھوکریں
بیں۔ تلاش کی اس رہگذر پہ کبھی تو واقعتاً انھیں عامل
ہر ملے اور کبھی بقول ان کے نرے دکاندار قسم کے
ر دراز بھی۔ اس سے بھی ان کے شوق کی پیاس نہ بجھی
ر ہند کا رخ کیا۔ جہاں انھیں حق محصور نظر آیا۔ اس
۔ دور کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ بحمداللہ ۱۹۲۱ء کے آغاز
وہ پورے مسلمان ہو گئے۔

اب آئیے ذرا ماجد صاحب کی ان تحریروں پر
نظر ڈالیں جو انھوں نے اسلامیات کے سلسلہ میں لکھی
اور جن کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ
اسلامی شان نمایاں ہے۔ اسلامیات و قرآنیات سے
علق انھوں نے جتنی کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں مولانا
ترجمہ و تفسیر کو پہلے خاص اہمیت حاصل ہے۔ انکے
جمہ و تفسیر کو ہند و پاک کے علمی طبقے سے بڑی
در و منزلت نصیب ہوئی۔ اس تفسیر کے پہلے حصہ میں
ھوں نے ایک دیباچہ سپرد قلم کیا ہے اس میں انھوں
قرآن کی تاریخی حیثیت پر جس خوبصورتی سے روشنی
ڈالی ہے وہ یقیناً ان کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی
بہت بڑا ثبوت ہے۔ قرآن کے متعلق ان کے بیانات
کو اگر انسانی ادراک و تعقل کسی طرح کی جانبداری سے
خبر کرے تو اسے محض ہٹ دھرمی اور تعصب پروری
ہی کہا جائے گا۔ دیباچے میں مولانا ماجد نے چہار
مختلف عناصر پر خاص طور سے بحث کی ہے۔ جو قرآن
کی بنیادی خصوصیات ہیں اور جن میں قرآن کی صداقت
کا راز مضمر ہے یہاں ہم ان کے دیباچے کے ان سطور
و بعینہ درج کرتے ہیں تاکہ ناظرین خود دیکھیں اور ماجد
صاحب کی باریک بینی کو داد دیں۔

۱۔ قرآن حکیم ایک نہایت درجہ مرتب و منظم
کتاب ہے۔

۲۔ قرآن مجید ایک زندہ صحیفہ بھی ہے اور
ماضی کی کتاب بھی۔ یعنی ایک طرف تو اس
کی مخاطب عرب کی وہ قوم تھی جو اس کے
نزول کے وقت موجود تھی بلکہ ساری قوم
کیوں کہیے زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیے
کہ مکہ اور مضافات مکہ اور مدینہ و حوالی
مدینہ کے باشندے تھے اور دوسری طرف
اس کے مخاطب روس، جاپان، چین اور
ہندوستان، آسٹریلیا، امریکہ کل روئے
زمین کے باشندے قیامت تک کے لئے
ہیں۔ اس کی یہ دونوں حیثیتیں نہ صرف موجود
ہیں بلکہ برابر ساتھ چلتی ہیں اور ترتیب
زمانی کے لحاظ سے پہلی حیثیت اور اہم
مقدم ہے جنت کی نعمتوں، دوزخ کے
عذابوں، آسمان کی ساخت، زمین کی حرکت
و سکون، ستاروں کی گردش، وغیرہ سے
متعلق کوئی ایسی بات اگر بیان کر دیتا
جو اس کے مخاطبین اول یعنی چھٹی صدی
عیسوی کے اہل حجاز کے مسلمات کے خلاف
یا ان کی فہم سے بالاتر ہوتی تو وہ لوگ خواہ
مخواہ ایک نئے الجھاؤ میں پڑ جاتے اور
اس سے ان کے دماغ وحشت کھا کر قرآن
کے بنیادی عقائد، توحید، رسالت، حشر
و نشر وغیرہ کی تکذیب پر آمادہ ہو جاتے
اس لئے قرآن نے نہایت حکیمانہ اسلوب
یہ اختیار کیا کہ مراتیں تو تمام تر مذاق عرب
کے مطابق ہی کیں لیکن ساتھ ہی ساتھ الفاظ
بھی ایسے رکھے کہ بعد کی نسلیں اور ہر دور
کے مخاطبین اپنی اپنی فہم و استعداد کے

ماتحت اس سے روشنی حاصل کر سکیں۔

۱۳۔ قرآن حکیم اپنے نفس مضمون یعنی نفس مطالب کے لحاظ سے ساری کائنات انسانی کو مخاطب بنائے ہوئے ہے سب کے ذہنوں اور عقلوں کو سامنے رکھے ہوئے ہے۔

۱۴۔ قرآن مجید کی دنیا حکمت و اخلاق اور دینیت وانسانیت کبریٰ کی دنیا ہے اس کی فضا تحقیق وطلب کی فضا ہے اس کا ماحول تقویٰ وطہارت کا ماحول ہے اس کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کسی درجہ میں تو بہرحال لازمی ہے۔ طہارت قلب وطہارت جسم کا مطلق اہتمام کئے بغیر محض زبان دانی کے بھروسہ پر قرآن سمجھ لینے کی کوشش ایک سعی لاحاصل ہے۔

مذکورہ بالاسطور میں قرآن کے متعلق بین حقائق کی طرف اشارے کئے گئے ہیں ان سے قرآنیات پر عائد کئے جانے والے بہت سے اعتراضات کے جوابات مل جاتے ہیں اور سچ پوچھئے تو ماجد صاحب کا یہ کارنامہ مغرب زدہ طبقے کے لئے آب حیات کا درجہ رکھتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ مغرب کے پیدا کردہ تمام تر فکری امراض جن سے ذہن انسانی مسموم و مفلوج ہوتا ہے۔ اس کا کلی و شافی علاج ہے ان اوصاف کی روشنی میں ماجد صاحب کی تفسیر قرآن کی دوسری تفاسیر کے مقابلہ میں فخر و مباہات کی چیز ہے اور اس کی مساوی رتبہ کی تفسیر مشکل سے نظر آئے گی۔ اسی طرح قرآن سے متعلق ان کی چھ اور کتابیں ہیں مثلاً ارض القرآن "جغرافیہ قرآنی"، "الحیوانات فی القرآن" یا "حیوانات قرآنی"، "اعلام القرآن" یا "قرآنی شخصیتیں" وغیرہ۔ ماجد صاحب جب تفسیر قرآن مجید مکمل کر لی تو ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کتاب الٰہی سے بڑھ کر دنیا کا کوئی مشغلہ نہیں چنانچہ انہوں نے قرآنیات کا باستیعاب مطالعہ کیا انھوں نے دیکھا کہ قرآن میں بہت سی جگہوں کے نام آئے ہیں۔ یہ نام کئی طرح کے ہیں۔ مثلاً کچھ تو ملکوں کے نام ہیں جیسے مصر، بابل، وغیرہ اور کچھ شہروں کے نام بھی ہیں جیسے یثرب، سبا اسی طرح کچھ پہاڑوں کے نام جیسے جودی، طور، صفا، اور مروہ وغیرہ اور بعض عمارتوں کے نام کعبہ، بیت الحرام اور مسجد الاقصیٰ۔

تمام ناموں کی جن کی تعداد ۱۲۹ تک پہونچتی ہے بہ ترتیب حروف تہجی۔ لغت کے طور پر مرتب کیا تاریخ اور جغرافیہ کی مستند کتابوں سے ان ناموں کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کیں اور پھر اپنے طور پر مختصر شرح و تفسیر کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اکثر مقامات پر کچھ شخصیتوں کے نام آئے ہیں یہ شخصیتیں بھی کئی طرح کی ہیں مثلاً جنی شخصیتیں، بشری شخصیتیں اور ملکی شخصیتیں۔ ان ناموں کو بھی مولانا عبدالماجد دریابادی نے تہجی وار ایک جامع لغت کی شکل میں شائع کیا ہے۔ ان شخصیات کے متعلق انہوں نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ صرف قرآن اور عربی کی اسلامی کتابوں ہی سے ماخوذ نہیں بلکہ قرآن سے باہر کی اور غیر اسلامی کتابوں مثلاً بائبل وغیرہ سے بھی حاصل کی ہیں ٹھیک اسی طرح انھوں نے قرآن کے حیوانی ناموں کو بھی جمع کیا اور مذکورہ بالا کتابوں کی طرح شرح و تفسیر کے ساتھ شائع کیا۔ اسی طرح کا کام اگرچہ اسلامی دنیا میں نیا نہیں ہے لیکن جس جامعیت اور مستقل مزاجی کے ساتھ ماجد صاحب نے یہ کام کیا ہے اسی کی روشنی میں ان کی اس کارگزاری کو اور کاموں پر فوقیت حاصل ہے یہ کام کچھ آسان نہیں اور نہ ہی معمولی ذہن کے انسان کو اس میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے ماجد صاحب کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ ایک ذہین اور نکتہ رس طالبعلم رہے

یں دوسرے مغربی علوم و فنون کے مطالعہ نے انھیں باریکیاں بھی
پرکھ سکھا دیئے ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کی شب و روز
محنت و غور و فکر نے ان کے مراحل کو حل کر دیا اسلام اور
ہمارا زاویہ نگاہ کیا ہے اسلام کو دل میں آنے کے بعد ماجد صاحب
اسلامی خدمات میں ہمہ وقت ہمہ جہت منہمک و مستغرق
رہنے کا جو مشغلہ بنا لیا تھا اس کے شانہ روز کا مصروف ترین
… المشاہدات … مشغولیت … دونوں چیزیں
… [illegible] …
… الدین … حکیم الامت حضرت مولانا
اشرف علی تھانوی وغیرہ کی بیاض بھی ان کی شاہ کار ہیں۔
دوران کے ایک ایک جملہ سے اسلامی شان و عظمت ٹپکتی
ہے۔ تفسیر ماجدی کے دیباچے میں مولانا عبد الماجد صاحب
رقمطراز ہیں۔

"پاک ہے وہ ذات اور ہر حمد کے قابل ہے
وہ ذات جس نے انسان کو ابدی مسرت اور
سرمدی راحت پر چلنے کے لئے عقل جیسی
نعمت اور محض اپنے فضل سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر
کر وحی جیسی نعمت عطا فرمائی۔ اور سلسلہ
وحی کی بعثت کی تکمیل اور انتہا عرب کی
اس زمین پر کی جس نے عرب و عجم، مشرق
و مغرب، گورے اور کالے، بدوی و حضری
وحشی و شہری سب کو راہ ہدایت
دکھائی اور جس نے ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانہ
کے لئے سچی عقل و دانش سچے علم و حکمت
سچی روحانیت و نورانیت کے دروازے
کھولے"

مندرجہ بالا اقتباس پیغمبر خدا حضرت محمدؐ
صلعم کی ذات والا صفات سے روشناسی حاصل
کرنے کے لئے ایک آئینہ ہے جس سے محمد رسول اللہ کی سیرت

و شخصیت کا عکس ذہن پر تو صاف عیاں ہے۔ کل تک یورپین
مستشرقین کے لغو اور فتنہ پرور بیانات کو پڑھ کر علیم
مطلق، عالم کل اور خالق علم و عقل کے متعلق شک و شبہہ
کا اظہار کرنے والا انسان ایسی بات کہے تو اسے خدا
کی قدرت اور اس کی مرضی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا
ہے۔ "سفر حجاز" میں انھوں نے اپنے عینی مشاہدات
اور قلبی کیفیات اور روحانی تاثرات جو انھوں نے کہ
و مدینہ میں حاصل کئے ایسے والہانہ انداز میں پیش کیا
ہے کہ اس کے مطالعہ سے انسان وجد میں ڈوب جاتا ہے
جگہ جگہ موقع و محل کی مناسبت سے اس سفرنامہ میں
مولانا عبد الماجد نے اشارۃً و کنایۃً اسلام کی خصوصیات
پر روشنی ڈالی ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے، اگر یہ کہا جائے
کہ مولانا نے اپنی زندگی کا اسلامی سفر جو سنہ ۱۹۱۸ء کے آغاز
سے شروع کر دیا تھا "سفر حجاز" پر ختم کر دیا اور صاف
لفظوں میں یہ کہ اسلام، قرآن و حدیث اور رسول کے
متعلق اپنے عقائد کی تکمیل کر لی تو یہ کسی طرح غلط نہ ہوگا۔

آج خود مولانا عبد الماجد دریابادی صاحب کے
لئے اور ہم سب کے لئے یہ فخر و مسرت کی بات ہے کہ
اسلامی فکر و تدبر کے اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں
پوری دنیائے اسلام کے لئے وہ علم کے ایسے آفتاب
کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی شعاعیں ہند و پاک کے
حدود سے نکل کر پوری دنیا پر محیط ہو رہی ہیں خدا
انھیں تا دیر زندہ سلامت رکھے کہ وہ علمی محفلوں اور
دینی انجمنوں کو اپنی باوزن شخصیت اور آب و تاب
سے بقعۂ نور بنا رہے ہیں۔

آمین ثم آمین

محمد ایوب

ماتحت اس سے روشنی حاصل کر سکیں۔

۱۳۔ قرآن حکیم اپنے نفس مضمون یعنی
ومطالب کے لحاظ سے ساری کائنات
انسانی کو مخاطب کئے ہوئے ہے سب
کے ذہنوں اور عقلوں کو سامنے رکھے ہوئے
ہے۔

۱۴۔ قرآن مجید کی دنیا حکمت واخلاق اور دینیت
وانسانیت کبریٰ کی دنیا ہے اس کی فضا
تحقیق وطلب کی فضا ہے اس کا ماحول تقویٰ
وطہارت کا ماحول ہے اس کی گہرائیوں تک
رسائی حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کسی
درجہ میں تو بہرحال لازمی ہے۔ طہارت
قلب وطہارت جسم کا مطلق اہتمام کئے
بغیر محض زبان دانی کے بھروسہ پر قرآن
سمجھ لینے کی کوشش ایک سعی لاحاصل ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں قرآن کے متعلق بعض حقائق کی طرف اشارے کئے گئے ہیں ان سے قرآنیات پر عائد کئے جانے والے بہت سے اعتراضات کے جوابات مل جاتے ہیں اور سچ پوچھئے تو ماجد صاحب کا یہ کارنامہ مغرب زدہ طبقے کے لئے آب حیات کا درجہ رکھتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ مغرب کے پیدا کردہ تمام تر فکری امراض جن سے ذہن انسانی مسموم ومفلوج ہوتا ہے۔ اس کا کلی وشافی علاج ہے ان اوصاف کی روشنی میں ماجد صاحب کی تفسیر قرآن کی دوسری تفاسیر کے مقابلہ میں فخر ومباہات کی چیز ہے اور اس کی مساوی رتبہ کی تفسیر مشکل سے نظر آئے گی۔ اسی طرح قرآن سے متعلق ان کی چھ اور کتابیں ہیں مثلاً ارض القرآن، جغرافیہ قرآنی، "الحیوانات فی القرآن" یا "حیوانات قرآنی"، اعلام القرآن" یا قرآنی شخصیتیں وغیرہ۔ ماجد صاحب جب تفسیر قرآن مجید مکمل کر لی تو ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کتاب الٰہی سے بڑھ کر دنیا کا کوئی مشغلہ نہیں۔ انہوں نے قرآنیات کا باستیعاب مطالعہ کیا انھوں نے دیکھا کہ قرآن میں بہت سی جگہوں کے نام آئے ہیں، یہ طرح کے ہیں۔ مثلاً کچھ تو ملکوں کے نام ہیں جیسے مصر، بابل، وغیرہ اور کچھ شہروں کے نام بھی ہیں جیسے یثرب، سبا اسی طرح کچھ پہاڑوں کے نام جیسے جو طور، صفا، اور مروہ وغیرہ اور بعض عمارتوں کے نام کعبہ، بیت الحرام اور مسجد الاقصیٰ۔

تمام ناموں کی جن کی تعداد ۱۲۹ تک پہونچتی ہے بہ ترتیب حروف تہجی۔ لغت کے طور پر مرتب کیا تاریخ اور کی مستند کتابوں سے ان ناموں کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کیں اور پھر اپنے طور پر مختصر شرح وتفسیر کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اکثر مقامات پر کچھ شخصیتوں کے نام آئے ہیں یہ شخص بھی کئی طرح کی مثلاً جنی شخصیتیں، البشری شخصیتیں اور ملکی شخصیتیں۔ ان ناموں کو بھی مولانا عبدالماجد دریابادی نے ہجی وار ایک جامع لغت کی شکل میں شائع کیا ہے۔ ان شخصیات کے متعلق انہوں نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ صرف قرآن اور عربی کی اسلامی کتابوں ہی سے ماخوذ نہیں بلکہ قرآن سے باہر کی اور غیر اسلامی کتابوں مثلاً بائبل وغیرہ سے بھی حاصل کی ہیں ٹھیک اسی طرح انھوں نے قرآن کے حیوانی ناموں کو بھی جمع کیا اور مذکورہ بالا کتابوں کی طرح شرح وتفسیر کے ساتھ شائع کیا۔ اسی طرح کا کام اگرچہ اسلامی دنیا میں نیا نہیں ہے لیکن جس جامعیت اور مستقل ملان کے ساتھ ماجد صاحب نے یہ کام کیا ہے اسی کی روشنی میں ان کی اس کارگزاری کو اور کاموں پر فوقیت حاصل ہے یہ کام کچھ آسان نہیں اور نہ ہی معمولی ذہن کے انسان کو اس میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے ماجد صاحب کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ ایک ذہین اور نکتہ رس طالبعلم تھے

ہیں دوسرے مغربی علوم و فنون کے مطالعہ نے انھیں باریک بینی کے گر سکھا دیئے ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کی شب و روز کی محنت و غور و فکر نے ان کے مراحل کو حل کر دیا۔ الحاد کی خارزار سے نکل کر وہ اسلام کو واپس آنے کے بعد مولانا نے اسلامی خدمات میں عمر و عزیز کا بہت بڑا حصہ صرف ہونے کا جو مشن بنایا تھا اس کے شایانِ شان ان کا معرکۃ [illegible] تفسیر القرآن ہے [illegible] مشرقی و مغربی [illegible] کو پہنچایا ہے [illegible] "تصوف اسلام" مولانا جلال الدین رومی اور سوانح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ کتابیں بھی ان کی شاہکار ہیں۔ اور ان کے ایک ایک جملے سے اسلامی شان و عظمت ٹپکتی ہے۔ رفیہ ماجد کے دیباچے میں مولانا عبدالماجد صاحب رقمطراز ہیں۔

"پاک ہے وہ ذات اور ہر حمد کے قابل ہے
وہ ذات جس نے انسان کو ابدی مسرت اور
سرمدی راحت پر چلنے کے لئے عقل و ہوش کی
نعمت اور عقل سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر
کر وحی جیسی نعمت عطا فرمائی۔ اور سلسلۂ
وحی کی بعثت کی تکمیل اور انتہا عرب کی
اس زمین پر کی جس نے عرب و عجم، مشرقی
و مغربی، گورے اور کالے، بدوی و حضری
وحشی و شہری سب کو راہ ہدایت
دکھائی اور جس نے ہر قوم، ہر ملک ہر زمانہ
کے لئے سچی عقل و دانش سچے علم و حکمت
سچی روحانیت و نورانیت کے دروازے
کھولے"

مندرجہ بالا اقتباس پیغمبر خدا حضرت محمد صلعم کی ذات والا صفات سے روشناسی حاصل کرنے کے لئے ایک آئینہ ہے جس سے محمد رسول اللہ کی سیرت و شخصیت کا عکس دیکھنے تو صاف عیاں ہے۔ کل تک یورپین مستشرقین کے لغو اور فتنہ پرور بیانات کو پڑھ کر علیم مطلق، عالم کل اور خالق علم و عقل کے متعلق شک و شبہ کا اظہار کرنے والا انسان ایسی بات کہے تو اسے خدا کی قدرت ہے اور اس کی مرضی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ "سفر حجاز" میں انھوں نے اپنے عینی مشاہدات اور قلبی کیفیات اور روحانی تاثرات جو انھوں نے حاصل کئے ایسے والہانہ انداز میں پیش کئے ہیں کہ اس کے مطالعہ سے انسان وجد میں ڈوب جاتا ہے۔ جگہ جگہ موقع و محل کی مناسبت سے اس سفرنامہ میں مولانا عبدالماجد نے اشارۃً و کنایتاً اسلام کی خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مولانا نے اپنی زندگی کا اسلامی سفر جو ۱۹۱۸ء کے آغاز سے شروع کر دیا تھا "سفر حجاز" پر ختم کر دیا اور صاف لفظوں میں یہ کہ اسلام، قرآن و حدیث اور رسول کے متعلق اپنے عقائد کی تکمیل کر لی تو یہ کسی طرح غلط نہ ہوگا۔

آج خود مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کے لئے اور ہم سب کے لئے یہ فخر و مسرت کی بات ہے کہ اسلامی فکر و تدبر کے اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں پوری دنیائے اسلام کے لئے وہ علم کے ایسے آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی شعاعیں ہند و پاک کے حدود سے نکل کر پوری دنیا پر محیط ہو رہی ہیں خدا انھیں تا دیر زندہ سلامت رکھے کہ وہ علمی محفلوں اور دینی انجمنوں کو اپنی باوزن شخصیت اور آب و تاب سے بقعۂ نور بنا رہے ہیں۔

آمین ثم آمین

محمد ایوب

غلام احمد فرقت ایم اے کاکوروی

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

سچ پوچھیے تو میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو سچ کی حد تک اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ہفتہ وار سچ کے مدیر تھے اور یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جس کا سن بھی اب مجھے یاد نہیں۔ ہو گا کوئی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ کا زمانہ مولانا ظفر الملک اڈیٹر الناظر میرے حقیقی پھوپھا تھے۔ الناظر کا دفتر وکٹوریہ اسٹریٹ پر سر راہ ایک بڑے دو منزلہ مکان میں تھا۔ اوپر کی منزل میں میری پھوپھی رہتی تھیں۔ اور نیچے کی منزل میں ایک بڑے صحن کے گرد کئی کمرے تھے انمیں دو کمرے الناظر بک ایجنسی کے لئے وقف تھے ایک میں غالباً الناظر پریس تھا جو اُس وقت تک فروخت نہیں ہوا تھا۔ ایک کمرہ اڈیٹر کا تھا اور اس کے برابر رقم صاحب مرحوم کا کمرہ تھا جو اس دور کے ایک مشہور خوشنویس اور شاعر تھے اور الناظر اور سچ وہی لکھتے تھے رقم صاحب مرحوم مجھ سے بڑی محبت فرماتے تھے کیوں کہ وہ تقریباً پندرہ بیس برس پہلے سے صرف الناظر ہی لکھتے تھے اور جب میں اپنی پھوپھی سے ملنے جاتا تو ان کے پاس ضرور جاتا۔ انٹرمیڈیٹ پاس کر کے میں روزانہ حقیقت لکھنؤ (جن کے اڈیٹر عم محترم مولوی انیس احمد صاحب عباسی تھے) کے ادارۂ تحریر سے منسلک ہو کر حقیقت کا مزاحیہ کالم "گلفردش" لکھتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ وہی اخبار تھا جس میں ہا کری حیثیت سے لکھنؤ کی گلی کوچوں میں سرخیاں پکار پکار کے بیچ چکا تھا۔ مولانا ظفر الملک علوی کٹر کانگریسی تھے اور اس درجہ کھدر پرست تھے کہ گرمیوں میں جو موٹے کھدر کا لباس وہ پہنتے تھے اسے دیکھ کر لوگوں کو جھرجھری آنے لگتی تھی مولانا بدیسی مال (انگریزی کپڑے) کے شدید دشمن تھے کہ ان کا بس نہ تھا وہ انگریزوں کو جلانے کے لئے گھر میں برتن تک کھدر کے استعمال کرتے رہے مولانا کا پورا گھر کھدر بھنڈار بنا ہوا تھا اور میری پھوپھی زاد بہن کو بھی اتنے دبیز کھدر کے کپڑے پہننا پڑتے تھے کہ اگر آج کل کے سجاب گیا سائز کے لوگ دیکھ لیتے تو شاید اپنی دبازت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تائب ہو جاتے۔

بات کہاں سے کہاں تک پہونچ گئی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ سچ غالباً مولانا ظفر الملک علوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کی مشترکہ طباعت اور ادارت میں نکلتا تھا۔ مقصد یہ کہ مولانا ظفر الملک اس کے ناشر اور مولانا عبدالماجد صاحب اس کے مدیر تھے اور ۱۹۲۵ء میں جب یہ شائع ہونا شروع ہوا تھا اس وقت بھی اس کی ضخامت اور حجم یہی تھا جو اس وقت صدق جدید کا ہے مگر سچ کا لفظ چوں کہ لغوی اعتبار سے نجیب الطرفین ہندی تھا اور وہ کانگریس زدہ ماحول سے نکلنا شروع ہوا تھا اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی اختلاف نہ پیدا ہو۔ لہٰذا اس کو کچھ ہی عرصہ بعد عربی زبان کے ہاتھ پر بیعت کر کے صدق کی شکل

اختیار کرنا پڑی اور جب وہ حق و صداقت کی منزل میں آیا تو مصداق الحق مُر؀ اس ماحول کی تلخی زیادہ عرصہ تک برداشت نہ کر سکا اور مجبوراً اسے صدق جدید کا چولا بدلنا پڑا۔ تاریخ شاہد ہے کہ سچ، صدق اور صدق جدید کی ادارت ہمیشہ اسی ہستی نے کی ہے جو ان الفاظ کی صحیح تفسیر یا اسم بامسمیٰ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس ہفت خواں میں سچائی کا دامن ان کے ہاتھ سے کسی منزل میں بھی نہیں چھٹا۔

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

اس کے بعد تا ایندم صدق و صفا کی منزل کی طرف گامزن ہے اور اس دار و رسن کے دور میں بھی "انا الحق" کا نعرہ اس کی زبان پر ہے اگرچہ گذشتہ تینتیس سال سے روزانہ اس تک یہ خبریں پہونچتی رہتی ہیں۔ ؎

رپٹ لکھوائی ہے اغیار نے جا جا کے کھتانہ میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں

اب جہاں تک مولانا کی ذات گرامی کا تعلق ہے اس وقت تک مولانا سے شرف نیاز حاصل کرنے سے محروم رہا تھا اور حقیقت سے منسلک ہونے کے بعد بھی ایک عرصہ تک مولانا سے بالمشافہ میری ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ حالانکہ آٹھویں جماعت میں ان کا نام گھر میں برابر سنتا رہتا تھا۔ کیونکہ میرے ماموں مولوی انیس احمد صاحب عباسی کے وہ سرپرست اور استاد بھی تھے اور ان کے بعض مضامین بھی میں نے پڑھے تھے۔ لیکن مولانا سے میری عقیدت کی اس وقت کوئی حد و انتہا نہ رہی جب نواب مرزا شوق لکھنؤی کی مثنوی زہر عشق پر ان کا مقدمہ میری نظر سے گذرا جسے میں نے اتنی بار پڑھا کہ اس کا شروع کا مندرجہ ذیل ٹکڑا مجھے آج تک زبانی یاد ہے۔ اسے آپ بھی سنتے چلئے

مقدمہ کا عنوان ہے: "اردو کا ایک بدنام شاعر" لکھنؤ اور واجد علی شاہ "جان عالم" کا لکھنؤ، ہر لب پر گل کا افسانہ، ہر زبان پر بلبل کا ترانہ، ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینہ میں جوش تمنا، ہر روز میلوں ٹھیلوں کا ہجوم، ہر شب گانے بجانے کی دھوم، یہاں رہس کا سوانگ رچا ہوا، وہاں اندر سبھا کی پریوں کا پرا جما ہوا۔ اِدھر ضلع جگت اور تالیاں، اُدھر قہقہہ اور گلے بازیاں، ہر طرف رندی و سرمستی کا جوش و خروش ہر گوشہ "بساط دامان باغبان و کف گلفروش" بڑے بڑے متین اور ثقہ گویوں اور سازندوں کی سنگت پر مجبور، بڑے مہذب اور مقطع بھانڈوں اور ڈھاریوں کا بہروپ بھرے ہوئے اچھے اچھے سفید پوشوں کے دامن عبیر اور گلال کی پچکاریوں سے لالولال بھاری بھاری جبّے اور عمامے پشوازوں کی گردش پر نثار "اس جنت نگاہ و فردوس گوش" کی فضا میں ایک صاحب حکیم تصدق حسین نامی آنکھیں کھولتے ہیں۔ عالم دین نہیں، صوفی و درویش نہیں، مصلح معاشر ہیں۔ ایک یار باش زندہ دل، رند مشرب آدمی، اہل بزم کے خوش کرنے کو شعر و شاعری کا سازلے کر بیٹھے تو انگلیاں انھیں پردوں پر پڑیں جن کے نغمے کانوں میں رچے ہوئے تھے اور منھ سے بول نکلے تو وہی جن کے نقشے آنکھوں میں جمے ہوئے تھے۔ غزلیں شاید زیادہ نہیں کہیں، کہی بھی ہوں گی تو اس وقت کسی کی زبان پر نہیں۔ تھوڑا بہت جو کچھ کہا اس کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

کہتے ہیں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے
پھرتے ہیں انھیں غیر اُبھارے کئی دن سے

اِک شب ترے گھر آن کے مہمان رہے تھے
ملتے ہیں نہیں شرم کے مارے کئی دن سے

آخر مری آہوں نے اثر اپنا دکھایا
گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں پیارے کئی دن سے

پھر شوق سے کیا اس بُت عیار سے بگڑی

صدق جدید سے پہلے صدق مولانا عبد الرؤف صاحب عباسی کے اخبار روزنامہ حق پریس سے شائع ہوتا تھا۔

اس مقدمہ میں درحقیقت مولانا نے اپنے قلم سے جادو جگائے ہیں اور مثنوی مقدمہ سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اس مثنوی کو بار بار پڑھ کر میں نے یہ سوچا تھا کہ جن صاحب نے مقدمہ لکھا ہے ان کو لوگ مولوی کیوں کہتے ہیں ان کو تو عاشقان پاک طینت کا خضر راہ ہونا چاہئے تھا یا ڈال کے ٹوٹے اناڑی عشاق کی درس گاہ کا پرنسپل کیوں کہ وہ عشق کے تو قائل ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ان کا کہنا ہے سہ

آتش کدۂ حسن میں جانا مگر اے دل
شعلوں سے بچائے ہوئے دامان تمنا

یہ واقعہ ہے کہ اس مقدمہ میں مولانا کے قلم سے جو بلیغ فقرے نکل گئے ہیں اور جس جس انداز میں مولانا نے زہر عشق کے ہیرو اور ہیروئن کی دلدوز داستان کو بیان کیا ہے۔ ایسے ادب پارے ہیں جن کو پڑھ کر دل کے گوشوں میں محفوظ کر لینے کو دل چاہتا ہے۔ مقدمہ کا ہر حصہ ایک درس اور عشاق کے لئے مشعل ہدایت ہے۔ انھوں نے یہ مقدمہ نہیں لکھا ہے بلکہ نواب مرزا شوق کی آخرت کو سنوارا ہے مقدمہ کا اختتام یوں ہوتا ہے۔

"مشرق کے بے حیا سخن گو، اُردو کے بدنام شاعر رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا ہے۔ تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ تو نے موت کو یاد رکھا تیری یاد کو انشاء اللہ موت نہ آئے گی ... تو نے شاید کسی کی رحمت بے پایاں پر تکیہ کر کے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو بہت پھیلایا لیکن اس سے بھی بڑھ کر کسی کی عظمت بے پایاں سے خائف ہو کر موت و انجام کی یاد دلا دلا کر بھی خوب رُلایا۔ خدا اے آمرزگار تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو و مغفرت کے سایہ میں لے لے اور تیرے کلام کے درد و محبت، تیرے بیان کے سوز و گداز کا اجر اپنی ہی قدرت و رحمت کی مناسبت سے تجھے بے حد و حساب عطا کرے۔"

خدا جانتا ہے اس ادبی جواہر ریزے کو پڑھنے کے بعد رہ رہ کر میرے دل میں یہ آرزو کروٹیں لینے لگی کہ کاش میرے بھی کسی مضمون سے مولانا کے دل پر ایسی ہی چوٹ لگتی اور وہ میرے لئے بھی ایسے ہی دو ایک کلمات لکھنے پر مجبور ہو جاتے جس سے اپنی جملہ غفلتوں اور گمراہی کے باوجود مجھے بخشش کا ایک سہارا مل جاتا لیکن سہ

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہاں تو میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ اخبار حقیقت کے ادارہ تحریر میں شامل ہونے کے بعد بھی ایک عرصہ تک مولانا کی زیارت سے محروم رہا اب ان کی غائبانہ ملاقات کے سلسلے میں ایک لطیفہ سنتے چلیے حقیقت کی جو دن میں تین مرتبہ ڈاک آتی تھی اتفاق سے اسے میں ہی کھولتا تھا اور جو خطوط ایڈیٹر سے متعلق ہوتے تھے وہ ایڈیٹر صاحب کے سامنے رکھ دیتا تھا۔ مجھے اخبار میں آئے ہوئے ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک دن ایک کارڈ عجیب و غریب قسم کا موصول ہوا اس کارڈ کی پیشانی پر جلی حروف میں ہفتہ وار سچ لکھا ہوا پتہ تو چھپا تھا مگر بقیہ کارڈ سادہ تھا۔ پتہ کی جگہ جلی روشنائی سے کسی نے دو سطروں میں تلے اوپر کچھ نکتے بنا دئیے تھے اور جس طرف مضمون لکھا جاتا ہے اس پر بھی تلے اوپر دو سطروں میں کچھ نکتے تھے اور اس کے نیچے بہت سے نکتوں کے جھرمٹ میں ایک نہایت منحنی سا نشان تھا۔ میں نے اس کارڈ کو یہ سمجھ کر کہ یہ کسی بچے کے ہاتھ اخبار سچ کا سادہ کارڈ پڑ گیا ہے اور اس نے قلم سے ادھر ادھر نکتے بنا کر اسے بیرنگ ڈاک کر دیا ہے۔ چنانچہ جب میں نے ایڈیٹر صاحب کو خطوط پیش کیے تو اس کارڈ کو علیحدہ کر لیا۔ ایڈیٹر صاحب نے مجھے اس کارڈ کو علیحدہ کرتے دیکھ لیا اور پوچھا کہ اس میں

لکھا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ کارڈ یوں ہی کسی بچہ نے لکھ کر پوسٹ بکس میں ڈال دیا ہوگا کیوں کہ اس پر کچھ نہیں لکھا اور یہ کہہ کر جو میں نے انھیں دیا تو بولے "آئین! مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا خط ہے" میں نے مگر اس میں مولانا نے کچھ لکھا تو ہے نہیں، اس پر لکیروں کی طرف اشارہ کرکے بولے یہ کیا لکھا ہے اور اس طرح اس کی عبارت پڑھ دی جس طرح کوئی یاد کیا ہوا پہاڑا دُہراتا ہے میں نے ایڈیٹر صاحب سے وہ خط لیا اور اس کے بعد کافی دیر تک اس پر مسمریزم کی مشق کرتا رہا مگر پھر سمجھ میں نہ آیا کہ انھوں نے جو عبارت [illegible] پڑھ کر سنائی تھی وہ اس [illegible] میں کس جگہ چھپی [illegible] کے الفاظ جہاں لکھے تھے اس [illegible] لکیروں کے ایک ہی [illegible] معلوم ہوتے تھے میں نے دسویں جماعت تک خوشخط پڑھنے کی مشق کی تھی اور [illegible] گھسیٹ سے گھسیٹ تحریر پڑھ لیتا تھا مگر اس قسم کی گھسیٹ [illegible] سے کبھی نہیں پڑا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے سر سے ایک بال توڑ کر کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ [illegible] اس خط کو پڑھنے کے بعد مجھے مولانا کی [illegible] کا اندازہ ہوا تھا۔ بہرحال اس کا [illegible] کر میں بعض اپنے دوست احباب کو پہیلیاں بجھوا [illegible] کہ اس تحریر کی نوک پلک [illegible] اور وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو مولانا کے سامنے زانوئے ادب تہ کر چکے ہوں۔ اور مولانا کے اشاروں کنایوں سے واقف ہوں۔ البتہ میرے دوستوں میں ایک صاحب نے جو واقعتاً بہت پڑھے لکھے تھے۔ مولانا کی تحریر دیکھ کر بتایا کہ یہ کسی بڑے عالم کی تحریر ہے اور اس کے بعد کہا کہ دنیا میں جو چند مشہور فلسفی اور عالم گزرے ہیں ان کا خط بھی اسی قسم کا تھا۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے نپولین، جانسن اور شیکسپیئر کے نام لئے اور کہا کہ ممکن ہے بڑے بڑے نبیوں اور پیغمبروں کی تحریریں بھی ایسی ہی ہوتی ہوں کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق اردو میں ایک مثل چلی آتی ہے کہ "لکھیں موسیٰ پڑھیں خدا" اسی سلسلہ کی ایک کڑی علامہ اختر تلہری ہیں جو اس دور میں عربی، فارسی اور اردو کے ایک متبحر عالم ہیں ان کا خط بھی اگرچہ [illegible] مولانا عبدالماجد صاحب کے خط کے مقابلہ میں قطب مینار لگتا ہے مگر اس کے بعض دائرے چغتائی آرٹ کو [illegible] گردن جھکا لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ علامہ اختر تلہری کے بعد ایک بزرگ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں مرحوم بھی گزرے ہیں جن کا خط دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی بچے نے سادہ کاغذ پر کیڑے مکوڑے بنا کر کاغذ کی سادگی سے شدید انتقام لیا ہے۔

مولانا سے میری پہلی غائبانہ ملاقات کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں اخبار حقیقت میں "کھٹ مٹھے" کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتا تھا۔ اس زمانہ میں مسلم لیگ اور کانگریس کی آویزش اپنے معراج کمال پر تھی اور لکھنؤ میں مسلم لیگ کا بڑا زور تھا۔ سویرے سے شام تک جگہ جگہ مسلم لیگ کے جلسے ہوتے رہتے تھے اور ان میں جاہل مسلمان تک بے تکے نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے رہتے تھے۔ میں ایک دن بحیثیت رپورٹر مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں شریک ہو گیا جس میں عجیب عجیب موقعوں پر بہت سے جاہل نعرہ ہائے تکبیر بلند کر رہے تھے مثلاً مقرر کی زبان سے نکلا کہ "دھوتی اور پیجامہ میں بڑا فرق ہے" آواز آئی نعرہ تکبیر۔ کسی نے کہا کہ "مسلمان گوشت کھاتا ہے، ٹوپی پہنتا ہے۔ اردو زبان بولتا ہے۔" پورے جلسے نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا نعرۂ تکبیر۔ چنانچہ اس دن "[illegible] حقیقت" کا مزاحیہ کالم اسی موضوع پر لکھا۔ اور

شروع میں اس نعرے کے تقدس پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ یہ نعرہ مجاہدین اسلام کن کن موقعوں پر لگاتے تھے۔ اور مسلمانوں میں اس نعرہ کی کیا اہمیت تھی۔ اس کے بعد اس جلسہ کا نقشہ کھینچا جہاں اس نعرے کو ... تک طریقہ پر استعمال کیا جاتا تھا جب یہ پرچہ شائع ہو گیا تو اس کے چوتھے روز مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے انیس احمد صاحب عباسی ایڈیٹر حقیقت کو خط لکھا کہ نعرہائے تکبیر پر لکھنؤ گلفروش میں جو مزاحیہ کالم لکھا گیا ہے اس میں اگرچہ اسکے تقدس کا اگرچہ خیال رکھا گیا ہے مگر پھر بھی اسے پڑھ کر نعرہ کے تقدس پر قدرے حرف آتا ہے اور اس کی تذلیل کا پہلو نکلتا ہے لہٰذا اس موضوع پر لکھنے میں کافی احتیاط کی ضرورت تھی۔ مولانا کے ارشاد گرامی کو سن کر میں نے چاہا کہ میں مولانا سے بالمشافہ مل کر معذرت کر لوں اور اگر آئندہ کوئی ایسا جلسہ ہو تو اس میں مولانا کو ساتھ لیکر صورت حال کا مشاہدہ کرا دوں۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں امین الدولہ پارک میں مسلمانوں کی طرف سے اردو کے سلسلہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں تمام مسلمان جماعتوں کے لیڈر شریک تھے۔ چنانچہ چودھری خلیق الزماں۔ راجہ صاحب محمود آباد۔ مولوی مستنصر اللہ۔ خلافت والے سید ذاکر علی صاحب مرحوم وغیرہ اور شیعوں کی طرف سے بشیر رضوی صاحب وکیل جو مقامی شیعہ لیڈروں میں ایک نہایت پرجوش مقرر اور اردو زبان کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ شریک تھے۔ اس جلسہ میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو بھی دعوتِ خصوصی دی گئی تھی۔

اس لئے میں نے اس جلسہ میں شریک ہونے خصوصیت سے پہونچ گیا اور ڈائس پر پہلے سے جا کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد ڈائس پر تمام لیڈر پہونچ گئے۔ جس میں مولانا بھی شریک تھے۔ چونکہ میں مولانا کو اس وقت تک نہیں پہچانتا تھا اس لئے میں نے مولانا کی آمد کے بارے میں دریافت کیا تو ایک صاحب نے اشارے سے بتایا کہ وہ بیٹھے ہیں۔ میں اٹھ کر ان کے پیچھے بیٹھ گیا۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا اس کے بعد اردو زبان زندہ باد! انقلاب زندہ باد! نعرۂ تکبیر بلند ہوئے۔ اور تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا اس میں جب بشیر رضوی نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی اور اردو زبان میں جو دنیا کی مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں ان کی ایک فہرست پیش کرتے ہوئے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو ہی دنیا کی وہ واحد زبان ہے جس سے دنیا کی ساری زبانیں نکلتی ہیں تو رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے مختلف لیڈران وہاں سے اٹھنا شروع ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد صرف چند لیڈر ڈائس پر رہ گئے۔ بشیر رضوی صاحب کی تقریر کا سلسلہ تقریباً دو گھنٹے جاری رہا اور سارا جلسہ اسوقت ہکا بکا ہو کر رہ گیا جب انھوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ کہنا شروع کیا کہ "آج دنیا بھر میں جتنی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں یقین مانئے وہ سب ہماری اردو ہی سے نکلی ہیں چنانچہ جس زبان نے ہم سے جن الفاظ کی بھیک مانگی ہم نے اسے مایوس نہیں ہونے دیا۔ اطالوی زباں کو "کمرہ" کی ضرورت پڑی۔ ہم نے کمرہ دیا۔ لاطینی زبان کو "پادری" کی ضرورت پڑی ہم نے "پادری" نذر کیا۔ انگریزی زبان کو پینشن۔ بٹن۔ بوتل۔ الیکشن۔ ٹکٹ۔ ریل اور پولیس کی حاجت ہوئی ہم نے اسے شرمندہ نہ ہونے دیا۔ پرتگالیوں کو آٹے کی ضرورت ہوئی ہم نے آٹا دیا۔ جسے اُس نے اٹ بنا لیا پھر اسے "جوبن" کی ضرورت پڑی ہم نے اپنا جوبن جوں کا توں اسے پیش کر دیا۔ ہم نے پرتگالیوں کو نیلام کا لفظ دیا پنجابی کو چنگے کا لفظ دیا۔ فرانسیسی زبان نے جو تام مانگا۔ ہم نے جو تام بنا کر دیدیا۔ جسے اس نے بوتال کر بنالیا۔

نے انگشت طلب کی ہم نے اپنی انگشت اُسے پیش کر دی جسے اس نے انگشت بنا لیا۔ ترکی کو چق کی ضرورت پڑی ہم نے

اس کی پردہ پوشی کے لئے اسے چق کا ہیچ عنایت کر دی۔ ویوں کو ساقی۔ شمع۔ محتسب۔ واعظ غرض جو ضرورتیں پیش آئیں ہم پیش کرتے گئے۔ فارسی زبان کو مرغ کی ضرورت تھی ہم نے اپنا مرغ نذر کر دیا۔ اسے اردو کی مشاطہ پسند آئی، ہم نے مشاطہ کو ان کی آرائش اور زیبائش کے لئے بھیج دیا۔ بشیر رضوی صاحب کی تقریر جس وقت ہو رہی تھی اس درمیان میں غالباً مولانا یہ سوچ کر جلسہ سے اٹھ گئے کہ اس لئے ہمارا اردو زبان کی حمایت میں دوسروں کے پاس بیٹھے ... دی کہا جاتا ہے۔ اور جاتے وقت مولانا کو اس درجہ ... نہیں دیکھ سکا کہ میرا منہ کھلا ہوا تھا اور میں رضوی صاحب کی حالت پر عش عش کر رہا تھا۔ بہر صورت اس جلسہ میں جو نعرے لگ رہے تھے وہ کچھ انداز کے تھے کہ بشیر رضوی صاحب نے جب یہ کہا کہ "ہم نے دنیا کی زبانوں کے پیٹ بھرے ہیں"۔ جلسہ سے آواز آئی نعرۂ تکبیر۔ انھوں نے کہا "ہم کو غدار محض اور ملک و قوم کا دشمن سمجھا جاتا ہے"۔

جلسہ سے آوازیں بلند ہوئیں: "اللہ اکبر" غرض اس طرح اس روز میں مولانا سے روشناس تو ہو گیا مگر بالمشافہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔

اس طویل تمہید سے مجھے کچھ یہ اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں اتنا پڑھنے کے بعد آپ اکتا کر مجھے بور نہ سمجھنے لگیں ہوں اس لئے ایک دلچسپ واقعہ جو اگرچہ مولانا کی خالص گھریلو زندگی سے متعلق ہے سناتا ہوں۔ اس سے آپ کو اول تو اس کا اندازہ ہوگا کہ مولانا کس درجہ شرع اور احکام الٰہی کے پابند ہیں دوسرے نیشنل انٹگریشن، میل جول، اتحاد و اتفاق اور یکجہتی جس پر آج ہماری حکومت کی طرف اتنا زور دیا جا رہا ہے کہ لوگ اس سے اکتا کر نفرت کرنے لگے ہیں کیونکہ یہ نعرے آج کل صرف حلق سے زبان تک محدود ہیں اور ان کا دل اور عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر یہی میل جول اور اتحاد و اتفاق مولانا کی خانگی اور سنجی زندگی میں

اس درجہ رچا بسا ہے کہ شاید ہی سننے والوں کو یقین آئے مگر چونکہ میں ذاتی طور پر اس حقیقت سے واقف ہوں اس لئے آپ کے گوش گذار کئے دیتا ہوں۔ اس دور کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ آج اس اتحاد کے علمبردار کو فرقہ پرست کہا جاتا ہے ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اب اس دلچسپ واقعہ کو ذرا غور سے سنئے۔ مولانا عبدالماجد صاحب کے ایک بڑے بھائی عبدالمجید صاحب تھے جو پہلے ڈپٹی کلکٹر تھے بعد میں سٹی مجسٹریٹ ہو کر ریٹائر ہونے کے بعد تمام تو منزل میں جہاں مولانا کے دوسرے اعزا کی ایک زمانہ سے سکونت ہے اسی کے پاس ایک بنگلہ میں رہنے لگے۔ مولانا کے بڑے بھائی یعنی ڈپٹی عبدالمجید صاحب مرحوم اور مولانا ایک روح اور دو قالب کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس دور ابتلا میں کبھی کوئی ایسی تلخی نہ پیدا ہوئی بھائیوں کے درمیان۔ گوشت کو ناخون سے جدا کرسکتی۔ درحقیقت اتحاد و اتفاق، میل جول کیسی کا درس اگر کسی کو لینا ہو تو مولانا کی خانگی زندگی سے حاصل کرے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی صاحب اور مولانا عبدالماجد میں حکم خداوندی کے تحت عالم ارواح میں ایک عجیب قسم کا معاہدہ ہوا تھا اور وہ یہ کہ بڑے بھائی یعنی ڈپٹی صاحب کے یہاں چار لڑکے اور ایک لڑکی ہوگی۔ اس کے جواب میں مولانا کے یہاں صرف چار لڑکیاں اس ترتیب سے ہوں گی کہ بڑے بھائی کے ہر لڑکے کی عمر جب دو سال ہو جائے گی تو چھوٹے بھائی کے یہاں ایک لڑکی ہوگی تاکہ بڑے بھائی کے چاروں لڑکوں سے چھوٹے بھائی کی لڑکیوں کا رشتۂ شرعی ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بڑے بھائی کے چاروں لڑکوں کی شادی مولانا کی چاروں لڑکیوں سے ہوئی اور خلوص کی

بھی خالص شریعت محمدی کی روشنی میں عورتوں میں ایک مثل مشہور ہے کہ خدا بھوکا اٹھاتا ہے بھوکا سلاتا نہیں مگر جس طرح چاروں شادیاں ہوئیں انھیں دیکھ کر اب یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ خدا کنوارہ اٹھاتا ہے اور کنوارہ سلاتا نہیں یہ شادیاں جس دلچسپ انداز میں ہوئیں ان میں سے ایک کا علم تو مجھے بھی ہے۔ اور یہ شادی مولانا کے بھتیجے مسٹر حبیب احمد قدوائی کی تھی۔ مولانا کے چاروں بھتیجوں سے میرے دوستانہ و عزیزانہ تعلقات ہیں۔ حکیم عبدالقوی صاحب بی۔ اے۔ صدق جدید کے منیجر سب سے بڑے ہیں اور ایک مشہور صحافی ہیں۔ منجھلے صاحبزادے مسٹر حبیب احمد قدوائی جو کم و بیش میرے ہم عمر ہیں اور یوپی سکریٹریٹ میں ملازم ہیں ان سے چھوٹے ہاشم قدوائی مسلم یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے شعبہ میں ریڈر ہیں اور سب سے چھوٹے علیم قدوائی بھی ایک اچھے سرکاری عہدہ پر کانپور میں ملازم ہیں۔ جس دن حبیب احمد قدوائی صاحب کی شادی ہوئی اس دن عصر کے وقت تک وہ بالکل کنوارے تھے اور حسب دستور امین آباد میں دوستوں سے ملنے گئے ہوئے تھے ان کو اس وقت تک اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان کی شادی ہونے والی ہے مگر گھر پہنچنے کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ عام شادی شدہ انسانوں کی طرح شادی شدہ تھے ہوا یہ کہ جس وقت حبیب امین آباد گئے ہوئے تھے کہ اتنے میں موذن نے عصر کی اذان دی۔ اور مولانا دریاباد سے غالباً دن دوپہر کے لیے آئے تھے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے اور واپسی پر ڈپٹی صاحب سے گفتگو ہوئی کہ اب حبیب میاں کی شادی کیوں نہ کر دی جائے جب کہ وہ ماشاء اللہ سے ایک مستقل سرکاری ملازم ہیں۔

اتنے میں ملازم کو آواز دی گئی۔ قادر یا قادر دست بستہ حاضر ہو گیا۔ ایک آدمی حبیب میاں کی تلاش میں امین آباد گیا دوسرا چار بند ٹھیال بازار سے لے کر حاضر ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں حبیب میاں پکڑ کر پہنچ گئے۔ زنان خانہ میں منجھلی لڑکی کو نئے کپڑے پہنا کر دلہن بنا دیا گیا۔ باہر حبیب میاں نوشہ بنے مولانا نے خود ہی خطبہ نکاح لکھ کر پڑھ دیا۔ گھر کے دو دو لوگ جمع ہوئے پھر شرع محمدی مقرر ہو چکا تھا اور ایجاب و قبول کے بعد ڈپٹی صاحب زادے ایک گھنٹہ قبل تک تحت اللفظ کنوارے تھے [illegible] کی شکل میں کھڑے سہرا کیا نظر آئے۔ نہ ڈھول نہ ڈھولک نہ پوپوں نہ شادیانے نہ پھیری نہ باجا نہ گانا۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ نکاح اور رخصتی ایک ساتھ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ شادی کیا ہے

جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا

حبیب جب دوسرے دن شام کو ملے تو نئی شیروانی پہنے ہوئے تھے میں نے کہا آج بہت خوش خوش نظر آرہے ہو۔ بولے میری شادی ہوگئی۔ میں نے کہا کب؟

بولے کل عصر اور مغرب کے درمیان۔

میں نے کہا۔ مبارک دلہن کے قدم آئیں۔ بہر صورت۔

عذاب و ثواب بہ گردن راوی کیوں کہ راقم الحروف اس دفع پر شریک نہ تھا۔

مولانا سے بالمشافہ میری ملاقات اس وقت ہوئی جب ۴۳ء کے اوائل میں میں نے اپنی کتاب "مدادا" پر ان سے مقدمہ لکھوانے کی خواہش ظاہر کی جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ جس وقت میں ان سے ملا ہوں اس وقت وہ لکھنؤ چھوڑ کر دریاباد میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر چکے تھے وہاں پابندی صبح کو وہ لکھنؤ آتے اور شام ہی کو یا دوسرے روز صبح واپس چلے جاتے اور تا ایندم یہ سلسلے جاری تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کو نہایت سادے لباس میں دیکھا۔ جو لوگ مولانا سے کبھی نہیں ملے ہیں اگر وہ ان سے پہلی بار ملیں تو وہ ان کی وضع قطع سے اس کا اندازہ نہیں کر سکیں گے کہ وہ انگریزی

عربی، فلسفہ اور اردو کے اتنے بڑے عالم سے مل رہے ہیں جسے ایک ایسے ملک میں پیدا کر دیا گیا جس کی وسعت اس کی علمی وسعت کی ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ورنہ اگر کسی مغربی ملک میں پیدا ہوتے تو نہ جانے ان کے لئے دنیا کی کتنی آسائش فراہم ہوتی۔ اور قدم قدم پر ان کے لئے دنیا کے کتنے بڑے بڑے عالم پلکیں بچھاتے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں جب بھی ان سے ملا مجھے اپنے بزرگوں کی محبت و شفقت یاد آگئی۔ انھوں نے میری کتاب پر جو مقدمہ لکھا ہے اس نے مجھے اس مرتبہ پر پہونچا دیا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

چلتے چلاتے چپکے سے دو باتیں مولانا کے متعلق اور گوش گزار کرتا چلوں۔ اول یہ کہ تنقید کے معاملہ میں وہ محمود و ایاز اور چھوٹے بڑے کی تحقیق نہیں کرتے۔ وہ چاہے ڈاکٹر سمپورنانند آنجہانی گورنر راجستھان ہوں یا ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند مرحوم جو مولانا کا بہت ہی احترام کرتے تھے، بلکہ ڈاکٹر سمپورنانند کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی مولانا راجستھان گئے انھوں نے مولانا کو اپنا مہمانِ خصوصی بنا کر ان کی حد درجہ خاطر و مدارات کی اور ان کو اپنے سلون پر بھی [illegible] مگر ان کی پالیسی اور نظریات پر تنقید کرنے میں انھوں نے کبھی سے کوئی تنقید کرنے میں کبھی جھجھک محسوس نہیں کی۔ اسی طرح پروفیسر رشید احمد صدیقی اور سید علی عباس حسینی مرحوم اور ان کے دوستوں اور حد درجہ عقیدت مندوں میں تھے۔ ان کی کتابوں پر بھی مولانا نے سخت سے سخت تبصرے کئے۔ دوسری بات یہ کہ مولانا رعایت لفظی اور ضلع جگت کے ماہر ہیں۔ لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں ایک زمانہ میں ضلع جگت میں شمس العلماء حکیم شمس الدین، نواب حامد حسین، مولانا صبغت اللہ فرنگی محلی مرحوم کا نام سرفہرست تھا۔ جن میں مولانا کو سب پر سبقت حاصل تھی۔

میں نے مولانا کی تقریباً وہ تمام تحریریں پڑھی ہیں جو کتابی شکل میں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا کی زبان اور ان کا لب و لہجہ نہ جانے کس ٹکسال میں پروان چڑھا ہے کہ ادق سے ادق موضوعات پر بھی جب وہ قلم اٹھاتے ہیں تو زبان کی چاشنی اور لہجہ کی شگفتگی میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آنے پاتا۔ یقین مانئے کہ ان کے طنزیہ مضامین پڑھ کر میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں طنز کے ابعاد سے بھی واقف نہیں ہوں۔ وہ ایک معمولی سے فقرہ میں طنز کی کائنات سمو دینے کے گر سے واقف ہیں۔ علم و ادب کے اس کوہِ گراں کا سایہ خدا کرے ہمیشہ تشنگانِ ادب پر قائم رہے۔

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

محمد شرف الدین ساحل (ناگ پور)

ایک خط — ایک مُلاقات

طالب علمی کا زمانہ بڑا ہی پر آشوب زمانہ ہوتا ہے اس دور میں طلباء کی زندگی کئی متضاد نظریات کا گہوارہ بن جاتی ہے مگر میں نے ایسے خاندان اور ماحول میں آنکھیں کھولیں جو اپنے اندر خالص ادبی و مذہبی مذاق رکھتا تھا۔ کیونکہ شخصیت و ذوق کی تعمیر اور تخریب کا انحصار ماحول پر ہے۔ لہٰذا میرا رجحان بھی اسی طرف گیا جس طرف میرے خاندان اور میرے دوستوں کا تھا اسی طرح مختلف نظریات کا شکار ہونے کے بجائے میں نے اپنے لئے ایک مخصوص راہ متعین کر لی۔

بہت کم عمری ہی سے ایسی ایسی کتابیں میرے زیر مطالعہ رہیں کہ آج جب میں حال کے پردے سے ماضی کے ان حالات پر بغور نظر کرتا ہوں تو ششدر و حیران رہ جاتا ہوں۔ میں نے ان ایام میں دیگر مذہبی و دینی کتب کے ساتھ ساتھ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ اور حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی جس قدر بھی تصانیف تھیں یکے بعد دیگرے کچھ اس طرح پڑھیں کہ ان کا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں منقش ہوکر رہ گیا اور اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصیتوں کا میں کہاں تک معتقد ہوں گا۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

بڑی خوشی کی بات ہے کہ "مجلہ فروغ اُردو" کے منتظمین حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادبی و مذہبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے شایان شان ایک نمبر نکال رہے ہیں۔ میں انھیں اپنے دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ حالانکہ یہ کام تو بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا۔

جس وقت میں نے یہ اعلان پڑھا تو میرے روح و بدن میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سوچا کہ حضرت پر کیا لکھوں۔ کئی روز اسی کشمکش میں گذر گئے کیونکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو موصوف کے بارے میں براہ راست بہت کم معلومات رکھتے ہیں مزید برآں مجھ جیسے کم فہم انسان کا مولانا کے سوانح اور خدمات پر خامہ فرسائی کرنا دراصل ایک نازک

اور مشکل ترین مرحلہ بھی تھا۔ لیکن پھر بھی طبیعت نہ مانی اور ضمیر چلا اُٹھا۔ "کچھ تو لکھ کر" فدائیانِ ماجد" میں تو بھی اپنا نام لکھوالے۔"

آج تک مجھ سے حضرت مولانا مرحوم سے ایک بار خط و کتابت ہوئی اور ایک مرتبہ ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا جبکہ موصوف مشکلات قرآن پر لکچر دینے کے لئے مدراس تشریف لے جاتے ہوئے ناگپور ریلوے اسٹیشن سے گزر رہے تھے۔ فوراً خیال آیا کہ کیوں نہ انھیں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر ناظرین کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کر دوں۔ خط ایک ادبی استفسار سے رکھتا ہے۔ لہٰذا میں پہلے اپنے خط کا ایک مخصوص اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں۔ تاکہ جواب سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضرۃ المکرم مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۶ء

السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آج تک سنتے آئے ہیں کہ حافظ شیرازی کے دیوان کا پہلا مطلع ہے

(۱) اَلاَ یا اَیُّھا السّاقی اَدِر کاساً و ناوِلھا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

یزید ابن معاویہ کے اس شعر سے استفادہ ہے

(۲) اَنَا المَسْمُومُ مَا عِندی بِتریاقٍ ولاَ رَاقِی
اَدِر کاساً وناوِلھَا اَلاَ یا اَیُّھا السّاقِی

حضرت مولانا ابو الحسن ناطق گلاؤ ٹھوی مرحوم کی تصنیف "سبع سیارہ" میں ایسا نظر آیا کہ اس میں استفادہ نہیں بلکہ حافظ نے یزید کے شعر پر اصلاح دیکر اس میں جو معائب تھے اُنھیں دُور کر دیا ہے۔

اور شعر کو جو معمولی تھا۔ بہت بلند کر دیا ہے اس کے متعلق اگر از راہِ کرم آپ اپنی وقیع رائے سے مستفیض فرمائیں گے تو موجب طمانیت ہوگا۔ میں نے اپنی محدود اور ناقص عقل سے دونوں اشعار کا جو مطلب سمجھا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اور اس میں کسی طرح کی غلطی پاکوتاہی ہو تو مہربانی فرماکر اس کی بھی تصحیح فرما دیں۔

۱۔ اے ساقی تو کہاں ہے اپنا جام بھر اور اس کو گردش میں لا کیونکہ عشق جس کو میں پہلے آسان سمجھا تھا اب اس نے مجھ کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

۲۔ "شاعر" ایک ایسا زہر خوردہ شخص ہے نہ جس کے پاس تریاق ہے اور نہ جھاڑنے والا۔ تو کہاں ہے اے ساقی تو ذرا اپنا جام بھر اور اس کو گردش میں لا۔ (یعنی شراب نوشی سے کچھ فائدہ پہنچے)

میں اپنے قلب کی گہرائیوں سے آپ کی صحت و تندرستی کے لئے دعا کرتا ہوں اور یہ بھی اُمید ہے کہ آپ کی دعائیں ہمیشہ میرے ہمراہ رہیں گی۔

اُمیدوارِ کرم سائل

الجواب: بسم اللہ

مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۶ء صدق جدید دریاباد لکھنؤ یوپی

مکرم بندہ۔ وعلیکم السلام

اب اس طرح کے اشعار پر غور و خوض، موازنہ و محاکمہ کا وقت کہاں سے لایا جائے۔ میری فہم ناقص میں یزید کا شعر بھی بُرا نہیں۔ حافظ نے اسے لطیف تر اور زیادہ شاعرانہ بنا دیا ہے۔ آپ نے دونوں شعروں کا مطلب

صحیح لکھا ہے۔

والسلام۔ دعاگو

عبدالماجد

یہ تو رہا خط اب ملاقات کے تاثرات دیکھئے:۔

دو شنبہ کا دن اور جولائی کی ۱۲ تاریخ تھی۔
میں اپنے معزز دوست محفوظ الرحمان انصاری سے ملاقات کی غرض سے ان کے آفس پہنچا۔۔۔۔۔ دیکھ کر مسکرا دیئے ۔۔۔۔۔ میرے دل میں مولانا کے لئے جو عقیدت و محبت تھی وہ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔۔۔۔۔ کہنے لگے مبارک ہو۔۔۔۔۔ میں نے کہا کیا۔۔۔۔۔ فرمایا کل ہی حکیم عبدالقوی دریابادی صاحب کا خط آیا ہے۔۔۔۔ تو پڑھ لو لکھا تھا۔۔۔۔ (۲۰ جولائی ۱۹۷۱ء بروز اتوار ساڑھے چار بجے حضرت ماجد صاحب دکھن ایکسپریس سے ناگپور اسٹیشن سے گزر رہے ہیں) یہ خبر پڑھتے ہی میرے خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جوں جوں وقت قریب ہوتا گیا ایک نئی اُمنگ و حوصلہ میرے دل میں پیدا ہوتا رہا۔۔۔۔۔۔ آخر وہ گھڑی آہی گئی جس کا میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔۔۔۔۔ وقت سے آدھ گھنٹہ پیشتر اسٹیشن پہنچا۔۔۔۔۔ دیکھا تو بیسوں افراد مولانا سے ملنے کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ پلیٹ فارم پر ایک جانب گاڑی کے منتظر کھڑے ہیں اور حسرت بھری نگاہوں سے جن میں خوشی و انبساط کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اسی جانب دیکھ رہے ہیں جس طرف سے گاڑی آتی ہے۔ میں بھی اُن کے ہمراہ ہو گیا۔۔۔۔۔ ناگپور کے اطراف و جوانب سے بھی لوگ حضرت مولانا کے دیدار کیلئے آئے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ آئے نہیں تھے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مولانا کی عقیدت انھیں کھینچ لائی تھی۔۔۔۔ گاڑی وقت مقررہ پر پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوئی۔ حکیم عبدالقوی دریابادی پہلے ہی سے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ لوگ اُنھیں دیکھ کر تیزی سے اسی طرف دوڑے۔۔ ۔۔۔ چند ہی لمحوں میں ایک خندہ رو اور روشن و چمکدار چہرہ کمپارٹمنٹ سے نمودار ہوا۔۔۔۔ یہی حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی تھے۔ لوگوں نے آہستگی سے حضرت کو نیچے اُتارا نحیف و ناتواں جسم مقطع ریش۔ لبوں پر مہر خاموشی ثبت کرتہ اور واسکٹ زیب تن آزار پاجامہ اور سر پر کھدر کی ٹوپی تھی۔ آہ کتنا سادہ لباس تھا۔ جس سے عظمت اسلامی ٹپک رہی تھی تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر منشا الرحمان خاں منشاؔ نے میرا بھی تعارف کرایا۔ تعارف و مصافحہ کے بعد ایک حلقہ بنا کر لوگ مولانا کے اردگرد کھڑے ہوگئے۔ مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی اور مجمع بھی بڑھتا رہا۔ ناگپور ریلوے اسٹیشن پر گاڑی بیس منٹ سے زائد وقفہ تک قیام کرتی ہے لہٰذا گفتگو کا سلسلہ بھی اچھا خاصہ جاری رہا۔ لوگ اپنی اپنی سناتے رہے مگر مولانا ہیں کہ خاموشی سے ہر ایک کی باتیں سنتے اور "ہاں اور نہیں" کے علاوہ کچھ نہ فرماتے۔ کسی بات پر بھی کبھی کبھی ہلکی سی مسکراہٹ چہرہ پر نمودار ہوتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ شاید کم گوئی مولانا کی صفت تھی اور ایسا ہو بھی کیوں نہ۔۔۔۔۔۔ کیونکہ حقیقت

...ہے

"جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے"

...نے مولانا سے مدراس سے واپسی پر ناگپور رکنے ...اصرار کیا۔ مگر وہی خاموشی ...ہاں اس میں ...انکار کی کشمکش ضرور تھی۔ آخر حکیم عبدالقوی ...صاحب نے معذرت چاہی ..... سگنل ہو چکا تھا۔ ...مولانا پھر اسی گاڑی پر سوار ہولئے اور دروازے ...قریب ہی کھڑکی کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔ گاڑی ...سیٹی بجائی اور آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑنے ...میں نے لپک کر مولانا سے آخری مصافحہ اور سلام کیا۔ حضرت مسکرا دیے۔ میرا سر ادب سے خم اور ...آنکھیں اشکبار ہوگئیں ...... سر اٹھایا تو گاڑی کو ...پوری رفتار سے جاتے ہوئے پایا ... جدائی کے ...لمحات مجھ پر یاس و حسرت اور جمود طاری ہو چکا ...تھا۔ کچھ دیر تک پلیٹ فارم پر جاتی گاڑی کو دیکھتا رہا، اور میری زبان پر بے ساختہ یہ ...کلمات جاری ہوگئے ۔

ہند کے مرد مجاہد تری عظمت کو سلام

تیرے الطاف و عنایات و محبت کو سلام

...اس سے زیادہ اور کیا تحریر کروں۔ بقول ناطق ...گلاؤٹھوی ؎

خود میری حسرت اظہار سخن کوش نہیں

گفتگو ورنہ اسے ... خاموش نہیں!

مولانا محترم سے میری زندگی کا یہ ایک یادگار ملاقات تھی جس نے میرے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا۔

مولانا دریابادی، ایک صداقت نگار قلم

(از ضیا ہانی صاحب)

باقی مضمون صفحہ ۲۹۰

کتنی سچی اور پتے کی بات مولانا نے بیان فرمائی ہے حقیقتاً اس کفر و الحاد کے دور میں سچ اور صدق کا مقصد وجود ہی خود مولانا کے الفاظ میں شیطانی قوتوں کی بیخ کنی اور دجالی مرعوبیت کو دلوں سے دور کرنا ہے۔

مولانا کی طرز تحریر سے متاثر ہوکر کسی نقاد نے بالکل سچ کہا ہے کہ مولانا "طنز نگاری" کے شاہنشاہ ہیں میں اس آیۃ کریمہ کا اطلاق مولانا کی ذات ستودہ صفات پر ہوتا ہے۔ والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ھم المتقون ۵ "اور جو سچی بات لایا اور جس نے اس کو سچ جانا وہی ہیں متقی "

ان کے احساس کمتری پر برہان قاطع ہے یعنی یہ کہ تجارت اخروی جو مسلمان کے نزدیک اسلام کے ساتھ مخصوص ہے ہر اچھے آدمی کا حق ہے "

" یہ سب بے شک و شبہ صحیح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اچھا آدمی کہتے کسے ہیں اور آدمی کی اچھائی کا معیار کیا ہے .... نیکی کا آخری معیار تو یہی ٹھہرے گا کہ وہ عمل اپنی صورت و روح دونوں لحاظ سے مرضی الٰہی کے مطابق ہو اور اسی کا نام اسلام ہے متفرق نیکیاں الگ الگ کر کے ایک غیر مسلم بھی پائی جاتی ہیں لیکن اخلاقی و روحانی خوبیوں کا جو مکمل و مرتب نظام ہے اس کا نام اسلام ہے اگر یہ عقیدہ نہ رہا تو پھر اسلام کی ضرورت ہی دنیا کو کیا رہ جاتی ہے۔"

مولوی حامد اللہ ندوی

مولانا عبدالماجد دریابادی

تصویر، شخصیت، عکس

دارالسلام، عمرآباد، جنوبی ہند کی ایک بڑی اہم عربی درس گاہ ہے، اس کی تعلیمی سرگرمیاں تو جو کچھ ہیں سو ہیں لیکن اس کی سماجی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی جنوبی کے اور عربی اداروں کے مقابلے میں زیادہ انفرادی اور نمایاں ہوتی ہیں نصاب تعلیم کے اعتبار سے، اساتذہ کے اعتبار سے، اور طلبہ میں پیدا ہونے والی صلاحیتوں کے اعتبار سے اس پر شمال کی گہری چھاپ ہے۔ شمالی ہند سے وقتاً فوقتاً جو بڑے عالم جنوبی ہند کے دورے پر نکلتے ہیں ان کا پہلا قدم یہیں پڑتا ہے اطرافِ ہند کے بڑے بڑے عالم بھی یہاں آتے اور قیام کرتے ہیں۔ کوئی عارضی طور پر، کوئی مستقل طور پر، دہلی، لکھنؤ اور بہار کے متعدد عالموں نے یہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی ہے، ان سب حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ادارہ کے طلبہ کو ہمیشہ ہی شمالی ہند کے کسی نہ کسی بڑے عالم کا تقرب حاصل رہتا ہے، مجھے بھی اپنی طالب علمی کے زمانہ میں شمال کے متعدد علماء و فضلاء کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، ان میں ایک مولانا ابوالجلال ندوی بھی تھے۔

مولانا ابوالجلال ندوی، دارالسلام کے بانی و مہتمم کی دعوت پر وہاں پہنچ آئے تھے اور ادارہ کی لائبریری میں ان کا قیام تھا، وہیں ایک کمرے میں تن و تنہا وہ دن رات مطالعہ کرتے اور زیادہ تر موضوعات پر لکھتے رہتے تھے۔ طلبہ انھیں اکثر اپنی انجمنوں اور مجلسوں میں کھینچ پکڑ لاتے تھے۔ وہ ایک جسیم شحیم، قد آور اور تنومند و بسیار شخص تھے، اکثر کرتے پاجامے میں ہوتے۔ کبھی شیروانی پہنی بھی تو بٹن لگانے کی نوبت نہ آتی، مطالعہ بہت وسیع تھا وہ ہر موضوع پر بولتے اور بے تکان بولتے تھے، ان کی خود فراموشی اور شانِ بے نیازی نے ان کی ظاہری اور باطنی شخصیت کو بڑا پرکشش بنا دیا تھا، ادارہ کے سب ہی طلبہ اور اساتذہ ان سے متاثر تھے اور جن کو

(و) کبھی مولانا عبدالماجد دریابادی سے شرف نیاز حاصل کرنے اور ان کی تحریروں سے مستفید ہونے کا موقع ملا تھا وہ اکثر مولانا ابوالجلال ندوی کے ساتھ مذاقاً بحثاً ان کا بھی ذکر کرتے اور اکثر کرتے رہتے تھے۔

میں مزاج کے اعتبار سے زیادہ میل جول والا نہ تھا، کم سخنی اور دیرآمیزی میری فطرت میں شامل تھی، لیکن مولانا ابوالجلال ندوی سے بہت جلد مانوس ہو گیا۔ اپنی فرصت کے اوقات میں اکثر ان کے پاس جاکر بیٹھ رہتا اور ان کی باتیں شوق سے سنا کرتا۔ مجھے مطالعہ کا بھی بے حد شوق تھا۔ اس سلسلہ میں بھی ان کی رہنمائی مجھے حاصل تھی اس طرح مولانا ابوالجلال ندوی سے قریب ہو جانے اور ان کے نام کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام بار بار سننے کی وجہ سے میرے دل میں بھی مولانا دریابادی کے لئے ان دیکھی عقیدت سی پیدا ہو گئی۔ میں نے اپنے ذہن میں مولانا دریابادی کی ایک خیالی تصویر بنا لی، جو مولانا ابوالجلال ندوی کی شخصیت سے ملتی جلتی تھی۔

(٣)

اے خالقِ ہر بلندی و پستی
شش چیز عطا بکن ز ہستی
ایمان و امان و تندرستی
علم و عمل و فراخ دستی

پتہ نہیں کیسے یہ دو شعر بچپن ہی سے میری دعاؤں کا ایک حصہ رہے ہیں، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان دو شعروں میں جن نعمتوں کا ذکر ہے وہ مجھے واقعی مل بھی گئیں۔ البتہ علم کے مقابلہ میں ہمیشہ خوش قسمت رہا۔ میرے لئے اس راہ کی ہر رکاوٹ جلد یا بدیر دور ہو گئی اور پھر قدم سے چشمے پھوٹ نکلے۔

جب میں دارالسلام میں تھا تو لفظ ندوی میں بڑی کشش محسوس کرتا تھا اور یہ میری بڑی تمنا رہی کہ میں کسی نہ کسی صورت سے لکھنؤ پہنچوں اور ندوہ سے اپنی باقی تعلیم مکمل کر کے ندوی کہلاؤں، اس وقت جنوبی ہند کے طلبہ کا شمالی ہند جانا اور ندوہ، دیوبند، جامعہ یا علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرنا انگلینڈ جانے سے کم نہ تھا اور بہت کم طلبہ کو یہ سعادت نصیب ہوتی تھی، ان ساری مشکلات اور اپنی بے مائیگی کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور ایک خاص موقع سے فائدہ اٹھا کر اس وقت کے پرنسپل مولانا عمران ندوی کو اپنے حالات لکھ بھیجے، انھوں نے کمال مہربانی سے نہ صرف یہ کہ وہ مجھے ندوہ میں داخلہ دیا بلکہ میرے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے میرے وظیفہ کا بھی انتظام کر دیا۔

میرا داخلہ درجہ نہم میں ہوا تھا جو ان دنوں فضیلت کا آخری سال تھا اس طرح مجھے لکھنؤ میں رہنے کا موقع سنہ ۴۵-۴۶ء صرف ایک سال کے لئے ملا تھا۔ لیکن یہ ایک سال بھی مس خام کو کندن بنانے کے لئے بڑا سازگار ثابت ہوا۔ تعلیم کے ساتھ ذاتی مشاہدات نے مجھ میں وہ بصیرت پیدا کر دی جو بصورت دیگر ناممکن تھی سال بھر میں میرا کام یہ رہا کہ میں یکسوئی، محنت اور تندہی کے ساتھ پڑھوں اور جہاں تک ممکن ہو مسجد و مکتب سے زیادہ بزرگوں کی نظر سے اکتساب فیض کروں۔

ان دنوں خود ندوہ علمی و ثقافتی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی بڑے عالم یا فاضل کے آنے کی خبر ہوتی اور طلبہ کو بھی کبھی انھیں قریب سے کبھی دور سے دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ ریاست حیدرآباد کے کچھ افسر ندوہ کے معائنہ کے لئے آ رہے ہیں، اور معائنہ کرنے والوں کی ذمہ داری مولانا دریابادی کے سپرد ہے۔ مولانا دریابادی کے لئے میرے تحت الشعور میں جو دبی ہوئی عقیدت تھی وہ از سر نو جاگی اور میں بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا اور

میں نے دور ہی سے دیکھا کہ مولانا دریابادی لائبریری میں اپنے افسروں کو کچھ نایاب کتابیں دکھانے میں لگے ہوئے ہیں ایک صحت مند، توانا، اور قدآور شخصیت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن میں مولانا دریابادی کا جو تصور تھا یہ شخصیت اس سے زیادہ باوقار مرعوب کن اور پرکشش ہے۔

یہ تو محض دور کا جلوہ تھا یہ تمنا اب بھی باقی تھی کہ کسی نہ کسی صورت ان سے قریب ہونے کی سعادت حاصل کروں، عید کا دوسرا دن تھا اور میرے ایک دوست منظور جو نسبتاً مجھ سے کم درجہ میں تعلیم پاتے تھے اور ضلع اعظم گڈھ کے ہونے کی وجہ سے اپنے نام کے آگے بڑے فخر سے ایم۔ اے۔ لکھتے تھے۔ صدق کے دفتر کی طرف چل پڑے مقصد یہی تھا کہ مولانا دریابادی سے شرف نیاز حاصل کیا جائے ان دنوں لکھنؤ کی فضا سیاسی نعرہ بازیوں سے گونج رہی تھی۔ جو جہاں تھا اپنی آواز زیادہ سے زیادہ اونچی کرنے کے لئے بےچین تھا، ایک طرف قوم پرست مسلمان اپنا زور دکھا رہے تھے تو دوسری طرف مسلم لیگ کی زمام قیادت چودھری خلیق الزماں کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے اپنی آواز کو زیادہ موثر بنانے کے لئے "تنویر" کے نام سے ایک روزنامہ بھی جاری کر دیا تھا۔ ادھر قوم پرستوں کے اخبار نیشنل ہیرالڈ اور قومی آواز بھی شائع ہونے لگے۔ مسلمانوں میں ہر طرف ایک عجیب جوش تھا، ولولہ تھا، ہیجان تھا۔

صدق کے دفتر میں "تنویر" کا بھی کام ہوتا تھا۔

جب میں اور میرے دوست وہاں پہونچے تو مولانا دریابادی تو نہ تھے البتہ حکیم عبدالقوی ایڈیٹر تنویر بیٹھے صدق ہی کا کچھ کام کر رہے تھے، انھوں نے بتایا کہ مولانا دریابادی بہت کم لکھنؤ آتے ہیں زیادہ تر دریاباد میں ان کا قیام رہتا ہے اور وہیں سے وہ صدق کا انتظام بھی کرتے ہیں لیکن ہماری خوش قسمتی سے اس ہفتہ ان کے یہاں آنے کا امکان تھا ہم دن اور وقت پوچھ کر لوٹنے ہی والے تھے کہ چودھری خلیق الزماں وہاں تشریف لے آئے، وہ دراصل تنویر کے اسٹاف سے عید ملنے آئے تھے، ہم دونوں کو پایا تو ہمیں بھی گلے لگا لیا۔ جب انھیں بتایا گیا کہ ہم اسٹاف ممبر نہیں، ندوہ کے طالب علم ہیں تو وہ اور بھی خوش ہوئے اور دو ایک منٹ ہمارے تعلیمی مشاغل اور ندوہ کے حالات پر بات چیت کرنے کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

ہم نے مولانا دریابادی کے آنے کا دن اور وقت تو معلوم کر ہی لیا تھا ٹھیک اس دن وقت مقررہ پر ہم دونوں مولانا کی قیام گاہ خاتون منزل پہونچے۔ مولانا اپنے بعض ملنے والوں کے ساتھ پہلے ہی سے وہاں تشریف فرما تھے بات چیت جاری تھی ہم دونوں نے سلام کیا اور ایک طرف ادب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان لوگوں کی گفتگو کا موضوع ایک نہ تھا کبھی مذہب تھا کبھی فلسفہ و تصوف کبھی ہندوستانی اور مشرق و مغرب کی سیاست زیادہ تر مولانا ہی بولتے تھے۔ ان کی باتوں میں تسلسل تھا بات میں بات پیدا ہوتی اور پہلو بدلتا رہتا تھا اس وقت ان کی ہر جنبش، ہر لفظ اور ہر بات ہمارے لئے مرعوب کن تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جذب کے عالم میں ہیں اور کثرت مطالعہ نے ان کی فکر کی یکجہتی کو گویا منتشر کر دیا ہے ان کی ہر بات میں ایک تیر ہے ایک نشتر ہے ایک چوٹ ہے۔

کچھ دیر بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے، ہم دونوں نے اپنا اپنا تعارف کرایا اور اپنی اپنی عقیدتمندیوں کا ذکر کیا وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ہمیں جی لگا کر پڑھنے کی تاکید کی اور دعا دے کر رخصت کیا، ہم جب ندوہ لوٹے تو ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قد اونچا ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد بھی کچھ ماہ تک لکھنؤ میں رہا لیکن اپنی تعلیمی مصروفیتوں نے پھر کسی اور جانب توجہ کرنے کی مہلت دی نہ تو مولانا دریابادی سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کا پھر کبھی موقع ملا۔ لیکن چوں کہ میرے دل میں ان کے لئے عقیدت پہلے ہی سے موجود تھی اس لئے ان کی ایک جھلک اور ان سے ایک شرفِ ملاقات بھی میری اس عقیدت کو دوبالا کرنے کے لئے بہت ہے۔ یعنی ان کے ہر نقشِ تحریر کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر آنکھوں سے لگانا شروع کر دیا۔

(۳۱)

عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ ہم کسی ادیب، کسی عالم، کسی شاعر، کے متعلق سنی سنائی باتوں کی بنا پر اپنے ذہنوں میں ایک اچھی تصویر بنا لیتے ہیں لیکن براہ راست اس ادیب عالم یا شاعر کو دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ہماری ذہنی تصویر اور اس کی اصلی شخصیت میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس ادیب عالم یا شاعر کی اصلی شخصیت جو کچھ ہوتی ہے اس کا صحیح عکس بھی اس کی تخلیقات میں بہت کم ہمیں نظر آتا ہے کہ ہر شخص اپنے اطراف ایک مصنوعی ہالہ بنائے ہوئے ہے خود دھوکہ میں رہتا ہے اور دوسروں کو بھی دھوکہ دیتا ہے۔ لیکن مولانا دریابادی کی جو خیالی تصویر میری ذہن میں تھی۔ ان کی شخصیت اس سے بڑھ کر نکلی اور ان کی شخصیت جو کچھ ہے وہ واضح طور پر اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ ان کی تحریر کے جھروکوں سے جھانکتی ہے۔

جیسا کہ مولانا نے اعتراف کیا ہے، وہ پیدا تو مسلمان ہوئے تھے، مگر جذباتی طور پر اپنی پوری زندگی میں مختلف متضاد حالات سے گذرے ہیں۔ بچپن میں نماز روزہ کے پابند رہے۔ جوانی فلسفہ و نفسیات کی خیالی وادیوں میں بھٹکتے گذری۔ کچھ دن ہندو فلاسفہ کے زیر اثر رہے اور آخر میں مولانا رومی ان کی مدد کو پہونچے اور ان کی تعلیمات نے انھیں از سرِ نو اپنا دین درست کرنے کا موقع دیا یہاں تک کہ مولانا محمد علی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا اشرف علی تھانوی کی صحبتوں نے دل و دماغ کا رہا سہا فتور بھی دور کر دیا اور وہ اپنے عقیدہ و عمل میں اس قدر راسخ ہو گئے کہ پھر دنیا کی کوئی چیز ان کے قدموں کو لڑکھڑا نہ سکی۔

جذباتی اتار چڑھاؤ کے اس پورے دور میں وہ مشاہداتی اور تجرباتی طور پر بھی مختلف صبر آزما مراحل سے گذرے ہیں ان مراحل سے جہاں انھیں متعدد بزرگان کے حالات سے دوچار کیا وہاں ان کی فکری صلاحیتوں کو بھی جلا دے کر روشن سے روشن تر کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اس روشنی میں بہ آسانی اچھے برے، نیک و بد، صالح و غیر صالح کی تمیز کرنے کے لائق ہو گئے اور ان میں اتنی اخلاقی جرأت پیدا ہو گئی کہ جس کو وہ سچ سمجھیں بیباکی کے ساتھ اس کا اعلان بھی کر دیں۔

اردو زبان و ادب کی محبت انھیں ورثہ میں ملی تھی مشرقی و مغربی علوم اور اپنے ذاتی تجربات کی انھیں مواد فراہم کیا۔ عشق کی کامیابیوں نے انھیں جمالیاتی قدروں سے روشناس کرایا۔ اور گھریلو ناز و نعم اور آسودہ حالی نے انھیں خود بینی کے ساتھ ساتھ خدا بینی کا ذوقِ سلیم بخشا۔ ان سب کا حاصل یہ ہے کہ ان کو تحریروں میں ایک بوقلمونی ایک تنوع، ایک رنگا رنگی ہے، انھوں نے فلسفہ پر لکھا، نفسیات پر لکھا، ادب پر لکھا، تاریخ پر لکھا سیاست پر لکھا، تصوف پر لکھا، مذہب پر لکھا یہ سارے موضوعات ایک دوسرے سے بہت زیادہ ملسلک نہیں ہیں لیکن پھر بھی جب ہم ان کی ان تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کثرت تحریر میں جو چیز ہمیں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے وہ ان کی شخصی وحدت ہے کہ ان کے کسی بھی نقشِ تحریر میں، چھپے ہوئے جملوں میں مشاہد

کی عکاسی میں تجربات کی شیوہ بیانی میں، ار ندو ڈ ہر قدم پر دہ بڑی آسانی کے ساتھ پہچان لئے جاتے ہیں اور ان کا احساس خودی ہر جگہ اپنا جلوہ دکھا کر ہمیں مسحور اور بے خود بنانے کی کوشش کرتا ہے، ان کا تصور ان کی شخصیت ہے اور ان کی شخصیت ان کے عکس سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔

مجموعی طور پر ان کی کہانی ایک ایسے مسافر کی کہانی ہے جو کوہ دمن طے کرنے، دشت و بیابان کی خاک چھاننے اور دیر و حرم کے فاصلے ناپنے کے بعد صحرا کی طرف چل پڑا ہو، لیکن بھٹکنے کے لئے نہیں بلکہ صحرا کو چمن زار میں بدلنے کے لئے۔

رہرو منزل عشقیم وز سرحد عدم
تا بہ اقلیم وجود ایں ہمہ راہ آمدہ ایم

حضرت ماجد دریابادی

عمیر انصاری

زباں ایسی گماں ہو جس پہ دریا کی روانی کا
بیاں ایسا کھنکتے ہوں کہیں جام و سبو جیسے

تفکّر اور تخیّل کی ادا کاری کا ہر منظر
خیاباں نور و نکہت ہوں چمن میں چار سو جیسے

ہر اک سادہ سے مضموں میں بھی اس انداز کے تیور
اٹھا ہو لے کے انگڑائی ابھی اک ماہ رو جیسے

وہ الفاظ و معانی کی صدا دیتی ہوئی دُنیا
کسی کھلتے ہوئے گلزار کا جوشِ نمو جیسے

بیانِ فلسفہ ہو یا حدیثِ علم و حکمت ہو
قریبِ دل کسی سے ہو رہی ہو گفتگو جیسے

اشاروں، استعاروں اور کنایوں کے وہ میخانے
سپردستِ حنائی ساغر و جام و سبو جیسے

مناظر اُن مسائل کی براگندہ نقابی کے
کھڑا حسن آئینے میں اپنے رُوبہ رُو جیسے

ہر اک فکر و نظر کے آئینے خانے کا وہ عالم
رواں باہم دگر ہو کاروانِ رنگ و بُو جیسے

جنونِ شوق کی ہر ہر قدم وہ شعلہ سامانی
ہو صدیوں سے کسی کو آپ اپنی جستجو جیسے

جہاں میں اب ہے یوں ہی حضرتِ ماجد کی ہستی بھی
زبانِ اہلِ عالم میں زبانِ لکھنؤ جیسے

حکیم عبدالقوی دریابادی

ایک یادگار فوٹو

یہ فوٹو مولانا عبدالماجد دریابادی کی تقریب شادی جون ۱۹۱۶ء کا ہے اس وقت وہ "مرحوم" عبدالماجد ،، اس فوٹو میں جو لوگ شامل تھے اُن میں مولانا مدظلہ کے علاوہ صرف دو صاحب اس وقت زندہ سلامت ،۔ مولانا عبدالباری ندوی اور انیس احمد صاحب عباسی ایڈیٹر حقیقت ۔ اس فوٹو میں شامل حضرات حسب ذیل ہیں:

دائیں طرف سے کرسی پر: (۱) مولوی تجمل کریم صاحب قدوائی وکیل بانرہ ۔ مولانا دریابادی کے عزیز قریب۔ م پاکستان کے ۔چند سال بعد پاکستان منتقل ہوگئے۔ وہیں انتقال ہوا۔

(۲) مولوی حاجی مسعود علی ندوی، سابق ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ مولانا کے بہت زیادہ بے تکلف رفیق۔

(۳) مولانا حاجی شاہ عبدالباری ندوی۔ مولانا کے بڑے پرانے رفیق، عمر میں اُن سے کچھ بڑے مصنف مذہب و عقلیات لے ۔فہم انسان تجدید تصوف وسلوک، تجدید تعلیم وتبلیغ، سائنس واسلام وغیرہ۔

(۴) مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ۔ علامہ شبلی کے علمی وقلمی جانشین اُردو کے نادر ادیب دارالمصنفین اعظم گڑھ کے بانی مدیر رسالہ معارف وصاحب تصانیف کثیرہ کراچی میں وفات پائی مولانا کے خصوصی دوست۔

(۵) جسٹس سید کرامت حسین مرحوم ۔مشہور فلسفی، کرامت حسین گرلز کالج لکھنؤ کے بانی ۔مصنف فقہ اللسان و افراد کا سبب

(۶) مولانا عبدالحلیم شرر مورخ اسلام اور مشہور ناول نگار۔

(۷) سید سجاد حیدر یلدرم ۔صاحب طرز ادیب

(۸) نواب ناظر یار جنگ ڈاکٹر ناظر الدین حسن مرحوم مولانا کے ہم زلف۔

کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں:۔

۱۔ حاجی محبوب علی مولانا دریابادی کے وفادار خدمت گار

۲۔ انیس احمد صاحب عباسی ایڈیٹر روزنامہ حقیقت لکھنؤ۔ مولانا دریابادی کے شاگرد اور پرانے ممتاز صحافی۔

۳۔ مشتاق مصطفیٰ صاحب ساکن گدیہ ضلع بارہ بنکی ۔ مولانا دریابادی کے عزیز۔

۴۔ ڈاکٹر حفیظ سید، استاد اردو الہ آباد یونیورسٹی، مولانا کے عہد طالب علمی کے ساتھی۔

۵۔ حاجی حافظ محمد یونس قدوائی دریابادی سابق چیف ریڈر ہردوئی۔ مولانا کے قریبی عزیز

۶۔ مولوی احمد کریم دریابادی ۔ ریٹائرڈ جج، مولانا دریابادی کے عزیز قریب۔

اُردو کی کہانی

بچوں اور اَن پڑھ بالغوں کے لئے آسان زبان میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ۔ نو، دس بار چھپ چکی ہے۔ ہندی اور دونوں زبانوں میں دستیاب ہوتی ہے۔

سائز $\frac{۳۰ \times ۲۰}{۱۶}$ ۱۱۲ صفحات قیمت 1/50

ساحل اور سمندر

مصنف کا امریکہ اور یورپ کا سفرنامہ ہے جس کے متعلق ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی نے اپنے ... کے مقالہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ اُردو کا سب سے اچھا سفرنامہ ہے کیونکہ مصنف ... تاثرات اور معلومات کا ایک نادر امتزاج بخشا ہے۔ سائز $\frac{۳۰ \times ۲۰}{۱۶}$ قیمت چھ روپیہ

عکس اور آئینے

ادبی اور تنقیدی مضامین کا چھٹا مجموعہ ہے۔ جس میں مصنف کے بہت ہی اہم اور معرکہ آ[را] مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین نے دَورِ جدید کے نقادوں کی رہنمائی کی ہے۔

سائز $\frac{۳۰ \times ۲۰}{۱۶}$ قیمت پانچ روپیہ

تنقیدی نظریات

پروفیسر احتشام حسین نے اُردو کے مستند نقادوں کے تقریباً تیس ۳۰ مضامین د[و] جلدوں میں اس طرح مرتب کر دیئے ہیں کہ تنقیدی مطالعہ کے سارے پہلو اپنی رنگار[نگی کے] ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ یہ جلدیں تقریباً ہر یونیورسٹی کے اُردو نصاب میں داخل کی گئی ہیں

جلد اول سائز $\frac{۳۰ \times ۲۰}{۱۶}$ قیمت چھ روپیہ

جلد دوئم " " چھ "

اُردو ادب کی نئی تاریخ

یوں تو اُردو ادب کی متعدد تاریخیں شائع ہو چکی ہیں لیکن غالباً خاص طرح [کی] تاریخی بصیرت اور تنقیدی شعور نے اسے واقعی ایک نئی تاریخ بنا دیا ہے! دوسری ادبی تاریخوں سے بہت مختلف ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ اُردو زبان و ادب کی ایک جامع اد[ر] مکمل تاریخ ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اُردو زبان و ادب کی ایک زندہ تہذیبی قوت [کی] حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ سائز $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ زیر طبع

اِن تصانیف کے علاوہ پروفیسر احتشام حسین نے کئی ترجمے کئے ہیں اور کئی دوسری کتابیں مرتب کی ہیں جو دستیاب ہوتی ہیں۔ ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

تراجم:۔

دیویکاندا:۔ ساہتیہ اکاڈیمی روئیں رولاں کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ۔
قیمت چار روپیہ

کلکی:۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے لئے ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ایک اہم تصنیف کا ترجمہ
قیمت بچھتر پیسے

مطبوعاتِ ادارہ فروغِ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروفِ تہجی مع قیمت) (ا)

۱۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر۔ ڈاکٹر محمود الحسن رضوی — ۱۲/-
۲۔ مُعظم نمبر۔ فروغِ اُردو۔ اقبال صدیقی — ۳/۵۰
۳۔ انوار اللغات اُردو المعروف بہ مخمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین — ۴/-
۴۔ ادبی تاثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/۵۰
۵۔ آئینۂ عقل۔ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری — ۴/۵۰
۶۔ اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی — ۴/۵۰
۷۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۳/-
۸۔ انارکلی۔ امتیاز علی تاج — ۲/۲۵
۹۔ اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ، پروفیسر کلیم الدین احمد — ۶/-
۱۰۔ اُردو میں تنقید۔ ڈاکٹر احسن فاروقی — ۳/-
۱۱۔ انتخاب قصائد اردو۔ مغیث الدین فریدی — ۱/۵۰
۱۲۔ ادب اور نظریہ۔ آل احمد سرور — ۵/-
۱۳۔ اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ سوم۔ عبدالشکور — ۴/۵۰
۱۴۔ ادبی نقوش۔ شاہ معین الدین احمد ندوی — ۵/-
۱۵۔ اقبال۔ مرتبہ فروغِ اُردو — ۰/۵۰
۱۶۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ عبدالماجد دریابادی — ۴/۵۰
۱۷۔ البرامکہ یعنی آلِ برامکہ کا عروج و زوال، ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے — ۲/-
۱۸۔ انتخاب کلامِ میر مع مقدمہ۔ ناظر کاکوروی — ۱/-
۱۹۔ انتخاب کلامِ غالب۔ بشیر احمد علوی — ۱/۵۰
۲۰۔ ادبی تنقید۔ ڈاکٹر محمد حسن — ۴/۵۰
۲۱۔ انتخاب قصائد و غزلیات (فروغِ اُردو) — ۴/-
۲۲۔ ادب کیا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی — ۲/۵۰
۲۳۔ ادبی خطوطِ غالب۔ مرزا محمد عسکری — ۹/-
۲۴ آئینۂ نثرِ اُردو۔ سعادت علی صدیقی — ۳/-
۲۵ ایک نادر روزنامچہ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی — ۲/۵۰
۲۶ ایوانِ غزل۔ مجنوں گورکھپوری — ۰/۳۷
۲۷ اُردو کی کہانی۔ سید احتشام حسین — ۱/۵۰
۲۸ ادب پارے حصہ نظم و نثر " " — ۴/۷۵
۲۹ انتخاب نثرِ جدید " " — ۳/-
۳۰ ابوالکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد — ۰/۲۵
۳۱ ارمغان نثر و نظم۔ عبدالاحد خاں خلیل — ۳/۷۵
۳۲ افسانہ نمبر۔ مرتبہ فروغِ اُردو — ۱/۵۰
۳۳ اچھی نظمیں۔ آغا محشر — ۰/۵۰
۳۴۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد، جدید اڈیشن۔ غلام احمد فرقت — ۱۳/-
۳۵ اُردو شاعری۔ امیر احمد علوی — ۱/۵۰
۳۶ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ — ۱/۵۰
۳۷ غزلیات حافظ، صائب، غالب فارسی — ۲/۵۰
۳۸ اپنی پہچان پوری زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب۔ اعجاز احمد فاروقی — ۱/۲۵
۳۹ اللہ کے پیارے۔ امیر حسن نورانی — ۰/۵۰
۴۰ ادبی معرکہ نمبر۔ مرتبہ فروغِ اُردو — ۱/۵۰
۴۱ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی۔ عبدالماجد دریابادی — ۱/۲۵
۴۲ اسپین کی شہزادی۔ صادق سردھنوی — ۲/۵۰
۴۳ ایک جان تین قالب۔ خاں محبوب طرزی — ۲/-
۴۴ اُلفت " " " — ۵/۵۰
۴۵ آغازِ سحر " " " — ۲/-
۴۶ امین آباد " " " — ۲/-
۴۷ اپنی موج میں۔ آوارہ — ۲/۵۰
۴۸۔ انوار جدید خط و کتابت۔ خلیق احمد علوی — ۰/۴۵

نمبر	نام کتاب و مصنف	قیمت
۴۹	ایجادوں کی باتیں ۔ مصطفےٰ حسن رضوی	۲/-
۵۰	اچھی کہانیاں (حصہ اول) شمس الدین ندوی	۰/۴۰
۵۰	(حصہ دوم) " "	۰/۳۵
۵۱	(حصہ چہارم) " "	۰/۵۰
۵۲	ادب کا مقصد ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۳/-
	(ب)	
۵۴	بابائے اردو عبدالحق ۔ عبداللطیف اعظمی	۵/-
۵۵	بستان حرم (جدید نعتیہ کلام) از زائر حرم حمید صدیقی	۱/۵۰
۵۶	شہید محبت بوٹا سنگھ ۔ خان محبوب طرزی	۴/-
۵۷	بزم بے تکلف ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین	۲/۵۰
۵۸	برگ گل شبلی نعمانی	۰/۴۰
۵۹	بہادر شاہ ظفر امیر احمد علوی کاکوروی	۵/۵۰
۶۰	بہشتی ثمر (اول دوم) یعنی خلاصہ بہشتی زیور ۔ مولانا تھانوی	۲/-
۶۱	بانی اسلام (علامہ محی الدین خیلا کی تاریخ کا اردو ترجمہ)	۰/۷۵
	(پ)	
۶۲	پطرس کے مضامین ۔ پطرس بخاری	۱/۵۰
۶۳	پیاری باتیں محسن کاکوروی	۰/۲۰
۶۴	پھولوں کا انبار (ناول) منظر سلیم	۴/۵۰
۶۵	پیسہ اور پرچھائیں (مجموعہ ڈرامہ) ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
۶۶	پاگل خانہ (ناول) ناسک لیح آبادی	۳/۲۵
۶۷	پیغام " طاہرہ دیالپوری	۳/-
۶۸	پنجاب میں اردو حافظ محمود شیرانی	۴/۵۰
۶۹	پردیسی کے خطوط (حصہ اول) مجنوں گورکھپوری	۴/-
	(ت)	
۷۰	تاریخ ادب اردو (فروغ اردو ایڈیشن) ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۸/-
۷۱	تحریریں مجموعہ مضامین ڈاکٹر گیان چند	۴/۵۰
۷۲	تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ ۔ فرید احمد علوی	۰/۷۵
۷۳	تاریخی جائزے ڈاکٹر محمد یسین	۳/۹

نمبر	نام کتاب و مصنف	قیمت
۷۴	تعارف تاریخ اردو (جدید ایڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/-
۷۵	تاجدار مدینہ اقبال صدیقی	۰/۱۲
۷۶	تنقیدی اصول اور نظریے حامد اللہ افسر	۴/۵۰
۷۷	تنقید و تحلیل ۔ شبیہ الحسن نونہروی	۳/-
۷۸	تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) سید احتشام حسین	۴/۵۰
۷۹	تنقیدی نظریات (جلد اول) " "	۶/-
۸۰	" " (جلد دوم) " "	۶/-
۸۱	تنقیدی اور عملی تنقید " "	۵/
۸۲	تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) ۱۹۶۴ء آل احمد سرور	۳/۵۰
۸۳	ترانہائے خیام ۔ ڈاکٹر رضیہ حسین	۲/-
۸۴	تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص محمد حسین شمس	۱/۶۵
	(ٹ)	
۸۵	ٹیگور آدم سیتاپوری	۲/-
۸۶	ٹھیکرے کی مانگ ۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی	۲/۰
	(ث)	
۸۷	ثنائے حبیب (نعتیہ کلام) بہزاد لکھنوی	۲/۲۵
	(ج)	
۸۸	جان غالب محمد حسین شمس علوی	۲/-
۸۹	جائزے انور سیوانی	۳/-
۹۰	جواہرات انجیل ۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/-
۹۱	جنگ آزادی نمبر (۱) (۱۸۵۷ء) فروغ اردو	۳/-
۹۲	جنگ آزادی نمبر ۲ " "	۳/-
۹۳	جوئے رواں (مجموعہ کلام) حامد اللہ افسر	۲/۵۰
۹۴	جادو کی انگوٹھی (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اثر بلگرامی	۲/۵۰
۹۵	جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین	۲/۵۰
۹۶	جلوے معین الدین دردائی	۱/۷۵

۹۷ جمیلہ بوائری (ناول) عمان محبوب طرزی ۴/۵۰
۹۸ جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۶/-

(چ)

۹۹ چوکھی بہن مجموعہ افسانہ - مسیح الحسن رضوی ۲/۷۵

(ح)

۱۰۰ حیات فضل الحق خیرآبادی ۱/۲۵
۱۰۱ حالی بحیثیت شاعر (جدید اڈیشن مع اضافہ جدید اڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۳/-
۱۰۲ حسرت موہانی عبدالشکور ۳/۵۰
۱۰۳ حسرت تعمیر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰
۱۰۴ حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰
۱۰۵ حکیم نباتات وزیر خاں لنگراں ۲/
۱۰۶ حبیبہ غالب سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۰۷ خیالات رنگین یعنی مجموعہ مضامین فارسی (زیر طبع)
۱۰۸ خلاصہ شریف زادہ مرزا رسوا ۱/-
۱۰۹ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی عبدالماجد دریابادی ۲/۷۵
۱۱۰ خضر راہ مع ترجمہ علامہ اقبال -/۲۵
۱۱۱ خلاصہ روح تنقید ۱/۰
۱۱۲ خلاصہ [illegible]
۱۱۳ خلاصہ المیزان ۱/۰
۱۱۴ خبطی (مزاحیہ) محمد علی واحدی مع مقدمہ شوکت تھانوی -/۷۵
۱۱۵ خوش بختی کی تلاش - احسن الظفر بی اے ۱/۵۰
خلاصہ شعر الہند (دوم) ۲/- ۱/-

(د)

۱۱۶ دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۳/-
۱۱۷ دیوان فغانی ۱/۵۰
۱۱۸ داستان سہراب و رستم مع مقدمہ (فارسی) عبداللطیف خلیل ۳/-

۱۱۹ دیوان صفی (حصہ اول) صفی لکھنوی ۲/-
۱۲۰ دہلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/-
۱۲۱ دستہ گل شبلی نعمانی -/۶۰
۱۲۲ دوشیزہ تاتار (ناول) عمان محبوب طرزی -/۵۰
۱۲۳ دلربا " " " ۳/-
۱۲۴ دلی کا دبستان شاعری مع اضافہ جدید اڈیشن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۱۲/-

(ڈ)

۱۲۵ ڈاکٹر نذیر احمد انوار الحسن -/۳۷

(ذ)

۱۲۶ ذوق جستجو - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۲/۵۰
۱۲۷ ذوق ادب و شعور - پروفیسر احتشام حسین ۴/۵۰
۱۲۸ ذوق جنون مجموعہ کلام آل احمد سرور ۴/۵۰

(ر)

۱۲۹ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین ۵/۰
۱۳۰ رباعیات غالب مع اردو ترجمہ سید امیر حسن نورانی ۳/۰
۱۳۱ رہبر مضمون نویسی - شجاعت علی صدیقی ۲/۵۰
۱۳۲ راکھی - ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی -/۳۷
۱۳۳ رخسار سحر انصر کریم تھدرانی ۱/۵۰
۱۳۴ زنجیر (ناول) ۳/۵۰
۱۳۵ رموز [illegible] مع مقدمہ اردو - محمد شریف ۳/۵۰
۱۳۶ ریاض فارسی - منتخب کلام فارسی ۲/۰

(ز)

۱۳۷ زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ مولانا تھانوی -/۵۰
۱۳۸ زمینیوں کا بادشاہ (حکیم انا) (مزاحیہ ناول) علی عباس حسینی ۳/۰

(س)

۱۳۹ سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۳/۰
۱۴۰ سوانح اور خاکے — نجم الدین تقوی — ۳/۰
۱۴۱ سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حکیم چند نیر — -/-
۱۴۲ سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۳/-
۱۴۳ سلک گہر — سید احتشام حسین — ۳/-
۱۴۴ ساحل و سمندر — سید احتشام حسین — ۶/-
۱۴۵ سر سید یا احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰
۱۴۶ سرمایہ زبان اردو — جلال لکھنوی — ۴/۵۰
۱۴۷ سخنہائے گفتنی — کلیم الدین احمد — ۵/-
۱۴۸ سفر (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/۰
۱۴۹ سیاحت زمین (ناول) — محمود اعظم فہمی — ۱/۵۰
۱۵۰ سید سالار مسعود غازیؒ — حشمی محمود آبادی — ۳/۵۰
۱۵۱ ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۳/۵۰
۱۵۲ سہرا حلقہ — ۰۵
۱۵۳ سر سید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی — ۰/۳۷
۱۵۴ سوشل اسٹڈی — احمد محسن کاکوروی — ۱/۷۵

(ش)

۱۵۵ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) — غلام احمد فرقت — ۸/۰
۱۵۶ شرح سلک گہر — عبد القوی دریابادی — ۳/۵۰
۱۵۷ شاہ عکس حضرت جی — پروفیسر عبد الشکور — ۳/-
۱۵۸ شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی — ۴/-
۱۵۹ شرح ادب پارے نظم — ۳/۰
۱۶۰ شرح منتخبات فارسی — عبد القوی دریابادی — ۴/۵۰
۱۶۱ شبلی نعمانی — انوار الحسن صدیقی — ۰/۳۷
۱۶۲ شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن) — نظم طباطبائی — ۵/۰
۱۶۳ شاہان مالوہ یعنی گجرات کی تاریخ — امیر احمد علوی — ۳/۵۰
۱۶۴ شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم — شبلی نعمانی — ۲۵/۰
۱۶۵ شرح نثر امروز ایران — احسن الظفر ایم اے — ۲/۰
۱۶۶ شرح شعر امروز ایران — " — ۲/۵۰
۱۶۷ شمع و شاعر — علامہ اقبال — ۰/۲۵
۱۶۸ شرح حکیم نباتات خاں — نیر مسعود — ۱/۲۵
۱۶۹ شرح انتخاب قصائد و غزلیات
۱۷۰ مطابق نصاب بی اے — عبد العلیم قدوائی — ۶/۰
۱۷۱ شرح ترانہائے خیام — حکیم عبد القوی — ۱/۵۰
۱۷۲ شرح نصاب فارسی — ۴/۰

(ص)

۱۷۳ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — ۳/۰
۱۷۴ صحیفۂ محبت (مہدی افادی کے خطوط) — ڈاکٹر محمود الٰہی — ۵/۰

(ط)

۱۷۵ طرزی نمبر (خان محبوب طرزی) — مرتبہ فروغ اردو — ۲/۰
۱۷۶ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیئے — غلام الثقلین — ۰/۳۷
۱۷۷ طلسم اسرار (ڈرامہ) — مرزا رسوا لکھنوی — ۱/۲۵
۱۷۸ طرۂ امیر — امیر مینائی منتخب کلام
۱۷۹ (جدید ایڈیشن) — امیر احمد علوی — ۳/۵۰

(ع)

۱۸۰ عذرا (ناول) — صالحہ عابد حسین — ۵/۰
۱۸۱ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) — سید احتشام حسین — ۴/۵۰
۱۸۲ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینے میں — اخلاق حسین عارف — ۳/۰

(غ)

۱۸۳ غالب کی تخلیقی تحمیل۔ شہید صفی پوری ۴/۰
۱۸۴ غنچہ و گل سید محمود الحسن رضوی ۳/۰
۱۸۵ غالب کے کلام میں محاکاتی عناصر نادم سیتاپوری ۴/۵۰
۱۸۶ غزنی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
۱۸۷ غزلیات نظیری ۱/۵۰

(ف)

۱۸۸ فن خطابت یعنی استاد تقریر۔ کلب مصطفےٰ ایڈوکیٹ [illegible]
۱۸۹ فریدہ خان محبوب طرزی ۲/۰
۱۹۰ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ نادم سیتاپوری ۴/۵۰
۱۹۱ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۲/۵۰
۱۹۲ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۲/۵۰
۱۹۳ فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی ۳/۰
۱۹۴ فغان محسن محسن کاکوروی ۰/۳۰
۱۹۵ فارسی آموز مشیر احمد علوی ۱/۰
۱۹۶ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۶/۰۰

(ق)

۱۹۷ قدیم و جدید یہ مزاحیہ مضامین غلام احمد فرقت [illegible]
۱۹۸ قصائد خاقانی [illegible]
۱۹۹ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰
۲۰۰ قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۴/۵۰
۲۰۱ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۸/۰
۲۰۲ قدر و نظر ڈاکٹر اختر اورینوی ۶/۵۰
۲۰۳ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۲/۰
۲۰۴ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/
۲۰۵ قومی ادب، نثر و نظم حامد افسر ۲/۴۳
۲۰۶ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۳/۰

(ک)

۲۰۷ کیسر اور کاہی بدرالدین طیب جی
۲۰۸ کفش گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت

(گ)

۲۰۹ گلبانگ حرم مع مقامات مقدسہ کے فوٹو زائر حرم حمید لکھنوی
۲۱۰ گاندھی نمبر
۲۱۱ گلدستۂ فارسی اول و دوم
۲۱۲ گلزار فارسی یعنی آمدنامہ
۲۱۳ گلہائے ادب۔ عبدالاحد خاں خلیل
۲۱۴ گاندھی جی کے ساتھ حامد اللہ افسر

(ل)

۲۱۵ لوائح جامی مع مقدمہ عبدالاحد خاں خلیل
۲۱۶ لال تاج مائل ملیح آبادی
۲۱۷ لب بام عادل رشید
۲۱۸ لسانیات اور اردو سید محمود حسن رضوی

(م)

۲۱۹ مزاحیہ خمسہ دیوان غالب اردو شاہد احمد فرقت
۲۲۰ محسن کاکوروی نمبر
۲۲۱ مسلمان اور [illegible] مولانا ابوالکلام آزاد
۲۲۲ مرثیہ نگاری اور میر انیس۔ ڈاکٹر احسن فاروقی
۲۲۳ مضامین فرحت (حصہ اول) مرزا فرحت اللہ بیگ
۲۲۴ مضامین فرحت (حصہ دوم) " " "
۲۲۵ ماضی کی کہانیاں آفتاب اختر تلہری
۲۲۶ میرے اسٹیج ڈرامے ڈاکٹر محمد حسن

۲۲۶ موسم گل (ناول) عادل رشید ۶/۰

۲۲۷ مجبور " خان محبوب طرزی ۴/۵۰

۲۲۸ مضامین جدیدہ محمد ہادی ۱/۲۵

۲۲۹ مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ قدرت اللہ بیگ ۲/۵۰

۲۳۰ مطالعہ شبلی ناظر کاکوروی ۔ شجاعت علی سندیلوی ۴/۰

۲۳۱ ابیات شبلی جالب مظہری ۲/۵۰

۲۳۲ مثنویات حالی ۔ ناظر کاکوروی، شجاعت علی سندیلوی ۲/۵۰

۲۳۳ مطالعہ حالی " " " ۴/۵۰

۲۳۵ میٹھے بول " " ۱/۲۵

۲۳۶ مولوی نذیر احمد کی کہانی ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۰

۲۳۷ معرکہ روم و یونان صادق سردھنوی ۲/۰

۲۳۸ مصنوعی چاند خان محبوب طرزی ۲/۰

۲۳۹ مقدمہ شعر و شاعری مطابق نصاب بی۔ اے (اردو) ۱/۵۰

۲۴۰ مرثیہ غالب " ۰/۲۵

۲۴۱ مجموعہ کربلا جرجی زیدان ۱/۵۰

۲۴۲ معمار اکل ملیح آبادی ۴/۵۰

۲۴۳ مولانا حالی انوار الحسن صدیقی ۰/۳۷

۲۴۴ مہاراج بلی ڈاکٹر احسن فاروقی ۲/۰

۲۴۵ مسٹر ملا کی نوک جھونک۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ۰/۷۵

۲۴۶ مجذوب اور اُن کا کلام ۔ مولانا رضا انصاری ۱/۵۰

۲۴۷ مصباح بلاغت مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۲/۰

۲۴۸ مطالعہ سودا ڈاکٹر محمد حسن ۳/۰

۲۴۹ مزاحیہ شرح دیوان غالب ۔ غلام احمد فرقت ۸/۰

۲۵۰ مقدمات و مقالات ۔ عبدالاحد خاں خلیل ۵/۵۰

۲۵۱ منتخب سوانح اور خاکے ۔ نجم الدین تاجی ۳/۰

(ن)

۲۵۲ نثر مرزا ایرانی ڈاکٹر رغیب حسین ۲/۰

۲۵۳ نشاط غالب ۔ وجاہت علی سندیلوی ۴/۵۰

۲۵۴ نقد و انتقاد اعجاز احمد معجز ۲/۰

۲۵۵ نقش حالی اول دوم یعنی حالی نمبر پروفیسر احتشام حسین ڈاکٹر ظہور الحسن ہاشمی شجاعت علی سندیلوی ۱۲/۰

۲۵۶ نغمہ کوہسار خان محبوب طرزی ۴/۰

۲۵۷ نفحات الہند مع مقدمہ اردو محمد شریف ۳/۰

۲۵۸ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی کبیر احمد جائسی ۲/۰

۲۵۹ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ حامد اللہ افسر ۲/۰

۲۶۰ نیا راستہ (ناول) خان محبوب طرزی ۳/۵۰

۲۶۱ نوروز (ناول) اکل ملیح آبادی ۴/۵۰

۲۶۲ نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ) آل احمد سرور ۶/۰

۲۶۳ نقوش و افکار مجنوں گورکھپوری ۴/۵۰

۲۶۴ نیلم انتصار حسین ۳/۰

۲۶۵ نذیر احمد کی کہانی فرحت اللہ بیگ ۱/۰

۲۶۶ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی عبدالاحد خاں خلیل ۲/۰

۲۶۷ نقش نولکشور نمبر ۲/۰

(ہ)

۲۶۸ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے علی عباس حسینی ۳/۰

۲۶۹ ہندی کے مسلمان شعرا ۔ میر حق نورانی ۰/۷۵

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی ۱۰ یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

جلد (۱۸) شمارہ (۷) (۸)
رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۰
لائسنس نمبر: ۲۰۶۴۱۷/ ۲۰۱۸۱۶۴
فون نمبر: ۲۶۱۳۵

ادارہ فروغ اردو ہند کا علمی و ادبی ماہنامہ

فروغ اردو

محمد لکھنؤ

مدیر اعزازی:-
پروفیسر سید احتشام حسین

دسمبر و نومبر ۱۹۷۱ء

مجلس ادارت:
محمد حسین شمس علوی
عبدالقوی دریابادی
سعادت علی صدیقی

زر سالانہ: چار روپے
فی پرچہ: ۳۷ پیسے

پتے:-
۱- ادارہ فروغ اردو
امین آباد پارک لکھنؤ-۱
۲- انوار اشرف
۵۰- بی، ڈی سولا ٹاؤن
نارتھ ناظم آباد۔ کراچی، پاکستان

*

ترتیب

سید انصار حسین پرنٹر، پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

اپنی باتیں

مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر نکال کر ہم اپنے قارئین کے ردِّ عمل کا انتظار کرتے ر
کیونکہ یہ نہ تو افسانہ نمبر تھا نہ غزل نمبر، نہ ڈراما نمبر تھا نہ فلم نمبر، گویا کسی حیثیت سے بھی عام دلچسپی کی چ
تھا۔ لیکن ہمیں مسرت ہے کہ ہمیں جو خطوط ملے ہیں وہ نہ صرف ہمت افزا ہیں بلکہ اس کا پتہ بھی دیتے ہیں کہ اردو پڑ
والے سنجیدہ اور علمی مباحث سے بھی دلچسپی لینے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ بعض تبصرے عقیدتمندانہ ہیں اور بعض
کچھ خطوط تنقیدی ہیں اور کچھ محض نکتہ چینی کے انداز میں لکھے گئے ہیں، ہم دونوں کے لئے ممنون ہیں۔ تحسین
خطوط سے یہ اندازہ ہوا کہ ہماری کوشش اکارت نہیں گئی۔ تنقیدی خطوط میں بعض خامیوں کی طرف اشار
کئے گئے ہیں، جن میں سے کچھ پر ہمارا اختیار نہیں تھا۔ ہم نے ان تمام حضرات کے مضامین حاصل کرنے کی تگ و
کی جن کو اصحاب رائے کہا جاتا ہے لیکن یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ ان میں سے بعض نے توجہ نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ
کہ آخر وقت تک انتظار کرتے رہے اور تاخیر کے علاوہ ترتیب بھی حسب دلخواہ نہ ہو سکی۔ جن حضرات نے نکتہ
نکتہ چینی کی ہے یا کرتے رہتے ہیں، اُن کے لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا، وہ یا تو عادت سے مجبور ہیں یا اُن کے
پاس کوئی تعمیری نقطۂ نظر ہے ہی نہیں۔ بہرحال ہمیں یہ اطمینان ہے کہ ہم نے اپنی کوشش میں کوئی کمی نہیں
اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت اور کارناموں پر اتنا مواد یکجا کر دیا جس سے مدد لینا دورِ مستقب
کے نقاد اور محقق کے لئے ناگزیر ہوگا۔

ہم کئی بار انھیں صفحات پر یہ لکھ چکے ہیں کہ رسالہ پر سب سے زیادہ حق قارئین کا ہوتا ہے وہ اگر ہمدردا
مشورے دیتے رہیں گے، اعانت کرتے رہیں گے اور مفید راستے سمجھاتے رہیں گے تو ہم رسالہ کو ان دشواریو
کے باوجود بہتر بنانے کی سعی کریں گے جن سے اردو رسائل اور کتب فروش دوچار ہیں۔ جب تک کوئی رس
اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوتا، جب تک اس کے خریداروں کی تعداد نہیں بڑھتی اور جب تک اس کے پڑھنے
والے اپنا نہیں سمجھتے اس وقت تک رسالہ کی ترقی اور بہتری خیال خام [illegible] اردو سے محبت کرنے وال

ائل خریدتے ہیں نہ کتابیں، اس کی ترقی کس طرح ہوگی، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

اُردو ترقی سے کیا مراد ہے، اس پر بہت کچھ اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اس کی ترقی میں کتنا ہاتھ ہوگا اور کتنا حکومت کا، اسے بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے رہا یہی، اور جمہوری حکومت ہونے کے سے کے ساتھ حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ زبانوں کی ترقی اور تحفظ کا خاص خیال رکھے۔ ہم اسے تسلیم تے ہیں کہ حکومت کو اس بات کا کسی نہ کسی قدر احساس ہے۔ ہندوستان کا دستور بھی زبانوں کے تحفظ کا ذمہ دار یکن سب سے بڑی دشواری عملی اقدام میں پیش آتی ہے۔ ابھی حال ہی میں حکومت اُترپردیش نے ایک اردو اکیڈمی کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اُس کے اغراض و مقاصد اور حدودِ عمل کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں ں ہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی تشکیل میں کیا رکاوٹیں ہیں، اُس کے ممبر کن حلقوں سے لئے جائیں گے، اُن کی بت محض مشیروں کی ہوگی یا اُن کو اختیارات بھی حاصل ہوں گے کہ وہ اکیڈمی کو اُردو کے مفاد میں چلا سکیں، س کا ناظم، ڈائرکٹر یا چیرمین جو بھی ہوگا وہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے ہوگا یا ایک غیر سرکاری عہدہ دار کی یثیت سے جو ممبران اکیڈمی کے فیصلوں پر عمل درآمد کرے گا، اس اکیڈمی کے کام میں اور ترقی اُردو بورڈ لومتِ ہند کے کاموں میں کیا خاص فرق ہوگا؟ یہ سوالات ایسے ہیں جن کا شافی جواب ابھی تک نہیں ملا ہے۔ لیڈمی کا لفظ خاصا بھاری بھرکم ہے۔ اس کا خیال کر کے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق زیادہ تر بہت اونچے اور علی ادب سے ہوگا یا ایسے ادبی مسائل سے جو تحقیق و تنقید سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمارے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اُردو کے ثانوی درجات کے لئے نصاب کی کتابیں کہاں مرتب ہوں گی، کہاں سے شائع ہوں گی اور ون سا ادارہ انھیں نصاب تعلیم کے لئے منظوری دے گا۔ کیا یہ اکیڈمی مختلف ناشرین کو بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد دے گی؟ کیونکہ جب تک کسی زبان اور ادب کی ترقی غیر سرکاری اداروں سے متعلق نہ ہو اور عام لوگ اُس میں شریک نہ ہوں، اُس وقت تک تمام لوگوں کی وابستگی اُس سے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمارا یہ جاننا ضروری ہے کہ اُردو اکیڈمی کس طرح اپنے مقاصد کو پورا کرے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ ہونے کی وجہ سے اس کا دائرہ عمل آزاد اداروں کی طرح وسیع نہیں ہو سکتا حالانکہ اُس کے ذرائع وسیع ہوں گے لیکن ہمارے سامنے انجمن ترقی اُردو ہند کی مثال ہے، جس میں اُردو کے بڑے بڑے ادیب اور عالم شریک ہیں لیکن وہ کبھی اُردو بولنے والوں کی پوری طرح نمائندگی نہیں کر سکی ہے اور نہ اُسے اُن کا اعتماد ہی حاصل ہے۔

اس لئے حکومت کا یہ فرض ہے کہ اُردو اکیڈمی کے لائحہ عمل کا واضح خاکہ بنائے اور ایسے باعمل لوگوں کو اس سے وابستہ کرے جو قابلِ اعتماد ہیں اور جن کے ہاتھوں سے اُردو کو واقعی اس ریاست میں وہ مقام حاصل ہو سکے گا جس کی وہ مستحق ہے۔

مفتوںؔ کوٹوی

سلامِ عید

تابانیٔ ہلال سے روشن ہوا اُفق / اہلِ معاش باغ میں میرا سلامِ عید
دل کی بشاشتوں سے ہیں چہرہ کی تابشیں / چہرہ کی تابشوں میں نہاں ہے پیامِ عید
خوشیوں سے مست ہو گئے خورد و کلاں سبھی / سرشاریاں وہ ساتھ میں لایا ہے جامِ عید
ظاہر لباس، جسم سے ہے رنگِ انبساط / پوشیدہ کیا مسرتیں رکھتا ہے تمامِ عید
پہونچایا ماہِ نو نے پیامِ عرب ہمیں / اوجِ فلک سے سوئے زمیں ہے خرامِ عید
پُر کیف صبحِ عید ہے مثلِ بہارِ گُل / روشن ہے چاند تاروں کی مانند شامِ عید
یہ وہ خوشی ہے جس میں ہیں چھوٹے بڑے شریک / خورد و کلاں سبھی کے ہے گھر اہتمامِ عید
ماحول کو مقدّس و مسرور کر دیا! / سارے ہیں مستفیض، یہ ہے فیضِ عامِ عید
باطن کی ہے صفائی ہے سب مِل گئے گلے / ظاہر لباس سے بھی ہے کیا احتشامِ عید
لب پر رواں ہیں عید مبارک کے غلغلے / کتنی مٹھاس رکھتا ہے باہم کلامِ عید
بوڑھے ہیں فیض بار بچے ہیں فیضیاب / لب پر کہیں دعا ہے کہیں ہے سلامِ عید
دل کو خمیرہ خوئی مہِ نو کی بھا گئی / ہے دال عید باعثِ صد احترامِ عید
رہتے جو عجز سے تو چمکتے جہان میں / لالِ ہلال ہی سے منوّر ہے نامِ عید
اپنائیے زمانے کو دے کر مسرتیں / دل ہے غلامِ عید کہ ہے شاد کامِ عید

مفتوں کی التجا ہے خدائے کریم سے
ہر دن نصیب میں ہوں یہی صبح و شامِ عید

بلاوا

"کبھی خوابِ زلیخا کی کوئی تعبیر بھی نکلے
کبھی افسانۂ یوسف کی شہرت بنکے آجاؤ"

اخگر مشتاق رحیم آبادی

• زیرِ طبع مجموعہ "آتشِ لب" کی ایک نظم کا پہلا بند •

ل بیتاب کی تسکین و راحت بن کے آجاؤ — محبت کے حسیں خوابوں کی جنت بن کے آجاؤ
سی صورت یہ بے معنی خموشی کا سماں ٹوٹے — شراب و شعر و موسیقی کی دولت بن کے آجاؤ
تھی کو ڈھونڈتی پھرتی ہے میری شامِ تنہائی — بصد ناز و ادا پھر حسنِ خلوت بن کے آجاؤ
امروز جس ماضی کی یادوں میں تڑپتا ہے — اُسی ماضی کی پھر تازہ حکایت بن کے آجاؤ
کہاں تک آہ یہ افسانہائے تشنہ کامی ہی — مرے ان خشک ہونٹوں کی مسرت بن کے آجاؤ
ہ جن رنگین وعدوں کا سہارا دے گئے تھے تم — اُنہی رنگین وعدوں کی حقیقت بن کے آجاؤ
ہ نامے جن میں عہدِ قربِ زریں کے فسانے ہیں — اُنہی ناموں کا مفہومِ عبارت بن کے آجاؤ
ہارِ میکدہ ساماں کے آنے میں تامل کیوں — حریمِ رنگ و بُو میں جشنِ عشرت بن کے آجاؤ
تھیں میری قسم، مجھ سے نہ ہرگز بدگماں ہونا — سراپا پیکرِ عشق و محبت بن کے آجاؤ
حسیں راہوں میں تو مصروفیت حائل نہیں ہوتی — بس اب اک فرصتِ رنگیں کی دولت بن کے آجاؤ
مجھے طعنے نہ دے دنیا تمھاری بے وفائی کے — تم اپنے عہد و پیماں کی حقیقت بن کے آجاؤ
بس اب روٹھے نہ مجھ سے جانِ من شانِ مسیحائی — دلِ بیمارِ شامِ غم کی صحت بن کے آجاؤ
خمارِ شوق میں یہ مضمحل انگڑائیاں، توبہ — مرے شیشے میں صہبائے محبت بن کے آجاؤ
کہاں تک ہر نفس یہ شکوہ ہائے دردِ مہجوری — کسی تدبیر سے اب میری قسمت بن کے آجاؤ
ترپِ غم خاک میں ملتے ہوئے دیکھے نہیں جاتے — مرے ان آنسوؤں کی قدر و قیمت بن کے آجاؤ
بہت تڑپا رہی ہیں عہدِ رفتہ کی حسیں یادیں — حسیں یادوں کی پھر کوئی کرامت بن کے آجاؤ
زمانہ طنز سے ہنستا ہے میرے چاکِ داماں پہ — مرے جذبِ جنوں کی اب تو عظمت بن کے آجاؤ

غرض اخگر مجھے پروانہ وار اُس نے یہ لکھا ہے
مری محفل میں پھر شمعِ مسرت بن کے آجاؤ

(ناتمام)

اقبال بلگرامی ایم۔اے

خطوط نگاری

اگر ہم مخطوطاتِ عالم کا ایک سرسری جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ خط صرف ضرورت کا اظہار یا زیادہ سے زیادہ واقعات کی کھتونی ہوتے تھے اور لکھنے والے اس میں اپنی قابلیت کا اظہار کرتے، پڑھنے والے کے لئے اِس میں کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ خطوط انتہائی کاروباری انداز کے ہوتے۔

خطوط کے جو پُرانے مجموعے ملتے ہیں انہیں جو خطوط ہیں یا تو مذہبی رہنماؤں کی طرف سے یا حکومت کے سربرآوردہ لوگوں کی طرف سے لکھے گئے ہیں جو خطوط حکومت کی طرف سے لکھے گئے ہیں ان میں صرف احکام ملتے ہیں جو اُن کے وزیروں اور نائبین کو دیے گئے ہیں۔ نیز جو خطوط مذہبی رہنماؤں کی طرف سے لکھے گئے ہیں وہ تمام تر مذہبی نکات اور روحانی باریک بینیوں سے لبریز ہیں۔

زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو خطوط جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا جس کی بنا پر ہمارے سامنے کئی ایسے مجموعے آتے ہیں جو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ہی خطوط کی وجہ سے ہمارے سامنے مصنف کی انشا پردازی کی اعلیٰ قابلیت ظاہر ہوتی ہے اُن سے اُس کے اخلاق اور ماحول پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ لاطینی زبان میں ہوریس اور سسرو، انگریزی میں ملٹن، بیکن، کاؤپر گولڈ سمتھ بائرن، لارڈ چیسٹر فلیڈ، ملکہ وکٹوریہ وغیرہ، فرانسیسی میں والٹیر ورڈ یڈ وغیرہ کے خطوط نثر کے بہترین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ ہر زبان میں خطوط نگاری کی تاریخ پر تھوڑی سی روشنی ڈالوں گا۔ اُردو کے ادیبوں نے تقریباً ہر صنف میں فارسی سے خوشہ چینی کی ہے۔ اور فارسی کے ادیبوں نے کم و بیش عربی سے، اس لئے عربی اور فارسی میں فن خط نویسی کے ارتقار کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اِن دونوں زبانوں کے خطوط میں کیا چیز نمایاں تھی اور اُس کا اثر اُردو خط نویسی پر کس طرح ہوا۔

تاریخ اسلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے دَور میں اِس فن نے بہت ترقی کی اور حضور صلعم کے زمانے سے ہی خطوط کی نگہداشت کا کام شروع ہو گیا تھا۔ ممالک غیر یعنی اسلامی ممالک

ہوا) میں خطوط بھیجے جاتے۔ انھیں انشا پردازی میں
رت رکھنے والے صحابہ تحریر کرتے اور وہی اُن کی
ملات کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ تاریخ سے یہ
بھی ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس بڑھتی ہوئی
ورت کے پیشِ نظر اس کام کے لئے ایک مستقل
لمِ انشا کی بنیاد ڈالی اور خلافتِ اُمیہ اور خلافتِ
اسیہ دونوں نے اس محکمہ کے ساتھ ساتھ فنِ
نویسی کو ایسی ترقی دی جو اس سے پہلے اُسے
بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ حکومت کی طرف سے یہ ایک
ہم فن بن گیا، جس کے سیکھنے میں لوگ برسوں کوشش
رتے، اسی کے پیشِ نظر بڑے بڑے انشا پردازوں
کے خطوط کے نمونے شائع ہوگئے اور خطوط نویسی پر کتابیں
لکھی گئیں اور ہر قسم کے لئے ایک خاص اسلوب مقرر کیا
گیا۔ حیاتی۔ صاحب، عماد سے لے کر ابن عبدالکریم
تک بیسوں انشا پردازوں کے خطوط اور مراسلے اس
حقیقت کی اس بیش قیمت علمی اور فنی خدمت کا اظہار
ہوتا ہے۔

خلافت عباسیہ کے خاتمہ کے بعد اسلامی ایشیا
میں جب مغلوں کا راج ہوا اور عربی کے بجائے فارسی
کو دفتری زبان کا درجہ مل گیا تو خطوط بھی عربی کے بجائے
فارسی میں لکھے جانے لگے۔ ایک قیاس کے مطابق
فارسی خطوط نگاری ایران سے زیادہ ہندوستان میں
پروان چڑھی اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی خطوط کے شاہکار
مجموعے ایران کی نہیں بلکہ ہندوستان کی سرزمین نے پیدا
کئے۔ اِن میں حکومت کے رقعات کے علاوہ صوفیوں،
عالموں اور دوسرے لوگوں کے بہت سے نجی خطوط بھی
شامل ہیں۔ ان خطوط کا بھی رنگ حکومت کے خطوط سے

ملتا جلتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ مکتبوں میں یہی خطوط
پڑھائے جاتے تھے۔

اُردو خط وکتابت میں ابتداً فارسی خطوں
کے اِن مجموعوں ہی کی پیروی کی گئی تھی۔ اس لئے ہمیں
یہ دیکھنا چاہیئے کہ فارسی اور عربی میں خط وکتابت
کا کیا رنگ تھا، اور اُسے کیوں اختیار کیا گیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ عربی اور
فارسی خطوں نے حکومت کے زیرِ سایہ پرورش پائی
جس سے ان کی نشو و نما پر بہت اثر پڑا۔ حکومت کی
جانب سے جو خطوط لکھے جاتے اُن میں مندرجہ ذیل
باتوں کا خیال رکھا جاتا۔

۱۔ خط میں شروع سے لے کر آخر تک رکھ رکھاؤ باقی
رہے۔

۲۔ کوئی حرف حکومت کی آن بان اور شان وشوکت
کے خلاف نہ ہو

۳۔ خط پڑھنے سے حکومت کی چھوٹی سی چھوٹی کمزوری
ظاہر نہ ہونے پائے۔

۴۔ کسی ایسی بات کا بھی خط میں گذر نہ ہونا چاہیئے
جس سے خط پڑھنے والے کو احساس ہو جائے
کہ حکومت کی نظر میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے
اور اس کے بغیر حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔

مندرجہ بالا اصولوں کی بنا خطوط نویسی میں
تکلف پیدا ہوگیا۔ اور وہ سادگی باقی نہ رہی جو
خطوں کے لئے زیور کا کام دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی
کہ خط وکتابت کی بنیاد محض ضرورت پر قائم تھی۔
اور اکثر تو ایسا ہوتا کہ اصل مضمون انتہائی مختصر ہوتا اور
غیر ضروری باتیں بہت زیادہ ہوتی تھیں۔

شاہی انشاپرداز محض دلچسپی کی خاطر داد قابلیت دینے لگے۔ اس طرح مکاتیب نگاری ادبی جوہر دکھانے کی جولان گاہ بن گئی، اور خطوط میں وہ تمام باتیں جو اُس زمانے کے ادب کی جان تھیں آ گئیں، یعنی اگر مضمون خواہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اگر اس میں جدّت پیدا کرنا ہو تو مقفیٰ مسجع عبارتوں، استعاروں اور تشبیہوں کی بھرمار کے بغیر کام نہیں بنتا تھا۔ اس کے ثبوت میں اُس زمانے کے وہ خطاط ہیں جن میں ذرا ذرا سے مضمون میں خوبصورتی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ الفاظ کھپانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔

القاب پر بھی اس کا کافی اثر پڑا۔ جو جس مرتبہ کا ہوتا اُس کے لئے ویسے ہی القاب استعمال ہوتے بعض وقت القاب طرفین کے تعلقات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اس لئے القاب لکھتے وقت بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا۔ بعض اس لئے بھی القاب بڑھا چڑھا کر لکھے جاتے کہ وہ ایسا سمجھنے لگے کہ اُس کی قدر و قیمت بادشاہ کے دربار میں بہت ہے، اور وہ بادشاہ کے بالکل قریبی لوگوں میں سے ہے۔ جس کے ردِ عمل کے طور پر وہ بادشاہ کی اطاعت کا پہلے سے زیادہ دم بھرنے لگتا۔

نجی خطوں میں بھی ہر رشتہ دار اور ہر حیثیت کے ملنے والے کے لئے جدا جدا القاب مقرر ہو گئے۔ اور اُن میں جدّت پیدا کرنا اچھے لکھنے والوں کی خصوصیت بن گیا۔ رقعات ابو الفضل، رقعات عالمگیر، انشاء مادھورام، فائق، سبرہار بجم وغیرہ فارسی کے وہ مکاتیب ہیں جو ہندوستان میں تیار ہوئے۔ جن میں متذکرہ بالا تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔ یہی مجموعے ہندوستان کی درسی کتابوں میں شامل رہے، اور جب تک پڑھے لکھے گھرانوں میں خط و کتابت فارسی میں ہوتی رہی۔ اُس میں اُن خطوط کا رنگ صاف جھلکتا رہا۔ اور جب خط اُردو میں لکھے جانے لگے تو انھوں نے اُردو خطوط پر بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑ دی۔

خط کو "آدھی ملاقات" کہا جاتا ہے "آدھی ملاقات" محض اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں صرف ایک جانب سے گفتگو ہوتی ہے۔ دوسری طرف سے خاموشی رہتی ہے۔ اگر یہ کمی نہ ہو تو ملاقات کے تمام مقاصد مکتوب سے مل سکتے ہیں۔ خط میں ایک خاص بات یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم اس میں وہ باتیں بھی لکھ جاتے ہیں جن کو ہم گفتگو میں نہیں کہہ سکتے۔ خطوط کے ذریعے ہم روٹھے ہوئے کو مناتے، بگڑے ہوئے سے صلح صفائی کرتے، ندامت کا اظہار اور معافی مانگتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے لئے خطوط ہمارے لئے انتہائی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

ہر شخص جب کسی سے ملتا ہے تو کچھ اپنی کہتا اور کچھ دوسروں کی سنتا ہے اور اس سے وہ خود بھی خوش ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی خوش کرتا ہے۔ یہ کام خط سے بھی ہو سکتا ہے۔ اچھے خط کی پہچان یہی ہے کہ وہ ملاقات کی تمام اغراض کو پورا کرے۔ جن خطوط کے مجموعوں میں ملاقات کے زیادہ سے زیادہ پہلو نظر آئیں اُسے لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جن لوگوں کی افتادِ طبع ہی کاروباری انداز سے کرتے ہیں۔ ان خطوط میں بھی یہی انداز آجاتا ہے۔ جس سے خطوط کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے۔

خط میں ہمیشہ طرز نگارش سے بہت اچھا اثر
ہے۔ یعنی جس طرح ہم ملاقات میں بات چیت
ہیں۔ اگر اسی طرح خط لکھا جائے تو اس کا اثر
الیہ پر بہت اچھا پڑتا ہے۔

غالب جو اردو خطوط نگاری کے باوا آدم
جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو میں خط لکھنا شروع
سے تیس سال قبل ۱۸۲۶ء کے لگ بھگ ایک
ب کی فرمائش پر فارسی خط و کتابت کے قواعد
مرتب کئے تھے۔ یہ باتیں انھوں نے فارسی خطوط کے
میں لکھی ہیں۔ لیکن اگر خطوط کو دلکش اور دل پسند
ہو تو ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل
آٹھ قواعد جو غالب نے بتائے ہیں بیش خدمت ہیں۔
خط کے شروع میں مکتوب الیہ کو اس کے موافق حال
کسی لفظ سے پکارا جائے۔
اس کے بعد زبانِ قلم پر ایک دم صرف مطلب
آجانا چاہیئے۔ القاب آداب خیریت گوئی اور
خیر و عافیت طلبی قطعاً زائد و بیکار ہے۔
خط لکھنے والے کو اس بات کی کوشش کرنا چاہیئے
کہ تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا ہو جائے۔ مطلب کو
اس انداز سے ادا کرے کہ سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔
اگر کئی باتیں کہنا ہوں تو وہ نہایت ہوشیاری
سے ترتیب دے۔
ایسا نہ ہو کہ الفاظ پیچیدہ ہو جائیں اور مطلب
کے اجزا ایک دوسرے سے مل جائیں۔
مشکل اور دقیق استعاروں اور غیر مانوس الفاظ
سے جو زمانے کے مذاق کے موافق نہ ہوں ہمیشہ اجتناب
کرے۔

۷۔ ایک لفظ کو بار بار لکھنے سے بچے۔ زبان کی خوبی ہاتھ
سے نہ جانے دے اور بے فائدہ طوالت سے ہمیشہ
بچتا رہے۔
۸۔ تمام خط میں کسی جگہ مکتوب الیہ کے مرتبہ و منزلت
کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔

غالب کے مندرجہ بالا قوانین کی رو سے
یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خط میں وہی انداز اپنایا جائے
جو گفتگو میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ بے تکلف دوستوں کی
ملاقات میں ایک دم اصل موضوع سے بات چیت
شروع ہو جاتی ہے۔ اگر خیریت وغیرہ کا ذکر آ بھی جائے
تو بیچ میں یا آخر میں آتا ہے۔ جیسا کہ گفتگو میں موٹے
موٹے اور معقول الفاظ سے بدمزگی پیدا ہو سکتی ہے
ویسے ہی خط میں بھی اگر یہی طریقہ اپنایا جائے تو عبارت
مشکل اور دقیق ہو جائے گی اور تصنع کا احساس ہوگا۔

ادبی حیثیت سے اگر ہم خطوط کا جائزہ لیں تو یہ
بات واضح ہو جائے گی کہ اس سے ہر خیال کا آدمی،
چھوٹا ہو یا بڑا، خواص سے ہو یا عوام سے برابر کا لطف
اٹھاتا ہے۔ ان خطوط میں انسانی زندگی کے ہر پہلو پر
تنقید، دنیا کے ہر ادب، آرٹ اور کسی نقطہ نظر پر تبصرہ
اور کائنات کی تمام جاندار اور بے جان اشیاء پر بحث
کی جا سکتی ہے۔ اچھے مکتوب نگار کے خطوط کے مجموعے
کی یہ خوبی ہے کہ اس میں سے ہر قسم کا قاری اپنے مذاق
کی بات نکال لیتا ہے۔ اور اس کے لئے دلچسپی کا سامان
مہیا ہو جاتا ہے۔

خطوط کا مطالعہ اس لئے بھی دلچسپ ہے کہ ان
کے ذریعے ہم مکتوب نگار کو روزمرہ کی زندگی میں حرکت
کرتے پاتے ہیں۔ اور اس کے لئے صحیح خد و خال ہمارے

سامنے اُجاگر ہوتے ہیں۔ بعض وقت تو ایسا ہوتا ہے کہ
قاری اِن خطوط میں اپنے دل کی دھڑکن بھی محسوس کرتا
ہے اور اس کو آپ بیتی سمجھنے لگتا ہے۔ کیونکہ خطوط عام
تحریروں سے ہٹ کر ہوتے ہیں اس میں لیا دیا انداز نہیں
ہوتا۔ یہاں زندگی اپنے اصلی خط و خال میں جیتی جاگتی
نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق، خطوط شبلی کے مقدمہ میں
لکھتے ہیں :-

"خانگی خطوں میں اور خاص کر اُن خطوں میں
جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک
خاص دلچسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں
ہوتی۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔
تکلف کا پردہ بالکل اُٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی
دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے
سے خود باتیں کر رہا ہے۔ جہاں اندیشۂ لائم نہیں ہوتا
یہ دلی جذبات اور خیالات کا روزنامچہ اور اسرار
حیات کا صحیفہ ہے پھر کون ہے جو اس خاموش
آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔ یہ ہماری فطرت
میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں، آپ بیتیوں
اور خطوں کو بڑے ذوق اور شوق سے پڑھتے ہیں۔"

خطوط کی ایک اہم خصوصیت انکی سادگی ہے
بلکہ یہ اُنھیں عام مقبولیت کا شرف حاصل ہوتا ہے
یہ ایسی سادگی ہوتی ہے کہ اس پر ہزاروں بناؤ سنگھار
قربان کر دیے جا سکتے ہیں۔ اس سے پڑھنے والے کو وہ
مزہ آتا ہے جو ادب کی کسی دوسری صنف میں آ نہیں
سکتا۔ اول تو ادبی تخلیقات انتہائی نپے تلے انداز اور
تمام ادبی اور تحریری پابندیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے
ادیب ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، اس میں وہ بے ساختگی
اور سادگی نہیں آنے پاتی جو خطوط میں اکثر اُجاگر ہوتی
ہے۔ اگر کہیں ان میں فطرت کی جھلک نظر آتی بھی ہے
ادیبانہ عبارت اور منشیانہ صفت کے پردوں کے
سے۔ اکثر پڑھنے والے اِن ہی میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں
اور حسن فطرت سے جو فنی پابندیوں سے آزاد ہوتا
ذرا بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس کے برخلاف
یہ خصوصیت صرف خطوط ہی کو حاصل ہے۔ اس ضمن
میں ڈاکٹر عبدالحق مقدمہ خطوط شبلی میں لکھتے ہیں

"انسان بچپن کی سی سادگی سے، بلا تصنع
اِن خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ
میں گذرتے ہیں جنھیں نہ انشا کی صفت مسخ کر سکتی
ہے اور نہ تشبیہات اور استعارات کا بوجھ دبا سکتا
ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل اور دماغ کھول
کر رکھ دیتا ہے۔ جس میں ہر حرکت، ہر خیال اور
تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔"

یہ ایک ایسا پرکھنے کا آلہ ہے جس پر ادب
فطری صلاحیتوں کو پرکھا جاتا ہے۔ یہاں پر ا
ادیبوں میں فرق محسوس ہوتا ہے جو مشق ریاضت
سے بنے ہوئے اور فطرت کے کارخانے میں تیار
ہوئے ادیب ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتے ہیں
مہدی افادی ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"سرسری خیال اگر اس پایہ کا ہو کہ انشا
پردازی اِسکی بلائیں لیتی ہو تو یہ بھی کمال کا ایسا
رُخ ہے جس سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔"

خطوط اِس لئے بھی جاذب نظر ہوتے ہیں
کہ اِن سے ادیب کی ذات کا صحیح پرتو اور کلام
تصانیف کے متعلق اس کا اپنا نقطہ نظر واضح ہوتا
ہے۔ خطوط سے بعض وقت ایسے ایسے راز اور مضا

ایسی ایسی کمزوریاں و خوبیاں معلوم ہوتی ہیں جن کو ہم دوسری طرف تلاش نہیں کرسکتے۔ اس معاملے میں خطوط ہی ہمارا ساتھ دیتے ہیں نیز ان ہی خطوط کی وجہ سے مصنف کی عادت و خصلت، خوبیاں، خامیاں اور اس کے دل کا راز معلوم ہوجاتا ہے۔ مصنف یہ سمجھ کر تمام چیزیں مکتوب الیہ کو لکھ دیتا ہے کہ وہ صرف مکتوب الیہ تک ہی محدود رہیں گی لیکن اسے کیا معلوم کہ لوگ اس کے ایک ایک پرچہ کی تاک میں لگے ہونگے اور اس کو ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب ہوں گے شائد اسی کے پیشِ نظر یہ بات کہی جاتی ہے کہ خطوط سوانح نگاری کی جان ہیں۔ خطوط کے ذریعے بھی ہم لکھنے والے کی زندگی اور ماحول کا صحیح علم حاصل کرسکتے ہیں اس کے اخلاق و اوصاف کا ہر پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ ذہنی ارتقا کی پوری کیفیت بھی قریب قریب ہمارے سامنے آجاتی ہے، جس کی وجہ سے ہم مصنف کی تصنیف کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

نفسیاتی تنقید میں مصنف کے خطوط سے بڑی مدد ملتی ہے۔ صرف تخلیقات کو سامنے رکھ کر اُسکے نفسیاتی پرتو کا جائزہ لینا بہت مشکل ہے۔ صرف خطوط ہی کی مدد سے ہم کسی حد تک اس کے کام کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ کیونکہ خطوط ہی ایک ایسا ذریعہ ہیں جس میں مصنف کھل کر بحث کرتا اور اپنے خیالات کو آزادانہ طور پر مکتوب الیہ کے سامنے پیش کرتا ہے جس سے نہ صرف مصنف کے نقطہ نظر کی ہی وضاحت ہوتی ہے بلکہ وہ کس رجحان کا حامل ہے اس کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ شائد اسی کے پیشِ نظر یورپ میں مصنفوں کے خطوط جمع کئے جارہے ہیں اور ان کی روشنی میں مصنفوں کے کام پر دوبارہ تنقید کی جارہی ہے۔ اسی وجہ سے کئی اہم گوشے جو آج تک دنیا کی نظروں سے اوجھل تھے سامنے آگئے ہیں۔

خطوط میں وہ تمام موضوع زیرِ بحث آتے ہیں جو کسی بھی ادب عالیہ کا سرمایہ ہوسکتے ہیں تنقید جو ادب کی جان ہے اس کی ابتدا بھی قریب قریب خطوط ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ انگریزی ادب میں تنقید کے بہترین نمونے خطوط ہی کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اردو ادب میں غالبؔ، اکبرؔ، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر اقبالؔ۔ سرسید احمد خان۔ شبلیؔ نعمانی، مولانا محمد علی جوہرؔ۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ۔ وغیرہ کے خطوں میں اتنے ادبی رموز اور نکات ہیں جو کسی حد تک دوسری صنف میں نہیں ملتے۔ خطوط میں انتہائی آزادی کے ساتھ تنقید کی جاتی ہے جو کسی مضمون کے ذریعے ممکن نہیں شائد اسی لئے بے لاگ تنقیدیں خطوط ہی میں نظر آتی ہیں۔ یہی بات خطوط کو ادب کی دوسری صنفوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

عربی و فارسی میں خطوط نویسی کا فن حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا لیکن اردو کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ چونکہ اردو فارسی سے متاثر رہی ہے اس لئے اردو مکتوبات بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ فارسی مکتوبات کی ہی پیروی اردو مکتوب نگار کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے مشکل پسندی جو فارسی خطوط کا طرۂ امتیاز تھا، اردو مکتوب نگاری کا بھی جزو بن گئی۔ اردو کا یہ ابتدائی دور تھا اسلئے اس میں اتنی پختگی نہیں آئی تھی کہ ادق خیالات اس میں ادا ہوسکتے البتہ اسلوب بیان میں صنائع اور بدائع کی

کثرت مقفیٰ اور مسجع عبارتوں کی بھتات، تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار اور القاب و آداب کی طوالت سبھی کچھ اس میں آ گیا۔

متذکرہ بالا خصوصیات مکتوبات احمدی و محمدی رقعاتِ عنایت علی انشار اُردو و سرور وغیرہ جو اُردو کے ابتدائی خطوط کے مجموعے ہیں نمایاں ملتی ہیں۔

غالب جنھوں نے اُردو خطوط نویسی میں حیرت انگیز تبدیلی کی اُن کے زمانے میں اور اُن کے بعد بھی پُرانے طریقے سے خط لکھنے والوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ غلام امام شہیدؔ اور غلام غوث بیخبرؔ جو غالب کے قریبی دوستوں میں تھے اُن کے خطوں میں یہی اسلوب نظر آتا ہے۔ اُردو خطوط نویسی کے اس اسلوب کی وضاحت مولوی غلام امام شہیدؔ کے خط میں جو انھوں نے ایک دوست کے والد کی وفات اور ان کی شادی پر لکھا تھا واضح ہوتی ہے۔ خط ملاحظہ فرمائیے :-

"مجموعۂ انشاء شیریں زبانی دیباچۂ کتاب سخن معانی زاد حقیقتۂ علم التشریح مراتب اشتیاق و آرزومندی کے تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے اور کچھ خوشی میں آ کر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔ زمانہ میں خوشی و غم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے...... تقدیر نے صبح کو اگر لباس سفید خوشی کا پہنایا تو شام کے واسطے جامہ سیاہ ماتمی بنایا۔ حاصل یہ آپکے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا۔ گویا اس گردشِ لیل و نہار نے خزاں و بہار کا تماشہ دکھایا .... اور اس غم نے جتنا رُلایا تھا، آپ کی شادی نے اتنا ہی ہنسایا۔ اس افسوس میں آسمان جو ماتمی لباس پہنے نظر آیا تو شفق کی سرخی نے وہیں خوشی کا رنگ بھی دکھایا۔ رنج میں دو ہتڑ جو پہلے سر پر مارا تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اُٹھا کر یہ دعا مانگی کہ خدا اس مرحوم کو جنت نصیب کرے اور آپ سلامت رہیں اور یہ شادی مبارک ہو۔ بندہ بھی ادائے رسم فاتحہ خوانی و شرکت محفل شادمانی کے واسطے ضرور حاضر ہوگا۔

زیادہ والسلام"

مولوی صاحب نے اس خط میں شادی اور غم دونوں کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس میں تعزیت کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی بجائے اس کے شادی اور تعزیت کو بین بین رکھا گیا، طریقہ کے مطابق اس میں تعزیت پر زیادہ زور دیا جانا چاہیئے تھا اس پورے خط کے مفہوم کو سیدھے سادے انداز میں بھی بیان کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اُس وقت کی روش شاید مولوی صاحب کے مانع ہوئی اور وہ تشبیہات، استعارات، محاورات، قافیہ پیما استعمال کئے بغیر نہ رہ سکے۔ القاب کا استعمال بھی پُرانے ڈھنگ کا ہے۔

غالب کے دوسرے دوست غلام غوث بیخبرؔ کا خط ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے غلام امام شہیدؔ کے نام لکھا ہے، ملاحظہ فرمائیے :-

"قبلہ میری شوخی دیکھئے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں، گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں...... یعنی حضرت کا دیوان مرتب کرکے اس کا دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسی

بات تھی جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے، ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو میں مرے ...... مگر چونکہ غلبہ شوق میں تمیز باقی نہیں رہتی۔ یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں کیا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ دیباچہ لکھ ڈالا۔ وہ اس کے قابل کاہے کو ہے۔ آپ کے دیوان پر میرا دیباچہ ایسا ہے جیسے موتی کی لڑی میں سنگریزے کا آویزہ لگا ہو۔ زربفت کی قبا میں چھینٹ کا حاشیہ لگا ہو ...... مگر اس نظر سے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ بدصورت کے مقابلے میں حسین کے حسن کو اور رونق ہوتی ہے ...... خاطر مشکل پسند کرے تو ہوسکتا ہے۔ بیشک دیکھنے والوں کو اس کی برائی سے اسکی خوبی زیادہ نظر آئے گی۔ میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو۔ اس کے لئے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت حاصل ہو۔"

اس خط میں بھی وہی انداز ہے جو پہلے خط کا ہے، القاب کے بغیر ہی خط شروع کر دیا گیا ہے بشائد غالب سے قبول کیا گیا ہوگا۔ غالب کے خطوط وجہ سے مشکل پسندی کے بجائے سہل پسندی عام ہونے، لیکن بعض لوگوں نے پھر بھی پرانی روش سے ہٹنا پسند ہیں کیا۔ اس کی مثالیں حسن نظامی کے خطوط سے بھی سکتی ہیں۔

غالب کے زمانہ میں خط و کتابت فارسی میں ہوا کرتی تھی غالب نے اُردو میں خط لکھنا کب شروع کیا اس کی تحقیق ابھی نہیں ہوئی۔ حالی نے یادگار غالب میں سنہ ۱۸۵۰ء اُردو خط و کتابت کا ابتدائی سال مانا ہے۔ مالک رام کا خیال ہے کہ غالب کی اُردو خط و کتابت اس سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ غالب کو اُردو میں خط لکھنے کا خیال کیوں ہوا اس بارے میں بھی ابھی فیصلہ نہیں ہوسکا ہے۔ حالی نے ایک خط کا حوالہ دیکر یہ بات ظاہر کی ہے کہ فارسی خطوط میں غالب کو بہت کاوش کرنا پڑتی تھی۔ آخر عمر میں جب تصنیف و تالیف کا بار بھی ان پر پڑ گیا۔ تو اُنھوں نے مجبوراً فارسی کو چھوڑ کر اُردو میں خطوط نگاری شروع کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن اُنھوں نے جس طرز اور جس انداز سے خط لکھے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اُن میں جدت بھی ہے۔ خطوں کی پرانی طرز نگارش سے پہلے ہی وہ بیزار تھے۔ اُن کے فارسی خطوط کا بھی ایک بالکل نیا رنگ تھا۔ قدیم انداز تحریر اس وقت بھی پسند نہیں تھا۔ جب وہ خود اس کی پابندی کرتے تھے۔ فارسی خطوط کے قواعد اُس وقت مرتب کئے تھے۔ جبوقت خود ان کے خطوط ان پرانی روشوں سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ اپنے ایک خط میں میر مہدی سے قدیم روش نامہ نگاری کی اس طرح مذمت کرتے ہیں۔

"تمہارا دماغ جل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو، مسودے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں یہاں قریب ہے۔ وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔"

ایک خط میں انتہائی پر تکلف القاب آداب لکھنے کے انداز پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں طنز کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"کیوں کر کیوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں؟ ہاں اُتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں واہ کیا ہوش مندی ہے کہ قبلہ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب،

... نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم؟ سن غالب!
ہم تجھ سے کہتے ہیں بہت مصاحب نہ بن۔ لے
ایاز! حد خود بشناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس
کے بعد نو بیت کی غزل لکھی ہے اور آپ
اپنے کلام پھر وجد کر رہا ہے۔ مگر یہ تحریر
کی کیا روش ہے؟ پہلے القاب لکھ، پھر بندگی
عرض کر۔ پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ
پھر عنایت نامہ آنے کا شکر ادا کر۔"

اُردو خطوط کا ابتدا سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان خطوط میں ہر موضوع پر بحث کی گئی ہے مکتوب نگار نے مکتوب الیہ کو کھلے طریقے سے مطمین ہی نہیں کیا بلکہ افہام و تفہیم کے ساتھ ساتھ ذاتی رائے کی کھلے دل سے وضاحت کر دی ہے۔

اُردو خطوط نویسی کی جہاں بات شروع ہوئی وہاں ہم غالب کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتے صرف اس لئے ہی نہیں کہ اُنھوں نے اُردو خطوط کی دنیا ہی بدل ڈالی بلکہ اس میں بذلہ سنجی نیز مکالمہ نویسی کو بھی شامل کیا۔ بعض جگہ تو اپنے نام و تخلص سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے اور ایسی ایسی گل فشانیاں کی ہیں کہ خط پڑھنے کے بعد دن، وقت، تاریخ، سنہ، موسم، ماحول کا انتہائی انوکھے انداز سے اظہار ہوتا ہے۔

غالب کے بعد اُردو خطوط کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اُردو خطوط نے کافی ترقی کی ہے۔ جن مشاہیر کے خطوط کی وجہ سے یہ تبدیلی اور ترقی عمل میں آئی ہے اُن میں سے سرسید احمد خاں رح، خواجہ الطاف حسین حالی رح، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی رح، حضرت اکبر آلہ آبادی، ڈاکٹر اقبال رح اور حضرت جگر مرادآبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان مشاہیر کے خطوط سے نہ صرف نثر میں تبدیلی ہوئی بلکہ ان کے افکار کی وجہ سے اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ یہی خطوط ہمیں اس بات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں کہ اُس وقت کا تاریخی، سیاسی، سماجی پس منظر کیا تھا۔

سرسید نے جو خطوط لکھے ہیں اُن میں ادبی، اصلاحی، سیاسی، انتظامی، اور بعض میں سفری حالات بھی ملتے ہیں۔ ان تمام خطوط میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ سرسید کی قوم سے بے پناہ محبت اور قومی اصلاح ہے۔ اسی طرح مولانا حالی کے خطوط بھی اصلاحی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ ان میں بھی وہ رس نہیں ہے جو خطوط کی جان ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سرسید، حالی اور ان کے رفقا علیگڑھ تحریک (اصلاحی تحریک) سے وابستہ تھے اور ان لوگوں نے نظم و نثر دونوں سے قومی اصلاح کا کام لینا چاہا خطوط میں بھی ان لوگوں کے پیش نظر یہی پہلو تھا۔ اس لئے اس میں ان لوگوں کا انداز ناصحانہ نظر آتا ہے۔

شبلی نعمانی نے جو خطوط لکھے ہیں اُن میں علمی، مذہبی، اخلاقی درس ہی نہیں زبان کی چاشنی بھی ملتی ہے۔

اکبر الہ آبادی کے خطوط میں وہ بات نہیں جو ان کی شاعری میں ہے یعنی طنز و ظرافت کا ان کے خطوط میں نام و نشان نہیں ملتا۔ بعض خطوط میں علم

ادبی بحیثیں کرتے ہیں لیکن اکثر اپنی بیماری کا ذکر زیادہ کرتے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کے خطوط انتہائی سادا، بے لاگ، اور نیک دلی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ بعض جگہ تلخی، تیزی، غصّے کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ کچھ اس انداز سے لکھتے ہیں کہ قاری اس تلخی وغیرہ میں اپنایت محسوس کرنے لگتا ہے۔

جن مشاہیر کے خطوط میں انتہائی انداز جھلکتا ہے اُن میں مولانا عبدالکلام آزاد، سر سید، مہدی افادی، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ ہیں۔ مولانا ابوالکلام کا انداز بیان انوکھا اور منفرد ہے۔ غبار خاطر ان کے خطوط کی بہترین مثال ہے ان خطوط میں آزاد نے فلسفۂ غم و مسرت، فلسفۂ وجودیت، فلسفۂ حیات و ممات پر بہت کھل کر بحث کی ہے۔

سید عبدالسلام شاہ:

فیض محسنؒ

ملک الشعراء حضرت نیرنگ کاکورویؒ

دنیا عجب مقام ہے۔ جس کے ہر ملک ہر خطہ ہر شہر ہر قصبہ کی خصوصیات زبان زد خلائق ہیں۔ کسی مقام سے اہل حکمت اور فلاسفر اُٹھے کہیں پر دلیر اور شجاع پیدا ہوئے۔ کسی مقام کے فنکار اور صاحبِ ایجاد و اختراع مشہور ہوئے کوئی خطہ اپنی سخاوت مآب ہستیوں سے مشہور عالم ہوا کوئی مقام بزرگوں کی نسبت سے مرجع عوام ہوا کسی جگہ کو حافظ و سعدیؒ نے شہرت دوام عطا کیں۔ سورداس کالیداس تلسی داس جیسے قابل لوگ پیدا ہوئے کسی مقام کو غالب و ذوق نے اپنے افکار عالیہ سے عالی منزلت بنایا تو کسی مقام کو آتش و ناسخ کی آتش بیانی نے گلزار ابراہیم بنا دیا تو کسی مقام کے لئے میر انیس اور مرزا دبیر فخر ثابت ہوئے تو کوئی مقام شہیدی اور امیر مینائی پر نازاں نظر آیا اسی طرح مضافات لکھنؤ میں ایک قصبہ کاکوری نام کا ہے وہ بھی اپنے یہاں کی چند قابل لائق اور مشہور اور معروف ہستیوں پر جتنا فخر کرے کم ہے۔ ان میں حضرت محسن کا نام آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے آپ کا خاندان ہمہ آفتاب است کے مصداق رہا ہے۔ جس کی ضیا پاشی سے سرزمین کاکوری کا ذرہ ذرہ ستارہ بن کر چمکا۔ اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر اس قصبہ کے نام کو روشن کیا۔ ہم آج اس قصبہ کے ایک ایسے نامور شاعر سے ناظرین کو روشناس کرا رہے ہیں۔ جو حضرت محسن کا تلمیذ خاص اور خواہرزادہ ہونے کے علاوہ فدائے محسن تھا جو ہمہ وقت مداح محسن تھا جس نے راجپوتانہ کی ایک ریاست جھالاواڑ میں اپنی شاعرانہ صلاحیت اور اُستادانہ قابلیت سے نہ صرف عوام کو اپنایا بلکہ روسائے جھالاواڑ کو اپنا ایسا گرویدہ کر لیا کہ ایک رئیس مہاراجرانہ بھوانی سنگھ صاحب نے اسے اپنی مصاحبت اور خطابِ افتخار الشعراء سے سرفراز کیا تو دوسرے رئیس مہاراجرانہ راجیندر سنگھ صاحب محمود نے اپنا اُستاد سخن بنا کر تعظیم اور تلائی کڑے کی ریاستی اعزاز سے اس کو معزز اور ممتاز فرمایا وہ معزز و ممتاز ہستی مولوی عبد الحمید صاحب نیرنگ تلمیذ حسان الہند حضرت محسن کاکوروی کی ہے۔ حضرت نیرنگ کے والد ماجد کا نام عبدالمجید اور تخلص سحر تھا۔ جد امجد کا نام غلام مینا اور تخلص ساحر تھا سرمایہ افتخار نیرنگ کے صفحہ ۹ پر درج ہے کہ حضرت ساحر فارسی شاعری میں علی حزیں آرزو اور نظیری کے ہم پلہ تھے اور سحر فصیح الملک نواب میرزا خاں داغ کے ہمعصر تھے۔

حضرت نیرنگ کی پیدائش زمانہ غدر کے بعد ہوئی
ن ولادت محفوظ میں نہیں رہا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت
ریں ہوئی۔ حضرت نیرنگ کے ارشاد سے یہ معلوم ہوا کہ
یام طفولیت سے اپنے خال الکرم حضرت محسن کے
س رہے اور آپ کی دیکھ بھال میں آپ کی تعلیم جاری
ی۔ مولوی نور الحسن صاحب نیر مؤلف نور اللغات نے
ن نیرنگ کے صفحہ ۱۲ پر تحریر کیا ہے کہ جناب نیرنگ
مولوی حافظ علی شاہ علی الورصد ... سے نالو
... علم ادب ... علی ... سے
مرحوم نواب حامد حسین خاں صاحب مرحوم تلمیذ اسیر
... میں پڑھا شعر و سخن میں اپنے بڑے ماموں حضرت
... حضرت محسن کاکوروی سے اصلاح لی۔ جس شخص نے
لیسے ایسے نامور ذی علم روشن ضمیر حضرات کے روبرو
زانوئے ادب تہ کیا ہو اس کے باکمال ہونے میں کیا شبہ ہو
سکتا ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد جناب نیرنگ لکھنؤ میں
ہی کسی محکمہ میں کچھ عرصہ ملازم رہے۔ وہاں سے کسی بات
ترک ملازمت کرکے گوالیار اور بھوپال میں بھی ملازمت کی
ان دونوں مقامات پر بھی شعر و شاعری کی وجہ سے لوگوں نے
... اور کچھ لوگوں سے باہمی چشمک بھی ہوئی۔ مزاج میں
... تیزی تھی۔ ویسے اخلاق نہایت وسیع تھا۔ انسانی
ہمدردی اور ایثار و قربانی کا جذبہ سرشت میں تھا۔ مگر
... ذرا ... جو خوشامد پسند طبیعت نہیں تھی
... باتیں ملازمت میں مشکل سے نبھتی ہیں۔ اس لئے ان
مقامات سے بھی ملازمت ترک کرنا پڑی تھی۔

اس زمانہ میں ریاست جھالاواڑ میں مہاراجہ راناجی بھوانی
سنگھ صاحب مسند نشین تھے جو انتہائی علم دوست راجہ تھے
اور قابل لائق لوگوں کے قدر داں تھے۔ دیوان ریاست پنڈت
پرمانند چترویدی تھے خود قابل اور قابلوں کے قدر شناس
تھے آپ کی طلبی سے حضرت نیرنگ جھالاواڑ تشریف لائے
دیوان صاحب قدر دانی اور خصوصیات خاندانی کی مراعات
کا یہ انجام ہوا کہ آپ کو یکم جولائی ۱۸۹۹ء کو اپنے محکمہ عالیہ
دربار میں بعہدۂ محافظ دفتر مامور فرمایا۔ یکم نومبر ۱۹۱۱ء
کو حضرت نیرنگ کی پنشن ہوگئی مگر حضرت نیرنگ بعد
پنشن بھی جھالاواڑ ہی میں قیام فرما رہے اور متواتر خدمت
ادب فرماتے رہے۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۴ء کی
صبح کو فالج ہوا۔ اور ۲۵ دسمبر ۱۹۲۴ء کو آپ اس جہان فانی
سے رحلت کر گئے۔ مادۂ تاریخ رحلت میں نے آپ کے مقطع
کے ایک مصرع سے نکالا ہے[1]

مقطع نیرنگ: ۔ ہمیں چھوڑا یہاں کا رنگ نیرنگ
چلا دامن فشاں اس خاکداں سے　　۱۳۴۳ھ

خدا معلوم استاد مرحوم نے یہ غزل کس عمر میں کہی تھی مگر اس
غزل کے اکثر شعر آخری عالم کے بعینہ آئینہ دار ثابت ہوئے
فالج ہونے پر زبان کام نہیں دیتی تھی اور مرض نے بہت
جلد ان کو دنیا سے رخصت کر دیا اس کیفیت کو کتنے پہلے شعری
صورت میں کہہ گئے تھے[1]

دم آخر اجل نے کی یہ عجلت　　کہ میں کہنے نہ پایا کچھ زباں سے
نہ آئی جا کے پھر وہ بے مروت　　گلہ باقی رہا عمر رواں سے

مقطع اوپر درج ہے شاعرانہ انداز میں فن کا مظاہرہ فرماتے
ہوئے جس حقیقت حال کا انکشاف کیا ہے اس سے سیاحت
عدم آباد کی وہ اصل صورت سامنے آجاتی ہے۔ جو دل پر
اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نہ اس وقت کہنے والے کو

---

[1] کس حقیقت کا کس انداز میں اظہار فرمایا ہے۔

پتہ ہو گا نہ سننے والے اس بات پر پہنچے ہوں گے کہ یہ مصرع

چلا دامن فشاں اس خاکداں سے

مادۂ رحلت ہو گا۔ اور کہنے والا برسوں پہلے کتنا تناسب اپنے لئے مادۂ رحلت خود لکھ جائے گا۔ حضرت نیرنگ کے مزاج میں علم دوستی کے ساتھ ساتھ وطن دوستی کا جذبہ بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ وہ ایک منٹ انگریزوں کے وجود کو دیکھنا ہندوستان میں پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ لکھنؤ اور دہلی جیسے شہروں میں رہتے تو بلا شبہ وہ کانگریس کے ایک سرگرم کارکن ہوتے۔ گاندھی جی کے ساتھ تحریک آزادی کے وہ بھی ایک علم بردار ہوتے۔ ہندو مسلم منافرت سے وہ سخت نالاں تھے۔ ایسے ہندو مسلم لیڈروں سے جو قوم و مذہب کا نام لیکر باہم ہندو مسلم اتحاد کو ٹھیس پہنچاتے تھے سخت متنفر تھے۔ ریاستی جکڑ بندیوں کے باوجود وہ تحریک آزادی کے حامی تھے۔ کھدر پوشی کے تحریک کے وہ اس زمانہ میں عملی شامل بغیر کسی جھجک کے ہوئے ۔ اخبار اودھ پنچ میں جہاں آپ کے تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ آج وہ ذخیرہ میرے پاس موجود نہیں۔ ورنہ جستہ جستہ اقتباسات اپنی تحریر کے ثبوت میں پیش کرتا۔ کاتب الحروف کی جانب سے بھی بزمانۂ طالب علمی۔ بڑا دن۔ سال نو پر ایسے مضامین جاتے تھے۔ جن سے یگانگت اور باہمی اتحاد کو تقویت پہنچے اور اغیار کے دام استبداد سے ملک آزاد ہو۔ علاوہ اودھ پنچ کے روزانہ اخبار بھی ایک دو ضرور آتے تھے۔ اخبار بینی کا بیحد شوق تھا اپنے متمول دوست احباب کو دیکھنے کے لئے اپنے مطلوبہ اخبارات بھیجتے تھے۔ کوشش فرماتے تھے کہ اخبار بینی کا مذاق عام ہو اور ہندوستان کی فلاح و بہبود کی طرف لوگوں کے دماغ مائل ہوں۔ شاعری

اور اخبار بینی کے علاوہ آپ کو پتنگ بازی کا بیحد شوق تھا جو آخر تک رہا اور اودھ پنچ کے مذاق سے بھی آپ کو خاص مذاق تھا۔ دہلی لکھنؤ کے زباندانی کے معرکات سے بھی آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے کلام پر اکثر تنقیدی مضامین کی اشاعت اودھ پنچ میں ہوتی تھی۔ میں نے اودھ پنچ کے ایک پرانی جلد میں حضرت داغ کے قصیدے پر حضرت نیرنگ کا ایک تنقیدی مضمون پڑھا تھا۔ اس قصیدے کا ایک مصرع مجھے اب تک یاد ہے۔

ہیں دو گوہر ہیں دو جوہر آفتاب و ماہتاب

یہ سب کچھ عناد کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اصلاح زبان کے خاطر تھا۔ ورنہ حضرت داغ کے کلام کی خود میں نے آپ سے تعریف سنی ہے۔ اودھ پنچ میں کاتب اللغات آپ کی تصنیف کردہ شائع ہو چکی ہے وہ تفنن طبع کا جہاں بہتر سرمایہ ہے۔ اصلاح کا بہترین نمونہ ہے یہ لغت حضرت نیرنگ کی جودت طبع کی آئینہ داری کرتی ہے۔ اودھ پنچ میں جو مضامین گھنچکر لالا کے نام سے ہوتے تھے وہ آپ کے ہوتے تھے۔

جھالا واڑ میں حضرت نیرنگ کی تشریف آوری کے قبل بھی شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اور ایک دو حضرات کو لوگ استاد بھی سمجھتے تھے۔ لیکن جناب نیرنگ جیسا قابل اور زباندان۔ سخن رس۔ نقاد فن۔ محقق ادب۔ استاد لوگوں کو جھالا واڑ میں جب مل گیا۔ ذوق و شوق سے لوگ حضرت نیرنگ مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ اور آپ کی خداداد قابلیت شہرت کا باعث ہوئی۔ کچھ لوگوں کو چشمک ہوئی۔ ہر استاد نے اپنے اپنے طور پر جانچ پرتال بھی کی۔ مگر ان باتوں سے آپ کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ اور مشاعرے دھوم دھام سے ہونے لگے اصلاح زبان ہونا شروع ہوئی۔ مشاعروں کے انعقاد سے عوام الناس کی زبان صاف ہوئی۔

راسی صحت و صفائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک بار انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن سے بغرض جائزہ زبان اردو سید ظہور شمی تشریف لائے تھے تقریر میں کہا کہ یہاں کی زبان جھتما ان کے اور مقامات کے مقابلہ میں بہت صاف و شستہ معلوم ہوئی سنا ہے کہ تحریری رپورٹ بھی ان کی یہی ہے۔ بہر حال یہ صفائی اور شستگی زبان اور مشاعروں کی سرگرمی حضرت نیرنگ کی جگر کاری کی رہین منت ہے۔

مشاعرے پرائیویٹ طور پر جاری تھے۔ مہاراجہ بھوانی سنگھ صاحب جو خود علم دوست اور سخن سنج تھے۔ ان کو بھی شاعروں کا کلام سننے کا شوق پیدا ہوا ۱۹۰۵ء میں سرکاری طور پر پندرہ روزہ بزم مشاعروں کی بنیاد پڑی۔ ہر مشاعرے میں خود رئیس وقت شرکت کرتے اور مناسب داد سے شعرا کی حوصلہ افزائی فرمائی جاتی تھی۔ شہر میں اس بات سے شوق شاعری میں اور اضافہ ہوا۔ اور تلامذہ نیرنگ کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ اور مہاراجہ بھوانی سنگھ صاحب کے دل میں آپ کی قابلیت اور جولانی طبع کی نقوش فرید مرتسم ہو گئے۔ پنشن میں کبھی کسی کا اس وقت تک اضافہ نہیں ہوا مگر دربار نے دو بار آپ کی پنشن میں گرانقدر اضافہ فرما کر حضرت نیرنگ کو نشست دریچانہ کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ ۲ دسمبر ۱۹۲۷ء کو تقریب سالگرہ کے موقع پر خطاب افتخار الشعراء سے مزید اعزاز عطا کیا گیا۔ اور طباعت دیوان کا ارشاد فرمایا۔

مہاراج کا یہ عمل تھا کہ روزانہ صبح کو آپ کے دربار میں سنسکرت اور ہندی کے کوی اور پنڈت۔ انگریزی لٹریچر کے ماہر عربی و فارسی اور اردو کے عالم اور شاعر نیز دیگر فنون لطیفہ کے مشاق حاضر ہوتے تھے اور اپنے بیان اور زبان کے جوہر دکھاتے تھے اس وقت دو غزل حضرت نیرنگ کی بھی ضرور سماعت فرماتے تھے۔ اس طرح پورا دیوان نیرنگ اس رئیس علم دوست کا سنا ہوا ہے۔ دیوان طبع نہ ہونے پایا تھا کہ مہاراج بھوانی سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ دیوان کی طباعت بھی مشکل میں پڑ گئی مگر جب شری مہاراج راجندر سنگھ مسند نشین ہو گئے اور زمام حکومت سنبھال لی۔ تو آپ نے اور احکامات کے ساتھ دیوان نیرنگ کی طباعت بھی جاری کر دی مسند نشینی کے بعد پہلی سالگرہ کی تقریب جس میں رئیس الور بھی شریک تھے مطبوعہ دیوان دونوں رئیسوں کو پیش کیا گیا اور حضرت استاد کو خلعت فاخرہ سے نوازا گیا۔ مہاراجہ راجیندر سنگھ صاحب کو خود شوق شاعری ہوا۔ اور آپ نے حضرت نیرنگ کو اپنا استاد بنایا اور اپنی سالگرہ کی تقریب کے موقعہ پر راجیہ سبھا میں حضرت نیرنگ کو خطاب ملک الشعرا سے صاحب افتخار کیا تعظیم اور طلائی کڑہ تقریباً ۴۰ تولہ کا پاؤں میں پہنے کو دیا یہ ریاست کا خاص اعزاز تھا۔ جو خاص معزز لوگوں کو ہی دیا جاتا تھا۔ روسائے وقت کی ان حوصلہ افزائیوں سے جھالا واڑ میں شوق شاعری ترقی کرتا رہا مہاراج راجیندر سنگھ صاحب اتنی عزت کرتے تھے کہ آپ اکثر مولوی صاحب مرحوم کے مکان پر آ جاتے تھے مولوی صاحب ایک مجذوب بالجی کے بڑے معتقد تھے وہ آپ کے مکان پر ہی رہتے تھے۔ مہاراج ان کے درشن کرکے نہایت خوش ہوتے تھے۔ یہ خصوصیات جھالا واڑ کے رئیسوں کی ایسی ہیں جو یادگار رہ گیں۔

حضرت نیرنگ نے تلامذہ کی مشق سخن کے لئے اپنے دولت کدہ پر دفتیہ مشاعرہ کی طرح ڈالی تمام تلامذ شب کو وہاں جمع ہوتے کسی دیوان سے کوئی طرح دیجا تی اور وقت معینہ کے اندر ہر شاعر سے اس کا پرچہ لے لیا جا

تعداد اشعار کے ساتھ ساتھ فنی خوبیاں بھی اس کی تخلیقات میں بلحاظ مضمون تخیل۔ بندش۔ دیکھی جاتی تھیں۔ حضرت اُستاد کی نظر میں جس کا کلام معیار میں پورا اُترتا وہ قابلِ داد و تحسین ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں نقائص و نقائص شعری پر بھی توجہات مبذول کیجاتیں یہ طریقہ انتہائی منفعت رساں ہوا۔ تلامذہ کو کوئی بات موزوں کرنا دشوار نہ رہا۔ جس وقت مہاراجہ بھوانی سنگھ نے منظومات یا مثنویات لکھنے کے لئے شعرا کو مختلف موضوعات دئے تو شاعر کو اپنے موضوع کو منظوم کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔

طریق اصلاح اتنا اچھا تھا کہ شعر معمولی تبدیلی سے نہایت بلند ہو جاتا۔ اس موضوع پر اگر تفصیل سے مستقل قلم اُٹھائی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ میں اپنی ابتدائی دور کی غزل کے چند شعر تمثیلاً پیش کرتا ہوں جس سے بخوبی طریق اصلاح ذہن نشین ہو جائیگا۔ طرح مشاعرہ تھی :-

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

یہ سرکاری مشاعرہ کی طرح دیوان ذوق سے خود مہاراجہ کی دی ہوئی تھی۔

شفیق :- (مطلع)

ناحق کسی کے دل کو کبھی بھی نہ چھیڑ تو
دنیا میں میل جول سے اپنی نبیڑ تو

اس مطلع پر کوئی اصلاح نہیں ہوئی بلکہ اُستاد نے بنادیا جو میرے لئے باعث فخر ہوا۔

شفیق :-

آفات و درد و کرب کا خوگر آشنا ہوں میں
اے موجِ عمر مجھ کو نہ اتنا تھپیڑ تو

حرف عطف کا تسلسل ثقالت پیدا کر رہا تھا طرز بیان میں سختی تھی۔ اصلاح سے یہ عیوب دور ہو گئے۔ اور شعر شعر ہو گیا۔

شفیق :-

ہے مثل آفتاب سرکوہ زندگی
ناحق نہ دامن اپنا لہو سے تھیڑ تو

اصلاح میں اس کی عمر کی جگہ لفظ زندگی رکھا گیا ہے۔ لیکن ایک لفظ زندگی سے جو شعر میں زندگی آگئی وہ اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں۔

شفیق :-

صبر و شکیب و حکم رضا پر ہو کاربند
داماں کو حرص و آز سے اپنے سیکڑ تو

اصلاح میں کا کی جگہ پر رکھ دیا ہے۔ ایک حرف کی تبدیلی پر شعر میں خوبی آگئی۔ اس تبدیلی کے باوجود استاد نے اس اس پر صاد فرمایا۔ تو مشق شاگرد کی غزل میں دو شعروں پر صاد ملنا نعمت غیر مترقبہ کا ملنا تھا۔

شفیق :-

کہدے شفیق اس سے کہ دل ہے خدا کا گھر
خوف خدا بھی چاہیئے اس کو نہ چھیڑ تو

اصلاح سے طرز بیان میں زور پیدا ہو گیا دوسرے مصرعے میں اس واسطے ہی کتنا بدنما طریقہ بیان تھا۔ اُستاد نے اس کو تبدیل کیا۔ دونوں مصرعوں سے دل کی تکرار بھی دور ہو گئی۔

حضرت والد ماجد قبلہ جناب تسلیم کی ایک اصلاحی غزل کے چند شعر درج کرتا ہوں۔

تسلیم :- ذراسی زندگی ارمان کیونکر دل سے نکلیگا
غضب یہ ہے کہ اس ارمان میں مشکل سے نکلیگا

ح: کیا اس میں ء کا ٹکڑا کیونکر کر دینے سے کچھ بات
در پیدا ہو گئی۔

سلیم

دل پرایناق لو ہے نہ قابو میں زبان اپنی
اس وقت پرسشں کیا زبان دل سے نکالیگا

ح سے انداز بیان کتنا صاف اور موثر ہو گیا۔

سلیم:-

ذرا سی زندگی میں دل کو دنیا سے لگا بیٹھے
اگر دل لگ گیا تو اس میں تو مشکل سے نکلیگا

دل لگ گیا اس میں تو کی ترمیم سے شعر کا پایہ کتنا بلند
ہوا۔

سلیم:-

تماشا دیکھیے وہ بام پر آئے تھے پرسش کو
کوئی کشتۂ حرماں اسی منزل سے نکلیگا
اح سے شعر میں سند بیت آگئی۔

سلیم:

کسے دکھلائے گا تسلیم منھ اپنا وہ دنیا میں
ذلیل و خوار ہو کر جو تیری محفل سے نکلیگا

اصلاح سے بیان میں سلامت و روانی پیدا ہو گئی۔

حضرت نیرنگ مرحوم کے تلامذہ کی تعداد شہر جھالا
[illegible] ۲۰۰ یا ۵۰ تک تھی۔ طرحی مشاعرہ ہوتے تھے۔ ۴۰
شاگردوں کی غزل پر اصلاح دیکر اسی طرح میں ایسی
[illegible] کہنا جس سے شان استادی برقرار رہے یہ استاد
داغ ہی کا کام تھا۔

ابتدا میں ایک مقام پر مستقل قیام نہ رہنے سے
بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ سرمایہ افتخار نیرنگ تاریخی نام
[illegible] یعنی دیوان نیرنگ کل ۲۰۰ صفحہ پر مشتمل ہے ۱۹۲۹ء

ابتدا میں "شکریہ اعزاز" حضرت استاد ہے دیباچہ صفحہ ۳
سے صفحہ ۶ تک قاضی عزیز الدین احمد خانصاحب دیوان
ریاست دتیا کا ہے۔ جو حضرت استاد کے ہمعصر دوست اور
ہموطن تھے صفحہ ۷ سے صفحہ ۱۲ تک [illegible] عالی عنوان
سے آپ کے صاحبزادہ [illegible] سید رفیق احمد صاحب
علوی کی تحریر ہے صفحہ ۱۳ سے ۱۷ تک مولوی نور الحسن صاحب
نیر مولف نور اللغات کی مجمل تحریر ہے جس میں حضرت نیرنگ
کی تعلیم و تربیت، ملازمت اور شاعری پر روشنی ڈالی
گئی ہے۔ باہتمام و تصحیح مولوی نور الحسن صاحب مطبع نیر پریس
[illegible] لکھنؤ میں طبع ہوا ہے سائز بڑا نہ کتابی ہے۔ کتابت
کی غلطیوں کی کثرت ہے غلط نامہ بھی تیار کر لیا گیا تھا۔
مگر وہ طبع نہ ہو سکا۔ رباعیات شائع ہونے سے رہ گئی
ہیں۔ ردیف وار پورا دیوان ہے آخر میں دو قصیدے
مہاراجہ [illegible] کی منقبت میں [illegible] ہیں۔ چار
تضمینیں ہیں۔ چند قطعات تاریخ ہیں۔

آخر میں طباعت دیوان کے سلسلہ میں تلامذہ کے
قطعات تاریخی ہیں جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔
ظہیر الدین صاحب [illegible] عزیز خانصاحب، قاضی
احمد بخش صاحب۔ منشی صغیر الدین صاحب۔ عبد السلام
بیگ شفیق۔ الٰہی بخش صاحب زاہد۔ پنڈت گنیش رام صاحب
برہمن۔ عبد النبی خانصاحب غنی۔ سید صادق حسین صاحب
رضوی۔ منشی عبد الحمید خاں [illegible] سلطان بیگ۔ منشی
سکندر خاں صاحب اثر ان کا مادہ دیوان کا تاریخی نام
ہے۔ منشی عبد العزیز صاحب عزیز۔ مرزا منیر بیگ صاحب
یقین۔ حافظ محمد یٰسین صاحب شریں۔ بابو شمبر ناتھ صاحب
مسکین۔ مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب یکرنگ۔ منشی حبیب
احمد خاں صاحب شیدا۔ منشی وجیہ الدین خاں صاحب

حنیف تلمیذ امیر مینائی مرحوم، مرزا رفیق بیگ صاحب تسلیم ابو البیان سید رفیق احمد صاحب تسنیم۔

دیوان حمد و نعت سے شروع ہوا ہے۔ مطلع اول حمد شاہ امیر ہے۔

چمکے فروغ حمد سے حسنِ رقم مرا
سجدے میں سر جھکائے ادب سے قلم مرا

نعت کا مطلع زینتِ دیوان ہے۔

محفلِ قدس کی رونق کا بڑھانے والا
لامکاں میں کوئی مہمان ہے آنے والا

حسن مطلع اس طرح حسنِ دیوان دوبالا کر رہا ہے۔

وہ براق نبوی خلد سے آنے والا
تیز مانند نظر عرش پہ جانے والا

خوف محشر، ندامت عصیاں، امید کرم تینوں معاملات کو کس سادگی کے ساتھ زیب قرطاس کیا ہے۔ بے ساختہ منہ سے داد نکلتی ہے۔

میں چلا حشر میں روتا ہوا پیچھے پیچھے
آ گئے آگے مری بگڑی کا بنانے والا

ردیف داؤ میں ایک غزل نعتیہ اور درج ہے۔ اس غزل کے رنگ اور انداز بیان تدرج خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ گلستانِ حسن کا عندلیبِ خوشنوا کس طرح فضائے قدس کو مسحور کر رہا ہے۔

بہار آفرینش زینتِ ارض و سما تم ہو
رموز کن فکاں کا اصل مقصد مدعا تم ہو

کریم و کارساز و چارہ گر مشکل کشا تم ہو
خدا تو ہو نہیں سکتے مگر شانِ خدا تم ہو

تمہارے عکس سے روشن نگارستانِ وحدت ہے
حریم قدس میں آئینہ حیرت نما تم ہو

شرف ختم رسالت کا ہو کس کو نسل آدم میں
ازل ہو گیا فیصل۔ کہ ختم الانبیا تم ہو

بنا کر تم کو دیکھا ہے خدا نے اپنے عالم کو
شبستانِ قدم میں قد آدم آئینہ تم ہو

اس غزل میں ۳۴ شعر ہیں۔ ہر شعر لاجواب ہے دل چاہتا کہ پوری غزل ہی نقل کر دی جائے۔ مگر مضمون طویل ہو جا رہا ہے اس لئے پانچ شعر ہی اقتباس کئے گئے۔ منقبت حسین علیہ السلام میں اس طرح گل افشانی کی گئی ہے

فضیلت شاہزادوں کی یہ کیا کم ہے مسلمانوں
علی کی فاطمہ کی احمد مختار کی جاں ہے

اُنھیں کے نام سے ہے گلشنِ اُمت کی زیبائش
گلستانِ رسالت کے یہ دونوں سرو بستاں ہیں

حضرت اُستاد کے کلام میں لکھنوی رنگ غالب ہے اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ کیوں کہ آپ لکھنؤ کے قریب کے رہنے والے تھے لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ لکھنؤ کی زبان و بیان سے گرویدگی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ رنگ قدیم کی جھلک کلام میں نہ ہوتی تو اُس قدیم زمانہ میں کون پسند کرتا۔ کلام میں وہی استعارات و تشبیہات متداول ہیں۔ لیکن ان کے رکھ رکھاؤ کی خوبی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اُستاد سخن نے کس طرح ان چیزوں کو اپنا بنا لیا۔ اسی کو جدت طبع کہا جاتا ہے اسی کا نام اختراع ہے۔ یہاں قدیم اور جدید کا ذکر آنے پر ایک بات اور یاد آ گئی جو لکھتا ہوں آپ کے چند شاگرد داٹاوہ کا نپور میں بھی تھے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۲ء تک وہاں کے شاگردوں کی غزلیں اور نظمیں اصلاح کو آتی تھیں۔ وہ غزلیں اور نظمیں جدید رنگ کی ہوتی تھیں۔ ان پر اسی رنگ کی اصلاح بھی ہوتی تھی۔ یہ بات تلامذۂ نیرنگ ہی جان سکتے ہیں۔ ہمارا خیال

بوانی سنگھ صاحب کا انتقال ۱۹۲۹ء میں ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سے نئی غزل تو آپ نے کوئی لکھی نہیں۔ صرف اصلاحِ سخن کا کام ضرور جاری رہا۔ اگر حضرت اُستاد رنگِ جدید کی طرف متوجہ ہوتے تو ان کے اختراع پرداز دماغ اور جدت طبع کی نیرنگیاں بھی وہ عطا باریاں ہوتیں۔ جس سے گلستانِ ادب اور خوش رنگ نظر آتا۔ ہم اب کلامِ نیرنگ سے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے شعر میں فنی اعتبار سے کوئی خوبی ہوگی بیان اور زبان کا لطف ہوگا۔ عیش کی واردات ہوگی تصوف کی بات ہوگی۔ فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ ہوگا۔ سلاست و روانی کا دریا ہوگا۔ تشبیہات و استعارات کا شگفتہ چمن زار ہوگا۔ جس کو دیکھ کر اہل ادب اور صاحبانِ ذوق محظوظ ہوں گے۔ اور یہ تسلیم کریں گے کہ اس فرزندِ سحر و ساحر نے اپنے نیرنگِ سخن سے تلامذۂ محسن میں وہ سحر آفریں یادگار قائم کی ہے۔ جو تاریخ ادب کے صفحات کے لیے محسن ثابت ہوگی۔

کمال جذبِ الفت رنگ دکھلاتا ہے وحدت کا
وہ بت ہے نور کا پتلا میں پتلا ہوں محبت کا

کلامِ وصفِ چشمِ یار کا مطلب نہ ہاتھ آیا
مرے ہر شعر کا مضمون ہے آہوِ دشتِ وحشت کا

شبستانِ طرب سے تم جو اُٹھے پڑ گئی ہل چل
فروغِ شمع پر عالم ہوا صبحِ قیامت کا

سینہ بھی فروغ آرزو سے پاس رکھتی ہے
سرشکِ چشمِ عاشق ہے ستارہ میری قسمت کا

تجھے اے مرغ دل بہتر ہے باز آنا محبت سے
کہ نیچے جھاڑ کر پیچھے پڑا ہے آسماں کیسا

لحد میں سوتے جاتے ہیں مئے الفت کے متوالے
ترے بازار میں سستا ہوا خوابِ گراں کیسا

زنگار دور ہو جو صفائے خیال کا
ہر دل ہو آئینہ ترے حسن و جمال کا

آتے ہیں صبح سے وہ شہیدوں کی گور پر
انداز اُڑے ہیں قیامت کی چال کا

ہائے میں بدرِ حیرت ہے اک نانِ بے طلب
رتبہ بلند ہے دہنِ بے سوال کا

فاتحہ کیسا کسی کو یاد بھی آتی نہیں
تین دن کا سوگ ہو جاتا ہے مر جانے کے بعد

ہم سے بے تشنگی آغوشِ تصور کا گلہ
ہم دبا رکھتے ہو مٹھی میں مرا دل کیونکر

تم لبھاتے ہو نئے ناز سے ہر دم دل کو
ہر گھڑی ہو مرے پہلو میں نیا دل کیونکر

اے شہِ عقدہ کشا بندہ نوازی فرما
ورنہ حل ہو گی یہ نیرنگ کی مشکل کیونکر

بتوں کی جور و جفا کس کو ناگوار نہیں
مگر خدا کی قسم دل پہ اختیار نہیں

ہماری خاک کا ملتا ہے بیکسی سے نشاں
وہاں ہے ڈھیر کسی کا جہاں مزار نہیں

کسی کے آبِ کرم نے بجھا دیا نیرنگ
وہ اب طپش نہیں ہیں وہ انتظار نہیں

زلفِ نعارض پر طبیعت بیقرار آنے کو تھی
ایک دن یہ گردشِ لیل و نہار آنے کو تھی

شمع نے دھوکہ دیا کیوں راستہ بتلا دیا
بیکسی رونے مجھے سوے مزار آنے کو تھی

آہ سوزاں سینۂ پر داغ چمکا گئی
اس گلستاں میں یہی بادِ بہار آنیکو تھی

تم مسیحائی جو کرتے نزع میں دو ایکبار
پھر نہ مرگِ ناگہانی ہزار آنے کو تھی

نہیں خواب اجل سے یار مہلت مجھ کو دم بھر کی
لبِ زخمِ جگر پر ہے کہانی تیرے خنجر کی

لگا یا تیل بالوں میں تو لاکھوں ہو گئے کشتہ
چلی تلوار موجِ نکہتِ زلفِ معنبر کی

مری وحشت کو اقبالِ جنوں سے کیا ترقی ہے
فروغِ داغِ رسوائی چمک ہے میرے اختر کی

فسونِ عجز بھی تسخیرِ اہلِ سرفرازی کا ہے
جھکایا سر جو میں نے پاؤں پر ٹوپی گری سر کی

الٰہی اس قدر کھو یا گیا ہوں شرمِ عصیاں سے
مجھے ڈھونڈینگی آنکھیں حشر میں خورشیدِ محشر کی

نہ چھوٹے جام میکشوں کے ہاتھ سے ساقی
ہماری انگلیاں ہو جائیں پلکیں چشمِ ساغر کی

بنا کر آئینہ نیرنگ وہ خود بیں ہوا آخر
لبِ آبِ بقا قلعی کھلی بختِ سکندر کی

نہیں ہے ضعف سے اب طاقتِ فغاں باقی
دگرنہ نام کو رہتے نہ آسماں باقی

رہیں بلا سے زمیں اور نہ آسماں باقی
ہمارا سر رہے اور تیرا آستاں باقی

بہار آتے ہی دیوانوں کا یہ حال ہوا
رہیں نہ جیب و گریباں کی دھجیاں باقی

دل و جگر سے مژہ ناوکِ نگاہ کا پوچھ
ہے آج تک خلشِ تیرِ بے کماں باقی

لڑائیں جان کو شعر و سخن میں کیا نیرنگ
کہ لکھنؤ نہیں باقی نہ داستاں باقی

مختار احمد شمیم :

ریاست ٹونک میں اردو شاعری کی ابتدا

دراصل ریاست ٹونک[1] کے وجود میں آنے سے پہلے ہی سرونج[2] میں شعرا پروری کی بنیاد پڑ چکی تھی اس لئے بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ ریاست ٹونک کے ابتدا ہی سے ہی علم نوازی اور ادب دوستی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی اصلیت یہ تھی کہ نواب امیر خاں لشکر میں محض جنگجو اور فن سپہ گری کے ماہرین ہی نہ تھے بلکہ ان میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اپنے زمانے کے بلند پایہ عالموں اور ارباب کمال میں سے تھے۔ اور اسی دور کے بعض نامور شاعر بھی امیر خاں کی فوج میں شامل تھے۔ اس لئے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ امیر خاں کا لشکر گویا ایک اچھی خاصی بزم ادب تھی۔ یہ لوگ موقعہ پر اپنی سپاہیانہ مہارت کا ثبوت دیتے اور فرصت کے اوقات میں ان کا مشغلہ آپس میں ادبی و علمی بحثیں اور تصنیف و تالیف کا شغل رہتا تھا۔ امیر خاں اپنے ان احباب اور ساتھیوں کے ادبی کارناموں سے محظوظ ہوا کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی مختلف صورتوں میں کرتے تھے۔

ریاست کے قیام کے ساتھ ہی جب گونہ اطمینان کا احساس ہوا تو پھر یہی سپاہیانہ شان والے جو قلم کے بھی دھنی تھے، یہی ارباب کمال اپنے ہاتھوں سے شعر و ادب کے گیسوؤں کو سنوارنے میں منہمک ہو گئے۔ کیوں کہ اب انھیں اس سے بہتر موقعہ کیا ملتا۔ اس لئے بقیہ زندگی کو علم و ادب اور مذہبی امور کے لئے وقف کر دیا۔

لیکن ضروری ہوتا ہے کہ ریاست کے وجود سے پہلے کسی ایسی شخصیت کا پتہ لگایا جائے جو باقاعدہ شعر و سخن کے میدان میں اپنے فن اور کمال کے ساتھ موجود تھی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ امیر خاں کا پہلا قبضہ ریاست ٹونک کے مشہور قصبہ سرونج پر ہی ہوا تھا۔ اور پھر باقاعدہ ریاست کے قیام تک سرونج کو امیر خاں کا دارالحکومت

---

[1] ریاست ٹونک سرونج، ٹونک، چھبڑہ اور رام پورہ کے علاقوں سے مل کر بنی تھی۔ اگرچہ جغرافیائی لحاظ سے یہ تمام علاقے ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر تھے لیکن نواب کی دانشمندی نے انھیں ایک سماجی ڈور میں باندھ رکھا تھا۔

[2] مالوہ کا حسین اور سرسبز علاقہ۔ ریاست کی تمام آمدنی کا انحصار اسی علاقہ پر تھا۔ نواب بھوپال کی ملازمت چھوڑ کر امیر خاں نے اپنی علیحدہ فوج تیار کر لی تھی اور مالوہ کے راجہ ... کی مصاحبت ... ۱۷۹۸ء میں مہاراجہ نے امیر خاں کو پرگنہ سرونج جاگیر کے طور پر دیا تھا۔ جو بعد میں ان کی ریاست کا ایک اہم حصہ بنا۔

کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ امیر خاں معہ اپنے لشکریوں کے جب سرونج میں فتوحات اور جنگ کے میدانوں کے بعد پڑاؤ ڈالتے ہوں گے تو سرونج کی شعری فضاؤں کی ہوا انھیں اور ان کے ساتھیوں کو ضرور چھیڑتی ہوگی۔

سرونج چونکہ قدیم تاریخی شہر تھا۔ اور اس وقت بھی شعر و سخن کا وہاں چرچا تھا۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ سرونج کی تہذیب کے اول اول اثرات ہی شہر ٹونک پہنچے ہوں اور یہیں سے امیر خاں کے ساتھی شعرا اس رنگ شاعری کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔ جس میں سوز گداز کا عنصر غالب تھا۔ درد تھا۔ زمانے کے تجربات کا نچوڑ شامل تھا، اور یہی رنگ آگے چل کر ریاست کے شعر و ادب کا خاصہ بنا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب خدائے سخن میر تقی میر کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اور ان کی شاعری دور دور تک اپنا تسلط قایم کر رہی تھی۔ سرونج میں اس وقت میر کی تقلید میں "ریختہ" میں شعر کہے جا رہے تھے۔ اس زمانہ کا گمنام شاعر اور میر کا مقلد مرمت خاں مرمت تھا۔ مرمت کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں ؎

سکندر اور دارا کی تھی اڑتی خاک قبروں پر
جو دیکھا حال میں نے جاکے کل گورِ غریباں کا

یہ دردِ ہجر ہے جاں لب پہ آ رہی کاری رات
خدا دکھائے نہ دشمن کو ایسی بھاری رات

قصۂ ہجر میں سارا ہی سناتا اُس کو
نہ سنی اُس نے دلے میری کہانی افسوس

خطا کا کیا ذکر ہے واں پر تو مرمت ہرگز
پوچھ سکتا نہیں پیغام زبانی افسوس

مرمت کے بارے میں ناظم سیتاپوری رقم طراز ہیں۔

"مرمت خاں کے ذکر سے عام طور پر تذکرے خالی نظر آتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ مرمت کا عہدِ شاعری کا وہی تھا جو میر تقی میر کا زمانہ ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ مرمت کی شاعری کا آغاز اس دور سے ہوا جب علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی سرونج میں جاکر اقامت گزیں ہوئے کیوں کہ دیوان مرمت کا کافی حصہ فارسی غزلیات پر مشتمل ہے۔ جوان کا ابتدائی کلام معلوم ہوتا ہے اس دیوان میں فارسی کے علاوہ ایک اچھا خاصہ ذخیرہ اردو غزلیات اور ہندی کلام کا بھی ہے جس سے مرمت کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی پر روشنی پڑتی ہے"[1]

مرمت کا فارسی کلام اس دور کے تقاضوں کے مطابق ہے لیکن ان کی اُردو (ریختہ) شاعری میر کے اثرات کا نتیجہ ہی کہی جاسکتی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آزاد بلگرامی نے انھیں اُردو شاعری کی طرف متوجہ کیا ہو۔ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ سرونج قدیم تاریخی شہر ہے۔ شیر شاہ سے لیکر اکبر اور اس کے بعد کے حکمرانوں کی تاریخ کے مطالعہ سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہاں عالموں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ آزاد بلگرامی کی سرونج میں اقامت گزیں ہونے کی جہاں اور وجوہات ہیں، ایک وجہ وہاں کے علمی اور ادبی ماحول کی کشش بھی کہی جاسکتی ہے۔ بہرحال مرمت خاں مرمت کا ...

---

[1] ہماری زبان علیگڑھ۔ شمارہ ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء

آبائی سپہ گری تھا۔ کچھ دنوں وہ گوالیار بھی رہے اور پھر سرونج آ گئے۔ راقم السطور نے اپنے بعض بزرگوں سے مرمت کے اشعار سنے اس سے مرمت کی مقبولیت کا راز ظاہر ہوتا ہے۔

مرمت کے ذکر سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ریاست ٹونک کے وجود سے پہلے ہی یہاں اُردو میں شعر و شاعری کا پتہ چلتا ہے۔ اور تعجب نہیں کہ امیر خاں کے احباب جو فارسی میں کمال رکھتے تھے یہیں سے اُردو شاعری کو بھی اپنا کر راج پوتانہ کی حُدود میں داخل ہوئے ہوں۔

مندرجہ بالا خیال کو تقویت اس لئے پہنچتی ہے کہ سرونج سے امیر خاں کے ساتھ جو لوگ ٹونک پہنچے ہیں۔ وہ بھی اُردو میں شاعری کرتے ہوئے گئے ہیں۔ ان میں منشی بسادن لال شاداں کا ذکر ناگزیر ہے۔ امیر خاں کے دور میں چند دوسرے قابلِ ذکر شعراء میں فقیر محمد خاں گویا[1] پیدا خاں نکہت اور صاحبزادہ عبدالکریم خاں مشرقی ہیں۔ جو فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

ابتدا میں ریاست ٹونک کے شعر و سخن پر فارسی اثرات غالب رہے۔ اس کی وجہ شاید ایک یہ بھی ہو کہ سرکاری زبان فارسی ہی تھی۔ اگرچہ اس وقت نہ صرف ریاست ہی میں بلکہ پورے ملک میں اُردو محبوب زبان بن چکی تھی۔ امرائی شعر و شاعری کی زبان بھی ہو چکی تھی۔ اگرچہ امیر خاں کے عہدِ حکومت میں فارسی مستحسن خیال کی جاتی رہی لیکن نواب وزیرالدولہ کے بر سرِ اقتدار آتے ہی فارسی کے اثرات کسی حد تک کم ہو گئے تھے۔ نواب وزیرالدولہ دہلی سے اُردو کے عظیم شاعروں غالبؔ اور مومنؔ کی صحبت کی خوشبو لیکر ٹونک آئے تھے۔ اور ان کی ادب دوستی اور علم نوازی کے سبب بہت سے شعراء ادبا ان کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے جن میں مرزا سلیمان خاں اسدؔ لکھنوی، حکیم انوار علی حسینی، خان کرم حیدر (رام پوری) ارشاد حسین خیرآبادی، لالہ رہت رائے بلگرامی، رائے نرجن لال شاہجہاں آبادی اور مولوی الٰہی بخش نازشؔ کے علاوہ ظہیرؔ دہلوی اور ان کے بھائی انورؔ دہلوی ٹونک میں موجود تھے۔ ان حضرات کے "دامن وزیری" سے وابستہ ہونے پر ریاست کی ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا۔ شعری محفلیں سجنے لگیں۔ اور آہستہ آہستہ ٹونک میں اردو شاعری فارسی شاعری پر غالب آنے لگی پہلے اکثر قصیدے فارسی میں ہی کہے جاتے تھے لیکن اب قصائد کی زبان بھی اُردو ہو گئی تھی۔ فارسی کی سرکاری حیثیت بھی نواب محمد خاں کے دور میں باقی نہ رہ سکی تھی۔ اور اب اُردو زبان و ادب کا ہی ریاست میں بول بالا تھا۔

لیکن ٹونک سے اس عہد کی اُردو شاعری کی خصوصیات فارسی شاعری ہی کی تقلید میں تھیں۔ کیوں کہ جغرافیائی اور سماجی اعتبار سے شمالی ہندوستان سے ٹونک علیحدہ تو نہ تھا۔ مجموعی اعتبار سے اطراف میں جو ادبی رجحانات پروان چڑھ رہے تھے اُنھیں کا اثر ریاست کے شعرا نے بھی قبول کیا۔ اور کرنا بھی چاہیے۔ اُردو کسی ایک ریاست کی رہینِ منت نہ تھی یہ ایک ہمہ گیر زبان رہی ہے۔

---

[1] فقیر محمد خاں گویا افواج اودھ کے رسالدار تھے۔ بعد میں یہ نواب امیر خاں (ٹونک) کی فوج میں آکر شریک ہو گئے تھے ان کا ادبی کارنامہ انوار سہیلی" کا اُردو ترجمہ ہے

بہرحال بقول ڈاکٹر اعجاز حسین " اردو شاعری نے بھی زبان عاشقی میں گفتگو شروع کر دی تھی " اور یہ صرف اس لئے ممکن ہو سکا کہ ریاست ٹونک کے شعر و ادب کے سامنے بھی خارجی اثرات کے علاوہ فارسی زبان ہی اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔

اس وقت ٹونک کی ادبی فضا میں میرؔ اور دردؔ کی شاعری کے اثرات کافی نمایاں تھے۔ میرؔ کا سوز و گداز دردؔ کا تصوف اور پھر آگے چل کر بیان غالب کے ساتھ ہی مومنؔ کا تغزل ٹونک کی شاعری کا ماحصل رہا۔

اہلِ ٹونک نے مومن کے طرزِ شاعری کو خاص طور سے مستعار لیا۔ اور انھیں کے رنگِ تغزل میں ڈوب کر اپنی شاعری کا مزاج بنایا۔ شعرائے ٹونک نے بڑے سلیقے سے مومن کا ندرتِ اسلوب، گداز اور تغزل کو اپنا لیا تھا ٹونک کے اس دور کی نمایاں خصوصیات مومن کے طرزِ شاعری کے قدم بہ قدم نظر آتی ہیں غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ٹونک کے خارجی اور داخلی اثرات نے اہلِ ٹونک کے جس مزاج کی تشکیل کی تھی وہ مومن کے مزاج کے برعکس نہ تھے۔

غرض یہ کہ ریاستِ ٹونک کے اس دور کے شعرا کے کلام کی خصوصیات، سادگی، نازک خیالی اور سوز و گداز ٹھہری۔ کسی حد تک معنی آفرینی رعایت لفظی کا بھی دخل رہا ہے جو اس زمانہ کے عام شاعرانہ ماحول کے زیر اثر ہے۔ چند اشعار سے ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے ؎

یار آتا نظر نہیں آتا غم یہ جاتا نظر نہیں آتا
...ل دشتِ جنوں کی سیر بھی خاک اڑتا نظر نہیں آتا
(بہجت)

جس نے دیکھا ہے زخم بسمل کا ہاتھ وہ چومتا ہے قاتل

خاکساری ہے بسکہ اپنا شعار عطر بھی گر ملیں تو ہو گل
(دیبی پرشاد بشاشؔ)

اٹھاتا بوت یارب اکس حریق سوختہ جاں کا
جو مشعلہ آکے کاندھا دے گیا برقِ درخشاں کا
(نازشؔ)

نہ تھا غیروں کا شکوہ حالِ دل تھا
سنا کیا آپ نے میں نے کہا کیا! (آذرؔ)

اعدا کی ملاقات سے انکار مسلّم
کیا کہیئے مگر ہم نے سنا اور ہی کچھ ہے (اردلی)

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بھی ظاہر ہے کہ شعرائے ٹونک کے کلام میں داخلیت کے عنصر کو کافی دخل ہے دراصل یہ اس زمانے کے ہندوستان گیر اور خاص طور سے شمالی ہند کے انحطاط پذیر ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے خارجیت بھی داخلیت کی شکل میں ابھری۔ تصوف بھی اس انحطاطی دور کی دین تھا۔ جس نے شاعری میں داخلیت کو بڑھاوا دیا اور متاعِ سوز و گداز سے بہرآور کیا۔

انھیں تمام خصوصیات کے پیشِ نظر اس ریاست میں غزل کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ عشق کے مرحلے ہوں یا تصوف کی معراج، آپ بیتی ہو یا دلِ درد آشنا کی زمانے سے ٹھوکروں کا احوال یہ سب باتیں غزل سے بہتر کون ادا کر سکتا تھا۔ لہٰذا شعرائے ٹونک کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو غزل کے گیسوؤں کے سائے میں پناہ لئے ہوئے تھی۔

(باقی مضمون صفحہ ۳۲ پر دیکھیے)

مصطفین :

سورما اور شاعر۔ موسیٰ جلیل

میں اپنا آخری گیت لکھ رہا ہوں۔
اور جلاّد میرے سر پر تلوار لئے کھڑا ہے۔

موسیٰ جلیل کے یہ الفاظ شاعرانہ استعارہ نہیں یں حقیقت تھے۔ ایک جرمن اخبار نویس لیون نیبنزال ین کے چارلٹن برگ کے رجسٹری دفتر میں دستاویزی ‌ ل گیا جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ موسیٰ جلیل ینز سی جیل میں ۱۲ بجکر ۱۸ منٹ پر ۲۵ اگست ۱۹۴۴ء زائے موت دی گئی۔ سزائے موت دینے کا طریقہ دہاں تھا کہ سر قلم کر دیا گیا۔

ہمارے ملک میں موسیٰ جلیل کا نام وطن پرستی علامت بن گیا ہے۔ ملک کے دو سب سے بڑے زاز، نازی جرمن حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد بے پناہ جرأت سے کام لینے کے صلہ میں سوویت یونین یرو کا خطاب اور اُن کی نظموں کے مجموعے وابت کی یادداشتیں" پر لینن انعام، انھیں اُنکی ت کے بعد عطا گیا۔

آذربائیجانی شاعر صمد ورغون نے لکھا ہے:۔
دنیا اور دنیا کے ادب میں بہت سے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے حیات جاوید پالی ہے لیکن موسیٰ جلیل یسے جانباز شاعر چند ہی گزرے ہوں گے جس نے اپنی جانبازانہ موت سے بھی حیاتِ جاوداں پائی اور اپنی نظموں کی بدولت بھی۔ ایسے شاعروں میں بائرن تھا۔ ہنگری کا قومی شاعر پیتوفی تھا۔ جانباز فیوچک تھا اور اب موسیٰ جلیل بھی اُنھیں میں ہے۔

موسیٰ جلیل ۱۵ فروری ۱۹۰۶ء کو ایک چھوٹے سے تاتاری گاؤں ... مسطفینو میں پیدا ہوئے جو سابق اور برگ صوبے میں ہے۔ وہ ایک بڑے کسان گھرانے کی چھٹی اولاد تھے اور کم عمر ہی میں باپ کی موت نے اُنھیں بھوک اور محرومیوں سے آشنا کر دیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء کے قحط کے سال میں موسیٰ اپنی عمر کے بے گھر اور خراب و خستہ حال لڑکوں کی ایک ٹولی کے ساتھ اور برگ بھر میں مارے مارے پھرا کرتے تھے اور لوگوں کی خیرات یا بازار سے چنے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں پر اُن کی گزاوقات ہوتی تھی۔

سوویت اقتدار نے موسیٰ کو اپنے سایہ عافیت میں لے لیا اور اُنھیں تعلیم دی۔ اُنھوں نے کازان یونیورسٹی کے مزدوروں والے شعبے میں تعلیم حاصل کی اور لیدکو ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ علم زبان میں داخل ہو گئے۔

تیرہ ہی سال کی عمر میں اُنھوں نے نظمیں لکھنا اور

شائع کروانا شروع کر دیا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ خاصے معروف شاعر تھے اور ان کی نظمیں اُس زمانے کی بہترین نظموں کے انتخابیوں میں شائع ہونے لگیں تھیں۔ دوسری جنگ عظیم تک اُن کی ادبی تخلیق نظموں کے دس مجموعوں، کئی طویل نظموں اور ڈراموں، اوپیرا کے گیتوں کے بول پر مشتمل تھے۔ موخرالذکر نے تاتار اوپیرا تھیئٹر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

جب نازی جرمنی نے سودیت یونین پر حملہ کیا تو موسیٰ۔ فوراً فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اُنھیں فوجی اخبار "اوٗاگا" (جرأت) کے اسٹاف رپورٹر کی حیثیت سے والخوف محاذ پر بھیجا گیا۔ وہ اکثر محاذ پر جاتے مضامین اور رپورٹیں لکھتے اور ظاہر ہے کہ نظمیں بھی لکھتے۔ ۱۹۴۲ء کے موسم بہار میں دوسری اچانک حملہ آور فوج کو، جس میں جلیل کام کر رہے تھے، دشمن نے گھیر لیا اور باقی فوج سے کاٹ دیا۔ بھاگ نکلنے کی ایک ناکام کوشش کے دوران میں موسیٰ جلیل بری طرح زخمی ہوئے اور ایک بم پھٹنے سے اُن کے حواس مختل ہو گئے اور وہ گرفتار کر لئے گئے۔

۱۹۴۲ء کے آخر میں استالین گراد کے بعد نازی کمان نے سودیت یونین کے خلاف جنگ میں ایشیائی قومیتوں کے لوگوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا حالانکہ اس سال کے شروع کے مہینوں میں ان لوگوں کو بالکل ہی ختم کر دینے کے احکامات دیئے جا چکے تھے۔ نام نہاد "قومی دستے" بنائے گئے۔ ترکستانی، آرمینی اور جارجیائی۔ والگا علاقے کے غیر روسی جنگی قیدیوں کو ہنکا کر پولینڈ کے چھوٹے سے قصبے رادوم لے جایا گیا تاکہ ایڈیل یورال دستہ بنایا جائے۔ موسیٰ جلیل کی سرگرمی میں وطن دوستوں نے دستے میں شریک ہو جانے اور دشمن کو دھوکا رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ جو قیدیوں کو جو سامانِ جنگ دیا جائے اُسے فوج کے خلاف استعمال کیا جائے اور نازی اسکیم ناکام بنا دیا جائے۔

اپنی نظم "اُن کی بات نہ ماننا" میں موسیٰ نے محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا

اگر کوئی تم سے کہے کہ میں نے اپنے کام سے غداری
کی اور اپنے وطن سے، تو تم اُسے ہرگز نہ ماننا،
کہ یہ جھوٹ ہے۔ دوست ہی اس بات کو جان
سکتا ہے۔ سمجھ سکتا ہے کہ میں نے اپنے وطن کی
خاطر، اپنی شریکِ حیات کی خاطر اسلحے سنبھالے
اور لڑائی پر گیا۔
میں اور غداری کروں اپنے وطن سے؟ تم سے؟
کس کی خاطر؟ پھر میری زندگی میں رہ کیا
جائے گا؟

موسیٰ جلیل نے ایڈیل یورال دستے کی سف
مہاجر کمیٹی میں کام کرنا شروع کر دیا اور خفیہ تنظیم
اراکین کو اُنھوں نے ایڈیل یورال اخبار کے اد
دفتر میں، پریس میں اور ریڈیو براڈ کاسٹنگ د
پروپیگنڈہ کار اور لیکچرر کمانڈر وغیرہ کی ملاز
پر لگوا دیا۔ اس طرح اُن لوگوں کو سودیت پیغام بھی
مراسلے ملنے لگے۔ اور یہ لوگ اُنھیں دوسرے قید
میں بانٹ دیتے۔ نازیوں نے موسیٰ جلیل کو اُن
ہم وطنوں میں فرصت کے اوقات منظم کرنے کا
بنا دیا اور موسیٰ جلیل نے اس موقع سے پورا فا
اُٹھایا۔ وہ سارے کیمپوں کا دورہ کرتے جو بہ ظ
تو اس لئے ہوتا کہ گیت منڈلی کے لئے اراکین چنے
لیکن دراصل وہ خفیہ رابطہ قائم کرتے اور خفیہ

...زیادہ قیدیوں کو شریک کرتے۔

...ایدیل یورال دستے کی جو پہلی بٹالین مشرقی ...اذ پر بھیجی گئی اُس میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ ...ے اور ان سب نے دیتیک کے پاس بغاوت کر دی ...ین افسروں کو مار ڈالا اور بیلو روسی چھاپہ ماروں ...ے جا ملے۔

اتنے افسروں اور اسلحوں کے نقصان سے ...منوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے بعد انھوں ...نے تاتاری دستوں کو پھر نہیں بھیجا۔ اُنھیں شبہ ہو گیا ...ا کوئی خفیہ تنظیم ضرور ہے۔ اس لئے اُنھوں نے جاسوسی ...درستی کے ساتھ شروع کر دی اور قیدیوں کے بیچ ...ستعال دلانے والے ایجنٹ بھیجے۔

اگست ۱۹۴۳ء میں گستاپو نے خفیہ تنظیم کا سُراغ لگا لیا۔ موسیٰ جلیل اور تنظیم کے دوسرے ...مبروں نے بڑی احتیاط کے ساتھ عام بغاوت کے لئے جو تاریخ طے کی تھی اُس سے چند دن پہلے ہی ...دس اور زیادہ تر اراکین گرفتار کر لئے گئے۔

موسیٰ جلیل کی مشکیں باندھ کر موابت جیل ...ی ایک کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔ لیکن اُنھوں نے ...جد و جہد ترک نہیں کی۔ ابھی ایک ہتھیار اُن کے ...پاس باقی رہ گیا تھا۔ اُن کی شاعری۔

جلیل کی جواں مردی اور ثابت قدمی جولیس ...فیوچک جیسی تھی۔ چیکوسلواکیہ کے اس قومی سورما ...کی طرح تاتاری شاعر نے بھی ظلم اور ایذا سے ہار ...نہیں مانی اور "جلاد کی تلوار" کے سائے میں بھی پرورش ...لوح و قلم کرتا رہا ہے۔

اُن کی نظموں کے مجموعے "موابت کی یادداشتیں" ...میں قید کی المناکی، آزادی کی تڑپ اور محبت کرنے ...والے دردمند دل کا کرب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

اس شخص کی بے پناہ اندرونی قوت حیرت انگیز ہے کاغذ کا پُرزہ تک بیش قیمت تھا اس لئے موسیٰ جلیل نے صرف اہم ترین چیزیں ہی لکھی ہیں۔ اسی لئے اُن کی شاعری میں مرکوز اور مجتمع قوت کا احساس ہوتا ہے۔ سطروں پر ساز کے کھنچے ہوئے تار کا گمان ہوتا ہے اور بیشتر مصرعے ضرب المثل جیسے لگتے ہیں۔

مردِ مجاہد کے لئے جنگ اُس کی ہمت کی آزمائش ہوتی ہے
بہادر جیتنے کا تہیہ کر لیتے ہیں اور اُنھیں شکست کا خوف
نہیں رہ جاتا۔ (حا نیازی)

اگر تم دلیر ہو تو چٹان کی طرح اٹل ہو
لیکن اگر تم میں ہمت نہیں تو تم کچھ نہیں، محض غلام ہو۔
غلامی اور ذلت کی زندگی کس کام کی؟

گمنامی کی موت مر جانے میں کیا رکھا ہے؟
نہیں، زندگی خوبصورت ہوتی ہے بشرطیکہ آزاد ہو۔
اور صرف ہمت ہی آدمی کو زندۂ جاوید بناتی ہے۔

موسیٰ جلیل کے دل میں جرمن عوام کے آزادی خواہی کے خیالات اور اُن کے کلچر کے لئے بڑا احترام تھا اور اس لئے اُنھوں نے نازی جرمنی کے بارے میں اتنے درد کے ساتھ اور غصے میں لکھا ہے۔

کیا یہ سچ مچ مارکس کا وطن ہو سکتا ہے۔
یہی وہ ملک ہے جسے شیلر نے اپنا ملک کہا تھا۔
جہاں مجھے اور اتنے سارے لوگوں کو ہنکا کر لایا گیا ہے۔
اور نازی پہریدار ہم سے یوں پیش آتے ہیں جیسے ہم
ننگِ وجود ہوں۔؟
بیتھوون کے نغمے کہاں ہیں؟
اب یہاں کیوں نہیں بجائے جاتے؟

ایک جرمن ادیب ایرک ملر نے لکھا ہے "کیسی شرم کی بات ہے، کتنا بڑا المیہ ہے کہ اُس شخص کو جو جرمنیا سے محبت کرتا تھا، اُسے قتل کر کے جرمنوں نے اپنی

ہی قوم کو نقصان پہونچایا۔"

نازی قید نے موسیٰ جلیل نے ایک بلجیین انڈرے مرانس، پولینڈ کے رہنے والے یان ذچرا اور اطالوی رینیر دلا تعزیدینی سے دوستی کی۔ اب موسیٰ جلیل کی نظموں کا ترجمہ ۵۰ سے زیادہ زبانوں میں ہو چکا ہے اور ہر قوم کے عوام اُسے آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

موسیٰ جلیل اچھائی، انسان دوستی اور انصاف کا مبلغ تھا اور اُس نے ہر اُس شخص کو اپنا گردیدہ بنا لیا ہے جو امن اور آزادی چاہتا ہے۔

دوٓ آنسو

ابوالاسرار رمزی۔ اٹاوی

حرم کی خاک بھی خود اُڑ کے آئی جاتی ہے
عجب کشش مرے سجدوں میں پائی جاتی ہے

جہاں رسائی فرشتوں کی ختم ہوتی ہے
صدا بشر کو وہیں سے لگائی جاتی ہے

نگل رہا ہے اندھیرا اب چراغوں کو
کہ جن کے نور سے محفل سجائی جاتی ہے

درِ کریم سے مل جائیں ایسے دوٓ آنسو
کہ جن سے آتشِ دوزخ بجھائی جاتی ہے

ہے گُل کو خار سے شکوہ تو خار کو گُل سے
چمن میں آج بغاوت سی پائی جاتی ہے

خدا کے سامنے کس مُنہ سے جاؤگے رمزی
وہاں تو شیشے میں صورت دکھائی جاتی ہے

ریاست ٹونک میں اُردو شاعری کی ابتدا

بسلسلہ صفحہ ۲۸ کالم ۲

غزل کے علاوہ ٹونک میں قصاید کا بھی رواج تھا نوابین ریاست سے انعام واکرام اور ان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے قصیدہ سے بڑھ کر سفارش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ نکہت اور بہجت ٹونک کے اس دور کے اعلیٰ قصیدہ نگاروں میں تھے۔ بہجت کا تو ایک پورا دیوان قصاید پر مشتمل ہے۔

مرثیہ کو ٹونک کے سُنّی امرا اور سخت شریعت ماحول میں جگہ نہ مل سکی۔ ہاں مثنویات ضرور لکھی گئیں ان میں مولوی الٰہی بخش نازش کی "گلزارِ خیال" اور بچھمی نرائن آذر کی "گلزارِ نصیحت" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر مثنوی اخلاقی مضامین پر مشتمل ہے سادہ زبان اور بیان میں روانی لئے ہوئے ہے۔ نواب محمد علی خاں کی سرپرستی میں طویل نظمیں مذہبی موضوعات پر لکھی گئیں۔ بخف علی خاں کی "فتوحاتِ عجم" ان میں سے ایک ہے۔

۱۸۱۷ء سے ۱۸۶۷ء تک کے ٹونک کے ابتدائی شعری ماحول کا جائزہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اُردو شاعری کی نشو و نما میں جہاں اور باتیں ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں، وہیں ریاستوں کی سرپرستی اور مقامی عوامل نے بڑھ چڑھ کر اس کارگہہ شیشہ گری میں حصہ لیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں اُردو ادب کا سرمایہ دراصل ریاستوں ہی کا رہین منت ہے۔

مطبوعات ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت) (ا)

۱- اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر - ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۲/-

۲- المعلم نمبر - فروغ اردو - اقبال صدیقی ۳/۵۰

۳- انوار اللغات اردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۴/-

۴- ادبی تاثرات - ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/۵۰

۵- آئینہ عقل - پروفیسر نکہت شاہجہانپوری ۴/۵۰

۶- اردو ناول کی تنقیدی تاریخ - ڈاکٹر احسن فاروقی ۴/۵۰

۷- امیر خسرو اور ان کی ہندوی شاعری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۳/-

۸- انارکلی - امتیاز علی تاج ۲/۰۵

۹- اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ پروفیسر کلیم الدین احمد ۶/-

۱۰- اردو میں تنقید - ڈاکٹر احسن فاروقی ۳/-

۱۱- انتخاب قصائد اردو غیاث الدین فریدی ۱/۵۰

۱۲- ادب اور نظریہ - آل احمد سرور ۵/-

۱۳- اردو ادب کا تحقیقی سرمایہ - معصوم عبدالشکور ۴/۵۰

۱۴- ادبی نقوش - شاہ معین الدین احمد ندوی ۵/-

۱۵- اقبال - مرتبہ فروغ اردو ۰/۵۰

۱۶- اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں - عبدالماجد دریابادی ۴/۵۰

۱۷- البرامکہ اور ان کا عروج و زوال ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے ۲/-

۱۸- انتخاب کلام میر مع مقدمہ - ناظر کاکوروی ۱/-

۱۹- انتخاب کلام غالب - بشیر احمد علوی ۱/۵۰

۲۰- ادبی تنقید - ڈاکٹر محمد حسن ۴/۵۰

۲۱- انتخاب قصائد و غزلیات (فروغ اردو) ۴/-

۲۲- ادب کیا ہے - ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

۲۳- ادبی خطوط غالب - مرزا محمد عسکری

۲۴ آئینہ نثر اردو - سعادت علی صدیقی

۲۵ ایک نادر روزنامچہ - ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

۲۶ ابوالحمر - مجنوں گورکھپوری

۲۷ اردو کی کہانی - سید احتشام حسین

۲۸ ادب پارے حصہ نظم و نثر ״ ״

۲۹ انتخاب نثر جدید ״ ״

۳۰ ابوالکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد

۳۱ ارمغان نثر و نظم - عبدالاحد خاں خلیل

۳۲ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اردو

۳۳ اچھی نظمیں - اختر مشتاق

۳۴- اردو ادب میں طنز و مزاح کا مکمل دو جلد جدید اڈیشن - غلام احمد فرقت

۳۵ اردو شاعری - امیر احمد علوی

۳۶ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ

۳۷ غزلیات حافظ صائب غالب فارسی

۳۸ اپنی پہچان پوری زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب - اعجاز احمد مدنی

۳۹ اللہ کے پیارے - امیر حسن نورانی

۴۰ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اردو

۴۱ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی - عبدالماجد دریابادی

۴۲ اسپین کی شہزادی - صادق سردھنوی

۴۳ ایک جان تین قالب - خان محبوب طرزی

۴۴ الفت ״ ״ ״

۴۵ آغاز سحر ״ ״ ״

۴۶ امین آباد ״ ״ ״

۴۷ اپنی موج میں - آوارہ

۴۸- انوار جدید خط و کتابت - خلیق احمد علوی

۴۹	اجالوں کی باتیں ۔ مصطفیٰ احسن رضوی	۲/-
۵۰	اچھی کہانیاں (حصہ اول) شمس الدین ندوی	-/۳۰
۵۰	(حصہ دوم) " "	-/۳۵
۵۱	(حصہ چہارم) " "	-/۶۰
۵۲	ادب کا مقصد ۔ ڈاکٹر نذر [illegible]	۳/-

(ب)

۵۴	بابائے اردو عبدالحق ۔ سید [illegible]	۵/-
۵۵	بستان حرم (جدید نعتیہ کلام) نازش پرتاپ گڑھی سید صدیقی	۱/۵۰
۵۶	بشیر محبت بوٹا سنگھ ۔ قاضی محبوب طرزی	۴/-
۵۷	بزم ہست گلدستہ ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین	[illegible]
۵۸	برگ گل [illegible]	[illegible]
۵۹	بہادر شاہ ظفر [illegible]	[illegible]
۶۰	[illegible]	[illegible]
۶۱	[illegible]	-/۴۵

(پ)

۶۲	پطرس کے مضامین ۔ پطرس بخاری	-/۵۰
۶۳	پیاری [illegible] ۔ تحسین بالرسدی	-/۱۰
۶۴	پھولوں کا [illegible] ۔ منظر سلیم	-/۵۰
۶۵	پیسا [illegible]	[illegible]
۶۶	[illegible]	-/۱۵
۶۷	[illegible]	[illegible]
۶۸	پنجاب میں اردو ۔ حافظ محمود شیرانی	[illegible]
۶۹	پردیس [illegible]	[illegible]

(ت)

۷۰	تاریخ ادب اردو (فروغ اردو ایڈیشن) ڈاکٹر سید اعجاز حسین	[illegible]
۷۱	تحریریں مجموعہ مضامین ۔ ڈاکٹر گیان چند	[illegible]
۷۲	تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ ۔ فرید احمد علوی	[illegible]
۷۳	تاریخی جائزے ۔ ڈاکٹر محمد لیسین	۳/-
۷۴	تعارف تاریخ اردو (جدید ایڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/-
۷۵	تاجدار مدینہ ۔ اقبال صدیقی	-/۱۲
۷۶	تنقیدی اصول اور نظریے حامد اللہ افسر	۴/۵۰
۷۷	تنقید و تحلیل ۔ شبیہ الحسن نونہروی	۳/-
۷۸	تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) سید احتشام حسین	۴/۵۰
۷۹	تنقیدی نظریات (جلد اول) " "	۶/-
۸۰	" " (جلد دوم) " "	۶/-
۸۱	تنقید اور عملی تنقید " "	۵/-
۸۲	تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن ۱۹۶۴ء) آل احمد سرور	۳/۵۰
۸۳	ترانہائے خیام ۔ ڈاکٹر [illegible]	۲/-
۸۴	[illegible] محمد حسین [illegible]	۱/۶۵

(ٹ)

۸۵	[illegible]	۲/-
۸۶	[illegible]	۲/-

(ث)

۸۷	ثنائے حبیب (نعتیہ کلام) بہزاد لکھنوی	۲/۲۵

(ج)

۸۸	جان غالب ۔ محمد حسین شمس علوی	۲/-
۸۹	جائزے ۔ انور سدید [illegible]	۳/-
۹۰	جواہرات [illegible] ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/-
۹۱	جنگ آزادی نمبر (۱۸۵۷) فروغ اردو	۳/-
۹۲	جنگ آزادی نمبر ۲ " "	۳/-
۹۳	[illegible] کلام حامد اللہ افسر	۲/۵۰
۹۴	[illegible] ڈاکٹر اطہر بلگرامی	۳/۵۰
۹۵	جشن [illegible] تیسر تلمیں	۲/۵۰
۹۶	جلوے ۔ معین الدین دردائی	۱/۶۵

۹۷ جمیلہ بوائری (ناول) خان محبوب طرزی ۲/۵۰
۹۸ جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۶/-

(چ)

۹۹ چوتھی بہن مجموعہ افسانہ - مسیح الحسن رضوی ۲/۷۵

(ح)

۱۰۰ حیات فضل الحق خیرآبادی ۱/۲۵
۱۰۱ حالی بحیثیت شاعر (جدید اڈیشن مع اضافہ جدید اڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۳/-
۱۰۲ حسرت موہانی عبدالشکور ۳/۵۰
۱۰۳ حسرت تعمیر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰
۱۰۴ حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰
۱۰۵ حکیم نباتات وزیر خاں لنکراں ۲/
۱۰۶ حبیبہ خانم سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۰۷ خیالات رنگین یعنی مجموعہ مضامین فارسی (زیر طبع)
۱۰۸ خلاصہ شریف زادہ مرزا رسوا ۱/-
۱۰۹ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی عبدالماجد دریابادی ۲/۷۵
۱۱۰ خضر راہ مع ترجمہ علامہ اقبال -/۷۵
۱۱۱ خلاصہ روح تنقید ۱/-
۱۱۲ خلاصہ جواہر العروض ۱/-
۱۱۳ خلاصہ المیزان -/۷۵
۱۱۴ خبطی (مزاحیہ) محمد علی واحدی مع مقدمہ شوکت تھانوی ۱/۵۰
۱۱۵ خوش بختی کی تلاش - احسن الظفر بی اے -/۲
خلاصہ شعرالہند (دوم) ۱/-

(د)

۱۱۶ دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۳/-
۱۱۷ دیوان فغانی ۱/۵۰
۱۱۸ داستان سہراب و رستم مع مقدمہ (فارسی) عبدالماجد خلیل ۳/-

۱۱۹ دیوان صفی (حصہ اول) صفی لکھنوی ۱/
۱۲۰ دہلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ -
۱۲۱ دستۂ گل شبلی نعمانی ۲/-
۱۲۲ دوشیزہ قاف (ناول) خان محبوب طرزی -
۱۲۳ دلربا " " " -
۱۲۴ دلی کا دبستان شاعری مع اضافہ جدید اڈیشن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۱/-

(ڈ)

۱۲۵ ڈاکٹر نذیر احمد انوار الحسن ۳/۷۵

(ذ)

۱۲۶ ذوق و جستجو - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی /۵۰
۱۲۷ ذوق ادب و شعور - پروفیسر احتشام حسین /۵۰
۱۲۸ ذوق جنون مجموعہ کلام آل احمد سرور /۵۰

(ر)

۱۲۹ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین /-
۱۳۰ رباعیات غالب مع اردو ترجمہ سید امیر حسن نورانی /-
۱۳۱ رہبر مضمون نویسی - شفاعت علی صدیقی /۵۰
۱۳۲ راکھی - ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی /۳۷
۱۳۳ رخسار سحر انصر کریم قدوائی /۵۰
۱۳۴ رفتار (ناول) /۵۰
۱۳۵ رموز حکمت مع مقدمہ اردو - محمد شریف /۵۰
۱۳۶ ریاض فارسی - منتخب کلام فارسی -/-

(ز)

۱۳۷ زکاۃ الحلی یعنی زیورات کی زکاۃ مولانا تھانوی -/۵۰
۱۳۸ زنبیلیوں کا بادشاہ (حکیم انا دفراحیہ ناول) علی عباس حسینی ۲/-

(س)

۱۳۹ سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۲/۰
۱۴۰ سوانح اور خاکے — نجم الدین لقوی — ۳/۰
۱۴۱ سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حکیم چند نیر — ۰/-
۱۴۲ سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۱۲/-
۱۴۳ سلک گہر — سید احتشام حسین — ۳/-
۱۴۴ ساحل و سمندر — سید احتشام حسین — ۶/-
۱۴۵ سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰
۱۴۶ سرمایہ زبان اُردو — جلال لکھنوی — ۴/۵۰
۱۴۷ سخنہائے گفتنی — کلیم الدین احمد — ۵/-
۱۴۸ سفر (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/-
۱۴۹ سیاحت زمین (ناول) — محمود اعظم فہمی — ۱/۵۰
۱۵۰ سید سالار مسعود غازیؒ — وحشی محمود آبادی — ۳/۵۰
۱۵۱ ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۳/۵۰
۱۵۲ سنہرا حلقہ — /۷۵
۱۵۳ سر سید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی — ۰/۳۷
۱۵۴ سوشل اسٹڈی — احمد محسن کاکوروی — ۱/۷۵

(ش)

۱۵۵ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) — غلام احمد فرقت — ۸/۰
۱۵۶ شرح سلک گہر — عبدالقوی دریابادی — ۳/۵۰
۱۵۷ شاہ نگیں حضرت جی — پروفیسر عبدالشکور — ۳/-
۱۵۸ شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی — ۴/-
۱۵۹ شرح ادب پارے نظم — ۳/۰
۱۶۰ شرح منتخبات فارسی — عبدالقوی دریابادی — ۴/۵۰
۱۶۱ شبلی نعمانی — انوار الحسن صدیقی — ۰/۳۷
۱۶۲ شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن) — نظم طباطبائی — ۵/-
۱۶۳ شاہان مالوہ یعنی گجرات کی تاریخ — امیر احمد علوی — ۳/۵۰

۱۶۴ شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم — شبلی نعمانی — ۲۵/۰
۱۶۵ شرح نثر امروز ایران — احسن الظفر ایم اے — ۲/۰
۱۶۶ شرح شعر امروز ایران — " — ۲/۵۰
۱۶۷ شمع و شاعر — علامہ اقبال — ۰/۲۵
۱۶۸ شرح حکیم نباتات خاں — نیر مسعود — ۱/۲۵
۱۶۹ شرح انتخاب قصائد و غزلیات
۱۷۰ مطابق نصاب بی۔اے — عبدالعلیم قدوائی — ۶/۰
۱۷۱ شرح ترانہائے خیام — حکیم عبدالقوی — ۱/۵۰
۱۷۲ شرح نصاب فارسی — ۴/۰

(ص)

۱۷۳ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — ۳/۰
۱۷۴ صحیفۂ محبت (مہدی افادی کے خطوط) — ڈاکٹر محمود الٰہی — ۵/۰

(ط)

۱۷۵ طرزی نمبر (خان محبوب طرزی) — مرتبہ فروغ اردو — ۲/۰
۱۷۶ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیئے — غلام الثقلین — ۰/۳۷
۱۷۷ طلسم اسرار (ڈرامہ) — مرزا رسوا لکھنوی — ۱/۲۵
۱۷۸ طرۂ امیر — امیر مینائی منتخب کلام
۱۷۹ (جدید ایڈیشن) امیر احمد علوی — ۲/۵۰

(ع)

۱۸۰ عذرا (ناول) — صالحہ عابد حسین — ۵/۰
۱۸۱ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) — سید احتشام حسین — ۱/۵۰
۱۸۲ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینے میں — اخلاق حسین عارف — ۳/۰

(ع)

۱۸۳ غالب کی تخلیقی تخیل۔ شبیہ صفی پوری ۴/۰
۱۸۴ غنچۂ گل سید محمود الحسن رضوی ۳/۰
۱۸۵ غالب کے کلام میں لحاقی عناصر ناظم سیتاپوری ۴/۵۰
۱۸۶ غزنی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
۱۸۷ غزلیات نظیری ۱/۵۰

(ف)

۱۸۸ فن خطابت یعنی استاد تقریر۔ کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ ۰/۷
۱۸۹ فریدہ خان محبوب طرزی ۲/۰
۱۹۰ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ناظم سیتاپوری ۴/۵۰
۱۹۱ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۳/۵۰
۱۹۲ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۵۰/۴
۱۹۳ فروغ جام مجموعہ کلام نشو واحدی ۳/۰
۱۹۴ فغانِ محسن محسن کاکوروی ۰/۳۰
۱۹۵ فارسی آموز شبیر احمد علوی ۱/۰
۱۹۶ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۴/۵۰

(ق)

۱۹۷ قدسیہ جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں غلام احمد فرقت ۵/۰
۱۹۸ قصائد خاقانی ۱/۵۰
۱۹۹ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰
۲۰۰ قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۴/۵۰
۲۰۱ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۶/۰
۲۰۲ قدر و نظر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰
۲۰۳ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۲/۰
۲۰۴ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/
۲۰۵ قومی ادب نثر و نظم حامد افسر ۳/۸۳
۲۰۶ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۳/۰

(ک)

۲۰۷ کیسر اور کاہی بدرالدین طیب جی .
۲۰۸ کفِ گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت .

(گ)

۲۰۹ گلہائے حرم مصور مع مقامات مقدسہ کے فوٹو زائر حرم حمید لکھنوی .
۲۱۰ گاندھی نمبر .
۲۱۱ گلدستہ فارسی اول و دوم .
۲۱۲ گلزار فارسی یعنی آمد نامہ .
۲۱۳ گلہائے ادب ـ عبدالاحد خاں خلیل
۲۱۴ گاندھی جی کے ساتھ حامد اللہ افسر .

(ل)

۲۱۵ لوائح جامی مع مقدمہ عبدالاحد خاں خلیل .
۲۱۶ لال قلعہ مائل ملیح آبادی .
۲۱۷ لب بام عادل رشید
۲۱۸ لسانیات در اردو سید محمود حسن رضوی .

(م)

۲۱۹ مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو محمد احمد فرقت .
۲۲۰ محسن کاکوروی نمبر .
۲۲۱ مسلمان اور کانگریس ابوالکلام آزاد .۵۰
۲۲۲ مرثیہ نگاری اور میر انیس ـ ڈاکٹر احسن فاروقی
۲۲۳ مضامین فرحت (حصہ اول) مرزا فرحت اللہ بیگ .
۲۲۴ مضامین فرحت (حصہ دوم) " " "
۲۲۵ ماضی کی کہانیاں آفتاب اختر ظہری .۵۰
۲۲۶ میرے اسٹیج ڈرامے ڈاکٹر محمد حسن .۵۰

۲۲۷ موسم گل (ناول) عادل رشید ۶/۰
۲۲۸ مجبور " خان محبوب طرزی ۴/۵۰
۲۲۹ مضامین جدیدہ محمد ہادی ۱/۲۵
۲۳۰ مثنوی سحر حلال (فارسی) معہ مقدمہ قدرت اللہ بیگ ۲/۵۰
۲۳۱ مطالعہ شبلی۔ ناظر کوروی۔ شجاعت علی سندیلوی ۴/۰
۲۳۲ نبات شبلی طالب مظہری ۲/۵۰
۲۳۳ مثنویات حالی۔ ناظر کاکوروی۔ شجاعت علی سندیلوی ۲/۰
۲۳۴ مطالعہ حالی " " " ۲/۵۰
۲۳۵ میٹھے بول " " ۱/۲۵
۲۳۶ مولوی نذیر احمد کی کہانی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۰
۲۳۷ معرکہ روم و یونان صادق سردھنوی ۶/۰
۲۳۸ مصنوعی چاند خان محبوب طرزی ۳/۰
۲۳۹ مقدمہ شعر و شاعری (مطابق نصاب بی۔ اے) حالی ۱/۵۰
۲۴۰ مرثیہ غالب " ۰/۲۵
۲۴۱ مجموعہ کربلا جرجی زیدان ۳/۵۰
۲۴۲ سمار مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
۲۴۳ مولانا حالی انوار الحسن صدیقی ۰/۳۰
۲۴۴ مہاراج بلی ڈاکٹر احسن فاروقی ۲/۰
۲۴۵ مسٹر ملا کی نوک جھونک۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ۰/۴۵
۲۴۶ مجذوب اور اُن کا کلام۔ مولانا رضا انصاری ۱/۵۰
۲۴۷ مصباح بلاغت مع مقدمہ (اُردو) محمد شریف ۲/۰
۲۴۸ مطالعہ سودا ڈاکٹر محمد حسن ۳/۰
۲۴۹ مزاحیہ شرح دیوان غالب۔ غلام احمد فرقت ۸/۰
۲۵۰ مقدمات و مقالات۔ عبدالاحد خاں خلیل ۵/۵۰
۲۵۱ منتخب سوانح اور خاکے۔ نجم الدین نقوی ۳/۰

(ن)

۲۵۲ نثر امرزا ابرار ڈاکٹر رغیب حسین ۳/۰
۲۵۳ نشاط غالب۔ وجاہت علی سندیلوی ۴/۵۰
۲۵۴ نقد و انتقاد اعجاز احمد معجز ۲/۰
۲۵۵ نقش حالی اوّل و دوم یعنی حالی نمبر پروفیسر احتشام حسین ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی شجاعت علی سندیلوی ۱۲/۰
۲۵۶ نغمہ مہر خان محبوب طرزی ۴/۰
۲۵۷ نقل ... مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۳/۰
۲۵۸ نقد فانی یعنی انتخاب کلام فانی کبیر احمد جائسی ۲/۰
۲۵۹ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ حامد اللہ افسر ۳/۰
۲۶۰ نیا ... (ناول) خان محبوب طرزی ۳/۵۰
۲۶۱ نور ... (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
۲۶۲ نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ) آل احمد سرور ۶/۰
۲۶۳ نقوش و افکار مجنوں گورکھپوری ۴/۵۰
۲۶۴ نشیمن انتصار حسین ۳/۰
۲۶۵ نذیر احمد کی کہانی فرحت اللہ بیگ ۱/۰
۲۶۶ نصاب فارسی، مع مقدمہ فارسی عبدالاحد خاں خلیل ۲/۰
۲۶۷ نئی نولکشور نمبر ۲/۰

(ہ)

۲۶۸ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے علی عباس حسینی ۳/۰
۲۶۹ ہندی کے مسلمان شعراء۔ امیر حسن نورانی ۰/۴۵

۲۷۰	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/۰۰
۲۷۱	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۲۷۲	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	" "	۱/۵۰
	(ی)		
۲۷۳	یادگار غالب	مولانا حالی	۲/۷۵
۲۷۴	یاقوتی (ناول)	خان محبوب طرزی	۲/۵۰
۲۷۵	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۳/۵۰

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

ادارۂ فروغ اردو ہند کا علمی و ادبی ماہنامہ

جلد ۱۸ — شمارہ ۸

رجسٹرڈ نمبر: ایل ۲۰

لائسنس نمبر: ۲۰۱۸۱۶۴/۲۰۶۴۱۷

فون نمبر: ۲۶۱۳۵

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

جنوری ۱۹۷۲ء

ماہر اعزازی:-

پروفیسر سید احتشام حسین

مجلس ادارت:-

محمد حسین شمس علوی

عبدالقوی دریابادی

سعادت علی صدیقی

زر سالانہ:- چار روپے

فی پرچہ:- ۳۷ پیسے

پتے:-

ادارۂ فروغ اردو

امین آباد پارک لکھنؤ-۱

ترتیب

سید انصار حسین پرنٹر، پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا

محمد حسین منہمتس علوی کاکوروی

اپنی باتیں

ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان کی لنگوا فرنیکا ـــــ اُردو ـــــ کو جن نامساعد حالا
سے گزرنا پڑا انھوں نے اِس شیریں اور ملک گیر زبان کی زندگی کو معرض خطر میں
دیا اور جس طرح بڑے بڑے زمیندار تعلقدار اور دیسی والیان ریاست چشم زدن
عروج سے پستی میں پہونچ گئے اُسی طرح اُردو زبان بھی اتنی مائل بہ انحطاط ہوئی
کہ اُس کی زندگی کی طرف سے مایوسی نظر آنے لگی اس "مردِ بیمار" کے معالجوں نے
کے شفایاب ہونے کی ساری تدبیریں کیں اُردو کے دن پھرنے کے آثار نظر نہیں
وجہ یہ کہ ہماری قومی حکومتیں ہی اس کی جان بری کی خواہاں نہ تھی سہ

دارند طبیباں ہمہ دردے را علاجے
دردے کہ طبیبم دہراں راچہ علالت

کی مصداق جن کے ہاتھ میں صحت کی کنجی تھی وہی طلابردا ہوگئے تو اس کی صحت کی کیسے
کی جاسکتی تھی۔

اب جبکہ اُترپردیش میں پنڈت کملاپتی ترپاٹھی کے ہاتھ اقتدار اعلیٰ آیا تو یہ نظر
لگا کہ اُردو کے پھر اب ضرور دن پھر کر رہیں گے۔ آپ نے برسرِ اقتدار آنے
وقت اُردو کے متعلق جس ہمدردی اور محبت کے جذبات کا اظہار کیا تھا وہ ر
رفتہ عملی شکل میں ظاہر ہونے لگے چنانچہ موصوف نے اُردو کو ترقی دینے کے لئے ا
مستقل رجسٹرڈ ادارہ قائم کردیا جس کا نام ہوگا اُردو اکاڈمی۔ اِس ادارہ کے اخراجا
اور اُس کے کام کو آگے بڑھانے کیلئے ہماری ریاست کی حکومت نے ۵ لاکھ دس ہزار روپیہ
کیا ہے اور اس کی نظم و نسق کی دیکھ بھال کے لئے ایک انتظامیہ کمیٹی مقرر کردی گئی
جس کے ممبر تعلیم سے تعلق رکھنے والے بہت سے ممتاز حضرات ہیں مثلاً پروفیسر سید احتشام حسین

ر نور الحسن ہاشمی - ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیم (اردو) شری خلیل الرحمٰن اور پروفیسر آل احمد سرور
اس کے علاوہ اکیڈیمی کی چیرمین ریاستی وزیر برائے قومی یکجہتی محترمہ بیگم حامدہ حبیب اللہ
ہوگی اور اس کے ڈائرکٹر پنڈت آنند نرائن ملّا اور اس کے سکریٹری اسسٹنٹ ڈائرکٹر
مات مسٹر صباح الدین عمر مقرر کئے گئے ہیں۔

اکاڈیمی کے مقاصد میں دوسرے کاموں کے علاوہ حسب ذیل امور شامل ہیں:۔

اُن ادبی اور سائنسی تحقیقات کا اُردو ترجمہ کرانا جنھوں نے ابھی تک اُردو کا لباس نہیں پہنا ہے۔

اُردو کے غیر شائع شدہ کتابوں کو شائع کرنا۔

اُردو میں حوالے سے متعلق کتابیں تیار کرکے شائع کرنا۔

۔ اُردو ادیبوں، مصنفوں اور مولفوں کو ان کی ادبی خدمات پر انعام دینا اور ان کی مالی مدد کرنا۔

۔ اُردو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے طلبہ کو سہولتیں اور مالی اعانت دینا۔

۔ اُردو کانفرنسوں کا انعقاد کرتے رہنا۔

اکاڈیمی کے ممبروں کی جو فہرست جو اخبارات میں چھپی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارہ پر سرکاری افسروں کا اثر و رسوخ زیادہ رہے جب کہ اس میں آزاد ممبروں کی اکثریت ہونا چاہیئے اس فہرست میں دوسری بات ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس ادارہ کی رکنیت کے لئے ایسے افراد لیا گیا ہے جو اُردو کے ماہر نہیں ہیں اور اُنھیں اُردو زبان سے زیادہ ربط ہی رہا ہے۔ اس کا ممبر انھیں لوگوں کو بنانا چاہیئے تھا جو برابر اُردو کی عملی خدمت کرتے رہے ہیں اور جو اُردو کی تصنیف و تالیف اور اُردو کتابوں اشاعت کے سلسلہ میں اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے ہوں۔

بس اس کی رکنیت اسی شخص کے حصّہ میں آنا چاہیئے جس نے اُردو مسلسل خدمت انجام دی ہو جس کا سلسلہ اب بھی جاری ہو اس زبان کی ترقی کے لئے خاص لگن اور ولولہ رکھتا ہو۔

غزلیات

ایم اے شمیم۔ ایم اے

عزم دل کا ہوتا ہے اور بھی جواں یارو
زیست جب بھی لیتی ہے اپنا امتحاں یارو

مہر و ماہ ہیں ہم بھی لیکن اس کو کیا کہئے
قریہ قریہ پھرتے ہیں خوار و بے مکاں یارو

میں کسی کے قدموں کا ایک نقشِ مبہم ہوں
میری جستجو میں ہے گردِ کارواں یارو

نفرتوں کے شعلوں میں لوگ کیوں جھلستے ہیں
کس لئے ہر اک چہرہ ہے دھواں دھواں یارو؟

کس طرح چھپاؤ گے، شکل لالہ و گل میں
جب پکار اُٹھے گا خونِ کشتگاں یارو؟

اک نئی سحر لے کر آفتاب نکلا ہے
کھول کر ذرا دیکھو بند کھڑکیاں یارو

آبروئے گلشن ہے، جانِ لالہ و گل بھی
ہے شمیم کے دم سے رنگِ گلستاں یارو

مظفر النساء نازبی، اے

چہرے پہ تازہ پھولوں کی جیسے نکھار ہے
سانسوں میں تیری خوشبوئے فصلِ بہار ہے

نظروں کے زخم بھرنے سے کیا فائدہ ہے د
دامن تو میرے دل کا ابھی تار تار ر

دیوانگیٔ عشق پہ ہنستے تو ہو مگر
سوچو تو اپنے دل پہ کسے اختیار ہے

منزل سے روشناس رہیں گے کبھی قد
قدموں پہ میرے اب بھی مجھے اختیار ر

آشفتہ حال ننگِ وفا کچھ بھی وہ سہی
اے نازؔ! ہر ادا سے مجھے اس کی پیار ہے

ڈاکٹر شمیم حنفی :-

سیّد احتشام حسین رضوی

سلسلۂ تعارف اساتذۂ اُردو جامعاتِ ہند — ۷

"ابّا! اب میں آپ سے بڑا ہو گیا ہوں۔"
یہ بات احتشام صاحب نے اس وقت کہی تھی جب وہ نویں درجے کے طالب علم تھے۔ ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور ان کے والد انھیں اپنے ساتھ پہلی بار لکھنؤ لے گئے تھے۔

بظاہر اس جملے میں اس معصوم سے بچے کی سادگی کا پرتو نظر آتا ہے جو بچپن اور جوانی کے سنگم پر پہونچنے کے بعد اپنے تیزی سے بڑھتے ہوئے قد کی طرف مسرت آمیز حیرت کے ساتھ دیکھ کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ اب وہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ واقعہ بھی یہی تھا لیکن اپنی ان آنکھوں کو کیا کروں جو حقیقتوں سے دوچار رہنے کے باوجود خواب کی دنیا میں بھٹکنے کی عادی ہو چکی ہیں۔ مجھے جب احتشام صاحب نے یہ واقعہ بتایا تو غیر شعوری طور پر میری نگاہیں تخیل کے دھندلکوں میں ایک ایسے حساس لڑکے پر مرکوز ہو گئیں جو ماضی و حال اور روایت و جدت کے دوراہے پر کھڑا ہو کر ایک لمحہ کے لئے دونوں سمتوں پر نظریں دوڑاتا ہے اور اپنے ذہن کو نئی منزلوں کا متلاشی اور نئی فضاؤں سے ہم آہنگ پاکر خود کو ذہنی اعتبار سے بلند تر اور پہلے سے زیادہ باشعور محسوس کرنے لگتا ہے۔

اور یہ سچ بھی ہے کہ اپنے بچپن اور جوانی کی آخری حدوں تک پہونچتے پہونچتے احتشام صاحب ایک نئے ذہنی افق سے دوچار ہو گئے تھے۔ پوربی دیس کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں جہاں پُرانی وضع کے ایک نیم پختہ مکان کی چہار دیواریوں میں قدیم سادات کی مخصوص مشرقی تہذیب اور روایتی وضعداری، مروت، اخلاق اور شرافت کا صدیوں پرانا ڈھانچہ اور تنگ سامانی کے باوجود ایک خاص رکھ رکھاؤ نظر آتا تھا۔ متوسط طبقے کے عام مسائل، پریشانیوں کے باوجود سفید پوشی کو برقرار رکھنے کی کوشش۔ مشرقی علوم .... اور مجلس و ماتم، نشست و برخاست اور خاطر تواضع کے روایتی انداز

باتوں باتوں میں الجھی ہوئی فضا اس فضا سے بالکل مختلف تھی جو احتشام صاحب کو ویلسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں ملی اور جہاں سے بڑے امتیاز کے ساتھ انھوں نے ہائی اسکول پاس کیا۔ اس اسکول کی زندگی کا ماحول قصباتی زندگی سے بالکل الگ تھی۔ یہاں انگریز یا عیسائی اساتذہ تھے۔ درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے انجیل مقدس کی تلاوت ہوتی تھی اور تعلیم کے ہر شعبے پر برطانوی حکمرانوں کے طرزِ زندگی اور [illegible] کی فلسفیات یا جدید علوم کا عکس [illegible] کے عام ہندوستانی مدرسوں یا اسکولوں کے مقابلہ میں زیادہ گہرا تھا۔ لیکن برسوں کی پالی پوسی روایتوں کے تحفظ کا جذبہ شدید اور بزرگوں سے ورثے میں ملی ہوئی معاشرتی قدروں سے ذہنی وابستگی اتنی گہری تھی کہ مغربی افق سے اٹھ کر مشرق کی ساری وسعتوں پر چھا جانے والی یہ نئی [illegible] احتشام صاحب میں خارجی طور پر کوئی نمایاں تبدیلی نہ کر سکی پھر بھی کان بچپن ہی سے وقت کے قدموں کی آہٹیں پہچاننے کے عادی تھے [illegible] نئے دور کے سیلاب کا پرشور نغمہ [illegible] رہا تا نتیجہ یہ ہوا کہ خارجیت اپنا [illegible] چکی تھی ہی داخلیت نے [illegible] رنگ ڈھنگ سے دوستی کر لی۔

پھر اسی دوران میں احتشام صاحب کو ایک بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اچانک انکے والد کا انتقال ہو گیا۔ شعور کی ابتدائی منزلیں طے کرتے ہوئے ذہن کے لئے یہ حادثہ محض دنیاوی اعتبار سے خود کو تنہا اور بے سہارا سمجھ لینے کا محرک نہیں بنا۔ یہ بھی ہوا کہ اب جہاں [illegible] دماغ کی کھڑکیوں سے مادی ضرورتوں کے مسائل [illegible] شروع کر دی وہیں تنہائی اور بے بسی کے احساس نے دھیرے دھیرے انکے دل میں اپنی کوششوں سے کچھ کر سکنے کی آرزو، ایک بہتر زندگی بنانے کے حوصلے اور ارمانوں کی ایک خیالی دنیا کے خواب کو جنم دینا شروع کر دیا۔ یوں کہنے کو دور اور قریب کے بہت سے بزرگوں کا سایہ سر پر موجود تھا۔ لیکن باپ کی شخصیت میں پیار اور احتساب سے اٹھی ہوئی لہروں سے چھوٹ کر اپنے آپ کو محرومیوں کے احساس سے نڈھال کرنے کے بجائے وہ کارزارِ حیات کے طوفانوں میں کود پڑے اور زندگی کے تجربات سے اپنی جھولیاں بھرنا شروع کر دیا۔

عام طور سے یہی دیکھا گیا ہے کہ ایسے طوفانوں کی زد میں آکر اچھے اچھوں کے ہوش بگڑ جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقیقتوں کے تیز دھارے شخصیت کے پرخچے اڑانے کی جگہ اسکے خواب و خیال کی راہیں بدل کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن احتشام صاحب ان دونوں عالموں سے بچے رہے یوں بھی انھیں شاید بچ ہی جانا چاہیئے تھا کیونکہ گھر سے پیار لے باہر کی دنیا میں سنبھل سنبھل کر [illegible] اور روایتوں کے احترام [illegible] دھیرے دھیرے قبول کرنا [illegible] حادثات زمانہ کے تھپیڑے کھانے والا سمٹا سمٹا یا شرمیلا نوجوان وقت کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے افق میں خود کو اس طرح نہ گم کر سکا کہ اس کا وجود موسوم ہو کر رہ جاتا شہر کے پرکشش ہنگاموں میں دیہات کے پرعظمت سکوت کی یادیں دم نہ توڑ سکیں اور مزید تعلیم کے شوق میں الہ آباد آنے کے بعد بھی یہ نوجوان دو مختلف سمتوں کو جانیوالی سڑکوں کے دوراہے پر کچھ دیر کے لئے ٹھٹکا پھر پھونک پھونک کر قدم بڑھانے لگا۔

یہ ذہنی کشمکش اور TO BE OR NOT TO BE

مسلسل سائے کی طرح احتشام صاحب کا تعاقب کرتا رہا۔ [illegible]ے میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کسی استاد کے مشورے پر ادبیات انگریزی کے ایم۔ اے کلاس میں داخلہ لیا۔ پھر چند بزرگوں کے مشورے سے اور وکالت کے شوق میں قانون کا کورس جوائن کر لیا۔ اور کچھ ہی دنوں بعد اس زمانے میں شعبۂ اردو کے صدر مرحوم سید ضامن علی صاحب کے اصرار پر شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئے۔ آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھے لیکن ہماری زبان و ادب کے لئے وہ ساعت شائد نیک تھی کہ پہلی کوشش میں چند نمبروں سے رہ گئے۔ اور دوبارہ اس طرف توجہ نہیں کی۔ ادب سے دلچسپی انکے مذاقِ طبع پر غالب آ گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادب میں ترقی پسندی کی لہر نے تخلیقی [illegible] سے دو چار رہنے والوں کے درک و شعور کو اپنی جانب متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ آزاد اور حالی کب کے جا چکے تھے۔ لیکن انکی صدائے بازگشت ان کی اصل آواز سے زیادہ گونجیلی اور قوی تھی۔ اس آواز میں بھی ایسے لوگوں کا اچھا خاصہ حلقہ تھا۔ جو اس نئی [illegible] کے عاشق ہو گئے تھے۔ احتشام صاحب بھی اس حلقے میں شریک ہو گئے آخر کہاں تک بچتے آخر کو چل کر اس لہر نے باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی اور "باغی" نوجوانوں کے ساتھ ساتھ چند "سٹھیائے" ہوئے بزرگوں کی اجتماعی کوششوں سے اسکے خط و خال تیزی کے ساتھ ابھرتے گئے۔ گاؤں کی دھولی بھائی فضا میں احتشام صاحب نے صرف پنگھٹ کا حسن، برسات کی بہاریں اور کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی بالیاں ہی نہیں دیکھی تھیں اور صرف ملہار یا برہا کے گیت یا رہٹ کی روں روں سے ابھرنے والا اداس نغمہ ہی نہیں سنا تھا بلکہ زمینداروں کے مظالم، فرسودہ اور بیمار رسوم و روایات کی زنجیریں بھوک، قحط، افلاس، اور بدحالی کی تصویریں اور سماجی و ذہنی پستی کے زندہ ڈھانچے بھی دیکھے تھے اور بوڑھے سود خواروں کی دوپہر کے سورج کی کرنوں جیسی سفاک اور تیز نگاہیں بھی پڑھی تھیں۔ چنانچہ اس نئی آواز میں انھوں نے اپنی آواز کو پا لیا اور مدرسے کی حدوں سے باہر نکل آئے۔ شخصیت نے کھلے ہوئے میدان میں آ کر اطمینان کی ایک سانس لی۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ پہلے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک ان کے فنکار کی دنیا بڑی تنگ تھی۔ چند گنے چنے مذہبی موضوعات یا کبھی کبھار اپنے سوز دروں کی آنچ سے [illegible] وقتی ہی طور پر خود کو بچانے کے لئے [illegible] جن کے اوپر سید احتشام حسین رضوی [illegible] کا لمبا چوڑا لیبل چسپاں رہتا لیکن اس تحریک کے ساتھ ساتھ ایک ایک کرکے ساری بندشوں کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ اور ان کی شخصیت میں چھپی ہوئی آزاد پسندی [illegible] کے لئے نئی راہیں مل گئیں۔ اور اب وہ صرف [illegible] رہ گئے تھے۔

ہیملٹ (HAMLET) کی نفسیاتی کشمکش

کا وہ دائرہ جہاں (TO BE OR NOT TO BE) کا مسئلہ لٹکا [illegible] رہتا تھا اب خود بخود پھیل کر بکھر گیا۔ احتشام صاحب نے اپنے آپ کو پا لیا تھا۔ اب سحر البیان کی طلسماتی فضاؤں، اطلس و کمخواب کے زرنگار پردوں، سلمیٰ [illegible] کیف آگیں محبت اور [illegible] جلوہ سامانیاں رنگ، حسن اور خوشبو کی کرشمہ سازیوں کے تانے بانے میں بھی انکی سنجیدہ، دانش اور ذہن نگاہیں الجھ نہ سکیں۔ وہ اس فضا میں پلنے والے کرداروں کو ٹٹول کر اپنے مطلب کی چیزیں نکالتے رہیں اور ناچ گانے کی دھوم، حسن و شباب کی کافرادائیوں اور رنگ رلیوں کی قوس و قزح کے نیچے [illegible]

ٹٹودبوڑھونے کے بجائے اس فضا میں اس عہد کے ہندوستان • کو دیکھتی رہیں، مطالعے کی وسعت کے ساتھ ساتھ کائنات کی حدیں بھی نئی وسعتوں کی طرف بڑھتی جا رہی تھیں۔

ایک روز ایک صاحب نے احتشام صاحب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ جب بھی ادب کی باتیں کرتے ہیں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ بجز ادب کے۔ تھوڑے بہت ترمیم واضافے کے ساتھ میں نے یہ بات کتنوں کی زبان سے سنی ہے۔ لیکن ان میں بیشتر وہی بزرگ شامل رہے ہیں جن کی انگلیاں وقت کی نبض سے زیادہ اپنی داخلیت کی رگ پر ہوتی ہیں۔ جن کا تصور بہت تابناک، بہت پُرکیف اور بہت خوبصورت ہونے کے باوجود برف کی سلوں کی طرح منجمد ہوتا ہے، جو تاریخ کے جدلیاتی ارتقا کو عملی زندگی یا مادیت کا بس ایک ادنیٰ سفر سمجھتے ہیں اور نور ونکہت سے معمور تخیل کی وادیوں میں نہ تو صنعتی ترقی کے ہنگاموں کا شور سننا پسند کرتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ اس طلسماتی فضا کے پردوں سے ذہنی واقتصادی انقلابات یا سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی استحصال کے خلاف ہونے والی انسانی جدوجہد کے سائے جھانکتے دکھائی دیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انکی داخلیت کے شیش محل پر خارجی حالات کی پرچھائیں نہ پڑ سکے اور زندہ حقیقتیں ان کے خوابوں کا تعاقب نہ کرسکیں۔ دل کی کافر ادائیوں میں دماغ کی کارفرمائیوں کا زہر نہ شامل ہونے پائے اور سرزمین خواب (ELDORALD) کے رنگا رنگ نقشے دیکھنے کے بعد عقلیت کا قلم یکبارگی یہ جملہ نہ ٹپکا دے کہ "اسکے بعد آنکھ کھل گئی"۔

اسی طرح احتشام صاحب کے بارے میں یہ رائیں بھی خاصی عام ہیں کہ انکی تحریریں الجھی ہوئی ہوتی ہیں۔ غلطی سے کوئی شگفتہ جملہ کبھی لکھ جائیں تو نظر ثانی اُسے کاٹ دیتے ہیں۔ اپنے موضوع کا جائزہ لیتے وق متعلقہ سماجی حالات کی الف بے سے ابتدا کرتے ہیں۔ جانے یہ باتیں کس حد تک صحیح ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان غور کرتے وقت میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے کہ جن تص کی بنیادوں پر ان کی عمارت کھڑی کی گئی ہے وہی ٹیڑھے اور شاید اسی لئے مجھے اس عمارت کی دیواریں تا ترچھی دکھائی دیتی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اپنے شعور کے ابتدائی سفر احتشام صاحب کی شخصیت جس نفسیاتی کشمکش سے د رہی ہے، جنون وخرد کے جس دوراہے پر بار بار ٹھٹکی عقل و وجدان کے سنگم پر جس طرح رک رک کر آگے بڑھی اور بڑھ بڑھ کر پیچھے ہٹی ہے۔ روایت اور جدت کے باتوں میں جس طرح الجھ الجھ کر بچی ہے اور ماضی و حا تصادم سے ابھرنے والی آواز جس طرح قبول کی ہے منزل سے نکلنے کے بعد کوئی بھی دوسری منزل اُسے ا دام فریب میں گرفتار نہ کرسکی۔ حقیقت اور سراب کا فر اچھی طرح سمجھ گئے۔ ان کی آواز ایک عہد کی آواز بن گئی میں ماضی کی فتح وشکست کے نشیب وفراز، انسانی تار کی پیچیدگیوں کے طلسم اور خواب وحقیقت کے مدوجز کی تھرتھراہٹیں شامل ہیں۔ لیکن اس آواز پر ایک بیدا ذی شعور، متحرک، صحتمند اور توانا دل ودماغ کی مہر دور ہی سے پہچانی جاسکتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے فکر خیال کی ساحریت سے ان کی آنکھیں بند نہیں ہوجاتیں

…ن بیان کی صہبا ان کے دماغ کو سلا نہیں دیتی۔ کسی …ے کی تحریک پر غور کرتے وقت وہ ان مادی وجوہ سے …نیاز نہیں رہ سکتے۔ جن سے اس نے اپنی غذا حاصل کی …اور یہ طرزِ فکر ان کا شناختی کارڈ بنا چکی ہے جسے پہلے ہی …طرح پہچانا جا سکتا ہے اس سلسلے میں خود میں ایک دلچسپ …واقعہ سے دو چار ہو چکا ہوں۔

ایک انٹرویو میں ممتحن نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ …محمد حسین آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے جو خاکہ آپ …نے مرتب کیا ہے اس کی ابتدا کس طرح ہوئی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی و سماجی کشمکش، برطانوی تسلط سے پیدا شدہ مختلف ذہنی و فکری رجحانات اور ان رجحانات کے ردعمل کے طور پر ظہور میں آنے والے نشاۃ الثانیہ کو میں نے اپنے موضوع کا پس منظر بنایا ہے کیونکہ اردو ادب میں جدت اور عقلیت کی جو لہریں اس دور میں ابھریں ان کے سوتے حالات و واقعات کے اس سرچشمے سے پھوٹے تھے

اور میری بات ختم ہوتے ہی ممتحن نے ایک تبسم زیر لب کے ساتھ کہا "آپ کے نگراں غالباً احتشام صاحب ہیں"

یہ سنتے ہی میں سوچنے لگا کہ میں ہی کیا وہ سارے لوگ جن کے شعور نے احتشام صاحب سے اکتساب فیض کیا ہے فکر و نظر کی سنجیدہ فضا میں اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتے کیونکہ احتشام صاحب خود کوئی راز یا پہیلی نہیں رہ گئے ہیں۔ وہ ایک مخصوص طرزِ فکر کا استعارہ اور ایک تحریک کی علامت بن چکے ہیں۔ ان کی انفرادیت ہر رنگ میں نمایاں ہونے کی قوت حاصل کر چکی ہے اور ان کا شعور ہر طلسم کو پھلانگ کر اپنا سفر طے کرنے پر قادر ہو چکا ہے۔

لیکن یہ بھی ہے کہ اس صحت مند، توانا اور منفرد آواز کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں شرافت، اخلاق، مروت، اور نیک نفسی کے روایتی معیار کی جو قندیلیں روشن رہی ہیں انھوں نے ان کی پوری شخصیت کے گرد ایک ہالہ کھینچ دیا ہے۔ یہ ہالہ ان کے وجود میں چھپے ہوئے باغی انسان کو گھن گرج کے ساتھ کچھ کہنے، ایک کھلی ہوئی شاہراہ کو پا لینے کے باوجود گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر تیز تیز چلنے اور ادب کا ایک متعین و روشن تصور رکھتے ہوئے بھی اپنے قلم کو بے لگام چھوڑنے یا کسی ادیب و شاعر کی شخصیت کے ان اسرار کو بے نقاب کرنے سے روکتا ہے جن سے آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ ہو جو اپنے ارمانوں کو بھی اپنے دل کے سامنے دہرانے میں جھجکتا ہو۔ جس کی زندگی "لے سانس بھی آہستہ" کی تفسیر بنی ہوئی ہو۔ جو اپنی آرزوؤں کی شکست پر جھنجھلانے میں اپنے آپ سے شرما جاتا ہو۔ جو اپنی تنہائیوں میں بھی شدت احساس سے بے قرار ہو کر اپنی آواز کو ایک حد سے آگے جانے سے روکتا ہو بھلا دوسروں کے سامنے یا دوسروں کے بارے میں کچھ کہتے وقت اس کی آواز میں تیزی کیسے آ سکتی ہے۔ یہ نرم آہنگی اور آہستہ خرامی بادی النظر میں احتشام صاحب کے پورے وجود پر فسردگی کا غبار بن کر چھا جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان کی شخصیت کا تیکھا پن ایک نامعلوم سی اداسی اور بے دلی کی دھند میں لپٹ کر ہلکا ہو گیا ہے جس میں ایک دھیما دھیما سا سوز ہے، تپش نہیں۔ جس میں لہریں تو بیدار ہوتی ہیں لیکن تلاطم کی حد تک نہیں پہونچتیں۔ پاس وضع کے ان دیکھے پہرے دار احساس کے دروازوں پر ہر وقت اپنی نظریں جمائے رہتے ہیں۔ اور نہاں خانۂ دل میں جلتے ہوئے آرزوؤں کے چراغ کی لو جہاں تیز ہوئی یہ دروازے فوراً بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ دبی ہوئی فسردگی اور تہ در تہ اداسی اوروں پر بار نہیں بنتی۔ اس میں دھرتی کے سینے پر پھیلی ہوئی اس چاندنی کا جادو ہے جس کی معنی خیز خاموشی دھیما پن" اور سوئی سوئی سی کیفیت اندھیروں کو بھی

پرکیف بنا دیتی ہے۔ مگر خود اپنے سحرکارانہ طلسم سے بے نیاز اور اپنے سوز خشک سے لاپرواہ نظر آتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ وضعداری کمزوری کی حدوں سے جا ملتی ہے جس کا انتقام وہ اپنے آپ سے لیتے ہیں۔ وہ ان کتابوں پر بھی پیش لفظ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جنھیں وہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اپنے ضروری کاموں کا حرج کرکے دوسروں کی معمولی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی کی دل شکنی نہیں کر سکتے۔ مجھے خود معلوم ہے کہ ایک صاحب نے اپنے بارے میں چند الفاظ لکھوانے کے لئے اس حد تک ان کا ناطقہ بند کر دیا تھا کہ انھیں ٹالنے کی ہزار کوششوں کے باوجود وہ ٹال نہ سکے اور ان کے تقریباً روزانہ نازل ہونے والے خطوط جس کی مجموعی تعداد کم و بیش چالیس رہی ہوگی۔ بالآخر اپنی محنتوں کا ثمرہ پانے میں کامیاب ہوگئے میں نے یہ منظر بھی بارہا دیکھا ہے کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے عالم میں بھی وہ بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ اچانک وارد ہو جانے والے کسی ایسے شخص کی باتوں کو گھنٹوں سنتے رہیں گے جو محض گفتگو برائے گفتگو کے مرض کا شکار ہو۔ ان کے ماتھے پر ایک بھی شکن نہیں ابھرے گی گو کہ کسی اور نے اگر اتنی کشادہ دلی پائی ہوتی تو ایک ساتھ ہزار شکنوں کو اس کی وسعت میں سمیٹ لیتا۔

اس کمزوری نے بعض لوگوں کو ان کی ادبی حیثیت پر انگلی اٹھانے کے موقعے ہی نہیں دیے بلکہ خود ان کی شخصیت بھی خاصی مجروح ہوئی ہے۔ احتشام صاحب کے شب و روز میں جانے کتنے ایسے لمحے آئے ہیں جب انھوں نے کسی ناخوشگوار واقعہ پر کچھ کہہ سن کے دل کی بھڑاس نکالنے کے بجائے اندر ہی اندر اس نشتر کو چھپایا ہے جو احساس کے دروازوں پر گھنٹوں دستک دیتا رہا۔ جانے کب تک [illegible] درد کی آنچ میں تپا کئے ہیں اور رات کی تنہائیوں کے جانے کتنے لمحے انھوں نے شدید کرب اور بے قراری کے عالم میں گذارے ہیں۔ اس طرح وہ شخصیت جو زمانے کے گرم و سرد کو جھیل کر پختہ ہوئی ہے اور جس نے حوادث کے تھپیڑے کھا کھا کر اپنی منزل پائی ہے اور حالات کے گرداب میں بھی اپنی انفرادیت کو ڈوبنے سے بچا پائے ہو اوپر سے اپنے وجود کی بس پرچھائیں نظر آئے گی۔ ایک [illegible] کی طرح دھیمی دھیمی متین، خاموش، سنجیدہ اور پروقار اور پہلے پہل دیکھنے والا شائد یہ جلدی سوچ بھی نہ سکے کہ اس کے سائے کی تہ میں زندہ حقیقتوں کے کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔

وضعداری کے ایک ہمیشہ بیدار رہنے والے احساس کے ساتھ ساتھ احتشام صاحب کے مزاج میں ایک فطری شرمیلا پن بھی ہے۔ پہلی ملاقات میں کبھی کبھی یہ شرمیلا پن دیکھنے والے کو پر غرور متانت کی ایک لمبی دیوار نظر آتا ہے جس کا درمیان میں حائل ہونا شائد اچھا نہ لگے۔ لیکن یہ شرمیلا پن جو احتشام صاحب کے خلوص کو فوراً بے باک ہو کر بیباک اور گرمجوشی کی حد تک پہونچنے سے روکتا ہے وہیں ان کی شخصیت میں ایک ایسی دلکشی کا اضافہ بھی کرتا ہے جس کا لطف اٹھانے کے لئے انھیں محض دیکھ لینا کافی نہیں ہے۔ وہ تبسم زیرلب کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں کبھی یہ کیفیت نہیں پیدا ہوتی کہ قہقہے کے جھکوروں میں انکے تجلی طور کو شرمانے والے دانتوں کا جلوہ نظر آ جائے۔ لیکن موٹے فریم کے چشمے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی روشن اور بیحد تیز آنکھیں بہت جلد اپنی ذہانت، خلوص و اعتماد کی کمندیں ڈال دیتی ہیں۔ ان آنکھوں کی طرف دیکھتے ہی ایسا لگتا ہے کہ ان کی تہ میں جانے کتنے اسرار اور اپنے زخموں کے علاوہ ایک زمانے کے غم کا احساس چھپا ہوگا۔ لیکن ان کی امڈتی ہوئی بیداری ان رازوں کو اظہار کے ساحل تک پہونچنے نہیں دیتی۔

اس شرمیلے پن نے ان میں بڑی دلکشی اور ان کی
باہ سادگی میں بڑی پرکاری پیدا کر دی ہے۔
ں خود انھیں بڑے جرکے بھی لگائے ہیں۔ احتشام
حب کا سماجی رتبہ بہتوں کے لئے قابلِ رشک ہوسکتا
لیکن مجھے اس بات میں شک ہے کہ انھوں نے اسے
پنی انفرادی ضرورتوں کی تکمیل یا اپنے ذاتی
ل کو حل کرنے کا وسیلہ بھی بنایا ہو۔ میں نے تو ہمیشہ
دیکھا کہ انھیں جب اپنے چھوٹے بچے اقبال کو ایک
ے اسکول میں داخل کرانے میں تھوڑی سی الجھن کا سامنا
کرنا پڑا تو انھوں نے چپ چاپ اسے ایک کمتر درجے کے
سکول میں ڈال دیا۔ اور جب کبھی اچانک کسی سفر کے موقع
پر پہلے سے ریزرویشن نہیں ہو سکا تو برتھ پر خوب پھیل
کر لیٹے ہوئے مسافر سے اک ذرا سمٹ جانے کی درخواست
کرنے کے بجائے وہ اس ضروری سفر سے بچنے کے حیلے
ڈھونڈنے لگے۔ شائد اسی شرمیلے پن نے انھیں امریکہ در
یورپ میں ایک برس گذارنے کے بعد بھی اپنی شخصیت پر
مغربیت کی آنچ آنے سے محفوظ رکھا۔ وہاں بھی وہ مختلف
علمی ادبی اور تہذیبی اداروں کی زیارت کرتے رہے۔
لائبریریوں اور میوزیموں کے چکر لگاتے رہے۔ اور انگلستان
امریکا و فرانس کے دانشوروں، عالموں اور ادیبوں سے
ملاقاتیں کرتے رہے۔ تہذیبی زندگی کے مطالعے سے دلچسپی رکھتے
ہوئے انگریزی، امریکی اور فرانسیسی فلمیں دیکھ لیں ورنہ
نائٹ کلب، تھیٹر اور ادیرا کی حدوں میں قدم رکھنے سے بھی کترا
تے۔ ... کی فضاؤں کے سمندر میں اترنے کے بعد بھی وہ
مستقل طور پر اپنی انفرادیت کے ساحل پر نظریں جمائے رہے۔
لیکن یہ انفرادیت احتشام صاحب کے شعور کے
... و علمی سرمایہ اکٹھا کرنے کی راہ میں کبھی نہیں اڑی اور

شعوری سفر میں کبھی بھی رکاوٹ نہیں بنی۔ اس کی وجہ
احتشام صاحب کی پوری شخصیت کا احاطہ کرنے والی علم کی
وہ پیاس، سب کچھ جاننے اور سمجھنے کی وہ جستجو اور نئے آفاق
سے روشناس ہونے کی وہ شائد خواہش ہے جو انکی شخصیت
کے ہر پہلو اور ہر افتاد پر غالب آجاتی ہے۔ وہ بیحد پڑھتے
ہیں اور پڑھنے سے زیادہ سوچتے ہیں۔ ان کا مطالعہ چند
انے گنے موضوعات کا پابند نہیں ہوتا کیونکہ ادب کو
اپنے مطالعے کا مرکز بنانے کے باوجود وہ اسے زندگی کے
دوسرے شعبوں اور علوم و فنون کی دیگر شکلوں سے
بے نیاز نہیں سمجھتے۔ یہ وحدت ان کے نزدیک کثرت کا جوہر
ہے۔ وہ زندگی کے ہنگاموں اور کسی بھی طرح کی عملی
سیاست سے حتی الامکان اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش
کرتے ہیں لیکن ان کی کون و مکان سے پار ہو جانے والی
نظر ان سب کا مفہوم سمجھ لیتی ہے۔ ادب کے ساتھ ساتھ
وہ فلسفہ، تاریخ، جمالیات، کلچر، مصوری، موسیقی،
نفسیات اور عمرانیات اور یہی نہیں بلکہ سائنس کی گوناگوں
کرشمہ سازیوں۔ آئین اسٹائن کے نظریات اور زمان و مکان
کے جدید ترین تصورات میں محض دلچسپی ہی نہیں لیتے بلکہ
ان سے ایسی واقفیت بھی رکھتے ہیں جو کتنوں کے نزدیک
قابل رشک ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے احاطہ
تحریر و تقریر میں آنے والی کوئی بھی بات بہت سی باتوں
کا مرکب بن جاتی ہے۔ اور ادبی تنقید یا مطالعے کے روایتی
انداز پر جان دینے والوں کو ان کی گفتگو کبھی ہوئی، بہکی
ہوئی اور ادب پر باتیں کرتے وقت ادب سے کترا کر دوسری
دنیاؤں میں بھٹکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شعر کی تشریح کرتے
وقت وہ محض الفاظ کے سیدھے سادے معنی بتا دینے یا اس
کا مفہوم بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کرتے۔ یہ تشریح ایک

فکری سفر بن جاتی ہے جس کی منزلوں میں وقت کے کتنے نشیب و فراز اور زندگی کے کیسے کیسے موڑ شامل ہو جاتے ہیں اور ان کی نگاہیں ایک اکیلے رخ کا پردہ چاک کرتی ہوئی پس منظر کی بیکراں وسعتوں پر پھیل جاتی ہے۔

ہو سکتا ہے احتشام صاحب سے زیادہ کچھ لوگوں نے پڑھا ہو لیکن ان کی عام گفتگو سن کر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حافظے میں مطالعے کا ذخیرہ جس ترتیب تہذیب اور سلیقے کے ساتھ محفوظ ہے اس کی مثال شاید آسانی سے نہ مل سکے گی۔ یہ سلیقہ اور ترتیب ہر گفتگو میں عام طور پر برقرار رہتی ہے اور اس کی سحر کاریاں سننے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتیں۔ ان کی زبان سے یورپ کے حالات سنتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ پوری فضا متحرک ہو کر سامنے آگئی ہے۔ ان کی گفتگو کی دل فریبیوں کے دو ایک واقعات کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے جب احتشام صاحب آئے تو وائس چانسلر نے انہیں ریسرچ کے طلبا کی انجمن کا صدر بھی نامزد کردیا۔ ان کی ایک تقریب میں احتشام صاحب اراکین سے متعارف ہوئے۔ معاشیات کے ایک ریسرچ اسکالر سے ملتے وقت رواداری میں انھوں نے اس کے موضوع سے متعلق بھی باتیں لیں۔ اور آگے بڑھ گئے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ طالب علم کی آنکھوں میں وہی پاکیزہ چمک عود کر آئی جو علم کی عظمت اور تقدس کے اعتراف کا نتیجہ ہوتی۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ "جی چاہتا ہے احتشام صاحب کو نگراں بناؤں"۔

اس اظہار میں جذبے کی شدت سے پیدا ہونیوالے مبالغے کی آمیزش تو ہو سکتی ہے لیکن اس میں چھپی ہوئی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح قومی یک جہتی کے موضوع پر ان کی تقریر سننے کے بعد سیاسیات کے ایک مشہور پروفیسر نے یا ہندی ادب کے مختلف پہلوؤں پر ان کی گفتگو سن کر ہندی کے ایک ممتاز ادیب نے بھی کم و بیش ایسے ہی تاثر کا اظہار کیا تھا۔ سیاسیات کا ایک پروفیسر یا ہندی کا ایک ادیب اپنے موضوعات سے جتنا قریب ہو سکتا ہے احتشام صاحب یقینی طور پر ان سے اتنے زیادہ قریب نہ ہونگے لیکن جس علم کی کرشمہ سازیوں نے انھیں اس درجہ مسحور کیا وہ میرے خیال میں احتشام صاحب کے حافظے میں محفوظ مطالعے کی وہی ترتیب اور سلیقہ اور ان کا منفرد انداز گفتگو ہے یہ انداز بعض لوگوں کی نظر میں احتشام صاحب کو "خوابوں کا آدمی" بنا دیتا ہے لیکن یہ وہی لوگ ہیں جو اس طرح اپنی ناتمام آرزوؤں کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں اور جن کی نظریں ستاروں سے آگے بسنے والی دنیاؤں تک پہنچنے سے پہلے ہی تھک جاتی ہیں۔

میں نے احتشام صاحب کو سب سے پہلے اس وقت دیکھا تھا جب وہ یونیورسٹی کے کسی کام سے الہ آباد آئے تھے اور محترمی ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے انھیں الہ آباد کی مشہور ادبی انجمن "تھرسڈے کلب" میں ایک چھوٹی سی تقریر کے لئے مدعو کیا تھا۔ یہ بات تقریباً سات برس پہلے کی ہے۔ باقاعدہ ملاقات تقریباً تین برس پہلے ہوئی جب الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی جگہ کے لئے ہونے والے انٹرویو میں امیدوار کی حیثیت سے آئے۔ میری اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خواہش پر اس دن ہاسٹل کی بزم ادب کے افتتاحی جلسے کا پروگرام بن گیا۔ کیونکہ اس موقع پر پروفیسر آل احمد سرور

م ڈاکٹر زور۔ ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر خورشید الاسلام بھی الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ بزم ادب کا سکریٹری ...نے کی حیثیت سے ان حضرات سے ملنا اور جلسے میں شرکت ...لئے آمادہ کرنا ذمے تھا۔ چنانچہ دیگر حضرات کے علاوہ ...احتشام صاحب سے بھی ملا۔ لیکن جلسے کی مصروفیتوں ...ان کے پاس زیادہ بیٹھنے کا موقعہ نہ مل سکا اس کے چند ...بعد ہی احتشام صاحب اپنا تقرر ہوجانے پر الہ آباد آگئے۔

اور اس کے بعد سے آج تک میں برابر احتشام صاحب ...دیکھتا رہا ہوں۔ ادبی جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے۔ کلاس ...پڑھاتے ہوئے، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں ان کی ...تیں سنتے ہوئے۔ ملگجی شانوں کو ان کے ساتھ سڑکوں پر ...چہل قدمی کرتے ہوئے، گھر پر جب وہ شیو بنا رہے ہوں یا مختلف باتیں بھی کرتے جا رہے ہوں اور اقبال کی شرارتوں ...احتجاج کرکے بیچ بیچ میں اسے ڈانٹتے بھی جا رہے۔ غرضیکہ ہر رنگ میں انھیں دیکھا ہے۔ میں نے انھیں اس عالم میں بھی دیکھا ہے کہ ایک خالص گھریلو آدمی کی طرح کے کسی فرد کی علالت سے پریشان وہ ڈاکٹر کے یہاں بھاگے جا رہے ہیں۔ اور یہ سوچ کر اکثر کڑھا بھی ہوں کہ راتوں کو اچانک ...اپنی طبیعت خراب ہوجانے پر وہ تنہا اور بے قرار گھنٹوں ...برآمدے میں ٹہلتے رہے ہیں اور نیند خراب ہوجانے کے خوف سے گھر کے کسی فرد کو جگانا بھی پسند نہیں کیا۔

میں نے جس قدر انھیں دیکھا ہے شائد اس سے زیادہ دوسروں سے ان کے بارے میں سنا ہے۔ دانش محل میں ان کے ساتھ بیٹھنے والے ان احباب سے جن کی شاموں میں تابناکی اسی وقت آتی تھی جب احتشام صاحب کی افسردہ اور پرسوز شخصیت کا جادو بھی شامل ہوجاتا تھا

ان طلبائے جنھوں نے برسوں احتشام صاحب سے اکتساب فیض کیا ہے۔ اور ان اساتذہ سے جنھوں نے احتشام صاحب کی رفاقت کے لطف اٹھائے۔ عام آدمیوں سے جو انھیں قدرے دور سے دیکھنے کے باوجود انھیں اپنے آپ سے قریب اور اپنی ہی طرح زندگی اور اس کے مسائل سے دوچار ایک سیدھا سادا سا انسان سمجھتے ہیں۔ مختلف شاعروں اور ادیبوں نے جنھوں نے احتشام صاحب کی آواز میں اپنی منزلوں کا سراغ پایا ہے اور اپنے شعور کو جلا بخشی ہے۔ ان دانشوروں سے جنھوں نے احتشام صاحب کے ساتھ مل کر فکر و خیال کی راہیں متعین کی ہیں۔ اور ان بزرگوں سے جنھوں نے احتشام صاحب کے ادبی مسلک پر نکتہ چینی کرنے کے باوجود ان کے لہجے کے توازن، ان کی فکر کی بلندی۔ ان کے خیال کی وسعت اور ان کے مزاج کی سادگی اور شرافت کا اعتراف کیا ہے۔

غرضیکہ میں یہ سمجھنے میں خود کو غلط بیانی کا قصوروار نہیں سمجھتا کہ میں نے احتشام صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی نظر کی بصیرت اور فکر کی وسعت کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا ہے۔ ان کے ادبی مسلک سے اپنے فرو مایہ شعور کے چراغ روشن کئے ہیں اور ان کی شفقتوں سے اپنے ذاتی غموں اور انفرادی محرومیوں میں نئی قوتیں حاصل کی ہیں لیکن انھیں میں سمجھ بھی سکا ہوں۔

وہ احتشام صاحب جو اپنی خلوتوں میں بھی خود کو اپنے آپ سے چھپاتے ہیں۔ جو اپنی آواز اور لہجے پر اعتماد رکھتے ہوئے بھی اس پر توازن کے پہرے بٹھلائے رکھتے ہیں۔ جو اپنی شخصیت میں چھپے ہوئے باغی انسان کو سرکشی پر آمادہ دیکھ کر اسے پیچھے ڈھکیل دینے کے عادی ہو چکے ہیں جو

(باقی مضمون صفحہ ۱۸ کالم ۲ پر دیکھئے)

غزلیات

اسحاق ملک حیدرآبادی

بذبۂ طلب جس کا رات دن مچلتا ہے
کب مراد فیلنے تک آستاں سے ٹلتا ہے
ں مقام سے دیکھیں کون بیچ نکلتا ہے
رنگ و نور کا جادو آدمی پہ چلتا ہے
، نویدِ عشرت ہو یا پیامِ محرومی
دل ترے اشارے پر کروٹیں بدلتا ہے
رہ اٹھاتے ہیں لوگ وقت حاصل سے
اپنی راہ تیزی سے وقت چل نکلتا ہے
ں گیت گاتا ہے بربطِ مسرت پر
کوئی شدتِ غم سے خونِ دل اگلتا ہے
یاد تلخی و حارت رہ گئی ملک باقی
دل کا حال کیا کہئے جب شعور جلتا ہے

●

پرواز جہادی

تعمیر و ترقی کے ہاتھوں، پامال بھی ہیں غرقاب بھی ہیں
تسکین و تسلّی کی خاطر، بیچین بھی ہیں بیتاب بھی ہیں

وہ بار نہیں ہوں اے غمِ جاں! جو تیرے اٹھائے اٹھ جاؤں
میں تنہا نہیں ہوں ساتھ مرے امیدیں بھی ہیں خواب بھی ہیں

رونے کی خوشی میں ہنسنا نہیں، اور ہنسنے کے غم میں رونا نہیں
دل تھام کے رہنا دیوانے! یاں غیر بھی ہیں احباب بھی ہیں

اے حوصلۂ صبر شکن! مایوس ہیں اہلِ ساحل بھی
کشتی ہے شکستہ اور رہ میں امواج بھی ہیں گرداب بھی ہیں

اے چارہ گرِ آئینہ ساز! مجبور ہیں ہم مجرم نہ سمجھ
خود ہی سے بیخود ہونے کے حالات بھی ہیں اسباب بھی ہیں

یہ بزمِ طرب، یہ میخانہ، جہانِ جہاں بے نظم و نسق
بے خانماں پرواز کے کچھ دستور بھی ہیں آداب بھی ہیں

●

آصفہ زمانی۔ ایم اے ایل ایل بی

طالب آملی

خود اپنے اور دوسروں کے آئینے خانے میں کسی شخص کے کلام کے حسن و قبح کے پرکھنے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ با لفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ تنقید کے دو رخ ہوا کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ کوئی شخص خود اپنے محاسن و معائب کا بیان انصاف کے ترازو میں رکھ دے دوسرے یہ کہ اس کے کلام کو دیکھنے اور سننے والے خود یہ اندازہ لگائیں کہ فلاں شخص کتنے پانی میں ہے یعنی وہ عوام الناس کی رائے کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟ عموماً تنقید کا یہ دوسرا طریقہ ہی پسندیدہ اور معیاری سمجھا جاتا ہے کیونکہ اپنے منہ میاں مٹھو بننا تو بہت آسان ہے اصل تعریف تو جب ہے کہ "غیروں" کے منہ سے "واہ" نکل جائے۔

ادبی دنیا میں طالب آملی کا نام محتاج تعارف نہیں، عہد جہانگیری کے اس نگینہ کی پرکھ تو شہنشاہ وقت خود کر چکا تھا۔ جس کا تابندہ ثبوت "ملک الشعرائی" کا وہ تاج تھا جس سے ۱۶۱۹ء میں طالب آملی نوازا جا چکا تھا۔ یہ ان چند خوش قسمت شعراء میں سے ایک تھا جس کی شاعری کا شہرہ خود اس کی زندگی میں ہو چکا تھا مرزا غالب کو تو ہمیشہ یہ غم رہا کہ لوگ ان کے کلام پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اسے اہل زبان کے کلام کا ہم پلہ نہیں سمجھتے، اس کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور ہیں

لیکن طالب کو اس قسم کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ انھوں نے کھلم کھلا جی کھول کر اپنی تعریف کی، ایسا محض اسلئے کہ انھیں احساس تھا کہ ان کا کلام اس لائق ہے کہ سراہا جائے لہٰذا بے اختیار کہہ اٹھے کہ ؎

ادا طرازی من دلفریب یاراں گشت
وگرنہ شوخ زبان نکتہ گوئی بسیار است

کامیابی کا یہ احساس تو فطری طور پر ہر شاعر میں موجود رہتا ہے۔ یہ نفسیات انسانی ہے کہ بدصورت سے بد صورت انسان بھی اپنے کو دنیا کا خوبصورت ترین شخص تصور کرتا ہے اگر وہ اپنے کو مکمل حسن کا نمونہ نہیں سمجھتا تو اپنی ذات میں کم از کم خوبصورتی کا بہرحال کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیتا ہے۔ علم نفسیات کے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ جس وقت بھی انسان میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ خوبصورت نہیں اسی وقت وہ ختم ہو جائے۔ پھر بھلا جس کے خمیر میں یہ احساس جا

ہو وہ خود اپنی ہی بنائی ہوئی خودساختہ تصویر کے پیکر کو جب الفاظ کا جامہ پہنا کر سامنے لے آئے تو کیونکر اسے برا کہہ سکتا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جہاں کوئی شاعر کبھی یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کے شعر کے ایک لفظ کو بھی کاٹا چھانٹا جائے یا ردوبدل کرکے ادھر سے ادھر کیا جائے۔ اشعار کے تراش وخراش اور کاٹ چھانٹ میں اسے بالکل وہی تکلیف واذیت ہوتی ہے جیسا کسی شخص کو اپنے بچے کے گلے پر چھری پھیرتے وقت۔ کیونکہ اس کو اپنے شعر سے ایسا ہی پیار ہوتا ہے جیسا کسی باپ کو اپنی اولاد سے۔ کسی کی اولاد خواہ کتنی ہی بدصورت کیوں نہ ہو اپنے والدین کی نگاہ میں چندے آفتاب وچندے ماہتاب ہوا کرتی ہے۔ بعینہ یہی حالت شاعر کے نزدیک اپنے شعر کی ہوتی ہے۔ یہی وہ احساس ہے جہاں ایک ایک شعر کی داد ملنے پر گویا اسے قارون کا خزانہ ہاتھ آجاتا ہے۔ پھر بھلا وہ کس دل سے خود اپنے اشعار کی برائی کر سکتا ہے۔ پھر بھی ایسے شعرا گذرے ہیں جنھوں نے خود اپنے کلام پر کھل کر تبصرے فرمائے ہیں فارسی شعرا میں امیر خسرو سے زیادہ اپنے کلام کے بارے میں بے لاگ تبصرہ کرنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہوا ہو "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں انھوں نے اپنے کلام کے محاسن ومعائب پر تفصیلی بحث کی ہے۔ پھر بھی اپنی قادرالکلامی کے مداح ہیں، کہتے ہیں ؎

دانی کہ ہستم در جہاں، من خسرو شیریں بیاں
گرنائی از بہر دلم ، بہر زبانِ من بیا

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

سخن بشنو مگر از بندۂ خسرو
جہاں چون او، سخن گوئی ندارد

عرفی نے بھی اپنے کلام پر تبصرہ فرماتے ہوئے ہی ایسا شعر کہا ؎

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقی وظیفات غزل است

نظیری بھی خاموش نہ رہ سکے تھے ؎

چوں تو بہ کنم از غزل و قولِ نظیری
دورانِ خرد از صد ہزاراں یک ہزرم را

مرزا غالب کو بھی اگرچہ ان کی زندگی میں خاطر خواہ داد نہیں مل رہی تھی تاہم وہ بھی اس احساس سے دبے نظر آتے ہیں ؎

دبیرم، شاعرم، رندم ندیمم، شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

طالب کے استاد فیضی بھی فرما گئے ؎

امروز نہ شاعرم حکیم
دانندۂ حادث و قدیم

پھر بھلا طالب اس خیال اور اس احساس کو کیونکر بھول جاتے — انھیں بھی اپنا ایک ایک شعر جیسے تاج محل شاہی خوبصورت نظر آرہا تھا۔ نہیں کوئی تشبیہ نظر آئی تو اپنے مستانہ کلام کو 'طاؤس' کہہ بیٹھے جو دیوانہ 'باغ' سے باہر نکل آیا ہو ؎

سخن مستانہ آید بر زباں از خاطر طالب
چو طاؤسے کہ مجنونانہ از بستاں بروں آید

انھیں بھی اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ دوسروں کا کلام انکے کلام کے آگے ہیچ ہے دیکھئے دونوں کا فرق وہ کیا کہہ کر ظاہر کرتے ہیں ؎

با جملہ صاحباں زبانیم لیک ہست
فرق از کلمہ خانہ، کلمہ خزانہ را

بھی کبھی اپنی نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی خود داد بھی دے بیٹھتے ہیں ؎

بسواد شعر طالب نظرم فتاد دیدم
ہمہ فکر ہائے نازک، ہمہ قصہ ہائے رنگیں

ساتھ ہی جہاں انھیں اپنے اشعار میں حُسن نظر آتا ہے وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ شعرگوئی قابل تعریف کام نہیں جبتک انسان میں شعرفہمی نہ ہو ؎

سخن طالب مکن بہ گفتن شعر
کیا از گفتن ست، فہمیدن

یہی اشعار کے جانچ کی کسوٹی ہے، یہی اس کے کمال کی معراج ہے — طالب اس معراج تک پہونچ چکے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر انھوں نے اپنے کلام کی خود تعریف کی تو بیجا نہیں۔

اب آئیے تنقید کے اس دوسرے پہلو پر نظر ڈالیں جہاں ہم اور آپ کچھ کہتے ہیں۔

یہاں پر چونکہ طالب کی فن شاعری پر نظر ڈالنا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس کی فن شاعری کو نقادوں نے کس انداز سے پرکھا، جانچا اور تولا؟ سب سے پہلے صاحب میخانہ کی رائے سے اس کی شاعری کی ادبی اہمیت کا اندازہ لگایا جائے فرماتے ہیں:

"آں نادرۂ عصر فرید زماں وحید دوراں خود رت۔ آں قدر اہلیت و استعداد کہ با او ست با دیگر فرائے ایں ایام نیست........ جوانی دید بانواع ہنر آراستہ عزیزی ملاحظہ نمود با صفات سخنوری پیراستہ در فن طرازامثال و اقران ممتاز در علم سلوک و مردی انباز۔"

مرزا صائب کی کسوٹی پر وہ اسطرح پورے اترتے ہیں ؎

بہ طرز تازہ قسم یاد می کنم صائب
کہ جا می طالب آمل در اصفہاں پیداست

بعد کی ایک شہادت سے تو یہاں تک اندازہ ہوا ہے کہ نہ صرف مرزا صائب بلکہ دوسرے ہمعصر سخنوران، طالب کی استادی کا یہاں تک لوہا مان بیٹھے کہ انھیں اپنا استاد تسلیم کرنے لگے۔

"مرزا صائب وغیرہ سخن سنجان او (طالب) را بہ استادی قبول داشتند[۱]۔"

مخزن الغرائب کے مصنف نے ابھی قلم اٹھایا تو یوں گہرافشانیاں کیں۔

"جودت طبع و استقامت سلیقہ اش بکمال و در طرز شاعری زبدۂ امثال بودہ سخنش در سخنوراں قدر قیمتی دارد۔"

والائے داغستانی نے جہاں دوسرے شعراء کو پرکھا، طالب کو بھی کسوٹی پر کس بیٹھے فرماتے ہیں:-

"طالب آملی از مستعدان روزگار بودہ، خطوط را خوب می نوشتہ در مصاحبت و مجلس آرائی نظیر نداشت۔ اشعارش در کمال عذوبت و بلاغت و شستگی و تازگی و رعنائی و نازکی واقع شدہ۔"

آزاد بلگرامی کو جب طالب کے تخیل کی بلند پروازی ندرتِ خیال اور نازکیٔ بیان کے بارے میں علم ہوا تو بے تحاشہ اس کا اظہار ان الفاظ میں کر بیٹھے:-

"شاعر خوش تخیل است، سخن را بہ مرحلت والائی نوازد و پایہ او را تا سدرۃ المنتہیٰ بلند می سازد۔"

---

[۱] سرخوش کلیمۃ الشعراء

سرو آزاد نے بھی اپنی آرا کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

"جویائی معانی بلند است وغواص لآ لئ
دل پسند"

'ید بیضا' کے الفاظ پر بھی غور کیجیے :-

" از شعرائی بلاغت آئین وفصحائی
نزاکت آفرین است"

طالب کے بارے میں یہ ناقدانہ اظہار تو ان حضرات کا تھا جنھوں نے اسے ہر طرف سے کھرا سمجھا اور بے تکلفی سے اپنی رائے کا اظہار کر دیا لیکن ان سب سے بلند تر اس شخص کی پرکھ اصلی پرکھ ہو گی جس نے طالب کی عظمت گرانے کی ہر چند کوشش کی لیکن پھر بھی اس کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں وہ ہیں لطف علی آذر دیکھیے کیا کہتے ہیں

" (طالب) صاحب دیوان است و در
شاعری طرز خاص کہ مطلوب شعرای
فصیح نیست دارد"

ظاہر ہے خود اپنے کلام پر اپنی ناقدانہ نظر کے بعد اور پھر دوسروں کی ناقدانہ رائے کے اظہار کے بعد طالب اپنے تمام محاسن شاعری میں کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہاں پر اگر ان کی فن شعر گوئی کو علٰحدہ علٰحدہ نہ بھی پرکھا جائے تو بھی کون سا پہلو ہے جو تشنہ رہ گیا۔ اور آخر میں تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؏

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

بسلسلہ مضمون صفحہ ۱۳ کا بقیہ

طوفانوں کی خواہش رکھتے ہوئے بھی سکون [illegible] ترشے ترشائے، تیکھے، خوبصورت اور [illegible] اشعار پر جان دینے کے باوجود زندگی اور بیدار [illegible] نہیں چھوڑتے۔ جو اپنے سینے میں حرم سرا کی ناز نین طرح چھپے ہوئے اسرار کو اپنے آپ سے سرگوشی کی اجازت بھی نہیں دیتے جو بجائے خود ایک [illegible] پرعظمت اور لازوال مکتبۂ فکر کی علامت ہوتے [illegible] بھی کبھی کبھی اپنے آپ سے شاکی ہوتے ہیں اور [illegible] کے ساتھ یہ کہتے ہیں۔" میں نے ابھی تک کیا ہی کیا انھیں سمجھنا بھلا کب آسان ہے۔

انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ" [illegible]

ان کا فلسفیانہ غم، ان کا احساس تنہائی [illegible] ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ وہ کیا ہیں" غالباً خود انھیں بھی اپنے چھپے چھپے سے جو علم نہیں ہے۔ شاید ان میں اتنی گہرائی اور پیچیدگی جس کو وہ بتا ہی نہیں سکتے۔ پھر میں ہی کیا کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ اس نے احتشام حسین کو سمجھا ہے۔

محی الدین حسن سہیل :-

فراق اور بارگاہِ حسن

بارگاہِ حسن کے فردوس بداماں مناظر جاذبِ نظر اور باعثِ فرحتِ قلب ہیں۔ اس کی [illegible] پھوٹتی [illegible] رنگین صد گلستاں نگاہ کا سامان مہیا کرتی [illegible] دراز کی نکہت [illegible] مشامِ جاں کو معطر کرتی [illegible] وہ بارگاہ ہے جہاں ان شہنشاہوں نے [illegible] جھکا دیے ہیں۔ جن کے قدموں پر انسانوں کے سر خم رہے ہیں اور رنگ جہانگیر اور تاجِ خسروی [illegible] آستانۂ بے نیاز پر جبیں سا رہا ہے نظامِ عالم [illegible] لرزہ جہاں [illegible] خود [illegible] ترک کر کے اس آستانۂ ناز پر سجدہ ریز رہا ہے۔

یہ بے نیازی یہ بے رخی حسنِ مجازی کو حسنِ حقیقی سے ملی ہے۔ جس کی بے نیازی کا افسانہ روزِ ازل سے خراماں خراماں ہوائیں سنا رہی ہیں۔ سازِ ہستی سے اسی بے رخی اور اسی کے فراق میں دلدوز نغمے پھوٹے ہیں یہ گلچین گلرخ گلبدن جس کا نام حسن ہے اپنے دامن میں گل کی تمام صفات لیے چمنستانِ [illegible] کے [illegible] کو [illegible] گری کے انداز سکھاتا ہے [illegible] کی اٹھکھیلیاں اور بلبل کے ترانے سب کا جواب [illegible] کی ایک خاموشی ہو گئی ہے۔ عشق کسی بھی روپ میں ہو پریشان اور سرگرداں حسن ہر صورت میں شہنشاہ بے نیاز ہے اور یہ عشق کا شیوۂ نیاز ہی تو ہے جس نے حسنِ بے پرواہ کو خود آرائی کی طرف مائل کر دیا ہے۔

عاشق کے دل میں بھری محبت کی بادۂ سر جوش موجیں مار کر اس کو [illegible] حسنِ جواں کی طرف لے جاتی [illegible] خرد متاعِ دل و جان سب کچھ چھن جاتا ہے۔ ایمان چشمِ مست پر نثار ہو جاتا ہے۔ سرمایۂ حیات نو بہارِ ناز کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے۔ دیوانگی دامنِ ہوش تار تار کر دیتی ہے۔ اور جب فراقِ حسن کی بارگاہ [illegible] آنکھ کھولتا ہے تو رہزنِ ہوش جلوے اسے سوزِ مکمل اور درد مجسم بنا دیتے ہیں یہ وہ سوز و ساز درد و الم ہے جس کے پردے کے پیچھے ایک ماہ پارہ اور ماہ

طلعت کی جفائیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ جس نے شاعر کو ایک نظر دیکھ کر اس کے دل کے گوشے گوشے میں غم کے دریا بہا دیئے ہیں اور فراق کی جذبہ حسن پرستی مجسمۂ غم بن گئی ہے۔ ان جفاؤں کے باوجود اس کا سر ہر طرح عقیدت آستانۂ ناز پر جھک جاتا ہے۔ اس کے نغمات میں اضطراب اور بےچینی کہیں دور دور نہیں نظر آتی اس کی درد بھری آواز میں بھی سکون کا پرتو جھلکتا نظر آتا ہے وہ جذبات کی شدت میں نوحہ گری کو دلدوز چیخوں کا ہمسر سمجھتا ہے اس کا درد دوسروں پر بار نہیں بننا چاہتا ہے وہ ان آنسوؤں کا خود احترام کرتا ہے۔ جس میں محبت کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ اس کی نگاہیں راہ زیست میں ایک شوخ چشم سے ٹکراتی ہیں اس کا خمار احساس کے جام کو چکنا چور کر دیتا ہے۔ جام ٹوٹنے کی جھنکار نغمہ بن کر یوں سامنے آتی ہے ؎

اک جنوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

جنوں ساماں نگاہ کا جادو اس کی کرشمہ سازی یہ ہوئی کہ شاعر انجمنوں میں اپنے کو تنہا محسوس کرنے لگا جب اس کی یاد اس کا خیال ساتھ رہنے لگا تو فراق کو ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس ہونے لگی عشق سے آشنا ہونے پر نفسیاتی طور سے انسان کو محبوب کے سوا دنیا میں کچھ نظر نہیں آتا اور مومن کا یہ خیال فراق کے خیال پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے کہ ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

دوسری طرف حسن کی یاد اس کی تمناؤں بھی کا دنیا سے بے نیازی اختیار کرا دیتی ہے۔ اس کا حسن کے دلفریب مناظر کا لطف ہر ساعت لیتا شاعری پرستش حسن کے طفیل حسین اور بلیغ ہو ہے جتنا جذبۂ جمال پرستی دل میں بڑھتا ہے ا اتنے ہی حسین اور اس رُخ پر نور کی طرح پاکیز جذبات سامنے آتے ہیں آئیے ایک اور جگہ فراق دیکھئے ۔

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

شام کے چہرے پر رات کی تاریکی کے چھانے ۔ دھواں اُڑ رہا ہے حسن بھی کسی احساس سے اُد نظر آرہا تھا۔ اس قیامت خیز لمحے میں عاشق کو اپ دل پر بیتی کہانیاں رہ رہ کر یاد آرہی ہیں حسن ا اُداسی دیکھ کر کہانیوں کا یاد آنا ؎

اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہوکر

کی صداقت کر رہا ہے عشق چاہتے ہوئے بھی کہنے سے مجبور ہے بھولے فسانے یاد آ کر رہے جا رہے ہیں۔

کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت میری
لب پہ آجاتی ہے رہ رہ کے شکایت تیری

اگر شکایتیں لب پر آ کر آواز بن جاتیں تو حسن اور بھی اُداس ہو جاتے اس شعر میں دھواں دھواں شام کو

سن کے اُترے ہوئے چہرے سے بہت حسین طریقہ
ے ملایا ہے اس شعر میں کیفیات کی دلکش تصویر
نی ہے جو سوچنے سے ذہن کے پردے پر اُبھر آتی
، فراق حسن کو الگ الگ ادا سے دیکھتا ہے اس
، جذبات میں بھی ادائیں پنہاں ہوتی ہیں یہ بات
س کو خاص طور پر حاصل ہے کہ وہ طرز بیان میں
یانانی نہیں رکھتا۔ اس کو خیالات کو سبک الفاظ
کے سانچے میں ڈھال دینے میں ایک خاص مہارت
حاصل ہے وہ خواہ کیف و سیرت کے دلفریب لمحے
ہوں کہ شورش کے زمانے اس کے ذہن میں آ کر حسن
کا لباس پہن لیتے ہیں۔ نئی باتیں اور نئے خیالات شستہ
زبان اس کو خزانۂ قدرت سے ودیعت ہوئی ہے
محبوب کو اس کے ایک انداز بیان میں دیکھیے ؎

جب دیکھو اس کو ہے یہ عالم
اک انگڑائی آئی ہوئی سی

می کی نگاہ جب اس یار دلنشیں کے سراپے پر
پڑتی ہے تو اس مخمور سراپے کے نظارے اسے
بلیغ احساسات بخشتے ہیں اس کی نظریں حسن میں
ایسی ادائیں لیتی ہیں جن کا احساس بھی اہل نظر کو
ہو پاتا ہے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ساعت
شباب کا بار ایک خمار کا عالم اس جانِ مجنوں کی
پر تاری رہتا ہے ایک انگڑائی آتی ہے اس کے
دلفریب سراپے کو عقیدت بوسہ دیتی ہے۔ اور
دوسری بھی اسی سے پھوٹ پڑتی ہے۔ انگڑائیوں
کے دامن سے انگڑائیاں پھوٹ کر اسے مست بنائے

رکھتی ہے۔ اک انگڑائی آتی ہوئی سی میں خود ایک
حسن کا دریا بہہ رہا ہے کلام کیا ہوتا ہے۔ ایک شگفتگی
کا جہان ہوتا ہے کہ سننے والا

؏ تازہ کن ایں جانِ مارا ساعتے

پکار اُٹھتا ہے اور فراق جھوم کر کہہ اُٹھتا ہے ؎

میرے پاس دھر بھی گیا ہے درد بھری کچھ آوازیں
جن کے دم سے رُخِ ہستی پہ دیکھو کیا تابانی ہے

اپنی درد بھری آوازوں کی تابندگی پہ اسکو اتنا ناز
ہے کہ رُخِ ہستی کے منور ہونے کی وجہ اپنے الفاظ
نظر آتے ہیں شاعر کا کلام خود شناسی کے بغیر پختہ
نہیں ہوتا خود شناسی نے غالب کو اپنے دور کا عظیم
شاعر بنا دیا اور آج بھی اس کی عظمت کو کوئی
نہیں پا سکا اس کے دور میں لوگ اسے نہ سمجھ پائے۔
لیکن اس نے ہمیشہ کہا ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

یہ احساس ہونا شاعری کے لئے اشد ضروری ہے کہ
شاعر کو اپنی صلاحیتوں کا علم ہو جائے وہی شاعر
عظیم ہوتا ہے۔ جس کو اپنی عظمت کا احساس خود ہوتا
ہے احساس کمتری صلاحیتوں کی موت کا پیغام ہے
لیکن کم مائیگی کا احساس بھی شاعر کو بارگاہ حسن
ہی سے ہوتا ہے جہاں کی نرالی رسموں کو دیکھ کر وہ
کہتا ہے ؎

حسن کو اِک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق
مہرباں نا مہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے ہیں ہم

کئی خود ہیں اور خود آرا کو اپنے حسنِ مجسم کی بہاروں کے جلوے سے کہاں فرصت کہ اس کا دل مسائل پر دفا ہو سکے یا وہ جفاؤں پر آمادہ ہو دفا اور جفا تو اس کی ادائیں ہیں جو بے خیالی میں سرزد ہوتی ہیں ؎

جفاؤں پہ ان کی [illegible] سے گلہ کیسا
جو پوچھے میری [illegible] دفا کیسا

اس لئے حسن کو صرف حسن سمجھ لینا کافی ہے ورنہ ان گیسوؤں کو جتنا سلجھایا جائے وہ اور الجھ جاتے ہیں دل زار کی طرف دیکھنے کا کیا سوال وہ تو اپنی آنکھوں کی گہرائی میں خود کھویا رہتا ہے مہربانی اور نامہربانی کی شکایت ناروا ہے۔

حسن ازل وہ نور ہے جہاں سے حسن کے سوتے پھوٹے ہیں کل نے جز دہیں اپنی رنگینی بکھیری ہیں ہر عالمِ رعنائی کا مرکز یہی پیکر ہے اس نے اپنی شوخی سے سارے جہاں میں حسین مناظر دلوں کو تڑپانے کے لئے تخلیق کر دیئے ہیں تاکہ اس کی جستجو اور اس کی تمنا سے دل درد آشنا ہو جائے اسی خیال کو فراق کے انداز میں دیکھئے ۔

نشاط حسن ازل کو بھی [illegible] آجا
دکھی ہوئی ابھی اتنی [illegible]

غم کے لمحات جن میں دل درد آشنا ہوتا ہے محبت کی تکمیل ہوتی ہے۔ ہجوم غم ظرف کا امتحان ہیں رگِ حیات میں کھٹک اور چبھن شکست دل کی جھنکار ہوتی ہے جس کی گونج اور نغمگی سے حسن ازل کی نیرنگیاں بھی جھوم اٹھتی ہیں اس خیال کی رنگینی بتا رہی ہے کہ دنیا کو درد دینے والے نے درد [illegible] لئے بخشا کہ وہ پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے جہاں پر تو خود سے شبنم کرنا کی تعلیم دی ہے عاشق کو [illegible] کی اہمیت بتائی ہے وہیں حسن پر ایک [illegible] کیا ہے ؎

کہاں [illegible] سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
بلا [illegible] محبت کے [illegible] ہو [illegible]

جس طرح بارِ الم اٹھانا ظرف کے اعلیٰ ہونے [illegible] ہے وہیں خوشی کے لمحات جذبات کو قابو میں [illegible] حوصلوں کی پختگی کی دلیل ہے عشق اور حسن [illegible] ہے کہ عشق غموں کے بحرِ بیکراں کو پار کر جاتا ہے اور اس کے ماتھے پر شکن نہیں ابھرتی [illegible] کی سیج پر سونے کی عادت سی پڑ گئی ہے [illegible] کی نرمی اور کیف نشاط سے دل گھبرا جاتا ہے [illegible] جو عزم محکم عطا کرتی ہے [illegible] سے گھبرا جاتی ہے جب حسن نشاط [illegible] گھبرا کر اسے ترک کرتا ہے اور عشق [illegible] کہ ہم سے یہ مصیبت نہیں اٹھتی تو حسن [illegible] تھکن کو اپنے سر لیتا ہے بالکل اسی خیال کو [illegible] شعر [illegible]

کچھ گراں ہو چلا ہے بارِ نشاط
آج دیکھتے ہیں حسن کے شانے

انکا حسن نظر ایک خاص ادا کا حامل ہے [illegible] کو حسن [illegible] کر [illegible] حسن نظر کی کسوٹی [illegible]

... ہے جس طرح سونے کو پرکھنے کے لئے
... اگر ادا ہے تو اشک اداشناس ہے وہ
... ایک ایک انداز کو سمجھ لیتا ہے اس کا
... پیچیدہ گتھیوں کو بہ آسانی سلجھا لیتا ہے
... ایک مقمہ چشم سیہ مست کی صورت میں جلوہ
... ہے جس کی ہلکی سی جنبش میں سو سو اشارے
... ہیں جو شوخی سے بھرے دل کی ترجمانی ہوتی
... عاشق الجھن میں مبتلا ہو کر رہتا ہے۔

آہ اس مست نگاہوں کے اشارے بھی مژگان
ہم سمجھنے کو بہت سمجھے مگر ... سمجھے

... کے اشارے ...
... ہیں صدیاں بیت جاتی ہیں اس پر پیچ راہ سے
... بھی منزل تک نہیں پہونچ پاتا ... عمر اس
... کو سلجھانے میں گذر جاتی ہے ... اس
سوال کا جواب بن جاتی ہے خیال ... یہ نزاکت
اور لطافت ہمیں خراق کے کلام میں بدرجۂ اتم نظر
آتی ان کے دل کے نشیمن پر محبت کی جلی حسن کی
شکل میں گری ہے جس نے اُن کے خیالات کو نکھار
بخش دیا ہے انگریزی شاعری کا گہرا مطالعہ کرنے
کی وجہ سے اُن کے کلام میں اس کی جھلکیاں بھی
نظر آتی ہیں ہر خیال خوبصورتی سے نظم کر دینے
میں اُن کی ذہانت کار فرما رہتی ہے ان کو انگریزی
شاعروں میں (TNNYSON) کا انداز بیان
... کی نظر (SHAKESPARE) کی وسعت تخیل
ملا ہے انگریزی ادب کی گہرائی اور گیرائی کو اس

ملا ہے انگریزی ادب کی گہرائی اور گیرائی کو اس
میں بانکپن نظر آتا ہے وہ زندگی سے اتنا قریب
کہ موت اس ... عزم ....
نے پوری طرح سمجھ لیا ہے اسی لئے اُن کے بیان
سے نکلتی ہے اس کو اپنی شاعری میں نئی باتیں
پیدا کر دینے میں خاصا لطف آتا ہے۔
کی جدت طرازی پر دنیائے شعر و سخن انگشت بدندان
رہ جاتی ہے ... روزانہ میں ایسا عزم
ہے کہ اُردو شاعری کو نئے ... اس طرح بخشتا
ہے۔

ایک آدمی عشق نام کا دیتا ہے گلیوں گلیوں
دیکھو اس سے بچے رہنا وہ شخص بڑا نقصانی

نقصان کا قافیہ اُردو ادب میں ایک اضافہ
ہے جو اپنی جگہ ایک ہے اس طرح کی بے باکی سے
اس کا کلام بھرپور ہے مثال کی طور پر کچھ شعر
پیش ہیں۔

(۱) اک عمر کٹ گئی ہے تیرے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

---

(۲) شب وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

---

(۳) مدتیں گزریں تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

---

(۴) مضطرب تو نے کھینچ کے رکھ دی قد رعنا کی تصویر
کھینچتی ہوئی الاپ کی اٹھتی ہوئی جوانی ہے

---

(۵) یوں تو بجلی سی اُٹھی وہ نگاہ ناز
دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

(۶) گہرائی تھی تھاہ ہنپائے دنیا کو حیرانی ہے
کچھ نہ کھلا اے بحر محبت تجھ میں کتنا پانی ہے

(۷) مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے

(۸) ہم نے بھی آج فراق کو دیکھا
سوز مکمل درد مجسّم

...سین قیصری :-

اُردو کا تاریخی پس منظر

عام طور پر لوگ فارسی کو اُردو کی ماں کہتے ہیں، ...ں: ہو، اُردو کی فارسی نژاد ہونے کی وجہ معقول ہے ...لام میں فارسی الفاظ بکثرت ہیں اور رسم الخط بھی ... ہوا۔ مسلمانوں نے اس کو ایک طرح سے گویا ... زبان نے اس کو اُردو ... انقلاب ... ریختہ کو جنم دیا۔ جس باب فارسیت کو امیر خسرو ... ہی امیر تمام تہم زبان سے بند کرنا ...تے تھے اس دروازہ کے دونوں پٹ اُردوئے معلی ... نے کھول دیے۔ ریختہ کی ایجاد ایک ایسا فتنہ ... سے کوئی شاعر نہ بچ سکا گویا یہ شاعری ... ہوا اور عرصہ دراز تک اس کے طلسم میں ... رہے جس سے قومی سالمیت کو نقصان پہونچا اور ...زبان کو خسارہ ... اٹھانا پڑا۔

فارسی کی وبا اس قدر عام ہو گئی تھی کہ قدیم ہندی ... میں فارسی الفاظ کی کثرت عجیب خیز معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً چند کوی کی "پرتھوی راج راسو" ظاہر ہے۔ ایسی زبان میں اظہار خیال کی وسعت کے لئے مناسب الفاظ کی کمی تھی۔ اُردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ کا نقش بہت دھندلا ہے مگر اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ تیرھویں صدی عیسوی میں اُردو کا سب سے پہلے شاعر طوطیٔ ہند امیر خسروؒ تھے۔ ان کے ابتدائی کلام کا ایک مصرع اُردو ایک فارسی ہے، کچھ اشعار میں ٹھیٹھ ہندی اور سنسکرت الفاظ ہیں، بہرحال، گر اس کو اُردو کا موجد کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان کی کتاب خالق باری اور کلام نے زبان کی آئندہ ترقیوں کے لئے شمع راہ کا کام کیا۔

امیر خسروؒ کے زمانہ سے لے کر دکن کے شعرائے اُردو کے زمانہ تک زبان نے اس طویل تین صدیوں میں کوئی خاص ترقی نہ کی مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد ۱۴۴۰ء لغایۃ ۱۵۱۸ء تک کبیر کے بھجن، ۱۵۴۰ء میں محمد جائسی کی پدماوت، ۱۵۵۷ء لغایۃ ۱۶۲۳ء میں تلسی داس جی کی رامائن میں ہندی ہندوستانی روزمرہ الفاظوں کی کثرت کا بخوبی پتہ ملتا ہے۔ عوامی زبان کے فروغ کے کوشاں اس میں ملکی و غیر ملکی الفاظ کی ملاوٹ کے حامی تھے کیونکہ شہنشاہ اکبر چاہتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد ہو۔ وہ خود بھی ہندی میں شعر موزوں کرتا تھا اور اس کے درباری بھی۔ فیضی نے بہت سے ہندی دوہرے کہے اور فارسی شاعر عبدالرحیم خان خاناں ہندی کا مشہور کوی تھا۔ امیر خسرو کے زمانہ کو نو مولود زبان اُردو کے واسطے صبح کاذب کہنا بیجا ہوگا۔

(۵) یوں تو بچی بچی سی اُٹھی وہ نگاہ ناز
دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

(۶) گہرائی تھی بتھاہ نہ پائے دنیا کو حیرانی ہے
کچھ نہ کھلا اے بحر محبت تجھ میں کتنا پانی ہے

(۷) مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے

(۸) ہم نے بھی آج فراق کو دیکھا
سوز مکمل درد مجسم

بن قیصری :-

اُردو کا تاریخی پس منظر

عام طور پر لوگ فارسی کو اُردو کی ماں کہتے ہیں، ... ہوئے اُردو کی فارسی نژاد ہونے کی وجہ معقول ہے ... میں فارسی الفاظ بکثرت ہیں اور رسم الخط بھی ... ہوا کہ مسلمانوں نے اس کو ایک طرح سے گویا ... زبان نے اس کو اُردو ... کا خطاب ... ریختہ کو جنم دیا جس باب فارسیت کو امیر خسرو ... ہندوستان ہی میں عام فہم زبان سے بند کرنا ... تھے اس دروازہ کے دونوں پٹ اُردو کے معلّی ... نے کھول دیے۔ ریختہ کی ایجاد ایک ایسا فیشن ... جس سے کوئی شاعر نہ بچ سکا گویا یہ شاعری ... ہوا اور عرصۂ دراز تک اس کے طلسم میں ... رہے جس سے قومی سالمیت کو نقصان پہونچا اور ... کو خسارہ ... اٹھانا پڑا۔

فارسی کی وبا اس قدر عام ہوگئی تھی کہ قدیم ہندی ... میں فارسی الفاظ کی کثرت تعجب خیز ... مثلاً چند کوی کی "پرتھوی راج راسو" ... فارسی زبان میں اظہار خیال کی وسعت کے لئے سب الفاظ کی کمی تھی۔ اُردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ [illegible]

رہ گیا کہ تیرھویں صدی عیسوی میں اُردو کا سب سے پہلے شاعر طوطیِ ہند امیر خسروؒ تھے۔ ان کے ابتدائی کلام کا ایک مصرع اُردو ایک فارسی ہے، کچھ اشعار میں ٹھیٹھ ہندی اور سنسکرت الفاظ ہیں، بہرحال اگر ان کو اُردو کا موجد کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان کی کتاب خالق باری اور کلام نے زبان کی آئندہ ترقیوں کے لئے شمع راہ کا کام کیا۔

امیر خسروؒ کے زمانہ سے لے کر دکن کے شعرائے اُردو کے زمانہ تک زبان نے اس طویل تین صدیوں میں کوئی خاص ترقی نہ کی مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد ۱۴۴۰ء لغایت ۱۵۱۸ء تک کبیر کے بھجن، ۱۵۴۰ء میں محمد جائسی کی پدماوت، ۱۵۵۰ء لغایت ۱۶۱۳ء میں تلسی داس جی کی رامائن میں ہندی ہندوستانی روزمرہ الفاظوں کی کثرت کا بخوبی پتہ ملتا ہے عوامی زبان کے فروغ کے کوشاں اس میں ملکی و غیر ملکی الفاظ کی ملاوٹ کے حامی تھے کیونکہ شہنشاہ اکبر چاہتا تھا

کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد ہو۔ وہ خود بھی ہندی میں شعر موزوں کرتا تھا۔ اور اس کے درباری بھی۔ فیضی نے بہت سے ہندی دوہرے کہے اور فارسی شاعر عبدالرحیم خان خاناں ہندی کا مشہور کوی تھا۔ امیر خسرو کے زمانہ کو نومولود زبان اُردو کے واسطے صبح کاذب کہنا بیجا ہوگا۔

جس کی درخشاں صبحِ صادق دکن کے مطلع پر شاہان بیجاپور
اور گولکنڈہ کے عہدِ زرّیں میں نمودار ہوئی۔

اُردو کے جا سر اور ریختہ کے موجد ولی نے اُردو
کا سنگ بنیاد رکھا جو آگے چل کر دہلی اور لکھنوی شعرا کے
واسطے نمونہ کلام بن گیا۔ دکنی حکومتوں کے زوال کے بعد
مرکزِ شاعری دہلی منتقل ہو گیا۔ دیوان ولی کی اشاعت نے
ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور سیکڑوں شیدائی پیدا
ہو گئے اور اسی طرز پر مشق کرنے لگے۔ مثلاً خان آرزو۔
حاتم۔ آبرو۔ ناجی۔ مضمون وغیرہ وغیرہ۔ ان قدیم شعرائے
دہلی کا کلام اُردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل میں ایک
نمایاں نشان ہے۔

سترھویں صدی عیسوی دکن میں اس کی آرائش
سے لے کر [illegible] جن کے نام [illegible] راجہ رام نرائن موزوں۔
مہاراجہ نرائن بیتی۔ درگا سہائے سرور۔ جگت موہن لال
رواں۔ تریہ کیفی۔ گوپی ناتھ امن۔ سے ہوتے ہوئے حفیظ۔
اور اقبال تک جو نظریہ علی گڈھ کے آخری نمایندہ تھے۔
اس کے بعد تو زبانِ اُردو نوک و پلک سے آراستہ و پیراستہ
ہو کر اور گراں قدر ادبی سرمایہ کی حامل بن کر چکبست۔
ملّا۔ آزاد۔ فراق۔ صفی اور اثر کے ذریعہ مزید مورثی
ہی رہی

اس مضمون کا ایک اور بھی مقصد ہے کہ غیر معروف
ادیبوں اور شعرائے اُردو کو تاریخ وار مع ان کے افکار
عالیہ کے روشناس کرایا جائے کہ اُردو کو ادب عالیہ کی
صف میں کھڑا کرنے کے لئے انھوں نے کن کن حالات اور
ماحول سے گذر کر اس کو بامِ عروج کا رُخ زیبا دکھایا مگر
تاریخ دانوں نے ان کو یکسر نہیں تو بیشتر ضرور فراموش
[illegible] کر سکے۔

سوائے ڈاکٹر عبدالحق کے جنھوں نے نصرتی
عشق و علی نامہ اور وجہی کے قطب و مشتری وغیرہ
پر کچھ لکھا ہے میری نظر سے کوئی ادیب، مبصر یا [illegible]
گذرا جس نے باقاعدہ یا مناسب تک حد بھی [illegible]
[illegible] کچھ بھی خامہ فرسائی کی ہوتا کہ ادب نواز حلقہ
[illegible] سے فیض یاب ہو سکتا۔ مقامی رسائل
کچھ بھی [illegible] ہے اس میں ہمہ گیر [illegible]
وہ [illegible] ہونے کے برابر ہے سابق نظام کے فروغِ اُردو کے سلسلے
[illegible] مواد سرد ہے ایک ذکر خیر ہے اور [illegible]
ہے کہ مقامی [illegible] حکومت اس پر توجہ دے۔ [illegible]
صحت مند تنقید روح کی غذا ہے جس طرح ایک
قوم کے کسی ذہین فرد یا کسی فنکار کی تخلیق پر د
نذرِ عقیدت ایک خوش کن مشغلہ ہے۔ اس [illegible]
کے لئے ڈاکٹر عبدالحق لائق ستائش ہیں

کسی بھی فنکار یا اس کے فن کا مطا[illegible]
اس کے سوانح حیات اور تاریخی پس منظر کے [illegible]
تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ جیسے فریم میں لگی ہو
زندگی کے بہاؤ کے ساتھ قدریں بنتی اور بگڑتی [illegible]
ماضی کبھی مر نہیں سکتا وہ حال سے وابستہ ہے [illegible]
سیڑھیاں مستقبل سے پیوست ہیں۔ بقول [illegible]
تمام دنیا ایک اسٹیج ہے اور پہلے سین کے خاتمہ [illegible]
سین کے شروع ہو جانے کے باوجود ہم [illegible] سین
نہیں کر سکتے۔ انگریزوں کے اقتدار [illegible]
بدلی۔ انگریزی آئی فارسی کو دیس نکالا ملا۔ انگ[illegible]
کی جابرانہ حکومت۔ انگریز زدہ ہندوستانیوں
ہندی سے بیزاری۔ اس کے باوجود بھی [illegible]
باقی رہے اور [illegible] کے عہد [illegible] اردو ادب [illegible]

... یاد کرتے ہیں۔ اس کو پُرانی قدروں ...
... جاتا رہا ہے۔ بہ نظر غور دیکھا جائے تو ...
... جدید سرحدیں پُرانی سرحدوں سے ...
شراب نئی بوتلوں میں، متعدد بار کتر بیونت کئے
... اس ظاہری نے کتنے پیرہن بدلے ہیں اس
... ممکن نہیں تو بے محل ضرور ہے۔

... نوازوں کی ہٹ دھرمی کو اگر مان لیا جا
... دلی میں جنم لیا (اس مفروضہ نے دوسری
... کڑیاں بھی اپنے ساتھ جوڑ لیں) ...
... تھا بھی یہیں ہوا تو بھی اس حقیقت کا اعتراف
... کہ اس نے دکن میں پختگی کی ...
... اردو زبان کہلانے کی مستحق ہوئی ...
... اردو کے باوائے آدم کہلاتے ہیں حالانکہ ...
... اور شعرائے دکن ولی کے پیش رو تھے جیسا کہ
... ذیل کے مضمون سے ظاہر ہوگا۔

... کی سیاسی مرکزیت کی بدولت ...
... تھی۔ جب اس سیاسی مرکزیت کا شیرازہ
... لسانی مرکزیت کا وجود ہوا اور ...
... مختلف علاقوں میں مقامی بولیاں ...
... اتنی صلاحیت نہ تھی کہ یہ علاقائی ...
توڑ سکیں۔ فوجوں کی آمد و رفت، تجارتی مرکز ...
... اور کاروباری ضرورتوں کے ماتحت میل ملاپ۔
گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کے مٹنے کے بعد
اردو نے دلی کی طرف رخ کیا کیونکہ دربار دلی میں ایسے
... تھے جس سے اس کے پھولنے پھلنے کے
... تھے۔ چچا غالب بھی اس ضمن میں آتے ہیں۔
... زبان کو فارسی مورخین نے ہندی اور ہندوی ایسے

ناموں سے یاد کیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے قطب شاہی شعراء میں محمد قلی قطب شاہ کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ یہ گولکنڈہ فرمانرواؤں میں سب سے عظیم شخصیت کا حامل تھا۔ اس نے ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک اکتیس سال حکومت کی۔ اردو منظوم نگاری میں اس کی حیثیت پیش رو کی ہے اور اس کا کلام ... سے کم نہیں۔ یہی وہ پہلا فرد ہے جس نے اسلامی روایات سے ہٹ کر ایک رواداری کی سیکولرزم کی آواز بلند کی۔ اس کے اشعار میں خدا و رسول پیر و ... مدح سے زیادہ مناظر فطرت ہے سماجی زندگی کی ... ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح میلوں ٹھیلوں کی ... پھولوں پھلوں کا ذکر ہے۔ باغات کی سیر ہے ... ادبی نقطۂ نظر سے وہ معیاری نہ ہو پھر بھی اردو میں منظر نگاری کا یہ پہلا قدم تھا جس کی مثال شعرائے فارسی سے بھی پیش نہیں کی تھی۔

وجہی مصنف قطب و مشتری ۱۶۰۹ء ایک ... داستان ہے کہ کس طرح ایک شاہزادہ عالم رویا میں کسی ... شاہزادی پر عاشق ہو جاتا ہے اور بڑے ... حاصل کرنے میں ... کامیاب ہو جاتا ہے ... غالب ہے کہ شاعر ... علی بیگ ... طرح مثنوی قطب و مشتری ... سلطان محمد شاہ کی تشبیہ میں ڈھال کر خوشنودی شاہ حاصل کی۔ سلطان محمد شاہ کا دیو بیکر ... مشتری کو چھیڑنا اور بڑے بڑے ... موقع پر بھی بیخوف ہو کر حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ... ایک خوشامدی سلطان کی تسلیں ... اس میں کافی سامان طرب تھا۔ لوگ معترض ہیں کہ شعرائے اردو

قصیدے لکھتے اور خوشامدیں کرتے تھے۔ کیا کرتے؟ ضرورت
ایجاد کی ماں ہے۔ جان و مال کا خوف ہے، عزت،
ناموس، ذلت، رسوائی یہ سب کون سہہ سکتا ہے۔ پھر
سب سے مقدم پیٹ۔ یہ سب کچھ کراتا ہے۔

اس حقیقت کی بہترین امثال ہم کو انشاء اللہ خاں
انشاؔ میں ملتی ہے۔ نواب نے ایک مصرع کہہ دیا ان کو غزل
پوری کرنی پڑی۔ ملاحظہ ہو ؎

پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی
ہاں وقت سلام اترے ہے ابلیس کی ٹوپی

ممدوح ان داتا کو غصہ آ گیا مرد میدان سخن کو
اوڑھنی اوڑھنی پڑی۔ انشاء اللہ خاں ایسے حکیم شہیم
ست سٹھے مرد معقول ناک پر انگلی رکھے فرما رہے ہیں ؎

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لیگی ترے بدلے ہزاری روزہ

تخت نشیں لونڈی بچہ چھپر کھٹ پر بیٹھا پھولوں
کا گجرا اچھال رہا ہے۔ اور انشاء اللہ خاں کھڑے فرما رہے
ہیں ؎

لگا چھپر کھٹ میں چار ہیرے اچھالا تو نے جو لیکے گجرا
تو موج دریائے چاندنی میں وہ ایسا جاتا ہے جیسے بجرا

اس کے باوجود بھی یہی انشاء اللہ خاں جب
معتوب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

ایک دور تھا کہ دولت انشاء اللہ خاں کے قدموں میں تھی
جب اقلیم سخن ہاتھ سے نکل گئی تو یہی شیر نیستان سخن خاک نشیں
ہو گیا۔ پھر تو دل گرفتہ ہو کر یہ شاہ سخن راکھ کے ڈھیر
بیٹھا نقد سخن لٹا رہا تھا۔ یہ سو فیصدی سچ ہے کہ
داستاں کمینہ خصال امرائے وقت کے ہاتھ لگ گئی
اور ان سے کوڑا اٹھوایا جا رہا تھا۔

جو شمع فروزاں بزم سخن کو منور کرنے کے
لئے جلائی گئی تھی اس سے تنور شکم گرم کیا جا رہا تھا۔
تو جملہ معترضہ تھا۔ آمدم بر سر مطلب۔

اس خوشامدانہ رویّہ کے باوجود مثنوی قطب
مشتری اور سب رس کو وجہی نے ایک شاعرانہ خوبی
شروع کرکے اس تیزی سے نقطۂ عروج کی طرف بڑھا
کہ بے اختیار واہ واہ نکل جاتی ہے۔ یاد رہے کہ
شعراء مع رستمی و نصرتی ابتدائے اُردو دکنی دکھنی
تھے۔ اُردو نے ابھی تک صرف گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا
پھر بھی وجہی کے سب رس میں ریختی کے یہ سب سانچے میں
ہوئے الفاظ ملتے ہیں، مثلاً حسن عشق۔ دل۔ نظر۔
تیر نظر۔ لٹ۔ خیال۔ صبر۔ ہمت۔ ناز۔ زہد۔ قافیہ
ہجر و وصال وغیرہ وغیرہ۔ ان تصنیفات کو دیکھ کر
کے لئے وجہی کی انتھک کاوش کی داد دینا ہی پڑتی ہے۔

حصہ نثر میں وجہی کا سب رس عرف "...
دل" اُردو ادب کی پہلی تصنیف ہے جو سنہ ...
میں آئی۔ بقول ڈاکٹر عبد الحق یہ فارسی مثنوی محمد یحیی
سابق فتحی سن تصنیف ۱۹۴۸ء کے طرز پر لکھی گئی
ایک تخیلی بیان حسن و عشق ہے جو فتحی سے ایک
شاہکار رومن۔ ڈی۔ لا۔ روز سے ملتا جلتا ہے جب
میں بہادروں اور بہادری کے کارناموں کو بڑی
کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا مثلاً شاہ انگلستان آرتھر
گول میز کے سرگلہنڈ کا ایسے سورما یا فرانس میں

کے تین بندوق باز۔ اس طرز کی تصنیفات کی وہاں بڑی مانگ تھی۔

سب رس کے کردار خصوصی بھی بڑے ہی دلچسپ ہیں حسن و عشق۔ دل و خرد۔ ان کردار خصوصی کے گرد دوسرے مددگار کرداروں کا بھی ہجوم ہے جن میں انفرادی طور پر مرد و عورت کے یہ اوصاف نظر آتے ہیں جو موقع اور محل کے اعتبار سے وقتاً فوقتاً اپنے اپنے رول ادا کرتے رہتے ہیں۔ جائے وقوع تن ہے جس کا فرمانروا دل ہے۔ یہ سب کردار اعضائے انسانی اور اس کے شعور ذات سے چنے گئے ہیں۔ مثلاً رخسار، لب، [illegible] زلف، نظر، قد، خیال، صبر، ہمت، ناز، عافیت، زہد، ہجر و وصال وغیرہ وغیرہ۔ کردار صحافت۔ قلعہ محفوظ کی نشاندہی کرتا ہے۔ "زہد" پارسائی مذہب ہے۔ "ہجر" جدائی کا عفریت۔ وصال ملن کا گلستان۔ موضوع بیان کو مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ فرسودہ حسن و عشق داروا [illegible] میں سیکڑوں دشواریوں کو سر کرکے روایتی طور پر عشق حسن کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ [illegible] معرکہ حسن و عشق برختم ہو جاتا ہے۔ [illegible] و خرد کی جنگ میں بالآخر اس پر مصالحت ہو جاتی ہے کہ خرد کو وزیر اعلیٰ تسلیم کر لیا جائے۔ وجہی حسن کی عظمت کا معترف تو ہے مگر اس کا کہنا ہے کہ اس سے اثر انداز محبت ایک ایسا اندھا جذبۂ بے اختیارانہ ہے جس کو ہر وقت خرد کی زیر نگرانی رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ تباہی کے علاوہ دائمی خوشی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ سکے۔ سب رس ایسے دلکش انداز میں لکھی گئی ہے جس پر آزاد نظم کا دھوکا ہوتا ہے۔

شعرائے بیجاپور میں سے دو شعرا ایسے گذرے ہیں جن کا تذکرہ جگہ بہ جگہ ملتا ہے۔ یہ ہیں کمال خاں رستمی اور نصرتی۔ رستمی اسمٰعیل خاں کا بیٹا تھا جس کا خاندانی لقب خطاط خاں تھا وہ دربار بیجاپور میں سکریٹری کے عہدہ پر فائز تھا۔ رستمی کی مثنوی خاورنامہ جو ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں لکھی گئی کافی مشہور ہے اس میں حضرت علی کے سیاسی حریفوں سے جنگ کا ذکر ہے۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی نے معارف میں چھپے ہوئے مضامین کے ذریعہ یہ توجیہہ کی ہے کہ خاورنامہ کی حقیقت بس اتنی ہے کہ جیسے داستان امیر حمزہ۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ خاورنامہ در اصل [illegible] میں اسی نام کی لکھی ہوئی ایک ایرانی شاعر ابن حسن کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ واللہ اعلم۔ ملکہ خدیجہ بیگم زوجہ محمد عادل شاہ بیجاپور کے حکم سے اس کو لکھا گیا۔

خاورنامہ میں جو بیس ہزار سطریں ہیں اور دکھنی منظومات میں یہ سب سے لمبی مثنوی ہے اس کا اصل قلمی نسخہ برٹش میوزیم لائبریری میں اب تک محفوظ ہے۔

نصرتی کا عروج دور علی عادل شاہ میں ہوا کرناٹک کے رہنے والے اس درباری شاعر نے اس قدر ترقی کی کہ وہ شاہ کا مصاحب خاص ہو گیا اور بعد ازاں ذوق کا ہم پلہ۔ اس کی تصنیفات میں غزل اور قصائد کے علاوہ مثنوی گلشن عشق۔ علی نامہ۔ اور تاریخ سکندری کافی مشہور ہیں۔ گلشن عشق ایک طویل داستان حسن و عشق ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کنک نگر کے راجہ کے کوئی اولاد نہ تھی درویشوں کی دعا سے اس کے یہاں شاہزادہ منوہر پیدا ہوا۔ ابھی یہ راجکمار صرف چودہ یا پندرہ سال کا تھا کہ ایک رات اس کو پریاں اغوا کرکے مہارس نگر راجکماری مدھومالتی کے محل میں لے گئیں اور صبح ہو ہی اس نے محل میں واپس کر گئیں۔ پریم چاشنی کے بعد

مولانا عبدالماجد دریابادی کا نعتیہ کلام

فروغِ اردو کے مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر میں مولانا کی چند غزلیں شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا کے کلام کی تلاش جاری ہے۔ محمد عبدالقوی دریابادی نے یہ دو نعتیں مرحمت کی ہیں۔ ایک نعت گلشنِ نعت میں شائع ہو چکی ہے۔

نعت

(مولانا محمد علی مرحوم کو تنہائی کے سب دن ہیں،
تنہائی کی سب راتیں، کا ردیف و قافیہ ہیں۔)

(۱)

پڑھ کے درود صلِ علیٰ حق کے حبیب کی ہوں باتیں
رحمت کی گھٹائیں ہوں اور نور کی برساتیں
وعدے ہیں شفاعت کے تسکین کی ہیں باتیں
آقائے دو عالم کی دیکھو تو مُدارا تیں
غم خواریٔ اُمت سے اک آن نہیں غافل
ظاہر میں تو ہے پردہ اور پردے میں ملاقاتیں
محشر میں اماں پائی صدقے میں درودوں کے
دشواری میں کام آئیں بھیجی ہوئی سوغاتیں
دارین کے کیا جلوے، فردوس کے کیا نقشے
سب کا ہے یہ دولہا ہے سب اُسکی ہیں باراتیں
اک نام مبارک ہے اور ورد درودوں کا
سارا ہی توشہ ہے کُل ہیں یہی سوغاتیں
دیدار کی حسرت ہے اور نام کی رٹ ہر دم
اس شغل میں دن گزرے اس دُھن میں کٹیں راتیں
ماجد نامہ سیہ پر بھی رحمت کی نگہ ہو جائے
وابستہ نگاہوں سے ہیں لاکھوں کراماتیں!

(۲)

پڑھتا ہوا محشر میں جب صلِ علیٰ آیا
رحمت کی گھٹا اٹھی اور ابرِ کرم چھایا
جب وقت پڑا نازک، اپنے ہوئے بیگانے
ہاں کام اگر آیا تو نام ترا آیا
پُرسش تھی گناہوں کی اور یاس کا تھا عالم
بے کس کی خبر لینے محبوبِ خدا آیا
یہ نام مبارک تھا یا حق کی تجلی تھی
دم بھر میں ہوا فاسق ابدال کا ہم پایہ
چرچے ہیں فرشتوں میں اور رشک ہے زاہد کو
اس شان سے جنت میں شیدائے نبی آیا
کیوں نزع کی دشواری آسان نہ ہو جاتی
تھا نام ترا لب پر اور سر پہ ترا سایہ
اک عمر کی گمراہی اک عمر کی سرتابی
جز تیری غلامی کے آخر نہ مفر پایا
حکمت کا سبق چھوڑا عزت کی طلب چھوڑی
دُنیا سے نظر پھیری، سب کھو کے تجھے پایا
سمجھے تھے سیہ کاری ہی ہے فزوں حد سے
دیکھا تو کرم تیرا اُس سے بھی سوا پایا
فاسق کی ہے یہ میت پر ہے تو تری اُمت
ہاں ڈال تو دے دامن کا اپنے ذرا سایہ

ڈاکٹر عشرت علی صدیقی:

کتابوں کی باتیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کا دو جلدیں آنا ضروری ہے)

پیام مسرت۔ صفحات ۳۰ قیمت ۴۰ پیسے

پیام رحمت۔ صفحات ۳۲ قیمت ۴۰ پیسے

شاعر: بیکل اتساہی

ناشر: مکتبہ اختری چھپرا والا۔ گونڈہ

پیام مسرت اور پیام رحمت اُردو کے مقبول ترین شاعر جناب بیکل اتساہی بلرام پوری کے شعری مجموعے ہیں۔ پیام مسرت میں مختلف موضوعات پر منظومات، گیت اور رباعیات شامل کی گئی ہیں اور پیام رحمت میں شاعر کا نعتیہ کلام پیش کیا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابچے جناب محمد رفیق القادری نے ترتیب دیے ہیں۔

بیکل اتساہی اس دور کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ شہرت و ناموری کے اعتبار سے وہ بہت خوش نصیب شاعر ہیں۔ ادبی محفلوں میں بھی ان کا کلام ذوق و شوق کے ساتھ سنا جاتا ہے اور مشاعروں و محافل میلاد میں بھی پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ان کی قدر افزائی ہوتی ہے۔ یہ سعادت بہت کم شاعروں کے حصہ میں آئی ہے۔

بیکل صاحب نے متعدد اصناف سخن مثلاً نظم، گیت، قطعات اور نعت وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا خاص میلان گیت کی طرف ہے۔ ان کے گیتوں میں جو میٹھا میٹھا رس اور درد، سادگی، حلاوت اور دلکشی ہے اس نے انھیں عوام و خواص دونوں کا محبوب شاعر بنا دیا ہے۔ عام فہم اور سلیس زبان، پیارا اور دلکش انداز بیان ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ حسن و عشق کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] عام فہم زبان [illegible] بیان میں دل کی بات کہنے کی روشن مثال ہیں۔ بیکل کے نعتیہ کلام میں بھی سوز و گداز اور کیف و اثر کی فراوانی ہے۔ [illegible] [illegible] شریعت مطہرہ کی [illegible] [illegible] موجود ہے، جو ایک نعت گو شاعر کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

ان مجموعوں کی اشاعت کے لئے رفیق القادری صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ توقع ہے کہ انھیں مقبولیت حاصل ہوگی۔

---

(۳) نذر ابر مرتبہ: جشن ابر کمیٹی

صفحات ۳۱۲ قیمت دس روپے۔ ناشر: جشن ابر کمیٹی

پیش نظر مجموعہ نظم و نثر حضرت ابر احسنی گنوری کی ستروں سالگرہ کے موقع پر تلامذہ ابر کی جانب سے بطور ہدیۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ابر احسنی گنوری حضرت احسن مارہروی تلمیذ داغ دہلوی کے شاگرد ہیں اور اردو کے

مشہور اساتذۂ سخن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آبرا حسنی گنوری نے تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ انکی غزلوں کے دو مجموعے "آبگینے" اور "قرینے" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "سفینے" اور نعتیہ کلام "نشیمنے" کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔

نثر نگاری میں بھی [illegible] بیٹھے اور معائب و محاسن کلام [illegible] عروض و بیان کے نکات کو اپنی کتاب "[illegible]" کے دو حصوں میں قلم بند کر چکے ہیں اور تذکرہ نویسی کی روایت کی پابندی بھی کر رہے ہیں۔ ان کے مضامین، کہانیاں وغیرہ شائع ہوتی رہتی ہیں۔

مجموعہ کی ابتدا میں مختلف اہم شخصیتوں اور ممتاز ادیبوں و شاعروں کے پیغامات و تاثرات شامل ہیں۔ اس کے بعد "گلہائے نثور" عنوان سے مخوب [illegible] سیفی پریمی، محمد احمد کیفی، طالب دہلوی، سوز شرمن پٹیالوی، مفتون کوٹوی، ملک ہندی بدایونی، [illegible] متوج، عبدالغفار عاشق کے مضامین ہیں، جن میں ابر صاحب کی شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ گلہائے [illegible] کے بعد "گلہائے منظوم" عنوان کے تحت ابر صاحب کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے آخر میں "گلہائے رنگ رنگ" عنوان کے ساتھ ابر صاحب کے شاگردوں کا کلام مع تصاویر پیش کیا گیا ہے شعراء کی تصاویر کے ساتھ ان کے مختصر سوانحی حالات بھی تحریر کئے گئے ہیں۔

مجموعہ میں فہرست کا نہ ہونا، جشن ابر کمیٹی کا جائے مقام کا درج نہ کیا جانا، ایسی خامیاں ہیں جو حیرت انگیز بھی ہیں اور تکلیف دہ بھی۔ کتابت طباعت [illegible] کو پیش نظر رکھتے ہوئے قیمت بھی مناسب ہے۔

بہ سلسلہ مضمون صفحہ ۲۹ کالم ۲

کا دل محل سے اچاٹ ہو گیا اور وہ مدھومالتی [illegible] پڑا [illegible] نوردی میں اس نے ایک دوسری راجکماری کو ایک دیو کے چنگل سے چھڑایا اور اس کے ماں باپ [illegible] کر دیا۔ چمپاوتی کی ماں نے دونوں پریمیوں کو ملانے کی کوشش [illegible] تو مدھومالتی کی ماں غیظ و غضب کی پتلی بن کر محل میں [illegible] اور جلال میں آکر خود اپنی بیٹی کو چڑیا کے روپ میں تبدیل کر دیا۔ خوش بختی سے یہ چڑیا ایک دوسرے راجکمار [illegible] [illegible] اس کے بپتا سننے کے بعد چندر سین نے بڑی جرأت دکھاتے ہوئے مدھومالتی کو اس کے والدین کے حوالے کر دیا۔ طلسمی اثرات ختم ہونے پر منوہر مدھومالتی [illegible] چندر سین چمپاوتی کی شادیاں [illegible] ہو گئیں [illegible]

کی مغلوں و مرہٹوں سے جنگ کا ذکر ہے گو کہ علی نامہ [illegible] تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ پھر بھی شاعر نے [illegible] وطن و شاہ دوستی کے جوش میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اس کیا اس میں مرہٹوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اس [illegible] مبالغہ آرائی کے باوجود علی نامہ میں فردوسی کے شاہنامہ کا ساز و بیان و جوش و خروش کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ خود نصرتی کا کہنا ہے کہ فارسی اور سنسکرت سے استفادہ کرتے ہوئے اس نے علی نامہ میں نئے نئے الفاظ اور خوبصورت تشبیہات کے ذریعہ اُردو میں ایک ایسی راہ نکالی جو منفرد ہے۔ نصرتی کے دعوے کو ڈاکٹر عبدالحق نے سراہا ہے۔

تاریخ سکندری ایک ہلکی پھلکی نظم ہے جس میں علی عادل شاہ کے ولی عہد کا ذکر ہے جب بیجاپور کی فوجی [illegible] فروغ اُردو کے

مطبوعات ادارۂ فروغِ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروفِ تہجی مع قیمت) (ا)

۱۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر۔ ڈاکٹر محمود الحسن رضوی — ۱۲/-

۲۔ لمعہ نمبر۔ فروغ اُردو۔ اقبال صدیقی — ۳/۵۰

۳۔ انوار اللغات اُردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین — ۴/-

۴۔ ادبی اثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/۵۰

۵۔ آئینہ عقل۔ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری — ۴/۵۰

۶۔ اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی — ۴/۵۰

۷۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۳/

۸۔ انارکلی۔ امتیاز علی تاج — ۲/۲۵

۹۔ اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد — ۶/-

۱۰۔ اُردو میں تنقید۔ ڈاکٹر احسن فاروقی — ۳/-

۱۱۔ انتخاب قصائد اردو منیث الدین فریدی — ۱/۵۰

۱۲۔ ادب اور نظریہ۔ آل احمد سرور — ۵/-

۱۳۔ اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبدالشکور — ۴/۵۰

۱۴۔ ادبی نقوش۔ شاہ معین الدین احمد ندوی — ۵/-

۱۵۔ اقبال۔ مرتبہ فروغ اُردو — ۰/۵۰

۱۶۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ عبدالماجد دریابادی — ۴/۵۰

۱۷۔ (البرامکہ یعنی آل برامکہ کا عروج و زوال) ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے — ۲/-

۱۸۔ انتخاب کلام میر مع مقدمہ۔ ناظر کاکوروی — ۱/-

۱۹۔ انتخاب کلام غالب۔ بشیر احمد علوی — ۱/۵۰

۲۰۔ ادبی تنقید۔ ڈاکٹر محمد حسن — ۴/۵۰

۲۱۔ انتخاب قصائد و غزلیات (فروغ اُردو) — ۴/-

۲۲۔ ادب کیا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی — ۱

۲۳۔ ادبی خطوط غالب۔ مرزا محمد عسکری

۲۴۔ آئینہ نثر اُردو۔ سعادت علی صدیقی

۲۵۔ ایک نادر روزنامچہ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

۲۶۔ ابو الخیر۔ مجنوں گورکھپوری

۲۷۔ اُردو کی کہانی۔ سید احتشام حسین

۲۸۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر " " — ۵

۲۹۔ انتخاب نثر جدید " "

۳۰۔ ابوالکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد — ۱

۳۱۔ ارمغانِ نثر و نظم۔ عبدالاحد خان خلیل — ۵

۳۲۔ افسانہ نمبر۔ مرتبہ فروغ اُردو — ۰

۳۳۔ اچھی نظمیں۔ آغا کشافی — ۰

۳۴۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کا مل دو جلد جدید اڈیشن۔ غلام احمد فرقت — ۰

۳۵۔ اُردو شاعری۔ امیر احمد علوی — ۱۰

۳۶۔ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ — ۱۰

۳۷۔ غزلیات حافظ صائب۔ غالب فارسی — ۱۰

۳۸۔ اپنی پہچان پوری زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب۔ اعجاز احمد فاروقی — ۵

۳۹۔ اللہ کے پیارے۔ امیر حسن نورانی — ۱۰

۴۰۔ ادبی معرکہ نمبر۔ مرتبہ فروغ اُردو — ۱۰

۴۱۔ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی۔ عبدالماجد دریابادی — ۵

۴۲۔ اسپین کی شہزادی۔ صادق سردھنوی — ۵۰

۴۳۔ ایک جان تین قالب۔ خان محبوب طرزی — -

۴۴۔ اُلفت " " " — ۵۰

۴۵۔ آغازِ سحر " " " — -

۴۶۔ امین آباد " " " — -

۴۷۔ اپنی موج میں۔ کوثر لکھنوی — ۵۰

۴۸۔ انوار جدید [illegible]۔ خلیق احمد علوی — ۲۵

۴۹ ایجادوں کی باتیں ۔۔ مصطفےٰ احسن رضوی ۲/-
۵۰ اچھی کہانیاں (حصہ اول) شمس الدین ندوی ۰/۳۰
۵۱ (حصہ دوم) " " ۰/۳۵
۵۲ (حصہ چہارم) " " ۰/۵۰
۵۳ ادب کا مقصد ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۴/-

(ب)

۵۴ بابائے اُردو عبدالحق ۔ عبداللطیف اعظمی ۵/-
۵۵ بستان حرم (جدید نعتیہ کلام) از حرم حمید صدیقی ۱/۵۰
۵۶ شہید محبت بوٹا سنگھ ۔ خان محبوب طرزی ۴/-
۵۷ بزم بے تکلف ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۲/۵۰
۵۸ برگ گل شبلی نعمانی ۰/۴۰
۵۹ بہادر شاہ ظفر امیر احمد علوی کاکوروی ۵/۵۰
۶۰ بہشتی ثمر (اول، دوم) یعنی خلاصہ بہشتی زیور ۔ مولانا تھانوی ۲/-
۶۱ بانی اسلام (علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اردو ترجمہ) ۰/۷۵

(پ)

۶۲ پطرس کے مضامین ۔ پطرس بخاری ۱/۵۰
۶۳ پیاری باتیں محسن کاکوروی ۰/۲۰
۶۴ پھولوں کا انبار (ناول) منظر سلیم ۲/۵۰
۶۵ پیسہ اور پرچھائیں (مجموعہ ڈرامہ) ڈاکٹر محمد حسن ۲/۵۰
۶۶ پاگل خانہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۲/۲۵
۶۷ پیغام " طاہر دیالپوری ۳/-
۶۸ پنجاب میں اُردو حافظ محمود شیرانی ۳/۵۰
۶۹ پردیسی کے خطوط (حصہ اول) مجنوں گورکھپوری ۲/-

(ت)

۷۰ تاریخ ادب اُردو ملا فروغ اردو (ایڈیشن) ڈاکٹر سید اعجاز حسین ۹/-
۷۱ تحریریں مجموعہ مضامین ڈاکٹر گیان چند ۲/۵۰
۷۲ تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ ۔ فرید احمد علوی ۰/۷۵
۷۳ تاریخی جائزے ڈاکٹر [illegible] ۳/۹

۷۴ تعارف تاریخ اُردو (جدید ایڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/-
۷۵ تاجدار مدینہ اقبال صدیقی ۰/۱۲
۷۶ تنقیدی اصول اور نظریے حامد اللہ افسر ۴/۵۰
۷۷ تنقید و تحلیل ۔ شبیہ الحسن نونہروی ۳/-
۷۸ تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) سید احتشام حسین ۴/۵۰
۷۹ تنقیدی نظریات (جلد اول) " " ۶/-
۸۰ " " (جلد دوم) " " ۶/-
۸۱ تنقیدی اور عملی تنقید " " ۵/
۸۲ تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن ۱۹۶۳ء) آل احمد سرور ۳/۵۰
۸۳ ترانہائے خیام ۔ ڈاکٹر رغیب حسین ۲/-
۸۴ تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص محمد حسین شمس ۱/۶۵

(ٹ)

۸۵ ٹیگور آدم سیتاپوری ۲/-
۸۶ ٹھیکرے کی مانگ ۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲/-

(ث)

۸۷ ثنائے حبیب (نعتیہ کلام) بہزاد لکھنوی ۲/۷۵

(ج)

۸۸ جان غالب محمد حسین شمس علوی ۲/-
۸۹ جائزے انور سیوانی ۳/-
۹۰ جواہرات التحلیل ۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱/-
۹۱ جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) فروغ اُردو ۴/-
۹۲ جنگ آزادی نمبر ۲ " " ۴/-
۹۳ جوئے رواں (مجموعہ کلام) حامد اللہ افسر ۲/۵۰
۹۴ چادر کی آنکھ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اثر بگرامی ۳/۵۰
۹۵ جنگ ہسپانی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین ۲/۵۰
۹۶ جلوے معین الدین دردائی ۱/۷۵

۹۷ جمیلہ بوائری (ناول) خان محبوب طرزی ۴/۵۰

۹۸ جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۶/-

(ج)

۹۹ چوکھی بن مجموعہ افسانہ - مسیح الحسن رضوی ۲/۷۵

(ح)

۱۰۰ حیات فضل الحق خیرآبادی ۱/۲۵

۱۰۱ حالی بحیثیت شاعر (جدید اڈیشن مع اضافہ جدید اڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۳/-

۱۰۲ حسرت موہانی عبدالشکور ۳/۵۰

۱۰۳ حسرت تعمیر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰

۱۰۴ حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰

۱۰۵ حکیم نباتات وزیر خاں لنکراں ۲/

۱۰۶ حبسیۂ غالب سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۰۷ خیالات رنگین یعنی مجموعہ مضامین فارسی (زیر طبع)

۱۰۸ خلاصہ شریف زادہ مرزا رسوا ۱/-

۱۰۹ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی عبدالماجد دریابادی ۲/۷۵

۱۱۰ خضر راہ معہ ترجمہ علامہ اقبال -/۷۵

۱۱۱ خلاصہ روح تنقید ۱/-

۱۱۲ خلاصہ جواہر العروض ۱/-

۱۱۳ خلاصۃ المیزان -/۷۵

۱۱۴ خبطی (مزاحیہ) محمد علی واحدی معہ مقدمہ شوکت تھانوی ۱/۵۰

۱۱۵ خوش بختی کی تلاش - احسن الظفر بی اے ۲/-

خلاصہ شعر الہند (دوم) ۱/-

(د)

دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۳/-

دیوان غنائی ۱/۵۰

[illegible] معہ ترجمہ معہ مقدمہ (فارسی)

[illegible] ۳/-

۱۱۹ دیوان صفی (حصہ اول) صفی لکھنوی

۱۲۰ دہلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ

۱۲۱ دستہ گل شبلی نعمانی

۱۲۲ دوشیزہ قاف (ناول) خان محبوب طرزی

۱۲۳ دلربا " " "

۱۲۴ دلی کا دبستان شاعری مع اضافہ جدید اڈیشن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

(ڈ)

۱۲۵ ڈاکٹر نذیر احمد انوارالحسن /۷

(ذ)

۱۲۶ ذوق و جستجو - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۵۰

۱۲۷ ذوق ادب و شعور - پروفیسر احتشام حسین ۵۰

۱۲۸ ذوق جنوں مجموعہ کلام آل احمد سرور ۵۰

(ر)

۱۲۹ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین ۱۰

۱۳۰ رباعیات غالب معہ اردو ترجمہ سید امیر حسن نورانی

۱۳۱ رہبر مضمون نویسی - شجاعت علی صدیقی /۵۰

۱۳۲ راکھی - ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی /۷۵

۱۳۳ رخسار سحر - انصر کریم قدوائی ۵۰

۱۳۴ رفتار (ناول) /۵۰

۱۳۵ رموز حکمت معہ مقدمہ اردو - محمد شریف /۵۰

۱۳۶ ریاض فارسی - منتخب کلام فارسی ۲/۰

(ز)

۱۳۷ زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ مولانا تھانوی ۱/۵۰

۱۳۸ زنفیلیوں کا بادشاہ (حکیم انا دی مزاحیہ ناول) علی عباس حسینی ۲/۰

(س)

۱۳۹ سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۲/۰
۱۴۰ سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۳/۰
۱۴۱ سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حکیم چند نیّر — ۰/-
۱۴۲ سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۲/-
۱۴۳ سلک گہر — سید احتشام حسین — ۳/-
۱۴۴ ساحل و سمندر — سید احتشام حسین — ۶/-
۱۴۵ سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰
۱۴۶ سرمایہ زبان اردو — جلال لکھنوی — ۴/۵۰
۱۴۷ سخنہائے گفتنی — کلیم الدین احمد — ۵/۰
۱۴۸ سفر (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/۰
۱۴۹ سیاحت زمین (ناول) — محمود اعظم فہمی — ۱/۵۰
۱۵۰ سید سالار مسعود غازیؒ — حشمی محمود آبادی — ۳/۵۰
۱۵۱ تاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۳/۵۰
۱۵۲ سنہرا حلقہ — ۰۵
۱۵۳ سرسید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی — ۰/۳۷
۱۵۴ سوشل اسٹڈی — احمد محسن کاکوروی — ۱/۷۵

(ش)

۱۵۵ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) — غلام احمد فرقت — ۸/۰
۱۵۶ شرح سلک گہر — عبد القوی دریابادی — ۳/۵۰
۱۵۷ شاہ نگیں حضرت جی — پروفیسر عبد الشکور — ۳/۰
۱۵۸ شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی — ۴/-
۱۵۹ شرح ادب پارے نظم — ۳/۰
۱۶۰ شرح منتخبات فارسی — عبد القوی دریابادی — ۴/۵۰
۱۶۱ شبلی نعمانی — انوار الحسن صدیقی — ۰/۳۷
۱۶۲ شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن) — نظم طباطبائی — ۵/۰
۱۶۳ شاہان اودھ [illegible] — امیر احمد علوی — ۳/۵۰
۱۶۴ شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم — شبلی نعمانی — ۲۵/۰
۱۶۵ شرح نثر امروز ایران — احسن الظفر ایم اے — ۲/۰
۱۶۶ شرح شعر امروز ایران — " — ۲/۵۰
۱۶۷ شمع و شاعر — علامہ اقبال — ۰/۲۵
۱۶۸ شرح حکیم نباتات خاں — نیر مسعود — ۱/۲۵
۱۶۹ شرح انتخاب قصائد و غزلیات
۱۷۰ مطابق نصاب بی اے — عبد العلیم قدوائی — ۶/۰
۱۷۱ شرح ترانہائے خیام — حکیم عبد القوی — ۱/۵۰
۱۷۲ شرح نصاب فارسی — ۴/۰

(ص)

۱۷۳ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — ۳/۰
۱۷۴ صحیفۂ محبت (مہدی افادی کے خطوط) — ڈاکٹر محمود الٰہی — ۵/۰

(ط)

۱۷۵ طرزی نمبر خان محبوب طرزی — مرتبہ فروغ اردو — ۲/۰
۱۷۶ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیئے — غلام الثقلین — ۰/۳۷
۱۷۷ طلسم اسرار (ڈرامہ) — مرزا رسوا لکھنوی — ۱/۲۵
۱۷۸ طرۂ امیر — امیر مینائی منتخب کلام
۱۷۹ (جدید ایڈیشن) امیر احمد علوی — ۳/۵۰

(ع)

۱۸۰ عذرا (ناول) — صالحہ عابد حسین — ۵/۰
۱۸۱ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) — سید احتشام حسین — ۴/۵۰
۱۸۲ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینے میں — اخلاق حسین عارف — ۳/۰

(غ)

۱۸۳ غالب کی تخلیقی تخیل۔ شبیہ صفی پوری ۴/۰
۱۸۴ غنچۂ دگل سید محمود الحسن رضوی ۳/۰
۱۸۵ غالب کے کلام میں الحاقی عناصر نادم سیتاپوری ۴/۵۰
۱۸۶ غزنی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
۱۸۷ غزلیات نظیری ۱/۵۰

(ف)

۱۸۸ فن خطابت یعنی استاد تقریر۔ کلب مصطفےٰ ایڈوکیٹ ۰/۷
۱۸۹ فریدہ خان محبوب طرزی ۲/۰
۱۹۰ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ نادم سیتاپوری ۴/۵۰
۱۹۱ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۳/۵۰
۱۹۲ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰
۱۹۳ فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی ۳/۰
۱۹۴ فغان محسن محسن کاکوروی ۰/۳۰
۱۹۵ فارسی آموز شبیر احمد علوی ۱/۰
۱۹۶ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۴/۵۰

(ق)

۱۹۷ قصیدے جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں غلام احمد فرقت ۵/۰
۱۹۸ قصائد خاقانی ۱/۵۰
۱۹۹ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰
۲۰۰ قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۴/۵۰
۲۰۱ قطرے پہ گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۷/۰
۲۰۲ قدر و نظر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰
۲۰۳ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۲/۰
۲۰۴ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/
۲۰۵ قومی ادب نثر و نظم حامد افسر ۳/۸۳
۲۰۶ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۳/۰

(ک)

۲۰۷ کیسر اور کاہی بدرالدین طیب جی
۲۰۸ کف گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت

(گ)

۲۰۹ گلبانگ حرم مصور مقامات مقدسہ کے فوٹو زائر حرم حمید لکھنوی
۲۱۰ گاندھی نمبر
۲۱۱ گلدستۂ فارسی اول و دوم ۳۰
۲۱۲ گلزار فارسی یعنی آمد نامہ ۴۰
۲۱۳ گلہائے ادب ۔ عبدالاحد خاں خلیل ۱۰
۲۱۴ گاندھی جی کے ساتھ حامد اللہ افسر ۵۰

(ل)

۲۱۵ لوائح جامی مع مقدمہ عبدالاحد خاں خلیل ۵۰
۲۱۶ لال قلعہ مائل ملیح آبادی ۱/۰
۲۱۷ لب بام عادل رشید ۱/۰
۲۱۸ لسانیات اور اردو سید محمود حسن رضوی /۵۰

(م)

۲۱۹ مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو غلام احمد فرقت ۱/۰
۲۲۰ محسن کاکوروی نمبر ۱/۰
۲۲۱ مسلمان اور کانگریس ابوالکلام آزاد /۵۰
۲۲۲ مرثیہ نگاری اور میر انیس۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۱/۰
۲۲۳ مضامین فرحت (حصہ اول) مرزا فرحت اللہ بیگ ۳/۰
۲۲۴ مضامین فرحت (حصہ دوم) " " " ۳/۰
۲۲۵ ماضی کی کہانیاں ڈاکٹر اختر تلہری ۲/۵۰
۲۲۶ مینہ اسٹیج ڈرامے ڈاکٹر [illegible] ۴/۵۰

- ۲۲۷ موسم گل (ناول) عادل رشید ۶/۰
- ۲۲۸ مجبور " خان محبوب طرزی ۴/۵۰
- ۲۲۹ مضامین جدیدہ محمد ہادی ۱/۷۵
- ۲۳۰ مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ قدرت اللہ بیگ ۲/۵۰
- ۲۳۱ مطالعہ شبلی ناظر کاکوروی۔ شجاعت علی سندیلوی ۴/۰
- ۲۳۲ نباتات شبلی جالب مظہری ۲/۵۰
- ۲۳۳ مثنویات حالی۔ ناظر کاکوروی شجاعت علی سندیلوی ۲/۵۰
- ۲۳۴ مطالعہ حالی " " " ۴/۵۰
- ۲۳۵ میٹھے بول " ۱/۲۵
- ۲۳۶ مولوی نذیر احمد کی کہانی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۰
- ۲۳۷ معرکہ روم و یونان صادق سردھنوی ۶/۰
- ۲۳۸ مصنوعی چاند خان محبوب طرزی ۴/۰
- ۲۳۹ مقدمہ شعر و شاعری (مطابق نصاب بی۔ اے) حالی ۱/۵۰
- ۲۴۰ مرثیہ غالب " ۰/۷۵
- ۲۴۱ مجموعہ کربلا جرجی زیدان ۳/۵۰
- ۲۴۲ معمار مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
- ۲۴۳ مولانا حالی انوار الحسن صدیقی ۰/۳۷
- ۲۴۴ مہاراج بلی ڈاکٹر احسن فاروقی ۲/۰
- ۲۴۵ مسٹر ملا کی نوک جھونک خواجہ عزیز الحسن مجذوب ۰/۷۵
- ۲۴۶ مجذوب اور اُن کا کلام۔ مولانا رضا انصاری ۱/۵۰
- ۲۴۷ مصباح بلاغت مع مقدمہ (اُردو) محمد شریف ۳/۰
- ۲۴۸ مطالعہ سودا ڈاکٹر محمد حسن ۳/۰
- ۲۴۹ مزامیر شرح دیوان غالب۔ غلام احمد فرقت ۸/۰
- ۲۵۰ مقدمات و مقالات۔ عبدالاحد خاں خلیل ۵/۵۰
- ۲۵۱ منتخب سوانح اور خاکے۔ نجم الدین نقوی ۲/۰

(ن)

- ۲۵۲ نثر امروز ایرانی ڈاکٹر رفیع حسین ۳/۰
- ۲۵۳ نشاط غالب۔ وجاہت علی سندیلوی ۴/۵۰
- ۲۵۴ نقد و انتقاد اعجاز احمد معجز ۲/۰
- ۲۵۵ نقش حالی اول و دوم یعنی حالی نمبر پروفیسر احتشام حسین ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی شجاعت علی سندیلوی ۱۲/۰
- ۲۵۶ نغمہ کوہسار خان محبوب طرزی ۴/۰
- ۲۵۷ نغمات الہند مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۳/۰
- ۲۵۸ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی کبیر احمد جائسی ۲/۰
- ۲۵۹ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ حامد اللہ افسر ۳/۰
- ۲۶۰ نیا راستہ (ناول) خان محبوب طرزی ۳/۵۰
- ۲۶۱ نوروز (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
- ۲۶۲ نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ) آل احمد سرور ۶/۰
- ۲۶۳ نقوش و افکار مجنوں گورکھپوری ۴/۵۰
- ۲۶۴ نیلم انتظار حسین ۳/۰
- ۲۶۵ نذیر احمد کی کہانی فرحت اللہ بیگ ۱/۰
- ۲۶۶ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی عبدالاحد خاں خلیل ۴/۰
- ۲۶۷ منشی نولکشور نمبر ۲/۰

(ہ)

- ۲۶۸ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے علی عباس حسینی ۳/۰
- ۲۶۹ ہندی کے مسلمان شعرا۔ امیر حسن نورانی ۰/۷۵

۲۷۰	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/۰
۲۷۱	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۲۷۲	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	” ”	۱/۵۰

(ی)

۲۷۳	یادگار غالب	مولانا حالی	۱/۵
۲۷۴	یا قوتی (ناول)	خان محبوب طرزی	۱/۰
۲۷۵	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۱/۵۰

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

جلد (۱۸) شمارہ ۱۰
رجسٹرڈ نمبر : ایل ۲۰
لائسنس نمبر : ۲۰۶۴۱۷/۲۰۱۸۱۶۴
فون نمبر : ۲۶۱۳۵

ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کا علمی و ادبی ماہنامہ

فروغ اردو لکھنؤ

فروری ۱۹۷۲ء

مدیر اعزازی :-
پروفیسر سید احتشام حسین

(ایڈیٹر) محمد حسین شمس علوی

مجلس ادارت :
عبدالقوی دریابادی بی اے
سعادت علی صدیقی ایم اے

زر سالانہ : چار روپے
فی پرچہ : ۳۷ پیسے

پتے :-
ادارہ فروغ اردو
امین آباد پارک لکھنؤ-۱

ترتیب

سید انصار حسین پرنٹر، پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا۔ ایڈیٹر محمد حسین شمس علوی

محمد حسین شمس علوطی قاسمی سجاکوروی

اپنی باتیں

کہا جاتا ہے کہ بارہ برس بعد گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں اور گردشِ ایّام کے اثرات سے ملکوں اور قوموں کی تقدیر بدل جاتی ہے لیکن نہیں تبدیلی ہوتی تو اُردو کی قسمت میں۔ طرح طرح کے منصو بے بنتے ہیں، الکشنوں میں وعدے ہوتے ہیں، انتخابی مہموں میں ووٹ دینے والوں کو خوش کرنے اور سبز باغ دکھانے کے لئے گھن گرج تقریریں ہوتی ہیں، حکومت کی جانب سے اعلانات ہوتے ہیں، لسانی کمشنر مقرر کیا جاتا ہے، اکیڈمی قائم ہوتی ہے اور مخصوص ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات کا تقرر ہوتا ہے، ہزار کے انعامات بھی تقسیم ہوتے ہیں۔ اور کچھ شاعروں کو چھوٹے چھوٹے وظائف بھی دے جاتے ہیں، لیکن اُردو کی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس پر غور کرتے ہوئے مختلف خیالات ذہن میں آتے ہیں:۔

۱۔ کیا اُردو بے جان اور غیر ضروری زبان تھی کہ اب اُس کی ضرورت باقی نہیں رہی یا اُس کا قالب بے رُوح ہوگیا؟

۲۔ کیا اِس کے بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہوگئی؟

۳۔ کیا موجودہ عہد کے تغیرات کا ساتھ دینے اور وقت سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت اس زبان میں نہیں ہے۔

۴۔ کیا اِس کا رویّہ قومی مفاد اور وطن دوستی کے خلاف ہے؟

۵۔ کیا حکومت کی جانب سے اس کی بقا اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟

۶۔ کیا اس زبان کے شاعر اور ادیب خاموش ہوگئے ہیں؟

۷۔ کیا خود اِس زبان کے نام لیواؤں کو اس کی بقا کی فکر نہیں رہ گئی ہے؟

اس طرح کے بہت سے خیالات ذہن کے پردوں پر منڈلاتے ہیں۔ سب بحث طلب ہیں اور سب ایسے ہیں کہ انھیں زوال کے اسباب میں سے کوئی نہ کوئی سبب قرار دیا جاسکتا ہے لیکن خیال ہے کہ سب سے زیادہ غور طلب علامت خود اُردو والوں کی بےحسی ہے۔ اگر اُردو مٹ گئی جاننے والوں کے ہاتھوں مٹے گی [illegible] کتابیں شائع

ب. سال میں چند شعرا کے مجموعے دو ایک تحقیقی مقالے، چند مذہبی کتابیں، ایک دو عام کتابیں،
دے بھٹکے کوئی علمی کتاب، چند معمولی ناول یا افسانوں کے مجموعے۔ کیا اس سرمایہ پر کوئی زبان
نده رہنے کا دعویٰ کرسکتی ہے اور زندہ رہنے کا حق جتا سکتی ہے؟ ان کتابوں کا بھی یہ حال
ے کہ اکثر کتابیں لکھنے والے انھیں خود اپنے پیسوں سے شائع کرتے ہیں۔ کم تعداد میں چھپاتے ہیں۔
س فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی چھوٹا موٹا انعام مل جائے کہ لاگت نکل آئے، کہیں نصاب میں داخل
ہوجائے یا زیادہ کمیشن دے کر کسی طرح ایک اڈیشن چار چھ سال میں ختم کرلیا جائے۔ آپ کسی
کتب فروش سے پوچھئے تو وہ بتائے گا کہ کورس کی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کے خریدار
شکل سے آتے ہیں۔ کچھ لائبریریاں تو ضرور سال بھر میں دو چار سو کی کتابیں خرید لیتی ہیں
لیکن انفرادی طور پر بمشکل کے چند کتابوں کی نکاسی ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر
کتابیں بکیں گی نہیں تو چھاپی کیوں جائیں گی، چھاپی نہ جائیں گی تو لکھنے والے لکھیں گے کیوں؟
کتاب محض غزل کا شعر یا مشاعرہ کی نظم تو نہیں ہے کہ گنگناتے گنگناتے دل کی آواز بن کر
نکل ہی آئے گی۔ اس کے لئے تو ریاضت، محنت اور وقت کی ضرورت ہوگی اور جو اپنا وقت
لگائے گا وہ اس کا معاوضہ بھی چاہے گا اُسے کتاب سے کچھ حاصل ہونا چاہیئے۔ کتاب
کے فروخت نہ ہونے کی وجہ سے ناشر رائلٹی سے بچنا چاہتا ہے، پھر لکھنے والا کیوں
لکھے گا، محض رسائل میں چند مضامین شائع ہوجانے سے تو ادب اور علم کی ترقی نہیں ہوسکتی۔

ان سوالات کا جواب کون دے؟ یہ ایک لامتناہی سلسلہ ایک پریشان کن دوار تسلسل
کا عمل ہے اور آخری نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اس کا علاج خود اُردو پڑھنے والوں کے ہاتھ میں
ہے۔ اگر وہ کتابیں نہیں خریدتے، نہیں پڑھتے تو پھر کوئی قوت اُردو کو تباہ ہونے سے
نہیں بچاسکتی۔ نہ حکومت کی امداد، نہ انتخاب لڑنے والوں کے وعدے، نہ سیاسی جماعتوں
کے منشور اور نہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی حب الوطنی، قوم پرستی اور زمانے سے ہم آہنگی
پیدا کرنے کی خواہش۔ معاملہ بالکل سیدھا سادا ہے اُردو کا نام لینے والوں کو اُردو پڑھنا، کتابیں رسائل
اور اخبارات زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ کوئی صورت اُردو کی بقا اور ترقی
کی نہیں ہے اور نہ اُردو اکیڈمی کا قیام اس مشکل کی بر آوری کر سکتا ہے۔

فروغِ اُردو بھی پوری قوم کے ساتھ ہر دلعزیز اور باعمل وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی
کو ہندوستان کی شاندار کامیابی پر مبارکباد میں شریک ہے کیونکہ اُسے یقین ہے کہ اس
سے جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کے اُصولوں کو نہ صرف دنیا میں، بلکہ ہندوستان میں بھی
تقویت پہونچے گی اور جن انصاف کے لئے ہم نے اپنی جان لڑائی ہے اُس سے خود
ہندوستان کے مختلف فرقے طبقے اور گروہ بہرہ ور ہوں گے۔

غزل

ڈاکٹر سلام سندیلوی

★

یہ مانا کہ تشنہ دہاں بھی بہت ہیں
عنایات پیر مغاں بھی بہت ہیں

زباں بند کر دی کسی نے تو کیا غم
مرے پاس طرز فغاں بھی بہت ہیں

گلستاں میں بیشک ہیں خطرات لیکن
مقامات امن و اماں بھی بہت ہیں

صبا نا شگفتہ ہیں کچھ غنچے لیکن
ترے پاس اٹکھیلیاں بھی بہت ہیں

ڈراتے ہیں کیوں مجھ کو خار بیاباں
مری راہ میں گلستاں بھی بہت ہیں

نقاہت سے شاخ سمن ہے خمیدہ
مری طرح سے ناتواں بھی بہت ہیں

نہ سمجھو انھیں تم خنک مثل شبنم
کہ ہر گل میں برق تپاں بھی بہت ہیں

یہ مانا کہ دو چار حاسد ہیں لیکن
سلام آپ کے قدرداں بھی بہت ہیں

اسلام بیگ شفیق

تسنیم علوی کاکوروی

آپ کا نام رفیق احمد تسنیم تخلص تھا۔ آپ حضرت ملک
خر مولوی عبدالوحید صاحب رحمۃ اللہ علیہ المتخلص
نگ کاکوروی اُستاد فرمانروائے ریاست جھالاواڑ کے بڑے
حب زادے تھے حضرت نیرنگ مرحوم نے بزمانۂ قیام جے پور
قد ثانی کر لیا تھا۔ آپ بمقام جے پور میں پیدا ہوئے۔ تاریخ
یدائش صحیح معلوم نہیں ہو سکی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ
ی پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء کے قریب تر ہوئی ہو گی۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں جب
ضرت نیرنگ مرحوم جھالاواڑ بغرض ملازمت تشریف لائے تھے
پ کے لئے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس وقت نو یا دس سال کے
تھے۔ اور ایک ان کی بہن چھ سات سال کی ساتھ تھیں۔
والدہ محترمہ کا جے پور میں انتقال ہو چکا تھا سایۂ پدری
میں آپ کی پرورش ہو رہی تھی۔ حضرت نیرنگ نے جھالاواڑ
میں قیام فرمانے کے بعد صاحبزادی کو اپنے برادر محترم مولوی
عبدالحمید صاحب کے پاس کاکوری پہونچا دیا۔ بالغ ہونے
پر مولوی عبدالحمید صاحب نے بھتیجی کا سید حسن صاحب کے
ساتھ کر دیا۔

تسنیم مرحوم کی ابتدائی تعلیم اُردو فارسی کی اپنے والد
کی خدمت میں ہوئی۔ بعد ازاں درباری اسکول جھالاواڑ
میں آپ کو داخل کرا دیا گیا۔ مروجہ فارسی تعلیم کا تکملہ گھر پر ہوا۔
اسکولی تعلیم چند سال جاری رہی۔ انٹرنس تک نہ پہنچے
تھے نہ تعلیم ترک کر دی گئی۔ اور آپ بمشورہ دیوان ریاست
ترکی بر مانند حیدر وید کی محکمہ عالیہ دربار میں نیر مرافقہ اہلکاران
ملازم کرا دئے گئے۔ کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد آپ ملازمت
چھوڑ کر الہ آباد چلے گئے۔ وہاں کسی اخبار کی ذمہ داری
سنبھالی تحریک آزادی اس زمانہ میں جاری ہو چکی تھی۔
آپ اس میں شریک ہوئے۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں
گولی چلی جس سے کسی نوجوان مسلمان کی شہادت ہو گئی۔
آپ نے پر زور مرثیہ اس کا لکھا جس سے حکومت کی
گرفت سخت ہو گئی۔ آپ تحریک آزادی کے جلسوں میں
تقریریں بھی کرتے تھے وہ پُر اثر ہوتی تھیں۔ اس لئے آپ کو
ابوالبیان سے نوازا گیا۔

الہ آباد سے آپ لکھنؤ آ گئے یہاں اخبار حقیقت کے
ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اخبار آپ کے زمانہ میں خوب مشہور ہوا۔
لکھنؤ سے حیدرآباد دکن چلے گئے وہاں بھی اخبارکی ادارت
میں کام کیا۔ حیدرآباد کے بعد آپ ریاست راجگڈھ میں (سینٹرل
انڈیا) آ گئے۔ اور اس ریاست کے رئیس نے اپنا درباری شاعر
اور مصاحبت کا رتبہ دا کیا۔ اور تاریخ ریاست راج گڈھ لکھنے
کام بھی سپرد کیا گیا۔ آپ نے اس فرض کو بڑی خوبی سے ادا کیا

پوری تاریخ بڑی تلاش اور جستجو کے بعد تیار کی جس سے رئیس بہت خوش ہوئے افسوس ہے کہ وہ تاریخ ان کی زندگی میں طبع نہ ہو سکی سنا ہے کہ وہ غیر مطبوعہ قلمی دریاست میں موجود ہے مختلف مقامات پر نقل و حرکت کرتے ہوئے ۱۹۳۴ء میں راج گڑھ سے اس عالم میں قدم رکھا کہ جہاں کا گیا ہوا کسی اور جگہ جا سکا نہ وہاں سے واپس ہی آ سکا استاد مرحوم کو اس حادثہ جانکاہ سے سخت صدمہ پہنچا۔ مگر مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا میرے والد ماجد مرزا رفیق بیگ صاحب مرحوم نے مادۂ تاریخ رحلت یہ نکالا تھا

فردوس بریں مقام تسنیم ۱۳۵۳ھ

استاد مرحوم نے کاوش فکر کی بہت داد دی یہ قطعہ تاریخ اخبار حقیقت لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے۔ مولوی نور الحسن صاحب نیر مؤلف نور اللغات نے بھی چند مادہ تاریخ رحلت بھیجے تھے وہ حافظہ میں نہیں رہے ایک یاد رہ گیا یہ مادہ تاریخ آپ نے فارسی کے ایک مشہور شعر سے نکالا تھا۔ ملاحظہ کیجئے

ہر آنکہ زاد بہ ناچار بایدش نوشید
ز جام دہر مئے کل من علیہا فان

۱۹۳۴ عیسوی (پورے شعر سے)

بر وقت انتقال معلوم ہوا تھا کہ اہل راج گڑھ نیز رئیس راج گڑھ کو آپ کی وفات پر سخت افسوس ہوا شعر و شاعری کے سلسلے میں جو حضرات وابستہ تھے آپ کی رحلت سے بے حد مغموم ہوئے تسنیم مرحوم کی باکمال شخصیت کی وجہ سے راج گڑھ میں وہ ادبی و شعری ماحول پیدا ہو گیا تھا کہ لوگ محسن و نیرنگ کے نام سے اور ان دونوں بزرگوں کے کلام کے محاسن سے نا آشنا نہیں رہے۔ تسنیم اور شاعری اس موضوع پر کچھ لکھنے [illegible]

ہوگا کہ حضرت نیرنگ کے آبا و اجداد سب اردو فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ خود حضرت نیرنگ نے فن شاعری اک محقق سخن اور قادر الکلام استاد ہونے کا وقار حاصل کیا۔

تسنیم صاحب نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی کہ ہر وقت شعر و شاعری کی باتیں سنیں۔ حضرت نیرنگ کی ڈیوڑھی پر تلامذۂ نیرنگ کی بھیڑ دیکھی۔ فطری مناسبت کے ساتھ ان باتوں کا بھی مزاج و طبیعت پر اثر ہوا قدرتی ذہانت فطانت کے جوہر چمکے۔ بہت جلد آپ نے شعری مہارت میں نمایاں کامیابی حاصل کر لی۔ تلامذۂ نیرنگ روزانہ کو حاضر ہوتے وقتیہ طرح پر طبع آزمائی ہوتی حضرت استاد بلحاظ محاسن شعری، شاگرد کے کلام پر نظر ڈالتے جو وقت مقررہ میں اچھے شعر نکالتا وہ مستحق داد و ستائش ہوتا تھا اس سے جناب تسنیم نے کافی شعر گوئی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔

دنیا میں بے فکری کا زمانہ مشکل ہی سے ملتا ہے تسنیم صاحب کو اوائل عمر میں ہی شریک حیات کی دائمی مفارقت سخت گزری۔ آپ کی شادی جھالا واڑ کے قاضی خاندان کی ایک صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی وہ بعد شادی علیل ہو کر رحلت کر گئیں۔ اسی کا اثر مزاج تسنیم پر سنا ہے کہ ایسا ہوا کہ کچھ زمانے کے لئے طبیعت میں وہ درجی اور وہ روانی نہیں رہی، الٰہ آباد میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا نیز دیگر افکار معاش بھی لگے رہے۔ مگر کسی طرح وہ ان سب سے مقابلہ کرتے ہوئے شاعری کے میدان میں اپنے آپ کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

مزاج نہایت اچھا پایا تھا۔ بڑے خوش اخلاق [illegible] تسنیم [illegible] رہے ہو [illegible]

رہے۔ دوران تمام خوبیوں پر آپ کا حسن کلام حسن بیان چھایا ہوا تھا کہ ہر اہل ذوق آپ کا گرویدہ تھا۔ راج گڑھ میں ریاستی تقاریب کے موقعہ پر آپ قصائد لکھتے جو قصائد کی خوبیوں کے حامل اور فنی اعتبار سے قابل قدر رہتے مراثی لکھنے کا خاص شوق تھا۔ میر انیس کے کلام کے بہت گرویدہ تھے۔ ان کے چند مراثی کے بندوں پر آپ نے تضمین بھی کیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں جب آپ تعلقہ آئے تھے۔ اکثر اپنا کلام احباب کو سناتے تھے۔ افسوس ہے کہ آپ کا تمام وہ کلام جو آپ نے مختلف مقامات پر لکھا۔ وہ دستبرد زمانہ کے نذر ہو گیا۔ اور جو پاس تھا وہ بعد رحلت ان کے چھوٹے بھائی مولوی محب الرحمن صاحب ملوی ڈاکوری سے راجگڑھ پہنچکر اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ تلاش و جستجو کی آپ کا کلام کہیں سے مل جائے تو ہدیۂ ناظرین کیا جائے۔ مگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۹۱۱ء کی دو غزلیں میرے دوست منشی ظہور الدین صاحب بلیں جن کے پرچے دیمک خوردہ ہیں۔ ایک میرے پاس کے دیرینہ کاغذات میں تلاش سے نکل آئی۔ ان تینوں غزلوں کو ذیل میں درج کرتا ہوں یہ کلام مرحوم کا بالکل ابتدائی دور کا ہے اہل ذوق اس سے بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کے بعد کا کلام کس پایہ کا ہوگا۔۔ کوشش جاری ہے اگر دستیاب ہو گیا تو ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔ پہلے نعتیہ اشعار سے ملاحظہ کیجیے۔

اے دل نعت احمد مختار رہ نہ جائے
اس نظم میں کوئی در شہوار رہ نہ جائے

ہو خواب میں زیارت محبوب کبریا
اس زندگی میں حسرت دیدار رہ نہ جائے

جتنے قصوروار ہوں پائیں قصور خلد
دوزخ کے واسطے بھی گنہگار رہ نہ جائے

پوچھے گا کون حشر میں اب تم کو زاہدو
رضواں کو حکم ہے کہ گنہگار رہ نہ جائے

مقطع کا پورا ایک مصرع دیمک کھا گئی۔

اسی زمین میں دوسرے رنگ کے اشعار پڑھیے۔

آتے ہوئے رقیب کے گھر یار رہ نہ جائے
سر پھوڑنے کو پھر در و دیوار رہ نہ جائے

پھانسی لگا کے آپ ہی مر جائے بدنصیب
پھندوں میں زلف کے تو گرفتار رہ جائے

قاصد یہ اضطراب یہ درد و الم مرا
کوئی بھی حال قابل اظہار رہ نہ جائے

قامت کے ساتھ عکس قیامت اتار لوں
تضمین مصرع قد دلدار رہ نہ جائے

پہلے اڑا تو دامن محشر کی دھجیاں
پھر اے جنوں کفن کا کوئی تار رہ نہ جائے

تسنیم زندگی میں جو آزاد ہو سکو
تیرے لئے بھی قبر میں آزار رہ نہ جائے

غزل

وہ عاشق جفا میں شہید وفا ہوا
کوئی کسی پہ کوئی کسی پر فدا ہوا

حاصل تمہارے ظلم سے بھی مدعا ہوا
یعنی خدا کا شکر زباں سے ادا ہوا

رندوں پر کیا اثر ہو تیری گفتگو کا شیخ
کل پی رہا تھا آج بڑا پارسا ہوا

نظروں میں تولتی ہے مجھے چشم خونفشاں
ہے آج قتل پر مرے قاتل تلا ہوا

اللہ ایسی کونسی دلچسپ بات ہے
پھرتا نہیں جو ملک عدم گیا ہوا

میں نے اسے جھپٹ کے گلے سے لگا لیا
جب مجھ کو منھ پھیر کے خنجر خفا ہوا

ہے قتل عام گرم ہے بازار موت کا
ناکہ ہے آج ملک عدم کا کھلا ہوا

میں زمانہ بھر کا برا ہوں خطا معاف
یہ بھی تو کہیئے آپ سے کس کا بھلا ہوا

تسنیم جیتے جی نہ مدینے میں تم چلو
خلد بریں میں مر کے جو پہنچے تو کیا ہوا

—— دیگر ——

کانٹوں سے الجھ کر جو ہوئی چادری آپ
ہر خار نے کر دی ہے وہیں بخیہ گری آپ

خورشید کہے گا نہ کوئی رشک مسیحا
گو چرخ چہارم پہ کریں جلوہ گری آپ

شکوہ ہمیں وحشت کا نہ کچھ دشت جنوں کا
ہم گل کی طرح کرتے رہے جامہ دری آپ

اے ضعف نہ کر دے جائیے ڈھونڈھو سہارا
پہلو تو بدل دیتا ہے درد جگری آپ

شرمندۂ احساں نہ کرو تیر یہ رد کر
کر لینگی مری آرزوئیں نوحہ گری آپ

احسان فراموشی نہ کر شکوۂ صفلاں
تھی سنگ کی طالب تری آشفتہ سری آپ

خالی نہ گئی آہ جو پروانہ کو پھونکا
کچھ دیر کا مہماں ہے چراغ سحری آپ

تیغ نگہ قہر کے کس دن نہ ہوئے وار
کرتے رہے مجھ سے تو ہی کج نظری آپ

پہونچائیگی نامہ مرا آہ دل مضطر
کر لیگا مرا شوق مری نامہ بری آپ

مقطع کا پہلا مصرعہ دیمک چاٹ گئی دوسرا مصرعہ

تسنیم اٹھاتے ہیں عبث درد سری آپ

حضرت تسنیم کے کلام کی ابتدا جب اس شان کی ہے تو انتہا کیا ہوگی۔ زبان کی صفائی۔ بندش کی برجستگی مضمون کی دلآویزی اہل ذوق سے خراج تحسین مستحق ہے۔ فقط ر

کرامت علی کرامت

طرفہ قریشی کی شاعری

طرفہ قریشی کے جس شعر نے پہلی بار مجھے ان سے متعارف کرایا وہ یہ ہے ؎

نگاہوں کے ملاپ پر نہیں، بنا یہ دوستی
دلوں کے ربط کو تعلقات کہتے آئے ہیں

"متعارف کرانے" سے مراد شاعر کے نام سے متعارف کرانا نہیں بلکہ اس کی شاعرانہ عظمت سے صحیح طور پر روشناس کرانا ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں ایک ایسی سچائی پیش کی گئی ہے جسے ہم اپنے دل کی آواز کہہ سکتے ہیں۔ اس سچائی میں پوشیدہ کیفیات کو ہم اپنے طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔ اس شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ نیا نہیں ہے۔ لیکن سادگیٔ بیان کے ساتھ ساتھ موزوں ترین الفاظ کے برجستہ استعمال سے شاعر ہمارے دل میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور یہی بات اس کی فنکارانہ چابکدستی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی نوعیت کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

جگر میں درد آنکھوں میں نمی محسوس کرتا ہوں
کبھی اوقات کچھ زندگی محسوس کرتا ہوں

بنائے درد جب دل میں مرے رکھی گئی ہوگی
محبت نے تڑپنے کی اجازت مانگ لی ہوگی

طرفہ قریشی نے نظم، غزل، رباعی تقریباً ہر قابلِ ذکر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے لیکن میں انھیں بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر تصور کرتا ہوں۔ موصوف علامہ سیماب کے شاگردوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے علامہ سیمابؔ کے کلام کی طہارت اور پاکیزگی کو برقرار رکھا اور اس کی حسین روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اپنی شاعری میں سیماب سے بیحد متاثر نظر آنے کے باوجود ان کا اپنا سوچنے کا انداز ہے جو ان کے کلام کو انفرادی حیثیت عطا کرتا ہے۔ نہ ان کے کلام میں جگر کی سی سرشاری اور خود رفتگی نظر آتی ہے۔ نہ فانی کی سی مایوسی و شکست خوردگی، نہ اقبال کی طرح ان کا کلام فلسفیانہ ہوتا ہے اور نہ اصغر گونڈوی کی طرح متصوفانہ۔ پھر بھی نہ جانے ان کے کلام میں کونسی بات ہے جو ہمیں پہلی نظر میں اپنی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ میرے خیال میں ان کے کلام کی دلکشی کا بہت

بڑا سبب خود سپردگی اور ربودگی کا وہ عالم ہے جس سے شاعر خود دوچار ہوا ہے اور ہمیں بھی اپنی مابعد الطبیعاتی دلفریبیوں میں گم کر کے آگہی کی عمومی سطح سے عرفان کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ کبھی کبھی طرفہ قریشی کا مابعد الطبیعاتی مزاج تصوف کے بہت قریب پہونچ جاتا ہے، وہ تصوف جو وحدانیت اور اسلام کے نظریات کے امتزاج کا نتیجہ نہیں بلکہ جس کا تعلق براہ راست اسلامی فلسفۂ حیات سے ہے۔ ذیل کے اشعار میرے اس قول کی وضاحت کے لئے کافی ہوں گے ؎

یہ جبر نہیں تو اور ہے کیا احساس ابھرا اک دل دے کر
جو سب سے زیادہ مشکل تھا فطرت نے وہ ہم سے کام لیا

جستجو اپنی ہی دنیا میں ہے عینِ مقصود
ڈھونڈ آپ اپنے کو اتنا کہ خدا مل جائے

میں خدا ہوں اور نہ خدا نما مگر اس کا جزوِ لطیف ہوں
مجھے رکھ تو اپنی نگاہ میں جو تجھے خدا کی تلاش ہے

طرفہ قریشی حیات و کائنات کی بوقلمونی پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اپنی ذات کی رنگا رنگی پر بھی۔ موصوف وسعتِ کائنات کے درمیان اپنی ذات کا مقام متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں آگہی سے لے کر نیم آگہی اور تحت آگہی تک انھیں جن مرحلوں سے گذرنا پڑا ہے وہ انھیں جمالیات کے ایک نئے تصور کے قریب پہونچا دیتے ہیں ؎

جنوں نواز عشق ہی کو ذات کہتے آئے ہیں
خرد کو حسن خالقِ صفات کہتے آئے ہیں

تو اپنی جنبشِ نگاہِ شوق سے تو کام لے
نظر کو پردۂ جمالیات کہتے آئے ہیں

ورق ورق ہے اس کا اک بابِ مدعا ئے
حیات کو بیاضِ خواہشات کہتے آئے ہیں

مشاطگیٔ حسنِ عمل کے لئے ہر وقت
ہے اہلِ جہاں کے لئے آئینہ مری ذات

غبارِ عکسِ جمال سے ہے تسلسلِ زندگیٔ عالم
جہاں نگاہوں میں تم نہ ہوگے وہاں ہمیں موت ہی ملے گی

طرفہ صاحب کے کلام کا قابلِ قدر حصہ نزاکتِ تخیل ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں عروسِ فکر اپنی تمام سج دھج کے ساتھ مشاطگی میں محو نظر آتی ہے۔ ان اشعار میں ان کا ایک ایسا انوکھا پن ہوتا ہے جو تحت الشعور اور لاشعور کی گہرائیوں سے بہت سے خفتہ تجربات کو شعور کی سطح پر ابھار لانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل کر رہا ہوں ؎

ہر اک آنسو میں اسکے جوہرِ سوزِ محبت ہے
یہ کس نے شمع کی آنکھوں میں بھر دی خاکِ پروانہ

میں پست و بلندِ عالم کی تفریق مٹانے آیا ہوں
خورشید کی زرّیں کرنوں کو ذرّوں سے ملانے آیا ہوں

نہیں گر چاندنی شبِ غم مژہ پہ جگنو تو ہے منظم
مرے سیہ خانۂ محبت سے کچھ تو رشتہ ہے روشنی کا

زنداں میں بھی گیا نہ مذاقِ شگفتگی
[illegible] ودر کو ہم

طرفہ قریشی نے اپنی شاعری میں عموماً وہی
علامتیں استعمال کی ہیں جو متقدمین کے یہاں کثرت
سے ملتی ہیں۔ طرفہ قریشی کی شاعری کا تعلق جس دور
سے ہے اُس سے ؎

ڈھل جائیں گی بدن پہ جمی دھوپ کی تہیں
جی بھر کے سرخ پانی میں ایسا نہاؤں گا
(بشیر بدر)

جب مچھلیوں نے آخری دیدار کر لیا
دریا کو میں نے ریت کے کوزے میں بھر لیا
(پرکاش فکری)

پانی کے ساتھ ساتھ تھے شعلے ملے ہوئے
شوشے لہو کے ابر کے ہاتھوں نہ مٹ سکے
(وہاب دانش)

مزاجِ وقت کی تصویر بن گئے ہم لوگ
لبوں پہ برف جمی ہے دلوں میں لو ہے بہت
(سلطان اختر)

جیسی شاعری کی تلاش عقلمندی نہ ہوگی۔ البتہ
ان کی بہت بڑی خوبی یہ ضرور ہے کہ شاعری میں اپنے
نادر جذبات و تخیلات کے امتزاج سے وہ فرسودہ الفاظ
میں بھی ایک نئی جان ڈال دیتے ہیں۔ جس سے یہ الفاظ
خود بخود نئی نئی علامتوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔
اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اندازِ بیان میں ایک تازگی
پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کیفیات کے ابلاغ میں
جذبات کی اضافی فراوانی معرضِ وجود میں آتی ہے۔
مثلاً ؎

ثبت ہر ذرے پہ ہے مہرِ نظامِ فردوس
تم نے دیکھا ہی کہاں ہے ابھی ویرانۂ دل

عشق کو چاہیئے رکھدے وہیں بُنیادِ حرم
جس جگہ بھی ترا نقشِ کفِ پا مل جائے

میری فریادوں نے پایا ہے فرشتوں سے خراج
چومتا ہے نہ دعاؤں کا اثر میرے لئے
آندھیوں سے میں نے پائی قوتِ پروازِ شوق
لائے ہیں اُٹھ کر بگولے بال و پر میرے لئے

بعض اوقات انھوں نے نئے نئے شعری پیکر تراشے
ہیں اور بڑی خوبی سے تراشے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

بعد میرے سرد پڑ جائے گی نبضِ رنگ و بو
شام سے رودے گی شبنم تا سحر میرے لئے

ان کا گرد و پیش کا مطالعہ بہت گہرا معلوم ہوتا ہے اور
غالباً یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ماحول کی ہو بہو عکاسی
بڑے خوبصورت پیرائے میں کر دیتے ہیں مثلاً ؎

کس نے چھیڑا باغ میں ذکرِ خزاں
برگ ساکت، پھول چپ، کلیاں خموش

موجودہ حیات کی بے حسی و تنہائی کی اتنی خوبصورت
عکاسی مجھے بہت کم کہیں اور نظر آئی۔ ذیل کا شعر
ملاحظہ فرمائیے جس میں شاعر نے انسان کی نفسیات
کا بہت ہی قریب سے مطالعہ کیا ہے اور اسکے جذبات
کے نہاں خانے کے اندر بہت قریب سے جھانک کے
دیکھا ہے ؎

حدودِ غم سے قدم ہٹا کر نہ کر تلاشِ مسرتِ دل
خوشی تو ابنِ الضمیرِ غم ہے، یہ غم کے پہلو میں ہی ملے گی

انسان کی نفسیات اس قدر پیچیدہ ہوتی ہے کہ ہر جذبۂ
خوشی میں جذبۂ غم اور ہر جذبۂ غم میں جذبۂ خوشی

پوشیدہ رہتا ہے اور اس کے کسی رجحان کو خالص جذبۂ خوشی یا خالص جذبۂ غم سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اُردو کے اکثر جدید شعراء (بہ استثنائے چند) سب سے بڑی غلطی یہ کر رہے ہیں کہ موجودہ حیات کو صرف احساسِ کرب سے وابستہ کر دیتے ہیں، حالانکہ جدید شاعری کا فلسفہ وہی ہونا چاہیئے جو طرفہ قریشی کے مندرجۂ بالا شعر سے مترشح ہے۔

آخر میں طرفہ صاحب کا ایک ایسا شعر پیش کر رہا ہوں جس میں شاعری کی ذکاوت سے لے کر تخلیقِ شعر تک کے تمام مراحل اپنی طرفگی لئے ہوئے جلوہ گر نظر آتے ہیں اور جس میں موصوف کی شاعری کی تمام دلفریبیوں اور دلآویزیوں کا راز پنہاں ہے ؎

میں ہوں طرفہ واقفِ سرِّ حیات
میرا ہر مصرع ہے پیغامِ سروش

ظہورالدین

اظہار اور اُردو ادب

ظہاریت ایک ایسی اصطلاح ہے جس کو ایل. واکسیلز (L. Vauxcelles) نے جولین آگسٹ ہاروے (Julian - August - Herue) کی تصویریں دیکھنے کے بعد، جنھیں اُس نے ۱۹۰۱ء میں اریت (EXPRASSIONISMS) کے عنوان کے تحت نمائش کے لئے پیش کیا تھا، ایجاد کیا۔ جرمنی میں جہاں اس طلاح کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا، پہلے ۱۹۱۱ء میں تصویروں لئے اور پھر ۱۹۱۴ء میں ادب کے لئے استعمال کیا گیا۔ فرانس یہ تحریک ۱۹۰۵ء میں لیس فادیس (LAS FAUVES) نمائش کے ساتھ سامنے آئی۔

نظریہ اظہاریت کے حامیوں کے ہاں کسی مشترکہ کڑی کو ڈھونڈھ نکالنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر بھی چند باتیں ایسی در ہیں جن کو سامنے رکھ کر اس تحریک سے متعلق ایک لی خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے مثلاً یہ لوگ جذبات و لات کے پُرزور اظہار پر یقین رکھتے ہیں نقل نہ اتارنے ایک بار پیش کردہ اشیا کو دوبارہ پیش نہ کرنے کی ن کرتے ہیں ان کا قول ہے کہ دنیا جہاں کتنی دیں ہے دوہرانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس رجحان سے وابستہ تصور مجرد ہستیوں کا سہارا لیتے ہیں اور مقامی رنگوں کے مقابلہ میں غیر حقیقی اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقی اشیا کے مقابلے میں اُنھیں مجرد اور غیر مرئی اشیا زیادہ پسند آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں رنگ بلا تام اور تصویریں بلا وضاحت کے ملتی ہیں چونکہ یہ سب غیر عقلیت کے دلدادہ ہیں اس لئے ہمیں ان کے ہاں سوز و گداز بھی بدرجہ اتم ملتا ہے۔ اپنے جذبات و خیالات کو دردناک انداز میں پیش کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے اس نظریے کے تحت لکھے گئے ڈراموں اور نظموں کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اظہار کو اوّل حیثیت دیتے ہیں۔ ہیئت اور وزن ان کے لئے بعد کی چیزیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں غیر مرتب نحوی ساخت محرل اور موثر پیکر کاری اور خیال کا عدم تسلسل وغیرہ خصوصیات بکثرت ملتی ہیں۔ اس فانی دنیا کے شکنجہ میں جکڑا ہوا انسان ان کی دلچسپی کا مرکز ہے۔

جرمنی میں بھی دوسرے ممالک کی طرح اس نظریے نے زیادہ تر شاعری اور ڈراموں میں رواج پایا۔ سٹرائنڈ برگ (STRINDLEERG) کے زیر اثر

ویڈ کائنڈ (Wede kind) سے لیکر بارلیک
(Barlack) تک جرمن کے اظہاریت پرست
ڈرامہ نگاروں نے دنیائے ادب کی قابل قدر خدمت انجام
دی ہے۔ شاعری کا دور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۵ء تک ہے
جس کے بعد اس کی جگہ سرریلزم اور نیو ریلزم وغیرہ لے
لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں (Bar[illegible] Brecht)
کی وہ نظمیں خاصی اہمیت کی حامل ہیں جو
Hans postille کے عنوان کے تحت
۱۹۲۷ء میں چھپ چکی ہیں۔

جرمنی سے باہر دوسرے ممالک میں اس نظریے
کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ فرانس میں تو اس
نظریے کو ٹھہرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ البتہ اینگلو سیکسن
ادب میں اس کا اثر زیادہ تر ڈراموں [illegible]
وانیل [illegible]
بلیو رائس [illegible]
میشیں [illegible]
ڈائلڈر (Thornton Wilder) [illegible]
سکن آف دی ٹیتھ (Skin of the teeth) خاص
طور پر قابل ذکر ہیں۔ منظوم ڈراما نگاروں میں آڈن (Auden)
اور اشروڈ (Isherwood) کے کئی ڈرامے بھی
اسی رجحان کے غماز ہیں۔ شاعری میں
Edith Sitwell
کی (Facade) قابل ذکر ہیں۔

اظہاریت کو ایک تحریک کی صورت میں ۱۹
ویں صدی کے آخر میں ہمارے سامنے آتی ہے لیکن
وہ خصوصیات جن کی ترجمانی یہ تحریک کرتی ہے اس
سے پہلے بھی بہت سے نامور ادیبوں کے ہاں ہم کو ملتی
ہیں۔ جن میں سے کچھ کا ذکر یہاں پر بے جا نہ ہوگا۔

اظہاریت درحقیقت ایک لسانی اور [illegible]
نظریہ ہے۔ خیال کا بہترین اظہار ہمیشہ سے [illegible]
کا حصہ رہا ہے۔ خیال [illegible] کے لئے الفاظ کا استعمال
اور مناسب الفاظ کے جامہ میں خیال [illegible]
سسرو (Cicero) [illegible]
[illegible] (Beque unity) [illegible]
[illegible]
[illegible] (Maugeries) [illegible]
ہے کہ شاعر کا کام اپنے خیالات کو [illegible]
کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ [illegible]
اظہار اس سائنس سورج کی طرح [illegible]
کو صاف اور واضح کر دیتا ہے جس [illegible]
[illegible] (Herder) [illegible]
اظہار کو زبان [illegible]
[illegible]
[illegible] (Biographia Literaria) [illegible]
سمجھ میں لگنے کے لئے خیال اور اظہار [illegible]
بہت ضروری ہے۔ جے۔ ایس مل۔ شاعری کو [illegible]
کا اظہار قرار دیتا ہے۔ اسی طرح جان کیبلے
(John Keble) اپنے خطبات میں شاعری کو
ایسے جذبات کا بلا واسطہ اظہار قرار دیتا ہے جنھیں
ہم بالواسطہ طور پر ظاہر نہیں کر پاتے۔ یہ بلاٹ اور
بحر دونوں کو اظہار کے بلا واسطہ وسائل قرار دیتا ہے
والٹر پیٹر اظہار کو صداقت کی فطری ہوئی شکل تصور کرتا ہے
جیسے دوسرے معنی داخلی ادراکات کو موزوں الفاظ کے غائب

لہ اس پیرا میں پیش کئے گئے سبھی حوالے [illegible]
Ency of poetry and poetics

میں ظاہر کرنے کے ہیں۔ ایک دوسرا فلسفی آر۔ ایل۔ نیٹل شپ (R. L. Nettle ship) اسکی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم ایک احساس کو اُس وقت تک محسوس نہیں کرسکتے جب تک کہ اُس کا اظہار نہ کیا جائے۔

شاعری اور ادب سے متعلق اظہاریت کی ایک چونکا دینے والی تعریف کروچے نے پیش کی ہے۔ ۱۹۰۳ء میں اس نے ہیگل کے اس قول کو کہ "حسن حواس کی وساطت سے خیال کا اظہار ہے" رد کرتے ہوئے کہا "حسن صرف ایک موضوع کے اظہار کا نام ہے" اپنی "جمالیات" [illegible] اظہار جذبہ کا [illegible] کروچے کے نزدیک [illegible] داخلی ذہنی تصویریں کے ہیں۔ کروچے جب اظہار کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اُس کے معنی خارجی اظہار یعنی بولنے، لکھنے، تصویر بنانے یا گانے کے نہیں ہوتے بلکہ نفس میں ایک تاثر کو درست طریقہ پر سمجھ چکنے کے ہوتے ہیں۔ کروچے کے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے آر۔ اے۔ سکاٹ جیمز لکھتا ہے: -

"کروچے[1] کے فلسفے کے مطابق آرٹ وجدان یا نفس کے داخلی اظہار کے سوا کچھ نہیں ...... ہر بات آرٹسٹ کے نفس میں واقع ہوتی ہے۔ جمالیاتی اظہار کلیتاً داخلی ہے۔ تاثرات کی خارجی صورت کا عمل صرف اسی کو ہے۔ وہ انھیں کسی ٹھوس صورت میں منتقل نہیں کرتا۔ اس لئے اُن سے کوئی نقاد نہ تو آگاہ ہوسکتا ہے، اور نہ استفادہ کرسکتا ہے۔"

کروچے کے انھیں خیالات سے متعلق دیوندر اِسّر لکھتے ہیں: -

"کروچے[1] اور اُس کے ہم خیال فن کار اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی آدمی داخلی تصویر کشی کرتا ہے تو وہ فن کار ہوتا ہے۔ چاہے اُس کا خارجی اظہار ہو یا نہ ہو۔ فکر و خیال سے بہت پہلے فن جنم لے چکتا ہے کیونکہ خیال کے مقابلہ میں تخیل کو اولیت حاصل ہے۔ اس لئے فن کار [illegible] یا داخلی تصویر کشی [illegible] سے پہلے ظہور میں آتا ہے۔"

[illegible] کے مطابق اظہار کے اصول [illegible] اظہار انھیں خود [illegible] بھی شاعرانہ فرہنگ کو مستقل [illegible] نہیں دیتا۔ اسی لئے وہ بانگ دہل کہتا ہے کہ اسلوب یا بندش کے اصول یا متعین ضابطے پہلے سے بنائے نہیں ہوتے۔ کسی مخصوص نظم کی تخلیق کے دوران اپنے موضوع کی ضرورتوں کے مطابق شاعر خود اُن کی ترتیب عمل میں لاتا ہے اور وہ کسی دوسری نظم کے لئے موزوں نہیں ہوسکتے۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اظہار ہی اسلوب کو متعین کرتا ہے۔ پہلے سے بندھے ٹکے ایسے کوئی ضابطے نہیں ہیں جن کی وساطت سے خیال کا اظہار بہتر طریقے سے ہوسکے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ گو ہر نیا اظہار، اظہار کے سابق وسائل سے خوشہ چینی کرتا ہے لیکن وہ اُن کو

The Making of Literature By R.A. James Scott. P. ۳۲۳

[1] "فکر و ادب" از دیوندر اِسّر ص: (۱۸-۵)

ہو بہو نقل نہیں ہوتا۔ وہ اظہار کے سابق وسیلوں کو نئے اظہار کے لئے بطور مواد استعمال کرتا ہے۔ ہر نیا پیکر پہلے کے پیکروں کا امتزاج ہوتا ہے جنہیں نئے ڈھنگ سے ترتیب دے کر نئے جذبہ کے اظہار کے لئے موزوں بنایا جاتا ہے۔ اظہار کی اکائی لفظ نہیں جملہ ہے جسے قواعد کے سانچوں سے نہیں بلکہ معنے کی ایک مکمل اکائی کے لحاظ سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ اظہار ایک محاورہ پر مشتمل ہو یا پوری نظم پر۔

کروچے نے "La poesia" (۱۹۳۶ء) میں بھی شاعری سے متعلق بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہیئتیں اور ڈھانچے شاعر کے لئے اظہار کے سابق وسائل کی یادداشت کے طور پر مفید ہو سکتے ہیں۔ شاعر کو چاہیئے کہ وہ انھیں ذہن میں رکھے اور انھیں اپنے ذہن پر عمل پیرا ہونے دے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی نئے اظہار کا حصہ بننے میں کامیاب ہو جائے۔ کروچے کا ایقان ہے کہ جب کوئی خیال ذہن میں مکمل صورت اختیار کر لیتا ہے تو پھر اسے چاہے کسی طرح بھی ظاہر کیا جائے اظہار مکمل ہوتا ہے۔ اگر کبھی کوئی اظہار نامکمل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خیال نے ذہن میں ابھی پوری اور واضح صورت اختیار نہیں کی ہے۔

اردو ادب میں گو حقیقتاً نقادوں نے کبھی اس رجحان کی پیروی نہیں کی ہے تاہم ادیبوں اور شاعروں کے ہاں اس کا احساس ضرور ملتا ہے۔ بیشک ہر ادیب خیال کے بہترین اظہار کا قائل ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے شاعروں کے فن پاروں سے اس قسم کی ان گنت مثالیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ اظہار کے انھیں بہتر وسائل کی تلاش پر مشتمل ہے۔ البتہ جہاں تک کروچے کے خیالات کا تعلق ہے اردو ادیبوں میں سے کسی نے بھی ابھی تک انھیں قبول کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ویسے بھی اظہاریت سے متعلق اس کے خیالات کو کوئی خاص فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس نے اظہار کو محض نفسیاتی عمل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اظہار کی ابتدا نفسیاتی عمل سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن جب تک وہ خارجی تجربہ کی صورت اختیار نہیں کرتا صحیح معنوں میں اظہار نہیں کہلا سکتا۔

کروچے کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ نفسیاتی عمل جب مکمل ہو جاتا ہے تو پھر وہ جس طرح بھی ظاہر کیا جائے اظہار مکمل ہوتا ہے۔ یعنی فن کار کو فضول ریاضت کرنے کی ضرورت نہیں۔ نفسیاتی عمل مکمل کر لینے کے بعد اگر وہ محض چند ٹیڑھے ترچھے خاکے بھی کھینچ دیتا ہے تو وہ اس کے نفسیاتی عمل کی مکمل تصویر ہوتے ہیں۔ کروچے کی یہ دلیل ناقص ہے، اور اس سے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو فن کار بننے کے خواہاں تو ہیں لیکن ریاضت کی صبر آزما منازل سے گذرنا نہیں چاہتے۔ فن ایک ریاضت ہے جس کے بغیر نفسیاتی عمل چاہے وہ کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو صحیح معنوں میں اظہار نہیں پا سکتا۔

اسمٰعیل انصاری ایم۔ اے

جدید اُردو شاعری اور حالی

قبل اس کے کہ مذکورہ بالا عنوان کے تحت کچھ لکھا جائے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک مختصر تمہید بھی کردی جائے تاکہ موضوع کا احاطہ مطلوبہ حدود میں کیا جاسکے۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہر چند کہ "کلام" سے مراد صرف نظم یا غزل یا قصیدہ وغیرہ ہی مراد نہیں۔ اس میں نثر پارے بھی شامل کئے جاسکتے ہیں کیونکہ یہ شاعری کے دوسرے اہم عنصر یعنی معنی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہترین نثر پارے بھی چاہے وہ بحر، ردیف و قافیہ کی پابندی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں معنوی اعتبار سے شاعری کے دائرے میں آجاتے ہیں چنانچہ آزاد نظم (Free Verse) اس کی مثال ہے۔ پروفیسر احمد صدیق مجنوں گورکھپوری اپنی تصنیف "ادب اور زندگی" میں یوں رقمطراز ہیں:۔

"اصلی شاعری کے لئے عروض، وزن و قافیہ لازم نہیں ہیں۔ دوسرے بہر معیاری نثر پارے کی اصل روح ایک آہنگ ہوتا ہے جو شعر کے باہری اور ظاہری آہنگ سے کہیں زیادہ بلیغ و پرکیف ہوتا ہے۔"

جدید شاعری کے لئے عروض، وزن و قافیہ لازم نہیں ہیں

لیکن اس میں شک نہیں کہ یہی چیز ہماری شاعری کے لئے زیب و زینت کا کام دیتی ہے۔ اس کے باوجود روایت یہ پڑ گئی ہے کہ ہم صرف انھیں فن پاروں کو شاعری قرار دینے لگے ہیں جو صنائع و بدائع کی پابندی کرتے ہوں اور شاعری کا مقرر کردہ اصناف میں سے ہوں۔

اس طرح ہم شاعری کے دو اہم عنصر ترتیب دینے کے بعد ان کو نظم اور نثر دو بالکل علیحدہ شعبوں میں تقسیم کردیتے ہیں۔ اب حصہ نظم میں مختلف اصناف آئیں گے مثلاً پابند نظم، آزاد نظم، مرثیہ، قصیدہ، غزل، رباعی، قطعات وغیرہ۔ اب ہم یہاں صرف "نظم" ہی کے تعلق سے گفتگو کریں گے۔

علامہ شبلی نے شعر کے دو اہم اجزا بتلائے ہیں یعنی صورت اور نفسِ مضمون۔ پہلی صورت میں وہی صنائع و بدائع، وزن، بحر، ردیف، اور قافیے متعلق دیکھا جاتا ہے، اور دوسرے جز میں نفسِ مضمون یعنی مطلب بیان کیا جاتا ہے۔ دراصل دوسرا جز ہی اصل جوہر ہے۔ اب ہم نفسِ مضمون کی طرف آتے ہیں۔

شاعری یا ادب کی اصل غرض و غایت ہی یہ ہے کہ وہ عوام کی روزمرہ زندگی کی نمائندگی کرے۔ اور جس میں یہ صلاحیت ہو کہ عوام کی زندگی کی ترکیب میں داخل ہو کر اس

کی تہذیب و ترقی میں مددگار ثابت ہوسکے، وہ شاعری جو صرف تخیل پر مبنی ہو آج پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ اس میں ہرگز کلام نہیں کہ قدما کا کلام تہذیب و اخلاق، پند و نصائح اور تصوّف کی چاشنی لئے ہوئے ہے اور انسان کو اپنے کردار کی تہذیب و ترقی میں بہت ممد و معاون ثابت ہوئی ہے اور انسان ایک اکائی کے علاوہ اپنے ماحول، اپنے زمانے، اپنے معاشرے کا ایک جزو بھی ہوتا ہے اور انہی مہذب افراد کے مجموعے کا نام سوسائٹی ہے۔

قدیم شاعری اپنے تمام تر اکتسابات و کمالات کے باوجود زندگی کی وہ نمایندگی نہ کرسکی جو اُسے کرنا چاہیئے تھا۔ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ قدیم اُردو شاعری نے اپنے تمام تر تصورات، اصول، مفروضات، اسالیب، حتیٰ کہ اپنا تخیل اور اپنا دستور تک فارسی شاعری سے اخذ کیا۔ فارسی شاعری میں تصوّف کو ایک اہمیت حاصل ہے۔ یہاں مادیت اور آفادیت کا تصوّر کچھ دھندلا سا ہوکر رہ جاتا ہے۔ دراصل فارسی شاعری اشارتی شاعری ہے یہاں سیدھی اور سچی بات ہوتی ہے لیکن سادگی بہت کم نظر آتی ہے۔

چونکہ قدیم ہندوستان پر مغل بادشاہوں، ایرانی تہذیب کے دلدادہ درویشوں کی بالادستی رہی ہے اسی لئے زیادہ سکہ اسی کا چلتا رہا اور تمام تر توجہ کی مستحق وہی قرار پائی۔ اس سے ہٹ کر تقریباً تمام زبانوں کو ضمنی حیثیت حاصل رہی ہے۔ خود اہلِ حکومت کی مادری زبان فارسی رہی ہے، درباری زبان بھی وہی رہی چنانچہ فطری طور پر زیادہ آؤ بھگت اسی کی رہی!

اُردو میں فارسی کے مروجہ اصول، تخلیات، مفروضات و اسالیب بتدریج سرایت کر گئے۔ اور اُردو کو بھی انہی اصولوں اور ضابطوں کا پابند سمجھا گیا، اور برتا گیا جسکی وجہ سے میں گل و بلبل، عشق و عاشقی، چمن و صیاد، ظالم و مظلوم وغیرہ وغیرہ۔ مضامین کثرت سے باندھے گئے یہ سب تو ہوا لیکن ہماری شاعری کو بھی ہما اپنی معاشرت سے، ہماری اپنی تہذیب سے ہم آہنگ باقی تھا۔ جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ادب (خواہ نظم ہو اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے، یا ہونا چاہیئے۔ وجہ یہ بھی ہے کہ جب زندگی کا ایک دستور اپنی تمام تر توانائیوں کو طور پر بروئے کار لا چکتا ہے تو پھر وہ ناکارہ ہونا کافی ہونے لگتا ہے اب اُس نظام کے اندر سے ایک نیا نظا جنم لینے لگتا ہے جو ہمارے تجربوں اور اختراعات وغ کا مجموعہ ہوتا ہے ہم اُسی کو انقلاب کہتے ہیں جب طرز مد اور سیاسی و سماجی حالات میں تبدیلی پیدا ہونے لگتی ہے تو ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، کیونکہ انسان ز میں کوئی تواریخی دور ایسا نہیں گذرا جس کے ادبی اکتسا اسکے مخصوص اور مروجہ اقتصادی اور معاشرتی نظام کی پیدا نہ ہوں۔ لیکن اصلی شعور ہمارے ادبا، و شعرا میں اسی وقت پیدا ہوا جب ان کو ہمارے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کا صحیح اندازہ ہوا، جب حالات بدلے تو قدریں بھی بدلیں اسکے بعد ہمارے ادب میں مادّی ضرورتیں یعنی اقتصادی اصل معاشرتی نظام کی تبدیلی، اور مغربی مفکرین کے اعلیٰ خیا آہستہ آہستہ داخل ہونے لگے، ابتک کی سنی سنائی باتیں گویا ہمارے لئے آسمانی والہامی حیثیت کی ہوگئی تھیں جو سے ہمارے معاشرتی و سماجی کردار میں کوئی خاطر خواہ تبد پیدا نہ کرسکی۔

ان تمام تبدیلیوں کا منبع دراصل غدر اور اس کے آس پاس والا عرصہ ہے۔ یہ ایک ایسا موڑ تھا جہاں سے

کبھی تو ہم اپنے شاندار ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتے اور کبھی مستقبل کی طرف دُور تک نگاہیں دوڑ جاتیں۔ غور و فکر کا یہ غلبہ ہم پر طاری ہوا کہ کس طرح اپنے گرد و پیش کو نظر میں رکھتے ہوئے حالات و ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی راہ متعین کرتے ہیں۔ یہیں سے ہماری شاعری میں نئے نئے رجحانات کی گونج سنائی دینے لگی۔ یہ رجحان اس خیال پر مبنی تھا کہ کس طرح ہم اختیار زمانہ سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ادب کو ہمہ گیر اور زندگی سے قریب کر سکتے ہیں۔ یہ ایک زبردست تحریک تھی جو باقاعدہ تحریک کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔

دراصل شاعری قدیم ہو کہ جدید اپنے معاشرے اور تاریخ سے متاثر ہوتی ہے۔ چونکہ غدر سے پہلے کا زمانہ سیاسی طور پر مطلق العنان طرزِ حکومت کا زمانہ تھا جو بہت اطمینان اور امن و امان کا دَور تھا۔ جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظام پورے معاشرے میں رائج تھا۔ اور عام طور پر لوگ عیش کوشی اور تن آسانی کی فضا میں سانس لے رہے تھے۔

یہ تو ہوا مغلوں کے دَورِ حکومت سے لیکر ۱۸۵۷ء کے ذرا پہلے کا عرصہ۔ لیکن قدیم ادبی سرمایہ اس سے بھی مختلف تھا۔ چونکہ اُردو کی ماں فارسی ہے۔ اسلئے عرصہ دراز تک ہماری زبان فارسی و نیز عربی سے متاثر رہی چنانچہ غزل اسی کی یادگار ہے۔

سوائے چند شعراء کے شعراء کی اکثریت عام طور پر غزل ہی میں زور آزمائی کرتی رہی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ غزل میں بھی صرف انہی روایات کو آگے بڑھاتی رہی جو خاص طور پر فارسی کا ورثہ ہے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو غزل فارسی کے تتبع میں انہی مضامین کو دامن میں سمیٹتی رہی جو عرصے دراز سے فارسی و عربی جیسی قدیم زبانوں میں رائج تھا اس پر ہندوستان کے حالات و معاشرت اور رجحان نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ چنانچہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ جاگیردارانہ طرز معاشرت اور رجحان نے سرمایہ دار طبقہ میں عیش کوشی و تن آسانی کو فروغ کیا۔ اس نے فطری طور پر ہمارے ادب میں اس کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔

اس میں شک نہیں کہ ادب و شاعری کا اپنے معاشرے سے متاثر ہونا فطری عمل ہے لیکن ادب صرف عکاسی یا آئینہ دکھانا ہی نہیں ہے۔ فنکار ایک طرف تو اپنے معاشرے سے متاثر ہوتا ہے اور جو کچھ وہ دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے نہ صرف جوں کا توں ہی پیش کرتا ہے بلکہ اس میں تخیل سے بھی کام لیتا ہے جو شاعری کا اصلی جوہر ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ شاعر کو اپنی ایک آزادانہ رائے بھی دینا ہوتا ہے یعنی اس کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ کہے "یوں ہوا ہے" بلکہ اس کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ "یوں ہوتا تو بہتر تھا" اس طرح شاعر یا ادیب کے دو فرض ہوئے یعنی وہ یہ بھی بتائے کہ "کیا ہو رہا ہے؟" ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ کیا ہونا چاہیئے تھا؟ اس معیار پر اگر ہمارے قدیم ادب کو پرکھا جائے تو ہمیں مایوسی ہی نصیب ہوگی۔

قدیم شاعری سراسر داخلی شاعری رہی ہے اس میں شعراء صرف اپنے ذاتی جذبات و محسوسات کو من و عن بیان کر دیتے ہیں بلکہ اس میں خیال و غلو سے بھی کام لیتے رہتے البتہ غزل میں خصوصاً لکھنؤ اسکول میں کچھ خارجی رجحان کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ خارجیت داغ و امیر و نیز آتش و ناسخ والی خارجیت ہے جس میں معشوق کا سراپا، اس کے حسن کی تعریف حتیٰ کہ اسکے طرزِ ادا، رخسار و زلف اور سراپا تک محدود ہے۔ محترم اعجاز حسین صاحب فرماتے ہیں :-

"اُردو نے آنکھ کھول کر دیکھا تو فارسی ادب

تفصیلات اور وارداتِ حسن و عشق سے کھیل رہا تھا دل کھونا، ہجر میں آہیں بھرنا، تڑپنا، مرجانا، جینا، کبھی کبھار مجاز سے حقیقت تک پہونچنا، اسکے ساتھ ساتھ حسن کی تعریف، اپنی ستم کوشی پر ناز اپنی قوت برداشت کا مظاہرہ، غرضکہ دنیائے عاشقی کے جملہ لوازمات پر نظر پڑی"

موصوف آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"ولی کے وقت یا اس سے پہلے بھی دکن ہو یا شمال جہاں کہیں نظریں جاتی تھیں معلوم ہوتا کہ اردو کا سب سے [illegible] دنیائے محبت (حقیقی ہو یا مجازی) کی سیر کرنا اس کے واقعات و رازہائے سربستہ کا بیان کرنا اور ان سے لطف اندوز ہونا ہی ہے۔"

یہاں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری میں قدیم سرمایہ صرف عشق و محبت کے افسانوں تک محدود رہا۔ قدما کی اکثریت کا میدان تو صرف غزل تھا، اس میں شک نہیں کہ قدما ہی اکثریت میں ایسی ہستیاں بھی تھیں جنھوں نے ان روایات سے انحراف کیا، اور اپنے لئے الگ میدان منتخب کئے ان بزرگوں میں میر انیس و مرزا دبیر کے نام سر فہرست ہیں۔ ان دونوں شعراء نے مرثیہ کو اپنے کمالِ فن کے لئے منتخب کرلیا تھا۔ اس فن میں خوب خوب جولانیاں دکھائیں اور آخرکار اس فن کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا کہ جہاں اُردو زبان فخر سے سر اونچا کر سکتی ہے انکے علاوہ میر حسن نے مثنویاں خوب لکھیں ہیں۔ ان کی مثنوی "بدر منیر" شاہکار نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔ یوں تو اس مثنوی میں بھی عشقیہ مضامین ہیں لیکن کہیں کہیں فطرت کی عکاسی اور شمالی ہند اور خصوصاً لکھنؤ کے طرزِ معاشرت، لباس، رہن سہن اور زبان و بیان رسوم و رواج کا ذکر ضمناً اور جہاں جہاں آگیا ہے اپنے کمال کو پہونچا ہوا ہے انکے علاوہ میر ضمیر، ضاحک نسیم وغیرہ نے نظموں کی طرف توجہ کی اور شعوری طور پر غزل سے دُور رہے۔ جس کے بارے میں ایک جدید انتہا پسند نقاد نے (کلیم الدین احمد) حکم لگایا کہ "اس کی گردن مار دینی چاہیئے" ان شعرا نے مختلف مثنویوں میں مناظر قدرت کے علاوہ کھیلوں، میلوں، تہواروں، محلوں اور معشوقوں علیحدہ علیحدہ متعدد نظمیں لکھی ہیں اس طرح ادب کو مقررہ روش سے ہٹا کر زندگی سے قریب کرنے کی شعوری کوشش کی ہے لیکن اس میں چنداں کامیاب نہو سکے اسکی دو وجہیں تھیں پہلی یہ کہ ایسے شعرا کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ دوسرے ایسی شاعری کو مقبولِ عام کی سند نہیں ملتی تھی۔ کیونکہ تمام معاشرہ میں عشقیہ مضامین باندھنے کا رواج عام تھا۔ میر و سودا کے عہد تک کچھ ایسے رجحانات بھی ہمکو ملتے ہیں۔ مثلاً میر کی ۲ و ۳ مثنویاں خصوصاً مثنوی "نیرنگ عشق" میں مناظر قدرت اور فطرت کی عکاسی کی کچھ عمدہ جھلکیاں ہم کو ملتی ہیں میر کی شاعری کے وہ حصے خصوصاً توجہ طلب ہے مثلاً جس میں میر نے اپنے گھر کا حال بتایا ہے اور غربت و افلاس کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ صحیح تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے وہ ایک ایک چیز کا بیان کرتے ہیں اور اسی خلوص سے کرتے ہیں جو انکی عشقیہ شاعری کا خاصہ ہے سودا کے "شہر آشوب" پر نظر ڈالیں تو یہی خوبی نظر آتی ہے۔ سودا کی ہجویں بھی کچھ کم توجہ طلب نہیں ہے۔ انکی ایک تمثیلی ہجو جو ایک گھوڑے کی تضحیک میں کہا ہے خوب اچھے ڈھنگ سے کی گئی ہے جو کچھ بھی

بہرحال قدما کی یہ ایک شعوری کوشش تھی جو مروّجہ شاعری سے مختلف تھی۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین اپنی تصنیف "نئے ادبی رجحانات" میں اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہیں :۔

"سودا کے عہد تک اردو شاعری کا رجحان غالب عشق و حسن کے کارناموں کو نظم کرنا تھا۔ اشعار میں تاثیر، خلوص، جوش، سادگی سب ہی کچھ ہوتا تھا غزل گوئی کے دائرے سے شعرا کبھی کبھی باہر قدم بھی رکھتے تھے اور بیانیہ شاعری پر توجہ کرتے تھے۔ مثنوی قصیدہ، ہجو، شہر آشوب، واسوخت میں نئے زمانے کے حالات، تو موں کی پستی و بلندی کا راز، تاریخی واقعات، مقامی تہوار، رتقریب کی اہمیت، شکار کی معرکہ آرائی وغیرہ بھی وقتاً فوقتاً نظم کرتے رہے جن میں سے بعض اجزا کئی لحاظ سے قابل قدر ہیں۔"

(نئے ادبی رجحانات)

غدر ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی رہی سہی طاقت بھی جاتی رہی۔ یہ زمانہ سیاسی طور پر انتہائی افراتفری کا زمانہ ثابت ہوا مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت تو گئی ہی تھی اب رہی سہی کسر ان کے فرسودہ خیالات اور رجعت پسندانہ طرز عمل نے پوری کردی۔ یہ انگریزی پڑھنا کفر خیال کرتے تھے اور اپنے ایک محدود دائرہ عمل سے باہر نکلنے کو عار سمجھتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے تمام ترقی پسند تحریکوں کی کھل کر مخالفت کی۔ اور اس تحریک کے چلانے والوں بشمول سرسید کفر کا فتویٰ دینے لگے یہ اب بھی عربی اور فارسی کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے رہنا چاہتے تھے، جواب ٹکسالی باہر ہو چکی تھی۔ انگریزی ملازمت کو باعثِ ننگ و ناموس گردانتے تھے۔

حالی نے ایسے حالات میں سب سے پہلے "مغرب کی پیروی" کا نظریہ پیش کیا، دراصل اس وقت کے حالات و واقعات کے اعتبار سے یہ ایک قسم کا اصلاح نامہ تھا۔ انسان حالات کے ہاتھوں کھلونا ہوتا ہے مجموعی طور پر ایک سوسائٹی سیاست کے ہاتھوں کھلونا ہوتی ہے۔ حالی چیخ چیخ کر یہ کہتے ہیں ؎

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارہ
کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارہ
نہیں پیروی جن کو میری گوارہ
مجھے اُن سے کرنا پڑے گا کنارہ
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حالی کے بعد اردو نظم کو جدید بنانے میں جن لوگوں نے بطور خاص حصہ لیا اُن میں اقبال جوش، احسان، دانش، آنند نراین ملا، چکبست وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ بالکل نئی نسل میں مجاز، اور علی سردار جعفری، وغیرہ مختلف عنوانات میں نئی شاعری کی ترجمانی کرتے رہے اور ادا کر رہے ہیں۔ ہمارے دور کے زندہ شاعروں میں فراق گورکھپوری نے اپنی غزلوں اور رباعیوں میں بڑی لطیف رنگینیاں پیدا کی ہیں اور یہ جدید نسل کے لئے انکی بڑی دین ہے۔

جدید نظم میں یوں تو غزل بھی آتی ہے اور نظم بھی۔ ناٹک بھی اور نوٹنکی، افسانے اور داستانیں سبھی کچھ ترقی پسند ادب میں شمار ہو سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اُن اصولوں اور تصورات کے شعور کے تحت وجود میں آئے ہوں، لیکن ہم یہاں صرف نظم ہی کے تعلق سے گفتگو کریں گے۔

جدید شاعری کی حسب ذیل قسمیں ہو سکتی ہیں:۔

۱۔ وطنی شاعری ۲۔ اخلاقی شاعری
۳۔ سیاسی شاعری ۴۔ نیچرل شاعری
۵۔ مناظر قدرت ۶۔ وصف نگاری
۷۔ قومی شاعری ۸۔ ظریفانہ شاعری
۹۔ تاریخی شاعری ۱۰۔ متفرق نظمیں

اس میں کلام نہیں کہ حالی سے ہماری جدید شاعری کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے لیکن حالی سے پہلے آزاد کو اردو کی کم مائیگی کا احساس ہو چکا تھا، چنانچہ انھوں نے دیکھا کہ اردو ادب کے پاس اسوقت شاعری کے سوا کوئی سرمایہ نہیں تھا جس کی صاف تو بلکہ اس تمدن میں نمایاں تھی جس تمدن کا علاوہ وہ قدیم نظام معاشرت تھا جس کے آب و گل میں ایران کے ربانی حکومت کے تصور کی پرستش شامل تھی اور کچھ انگریزوں کے اصلاحی طرز معاشرت کی جس کی خاتمہ بد نصیبی سے عالمگیر کے عہد کے بعد ہی ہو گیا۔

سب سے پہلے آزاد نے قدیم رنگ سے بغاوت کر کے اصلاحی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ پنجاب میں مناظر قدرت اور مذہبی رنگ میں نظمیں آزاد ہی نے سب سے پہلے لکھیں۔ اُن کا تتبع حالی نے کیا۔ اور آزاد کی پیروی کی۔ اور سب سے پہلے حالی نے جدید طرز پر نظمیں لکھیں۔

آزاد ہی نے سب سے پہلے اردو تذکرہ نگاری کی طرف توجہ کی اور قدیم طرز سے ہٹ کر اس فن میں ایک بالکل نیا انداز اپنایا۔ انھوں نے تفتیش اور تلاش کے بعد اردو کے مشہور و معروف شعراء کی حالات زندگی جمع کئے اور اُس کی روشنی میں تاریخ کی تالیف کی۔ اُن کی "آب حیات" اپنی خامیوں کے باوجود اردو تذکرہ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

آزاد اور حالی کے بدلے ہوئے ادبی انقلاب کیوجہ سے اُردو میں شاعری کے علاوہ معیاری نثر کے نمونے بھی پیش کئے گئے۔ ہم اس دَور کو اصلاحی دَور سے تعبیر کرتے ہیں۔

آزاد کی تقلید میں حالی نے چار نظمیں پنجاب کے مشاعرے میں پیش کیں۔ برکھا رت، حب وطن، انصاف اور اُمید۔ یہ نظمیں قدیم طرز شاعری سے بغاوت کر کے بالکل نئی طرز پر لکھی گئی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حالی نے اپنے دیوان پر ایک مبسوط مقالہ "مقدمہ شعر و شاعری" لکھ کر بالکل پہلی بار اُردو ادب کو شاعری کے معیار سے آشنا کیا۔

آزاد نے اُردو میں تذکرہ نگاری کا باضابطہ آغاز کیا اور حالی نے فن سوانح نگاری کو سب سے پہلے اردو میں رائج کیا۔ ان کی مختلف سوانح نگاریوں میں حضرت شیخ سعدی پر لکھی ہوئی تصنیف "حیات سعدی" اور سرسید کی سوانح "حیات جاوید" کے علاوہ مرزا غالب کی سوانح "یادگار غالب" لکھی۔ ہر چند کہ ان کتابوں کی تالیف کا مقصد خدمت ادب اور فن سیرت نگاری کی اصلاح کے علاوہ اپنے ہیرو کو غیر معمولی انسان ثابت کرنے کی کوشش بھی تھی لیکن اس اعتبار سے کم، وہ سب کے پیش رو ہیں۔ اسکے علاوہ حالی کی اصل غرض و غایت ان سیرت نگاریوں کے ذریعہ قوم و ملک کی خدمت تھی۔ جسکی رہنمائی انکی زندگی کا مشن تھا۔

حالی نے قوم و ملک کے نظریہ حیات و طرز فکر میں انقلاب پیدا کرنیکی کوشش کی۔ جسکی وجہ حالی کی قوم و ملک سے محبت تھی۔ مجموعی طور پر حالی کی زندگی کا واحد مقصد اصلاح تھا۔ اسلئے انکی ہر نثر اصلاحی اور انکی ہر تصنیف اجتہادی ہوتی تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کی نظم و نثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی معاشرت کی خرابیوں پر ان کی نظر رہا کرتی تھی۔

حالی قدامت پسندی کے سخت مخالف تھے اور پرانی

طرزِ شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ محسوس کرچکے تھے کہ قوم کو ایک نئی روشنی کی ضرورت تھی۔ اسلئے قوم کی اصلاح کے جذبہ کے تحت اُن پر ایک قسم کی ایسی بےچینی اور تڑپ سی رہا کرتی تھی۔ جب انکی اس نئی آواز کو شرفِ ممنونِ سماعت نہ ہوتی تو وہ اور تڑپ جاتے۔ ہندوستان کی اس وقت عام فضائے پستی ادب و شعر اور خصوصاً مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ذہنی و معاشرتی پستی حالی کو ہر دم بے اطمینانی کا باعث رہتی۔

حالی ہمارے محترم اور ہمارے ادب و زبان کے بہت بڑے محسن ہیں۔ اُنھوں نے شاعری میں نئے نئے پھول کھلائے ہیں۔ خاص طور پر غزل میں حالی نے اصلاح کی طرف توجہ کی۔ قدیم غزل جس میں صرف تخیل اور تصوف کے مضامین کی کثرت تھی، حالی نے اس کو محض عاشقانہ و متصوفانہ مضامین کے محدود دائرے سے باہر نکالا۔ اور اس میں اخلاقی اور اصلاحی مضامین کو داخل کیا۔ حالی نے غالبؔ سے بہت کچھ لیا۔ وہ اُن کے اُستاد تھے۔ لیکن جیسا کہ حالی نے خود اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے غالبؔ کی اصلاح سے اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جتنا انکی سیرت اور شخصیت سے اثر قبول کیا۔

پھر بھی حالی نے غزل میں اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی جس پر وہ خود چلے اور دوسروں کے لئے راستہ ہموار کیا۔ حالی نے غالبؔ سے حسنِ تخیل، ندرتِ فکر، اور شوخیٔ گفتار سیکھی، جسکی مثال اُن کا دلنشین دردکلام ہے مثلاً ؎

دکھانا پڑے گا ہمیں زخمِ دل
اگر تیر ان کا خطا ہوگیا

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزہ
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

اک عمر چاہیئے کہ گوارہ ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

لیکن اس طرزِ شاعری سے حالی کا دل جلد ہی بیزار ہوگیا عشق و محبت کے جھوٹے ڈھکوسلے جب حد سے گزرنے لگے تو اپنی کہی ہوئی باتوں پر خود انھیں شرم محسوس ہونے لگی چنانچہ جلد ہی اُنھوں نے اس فضول گوئی سے ہاتھ اُٹھایا۔ چونکہ اب حالی میں وہ جوانی کا جوش، اُمنگ، بے تحاشہ کی ترنگ نہ رہی اور پیرانہ سالی نے جب آن گھیرا تو فوراً حالی کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا جب عمر ڈھلی جوانی کا جوش کسی قدر ٹھنڈا ہوا تو ذہن میں بھی اعتدال آیا اور جذبات میں ایک قسم کا توازن قائم ہوگیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعرخوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تونے ہم کو چھوڑا
ہم نے تیری رام کہانی چھوڑی!

سچ تو یہ ہے کہ حالی کی کہی ہوئی یہ رباعی اُن کی زندگی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شروع میں حالی نے جھوٹ موٹ کا عاشق بننا گوارا کیا، اور ایک خیالی معشوق کی چاہ میں ہر وہ حرکت اُن سے سرزد ہوئی جو عشاق کا خاصہ وتیرہ ہے۔ یہ سب کچھ دراصل وہ مروجہ شاعری کے دائرے میں رہ کر کہتے تھے۔ اس دور کے کلام میں ہمیں حالی ہی ایک انفرادی شخصیت تو ملتی ہے۔ لیکن اس حالی کا کوئی نشان نہیں ملتا جس حالی کو ہم جانتے ہیں۔ یا جو بحیثیت حالی آج ہمارے ادب میں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل میں حالی کا ایک خاص مقام ہے اور اُس میں بھی اجمالاً ہمیں وہی خصوصیات ملے گی جو حالی کی اپنی دو

ہے مثلاً سادگی، بلند تخیلی، شدت جذبات وخلوص وغیرہ کیونکہ حالی نے غالب ومیر کا (غزل) میں تتبع کیا ہے انکے اوائل عمر کا کلام زیادہ تر غزل میں ہے لیکن آج ہم اس کو ایک کارنامے کی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

یہ تمام ذخیرۂ شاعری حالی کی اپنی طبعی میدان کا نتیجہ نہ تھا۔ وہ تو بس ایک مروجہ طرز شاعری کو نباہتے رہے لیکن اندر ہی اندر انکی اپنی طبیعت، اسکے خلاف ایک خاموش انقلاب کے لئے تیار ہوتی رہی۔ جب یہ لاوا اندر ہی اندر پک گیا تو سرسید اور آزاد کے ایک ہی نشتر سے پھوٹ گیا۔ اور اچانک قدیم طرز شاعری سے دل ایسا پھرا کہ وہ خود علم بغاوت ہاتھ میں لئے مقابلے کے نئے میدان میں آگئے۔ اب یہاں ان کا سامنا ایک ایسے مد مقابل سے پڑا جس کی جڑیں اپنے طور پر مضبوط ہو چکی تھیں یہیں سے حالی نے غزل خوانی چھوڑی اور نظم اردو اور … کی طرف متوجہ ہوئے۔

ہمارے ادب میں … کی بہت سی حیثیتیں ہیں۔ وہ نقاد بھی ہیں۔ سیرت نگار بھی۔ غزل گو بھی ہیں۔ نظم گو بھی ہیں وہ سادگی کے رسیا اور واقعیت کے امام بھی ہیں۔ اُن کا خلوص شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر حالی ایک مصلح ہیں۔ ایک طرف تو انھوں نے زبان وادب کی طرف اصلاح کا قدم اٹھایا اور اس میں انھیں چنداں کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ قوم و ملک کی اصلاح کا بھی بیڑہ اٹھایا جس میں وہ حتی المقدور کوشش کرتے رہے۔ اور آخر عمر تک اس کام سے نہ ہاتھ اٹھایا نہ ہمت ہاری!

حالی کو اگر کچھ غم تھا تو مسلمانوں کی زبوں حالی اور پستی کا۔ وہ دن رات مسلمانوں کے مسائل میں الجھے رہتے اور غور و فکر میں غرق رہتے۔ لیکن کوئی صورت ایسی نہ نکلتی کہ قوم کے اس کے ماضی کے شاندار کارنامے جتاتے اور غیرت دلاتے تاکہ ان کا حال درست ہو اور مستقبل سنور سکے

آخر سرسید کی ایما پر حالی نے ایک طویل نظم "مسدس" کی شکل میں لکھی۔ نظم کیا تھی مسلمانوں کو ایک سیدھی راہ دکھائی جس میں انکی شان وشوکت اور علم وحکمت کے قدیم طرز یاد دلائے اور آنیوالے مستقبل کیلئے راہ دکھائی۔ قوم جو پرانے خیالات اور قدما کی اندھی تقلید میں مبتلا تھی اور جدید علوم وفنون کو ہیچ گردانتے تھے اس کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

وہ تقویم پارینہ یونانیوں کی	وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی
یقیں جسکو ٹھہرا چکا ہے نکمی	عمل نے جسے کر دیا آکے ردی

اُسے وحی سے ہم سمجھتے ہیں زیادہ
کوئی بات اس میں نہیں کم زیادہ

نتائج جو ہیں مغربی علم وفن کے	وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن وہ ڈالے ہیں پردے	کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے

جمی ہیں دلوں میں ارسطو کی رائیں
جواب بھی وحی اترے تو ایمان لائیں

اب اس فلسفہ پر جو ہیں مرنیوالے	شفا اور مجسطی کا دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پہ سر دھرنے والے	افلاطوں کی اقتدا کرنے والے

وہ تیلی کے بیل سے کچھ کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں

مندرجہ بالا اشعار میں حالی نے قوم کے خیالات وفلسفہ ومنطق پر چوٹ کی ہے جنمیں وہ قدیم یونانی خیالات کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے اور ہر نئی چیز کو انہی پیمانوں سے تولنے کے عادی تھے۔ جدید خیالات کی جن کو ہوا بھی نہیں لگی تھی، بلکہ ہمیشہ ان پرانے اصولوں کی روشنی میں نئے نئے خیالات اور رجحانات کو رد کر دینے کے عادی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زمانہ کی رفتار کو نہ سمجھ سکے اور پستی کی حالت میں پڑے رہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ غلام السیدین :-

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا ※ ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گود میں پل کر اپنے کمال کو پہونچتی ہے اور اپنی خاص قدریں، خاص اصول اور نیک و بد کے خاص سانچے ڈھالتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے۔ جس کے بنانے میں مختلف قوموں، تہذیبوں کا اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے اور اس کا اٹوٹ سلسلہ صدیوں سے قائم ہے قدرت کی فیاضی سے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام یا بہت سی اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہے۔ جیسے اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی جرمنی میں گوئٹے امریکہ میں ابراہیم لنکن۔ ہندوستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد۔ اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گذشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی ہے انھوں نے مشرقی تہذیب اور علوم و فنون کے ماحول میں ابتدائی تربیت پائی۔ مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح ان کی بہترین قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے ان کی خلاق طبیعت نے اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی بہترین قدروں کو بھی اس طرح اپنایا کہ انکی ذات مشرق و مغرب کا ایک حسین سنگم بن گئی۔ اس میں ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی۔ رواداری اور وضعداری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی ذہنی جرأت انسان دوستی علمیت اور عوام کی بیداری کا جلوہ کارفرما تھا۔ اسطرح انکی ذات ماضی اور حال کے درمیان مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پُل کا کام کرتی تھی۔ وہ ایک زبردست عالم دین تھے۔ لیکن ملا کی تنگ نظری سے آزاد فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن کبھی اسکی موشگافیوں میں راستہ نہیں بھٹکتے انکا مسلک یہ تھا۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشۂ نظر کا فساد

انکے نزدیک مذہب و فلسفہ، سائنس سیاست سب کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈھالے اور اس غرض کیلئے اپنی جسمانی ذہنی اور روحانی قوتوں کو فروغ دے۔ انکی زندگی میں دین و دنیا کی تفریق نہ تھی دونوں میں حق پسندی اور شرافت کے اصولوں کی کارفرمائی تھی وہ ایک پختہ کار اور بیدار مغز سیاست دان تھے لیکن ان تمام ریشہ دوانیوں اور گھٹیا چالوں سے بلند جن کے ذریعہ بہت سے سیاستداں کھیل کھیلنے والے اپنی قوت و اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم اور ملک کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی تھی۔ لیکن اسکے لئے کبھی اشتہار بازی کے طریقوں سے کام نہیں لیا وہ کبھی عوام کی سطح پر نہیں اُترے بلکہ محبت اور رواداری سے ساتھ انھیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرتے اور جب کبھی وہ

راستے میں بھٹکا ابر… مولانا کی طرف سے انھوں نے بدگمانی یا [illegible] مولانا صراط مستقیم پر چلتے رہے اور معلمی اور ہدایت کے فرائض کو یکسوئی اور دل سوزی کے ساتھ انجام دیتے رہے سیاست کے طوفان آئے زلزلوں نے پہاڑوں کے ثبات قدم کو لڑکھڑا دیا لیکن یہ مرد مجاہد یہ کوہ وقار مومن اپنی جگہ پر اپنے اصولوں پر اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا۔ اس شان کے ساتھ کہ نہ ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا۔ اور نہ مخالفوں بدباطنوں کی ملامت کا خوف اور شکوہ انکی دریدہ دہنی اور بدزبانی کو اس طرح برداشت کیا کہ پیشانی پر بل تک نہ آیا زیادہ سے زیادہ کہا تو اتنا کہا کہ یہ کیسے نا عاقبت شناس ہیں؟ یعنی نہیں جانتے نہیں سمجھتے کہ انکی حرکتوں کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔ انکے دل میں کینہ [illegible] تھی۔ انھوں نے کسی جگہ ظہوری کا یہ شعر نقل کیا ہے جو انکے قلب صافی کا نقشہ بھی کھینچتا ہے ؎

شد از سینہ ظہوری پر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

ان کا پیغام قوم کے لئے یہی تھا کہ انکی شرافت کا ساتھ دو اور برائی و بے انصافی کے ساتھ رشتہ نہ جوڑو۔ خدا کی رسی کو جو حق و صداقت کی رسی ہے جو ستیہ کا راستہ ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور خود انھوں نے عمر بھر کبھی اس حبل المتین کو اس مضبوط رسی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی غلط اور بے انصافی میں اپنوں کا ساتھ نہیں دیا۔ کبھی صحیح اور سچی بات میں غیروں سے پہلوتہی نہیں کی۔ انکے لئے اپنے وہی تھے جو انکے اصولوں سے واقف ہوں۔ اور غیر وہ جو ان اصولوں کی مخالفت کریں۔

قدرت نے ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے اور انکا ناخن تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی حال دفتر کے کاموں کا تھا ہم لوگ معاملہ کی جزئیات میں الجھتے۔ موافق اور مخالف دلیلوں کا فریب کھاتے۔ لیکن ان کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفس معاملہ تک پہونچ جاتی اور وہ واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ ان کا دل اتنا فراخ تھا اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ [illegible] ایوان انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھا۔ وجہ سے ان پر تمام اقلیتوں کو پورا پورا بھروسہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا انکے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے انکی زبان سے کسی شخص کی [illegible] کہ فلاں چھوٹے دل اور دماغ کا آدمی ہے یعنی انکے نزدیک دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلت ہے۔

انھوں نے جنگ آزادی کے زمانے میں اس تحریک [illegible] سرفروشی کی۔ قید و بند کی مصیبتوں اور قربانی و ایثار کی زہر کو شہد کا گھونٹ بنا کر پیا۔ لیکن جب آزادی حاصل ہو گئی تو انھوں نے اپنی ساری قوت اور توجہ اس بات پر دی کہ قومی زندگی صالح بنیادوں پر قائم ہو جب کبھی کوئی نازک وقت یا مشکل مقام آیا جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شاید مصلحت کی کشش انصاف اور دیانتداری پر غالب آ جائے تو انکی اصول پرستی، جرأت اور حق گوئی نے سد سکندری کا کام دیا۔ اور مصلحت پرستی کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے [illegible] نے انکو قوم کے ضمیر کا خطاب دیا تھا یعنی اس میدان پر انھوں نے اس فرض کو اٹھایا تھا جو گاندھی جی انجام دیتے تھے۔

ناواقف لوگ انکو عام جلسوں یا سرکاری تقریبوں اور دعوتوں میں دیکھتے تو خیال کرتے کہ شاید مولانا آزاد سیاست کے مرکز سے دور ہو گئے ہیں لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ ہر مقام اور زمانے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ جب کانگریس آزادی کی جنگ کر رہی تھی مولانا اسکے ایک آزاد رکن اور صدر کی حیثیت سے طوفان کے مرکز میں رہے آزادی کے بعد انھوں نے اپنے لئے ایک دوسری شاہراہ عمل متعین کر لی تھی جس پر چل کر وہ ملک کی خدمت اور رہنمائی کر سکتے تھے۔ بیشک اب وہ ہر لحاظ سے گوشہ

(باقی صفحہ … پر)

پروفیسر امین چند شرما :

محمد حسین کلیم

محمد حسین نام اور کلیم تخلص تھا[5] دہلی وطن تھا [illegible] نظم و نثر دونوں پر قادر تھے [illegible] ریختہ کے شعر دار تھے[5] عربی فارسی [illegible] [illegible] کہتے تھے عربی تصوف کی [illegible] کی [illegible] ابن عربی کی مثنوی زمین [illegible] ترجمہ کیا تھا[6] عروض و قافیہ پر [illegible] رسالہ [illegible] [illegible][5] تا [illegible] ہندی عروض و قافیہ [illegible] [illegible] بھی ایک کتاب لکھی [illegible] [illegible] کتاب ہے درنثر ہندی نیز ایجاد [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] ہوتی ہے کیونکہ فضلی [illegible] [illegible] ہیں مصنف کی کتی میں کتاب [illegible] بادشاہ دہلی کے نابینا کیے جانے کے بعد [illegible] [illegible] دیوان نایاب ہے[5]

میر حسن کی [illegible] کلام بے نمک رہا اسی [illegible] قبول [illegible] مل سکی[9]

[illegible] کہ مرزا [illegible] [illegible] [illegible] ہے اُن کا تخلص [illegible] ایک خاص طرز کے موجد تھے اُن [illegible] اُن پر ختم ہو [illegible] مختلف اصناف سخن [illegible] کا [illegible] ہے[11] اُن کی طبیعت میں [illegible] [illegible][11]

[5] [illegible] اُردو ادب کی جدید تاریخ نسیم قریشی صفحہ ٦٩ [illegible] [illegible] عبدالشکور رشید صفحہ ١٣١ ۔ گلِ رعنا عبدالحئی صفحہ [illegible]

[6] گلِ رعنا عبدالحئی صفحہ ١١١

[7] تذکرہ میر حسن صفحہ ١٣٨ / گلِ رعنا عبدالحئی صفحہ ١١١

[illegible] سخن عبدالشکور رشید صفحہ ١٣١ / تاریخ ادب اردو عسکری صفحہ ١١٢

[4] تذکرہ میر حسن صفحہ ١٣٨ / تاریخ ادب اُردو عسکری صفحہ ١١٢ / اُردو ادب کی جدید تاریخ نسیم قریشی صفحہ ٦٩۔

[5] تذکرہ میر حسن صفحہ ١٣٨ / ایضاً صفحہ [illegible]

[6] ایضاً صفحہ ١٣٨ / اُردو ادب کی جدید تاریخ نسیم قریشی صفحہ ٦٩

[7] گلِ [illegible] عبدالحئی صفحہ ١١٢ [8] گلِ رعنا عبدالحئی صفحہ ١١٢

[9] تذکرہ میر حسن صفحہ ١٣٨ / اُردو ادب کی جدید تاریخ نسیم قریشی صفحہ ٦٩۔

[10] گلِ رعنا [illegible] صفحہ ١١٢ - ١١٣ / نکات الشعرا میر تقی میر صفحہ ٣٢ / [illegible] نسیم قریشی صفحہ ٦٦

[11] گلِ رعنا [illegible]

[12] اردو ادب کی جدید تاریخ نسیم قریشی [illegible]

صاحب نکات الشعرا کی رائے ملاحظہ کیجئے :-

" اگرچہ کلیم در فارسی گزشتہ است اما کلیم ریختہ بیش فقیر اینست۔ قطع نظر از انکہ بندہ را بخدمت او قرابت قریبہ است یک اخلاص تہ دلی دارم و اکثر بحال این ہیچمدان شفقت فرمایدہ[1]"

ان کے بارے میں میر حسن کی رائے بھی لطف سے خالی نہیں ہے۔

" درفنِ شعر وشاعری استادِ سخن بحرزِ خار طبعش در نثر و نظم موجزن۔ رسالۂ در عروض و قافیۂ ہندی تصنیف نمودہ و فصوص را کہ کتاب عربی ست بزبانِ ریختہ ترجمہ کردہ۔ کتابے در نثرِ ہندی نیز ایجاد نمودہ[2]۔"

رباعیات پر تبصرہ:

کلیم کی رباعیات کی ممتاز خصوصیت ان کا زورِ بیان اور سلاست ہے۔ مضامین عام طرز کے ہیں۔

ذیل کی رباعی میں کلیم نے درویش کی تعریف جس رنگ میں کی ہے اور دنیا داری کا جس خوبی سے نقشہ کھینچا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے ۔

دنیا کے ہاتھ سے جو دل ریش ہیں ہم
اس واسطے یاں عاقبت اندیش ہیں ہم
دنیا داری و نوکری محنت و کسب
جب کچھ نہ بنا کہا کہ درویش ہیں ہم[3]

کلیم نے عشقیہ رندانہ کی غمازی ایسے مؤثر پیرایہ میں کی ہے کہ عاشق بیچارہ اپنے دل کی بازی لگا کر صنم کے کوچہ سے الوداع ہوتا ہے۔ ہجر دماغی انتشار و قلبی بے تابی کا موجب ہوتا ہے۔ سچا عاشق اپنا دل صنم کے سپرد کرکے خود ہراساں و پریشاں رہتا ہے۔ اس کی زندگی ایک تلخ داستان ہو کر رہ جاتی ہے۔ عاشق کے احساسات کی عکاسی کا لطیف انداز ملاحظہ کیجئے ؎

گلرو تو چمن میں اچپلی سے نہ گیا
یہ دل بھی کلی سے بے کلی سے نہ گیا
جو کوئی گیا دل کو گیا چھوڑ یہاں
دل سے تو کوئی تری گلی سے نہ گیا[4]

ذیل کی رباعی میں بھی عشق کا رونا ہے۔ معشوق سراپا حسن کا پتلا ہے۔ نقاشِ ازل نے اس کی تصویر کشی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ صنم کا ہاتھ اتنا نازک اور خوبصورت ہے کہ اس کی خاطر مہندی کا دامن داغدار ہو گیا ہے۔ یہ ہے نازک اندامی کا کمال اور حسن کا بے پناہ جادو جس کی وجہ سے عاشق لٹو ہوتا ہے ؎

ہر چند لگاتے ہیں بتاں گل مہندی
تیرے ہی قدم تلے گئی رُل مہندی
ہیہات کہ کس طرح کا ہوگا وہ ہاتھ
جس ہاتھ ستی داغ ہوئی گل مہندی[5]

دوسری جگہ معشوق کے حسن اور اپنی وفاداری کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر معشوق اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دے تو پھول اپنے رنگ و بو پر ناز کرنا چھوڑ دیں ؎

نقاب اپنے رُخ کا جو تو باز کرتا
تو گل اپنی خوبی پہ کیا ناز کرتا
وفا کا ہوں پابستہ نہیں توڑ پنجرا
چلا جاتا جنگل کو پرواز کرتا[6]

---

[1] نکات الشعرا میر تقی میر صفحہ ۴۲
[2] تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۳۸
[3] تذکرہ سرور ؍؍ ۵۲۸

[4] تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۴۰ [5] تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۴۰
[6] نکات الشعرا میر تقی میر صفحہ ۴۳

مضمون بھی ملاحظہ کیجئے کہ معشوق کے سیرِ گل گشت کے لئے باغ میں نہ آنے سے عجیب ویرانی کا عالم پیدا ہوگیا ہے شمشاد خم ہے۔ قمری گردن میں طوق ڈالے ہوئے ہے۔ باغ کی روشیں زلف کی مانند برہم ہیں۔ حسن تعلیل سے شاعر نے عجیب لطف پیدا کیا ہے ؎

تو نہ آیا باغ میں شمشاد غم سے خم ہوا
طوق قمری کا فغاں سے حلقۂ ماتم ہوا
کس پریشاں میں قدم رکھا ہے پیچ و تاب سے
جادہ آتا ہے نظر جوں زلف کچھ برہم ہوا[لہ]

شاعر ضعف کا حال بیان کرتا ہے کہ وہ باغ میں ضعف کی وجہ سے ایسا گم ہوگیا ہے جیسے بوئے گل۔ رنگِ گل اس کے سراغ میں ہے وہ ایک مشتِ خاک ہے اور ہمہ داغ داغ ؎

ہم گم ہوئے ہیں ضعف سے جوں بو میانِ باغ
پھرتا ہے رنگِ گل کہ ہمارا کرے سراغ
جو کعبتین گھر میں مرے گل ہی ہے بساط
یک مشتِ استخواں ہوں و رشش جہت سے داغ[لے]

غرض یہ کہ کلیم کی چند رباعیات جو ہمدست ہوئی ہیں ان سے ان کے زورِ بیان اور سلاستِ زبان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

لہ نکات الشعرا میر تقی میر صفحہ ۴۵
لے " " " صفحہ ۴۶

باقی مضمون صفحہ ۲۶

تھے۔ لوگوں سے کم ملتے جلتے تھے۔ لیکن ان کی انگلیاں قوم کی نبض پر تھیں اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا کرنا چاہیئے۔ اس زمانہ میں ان کی شان یہ تھی ؎

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

اور سب کی رفاقت کا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے بنانے والے نے ان کو یاد کیا اور وہ اس کا نام لیتے تھے اس کے حضور میں پہونچ گئے تو نہ صرف لاکھوں دلی والوں کی بلکہ کروڑوں ہندوستانیوں عقیدت اور محبت صبر اور ضبط کے بندھن توڑ کر اُمنڈ پڑی اور باہمی فرقوں اور اختلافوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموش اور بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ میں نے اس جمِ غفیر میں جو ۲۲ فروری کو ان کے مکان کے گرد جمع تھا ایک بوڑھے سکھ کو یہ کہتے سنا۔ ارے تمھیں کیا معلوم ہے "آزاد نے تو بادشاہت کی ہے بادشاہت"۔ ایک معنی میں یہ بالکل صحیح ہے وہ دل و دماغ کے بادشاہ بھی تھے۔ اور حکومت کی پالیسی بنانے اور ڈھالنے میں ان کا جو حصہ تھا اور ان کے ساتھی ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے اس کے پیشِ نظر اس بوڑھے کا یہ قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بادشاہ جس میں ایک طرف انتہائی خودداری اور خودی کا احساس تھا جو کبھی کسی قوت کے سامنے سر نہ جھکاتا تھا ایک فقیر بھی تھا۔ فقیر اقبال کی اصطلاح میں یعنی ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

اسی وجہ سے ان کے ہاں فقیر و شاہی کے ڈانڈے مل جاتے تھے اور دل پکار اُٹھتا تھا ؎ نہ تخت و تاج میں، نے لشکر سپاہ میں ہے

جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اس فقیر کے پاس متاعِ دنیا میں سے بہت کم تھا ——

آر۔ جے۔ بیگم

شمع خاموش

آفرین باغ میں ایک سایہ دار پیڑ سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں غرق تھی کہ پیچھے سے آ کر شاہدہ نے اس کی آنکھیں موند لیں۔ آفرین خیالات کی دنیا سے چھلانگ لگا کر ہوش و حواس کی دنیا میں آ گئی اور سوچنے لگی اس وقت کون آ گیا ہاتھوں کو ٹٹول کر دیر تک پہچاننے کی ناکام کوشش کرتی رہی پھر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔ کون ہے میں نے ہار مانی ہاتھ ہٹاؤ میری ساری دنیا تاریکی سے گھٹی جا رہی ہے ایک قہقہے کے ساتھ شاہدہ نے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دی اور آفرین سے لپٹ گئی۔

آفرین: ارے تو میری شاہدہ کب آئی تجھے میں بہت یاد کر رہی تھی سسرال جا کر تو بالکل بھول گئی ہے مروت کہیں کی

شاہدہ:۔ بھولی کہاں میری آفو دیکھ میں گھر آتے ہی سیدھی تیرے پاس آ گئی۔ کہو کیسی رہیں تم، یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے پہلے والی آفرین کہاں ہے؟

آفرین:۔ وہ تو بہت عرصہ ہوا ختم ہو گئی تم کس آفرین کی بات کر رہی ہو۔

شاہدہ: مگر کیوں اور کیسے؟

آفرین: زمانہ اور قسمت کے ہاتھوں۔ خیر چھوڑو اس ذکر کو پہلے یہ بتاؤ کہ تیری کیسی گذری دولہا بھائی کیا کہتے ہیں۔ تو تو خوب لگتا ہے کہ موجیں کر رہی ہے۔ محبوب کا تیرے ساتھ کیسا رویہ ہے۔

شاہدہ: بہت ٹھیک میرا گھر میری جنت ہے اور جناب ہو میرے۔ چمن میں ایک ساتھ دو پھول کھلے ہیں

آفرین: مبارک ہو بہت جلد باری سے کام لیا۔ اندر بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں۔ یہ کہہ کر دونوں ڈرائنگ روم کی طرف چل دیں۔ شاہدہ جاتے ہی صوفے پر دراز ہو گئی۔ آفرین پاس بیٹھ کر اس کا سر بڑی محبت سے سہلاتے ہوئے کہنے لگی۔ جب ہی نقاہت کا یہ عالم ہے کہ بیٹھا نہ گیا تم نے تو حد کر دی ان کو اپنے ساتھ کیوں نہ لائیں۔

شاہدہ:۔ اسی کے پاس چھوڑ آئی اس لئے کہ پھر تم سے بات کرنا بھی دشوار ہو جاتا بہت ہی شریر ہیں۔ پہلے اپنی سناؤ کہ یہ سناٹا اور سکوت کیوں گھر میں برس رہا ہے اور اتنی شوخ اور شرارت سے بھری آفرین اتنی

سمجھ نا کیسے بن گئی۔ کالج کی شریر آفرین تم کو کیا
ہو گیا۔ کیسی چوٹ لگی کہ جس نے تمکو یکسر بدل دیا۔

آفرین:۔ یہ تیرا وہم ہے مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ تم
کو دیکھ کر ماضی کا ہر وہ دور سامنے آ گیا جس کو
میں بھول جانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

شاہدہ:۔ کیوں کیا ریاض سے تمھاری ٹھن گئی وہ تو تم کو
بہت چاہتا تھا۔ کالج میں ہر لڑکی اس سے محبت
کرنے کی راہیں تلاش کرتی تھی مگر وہ سوائے تمھارے
کسی کو لفٹ نہیں دیتا تھا۔

آفرین:۔ اس کی اسی محبت کو تو میں بھول جانا چاہتی ہوں۔

شاہدہ:۔ مگر کیوں بھول جانا چاہتی ہو کیا مجھ سے بھی
چھپاؤ گی۔ جس کو آج تک [illegible] معلوم ہے [illegible]
تین سال میں کچھ پتہ نہیں کیا کیا ہوا۔

آفرین:۔ نہیں شاہدہ میں خود بھی تم سے کہنے کے لئے
بیقرار ہوں۔ عجیب سی گھٹن ہے جو مجھے پریشان کئے
رکھتی ہے ایسا ہے کہ جب میں اور ریاض ایک روح
دو قالب بن گئے تو میں نے اس سے کہا کہ تم میرے گھر
پیغام بھیجو۔ میں امی کو راضی کروں گی۔ جب ریاض
کی والدہ نے پیغام دیا اور ایک روز خود وہ بھی
تشریف لائیں اور انھوں نے بتایا کہ ریاض یونیورسٹی
میں آفرین کا کلاس فیلو ہے اور دونوں ایک دوسرے
کو پسند کرتے ہیں تو ہم لوگوں کو ان کی مدد کرنا چاہیئے
اپنے بچوں کی زندگی سنوارنا ہم لوگوں کا فرض ہے
میری امی نے ان کو اطمینان دلایا میں آفرین کے
والد سے ذکر کروں گی جیسا وہ کہیں گے میں آپکو مطلع
کر دونگی۔ جانتی ہو ابا نے کیا کہا انھوں نے جواب
دیدیا کہ میں ایسے لڑکوں کو پروان نہیں چڑھا سکتا۔

ریاض اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور وہ یونیورسٹی
چھوڑ کر پاکستان چلا گیا اور میں شمع خاموش کی طرح
جل کر جلتی رہی اور ریاض کے انتظار میں جلتی رہونگی۔

شاہدہ:۔ کیا ہو گیا تھا ماموں جان کو میں ہوتی تو تمھاری
مدد ضرور کرتی خیر تم فکر نہ کرو۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے
گا کرونگی۔ مگر ریاض لاہور میں ہے یا کراچی میں
کوئی خط بھی تم کو لکھا کیا کر رہا ہے اب؟

آفرین:۔ لاہور میں اپنے کسی عزیز کے یہاں تھے بہت
دنوں سے کوئی خط نہیں آیا۔ معلوم نہیں کس حال
میں ہوں۔

شاہدہ:۔ تمہارا [illegible] میں معلوم کروں گی جب میں
[illegible] تم کو کچھ لکھنا چاہیئے تھا۔ چائے
[illegible] باتوں میں ٹال دو گی آفرین چائے پینے
چلی جاتی ہے۔

شاہدہ چائے پی کر اپنی ممانی کے پاس جا کر ان کی
خیریت معلوم کرتی ہے اور باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم کر لیتی
ہے کہ آفرین کی شادی کب اور کس کے ساتھ کر رہی ہیں۔

زینب بیگم:۔ ایک رشتہ تو اچھا بھلا تمھارے ماموں نے
رد کر دیا کیا بتاؤں۔

شاہدہ:۔ کونسا رشتہ ممانی جان۔ کیا کوئی بات چل کر
کسی وجہ سے ختم ہو گئی۔

زینب بیگم:۔ ہاں تمھارے ماموں جان کی ضد کے آگے
کسی کی کیا مجال انجینیر صاحب کا اکلوتا بیٹا ریاض
جو کہ آفرین کے ساتھ ہی پڑھتا تھا بیٹی تجھے تو
معلوم ہی ہوگا وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت
پسند کرتے تھے جب سے یہ رشتہ ٹوٹا آفرین ایکدم
خاموش سی ہو گئی اور ریاض یونیورسٹی چھوڑ کر

پاکستان چلا گیا اب ان کو فکر ہے کہ جلدی آفرین کے ہاتھ پیلے کردیں مگر اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں ۔

شاہدہ :۔ میں جلدی واپس جاؤنگی آپ فکر نہ کریں کسی اچھے رشتہ کے لئے میں مجیب صاحب سے کہونگی وہ کسی لڑکے کا ذکر بھی کر رہے تھے جو ان کی فرم میں مینیجر ہوکر ابھی آیا ہے۔ شام کو شاہدہ چلی گئی اس کا اپنے بچوں میں دھیان لگا تھا۔

آفرین ہر رات ریاض کی یاد کو دل میں لے کر سوجاتی اور صبح اسی کا تصور لے کر اٹھتی تھی۔ اسی طرح دن گزرتے رہے شاہدہ نے جس رشتہ کا ذکر کیا تھا پاکستان جاکر فوراً بھیجا رشتہ آفرین کے والد نے منظور کرلیا حالانکہ اتنی دور اپنے لخت جگر کو نہیں بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اچھا رشتہ ملنا بہت دشوار تھا اس لئے راضی ہوگئے گھر میں شادی کی چہل پہل تھی اور آفرین خاموشی کا قفل زبان پر ڈالے خاندان کے لئے قربان ہو رہی تھی مگر اس غم میں وہ پیلی پڑ گئی تھی بہت جلد وہ دن بھی آگیا جب باجوں کے ساتھ دولہا آنے والا تھا آفرین کو سجاکر دلہن بنایا گیا اور رسم نکاح ہوئی ریاض کا نام سن کر اس کے دل کو دھکا سا لگا بیساختہ ایک آہ اس کے لبوں پر آگئی پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی صبح ہوتے آفرین کا ڈولا اپنے دولہا کے گھر کی طرف جارہا تھا اور اس کا دل ریاض کی یاد میں آنسو بہا رہا تھا بہت جلد ڈولا اپنی منزل پر پہونچ گیا دولہا کو سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آرام کرنے کے لئے دوپہر کو اس کو اس کے کمرے میں پہونچا دیا گیا جہاں پہونچتے ہی آفرین کو پھر ریاض کے خیال نے آکر گھیر لیا۔ وہ بیٹھی ہوئی دل سے باتیں کر رہی تھی۔ کیا تو ریاض کے علاوہ دل میں کسی دوسرے کو جگہ دے سکے گی۔ مالک یہ بہت سخت امتحان ہے تو ہی بتا کہ میں کیا کروں اتنے میں کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی آفرین جلدی سے سمٹ کر بیٹھ گئی دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا آنے والے نے آتے ہی پاس بیٹھ کر گھونگھٹ الٹ کر ٹھوڑی پکڑ کر آفرین کا چہرہ اوپر اٹھایا اور بولا میری آفو ادھر دیکھو تمھارے سامنے کون ہے آفرین نے ریاض کی آواز پر بیساختہ آنکھیں کھول دیں اور لپٹ گئی، ریاض تم !!

اردو کے مایۂ ناز ادیب اور انشاء پرداز

مہدی افادی مرحوم کی بہترین اور دلکش

یادگار

صحیفۂ محبت

بیگم مہدی صاحبہ کے نام مرحوم کے خطوط کا مجموعہ جسے ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی

نے

ایک گرانقدر مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے

اور اس گراں بہا متاعِ محبت کو شائع کرنے کا فخر

ادارۂ فروغ اردو کو حاصل ہو گیا ہے

جلد طلب فرما دیں　　قیمت پانچ روپیہ

مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو

مصنفہ غلام احمد فرقت کاکوروی

جس میں غالب کے اشعار کی مزاحیہ انداز میں تشریح کی گئی ہے

بڑی دلچسپ کتاب ہے — جلد طلب فرمایئے

تقریباً .. صفحات　　قیمت آٹھ روپیے

قدمچے

جس میں جدیدیوں کی ادبی دولتیوں کے جواب میں ایسی منظوم بین الاقوامی دولتیاں رسید کی گئی ہیں کہ جب بھی پروائی ہوا چلے گی اس کا کھانے والا استغفار پڑھتا نظر آئے گا۔ اس کتاب کو فرقت کاکوروی نے ان بچوں کے نام معنون کیا ہے جو قدمچے پر بیٹھ کر خود سے باتیں کرتے ہیں۔

قیمت :- پانچ روپیہ ۵

ذوق و جستجو

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

کے

تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ

جو انشاء عالیہ ہی کا گرانقدر نمونہ نہیں بلکہ اس کے ذریعہ اردو ادب کی تاریخ کے بھی بہت سے گوشے منور ہو گئے ہیں

جلد طلب فرمایئے

قیمت :- بارہ روپیہ ۱۲ پچاس پیسہ

گلبانگ حرم

(مصور) (جدید اڈیشن) زائر حرم حمید مرحوم لکھنوی کی تازہ ترین جدید اضافوں کے ساتھ نعتیہ نظموں کا مجموعہ گلبانگ حرم مع تصاویر مقاماتِ مقدسہ جس کی اشاعت کا فخر بحمدہٖ

— ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کو حاصل ہے — قیمت پانچ روپیہ

دوسرا مجموعہ : لسانِ حرم بھی ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے شائع کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے — قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

مطبوعات ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت) (ا)

۱۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر۔ ڈاکٹر محمود الحسن رضوی — ۱۲/-
۲۔ لمعۂ ہیم نیر۔ فروغ اُردو۔ اقبال صدیقی — ۳/۵۰
۳۔ انوار اللغات اُردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین — ۴/-
۴۔ ادبی تاثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/۵۰
۵۔ آئینۂ عقل۔ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری — ۴/۵۰
۶۔ اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی — ۴/۵۰
۷۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۳/
۸۔ انارکلی ۔ امتیاز علی تاج — ۲/۲۵
۹۔ اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ پروفیسر کلیم الدین احمد — ۶/-
۱۰۔ اُردو میں تنقید۔ ڈاکٹر احسن فاروقی — ۳/-
۱۱۔ انتخاب قصائد اردو مغیث الدین زیدی — ۱/۵۰
۱۲۔ ادب اور نظریہ ۔ آل احمد سرور — ۵/-
۱۳۔ اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبد الشکور — ۴/۵۰
۱۴۔ ادبی نقوش ۔ شاہ معین الدین احمد ندوی — ۵/-
۱۵۔ اقبال ۔ مرتبہ فروغ اُردو — ۰/۵۰
۱۶۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں عبد الماجد دریابادی — ۴/۵۰
۱۷۔ البرامکہ اور ان کا عروج و زوال ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے — ۲/-
۱۸۔ انتخاب کلام میر مع مقدمہ۔ ناظر کاکوروی — ۱/-
۱۹۔ انتخاب کلام غالب ۔ بشیر احمد علوی — ۱/۵۰
۲۰۔ ادبی تنقید ۔ ڈاکٹر محمد حسن — ۴/۵۰
۲۱۔ انتخاب قصائد و غزلیات (فروغ اُردو) — ۴/-

۲۲۔ ادب کیا ہے ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی — ۲/۵۰
۲۳۔ ادبی خطوط غالب ۔ مرزا محمد عسکری — ۶/-
۲۴ آئینۂ نثر اُردو ۔ سعادت علی صدیقی — ۲/-
۲۵ ایک نادر روزنامچہ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی — ۲/۵۰
۲۶ ابو الخیر ۔ مجنوں گورکھپوری — ۰/۷۵
۲۷ اُردو کی کہانی ۔ سید احتشام حسین — ۱/۵۰
۲۸ ادب پارے حصہ نظم و نثر " " — ۴/۷۵
۲۹ انتخاب نثر جدید " " — ۴/-
۳۰ ابوالکلام آزاد (نظم) جگناتھ آزاد — ۰/۲۵
۳۱ ارمغان نثر و نظم۔ عبد الاحد خاں خلیل — ۲/۰۵
۳۲ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو — ۱/۵۰
۳۳ اچھی نظمیں ۔ اخگر مشتاق — ۰/۵۰
۳۴۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید اڈیشن۔ غلام احمد فرقت — ۱۲/-
۳۵ اُردو شاعری ۔ امیر احمد علوی — ۰/۵۰
۳۶ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ — ۰/۵۰
۳۷ غزلیات حافظ صائب، غالب فارسی — ۲/۵۰
۳۸ اپنی پہچان پوری زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب ۔ اعجاز احمد فاروقی — ۱/۲۵
۳۹ اللہ کے پیارے ۔ امیر حسن نورانی — ۰/۵۰
۴۰ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو — ۱/۵۰
۴۱ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی۔ عبد الماجد دریابادی — ۱/۲۵
۴۲ اسپین کی شہزادی ۔ صادق سردھنوی — ۲/۵۰
۴۳ ایک جان تین قالب ۔ خاں محبوب طرزی — ۲/-
۴۴ اُلفت " " " — ۵/۵۰
۴۵ آغاز سحر " " " — ۲/-
۴۶ امین آباد " " " — ۲/-
۴۷ اپنی موج میں ۔ آوارہ — ۲/۵۰
۴۸۔ انوار جدید خط و کتابت۔ خلیق احمد علوی — ۰/۴۵

۴۹ انگاروں کی باتیں ـ مصطفےٰ احسن رضوی ۲/-
۵۰ اچھی کہانیاں (حصہ اول) شمس الدین نوری ۰/۳۰
۵۱ (حصہ دوم) " " ۰/۳۰
۵۲ (حصہ چہارم) " " ۰/۵۰
۵۳ ادب کا مقصد ـ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۳/-

(ب)

۵۴ بابائے اردو عبدالحق ـ عبداللطیف اعظمی ۵/-
۵۵ بستانِ حرم (جدید نعتیہ کلام) زائر حرم حمید صدیقی ۱/۵۰
۵۶ شہید نسبت یوٹا سنگھ ـ خان محبوب طرزی ۴/-
۵۷ بزمِ بے تکلف ـ ڈاکٹر سید عابد حسین ۲/۵۰
۵۸ برگِ گل شبلی نعمانی ۰/۴۰
۵۹ بہادر شاہ ظفر امیر احمد علوی کاکوروی ۵/۵۰
۶۰ بہشتی ثمر (اول و دوم یعنی خلاصہ بہشتی زیور) مولانا تھانوی ۳/-
۶۱ بانی اسلام (علامہ محی الدین) کی تاریخ کا اردو ترجمہ ۰/۷۵

(پ)

۶۱ پطرس کے مضامین ـ پطرس بخاری ۱/۵۰
۶۲ پیاری باتیں محسن کاکوروی ۰/۴۰
۶۴ پھولوں کا انبار (ناول) منظر سلیم ۴/۵۰
۶۵ پیسہ اور پرچھائیں (مجموعہ ڈرامہ) ڈاکٹر محمد حسن ۳/۵۰
۶۶ پاگل خانہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۳/۲۵
۶۷ پیغام " طاہر ویانپوری ۳/-
۶۸ پنجاب میں اردو حافظ محمود شیرانی ۴/۵۰
۶۹ پردیسی کے خطوط (حصہ اول) مجنوں گورکھپوری ۲/-

(ت)

۷۰ تاریخ ادب اردو (از فروغ اردو ایڈیشن) ڈاکٹر سید اعجاز حسین ۹/-
۷۱ تحریریں مجموعہ مضامین ڈاکٹر گیان چند ۴/۵۰
۷۲ تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ ـ فرید احمد علوی ۰/۷۵
۷۳ تاریخی جائزے ڈاکٹر محمد یٰسین ۳/۹

۷۴ تعارف تاریخ اردو (جدید ایڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/-
۷۵ تاجدار مدینہ اقبال صدیقی ۰/۱۲
۷۶ تنقیدی اصول اور نظریے حامد اللہ افسر ۴/۵۰
۷۷ تنقید و تحلیل ـ شبیہ الحسن نونہروی ۳/-
۷۸ تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) سید احتشام حسین ۴/۵۰
۷۹ تنقیدی نظریات (جلد اول) " " ۶/-
۸۰ " (جلد دوم) " " ۶/-
۸۱ تنقیدی اور عملی تنقید " " ۵/
۸۲ تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) ۱۹۶۴ء آل احمد سرور ۳/۵۰
۸۳ ترانہائے خیام ـ ڈاکٹر رغیب حسین ۲/-
۸۴ تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص محمد حسین شمس ۱/۶۵

(ٹ)

۸۵ ٹیگور آدم سیتاپوری ۲/-
۸۶ ٹھیکرے کی مانگ ـ صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲/-

(ث)

۸۷ ثنائے حبیب (نعتیہ کلام) ہزار لکھنوی ۲/۲۵

(ج)

۸۸ جانِ غالب محمد حسین شمس علوی ۲/-
۸۹ جائزے انور سدیدانی ۳/-
۹۰ جواہرات اسمٰعیل ـ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱/-
۹۱ جنگ آزادی نمبر (۱۸۵۷ء) فروغ اردو ۳/-
۹۲ جنگ آزادی نمبر ۲ " " ۳/-
۹۳ جھرنے [illegible] حامد اللہ [illegible] ۲/۵۰
۹۴ چادر کی [illegible] ڈاکٹر [illegible] ۳/۵۰
۹۵ جنگ [illegible] ۲/۵۰
۹۶ جلوے [illegible] الدین [illegible] ۱/۰۵

۹۷ جمیلہ بوائری (ناول) خان محبوب طرزی ۴/۵۰
۹۸ جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۶/-

(چ)

۹۹ چوکھی بہن مجموعہ افسانہ - مسیح الحسن رضوی ۲/۷۵

(ح)

۱۰۰ حیات فضل الحق خیرآبادی ۱/۲۵
۱۰۱ حالی بحیثیت شاعر (جدید اڈیشن معہ اضافہ جدید اڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۳/-
۱۰۲ حسرت موہانی عبدالشکور ۳/۵۰
۱۰۳ حسرت تعمیر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰
۱۰۴ حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰
۱۰۵ حکیم نباتات وزیر خاں لنکراں ۲/
۱۰۶ حبسیہ غالب سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۰۷ خیالات رنگین یعنی مجموعہ مضامین فارسی (زیر طبع)
۱۰۸ خلاصہ شریف زادہ مرزا رسوا ۱/-
۱۰۹ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی عبدالماجد دریابادی ۲/۷۵
۱۱۰ خضر راہ معہ ترجمہ علامہ اقبال ۰/۷۵
۱۱۱ خلاصہ روح تنقید ۱/۰
۱۱۲ خلاصہ جواہر العروض ۱/-
۱۱۳ خلاصہ المیزان -/۷۵
۱۱۴ خبطی (مزاحیہ) محمد علی واحدی معہ مقدمہ شوکت تھانوی ۱/۵۰
۱۱۵ خوش بختی کی تلاش - احسن الظفر بی اے -/۲
خلاصہ شعر الہند (دوم) -/۲

(د)

۱۱۶ دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۳/-
۱۱۷ دیوان فغانی ۱/۵۰
۱۱۸ داستان سراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی) عبدالماجد خلیل ۳/-

۱۱۹ دیوان صفی (حصہ اول) صفی لکھنوی ۱/-
۱۲۰ دہلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/-
۱۲۱ دستہ گل شبلی نعمانی ۴۰
۱۲۲ دوشیزہ ثانی (ناول) خان محبوب طرزی -
۱۲۳ دلربا " " " -
۱۲۴ دلی کا دبستان شاعری معہ اضافہ جدید اڈیشن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۱/-

(ڈ)

۱۲۵ ڈاکٹر نذیر احمد انوار الحسن ۳/۷

(ذ)

۱۲۶ ذوق جستجو - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۲/۵۰
۱۲۷ ذوق ادب و شعور - پروفیسر احتشام حسین ۴/۵۰
۱۲۸ ذوق جنون مجموعہ کلام آل احمد سرور ۴/۵۰

(ر)

۱۲۹ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین ۵/۰
۱۳۰ رباعیات غالب معہ اردو ترجمہ سید امیر حسن نورانی ۲/۰
۱۳۱ رہبر مضمون نویسی - شجاعت علی صدیقی ۲/۵۰
۱۳۲ راکھی - ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۰/۳۷
۱۳۳ رخسار سحر - انصر کریم قدوائی ۱/۵۰
۱۳۴ رفتار (ناول) ۳/۵۰
۱۳۵ رموز حکمت معہ مقدمہ اردو - محمد شریف ۳/۵۰
۱۳۶ ریاض فارسی - منتخب کلام فارسی ۲/۰

(ز)

۱۳۷ زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ مولانا تھانوی ۰/۵۰
۱۳۸ زنمٹیوں کا بادشاہ (حکیم بابا) (مزاحیہ ناول) علی عباس حسینی ۳/۰

(س)

۱۳۹ سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۲/۰

۱۴۰ سوانح اور خاکے — نجم الدین آفندی — ۳/۰

۱۴۱ سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حلیم چند نیر — ۰ -

۱۴۲ سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۳/-

۱۴۳ سلک گہر — سید احتشام حسین — ۲/-

۱۴۴ ساحل و سمندر — سید احتشام حسین — ۶/-

۱۴۵ سرسید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰

۱۴۶ سرمایہ زبان اردو — جلال لکھنوی — ۱/۵۰

۱۴۷ سخنہائے گفتنی — ظہیر الدین احمد — ۵/-

۱۴۸ سفر (ناول) — اکمل ملیح آبادی — ۲/-

۱۴۹ سیاحت زمین (ناول) — محمود اعظم فہمی — ۱/۵۰

۱۵۰ سید سالار مسعود غازیؒ — جوشی محمود آبادی — ۳/۵۰

۱۵۱ ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۳/۵۰

۱۵۲ سہرا حلقہ — ۰۵

۱۵۳ سرسید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی — ۰/۳۷

۱۵۴ سوشل اسٹیڈی — احمد حسن کاکوروی — ۱/۷۵

(ش)

۱۵۵ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) — غلام احمد فرقت — ۹/۰

۱۵۶ شرح سلک گہر — عبد القوی دریابادی — ۳/۵۰

۱۵۷ شاہ عمگیں حضرت جی — پروفیسر عبد الشکور — ۳/-

۱۵۸ شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی — ۴/-

۱۵۹ شرح ادب پارے نظم — ۳/۰

۱۶۰ شرح منتخبات فارسی — عبد القوی دریابادی — ۴/۵۰

۱۶۱ شبلی نعمانی — انوار الحسن صدیقی — ۰/۳۷

۱۶۲ شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن) — نظم طباطبائی — ۵/-

۱۶۳ شاہان مالوہ یعنی گجرات کی تاریخ — امیر احمد علوی — ۳/۵۰

۱۶۴ شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم — شبلی نعمانی — ۲۵/-

۱۶۵ شرح نثر امروز ایران — احسن الظفر ایم اے — ۲/۰

۱۶۶ شرح شعر امروز ایران — " — ۲/۵۰

۱۶۷ شمع و شاعر — علامہ اقبال — ۰/۲۵

۱۶۸ شرح حلیم نباتات نعش — نیر مسعود — ۱/۲۵

۱۶۹ شرح انتخاب قصائد و غزلیات

۱۷۰ مطابق نصاب بی اے — عبد الحلیم قدوائی — ۶/۰

۱۷۱ شرح ترانہائے خیام — حکیم عبد القوی — ۱/۵۰

۱۷۰ شرح نصاب فارسی — ۴/۰

(ص)

۱۷۲ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — ۳/۰

۱۷۳ صحیفۂ محبت (مہدی افادی کے خطوط) — ڈاکٹر محمود الٰہی — ۵/۰

(ط)

۱۷۵ طنزی میرا خان محبوب طرزی — مرتبہ فروغ اردو — ۱/۰

۱۷۶ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے — غلام الثقلین — ۳۷

۱۷۷ طلسم اسرار (ڈرامہ) — مرزا رسوا لکھنوی — ۲۵

۱۷۸ طرۂ امیر — امیر مینائی منتخب کلام

۱۷۹ (جدید ایڈیشن) امیر احمد علوی — /۵۰

(ع)

۱۸۰ عذرا (ناول) — صالحہ عابد حسین — ۰

۱۸۱ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) — سید احتشام حسین — ۵۰

۱۸۲ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینے میں — اشفاق حسین عارف — ۰

(غ)

۱۸۳ غالب کی تخلیقی تخیل ۔ شبیہہ صفی پوری ۴/۰

۱۸۴ غنچۂ رنگ سید محمود الحسن رضوی ۳/۰

۱۸۵ غالب کے کلام میں لکاتی عناصر ناظم سیتاپوری ۴/۵۰

۱۸۶ غزنی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۱۸۷ غزلیات نظیری ۱/۵۰

(ف)

۱۸۸ فن خطابت یعنی استاد تقریر کلب مصطفٰے ایڈوکیٹ ۰/۰

۱۸۹ فریدہ خان محبوب طرزی ۲/۰

۱۹۰ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ۔ ناظم سیتاپوری ۴/۵۰

۱۹۱ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۴/۵۰

۱۹۲ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۱۹۳ فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی ۳/۰

۱۹۴ فغان محسن محسن کاکوروی ۲/۰

۱۹۵ فارسی آموز مشیر احمد علوی ۱/۰

۱۹۶ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۴/۵۰

(ق)

۱۹۷ قدیم جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں غلام احمد فرقت ۵/۰

۱۹۸ قصائد خاقانی ۱/۵۰

۱۹۹ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰

۲۰۰ قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۴/۵۰

۲۰۱ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۸/۰

۲۰۲ قدر و نظر ڈاکٹر اختر اورینوی ۵/۵۰

۲۰۳ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۲/۰

۲۰۴ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/

۲۰۵ قومی ادب نثر و نظم حامد افسر ۳/۸۳

۲۰۶ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۴/۰

(ک)

۲۰۷ کیسہ اور کاہی بدرالدین طیب جی ۲/۰

۲۰۸ کف گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۲/۰

(گ)

۲۰۹ گلبانگ حرم مصور مع مقامات مقدسہ کے فوٹو زائر حرم حمید لکھنوی ۰/۰

۲۱۰ گاندھی نمبر ۲/۰

۲۱۱ گلدستۂ فارسی اول و دوم ۱/۰

۲۱۲ گلزار فارسی یعنی آمدنامہ ۰/۴۰

۲۱۳ گلہائے ادب عبدالمنان خلیل ۰/۰

۲۱۴ گاندھی جی کے ساتھ حامد اللہ افسر ۰/۰

(ل)

۲۱۵ لوائح جامی مع مقدمہ عبدالمنان خلیل ۰/۶۰

۲۱۶ لال قلعہ مائل ملیح آبادی ۶/۰

۲۱۷ لب بام عادل رشید ۵/۰

۲۱۸ لسانیات اور اردو سید محمود حسن رضوی ۲/۵۰

(م)

۲۱۹ مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو غلام احمد فرقت ۸/۰

۲۲۰ محسن کاکوروی نمبر ۳/۰

۲۲۱ مسلمان اور کانگریس ابوالکلام آزاد ۲/۵۰

۲۲۲ مرثیہ نگاری اور میر انیس ۔ ڈاکٹر مسیح الزماں فاروقی ۴/۰

۲۲۳ مضامین فرحت (حصہ اول) مرزا فرحت اللہ بیگ ۳/۰

۲۲۴ مضامین فرحت حصہ دوم ″ ″ ″ ۳/۰

۲۲۵ ماضی کی کہانیاں آفتاب اختر تلہری ۲/۵۰

۲۲۶ میرے اسٹیج ڈرامے ڈاکٹر محمد حسن ۴/۵۰

۲۲۷ موسم گل (ناول) عادل رشید ۶/۰

۲۲۸ مجبور " خان محبوب طرزی ۴/۵۰

۲۲۹ مضامین جدیدہ محمد ہادی ۱/۲۵

۲۳۰ مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ قدرت اللہ بیگ ۲/۵۰

۲۳۱ مطالعہ شبلی۔ ناظر کاکوروی۔ شجاعت علی سندیلوی ۴/

۲۳۲ حیات شبلی جالب مظہری ۲/۵۰

۲۳۳ مثنویات حالی۔ ناظر کاکوروی شجاعت علی سندیلوی ۱/۵۰

۲۳۴ مطالعہ حالی " " " ۴/۵۰

۲۳۵ میٹھے بول " ۱/۲۵

۲۳۶ مولوی نذیر احمد کی کہانی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۰

۲۳۷ معرکہ روم و یونان صادق سردھنوی ۶/

۲۳۸ مصنوعی چاند خان محبوب طرزی ۲/۰

۲۳۹ مقدمہ شعر و شاعری (مطابق نصاب ...) [illegible]

۲۴۰ مرثیہ غالب " ۰/۲۵

۲۴۱ محبوبہ کربلا جرجی زیدان ۳/۵۰

۲۴۲ معمار مائل ملیح آبادی ۲/۵۰

۲۴۳ مولانا حالی انوار الحسن صدیقی ۰/۷۵

۲۴۴ مہاراج بلی ڈاکٹر احسن فاروقی ۲/۰

۲۴۵ مسٹر ملا کی نوک جھونک خواجہ عزیز الحسن مجذوب ۰/۷۵

۲۴۶ مجذوب اور اُن کا کلام۔ مولانا رضا انصاری ۱/۵۰

۲۴۷ مصباح بلاغت مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۳/۰

۲۴۸ مطالعہ سودا ڈاکٹر محمد حسن ۳/۰

۲۴۹ مزاحیہ شرح دیوان غالب۔ غلام احمد فرقت ۸/۰

۲۵۰ مقدمات و مقالات ... عبدالاحد خاں خلیل ۵/۵۰

۲۵۱ منتخب سوانح اور خاکے۔ نجم الدین نقوی ۳/۰

(ن)

۲۵۲ نثر امروز ایران ڈاکٹر رئیس حسین ۳/۰

۲۵۳ نشاط غالب۔ وجاہت علی سندیلوی ۴/۵۰

۲۵۴ نقد و انتقاد اعجاز احمد عجز ۲/۰

۲۵۵ نقش حالی اول دوم یعنی حالی نمبر پروفیسر احتشام حسین ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی شجاعت علی سندیلوی ۱۲/۰

۲۵۶ نغمہ کوہسار خان محبوب طرزی ۴/۰

۲۵۷ نفحات الہند مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۳/۰

۲۵۸ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی کبیر احمد جائسی ۲/۰

۲۵۹ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ حامد اللہ افسر ۳/۰

۲۶۰ ... (ناول) خان محبوب طرزی ۳/۵۰

۲۶۱ ... (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۲۶۲ نئے دور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ) آل احمد سرور ۶/۰

۲۶۳ نقوش و افکار مجنوں گورکھپوری ۴/۵۰

۲۶۴ نشیمن انتصار حسین ۳/۰

۲۶۵ نذیر احمد کی کہانی فرحت اللہ بیگ ۱/۰

۲۶۶ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی عبدالاحد خاں خلیل ۴/۰

۲۶۷ نقش نولکشور نمبر ۲/۰

(ہ)

۲۶۸ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے علی عباس حسینی ۳/۰

۲۶۹ ہندی کے مسلمان شعرا۔ امیر حسن نورانی [illegible]

۲۷۰	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/۰
۲۷۱	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۲۷۲	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	” ”	۱/۵۰

(ی)

۲۷۳	یادگار غالب	مولانا حالی	۲/۷۵
۲۷۴	یاقوتی (ناول)	خان محبوب طرزی	۲/۰۰
۲۷۵	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۲/۵۰

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

۱۔ پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۲۔ جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں

۳۔ اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

۴۔ جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے

۵۔ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

جلد (۱۸) شمارہ (۱۱)

ادارۂ فروغ اردو ہند کا علمی و ادبی ماہنامہ

رجسٹرڈ نمبر: ایل ۲۰

لائسنس نمبر: ۲۰۶۶۱۴/۲۰۱۸۱۹۴

فون نمبر: ۲۶۱۳۵

فروغ اردو

عمی لکھنؤ

مارچ ۱۹۷۲ء

زر سالانہ: چار روپے

فی پرچہ: ۳۷ پیسے

ترتیب

پتہ:-

ادارۂ فروغ اردو

امین آباد پارک لکھنؤ-۱

سید انصار حسین پرنٹر، پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا

چیف ایڈیٹر

محمد حسین شمس علوی

[illegible]

اپنی باتیں

اُردو ملک کے ایک بڑے مفکر، محب وطن اور [illegible] اکیڈیمی [illegible] طبقہ کی زندگی کا سوال ہے لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے اس کا [illegible] معلوم ہوتا ہے جیسے اُردو کا [illegible] ہاتھ سے نکل چکا ہے اور جو باقی رہ گیا ہے اُس کی مدد سے کھوئے ہوئے [illegible] کو واپس لانے کی جد و جہد کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں روشنی کی جو ہلکی سی کرن اُمید کی جو دھندلی سے دھندلی روشنی دکھائی دیتی ہے اسے غنیمت سمجھ کر اسی کو [illegible] کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اور اکیڈیمی کے قیام کی خبر سے کچھ ایسے ہی احساسات پیدا ہوتے ہیں [illegible] طریق کار [illegible] واضح نہیں لیکن اس نئے اقدام کا احساس خوشگوار ہے اور نیک نیتی سے [illegible] کامیاب ہو سکے۔

اکیڈیمی کے پہلے جلسہ کی جو کار روائیاں اخبارات میں شائع ہوئی ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجلس عاملہ نے پنڈت آنند نرائن مُلّا کی رہنمائی میں بعض اہم کاموں کی طرف توجہ کرنے کو اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلہ اُردو کو مادری زبان ماننے والوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ہے۔ زبان کی بقا، ترقی، علمی خدمات، کتب خانہ کا قیام، تصانیف اور مصنفین کی ہمت افزائی، غرضکہ جو عمارت بھی کھڑی کی جائے گی اس بنیاد پر کھڑی ہو گی۔ اس سلسلہ میں سب سے پیچیدہ سوال یہ ہے کہ اُردو اکیڈیمی کے مشوروں، اسکی تجویزوں اور فیصلوں کی حیثیت کیا ہو گی! نظام تعلیم اُتر پردیش کی حکومت کا بنایا ہوا ہے، وہی اُسے چلاتی ہے، یہاں تک کہ مرکزی حکومت کی "ہدایات" پر بھی عمل کرنا اس کے لئے لازمی نہیں ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مرکزی حکومت نے سہ لسانی فارمولے میں صرف جدید زبانوں کی تعلیم کا اُصول تسلیم کیا تھا۔ اُتر پردیش کی حکومت نے اس میں ایک کلاسیکی زبان سنسکرت بھی شامل کر لی اور پنڈت نہرو کی واضح خواہش کے باوجود مرکز کے نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا جب ایسا ہے تو یہ کیونکر سمجھا جا سکتا ہے کہ اُردو اکیڈیمی کی تجاویز اُتر پردیش کی حکومت بغیر اپنے مصالح کو نگاہ میں رکھے ہوئے ماننے پر تیار ہو گی۔ پنڈت آنند نرائن مُلّا نے اخباری نمایندوں سے اکیڈیمی کے کاموں کی وضاحت کرتے ہوئے یہ ضرور کہا ہے کہ انھیں حکومت کے تعاون کی اُمید ہے لیکن یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اکیڈیمی اُن سرکاری عمال کا دل بدلنے میں کس طرح کامیاب ہو گی جن کے ہاتھ میں تجاویز پر عمل کرنا اور کرانا ہوتا ہے۔ بہر حال ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے اور جتنا کچھ ہو رہا ہے اُسے قبول کر کے نئے عزم سے اُردو کی خدمت کیلئے آمادہ ہونا چاہیئے

اُردو کی ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور اُن سے متعلقہ مسائل پر اُردو دوستوں نے بار بار اظہار خیال کیا ہے اور کوئی

ہمیں کہہ سکتا کہ وہ اُن سے واقف ہیں [illegible] سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ
ایک [illegible] پر نگاہ [illegible] ہم دقّت کرتے ہیں۔ بچّوں کی تعلیم کے لیے
اردو زبان کے اسکولوں کا قیام [illegible] کہاں ہوا ضروری ہے ۔ آسانی سے وہ کس طرح قائم
کیے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے [illegible] اور حکومت کو آمادہ کرنا ہے کہ وہ ایسے اسکول جولائی سے پہلے
قائم کرے اور اردو [illegible] کے لیے فضا [illegible] دوسرا مسئلہ کتابوں کی فراہمی کا ہے۔ یہ
بظاہر سیدھا سادا ہے لیکن [illegible] اُن کی طباعت و اشاعت،
مختلف علاقوں میں [illegible] نصاب اور اساتذہ کی ٹریننگ
[illegible] ثانوی مدارس میں اردو
[illegible] پانچ، چالیس
[illegible] علمی اور عملی نقطۂ نظر سے غور
[illegible] اکیڈمی نصاب کی کتابوں
کرنا ہوگا [illegible] یہ کام لینا چاہیے گی تو اُسے
کی اشاعت اپنے ذمّہ [illegible]
ناشروں کو مطمئن کرنا ہوگا [illegible] کے لیے اقتصادی [illegible] نہ ہوں گی۔
لائبریریوں کی [illegible] کی اعانت، کتابوں
کی طباعت میں امداد [illegible] ضروری ہیں لیکن اوّل تو ان کا
فائدہ اُسی وقت ظاہر [illegible] تعلیم جو کتابیں پڑتی ہیں وہ دُور
ہوں گی۔ دوسرے یہ کہ [illegible]
[illegible] کام ہو سکتے ہیں سرکاری
پانچ [illegible] قومی سرمایہ کا
نگرانی کی وجہ سے [illegible]
ایک ایک پیسہ جائز [illegible] قیام کا خیر مقدم
ہم یہ یقین [illegible] اس کے کاموں کا جائزہ لیتے رہیں
کرنے میں کسی سے پیچھے [illegible] آخر میں ہم اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ
اور تعمیری تنقید کے ذریعہ اربابِ اختیار [illegible]
ہمیں اُمید ہے یہ ادارہ حکومت کا [illegible] اردو کی خدمت کرے گا۔

نعت

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی یہ تیسری نعت ہے۔ اس سے قبل ماہ جنوری ۱۹۷۲ء کے فروغ اُردو میں دو نعتیں شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا کے کلام کی تلاش جاری ہے۔ ارباب ادب کا بڑا کرم ہوگا۔ اگر وہ مولانا کا کلام عنایت فرمائیں۔ فروغ اُردو شکریہ کے ساتھ قبول کرے گا۔

(ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی)

اور اک شب تو باثر ہوتی ۔۔۔ وہ تجلّیِ حق اِدھر ہوتی
پائے اقدس پہ چشمِ تر ہوتی ۔۔۔ شب گزرتی یوں ہی سحر ہوتی
نالۂ نارسا رسا ہوتا ۔۔۔ سُرمۂ چشم خاکِ در ہوتی
کچھ تو ارمانِ دل نکل جاتا ۔۔۔ کچھ تو تسکینِ چشمِ تر ہوتی
دونوں پا کو لگائے آنکھوں سے ۔۔۔ یوں ہی راحتِ دل و جگر ہوتی
حسرتِ دید دل میں اب یہ ہے ۔۔۔ اب تو ہر شب یوں ہی بسر ہوتی

ہے حضوری نصیب میں شاید
ہند میں اب نہیں بسر ہوتی

از گلشنِ نعت مرتبہ نیّر نقشبندی
برقی اُردو پریس موچی بازار

شیخ حبیب اللہ (اڑیسہ)

غالبؔ، اقبالؔ اور رودادِ عشق

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اقبال کا عشق! اقبال [illegible] کا [illegible] ہے
[illegible] آسمانوں کی بلندیوں پر [illegible] ہے
اقبال اور غالبؔ کے عشق کا تفاوت [illegible] میں [illegible]
[illegible] کا [illegible] رکھتا ہے۔ ان دونوں کے [illegible]
[illegible] ہے۔ اقبال کا عشق [illegible]
بلکہ [illegible] ان کا [illegible] عشق کا [illegible]
[illegible] بوقلمونیاں، پہلو داری [illegible]
[illegible] انگیز ہیں۔ اقبال کے [illegible]
[illegible] نا [illegible] پسند نہیں [illegible]
[illegible] میں عشق [illegible]

نہ غم سفینہ دارم نہ سر کنارہ دارم
جز عشق حکایتے نہ دارم
[illegible]

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

غالبؔ کا عشق بعض اوقات وحشت کا جامہ [illegible]

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

کبھی کبھی غالبؔ کا عشق خللِ دماغ کا چولا بھی پہن لیتا ہے ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

مگر اقبال کا عشق پرشکوہ ہی نہیں بلکہ برق پاش بھی ہے۔ برق پاش ہی نہیں بلکہ نجیب و اشرف، اعلیٰ و برتر بھی ہے۔ چھچھوراپن اس میں ہوتا ہی نہیں ؎

اے عشق ہے گہر آبدار تو نامحرموں میں دیکھ نہ ہوا آشکار تو
عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا مجھے
[illegible] خاک ایسی نہاں زیر قبا رکھتا ہوں میں

کمال عشق [illegible]
زوال عشق و مستی [illegible]
جمال عشق و مستی [illegible]
جلال عشق و مستی بے نیازی

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
غالب کو عشق پر کوئی قدرت نہیں
[illegible] کی طرح ہے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مگر اقبال کا عشق لا ابالی ہے اور بے زار نہیں ہے
عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

غالب کے عشق کی بے سروسامانیاں اور غم پاشیاں [illegible] [illegible] خستہ و نڈھال ہو جاتے ہیں کہ بند عشق سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ چونکہ ان کی [illegible] گرفتار بلائے عشق ہو ہو جاتے ہیں اور [illegible] افسوس ملتے ہیں کہ وائے برمن پر سیلاب بلا ان کے بعد یتیم ہو جائے گا۔
آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

مگر اقبال عشق سے مطلق پریشان نہیں [illegible]
اس کے دامن میں جلوہ [illegible] نہیں [illegible]
بلکہ مسرت و شادمانی اور رحمت [illegible]
عجب سے آباد ہوا عشق ترا سینے میں
[illegible] جو ہر [illegible] پیدا [illegible]
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال
[illegible]
عشق کی گرمی سے [illegible]
کھیلنے [illegible] تجلیوں کے ساتھ [illegible]
عشق کے خورشید سے شام اجل [illegible] ہے
عشق سوز زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

زیں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید با ایں ہمہ بے تابی

غالب بھی عشق میں جان جلانے کا جبر دیکھتے ہیں۔ اسے جبر و مجبوری [illegible] [illegible] بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عشق خود [illegible] ہے [illegible] صورت رنگین ہے [illegible] غم [illegible] تو عشق ان کے یہاں باعث تو قیر [illegible] ہے۔ بطور مجموعی طور سے غالب عشق کی بارگاہ میں خود کو باب نبرد نہیں پاتے ہیں۔
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

ہر ... عشق ...

... برق کی تڑپا دل ... ہوں

... غمِ عشق کی ... پوچھ

... شہیدِ کلِ خسروانی شمع

لیکن غالب زیرِ خندہ زن ہیں کہ انھوں نے عشق کا مقام ... کرکے اس ڈرپے ... عمل کرنا چاہا۔ غالب کا عشق ... استعمال کرنا نہیں چاہتا ۔

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب

ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

... نظروں میں فرہاد کی ... عشق ... رعنائیاں رکھتا ... میں ہوسناکی نہیں ۔

در عشق و ہوسناکی دانی کی تفاوت چیست

آں تیشۂ فرہادے ایں حیلۂ پرویزے

غالب کا عشق فرس بے لگام ہے۔ ٹھیک ... عمر کی طرح جدھر چاہتا ہے سرپٹ دوڑتا ہے۔ اس میں تدبر و تفکر کا مادہ نہیں۔ غالب تو ہمیشہ سوگواری رکھتا ہے۔ اس کی کوئی خودی نہیں۔ یہ عشق فرمانبردار دل ہے ۔

... نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

جس دل پہ مجھ کو ناز تھا وہ دل نہیں رہا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے

غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

عشق نے غالب ابھی پکڑا نہ تھا الفت کا رنگ

رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ...

مگر اقبال کا عشق، میر کاروانِ دل ہے ۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من

عشق است امام من عقل است غلام من

... سلسلۂ روز و شب ... زمانے کی رو

عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

اگر ایں خاک داں را وا شگافی

درونش بنگری خوں ریزیِ عشق

غالب مردِ عشق کے مردِ میدان نہیں۔ عشق کی نگاہ برقِ تپاں جن کے نشیمن کو تاک لیتی ہے اور انھیں ... کر دیتی ہے تو وہ بے بس ہو جاتے ہیں ۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اقبال کا عشق ظالم و جابر اور موذی نہیں۔ یہ تو زندگی بخش ہے ۔

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی

تو ہے زناریِ بتخانۂ ایام ابھی

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک

اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا

اقبال کو تو افسوس اس بات کا ہے کہ زمانۂ حاضر کا عشق ہمکردار نہیں رہا۔ یہ زوال پذیر ہے۔ تغیر و تبدل زمانہ سے متاثر ہو رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح معیارِ ادب و علم و حکمت میں اضمحلال پیدا ہو رہا ہے ۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

اقبال تو یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جوہرِ عشق کو ہر کس و ناکس پرکھنے سے قاصر ہے ؎

ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست

پس وہ راز کو بھی عوام پر فاش کرنا نہیں چاہتے ؎

رمزِ عشق تو بہ اربابِ ہوس نتواں گفت
سخن از تاب و تبِ شعلہ بہ خس نتواں گفت

عشق اندر جستجو افتاد و آدم حاصل است
جلوۂ او آشکار از پردۂ آب و گِل است

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست
سرورش از مئے دیرینۂ تست

عقل ورق ورق بگشت، عشق بہ نکتہ رسید
طائر زیرکے برد دانہ زیرِ دام را

شعلۂ درآغوش دارد عشقِ بے پروائے من
برنخیزد یک شرار از حکمتِ نازائے من

حکمت و فلسفہ کارے است کہ پایانش نیست
سیلیٔ عشق و محبت بہ دبستانش نیست

عقاباں را بہائے کم نہد عشق
تذرواں را بباز اں سر دہد عشق

شعاعِ مہر او قلزم شگاف است
بہ ماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

نوائے عشق را ساز است آدم
کشاید راز و خود راز است آدم

غالب کا عشق کمزور و ناتواں ہے۔ دل صد رہ مظلوم ہے۔ مصافِ کارزارِ حیات میں بھٹک کے رہ جاتا ہے۔ اقبال کے عشق کی طرح عقابی شان حاصل نہیں جو ماہ و مشتری تک کو عنان نہیں سمجھتا۔ زمین و آسمان تک کو بیکراں تصور نہیں کرتا۔ ضعفِ داماں قطعاً نہیں۔ حسن کی شورش، جفا و ہولناکی سے نالاں نہیں۔ مگر غالب! سنیئے ؎

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستان سمجھا

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی اور یاں
طاقت بہ قدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اٹھ گئے وہی اُن کے عَلم ہوئے

غالب کا عشق وصال طلب، صرف تنعّم کے لئے تڑپتا رہتا ہے اور لذت یاب ہونا چاہتا ہے، خواہ معشوق ڈومنی ہی کیوں نہ ہو۔ قصہ مختصر غالب کا دل ہرجائی ہے۔ قیامتوں کا طالب۔ جلوۂ ساقی ہمیں اور صوتِ رباب و چنگ اس کے لئے دشمنِ ایمان و آگہی ہیں۔ غالب نے عشق کے بس ایک ہی پہلو پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کے زلفِ عنبریں کے شکن در شکن کو کبھی سلجھایا نہیں ہے۔

غالب کا عشق واحد العین ہے۔ غالب کے وادیٔ خیال میں عشق کی قلزم شگافی کی رنگا رنگی نہیں ہے۔ غالب نے خود ہی صاف صاف کہدیا ہے کہ اُن کے نزدیک عشق فقط تسکینِ خواہش کا نام ہے اور کچھ نہیں ؎

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

[illegible] مطالب کچھ نہ [illegible]

ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

[illegible] سے نو میدہ [illegible]

[illegible]

[illegible] عاشق [illegible]

[illegible]

[illegible] ہے چرخ [illegible] وہ حیال

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اقبال [illegible] کو قسمت ہوئی تھی [illegible]

[illegible] بیاں قاری کو [illegible]

عشق [illegible] تک [illegible] سمجھا [illegible]

[illegible] فرشتے [illegible]

پر جان نثار کرتی ہیں [illegible]

...... [illegible]

[illegible] زندہ رود [illegible]

زندہ رود [illegible]

شور و غوغا از نسیا رواز یمین

یک دو دم با ما نشیں [illegible] با ما نشیں

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے

شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

ہوئی نہ عامِ جہاں میں کبھی حکومتِ عشق

سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

ہر کہ [illegible] درگاہ نیست

[illegible] ایں درگاہ نیست

[illegible]

[illegible] یا [illegible] ترکانہ

[illegible] عشق

[illegible] سر بر آرد

[illegible] ہے

[illegible] پایندہ ہے

[illegible] نہیں

[illegible] مگر پاتا نہیں

[illegible]

[illegible] تماشا [illegible] کوئی

[illegible] حسن [illegible] آئیں

[illegible] اپنے کلام میں عشق

[illegible] بیان فرمائی ہیں۔ شعر کے

[illegible] اپنے قلمِ معجز رقم سے

[illegible] کو [illegible] کھینچا ہے

[illegible] گوشوں، بانکپن، شوخیوں

[illegible] شمس و قمر [illegible] جلوہ گر

[illegible]

[illegible] آتشِ عشق [illegible] فروخت

ہزاراں پردہ [illegible] آواز ما سوخت

عشقِ مرداں سر [illegible] گفتہ است

سنگ را با نوکِ مژگاں سفتہ است

عشقِ مرداں [illegible] رنگیں چوں بہشت

می کشاید نغمہ ما از سنگ و خشت

اقبال کے نزدیک عشق راز حیات کا محور ہے ۔ یہ راہ بر ہے ۔ زندگی ہے، علم و خرد کی اس کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں ۔ غالب کے عشق کی طرح خلل دماغ نہیں ؎

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

اقبال کے نزدیک عشق کے معجزات ہیں سلطنت فقر و دیں، عشق سراپا یقیں اور عشق کی گرمی سے معرکۂ کائنات ؎

عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پیدا حجاب

جس طرح اقبال کو دکھ تھا کہ شاید اُن کے بعد کوئی دانائے راز نہیں پیدا ہوگا ۔ اسی طرح غالب کو بھی فخر تھا کہ اُنکے بعد عشق کا دلدادہ پیدا ہوگا ہی نہیں ؎

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

اتنا ہی نہیں غالب نے دنیا کو چیلنج بھی کیا ہے کہ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مگر غالب کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا اور اقبال پیدا ہوئے ؎

حسن لرزید کہ خونیں جگرے پیدا شد

اقبال نے عشق کو حیاتِ نو اور اک نئی دنیا بخشی ؎

عشق کی تیغ جگر دار اُڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

خود اقبال کو بھی ناز ہے کہ اُنھوں نے دنیا کو عشق مقامات صحیح سے روشناس کر دیا ؎

یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام
عشق را عہدِ شباب آوردہ ام

عشق را من دلبری آموختیم
شیوۂ آدم گری آموختیم

اقبال کا دل نکتۂ فطرتی کی تعلیم نہیں دیتا۔ ان ۔ عشق میں حیاتِ جاودانی کی جلوہ آرائیاں ہیں

عشق را نازم کہ از بیتابیٔ روزِ فراق
جان ما را لبست با دردِ تو پیوندے د

اگر نہ بوالہوس با تو نکتۂ گو ئم
کہ عشق پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر

ز عشق درسِ عمل گیر و ہر چہ خواہی کن
کہ عشق جوہرِ ہوش است و جان فرہنگ

از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ من ہستم
در دیر نیاز من در کعبہ نماز م

عشق مرداں نقد خوباں را عیار
حسن را ہم پردہ در ہم پردہ دار

عشق بسر کشیدن است شیشۂ کائنات را
جامِ جہاں نما مجو دست جہاں کشا طلب

اقبال کو اگر فخر ہے کہ انھوں نے اپنے خونِ جگر قصۂ عشق کو رنگین بنا دیا تو کیا بات غلط ہے ؎

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات

اب یہ آپ کا کام ہے کہ شعرائے عالم کے دواوین کی چھان بین کی جائے آیا ان کے یہاں عشق کے کیا رنگ و روپ ہیں اور کیا شعرائے جدید و قدیم نے عشق کو کوئی اور وسعت بخشی ہے۔ یہ کیف نامعلوم خزانوں کا کھوج لگانا ضروری ہے۔ مگر یہ تحریر سکون نہیں۔ اس میں نہنگ، طوفان اور خرابی کنارا سے نبرد آزما ہونا پڑے گا ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق!

ڈرنے کی کوئی بات نہیں ؎

زہرے یہ آگیا تو یہی آسمان زمین
یہ ہے اقبال کا عشق کہ دل ...

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

تضمین بر غزل استاد الاساتذہ حضرت حسان الہند علامہ محسن کاکوروی رحہ

از

عارض کی مدح اور مثال آفتاب کی
دریائے نور میں نہیں وقعت حباب کی
بیضادی سحرے یہ نقل انتخاب کی
مصحف کا ایک صفحہ جبیں ہے جناب کی
تقریظ حق نے لکھی ہے اپنی کتاب کی

تقدیر جاگ اُٹھی ہے جہانِ خراب کی
دنیا نے شانِ خلد بریں اکتساب کی
ہر ذرہ میں در آئی ہے شان آفتاب کی
اُٹھتی ہے لامکاں سے جو چلمن حجاب کی
آمد ہے کس پیمبرِ عالی جناب کی

پہونچے تھے اس جلوس کے تا عرش غلغلے
باقاعدہ صفوں میں فرشتے کھڑے ہوئے
ہر ہر قدم پہ نعرے تھے حمد و صلوٰۃ کے
پنکھے پروں کے قدسیوں کے زیر [illegible]
جبریل [illegible] سواری جناب کی

ہے چشمِ دوزخ آج ندامت سے اشکبار
ہر شعلہ اپنے چہرے پہ ہے آج خاک بیز
عصیاں مرا او شعلۂ دوزخ میں ہے ستیز
چلنے لگی ہوائے شفاعت جو تیز تیز
آتش نہ کیوں کہے مری مٹی خراب کی

پھیلا ہوا ہے نور نبی کیسا دُور دُور
ہے مہر و ماہ میں بھی اسی نور کا ظہور
روشن انہی کے نور سے [illegible] طور
بالائے ہفت چرخ ہے محبوبِ حق کا نور
ہے [illegible] جہاں میں اسی آفتاب کی

دنیا کو [illegible] ملا
لیکن صفات و ذات میں تو سب سے تھا جدا
تخلیق پہ تری یدِ قدرت کو ناز تھا
جب انبیا میں حق نے تجھے منتخب کیا
سطر [illegible] انتخاب کی

معراج ہو گئی انہیں جو تجھ پہ مر مٹے
نام اپنا دو جہاں میں وہ مشہور کر گئے
شمس و قمر کی طرح وہ ہر جا چمک اٹھے
پہونچے فلک پہ تیرے قدم کے لئے بوسے
ذرّوں کو لے اُڑی ہے ہوا آفتاب کی

پیش آئے آخرت کا جو یارب مجھے سفر
دولت کا ہو خیال نہ اولاد پہ نظر
شکلِ رسول پاک ہو آنکھوں میں جلوہ گر
یارب ہو خاتمہ مرا حضرت ﷺ کے نام پر
بس یہ اخیر فصل ہے میری کتاب کی

یہ التجا شفیق کی یارب قبول ہو
اس کی قبولیت میں نہ وقفہ نہ طول ہو
تیرے کرم سے کیوں دلِ عاشق ملول ہو
محسن کی التجا ہے فنا فی الرسول ہو
اے بحرِ فیض لے خبر اپنے حباب کی

اسلام بیگ شفیق

الاداڑ (راجستھان)

محمد انصار اللہ نظر

پوربی اُردو — آغاز اور ارتقا

زبانِ اُردو کی ابتدا کا مسئلہ اب بھی نہایت الجھا ہوا ہے۔ اس مضمون میں میں نے اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ میرے نزدیک ایک رخ وہ بھی ہے جو [illegible] مضمون میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر اس پر بھی غور کر لیا جائے تو شاید کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکے۔

زبانِ اُردو کب، کہاں، اور کیونکر وجود میں آئی؟ اس بارے میں محققین میں اختلاف [illegible] اختلاف کا سبب علاقائی یا کسی نوع کی ذاتی عصبیت [illegible] قرار دینا مناسب ہے [illegible] موضوع سے متعلق بنیادی مواد کی کمی کو اس اختلاف کا ایک اہم سبب قرار دیا جا سکتا ہے چنانچہ پروفیسر محمود خاں شیرانی نے اپنی محققانہ تصنیف "پنجاب میں اُردو" کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے۔

"جب پرنسپل عبداللہ یوسف علی نے مجھ سے اُردو کے آغاز و قدامت کے موضوع پر لکھنے کے لئے ارشاد کیا تو میں نے اُن سے عرض کی کہ مضمون اگرچہ دلچسپ ہے لیکن اس پر ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں قلم اُٹھانا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے اور صحیح اطلاعات بہم رسانی کے لئے شاید ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا۔"

دوسرا اہم سبب زبانِ اُردو کی اصل کے متعلق بنیادی تصور کو بھی سمجھا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر بھی محققین کا یہ خیال ہے کہ اُردو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے نتیجے میں وجود میں آئی ان میں سے بعض نے سندھ اور بعض نے دکن کو اُردو کا مولد قرار دیا۔ ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی نے اس سلسلے میں لکھا ہے :۔

"اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی اسلئے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اسکی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی۔" (دکن میں اُردو)

ڈاکٹر آمنہ خاتون نے اپنے مختصر (بر قامت کمتر و بہ قیمت بہتر) رسالے "دکن کی ابتدا" میں تاریخی شہادتوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ عرب تاجر اور مسلمان پہلے جنوب میں آئے اور ان کے زیر اثر جو زبان [illegible] تشکیل پاتی تھی اس کا تعلق

اسی علاقے سے تھا۔ دوسرے ماہرین لسانیات کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اُپ بھرنش اور پراکرت کے واسطے سے زبان اُردو کا سلسلہ سنسکرت تک پہونچتا ہے۔ یعنی ان حضرات کے نزدیک اُردو قطعی طور پر ایک دیسی زبان ہے۔ البتہ اس نے عربی اور فارسی سے بھی کما حقہٗ فیض اُٹھایا ہے ان محققین کے خیال میں اُردو پنجاب، دہلی یا "دیار مشرق" میں وجود میں آئی۔ محققین کا ایک تیسرا گروہ بھی ہے جنھوں نے افراط و تفریط سے بچنے کے لئے ایک درمیانی راہ اختیار کی ہے۔ ان کے نزدیک اُردو ایک ہندوستان گیر زبان ہے جو کچھ مخصوص حالات میں، بعض مشترک خصوصیات کے ساتھ ملک کے مختلف علاقوں میں آزادانہ وجود میں آئی البتہ زمانۂ ما بعد میں انھیں مشترک خصوصیات کے ساتھ یہ زبان سارے ملک میں عام ہوگئی چنانچہ درج ذیل اقتباس اسی نظریہ کے مظہر ہیں:۔

"جتنی بھاشائیں ہند میں تھیں اتنی ہی ریختائیں بنیں، ان مختلف ریختاؤں کے عہد کو اُردوئے قدیم کا عہد کہنا چاہیئے جبکہ اُردو زبان کا لسانی سانچہ متعین نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اُردوئے وسطی کا عہد آتا ہے..... اسی دور میں لسانی عمل کا ایک اور پہلو شروع ہوگیا یعنی علاقائی ریختاؤں کو کھڑی بولی کی ریختہ متاثر کر رہی تھی۔"

(بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا۔ از پروفیسر اختر اورینوی ص ۹ تا ص ۱۱)

"یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب، اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔"

(نقوش سلیمانی ص ۲۵)

قرآن اور قیاس ساخت پر انحصار کرنے کے بجائے حق اور واقعات کی جستجو کے لئے اب غالباً بہتر امکانات پر ہو چکے ہیں اسلئے مناسب یہ ہے کہ اب تک کی معلومات نئے سرے سے جائزہ لیا جائے، زبان اُردو کا موجو نام (اُردو) بہت قدیم نہیں ہے، محققین کا اتفاق۔ کہ اس کا قدیم ترین نام ہندی، ہندوی، یا ہندی ہے چنانچہ پروفیسر شیرانی نے بھی یہی لکھا ہے (پنجاب میں ا ص ۵) پروفیسر محمد مسعود احمد (حیدرآباد۔ سندھ)۔ لفظ "ہندی" سے بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ابتدا ہندوستانی خط تحریر کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ ابو عثمان عمر بن بحر بن محبوب جاعظ بصری (۵۵/۲۴۹) کے درج ذیل اقتباسات نقل کئے ہیں:۔

"واما الهند فوجدناهم یقدمون فی النجوم والحساب ولهم الخط الهندی خاصة"	ہندوستان کے باشندوں کو نجوم اور حساب میں بہت آگے ہے۔ ان کا ایک خاص ہندی ہے۔

(سہ ماہی نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۶۶ء ص ۶۶)

"ولهم خط جامع الحروف اللغات وخطوط ایضاً کثیرة ولهم شعر کثیر وخطب طوال"	ان کا ایک خاص خط ہے جو کے تمام حروف کا جامع ہے ا علاوہ مختلف قسم کے خط ہیں کی شاعری اور تقریروں کا ذخیرہ ہے۔

(ایضاً ص ۱)

تیسری صدی ہجری کے ایک جہاز راں محمد حسن کا ایک د بزرگ بن شہریار کے حوالہ سے پروفیسر موصوف نے ان میں نقل کیا ہے:۔

" میں ۲۸۸ھ (۹۰۱ء) میں منصورہ (بھکر) میں
تھا۔ وہاں مجھ سے مستند بزرگوں نے بیان کیا کہ الرا ء
(اُردو) کے راجہ نے جو ہندوستان کا بڑا راجہ تھا کہ
جسکی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیرین کے بیچ میں تھی۔۔
.... ۲۷۰ھ (۸۸۳-۸۴ء) میں منصورہ کے بادشاہ
عبداللہ کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال ہندی
زبان میں اسکو بتا دے تو عبداللہ نے منصورہ میں ایک
عراقی کو پایا..... جس نے ہندوستانیوں میں نشوونما
پائی تھی اور اہل ہند کی مختلف زبانوں سے واقف
تھا...... اس نے ایک قصیدہ لکھ کر راجہ کو بھیجا...
..... جب وہ راجہ کے سامنے پڑھا گیا تو اس نے
بہت پسند کیا۔" (ایضاً صفحہ ۲۹)

یہ واقعہ نہایت اہم ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ زبان یا وہ رسم خط جس کا ان اقتباسات میں ذکر کیا گیا ہے "اردو" ہوگا۔ البتہ یہ صحیح ہوگا کہ وہ کوئی ایسی زبان ہو سکتی جس سے براہ راست یا بالواسطہ اُردو وجود میں آئی ہوگی۔ وہ سنسکرت ہو، پراکرت ہو یا کوئی اُپ بھرنش۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ ابتدا میں سنسکرت کو بھی "ہندی" کہا گیا ہے اور اپنے اس دعوی کے لئے موصوف نے دو سندیں پیش کی ہیں۔ اول خواجہ امیر خسرو کے یہ شعر ؎

زبان ہند ہم تازی مثال است
کہ آمیزش درآنجا بحال است
گر آئین عرب نحو است و گر صرف
ازاں آئیں دریں کم نیست یک حرف

اور دوسری سند بایں الفاظ ہے:۔

" عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ جہاں عبارت کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ جہاں عبارت براہ راست سنسکرت سے فارسی میں منتقل ہوئی اس لئے یہاں بھی ہندی سے سنسکرت ہی مراد لی جائے گی۔"
(سہ ماہی اُردو کراچی، اپریل ۱۹۶۲ء صفحہ ۹۸)

پروفیسر محمد مسعود احمد نے امیر خسرو کے مختلف بیانات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

" یہاں یہ اقتباس نہ ہونا چاہیئے کہ شاید اُردو زبان جس کو خسرو نے ہندی کہا ہے کہیں سنسکرت نہ ہو، نہیں، ہرگز ایسا نہیں ہے، سنسکرت جس کو اس زمانے میں رائج کرنے کی سعی نا حاصل کی جا رہی ہے آج سے سات سو برس پہلے بھی اسی طرح غیر معروف اور انجانی تھی، صرف برہمنوں کو اس کا علم تھا، ان کی بیویاں بھی اس زبان سے نا آشنا تھیں۔"
(نوائے ادب جولائی ۱۹۶۶ء صفحہ ۲۰)

ممکن ہے کہ خواجہ امیر خسرو نے "ہندی" میں سنسکرت کو شامل نہ کیا ہو لیکن دوسرے شواہد ڈاکٹر سبزواری کے خیال کے مؤید ہیں چنانچہ ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی نے بھی البیرونی کے حال میں لکھا ہے :۔

" البیرونی نے اپنی جملہ تصانیف میں کہیں بھی لفظ سنسکرت استعمال نہیں کیا ہے، یہی نہیں بلکہ انھوں نے ایک بار بھی لفظ پراکرت یا اُپ بھرنش بھی استعمال نہیں کیا ہے، دَور وسطی کے ہندوستانی پنڈتوں کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ سنسکرت اور دوسری زبانیں کوئی الگ الگ زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی آریہ سنسکرت زبان کی مختلف شکلیں ہیں۔ البیرونی نے بھی اس خیال کو تسلیم کر لیا تھا۔"
(بکھرے ورق صفحہ ۳۴)

اس طرح اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی

تمام زبانوں کو خواہ وہ سنسکرت ہوں، پراکرت ہوں یا اَپ بھرنش یا جدید بولیاں۔ زبان اہلِ ہند یا زبان ہندی یا ہندیہ یا ہندوی کے مشترک نام سے یاد کیا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ محمود خاں شیرانی نے لکھا ہے :۔

"مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر عجیب رہا ہے، وہ ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ پنجابی ہو یا برج ہو یا پوربی اُردو یا مارواڑی اور بنگالی۔"

(پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۳۶)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد رفتہ رفتہ فارسی مقبول ہوتی گئی۔ چنانچہ پروفیسر محمد مسعود احمد نے ابو عبداللہ محمد بن احمد شمس الدین (چوتھی صدی ہجری کے عشرہ ہشتم) کا قول ملتان کے بارے میں نقل کیا ہے :۔

"وفارسیۃ مفھومۃ" فارسی زبان عموماً سمجھی جاتی ہے۔

(نولکھا ادب، جولائی ۱۹۶۶ء صـ)

حکیم محمود ایاز نے برہان پور میں ۹۲۲ھ / ۱۵۱۶ء کے قریب ایک طبی رسالہ "مفتاح السرور عادل شاہی" تالیف کیا اس کا ایک قلمی نسخہ (نوشتہ ۱۰۰۰ھ / ۹۲-۱۵۹۱ء) راقم سطور کو پیلی بھیت میں دستیاب ہوا، اسکے "مقالہ دوم" کی "فصل اول" میں ہے :۔

"ادویہ مفردہ را ـــ دریں فصل یاد کنیم درسا می ہر یک بہ زبان ہندی انچہ یافت میشود در تحت آں بنویسیم۔"

اور اس عنوان سے جو الفاظ تحریر کئے گئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں :۔

[illegible]　　مروت　　ادھیا　　جھنگ

ادمغزالبط　　جبریلیہ　　انیسون　　جوہرکندہ
مغز سربط　　العصافیر　　رازیانہ رومی　　[illegible]
رشتہ　　کنجشک خانگی　　اسفیل مشوی　　[illegible]

ان میں بعض لفظ مثلاً جھنگہ (جھینگا)، جریلیا؛ اُردو میں رائج ہیں لیکن کنجشک خانگی، جوہر کندہ، رشتہ وغیرہ کو اُردو (ہندی) شاید مشکل ہی سے تسلیم کیا جا سکے اغلب ہے کہ دسویں صدی ہجری کے اوائل تک برہانپور کے علمی حلقوں میں فارسی مقامی بولی کی حد تک رائج ہو چکی تھی۔ بہرصورت قدیم کتابوں میں جب زبان کے معنی میں لفظ ہندوی، ہندی یا ہندیہ آئے تو اس کے صحیح مفہوم کا تعین کرتے ہوئے نہایت احتیاط کی ضرورت ہے ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس بابت لکھا ہے :۔

"گذشتہ آٹھ سو برس کے زمانے میں مطلقاً بلا قید مقام ہندی یا ہندوی کا لفظ ملک کی کسی علاقائی بولی کے لئے استعمال نہیں ہوا، ہندی سے کوئی مقامی زبان مراد نہیں لی گئی اور یہ ممکن بھی نہ تھا کہ ہندی کا اطلاق جس کے معنی ہیں ملک ہند کی زبان کسی خاص محدود علاقے کی زبان پر کیا جاتا۔"

(اُردو اپریل ۱۹۶۰ء صـ۹۶)

خواجہ امیر خسرو نے اپنے عہد کی ہندوستان کی مختلف بولیوں کی بابت اس طور پر صراحت کی ہے :۔

"There is at this in every every province a language peculiar to itself, and not borrowed from any other — Sindhi, Lahori, Kashmiri, the language of Dugar, Dh..., Samandar, Tilang, Gujrat,

Malabar, Gaur, Bengal, Oudh, Delhi and its environs

(نوائے ادب جولائی ۱۹۶۶ء ص۳۸)

اس اقتباس کو نقل کرنے کے بعد پروفیسر محمد مسعود احمد ہندی کے بارے میں جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں یہ ہیں:

"یہ بات قابل غور ہے کہ امیر خسرو نے صوبائی زبانوں میں سندھی لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی، گجراتی، تلنگی، معبری، دھور سمندری، اودھی اور دہلوی وغیرہ سب ہی باتوں کا ذکر کیا ہے مگر ان میں کہیں ہندی کا ذکر نہیں کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خسرو کے زمانے میں بھی یہ زبان صوبائی نہیں بلکہ ملکی اہمیت حاصل کر چکی تھی۔"

(ایضاً ص۳۸)

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ملک میں بالعموم چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم رہی ہیں، مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی مشرق میں شورشوں اور بورشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ دکن کے علاقہ کا بھی کم و بیش یہی حال رہا ایسی صورت میں کسی ملک گیر زبان کے وجود میں آنے کا امکان کم تھا۔ راقم سطور کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہاں آنے کے بعد یہاں کی تمام زبانوں کو ایک مشترک نام ہندی یا ہندوی سے یاد کیا بالکل اسی طرح جیسے اس ملک کے تمام باشندے "ہندو" کہلائے۔ خون رنگ و نسل اور عقیدہ و علاقے کے اعتبار سے ان کے مابین کتنے ہی اختلافات ہوں اسی طرح مختلف بولیوں کے درمیان چاہے کتنے ہی نمایاں اختلافات پائے جائیں وہ سب "ہندی" کہی گئیں۔ اس خیال کی تائید درج ذیل اقتباس سے ہوتی ہے:—

"شیخ علی متقی ۸۸۵ھ / ۱۴۸۰ء – ۹۷۵ھ / ۱۵۶۷-۶۸ء ہر شخص کے ساتھ اس کی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے چنانچہ ہندیوں کے ساتھ ہندی میں بات چیت کرتے تھے۔ شاہ منصور مجذوب برہانپوری .... کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اپنی ہندی زبان میں شیخ سے کہا کہ 'بھاکری پکانا مشکل ہے' بھاکری اس ملک کی زبان میں جوار کی روٹی کو کہتے ہیں۔"

(اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص۳۶)

اس طرح کسی بھی مقامی بولی کو اس کے مقامی نام کے علاوہ "ہندی" بھی کہا جا سکتا تھا لیکن جہاں کہیں لفظ "ہندی" استعمال ہوا ہے اس سے کون سی مخصوص علاقائی بولی مراد ہے۔ اس کا تعین مصنف کے مسکن سے کیا جائیگا یا پھر اس مخصوص بولی کی لسانیاتی خصوصیات پر توجہ کرنی ہوگی۔ لفظ "ہندی" کو کسی خاص علاقے کی بولی تک محدود خیال کر لینا بعض اوقات نہایت گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ کسی مقامی بولی کے نام کے استعمال کے سلسلے میں بھی احتیاط لازم درست ہے مثال کے طور پر ڈاکٹر محمد باقر نے لکھا ہے:—

"خود پنجاب کا لفظ ہمارے ہند و پاک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جہانگیر کے عہد ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء – ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء میں استعمال ہوتا ہے اور غالباً وہی پہلا شخص ہے جو اپنی تزک میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے .....

..... جس زبان کو ہم اس وقت پنجابی کہہ رہے ہیں اس کا نام بھی کچھ اور ہوگا۔"

(اُردو، جنوری ۱۹۶۸ء ص۳۸)

اسی طرح بعض دوسری بولیوں کے ناموں کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

تنقیدی تجزیے

کاظم علی خاں صاحب انچارج شیعہ کالج سٹی برانچ لکھنؤ کے تنقیدی مضامین کا وہ مجموعہ ہے:-

۱- جس کی تیاری میں موصوف نے اُردو ادب کے پوسٹ گریجویٹ اور ڈگری درجات کے طلباء کی نصابی ضروریات اور عام شائقین ادب کی لطیف ادبی ذوق کے مطالبات کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

۲- جس کے مضامین کی تیاری میں لاتعداد معیاری کتب کی ورق گردانی کرکے زیر بحث موضوعات پر چلنے والے مواد کو نچوڑ لیا گیا ہے اور لاتعداد اہم و معیاری کتابوں کا یہ نچوڑ بڑے سلیقے سے مصنف نے اپنے نظریات کی حمایت میں پیش کیا ہے۔ ان کتابوں میں ایک بڑی تعداد میں (پی ایچ ڈی، ڈی لٹ اور ڈی لٹ وغیرہ کی ڈگریوں کے لئے منظور شدہ) تحقیقی مقالے بھی شامل ہیں۔

۳- جسکے مضامین بلحاظ حجم ضخیم اور بلحاظ معیار پر مواد وقیع ہیں

۴- جس کی مجموعی ضخامت تقریباً تین سو صفحات ہے۔

۵- جسمیں ہجویات سودا۔ غزلیات آتش۔ مثنوی سحرالبیان از میر حسن۔ ناول امراؤ جان ادا از رسوا اور مراثی انیس سے متعلق ایسے مضامین ہیں جو طلبا کیلئے انتہائی مفید اور عام شائقین ادب کیلئے بہت زیادہ دلچسپ ثابت ہونگے

۶- جو ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ کے ذریعہ فروری ۱۹۷۲ء کے آخر تک منظر عام پر آگیا ہے اور آجکل تیزی سے طباعت کے مرحلوں سے گذر رہا ہے۔ طلباء اور شائقین ادب جلد از جلد ہم سے طلب فرمائیں۔

(زیر طبع)

ادارۂ فروغ اُردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ کا

مولانا عبدالماجد نمبر

جسمیں ۵۴ ہندو پاکستان کے نامور اہل قلم نے نمایاں طور پر حصہ لیا ہے اور مولانا ممدوح کی زندگی کے جملہ مدارج پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جس سے مولانا کی شخصیت کے ہر پہلو پر مکمل طور پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کی گوناگوں شخصیت کیا اور اب کس منزل پر جلوہ فگن ہے۔

قیمت نو روپیہ

خریداران ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ کیلئے

۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء تک چار آنہ فی روپیہ کی

خاص رعایت

جو خریداران ماہنامہ فروغ اُردو ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتب ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء تک طلب فرماوینگے ان کو چار آنہ فی روپیہ کی خاص رعایت کیجائیگی مگر کم از کم پچاس روپیہ کی کتب کی خریداری پر یہ رعایت ممکن ہوگی اور درج ذیل کوپن بھی ان کو ہمراہ آرڈر روانہ کرنا ہوگا۔

کوپن خریداران ماہنامہ فروغ اُردو

نام ....

پتہ ....

اسٹیشن ....

کاظم علی خاں۔ انچارج شیعہ کالج سٹی برانچ

کلامِ ولی پر آزاد کی علمی تنقید کا تجزیہ — آبِ حیات کے آئینہ میں

زیرِ نظر مضمون [illegible] کاظم علی خاں کی کتاب "آبِ حیات کا تنقیدی تجزیہ" کا ایک حصہ ہے [illegible] قابلِ قدر تنقیدی کتاب کا بیشتر حصہ [illegible] قارئین فروغ اردو [illegible] تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تنقیدی تجزیے" بہت جلد ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ [illegible] بیشِ نظر مضمون پر اپنی رائے دینے کی زحمت فرمائیں ——— ادارۂ فروغ اردو [illegible] اور ابھرتے ہوئے فنکاروں سے متعارف کراتا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نامور صاحبانِ قلم کی نگارشات کو بھی شائع کرنے کا فخر و شرف رکھتا ہے۔

(احمد حسین شمس علوی)

آبِ حیات میں آزاد نے بعض وجوہ کے باعث اردو ادب کے ارتقاء میں دکن کی خدمات کو نظر انداز کیا ہے ولی کے وطن کو میر کے برخلاف قدرت اللہ قاسم کے تذکرہ کی بنیاد پر اورنگ آباد کے بجائے گجرات بتاتا ہے ولی کے کلام کی نشو و نما میں معاون دکنی ادبی روایات کو بھی آزاد اپنے بعض نظریات کے پیشِ نظر نظر انداز کرتے ہیں۔ ولی کے بیان میں آبِ حیات متعدد تحقیقی فروگذاشتوں کی حامل نظر آتی ہے لیکن ان تمام امور کے باوجود ولی کا بیان آبِ حیات میں آزاد کی عملی تنقید کا قابلِ قدر نمونہ کہا جا سکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ بعض اہم ناقد آبِ حیات اور آزاد کو جدید اردو تنقید کا ذکر کرتے ہوئے نظر انداز کر دیتے ہیں اور جدید اردو تنقید کی ابتدا حالی سے بتانے پر مصر[1] رہتے ہیں حالانکہ حقائق و شواہد ان کے اصرار کو صدا و بے جا ثابت کرتے ہیں۔ آزاد کی عملی تنقید کے نمونے آبِ حیات میں متعدد مقامات پر ملتے ہیں۔ ولی کا

---

[1] کلیم الدین احمد، احسن فاروقی وغیرہ کے علاوہ اختر انصاری اور آل احمد سرور بھی اپنی بعض نگارشات کی بنیاد پر اس فہرست میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ کتاب "اردو تنقید کے معیار" میں اختر انصاری کا مضمون ہمارے پیشِ نظر ہے کتاب مذکور کا صفحہ ۵۹ دیکھا جا سکتا ہے۔ سرور صاحب کی کتاب تنقیدی اشارے کا صفحہ ۱۹۶ بھی ہمارے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔

بیان آزاد کی عملی تنقید کا سب سے بہتر نمونہ نہیں لیکن پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آزاد کے تنقیدی شعور کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے آبِ حیات میں ولی کی غزلوں کے منتخب اشعار کے بجائے ان کی متعدد غزلیں پوری پوری پیش کر دی ہیں جس کی وجہ آزاد کے الفاظ میں یہ ہے :۔

"تذکرہ نویسوں کا دستور ہے کہ جب شاعر کا حال لکھتے ہیں تو اسکے اشعار انتخاب کر کے لکھتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فیضانِ سخن رائگاں نہیں جاتا۔ نظیر کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ میر سے پہلو مارتے ہیں۔ پس اگر نظیر کا ذکر لکھ کر اسکے چند شعر منتخب لکھ دیے تو ناواقف سوائے اسکے کہ نظیر کو میر کا ہم پلہ شاعر سمجھے اور کیا تصور کر سکتا ہے (اور قارئین کو اس مغالطہ کن صورتِ حال سے محفوظ رکھنے کے لیے آزاد اپنا طریقہ کار یہ رکھتے ہیں کہ) ...... میں اُن (ولی) کے دیوان سے نیک نیتی کے ساتھ چند غزلیں پوری کی پوری لکھ دوں گا تاکہ اصلیت حال ظاہر ہو جائے۔"[۴]

آبِ حیات میں آزاد کے اس سلجھے ہوئے طریقہ کار کے مقابلہ میں جب ہم موازنۂ انیس و دبیر میں شبلی کی تنقید کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی نے انیس کے منتخب و اعلیٰ اشعار کے مقابلے میں چُن چُن کر دبیر کے معمولی شعر رکھ دیے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے دبیر کی صحیح عظمتوں تک پہونچنے کے بجائے گمراہ ہو جاتے ہیں تقابلی تنقید کی دشواریوں سے شبلی صحیح طور پر عہدہ برآ ہونے میں موازنہ میں ناکام رہے ہیں وہ انیس کی بے جا پاس داری اور دبیر کی مختلف و متعدد عظمتوں اور خوبیوں سے انکار کرتے ہیں یا انھیں کلام دبیر کے محاسن سے چشم پوشی کرتے ہوئے نظر انداز فرما دیتے ہیں ان امور پر ہم نے اپنی دبیر سے متعلق کتاب میں بحث کی ہے[۵] لطف یہ ہے کہ آزاد کی بے جا پاس داریوں کی فہرست مرتب کرنے والے شبلی کی اس صریحی بے جا پاس داری کو شبلی کے بے جا پاسداری کے پیشِ نظر، نظر انداز کر دیتے ہیں البتہ بعض ناقدوں نے ضرور شبلی کی تنقید کی اس خامی کی نشاندہی کی ہے۔ حامد حسین قادری اور فوق مرحوم اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہیں[۶]۔

آزاد نے ولی کی شاعری کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا ہے۔ شمالی ہند کی ادبی روایات کے پس منظر میں کلامِ ولی کی نشو و نما کا جائزہ بھی لینے کی کوشش کی ہے۔ ولی کی شاعری کے نقوش سے ولی کی شخصیت و علمی استعداد کا بھی خاکہ پیش کیا ہے آبِ حیات کی مندرجہ ذیل عبارت متذکرہ بالا خصوصیات کی مظہر محسوس ہوتی ہے :۔

"..... ایسے وقت میں کہ ہماری زبان زورِ بیان میں ایک طفلِ نو رفتار تھی جو انگلی کے سہارے بغیر نہ چل سکے۔ پس جتنے قدم کہ آگے بڑھی وہی (ولی) کی پرورش کے سہارے سے بڑھی۔ اُردو زبان اس وقت سوائے ہندی کے دوہروں اور بھاشا کے مضامین کے اور کسی قابل نہ تھی۔ انھوں نے اسمیں فارسی کی ترکیبیں اور فارسی کو بھی داخل کیا ..... ان کے اشعار سے معلوم ہوگا کہ وہ قواعد عروض کی طرح زبان عربی سے ناواقف تھے پھر بھی کلام کہتا ہے کہ

---

[۴] آبِ حیات ص ۹۴

[۵] اردو مرثیہ اور مرزا دبیر از راقم (کاظم علی خاں)

[۶] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ص ۶۴۱ - ۶۴۲۔ اس کے ساتھ المیزان۔ از فوق بھی ملاحظہ ہو۔

> فارسیت کی استعداد درست تھی۔ اُن کی انشا پردازی اور شاعری کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا ہے کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے ہیں مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی ہے۔[1]

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے (آزاد سے بجا طور پر اختلاف کرتے ہوئے) کلام ولی کے داخلی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ ولی عربی و قواعدِ عروض پر اچھی قدرت رکھتے تھے[2] لیکن آزاد نے اُردو شاعری کے نشو و نما اور ترقی میں ولی کی خدمات کا محولہ بالا اقتباس میں اور اس کے علاوہ بھی دوسرے مقامات پر پوری طرح احساس و اعتراف کیا ہے۔

کلامِ ولی میں آزاد نے متانت کے اہم وصف کو محسوس کرنے کے باوجود معاصرانہ چشمک کے عنصر کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اس سلسلے میں آزاد نے لکھا ہے :-

> "سودا کی طرح کسی سے دست و گریبان نہیں ہوئے مگر اپنے ہمعصروں پر چوٹیں کی ہیں چنانچہ ناصر علی سرہندی کے معاملہ سے ظاہر ہے۔"[3]

ولی کی شاعری میں آزاد عہدِ ولی کی جھلک بھی تلاش کرتے ہیں۔ آزاد کی متعدد عبارات ادب اور زندگی کے رشتہ سے متعلق ان کے شعور کی مظہر ہیں۔ آزاد کی مندرجہ ذیل عبارت بتاتی ہے کہ مغربی ادبیات اور فکریات کی روشنی ان کے ذہنوں تک پہونچ چکی تھی یہ عہدِ آزاد کی روشن خیالی کا عطیہ تھا جس کی مدد سے آزاد پر ادب اور زندگی کے تعلق کی حقیقت منکشف ہو چکی تھی آبِ حیات کی یہ عبارت اس امر کی مظہر کہی جا سکتی ہے :-

> "(ولی) کا دیوان اس عہد کے شاعروں کی بولتی تصویر ہے کیونکہ اگر آج دریافت کرنا چاہیں کہ اُس وقت کے اُمرا و شرفا کی کیا زبان تھی؟ تو اس کی کیفیت سوا دیوانِ ولی کے اور کوئی نہیں بتا سکتا۔"[4]

قدیم تذکرہ نگاروں کے برخلاف آزاد کلامِ ولی کی خصوصیات کی فہرست مرتب کرنے پر اکتفا نہیں کرتے آزاد کی عملی تنقید ولی کی فنی تخلیقات کے سطحی مطالعہ کے بجائے ان کی گہرائیوں میں جا کر کلام ولی سے متعلق چند قابلِ قدر انمول۔ بیش قیمت گوہر اور ایسے نایاب موتی نکال لاتی ہے جو آزاد سے قبل کے ناقدوں کی دسترس سے عام طور پر باہر رہے ہیں۔ آزاد کلام ولی کی خصوصیات کو پیش کرنے کے ساتھ بعض اہم خصوصیات کے محرکات و عوامل کا (عہدِ ولی کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی مدد سے) تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ آزاد کی تنقید کی یہ ایسی اہم امتیازی صفت ہے جو ۱۸۸۰ء میں شائع ہونے والی کتاب آبِ حیات کو جدید اُردو تنقید کی کتابوں میں سرِ فہرست جگہ دیتی ہے۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا ہے بعض ناقد اسی سے جدید اُردو تنقید کی ابتدا بتاتے ہیں حالانکہ جدید اُردو تنقید اپنی اہم خصوصیات کے ساتھ ۱۸۸۰ء میں پہلی مرتبہ شائع ہونے والی آزاد کی کتاب آبِ حیات میں بھرپور طور پر جلوہ گر نظر آتی ہے اور اس وقت تک حالی دستکی

---

[1] آبِ حیات۔ محمد حسین آزاد۔ ص ۸۸-۸۹
[2] کلیاتِ ولی۔ مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص ۱۳-۱۴۔
[3] آبِ حیات ص ۸۹
[4] آبِ حیات ص ۹۰

کی کسی تنقیدی تصنیف کا وجود ثابت نہیں[1] لیکن حقیقت بینی سے محروم کم نظر نا قدان حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے ان امور کو اگر نظر انداز کر جائیں تو اس سے حقائق تو نہیں بدلتے۔ مرحوم اختر انصاری اور پروفیسر آل احمد سرور نے اگرچہ آزاد کو نظر انداز فرما کر اپنی محولہ بالا نگارشات میں حالی کو جدید اردو تنقید کا بانی قرار دیا ہے لیکن ہمیں اُمید ہے کہ یہ حضرات اپنی وسعت نظر اور وسیع القلبی کے باعث ہمارے نظریات پر اظہار برہمی فرمانے کے بجائے ان کی راستی یا کجی کے متعلق مدلل فیصلہ دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے اصول و نظریات میں کسی کو اختلاف کے حق سے محروم کرنا ان حضرات کی رائے میں بھی اصولی طور پر غلط ہو گا۔ کلامِ ولی پر آزاد کی عملی تنقید سے ہم اپنے دعوی کی صداقت کا مزید ثبوت پیش کر رہے ہیں نظر انصاف ڈال کر فیصلہ

[1] آب حیات کی پہلی اشاعت کا سن بعض اہم کتب (مثلاً (۱) داستان تاریخ اُردو۔ حامد حسن قادری۔ (۲) تاریخ ادب اُردو۔ رام بابو سکسینہ (۳) اُردو تنقید کا ارتقا۔ عبادت بریلوی (۴) آب حیات کا تنقیدی مطالعہ۔ مسعود حسن رضوی (۵) اور جہاں تک ہم تلاش کر سکے ہیں "جدید اُردو تنقید۔ اُصول و نظریات۔ ڈاکٹر شارب (ردولوی)) میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اپنی کتاب "ادب کیا ہے۔" میں آب حیات کی اشاعت کا سن کسی تسامح کے تحت (ص ص ۱۰۱-۱۰۲ پر) ۱۸۸۶ء بتاتے ہیں لیکن آزاد پر اہم تحقیقی مقالہ "محمد حسین آزاد جلد دوم۔ از ڈاکٹر اسلم فرخی (ص ۶) سے آب حیات کی پہلی اشاعت ۱۸۸۰ء ثابت ہوتی ہے۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی اشاعت ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ اور شبلی کی تنقیدی تصانیف اس کے بھی بعد وجود میں آئیں ان امور کے لئے ملاحظہ ہو "اُردو تنقید کا ارتقا" از ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص ۱۸۸

ذی فہم قارئین خود ہی کر سکتے ہیں۔

آزاد آب حیات میں کلام ولی کے اہم وصف کی عام تذکرہ نگاروں کیطرح محض نشان دہی نہیں آزاد عہد ولی کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں کلام کے تصوف کے محرکات و عوامل بھی تلاش کرتے ہیں گ وہ ادبی تخلیق یا شاعری کو عصری ماحول کے اثرا سے عاری نہیں سمجھتے۔ اس طرح نظم آزاد میں آزاد کا ش سے متعلق پیش کیا جانے والا وہ مابعد الطبیعاتی یا نظریہ کہ "شعر ایک پرتو روح القدس کا اور فیضان ز الٰہی کا ہے کہ اہل دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے آ حیات میں بدل جاتا ہے اور اب آزاد شاعری کو عوا عوامل کا نتیجہ۔ عصری ماحول کی زائیدہ و پروردہ سماج پیداوار سمجھتے ہیں آب حیات آزاد کے تنقیدی شعور کے ا کی مظہر ہے لہٰذا آزاد کے تنقیدی نظریات میں تضاد کا مظ قرار دینا درست نہیں ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے تحقیقی مقالہ میں ایک مقام پر یہی تسامح فرمایا ہے (ملاحظہ ہو محمد حسین آزاد جلد دوم از ڈاکٹر اسلم فرخی۔ ص ص ۸۲-۱۶) آب حیات کی یہ عبارت کلامِ ولی میں تصوف یا صوفیانہ عناصر کو ولی کے عصری ماحول ولی کے خاندانی روایات اور اردو شاعری پر ہندی و فارسی شاعری کے صوفیانہ اثرات کا نتیجہ ثابت کرتی ہے۔ کلامِ ولی کے صوفیانہ عناصر کے عوامل و محرکات کا تجزیہ آزاد آب حیات میں یوں پیش کرتے ہیں۔

[2] نظم آزاد۔ لیکچر

"...ظاہر ہے کہ جب دولت کی بہتات اور عیش و نشاط میں کچھ نیکی پر خیالات آتے ہیں۔ تو صوفیانہ لباس میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت محمد شاہی دور نے در و دیوار کو دولت سے مست کر رکھا تھا جس سے تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ دوسرے دلی خود فقر کے خاندان عالی سے تھے اور فقیر ہی کے دیکھنے والے بھی تھے (گذا؟) تیسرے زبان اردو کے والدین یعنی بھاشا اور فارسی بھی صوفی ہی رہا تھے رہے کر برج بھاشا کے مقابلے کھڑی بولی سے اردو کا رشتہ (...زیادہ قریبی ثابت کیا جا چکا ہے) ان حضرات نے اسے بھی تصوف شاعرانہ میں ڈالا۔"[1]

آزاد کی تنقید کا یہ نمونہ دور جدید کی اردو تنقید میں ... کئے جانے والے مغربی تنقیدی نظریات و اثرات کی ... اور عمدہ مثال ہے۔ آزاد کی اس عبارت میں ہمیں فرانسیسی ناقدین سینٹ بیو اور تین (TAINE) کے ... تنقیدی نظریات کا شعور اور ان کا صاف اور واضح طور پر جلوہ گر محسوس ہوتا ہے اور یہ عہد آزاد کی اس روشن خیالی کی دین ہے جس کے تحت مغربی ادبیات اور فکریات کا روشنی بنگالی ادب سے طلوع ہو کر ہندوستان کے شمالی اور مغربی حصوں تک پہنچی ہندی ادب میں کبھار تیندو ہریش چندر کی نگارشات اور اردو ادب میں سر سید ...

ان رفقا اور محمد حسین آزاد کی نگارشات کے ذریعہ پھیل رہی تھی۔ آزاد اگرچہ آب حیات بنگال سے دور پنجاب میں لکھ رہے تھے لیکن مغربی ادبیات کے اثرات سے آزاد تک مختلف طریقوں اور ذریعوں سے پہونچ رہے تھے۔

آزاد تک مغربی نظریات و ادبیات کی روشنی جن ذرائع سے پہنچی ان میں دہلی کالج سر فہرست جگہ پاتا ہے آزاد کی تعلیم اسی دہلی کالج میں ہوئی تھی جہاں مغربی علوم کی کتابوں کو ان کے اردو ترجموں کی مدد سے پڑھایا جاتا تھا۔[2] آزاد نے خود آب حیات میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ (آب حیات ص ص ۲۶ - ۲۷) دہلی کالج کے تحت ۱۸۴۲ء میں قائم ہونے والی ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی مغربی علوم کے اردو ترجمے پیش کر رہی تھی جن کے ذریعہ آزاد مغربی علوم کی روشنی حاصل کرتے رہے تھے کہ آل احمد سرور نے اسی سوسائٹی کو سر سید کی ۱۸۶۳ء میں قائم ہونے والی سائنٹفک سوسائٹی کا محرک محسوس کیا ہے[3] جس کے لئے سر سید نے مغربی علوم کی کتب کے ترجمے ہندوستانی زبانوں میں کرانا شروع کئے تھے۔[4] اس کے علاوہ آزاد تک ان مغربی

---

[1] آب حیات ص۔ ۹۲

[2] اس امر کے لئے ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ طفیل احمد منگلوری ص۔ ۱۶۱

[3] علی گڑھ تحریک۔ مرتبہ نسیم قریشی ص۔ ۵۶

[4] اس امر کے لئے حاتم (کاسم علی خاں) کی انگریزی کتاب سر سید اینڈ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔ شائع کردہ ... کیندر لکھنؤ (ص ص ۱۲ - ۱۳) بھی دیکھی جاسکتی ہے

نظریات تنقید اور مغربی ادبیات کی روشنی کی رسائی میجر فلر، کرنل ہالرائڈ اور ڈاکٹر لائٹنر کے فیض صحت کا بھی نتیجہ ہوسکتی ہے۔ ۱۸۶۵ء میں آزاد کا سفر کلکتہ بھی اس سلسلے میں اہم اور روشن امکانات کا حامل ہوسکتا ہے یہ امور تحقیق کی روشنی چاہتے ہیں تاکہ پتہ چل سکے کہ غالب کے سفر کلکتہ جس طرح ان کی بعض تخلیقات پر براثر انداز ہوا اسی طرح آزاد کی تصانیف کہاں تک سفر کلکتہ کے اثرات رکھتی ہیں؟ بہرحال دہلی کالج میں آزاد کی تعلیم ؎۱ انگریز عالموں سے آزاد کا ربط و ضبط ؎۲ اور آزاد کا سفر کلکتہ وغیرہ ؎۳ آزاد کے تنقیدی شعور کی نشو و نما میں معاون معلوم ہوتے ہیں غرضکہ آزاد مغربی نظریات تنقید سے روشناس ہوتے رہے آزاد کا یہی تنقیدی شعور کلام ولی پر تنقید میں مغربی نظریات تنقید کے قابل قدر علمی نمونے پیش کرنے میں آزاد کی رہنمائی اور مدد کرتا ہے

کلام ولی میں تصوف کے محرکات کے تجزیہ سے متعلق آب حیات کے تذکرہ بالا اقتباس کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم فرانسیسی ناقدین سینٹ بیو اور اس کے شاگرد تین (TAINE) کے تنقیدی نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں (جو عہد حاضر میں جدید ناقدین کی تنقیدی نگارشات میں مرکزی حیثیت واہمیت رکھتے ہیں) تو ہمیں آزاد اور تین کے درمیان حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے اور تین کی تاریخی یا سائنٹفک تنقید کی روشنی سے آب حیات فیضیاب محسوس ہوتی ہے۔ آب حیات میں کلام ولی پر آزاد کا محولہ بالا علمی تنقید کا نمونہ پیش نظر رکھ کر تین کے تنقیدی نظریات کا جائزہ ہمارے قول کی تائید کرتا ہے۔ "فلاسفی آف آرٹ" میں تین کے یہ خیالات ملاحظہ ہوں۔

> "فن کوئی ایسی شے نہیں جو اپنے ماحول سے منقطع اور بے نیاز ہو۔ لہٰذا اُسے سمجھنے کے لئے ہمیں اس عہد کے ذہنی اور معاشرتی حالات۔ محرکات کا لازمی طور پر مطالعہ کرنا ہوگا جو اس کی تخلیق کا باعث ہوئے ...... تمام فنکار جزوی طور پر اپنے زمانے کی پیداوار ہوتے ہیں" ؎۴

اس کے علاوہ تین فنکار کی صلاحیتوں پر نسل وغیرہ کے اثرات کو بھی تسلیم کرتا ہے تین کے خیال میں کسی شاعر کی ادبی تخلیق پر تنقید کرنے میں اس شاعر یا فنکار کی صلاحیتوں کے ماخذ نسل۔ ماحول اور زمانہ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور آزاد کی محولہ بالا عبارت کلام ولی کے صوفیانہ عناصر کا تجزیہ تین کے نظریات کی بنیاد پر ہی پیش کرتی ہے یہ الگ بات ہے کہ تین کے نظریہ کی خامی فلابیر نے یوں محسوس

؎۱ نیرنگ خیال۔ حصہ اوّل۔ مرتبہ ڈاکٹر جعفر رضا ص۔ ۶

؎۲ (الف) داستان تاریخ اُردو۔ حامد حسن قادری ص ۳۸۵

(ب) نیرنگ خیال حصہ اوّل مرتبہ جعفر رضا ص ۹

؎۳ داستان تاریخ اردو ص ۳۸۵۔

؎۴ تاریخ جمالیات جلد دوم۔ نصیر احمد ناصر ص ۲۶۹

بحوالہ جدید اُردو تنقید۔ از ڈاکٹر شارب ردولوی ص ۳۲۶

ی ہے کہ اس میں فنکار کی ذاتی صلاحیت کو نظر انداز کیا گیا ہے بہرحال مغربی ناقدوں کے تنقیدی نظریات پر گفتگو ہمارا موضوع نہیں ہے۔ آزاد کی تنقید میں مغربی تنقید کی اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے آزاد کی تنقید کو دور قدیم کی اردو تنقید سے منفرد مختلف اور عہد جدید کی تنقید سے مماثل ہم رنگ ثابت کرنے کے لئے تائیدی شواہد پیش کرنا مقصود تھے۔

آزاد آب حیات میں دلی کے تصوف کے اہم محرکات کا تجزیہ کرنے کے بعد اردو شاعری میں تصوف کے استعمال اور اس کی افادیت کے امکانات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ جو عہد آزاد کی روشن خیالی کے سبب ادب اور زندگی میں احساس اصلاح بیدار ہونے کا نتیجہ ہے اردو شاعری میں تصوف پر آزاد کے نظریات ملاحظہ کریں:-

"اگرچہ اس اعتبار سے یہ نہایت خوشنما طریقہ ہے کہ عمدہ عمدہ [illegible] یعنی تصوف [illegible] لباس میں ہماری زبان میں آیا۔ مگر اس [illegible] کا افسوس ہے کہ کوئی ملکی فائدہ اس سے نہ ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی عالی یا آئینی رستے سے نہیں آیا بلکہ فقرانہ شوق یا توہیج کی ہوا سے اڑ کر آگیا۔ کاش شاہنامہ کے ڈھنگ سے آتا کہ محمد شاہی عاشقی اور عیش پرستی کا خون بہاتا اور اہل ملک کو بہادری اور ناموری کے میدانوں میں لا ڈالتا یا تہذیب و شائستگی سے اکبری عہد کو پھر زندہ کر دیتا"۔[1]

ولی کے کلام پر آب حیات میں آزاد کی محاکمہ تنقید کی مدد سے آزاد کے تنقیدی نظریات کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے جن میں سے چند نظریوں کی نشاندہی سطور گزشتہ میں ہم کر چکے ہیں ان کے علاوہ آزاد کی نظری تنقید کا یہ اصول بھی ہمیں [illegible] ہے کہ آزاد قدیم تذکرہ نگاروں کے برخلاف شعر و ادب کو محض فنکار کی انفرادی کوشش کا نتیجہ نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ فنی تخلیقات یا فنکار کے عصری ماحول، ادبی اور معاشرتی روایات اور فنکار کے مذاق و مزاج کی اہمیت کا بھی احساس رکھتے تھے۔ آزاد کے قبل قدیم اور تذکرہ نگار فنی تخلیق کو فنکار کا انفرادی فعل قرار دیتے تھے لیکن آزاد نے شعر و ادب کو اجتماعی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے شعر و ادب کو محض ذریعہ تفریح بھی نہیں سمجھا ہے اور ادب کے افادی پہلو کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ یہ نظریات عہد آزاد کی روشن خیالی کے تحت عقلیت پسندی کے رجحانات کی دین ہیں اور ان کی بنیاد پر آزاد بہ خوبی جدید اردو تنقید کے اہم رہنماؤں حالی اور شبلی وغیرہ کے پیش رو کا لقب حاصل کرنے کے اہل ثابت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے

---

[1] آب حیات۔ ص ص ۹۲۔ ۹۳

اسی لئے لکھا ہے کہ آزاد کے نزدیک ادب "محض ادب کی گڑھت نہیں بلکہ اس کی جڑیں معاشرت میں دور تک ڈوبی رہتی ہیں"۔ ۱؎ اسی لئے ڈاکٹر مسیح الزماں نے یہ بھی نظریہ قائم کر دیا ہے کہ "اردو تنقید میں ایک مجدد اور پیش رو کا لقب حالی سے زیادہ آزاد پر زیب دیتا ہے"۔ ۲؎ ڈاکٹر محمد عقیل نے بھی اردو میں تاریخی تنقید کی ابتدا آب حیات میں ہی بتائی ہے موصوف لکھتے ہیں:-

"تاریخی تنقید کے شعور کی روایت بہت پرانی نہیں ہے یورپی ادب میں جرمنوں نے فروغ کیا فرانس میں سینٹ بیو اور تین نے اسے اپنے طریقوں پر عام کرنے کی کوششیں کیں اور اردو میں یہ رجحان ترقی پسند تحریک کے ساتھ باضابطہ طور پر داخل ہوا۔ اگر کوئی چاہے تو اس کے ابتدائی نقوش محمد حسین آزاد کی آب حیات میں تلاش کر سکتا ہے۔" ۳؎

ان حقائق سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جدید اردو تنقید کی بنیاد آزاد نے رکھی مگر اس بنیاد پر بعد میں اگر حالی اور شبلی اپنی زبردست صلاحیتوں سے جدید اردو تنقید کی عمارت کو بلند نہ کرتے تو آزاد کا

۱؎ [illegible] ڈاکٹر مسیح الزماں ص۔ ۱۹۹
۲؎ " " " ص۔ ۲۰۳
۳؎ تنقید کے بنیادی مسائل۔ مرتبہ آل احمد سرور۔ ص۔ ۱۱۳

کام نامکمل ہی رہ جاتا۔ جدید اردو تنقید دراصل آزاد، حالی اور شبلی کی ہی کوششوں سے عہد تغیر میں پروان چڑھی اور آج اپنی ترقی یافتہ شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ جدید اردو تنقید کے ارتقا میں آزاد کی آب حیات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

بہرحال ولی کے بیان میں آزاد کی عملی تنقید کے قابل قدر بلکہ یادگار نمونے موجود ہیں۔ ولی کے دہلی پہنچنے پر اردو شاعری میں جو زبردست انقلاب پیدا ہوا اسے آزاد نے بڑے دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے آزاد کی یہ عبارت کافی مشہور اور مقبول ثابت ہوئی ہے۔

"غرض جب ان کا دیوان دلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔ قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبانوں سے پڑھا۔ گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔" ۱؎

آزاد کی تنقید سرسید اور ان کے رفقا کے برعکس کسی سیاسی یا سماجی تحریک کے بل بوتے پر نہیں قائم ہے آزاد نے اردو تصانیف نثر کی ادبی ساکھ قائم کی ہے آب حیات موضوع اسلوب دونوں ہی اعتبار

۱؎ آب حیات۔ ص۔ ۹۲

ـ آزاد کی شاہکار کتاب ہے آزاد کی نثر کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ نے جو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے اس سے اسلوب آزاد پر بھی روشنی پڑتی ہے اور آزاد کے ادبی قد و قامت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے ڈاکٹر سید عبداللہ کے اس اقتباس ہی پر ہم اس مضمون کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ محمد حسین آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"آزاد کا ادب خالص ادبی خلوص کا نتیجہ تھا اور اسی لئے کم از کم میں آزاد کے برترین ادبی رتبہ کا اعتقاد رکھتا ہوں اور ان کو اردو کا سب سے بڑا ادیب مانتا ہوں ...... آزاد کی نثر میں ... تاثیر، مصوری اور پیرا آفرینی کے وہ سب انداز ہیں جو اکثر اوقات شاعری کی رفعتوں تک پہنچ جاتے ہیں اور ذوق سلیم کی ان امنگوں کی تشفی کرتے ہیں جن کی خلاقی روح انسانی کے باطن میں مرکوز مضمر ہے۔"[1]

کتابیات:

نوٹ:۔ اس مضمون میں جن کتابوں کے حوالے پیش کیے گئے ہیں ان کی مکمل تفصیل یہ ہے:۔

(۱) اردو تنقید پر ایک نظر۔ کلیم الدین احمد۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ (۱۹۶۶ء تیسرا ایڈیشن) (۲) اردو میں تنقید ڈاکٹر احسن فاروقی۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ (۳) اردو تنقید کے معمار۔ مرتبہ ایم حبیب خاں۔ انڈین بک ہاؤس علی گڑھ (۱۹۶۵ء)۔ (۴) تنقیدی اشارے آل احمد سرور۔ فروغ اردو لکھنؤ (طبع چہارم ۱۹۶۲ء) (۵) آب حیات۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ رام نرائن لال پبلشر الہ آباد (۱۹۶۲ء) (۶) اردو مرثیہ اور مرزا دبیر۔ از راقم (کاظم علی خاں) احباب پبلشرز لکھنؤ طبع اول۔ (۷) داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری (طبع دوم [illegible] آگرہ) (۸) المیزان۔ فوق مہانی (۹) کلیات ولی۔ مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ طبع دوم ۱۹۴۵ء) (۱۰) تاریخ ادب اردو۔ مصنفہ رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور (۱۱) اردو تنقید کا ارتقاء۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ اردو مرکز دہلی (اشاعت ثانی ۱۹۶۴ء) (۱۲) آب حیات کا تنقیدی مطالعہ۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر لکھنؤ (طبع دوم ۱۹۶۴ء) (۱۳) جدید اردو تنقید، اصول و نظریات۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ کتاب پبلشرز لکھنؤ (طبع اول اگست ۱۹۶۸ء) (۱۴) ادب کیا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ (تیسرا ایڈیشن) (۱۵) محمد حسین آزاد (جلد دوم) ڈاکٹر اسلم فرخی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (اشاعت اول ۱۹۶۵ء) (۱۶) نظم آزاد۔ محمد حسین آزاد

---

[1] [illegible] ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ص ۳۴۷

نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس لاہور (طبع دوم مطبوعہ ۱۹۶۵ء) مملوکہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی۔

(۱۷) مسلمانوں کا روشن مستقبل — طفیل احمد منگلوری
کتب خانہ عزیزیہ دہلی (۱۹۴۵ء)

۱۸- علی گڈھ تحریک — مرتبہ نسیم قریشی۔
(طبع اول ۱۹۶۰ء)

۱۹- انگریزی کتاب — سرسید اینڈ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ ازراقم (کاظم علی خاں)
پرکاشن کیندر لکھنؤ (طبع اول)

۲۰- نیرنگ خیال حصہ اول — محمد حسین آزاد۔
مرتبہ ڈاکٹر جعفر رضا۔ شائع کردہ رام نرائن لال الہ آباد
(مطبوعہ ۱۹۶۷ء)

۲- تاریخ جمالیات جلد دوم۔ نصیر احمد ناصر۔ بحوالہ جدید اردو تنقید از شارب ردولوی۔

۲- معیار و میزان — ڈاکٹر مسیح الزماں۔ رام نرائن لال الہ آباد (پہلی اشاعت ۱۹۶۸ء)

۲- تنقید کے بنیادی مسائل — مرتبہ آل احمد سرور۔ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
(پہلی اشاعت ۱۹۶۷ء)

۱- مباحث۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ حصہ اول۔ از ڈاکٹر سید عبداللہ، کتب خانہ نذیریہ دہلی (۱۹۶۵ء)۔

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ

کا

ایک اور شاہکار

ادارۂ فروغ اُردو کی ادبی مجلس نے جس کی صدارت نسیم قریشی علی گڈھ یونیورسٹی نے کی اور یہ طے کیا کہ فروغ اُردو کا لکھنؤ نمبر شائع کیا جائے، لکھنؤ نمبر، تاریخی، ادبی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے مکمل دستاویز کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا، اس نمبر کے کم از کم تین حصّے ہوں گے۔

(۱) پہلے حصہ میں لکھنؤ کی تاریخی و تہذیبی اہمیت، یہاں کے علوم و فنون، وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا جائیگا

(۲) دوسرے حصّہ میں نثر کی ترقی میں لکھنؤ کی خدمات مختلف اقسام کا تفصیلی جائزہ۔

(۳) تیسرے حصے میں نظم کے ارتقاء میں لکھنؤ کی خدمات مختلف اصناف کا تفصیلی جائزہ۔

جناب نسیم قریشی صاحب ریڈر شعبۂ اردو علی گڈھ یونیورسٹی
اور
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی

اس یادگار نمبر کے

مرتبہ ... نگہ

اسمٰعیل انصاری ایم اے

جدید اردو شاعری اور حالی

(بہ سلسلہ گذشتہ)

جس کا فوری اثر ان کو اپنی معاشرت پر پڑا۔ ایسی حالت میں قوم پر کیا گزرتی رہی یہ حالی کی زبانی سنیئے ؎

سرکار میں کام پانے کے قابل   نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل   نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

پوچھو کہ حضرت نے جو کچھ پڑھا ہے   مراد آپ کی اسکے پڑھنے سے کیا ہے؟
مفاد اسمیں دنیا کا یا دین کا ہے   نتیجہ کوئی اسکے ذکر سوا ہے؟

تو مجذوب کی طرح سب کچھ کہیں گے
جواب اسکا لیکن نہ کچھ دے سکیں گے

نہ حجت رسالت پہ لا سکتے ہیں وہ   نہ اسلام کا حق جتا سکتے ہیں وہ
نہ قرآں کی عظمت دکھا سکتے ہیں وہ   نہ حق کی حقیقت جتا سکتے ہیں وہ

دلیلیں ہیں سب آج بیکار ان کی
نہیں چلتی توپوں میں تلوار ان کی

لیے اس مشقت میں جب وہ سراپا   نتیجہ نہیں ان کو معلوم جس کا

[illegible]

نہیں جانتے یہ کہ جاتے کدھر ہیں
گئے بھول رستہ وہ یا راہ بر ہیں

حالی کو سارا دکھ اس بات کا تھا کہ قوم اپنے ہاتھوں میں لیا سکہ لیے بازار میں گھومتی ہے جس کا چلن نہ تھا۔ پرانے خیالات اور قدیم علم و فن کی زمانے کو ضرورت نہیں تھی۔ لیکن قوم کا تمام سرمایہ یہی تھا۔ حالی کو قدیم علم و فن کا اعتراف تو تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ اب تعلیم قدیم ناقص ہو سکتی ہے جبکہ دنیا نئے نئے خیالات اور جدید سائنسی اور طبعی ترقیات کی خواہاں تھی۔ قوم کا اس باب میں جو حال تھا وہ انھیں کی زبانی سنیئے ؎

نہ انکو نباتات سے کم آگہی ہے   نہ اصلا خبر معدنیات کی ہے
نہ تشریح کی نے کسی پر کھلی ہے   نہ علم طبعی نہ کیمسٹری ہے

نہ پانی کا علم اور نہ علم ہوا کا
مریضوں کے انکے نگہباں خدا کا

نہ قانون میں انکے کوئی خطا ہے   نہ مخزن میں انگشت رکھنے کی جا ہے
سویدی میں جو کچھ لکھا ہے بجا ہے   نفیس کے ہر قول پر جان فدا ہے

سلف لکھ گئے جو قیاس اور گماں سے
صحیفے ہیں اُترے ہوئے آسماں سے

قوم کی زبوں حالی اور پستی کے ہر پہلو پر حالؔی کی نظر تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے تھے صاف صاف بیان کردیتے تھے۔ ملک و قوم کے بگڑے ہوئے معاشرے پر حالؔی کی گہری نظر تھی۔ وہ ایک طرف تو قوم کی معاشرت اور کسب روزگار کے مادّی پہلوؤں پر ان کی لغزشیں جتاتے تو دوسری طرف قوم کے اخلاق اور اس کی نئی نسل کا اخلاقی کمزوریوں پر بھی نظر کرتے ہیں۔ اور تمام کمزوریوں کو کھلم کھلا جتاتے ہیں خاص کر شرفا، کو ان کی اولادوں کا اخلاقی کمزوریوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ جن کو نہ علمی مدارس سے کوئی شغف تھا نہ شائستہ جلسوں سے کوئی تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ اُن کی بے اعتدالیوں کا رونا یوں روتے ہیں۔

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے، تباہ اُنکی حالت بُری اُنکی گت ہے،
کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے،
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
ملک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی

یہ علمی مدارس میں ہیں اُنکو پاتے نہ شائستہ جلسوں میں آتے جاتے
یہ میلوں کی رونق ہیں جا کر بڑھاتے پڑے پھرتے ہیں دیکھتے اور دکھاتے
کتاب اور معلّم سے پھرتے ہیں بھاگے
مگر ناچ گانے میں ہیں سب سے آگے

قوم کی حالتِ زار سے حالی مایوس تھے لیکن ناامید نہیں ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ وہ قوم ہے جو اگر چاہے تو [illegible] سکتے ہیں قوم [illegible]

مری نہیں ہے، بلکہ اس میں اب بھی حرارت باقی تھی اس کے دل میں اندر ہی اندر چنگاریاں دبی ہوئی تھ[illegible] اگر ضرورت تھی تو بس اتنی کہ ان چنگاریوں کو کوئی ہ[illegible] دیتا۔ حالؔی کو قوم کی اس صلاحیت کا پوری طرح احسا[illegible] تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"اگر قوم کے دل میں متاثر ہونے کا مادّہ نہ ہوتا تو یہ ایسی ایسی (مسدّس حالؔی) ہزار نظمیں بیکار تھیں۔ پس مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات کا کہ اس نے زمین شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی نہیں چاہی۔ اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے بے گمان نہیں ہے۔ مگر راستہ بھٹکے ہوئے ہیں مگر راستہ کی تلاش میں جیب ورامت نگراں ہیں۔ انکے ہنر مفقود ہوگئے ہیں۔ قابلیت موجود ہے۔ انکی صورت بدل گئی ہے مگر ہیولیٰ باقی ہے۔ انکے قویٰ مضمحل ہوگئے ہیں مگر زائل نہیں ہوئے ہیں۔ انکے جوہر مٹ گئے ہیں مگر جلد سے پھر نمودار ہوسکتے ہیں۔ انکے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں مگر چھپی ہوئی۔ انکے خاکستر میں چنگاریاں ہیں مگر دبی ہوئی۔"

یہ حالؔی کی قوم سے محبت ہے جو انھیں اس دلسوزی سے [illegible] کی عیب جوئی پر مجبور کرتی ہے چنانچہ انھوں نے ایسا اس[illegible] اختیار کیا جو غیرت دلانے والا بھی تھا اور مایوس[illegible] والا بھی۔ اُن کے دل کی آگ بھڑک بھڑک کر بجھ گئی [illegible] قوم کا درد حالؔی کے رگ و پے میں یوں سرایت کر گیا کہ [illegible] دم تک پھر چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ دن رات یہی فکر لگ[illegible] [illegible]

[illegible] کی طرف رجوع ہونگے۔ حالی جو کچھ بھی [illegible] تھے [illegible] سب کو قوم کا ہمدرد سمجھتے تھے اور ایک [illegible] اپنی ذات کو خیال نہ کرتے تھے [illegible] [illegible] جن کی زندگی کا مشن قوم و ملک [illegible] ہنر و علم سے لاپرواہی، اخلاقی کمزوریاں دور کرنا۔ [illegible] قوم کو ایک، باعمل، زندہ متحرک قوم کے روپ میں دیکھنے کی خواہش ہردم بے چین کئے رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] کے کلام میں درد اور سچائی ہم کو ملتی ہے۔ حالی کا [illegible] زبردست ہے۔ وہ جس بات کو جس برائی کو بیان کرتے ہیں [illegible] اور [illegible] بیان کرتے ہیں کہ اصل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اس سے ان کا مدعا قوم سے نفرت کا اظہار نہ تھا بلکہ ایک طرح کی کڑوی گولی تھی جو قوم کے جسم میں داخل ہوکر اس کے اصل روگ کا سدباب کرسکے۔

ناامیدی کو حالی کفر [illegible] تھے۔ انکے گرو سرسید [illegible] سے انھوں نے یہی سیکھا تھا کہ انسان کو امید کا دامن ناموافق ناموافق حالات میں بھی نہ چھوڑنا چاہئے۔ حالی کا [illegible] ہی اصلاح تھا اور اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب اسکی کامیابی کی امید باقی رہی چنانچہ سب سے پہلے حالی کے دل میں امید ہی نے ڈیرہ لگایا۔ کیونکہ یہی وہ منزل ہے جہاں سے وہ کمربستہ ہوکر قوم کی اصلاح کیلئے عملی میدان میں آتے ہیں۔ اگر حالی کو قوم کی اصلاح کی امید نہ ہوتی تو وہ اپنا مشن اسقدر اعتماد کیساتھ شروع نہ کرپاتے۔ سرسید اور حالی و نیز انکے رفقاء کار نے جب اصلاح کا مشن شروع کیا چاہے وہ زبان وادب ہو یا معاشرت اصلاح ہو یا دینی تعلیم، انکی تمامتر سرگرمیاں صرف یہی تھیں کہ قوم گمراہ نہ [illegible] سے۔ قوم کی اصلاح کی کوشش دراصل اس امید کے سہارے چلائی جسمیں انھیں خاطرخواہ کامیابی ہوئی۔ چاہے وہ [illegible] کے ایک عرصہ بعد۔ دراصل کسی قوم کے [illegible] والی قوم کے سدھار نے میں پہلیاں [illegible] حالی [illegible] عمل ہے اچھے اچھے مصلح اور قوم کے پیغامبر بھی بعض اوقات مایوسی کا شکار ہوجایا کرتے ہیں [illegible] دیکھتے ہیں کہ قوم انکی ایک نہیں سنتی اور اپنی [illegible] نہیں کرتی۔ تمام دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ حالی کوئی پیغامبر تو نہ تھے لیکن انکے تمام تر کارنامے وہی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ پکے مذہب پرست انسان تھے لیکن ہرسمت میں قدم اٹھانے میں کوئی عار نہ سمجھتے تھے جس سے ملک و قوم کا مفاد بھی پورا ہوجائے اور اپنے اپنے مذہب کے دائرے سے باہر بھی نہ نکلیں۔ مذہب سے بیزاری اور عام بے راہ روی قوم کا شیوہ بن چکا تھا۔ یہی صورت حال انکے لئے سخت پریشانی اور فکر کا باعث ہوئی۔

حالی کا دوسرا [illegible] زبان وادب کی اصلاح کا تھا، جیسا کہ پہلے [illegible] انھوں نے نئے سرے سے اردو ادب کا جائزہ لیا اور اسکو دنیا کے ترقی یافتہ ادب سے [illegible] اور انکی خوبیوں اور خرابیوں دونوں پر روشنی ڈالی۔ اس سلسلہ میں حالی کی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" جو انکی طویل نظم مدو جزر اسلام کا مقدمہ ہے اسمیں اردو کو نئے نئے معیاروں سے جانچا اور موجودہ زمانے کی رفتار سے اسکا [illegible] کیا۔ یہ مقدمہ اردو زبان میں تنقید کا بائبل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہرحال تنقید فی الحال ہمارا موضوع نہیں، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ حالانکہ انھوں نے اردو شاعری کی کونسی خامیوں کیطرف اشارہ کیا ہے اس صورت حال میں ہم مقدمہ کو اردو، زبان وادب کا ایک جائزہ تصور کرینگے۔ یوں تو مقدمہ کی حیثیت سے قابل توجہ ہے لیکن جو مدعا حالی کا اسکی تصنیف میں تھا وہ اردو زبان وادب کی اصلاح تھا۔

جب حالی کی نظر اُردو ادب کے سرمایہ پر پڑتی ہے تو انکو اسکی بے مائیگی کا سخت احساس ہوتا ہے کیونکہ قدیم طرزِ نظم فقر خیالی طوطے مینا اڑانے کے میدان سے آگے نہ بڑھ پائی تھی۔ ہنے دے کے عشق کے واردات کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے تھے جس سے قوم کے کردار و اخلاق پر بجائے مثبت اثر پڑنے کے سماج اس سے منفی اثر قبول کر رہا تھا۔ حالی شاعروں کو ان تمام خامیوں کا ذمہ دار گردانتے تھے اور انہی پر تمام تر ذمہ داری ڈال کر مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ قدما (ہی سوائے چند کے) جو حالت تھی وہ بھی حالی ہی کی زبانی سنیئے ؎

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر   عفونت میں سنڈاس سے بھی بدتر
زمیں جس سے زلزلے میں ہے برابر   فلک جس کے تیرے ملئے ہیں آسمان پر

ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا

بُرا شعر کہنے کی اگر کچھ سزا ہے   عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے   مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائینگے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

ہمارے ادب نے غلو اور ابہام نے کچھ اثر سرا ٹھا یا کہ تمام سخنور اس سے نہ بچ سکے۔ قصائد میں تو غلو سے وہ وہ کام لئے کہ انسان کو خدا بنا یا۔ اور شہنشاہوں کو خالق کا درجہ دیا اور رعیت کو اسکی مخلوق قرار دیا۔ ذاتی مفاد کیلئے ہمارے شعراء قصائد میں وہ وہ کلام کہہ گئے کہ آج ہم شرم محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے! انعام و اکرام کی لالچ نے انکو اندھا کر دیا تھا۔ وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ وہ اپنا ادب و شاعری کے حق میں کونسا سم قاتل تیار کر رہے ہیں۔ واقعیت سے تو خدا واسطے کا بیر تھا نہ اس کا کہیں چلن تھا نہ ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ غرض کہانتک گنائیے ایک بند اس عرض حال میں بھی نقل کیا جاتا ہے ؎

[illegible]   نہیں قوم کو ظاہر جس سے حیا لا
[illegible]   [illegible]

بنے ہندو میں اس سے دراک ہمارا
ہمالہ سے ہو جس کی چوٹی دو بالا

جو سقے نہ ہوں جی بجھا ئیں گندے سب   ہو میلا جہاں گم ہوں حلوا اگر سب
بنے دم پہ گر مہتر چھوڑیں نفر سب   جو ٹھہر جائیں بہتر تو گندے ہوں گھر سب

یہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

حالی کا عقیدہ تھا کہ جس قوم میں عقل و فہم نہ ہو، تو وہ قوم دین و دنیا میں سے کسی کا بھی دامن نہیں تھام سکتی۔ اگر یہ بھی نصیب نہ ہو تو کم از کم مال و دولت، زر و جواہر، علم و ادب کی دولت تو ضرور ہو۔ ورنہ ایسی قوم پر کا ٹوٹ کر گرنا بہتر ہے۔ تا کہ ایسی قوم نہ دین کے لئے باعث ننگ رہے نہ ملک و قوم کے لئے اس کا وجود ایک نحوست ثابت ہو سکے!!

فارم IV

بیان بابت ملکیت وجملہ تفصیلات

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ

مقام اشاعت : لکھنؤ
نوعیت اشاعت :- ماہنامہ
پرنٹر و پبلشر : سید انصار حسین مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ
ایڈیٹر : محمد حسین شمس علوی
قومیت : ہندوستانی
ملکیت : سید انصار حسین مقبرہ عالیہ گولہ گنج

میں سید انصار حسین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط
سید انصار حسین
یکم مارچ [illegible]

مطبوعات ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت) (ا)

۱- اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر۔ ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۲/-

۲- لُمعد نمبر۔ فروغ اُردو۔ اقبال صدیقی ۳/۵۰

۳- انوار اللغات اُردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۴/-

۴- ادبی اثرات ۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/۵۰

۵- آئینہ عقل ۔ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری ۴/۵۰

۶- اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۴/۵۰

۷- امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۳/-

۸- انارکلی امتیاز علی تاج ۳/۲۵

۹- اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ پروفیسر کلیم الدین احمد ۲/-

۱۰- اُردو میں تنقید ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۳/-

۱۱- انتخاب قصائد اردو مغیث الدین زیدی ۱/۵۰

۱۲- ادب اور نظریہ ۔ آل احمد سرور ۵/-

۱۳- اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبدالشکور ۴/۵۰

۱۴- ادبی نقوش ۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ۵/-

۱۵- اقبال ۔ مرتبہ فروغ اُردو ۰/۵۰

۱۶- اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں عبدالماجد دریابادی ۴/۵۰

۱۷- البرامکہ اور اُن کا عروج و زوال ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے ۲/-

۱۸- انتخاب کلام میر مع مقدمہ ۔ ناظر کاکوروی ۱/-

۱۹- انتخاب کلام غالب ۔ بشیر احمد علوی ۱/۵۰

۲۰- ادبی تنقید ۔ ڈاکٹر محمد حسن ۴/۵۰

۲۱- انتخاب قصائد و غزلیات (فروغ اُردو) ۰/-

۲۲- ادب کیا ہے ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی /۵۰

۲۳- ادبی خطوط غالب ۔ مرزا محمد عسکری /-

۲۴ آئینہ نثر اُردو ۔ سعادت علی صدیقی /-

۲۵ ایک نادر روزنامچہ ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۵۰

۲۶ ابو الکلام ۔ مجنوں گورکھپوری ۳۷

۲۷ اُردو کی کہانی ۔ سید احتشام حسین ۵۰

۲۸ ادب پارے حصہ نظم و نثر ۔ ۔ ۷۵

۲۹ انتخاب نثر جدید ۔ ۔ /-

۳۰ ابو الکلام آزاد (نظم) جگناتھ آزاد ۵

۳۱ ارمغان نثر و نظم ۔ عبدالاحد خاں خلیل ۵

۳۲ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۵۰

۳۳ اچھی نظمیں ۔ انگر مشتاق ۱۰

۳۴- اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید اڈیشن ۔ غلام احمد فرقت -

۳۵ اُردو شاعری ۔ امیر احمد علوی ۱۰

۳۶ آخری یادگار نادر شاہ معہ ترجمہ ۱۰

۳۷ غزلیات حافظ صائب۔ غالب فارسی ۱۰

۳۸ اپنی پہچان پوری زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب ۔ اعجاز احمد فاروقی ۵

۳۹ اللہ کے پیارے ۔ امیر حسن نورانی ۰

۴۰ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۰

۴۱ ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی ۔ عبدالماجد دریابادی ۰

۴۲ اسپین کی شہزادی ۔ صادق سرحدی ۰

۴۳ ایک جان تین قالب ۔ خاں محبوب طرزی

۴۴ اُلفت ۔ ۔ ۔ ۰

۴۵ آغاز سحر ۔ ۔ ۔

۴۶ امین آباد ۔ ۔ ۔

۴۷- اپنی موج میں ۔ آوارہ ۰

۴۸- انوار جدید خط و کتابت ۔ خلیق احمد علوی ۱

نمبر	کتاب / مصنف	قیمت
۴۹	ایجادوں کی باتیں ۔ مصطفیٰ حسن رضوی	۲/-
۵۰	اچھی کہانیاں (حصہ اول) شمس الدین نوری	-/۵۰
۵۱	(حصہ دوم) "	-/۷۵
۵۲	(حصہ چہارم) "	-/۵۰
۵۳	ادب کا مقصد ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	-/-
	(ب)	
۵۴	بابائے اُردو عبدالحق ۔ عبداللطیف اعظمی	-/-
۵۵	بستانِ حرم (جدید نعتیہ کلام) از ترنم صدیقی	۱/۵۰
۵۶	شہیدِ محبت بوٹا سنگھ ۔ خان محبوب طرزی	۴/-
۵۷	بزمِ بے تکلف ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین	-/۵۰
۵۸	برگِ گل ۔ شبلی نعمانی	-/-
۵۹	بہادر شاہ ظفر ۔ امیر احمد علوی کاکوروی	۵/۵۰
۶۰	بہشتی ثمر (اول، دوم) یعنی خلاصہ بہشتی زیور از ... تھانوی	۳/-
۶۱	بانیِ اسلام (علامہ محی الدین خیلاطی کی تاریخ کا اردو ترجمہ)	۳/۰۰
	(پ)	
۶۲	پطرس کے مضامین ۔ پطرس بخاری	۱/۵۰
۶۳	پیاری باتیں ۔ محسن کاکوروی	-/۴۰
۶۴	پھولوں کا انبار (ناول) منظر سلیم	۴/۵۰
۶۵	پیسہ اور پرچھائیں (مجموعہ ڈرامہ) ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
۶۶	پاگل خانہ (ناول) مالک ملیح آبادی	۳/۲۵
۶۷	پیغام ۔ طاہر دیالپوری	۳/۰
۶۸	پنجاب میں اُردو ۔ حافظ محمود شیرانی	۴/۵۰
۶۹	پردیسی کے خطوط (حصہ اول) مجنوں گورکھپوری	۶/۰
	(ت)	
۷۰	تاریخِ ادبِ اُردو (از سرِ نو اُردو ایڈیشن) ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۹/-
۷۱	تحریریں (مجموعہ مضامین) ڈاکٹر گیان چند	۴/۵۰
۷۲	تصویرِ درد مع تشریحات و ترجمہ ۔ زید احمد علوی	۷۵/-
۷۳	تاریخی جائزے ۔ ڈاکٹر محمد یٰسین	۳/۰

نمبر	کتاب / مصنف	قیمت
۷۴	تعارفِ تاریخِ اُردو (جدید ایڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/-
۷۵	تاجدارِ مدینہ ۔ اقبال صدیقی	۰/۱۲
۷۶	تنقیدی اصول اور نظریے ۔ حامد اللہ افسر	۴/۵۰
۷۷	تنقید و تحلیل ۔ شبیہہ الحسن نونہروی	۳/-
۷۸	تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) سید احتشام حسین	۲/۵۰
۷۹	تنقیدی نظریات (جلد اول) " "	۶/-
۸۰	" (جلد دوم) " "	۶/-
۸۱	تنقید اور عملی تنقید " "	۵/
۸۲	تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) ۱۹۶۴ء آل احمد سرور	۳/۵۰
۸۳	ترانہائے خیام ۔ ڈاکٹر رغیب حسین	۲/-
۸۴	تعلیماتِ اسلامی مکمل چار حصص ۔ محمد حسین شمس	۱/۶۵
	(ٹ)	
۸۵	ٹیگور ۔ آدم سیتاپوری	۲/-
۸۶	ٹھیکرے کی مانگ ۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی	۲/۰
	(ث)	
۸۷	ثنائے حبیب (نعتیہ کلام) ہزار لکھنوی	۲/۲۵
	(ج)	
۸۸	جانِ غالب ۔ محمد حسین شمس علوی	۲/-
۸۹	جائزے ۔ انور سدیدانی	۳/-
۹۰	جواہراتِ اسمٰعیل ۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/-
۹۱	جنگِ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) فروغِ اُردو	۳/-
۹۲	جنگِ آزادی نمبر ۲ " "	۳/-
۹۳	جوئے رواں (مجموعہ کلام) حامد اللہ افسر	۲/۵۰
۹۴	جادو کی انگوٹھی (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اثر بلگرامی	۳/۵۰
۹۵	جنگ بندی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین	۲/۵۰
۹۶	جلوے ۔ معین الدین دردائی	۱/۷۵

۹۷ جمیلہ بوائری (ناول) خان محبوب طرزی ۴/۵۰
۹۸ جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۶/-

(چ)

۹۹ چولی دامن مجموعہ افسانہ - مسیح الحسن رضوی ۲/۷۵

(ح)

۱۰۰ حیات فضل الحق خیرآبادی ۱/۲۵
۱۰۱ حالی بحیثیت شاعر (جدید اڈیشن مع اضافہ جدید اڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۳/-
۱۰۲ حسرت موہانی عبدالشکور ۳/۵۰
۱۰۳ حسرت تعمیر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰
۱۰۴ حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰
۱۰۵ حکیم نباتات وزیر خاں لنکراں ۲/-
۱۰۶ حبیبۂ غالب سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۰۷ خیالات رنگین یعنی مجموعہ مضامین فارسی (زیر طبع)
۱۰۸ خلاصہ شریف زادہ مرزا رسوا ۱/-
۱۰۹ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی عبدالماجد دریابادی ۲/۷۵
۱۱۰ خضر راہ مع ترجمہ علامہ اقبال -/۷۵
۱۱۱ خلاصہ روح تنقید ۱/-
۱۱۱ خلاصہ جواہر العروض ۱/-
۱۱۲ خلاصہ المیزان -/۷۵
۱۱۴ خبطی (مزاحیہ) محمد علی واحدی مع مقدمہ شوکت تھانوی ۱/۵۰
۱۱۵ خوش بختی کی تلاش - احسن الظفر بی اے -/۲
خلاصہ شعر الہند (دوم) -/۱

(د)

۱۱۶ دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۳/-
۱۱۷ دیوان فغانی ۱/۵۰
۱۱۸ داستان سہراب و رستم مع مقدمہ (فارسی) عبدالاحد خاں خلیل ۳/-
۱۱۹ دیوان صفی (حصہ اول) صفی لکھنوی ۳/-
۱۲۰ دہلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/-
۱۲۱ دستۂ گل شبلی نعمانی -/۵۰
۱۲۲ دوشیزہ تاتار (ناول) خان محبوب طرزی ۵/-
۱۲۳ دلربا " " " ۳/-
۱۲۴ دکنی کا دبستان شاعری مع اضافہ جدید اڈیشن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۱۲/-

(ڈ)

۱۲۵ ڈاکٹر نذیر احمد انوارالحسن -/۳۷

(ذ)

۱۲۶ ذوق جستجو - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۲/۵۰
۱۲۷ ذوق ادب و شعور - پروفیسر احتشام حسین ۲/۵۰
۱۲۸ ذوق جنون مجموعہ کلام آل احمد سرور ۴/۵۰

(ر)

۱۲۹ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین ۵/-
۱۳۰ رباعیات غالب مع اردو ترجمہ سید امیر حسن نورانی ۳/-
۱۳۱ رہبر مضمون نویسی - شفاعت علی صدیقی ۲/۵۰
۱۳۲ راکھی - ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی -/۳۷
۱۳۳ رخسار سحر - انصر کریم قدوائی ۱/۵۰
۱۳۴ رختار (ناول) ۳/۵۰
۱۳۵ رموز حکمت مع مقدمہ اردو - محمد شریف ۳/۵۰
۱۳۶ ریاض فارسی - منتخب کلام فارسی ۲/-

(ز)

۱۳۷ زکوٰۃ (حلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ) مولانا تھانوی -/۵۰
۱۳۸ زنبیلیوں کا بادشاہ (حکیم بانا (مزاحیہ ناول) علی عباس حسینی ۳/-

(س)

۱۳۹ سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۳/۰
۱۴۰ سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۲/۰
۱۴۱ سرور جہان آبادی — ڈاکٹر حکیم جنید [illegible] — [illegible]
۱۴۲ سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۳/۰
۱۴۳ سلک گہر — سید احتشام حسین — ۳/-
۱۴۴ ساحل و سمندر — سید احتشام حسین — ۶/-
۱۴۵ سرسید یا احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰
۱۴۶ سرمایۂ زبان اردو — جلال لکھنوی — ۲/۵
۱۴۷ سخن ہائے گفتنی — [illegible] — ۵/۰
۱۴۸ سفر (ناول) — [illegible] — [illegible]
۱۴۹ سیاحت زمین (ناول) — محمود [illegible] — ۱/۵۰
۱۵۰ سپہ سالار مسعود غازیؒ — جوشی محمود آبادی — ۳/۵۰
۱۵۱ ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۲/۵۰
۱۵۲ سہرا حلقہ — ۰۵
۱۵۳ سرسید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی — ۱/۳۷
۱۵۴ سوشل اسٹڈی — احمد محسن کاکوروی — ۱/۷۵

(ش)

۱۵۵ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) — غلام احمد فرقت — [illegible]
۱۵۶ شرح سلک گہر — عبدالقوی دریابادی — ۲/۵۰
۱۵۷ شاہ نمکیس حضرت جی — پروفیسر عبدالشکور — ۲/-
۱۵۸ شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی — ۴/-
۱۵۹ شرح ادب پارے نظم — ۲/۰
۱۶۰ شرح منتخبات فارسی — عبدالقوی دریابادی — ۴/۵۰
۱۶۱ شبلی نعمانی — انوار الحسن صدیقی — ۰/۳۷
۱۶۲ شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن) — نظم طباطبائی — ۵/۰
۱۶۳ شاہان مالوہ یعنی گجرات کی تاریخ — امیر احمد علوی — [illegible]
۱۶۴ شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم — شبلی نعمانی — ۲۵/۰
۱۶۵ شرح نثر امروز ایران — احسن ظفر ایم اے — [illegible]
۱۶۶ شرح شعر امروز ایران — ۲/۵
۱۶۷ شیخ و شاعر — علامہ اقبال — ۰/۲۵
۱۶۸ شرح [illegible] — نیر مسعود — ۱/۲۵
۱۶۹ شرح انتخاب [illegible] غزلیات
۱۷۰ [illegible] — ۶/۰
۱۷۱ شرح [illegible]
۱۷۲ شرح [illegible]

(ص)

۱۷۳ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — [illegible]
۱۷۴ صحیفۂ محبت ([illegible] کے خطوط) — ڈاکٹر محمود الٰہی — [illegible]

(ط)

۱۷۵ طرزی نہر [illegible] خان محبوب طرزی — مرتبہ فروغ اردو — ۲/۰
۱۷۶ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے — غلام الثقلین — ۰/۳۷
۱۷۷ طلسم اسرار (ڈرامہ) — مرزا رسوا لکھنوی — ۱/۲۵
۱۷۸ طرۂ امیر — امیر مینائی منتخب کلام
۱۷۹ (جدید ایڈیشن) امیر احمد علوی — ۳/۵۰

(ع)

۱۸۰ عذرا (ناول) — صالحہ عابد حسین — ۵/۰
۱۸۱ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) — سید احتشام حسین — ۴/۵۰
۱۸۲ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینے میں — اخلاق حسین عارف — ۳/۰

(غ)

۱۸۳ غالب کی تخلیقی تخییل۔ شبیہ صفی پوری ۶/۰

۱۸۴ غنچہ رنگ سید محمود الحسن رضوی ۳/۰

۱۸۵ غالب کے کلام میں لحاتی عناصر نادم سیتاپوری ۴/۵۰

۱۸۶ غزنی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۱۸۷ غزلیات نظیری ۱/۵۰

(ف)

۱۸۸ فن خطابت یعنی استاد تقریر۔ کالب مصطفےٰ ایڈوکیٹ ۰/۰

۱۸۹ فریدہ خان محبوب طرزی ۲/۰

۱۹۰ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ نادم سیتاپوری ۴/۵۰

۱۹۱ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۳/۵۰

۱۹۲ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۱۹۳ فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی ۳/۰

۱۹۴ فغان محسن محسن کاکوروی ۰/۳۰

۱۹۵ فارسی آموز شبیر احمد علوی ۱/۰

۱۹۶ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۴/۵۰

(ق)

۱۹۷ قدیمے جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں غلام احمد فرقت ۵/۰

۱۹۸ قصائد خاقانی ۱/۵۰

۱۹۹ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰

۲۰۰ قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۴/۵۰

۲۰۱ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۶/۰

۲۰۲ قدر و نظر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰

۲۰۳ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۲/۰

۲۰۴ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/

۲۰۵ قومی ادب نثر و نظم حامد اکبر ۳/۸۳

۲۰۶ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۳/۰

(ک)

۲۰۷ کیا اور کیوں بدرالدین طیب جی ۲/۰

۲۰۸ کفِ گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۲/۰

(گ)

۲۰۹ گلبانگ [illegible] مع مقامات مقدسہ کے فوٹو زائر حرم حمید لکھنوی ۱/۵۰

۲۱۰ گنگا [illegible] نمبر ۲/۰

۲۱۱ گلدستہ فارسی اول و دوم ۱/۳۰

۲۱۲ گلزار فارسی یعنی آمدنامہ [illegible]

۲۱۳ گلہائے ادب۔ عبدالاحد خاں خلیل ۳/۰

۲۱۴ گاندھی جی کے ساتھ حامد اللہ افسر ۵۰

(ل)

۲۱۵ لوائح [illegible] مقدمہ عبدالاحد خاں خلیل /۵۰

۲۱۶ لال [illegible] مائل ملیح آبادی ۱/۰

۲۱۷ [illegible] عادل رشید ۱/۰

۲۱۸ لسانیات اور اردو۔ سید محمود حسن رضوی /۵۰

(م)

۲۱۹ مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو غلام احمد فرقت /۰

۲۲۰ محسن کاکوروی نمبر /۰

۲۲۱ مسلمان اور کانگریس ابوالکلام آزاد /۵۰

۲۲۲ مرثیہ نگاری اور میر انیس۔ ڈاکٹر احسن فاروقی /۰

۲۲۳ مضامین فرحت (حصہ اول) مرزا فرحت اللہ بیگ /۰

۲۲۴ مضامین فرحت (حصہ دوم) " " " /۰

۲۲۵ ماضی کی کہانیاں آفتاب اختر تلہری /۵۰

۲۲۶ میرے اسٹیج ڈرامے ڈاکٹر محمد حسن /۵۰

۲۲۷ موسم گل (ناول) عادل رشید ۶/۰
۲۲۸ مجبور " خان محبوب طرزی ۴/۵۰
۲۲۹ مضامین جدیدہ محمد ہادی ۱/۲۵
۲۳۰ مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ قدرت اللہ بیگ ۲/۰
۲۳۱ مطالعہ شبلی ناظر کاکوروی۔ شجاعت علی سندیلوی ۴/۰
۲۳۲ نبات شبلی جالب مظہری ۲/۵۰
۲۳۳ مثنویات حالی۔ ناظر کاکوروی شجاعت علی سندیلوی ۲/۰۰
۲۳۴ مطالعہ حالی " " " ۴/۰
۲۳۵ میٹھے بول " " ۱/۲۵
۲۳۶ مولوی نذیر احمد کی کہانی [illegible] ۱/۰
۲۳۷ سحر کردم ویونان [illegible] ۶
۲۳۸ مصنوعی چاند خان محبوب طرزی ۴/۰
۲۳۹ مقدمہ شعر و شاعری (مطابق [illegible]) ۱/۵۰
۲۴۰ مرثیہ غالب " ۰/۲۵
۲۴۱ مجموعہ کربلا [illegible] ۳/۵۰
۲۴۲ معمار [illegible] ۴/۵۰
۲۴۳ مولانا حالی [illegible] ۰/۳۷
۲۴۴ مہاراجہ بلی [illegible] ۲/۰
۲۴۵ مسٹر [illegible] ۲/۰
۲۴۶ مجذوب اور اُن کا کلام [illegible] ۱/۵۰
۲۴۷ مصباح بلاغت مع [illegible] ۲/۰
۲۴۸ مطالعہ سودا ڈاکٹر محمد حسن ۳/۰
۲۴۹ مزاحیہ شرح دیوان غالب۔ [illegible] ۸/۰
۲۵۰ مقدمات و مقالات۔ عبدالاحد خاں خلیل ۵/۵۰
۲۵۱ منتخب سوانح اور خاکے۔ [illegible] ۳/۰

(ن)

۲۵۲ نثر امروز ایرانی ڈاکٹر رغیب حسین ۳/۰
۲۵۳ نشاط غالب۔ وجاہت علی سندیلوی ۴/۵۰
۲۵۴ نقد و انتقاد اعجاز احمد معجز ۲/۰
۲۵۵ نقش حالی اوّل دوم یعنی حالی نمبر
پروفیسر احتشام حسین ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
شجاعت علی سندیلوی ۱۲/۰
۲۵۶ نغمۂ کوہسار خان محبوب طرزی ۴/۰
۲۵۷ نفحات الہند مع مقدمہ اردو
محمد شریف ۳/۰
۲۵۸ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی
کبیر احمد جائسی ۲/۰
۲۵۹ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ
حامد اللہ افسر ۳/۰
۲۶۰ نیا راستہ (ناول) خان محبوب طرزی ۳/۵۰
۲۶۱ نوروز (ناول) آل مسیح آبادی ۴/۵۰
۲۶۲ نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدیدہ)
آل احمد سرور ۶/۰
۲۶۳ نقوش و افکار مجنوں گورکھپوری ۴/۵۰
۲۶۴ نیلم انتصار حسین ۳/۰
۲۶۵ نذیر احمد کی کہانی نزہت اللہ بیگ ۱/۰
۲۶۶ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی
عبدالاحد خاں خلیل ۴/۰
۲۶۷ نئی نولکشور نمبر ۲/۰

(ہ)

۲۶۸ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے
علی عباس حسینی ۳/۰
۲۶۹ ہندی کے سلائی مجوا۔ امیر حسن نورانی ۰/۴۵

۲۷۰ ہمارا جھنڈا — حامد اللہ افسر — ۱/۰

۲۷۱ ہندوستان شاہراہ ترقی پر — منظر سلیم — ۱/۵۰

۲۷۲ ہندوستان کا تیسرا منصوبہ — " " — ۱/۵۰

(ی)

۲۷۳ یادگار غالب — مولانا حالی — ۲/۷۵

۲۷۴ یاقوتی (ناول) — خان محبوب طرزی — ۲/۵۰

۲۷۵ یادگار انیس — امیر احمد علوی — ۲/۵۰

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی ۱۵ یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں،

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

(۴) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

جلد (۱۸) شمارہ (۴) ادارۂ فروغ اُردو ہند کا علمی و ادبی ماہنامہ

رجسٹرڈ نمبر : ایل ۲۰

لائسنس نمبر : ۲۰۱۸۱۴۳ ۲۰۴۴۱۶

... نمبر : ۱۶۱۳۵

فروغِ اُردو لکھنؤ

اپریل ۱۹۷۲ء

مدیر اعزازی :

پروفیسر سید احتشام حسین

نائب مدیر : محمد حسین شمس قاسمی کاکوروی

مجلس ادارت :

عبد القوی دریابادی بی۔اے

سعادت علی صدیقی ایم اے

زرِ سالانہ : چار روپے

فی پرچہ : ۳۷ پیسے

پتہ :

ادارۂ فروغ اُردو

امین آباد پارک لکھنؤ۔۱

ترتیب

سید انصار حسین پرنٹر پبلشر نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغِ اُردو لکھنؤ سے شائع کیا۔ ایڈیٹر محمد حسین شمس علوی

سعادت علی صدیقی

اپنی باتیں

اتر پردیش میں اردو اکاڈمی کو قائم ہوئے کئی مہینے گزر گئے، اس مدت میں اس کی مجلس عاملہ اور تحتی کمیٹیوں کے کئی جلسے بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی کا[م] سامنے نہیں آیا ہے جس سے یہ توقع کی جا سکے کہ وہ اردو کے لئے کیا کرنا چاہتی ہے؟ اور کس طرح وہ ان تمام مشکلات کو دور کرنے میں کامیاب ہوگی جو اردو کی راہ میں تقریباً چوتھائی صدی سے پیدا کئے جاتے رہے ہیں۔ اگر اکاڈمی کا مقصد صرف 'اکیڈمک' امور چند ادیبوں اور شاعروں کو انعام دینے یا ان کے مسودات کو یا چند نایاب کتابوں کو طبع کرانے تک محدود ہے، تو اس سے اردو زبان ا[ور] تعلیم کی مشکلات حل نہیں ہوں گی۔ اور نہ صحیح معنوں میں اس سے اردو دنیا کو اجتما[عی] حیثیت سے کوئی فائدہ ہوگا یہ کام تو اردو کے ادارے، پبلشر اور ناشر بھی کر سکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔ درحقیقت اردو اکاڈمی کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اردو تعلیم، زبان و ادب، کی ترویج و اشاعت ہو اور اردو کے سلسلے میں جتنے بھی حقوق دیے جائیں، ان کی حیثیت قانونی ہو، سرکاری سرکلرس، یا محکمے جا[تی] ہدایات اس قابل بھی نہیں سمجھے جاتے کہ ان کو پڑھا جائے اور وہ سب ردّی کی ٹوکری کی نذر کر دیے جاتے ہیں جیسا کہ ۱۹۴۸ء سے ہو رہا ہے۔ اسلئے یہ ضروری ہے کہ اردو اکاڈمی سب سے پہلے 'تعلیم' کی ترویج و اشاعت کے لئے مؤثر قدم اٹھائے اور ایسی بااختیار کمیٹی بنائے جو وزیر تعلیم ایجوکیشن سکریٹری ا[ور] ڈائرکٹر تعلیمات کے علاوہ دوسرے ذمہ داران تعلیم اور اکاڈمی کے ممبران پر مشتمل ہو۔ اس کمیٹی کا فیصلہ، سرکاری فیصلہ، سمجھا جائے گا اور اس پر عملدرآمد بھی نسب[تاً]

آسانی سے ہو سکے گا۔

اُردو تعلیم کے لئے چند بنیادی قدم اٹھانا لازمی ہیں:

۱۔ اُردو اساتذہ کا تقرر

۲۔ اُردو کتابوں کی فراہمی

۳۔ ہر بیسک اسکول میں کم از کم ایک اُردو داں استاد ضرور ہو۔

۴۔ ٹریننگ اسکولوں میں اُردو [illegible] امیدواروں کا انتخاب کیا جائے اور ان کو طریقہ تعلیم بتایا جائے جیسا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ٹریننگ اور نارمل اسکولوں میں رائج تھا۔

۵ تمام جونیر ہائی اسکولوں تک تمام اساتذہ کیلئے اُردو، ہندی جاننا لازمی کردیا جائے، تاکہ ہر استاد دونوں زبانوں میں تعلیم دے سکے۔

تعلیم کے علاوہ اکاڈمی کو دوسرے اہم کاموں کی طرف بھی توجہ دینا ہوگی، لیکن سب سے پہلے اسے اردو تعلیم ہی کی جانب توجہ دینا چاہیئے۔ خوشی کی بات ہے کہ محکمہ تعلیمات نے اس سال جولائی [illegible] سے جونیر ہائی اسکول (چھٹے سے آٹھویں درجہ تک) کے [illegible] کا ترجمہ کراکے شائع کرنے کا انتظام کردیا ہے امید ہے کہ [illegible] جامیٹری الجبرا وغیرہ کی کتابیں اُردو میں بھی جولائی ۱۹۷۲ء سے [illegible] ایک تعمیری قدم ہے جو اگرچہ ذریعہ تعلیم کے [illegible] اٹھایا گیا ہے۔ لیکن بہرحال اس سے کتابوں کے [illegible] کا۔ ادارہ فروغ اُردو محکمہ تعلیمات یوپی کو مبارکباد [illegible]

خوشخبری:- جولائی ۱۹۷۲ء کے تعلیمی سال میں اُردو زبان میں درجہ ۶ سے درجہ ۸ تک الجبرا جامیٹری۔ حساب اور سائنس کی کتابیں دستیاب ہوسکیں گی۔ اُردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ یہ کتب زائد سے زائد تعداد میں خرید کر یہ مضامین اُردو میں پڑھائیں۔

غزلیات :۔

صلاح الدین نیّر

★

میں ڈر رہا ہوں کسی آہِ صبح گاہی سے
الجھ نہ جائے کسی دن وہ تاجِ شاہی سے

وہی جنوں وہی خودداریاں سلامت ہیں
میں جی رہا ہوں اسی شانِ کج کلاہی سے

قدم قدم پہ جو قاتل کا پوچھتا ہے پتہ
الجھ گیا ہوں سرِ راہ ایسے راہی سے

کہاں کہاں ترے جلوے نہیں ہیں نور فشاں
مگر گلہ ہے مجھے اپنی کم نگاہی سے

علاجِ درد نہ تسکینِ آرزو کا پتہ
تمہیں ہے خود بھی ندامت مری تباہی سے

کبھی بھی خونِ تمنا نہیں کیا میں نے
بری ہوں دوستو! الزامِ بے گناہی سے

جو اپنی راہوں میں بھٹکا ہوا ہو خود نیّر
بہت دنوں سے بھٹکتے پھرتے ہیں اپنے راہی سے

ڈاکٹر تسخیر رضوی

★

دلِ ناکام تو آسودگی کی بات کرتا ہے
اندھیروں کے لیے کیوں روشنی کی بات کرتا ہے

محبت میں سکونِ زندگی کی بات کرتا ہے
مرے ساقی یہ تو کس [illegible] کی بات کرتا ہے

ابھی تک آدمی یوں آدمی [illegible]
کہ جیسے اجنبی اک اجنبی کی بات کرتا ہے

نہیں دنیا کا مجھ سے اور کوئی [illegible]
جسے دیکھو مری دیوانگی کی بات کرتا ہے

خرد مندی اسی میں ہے کہ دو تفریق کی باتیں
وہ نادان ہے جو ربطِ باہمی کی بات کرتا ہے

مجھے اس وقت آتی ہے ہنسی بیساختہ فہمی
کوئی فنکار جب آسودگی کی بات کرتا ہے

کاظم علی خاں ۔ انچارج شیعہ کالج سٹی برانچ :

آبِ حیات کے تحقیقی عناصر کی چند فروگذاشتیں

راقم الحروف کی [illegible] مطبوعہ [illegible] کا تنقیدی تجزیہ [illegible] آبِ حیات کے تحقیقی عناصر [illegible] تفصیل سے بحث [illegible] مذکرہ بالا [illegible] کچھ [illegible] اصلاح [illegible] محترم مسعود حسن [illegible] راقم الحروف [illegible] آزاد [illegible] ڈاکٹر اسلم فرخی کا گراں قدر تحقیقی مقالہ [illegible] شائع [illegible] اور لکھنؤ میں دستیاب نہیں وقتاً فوقتاً اپنے دولت خانہ پر ہی برائے مطالعہ عنایت فرمایا۔ [illegible] تحقیقی مقالہ کو راقم الحروف محدود مدت کے مختصر وقفوں میں جتنا پڑھ سکا [illegible] صحیح معنوں میں مطالعہ نہیں کہا جا سکتا لیکن [illegible] راقم الحروف نے اس کتاب سے جو استفادہ کیا [illegible] ڈاکٹر اسلم فرخی [illegible] آبِ حیات کا تنقیدی تجزیہ [illegible] شامل ہے اس کتاب کا کچھ حصہ [illegible] آبِ حیات کے تحقیقی عناصر سے متعلق ہے اور اس حصہ سے آبِ حیات کی متعدد تحقیقی فروگذاشتوں میں [illegible]

([illegible] ۱۹۷۲ء)

اس طویل بحث میں آبِ حیات کے تحقیقی عناصر کا تجزیہ دلائل، حقائق، نظائر و شواہد کی مدد سے کرنے کے بعد اب ہم اس موضوع کا جائزہ ایک دوسرے رخ سے لے رہے ہیں

محترم مسعود حسن رضوی ادیب [illegible] آبِ حیات کی تحقیقی حیثیت سے اہمیت ثابت کر چکے ہیں [illegible] اور مسعود صاحب کس پایہ کے محقق ہیں، اس کا اندازہ ڈاکٹر گیان چند جین جیسے محقق کی مسعود صاحب کی تحقیق کے بارے میں [illegible] بقول ڈاکٹر گیان چند جین مسعود صاحب کی تحقیقی نگارشات کا یہ عالم ہے کہ :-

"جو بات کہہ دی ہے [illegible] کی مجال نہیں"

کیا مسعود صاحب جیسے [illegible] محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کی تحقیقی حیثیت کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہمارے مذکرہ بالا نتائج کی [illegible] ثابت نہیں کرتا اگرچہ ہم نے خود بھی آبِ حیات کی تحقیقی اہمیت پر تفصیل سے مدلل

ث کی ہے لیکن ہمارے نتائج کی تصدیق مسعود صاحب
نگارشات سے بھی ہو جاتی ہے (دوسرے صاحبان قلم
نظریات اس سلسلہ میں ہم سطور گذشتہ میں پیش ہی
چکے ہیں)۔

آبِ حیات میں آزاد نے بے شمار امور کے بارے
تحقیق کی ہے اور اپنی تحقیق کے نتائج پیش کر دیئے
یں آزاد کی تحقیق میں بھی دوسرے بلند پایہ محققین کی
رح متعدد فروگذاشتیں اور خامیاں ملتی ہیں لیکن بعض
ضرات آزاد کی ان تحقیقی غلطیوں کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر
یش کرنے کے عادی نظر آتے ہیں ہم حقائق و دلائل کی بنیاد
بعض بزرگوں کے آزاد کی تحقیق کے خلاف متعدد بیانات
دکھوٹے سے زیادہ کھوٹا ثابت کر چکے ہیں لیکن ہم آزاد کی
تحقیق کو اغلاط سے یکسر بری نہیں پاتے آبِ حیات میں
طرح طرح کی کوتاہیاں بھی اسی طرح ملتی ہیں جس طرح
صف اول کے محققوں کی تحقیقی نگارشات میں ان کا
وجود ثابت کیا جا چکا ہے۔ ہم بعض بزرگوں کی طرح نہ تو
آزاد کے محاسن کے منکر ہیں اور نہ آزاد کی تحقیقی فروگذاشتوں
سے چشم پوشی کرنا چاہتے ہیں ... تنقید
کو بے جا تعریف اور بے بنیاد تنقیص دونوں ہی عیوب سے
بری رکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آبِ حیات کے تحقیقی ...
ان بعض اہم خامیوں کو بھی دلائل کے ساتھ قارئین کی
خدمت میں پیش کرنا ضروری ہے جو محترم مسعود حسن رضوی
ادیب نے اپنی کتاب "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ"
میں انہیں پیش فرمائی ہیں۔

● کتاب سے اس موضوع پر طویل بحث میں سے آزاد
یا آبِ حیات کی محض چند فروگذاشتیں (جستہ جستہ)
ہی پیش کر رہے ہیں ہم نے اس موضوع پر کافی
مفصل بحث کی ہے جو "آبِ حیات کا تنقیدی
تجزیہ" شائع ہونے پر ہی دیکھی جا سکے گی)
(کاظم علی خاں)

وجوہ جو کچھ بھی ہوں آزاد نے بہرحال اردو زبان کی
تاریخ میں دکنی ... ارتقا کو نظر انداز کیا۔
ولی کی شاعری نے ارتقا میں دکنی روایات کو فراموش
کیا ہے آزاد کی تحقیق کی یہ کوتاہی سطور گذشتہ میں
پیش کی جانے والی مختلف تاویلوں کے باوجود ہمیں
شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

ریختہ کی تعریف بھی آبِ حیات میں آزاد کی
تحقیق کا کمزور پہلو ہے حافظ محمود شیرانی نے اپنی
مشہور کتاب "پنجاب میں اردو" میں آزاد کی
تعریف ریختہ کی دیواروں کو مزید ... اور خود
شیرانی کی یہ خدمت قابل قدر ہے اور ریختہ کی تعریف
کی اس دیوار کو بلند کرنا یہاں مثبت فعل ہے اس کی
نوعیت ناسخ سے مختلف ہے جو کہتے ہیں،

روز یاں ریختے کی اٹھتی ہے دیوار نئی

نظم اردو کی تاریخ کے باب میں بھی آزاد نے نظریہ شعر
کے سلسلے میں یونان کے حکما کے نام سے جو نظریات
پیش کئے ہیں وہ تحقیقی خامیوں سے بری نہیں (۲۸)
ڈاکٹر احسن فاروقی نے اس امر پر دلچسپ بحث کی ...
اگرچہ اس بحث میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے (۲۹)

... مضمون میں ... صفحہ

ڈاکٹر اسلم فرخی کے قول کے مطابق آزاد نے مرزا مظہر کے بارے میں ایک دھوبن کو گھر میں ڈالنے کی روایت بغیر کسی سند کے پیش کی ہے (۔[illegible]) لیکن راقم کو آبِ حیات میں یہ روایت یوں ملتی ہے۔

"نکتہ اس میں یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ایک دھوبن گھر میں ڈالی تھی۔ اکثر حالات اور سال تاریخ وغیرہ معمولاتِ مظہری سے لئے گئے ہیں" ([illegible])

معمولاتِ مظہری راقم الحروف کو (تا دمِ تحریر) دستیاب نہیں ہو سکی ہے اس کتاب میں دھوبن والی روایت موجود ہے یا نہیں اس کے بارے میں پورے وثوق سے ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس مسئلہ پر ڈاکٹر خلیق انجم سودا پر اپنے تحقیقی مقالے میں یہ رائے دیتے ہیں۔

"یہ نکتہ غالباً آزاد کے ذہن کی اختراع ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے" (۸)

آزاد نے آبِ حیات میں انشا کی دربارِ سعادت علیخاں سے وابستگی خانِ علامہ نواب تفضل حسین خاں کی وساطت سے بتائی ہے (۹)۔ [راقم الحروف کاظم علی خاں "چونکہ ددھیالی رشتہ سے خانِ علامہ نواب تفضل حسین خاں مرحوم اور ننھیالی رشتے سے نواب سعادت علی خاں کے خاندان سے وابستہ ہے لہٰذا اس موضوع سے فطری طور پر گہری دلچسپی رکھتا ہے] آزاد مرحوم کا یہ قول درست ہے کہ "سعادت علی خاں کی مسند نشینی" خانِ علامہ نواب تفضل حسین خاں "ہی کی (کے) حسنِ تدبیر سے ہوئی تھی" (۱۰) لیکن انشا کی نواب سعادت علی خاں کے دربار سے وابستگی میں خانِ علامہ کا ہاتھ ہونا محلِ نظر ٹھہرتا ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون، اسلم پرویز اور ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے تحقیقی مقالوں میں خانِ علامہ کی وفات ۱۲۱۳ھ میں بتائی ہے ([illegible]) اور مرزا علی لطف کے تذکرہ گلشنِ ہند کے مطابق انشا کا ۱۲۱۵ھ میں مرزا سلیمان شکوہ کے [illegible] "[illegible] صنعت" میں ہی رہنے کا پتہ چلتا ہے ([illegible]) دربارِ سعادت علی خاں سے انشا کی وابستگی سلیمان شکوہ کے دربار سے علیحدگی کے بعد ہونا تسلیم کی جاتی ہے۔ اسلم پرویز اور ڈاکٹر اسلم فرخی نے آزاد کے قول کو رد کرنے کے لئے دلیل یہ پیش فرمائی ہے کہ جب خانِ علامہ کی وفات ۱۲۱۳ھ ہی میں ہو چکی تھی تو خانِ علامہ کی وساطت سے انشا کی دربارِ سعادت علی خاں سے وابستگی (جو تذکرہ گلشنِ ہند کی شہادت کی روشنی میں ۱۲۱۵ھ میں یا اس کے بعد ہی ہوئی ہوگی) کیونکر صحیح تسلیم کی جائے۔

لیکن ہمارا نظریہ اس سے ذرا مختلف ہے۔ ہم ڈاکٹر آمنہ خاتون۔ اسلم پرویز اور ڈاکٹر اسلم فرخی کے ذریعہ پیش کیا جانے والا خانِ علامہ کا سنِ وفات صحیح نہیں سمجھتے۔ ان تینوں محققوں نے خانِ علامہ نواب تفضل حسین خاں کی وفات ۱۲۱۳ھ میں کسی تاریخ کے تحت بتائی ہے خانِ علامہ نواب تفضل حسین خاں کی وفات کا سن مع تاریخ ہمارے مطالعہ کے مطابق پندرہ شوال ۱۲۱۵ھ ہے (۱۳) ٹی۔ ڈبلیو۔ بیل کی تاریخ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خانِ علامہ کی وفات پر شاہ محمد اجمل الہ آبادی نے ایک مؤثر نظم لکھی تھی

ان حقائق کے پیشِ نظر اسلم پرویز اور ڈاکٹر اسلم فرخی کے دلائل کا قلعہ خانِ علامہ کا سن وفات ۱۲۱۵ھ متعین ہونے پر متزلزل ہوتا نظر آتا ہے۔

لیکن ڈاکٹر اسلم فرخی وغیرہ کے دعوے ہمیں درست نظر آتے ہیں لیکن ان دعووں کے لئے ہمیں صحیح دلیل یہ نظر آتی ہے کہ اگر ۱۲۱۵ھ میں (قبل وفاتِ خانِ علامہ) ہی انشا کا سلیمان شکوہ کے دربار سے الگ ہوکر دربار نواب سعادت علی خاں سے وابستہ ہونا تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی انشا کی دربار سعادت علی خاں سے وابستگی میں خانِ علامہ کی وساطت کے شامل رہنے والا آزاد کا نظریہ اسلئے قابل قبول نہیں کہ خانِ علامہ کی وفات ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ سے دور ہوئی اور خان علامہ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ سے باہر جا چکے تھے (۱۰) ان حالات میں دربار نواب سعادت علی خاں سے انشا کی وابستگی میں خان علامہ کا ہاتھ شامل کرنا آزاد کی تحقیقی فروگذاشت ہی معلوم ہوتی ہے۔

(خان علامہ تفضل حسین خاں مرحوم کے بارے میں راقم کے مطالعہ کے نتائج ایک مکمل مضمون کے متقاضی ہیں۔ یہاں محض خان علامہ کے صحیح سن وفات کی نشاندہی پر ہی اکتفا کی گئی ہے جس کے متعلق ڈاکٹر آمنہ خاتون۔ ڈاکٹر اسلم فرخی۔ اور محترم اسلم پرویز جیسے تین محققوں کو غلط فہمی ہوئی ہے راقم کی یہ جسارت امید ہے کہ تحقیق کرنے والوں کی نظر میں قابل عفو فعل ہوگا۔ کاظم علی خاں، ۸ مارچ ۱۹۷۲ء)

حوالہ جات

۱۔ ملاحظہ ہو۔ آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ از سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر لکھنؤ۔ طبع دوم ۱۹۶۴ء

۲۔ تحریریں۔ ڈاکٹر گیان چند جین ادارہ فروغ اردو مطبوعہ ۱۹۶۴ء ص ۱۲

۳۔ پنجاب میں اردو۔ حافظ محمود خاں شیرانی۔ مکتبہ کلیاں لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۶۰ء ص ص ۔۔۔

۴۔ آبِ حیات۔ محمد حسین آزاد۔ رام نرائن لال بینی مادھو پبلشر الہ آباد ۱۹۶۲ء ص ۔۔۔

۵۔ اردو میں تنقید۔ ڈاکٹر احسن فاروقی۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ص ص ۱۹-۲۰

۶۔ محمد حسین آزاد۔ (جلد دوم) ڈاکٹر اسلم فرخی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (اشاعت اول ۱۹۶۵ء) ص ص ۱۲۵/۱۲۶

۷۔ آبِ حیات۔ (فٹ نوٹ) ص ۔۔

۸۔ مرزا محمد رفیع سودا۔ ڈاکٹر خلیل انجم۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ (طبع اول) فٹ نوٹ ص ۲۸۸

۹۔ آبِ حیات ص ۲۶۸

۱۰۔ آبِ حیات۔ فٹ نوٹ ص ۲۶۷

۱۱۔ خانِ علامہ کی تاریخ وفات حسب ذیل کتب میں ۱۲۱۳ھ ملتی ہے۔

(الف) تحقیقی نوادر۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون ص ص ۵۶ بحوالہ لطائف السعادت مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون (طبع اول) ص ۱۲۲

(ب) انشاءاللہ خاں انشاؔ۔ عبدالحق [illegible]
مکتبہ شاہراہ دہلی (طبع اوّل [illegible])

(ج) محمد حسین آزاد۔ جلد [illegible]
[illegible] ۱۸۱

[illegible] مرزا علی لطف [illegible]
لاہور (۱۹۰۶ء) ص [illegible]

تاریخِ آصفی۔ مترجمہ [illegible]
[illegible] ادب دہلی [illegible]

[illegible] طبع [illegible]
[illegible] کتاب [illegible]
[illegible] صاحب [illegible]
[illegible] حسین [illegible] کے عہد [illegible]
میں ڈاکٹر ثروت علی کی قابلِ [illegible]

مفتاح التواریخ۔ ٹی۔ ڈبلیو۔ [illegible]
[illegible] لکھنؤ [illegible]
[illegible]
(الف) لطائف [illegible]
طبع اوّل [illegible]
(ب) تاریخِ آصفی۔ مرتبہ ڈاکٹر ثروت علی۔
(فٹ نوٹ نمبر ۲) ص ۲۶

مقبرۂ حضرت امیر خسروؔ

دلّی تاریخی اہمیت کی حامل عمارتوں اور یادگاروں سے مالا مال ہے ان میں سے اکثر آثار بادشاہوں اور فاتحین کی یاد ذہنوں میں تازہ کردیتے ہیں اور ان میں سے کچھ یادگار عمارتیں بہت سے عظیم فنکاروں، شاعروں، بزرگوں اور درویشوں کے نام سے وابستہ ہیں۔ درویشوں کے اہم اور مقدس مقامات میں خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ ایک ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار کے بالکل نزدیک ہی ان کے عزیز ترین مرید کی قبر بھی ہے جنھیں فارسی اور ہندی ادب کی دنیا میں امیر خسروؔ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

امیر خسروؔ کو بھارت میں فارسی کا سب سے پہلا شاعر مانا جاتا ہے اور آپ کا نام فارسی زبان کی شاعری میں فردوسی اور نظامی جیسے عظیم شاعروں کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ فارسی شاعری کی بہترین روایت کے مطابق خسروؔ کی شاعری بھی بنیادی طور پر صوفیانہ مزاج رکھتی ہے اس میں خدا کی حمد و ثنا ہے۔ حسن، قدرت اور فطرت کی نغمہ سرائی ہے اور حقیقی محبت کی تاثیر اور اس کی صفات کا معجز اثر بیان موجود ہے۔

شاعر کی حیثیت سے امیر خسروؔ ایک عظیم مرتبہ رکھتے ہیں۔ یقیناً آپ ایک صاحب طرز شاعر تھے۔ جن کی تخلیقی صلاحیت ہر اسلوب شعری پر ماہرانہ قدرت رکھتی تھی۔ آپ کو تنگ بھگ پانچ لاکھ اشعار کہنے کا فخر حاصل ہے جن میں سے کثیر تعداد ہندی اشعار کی ہے ان کے عہد میں ہندی اپنے تشکیلی مراحل میں تھی۔ امیر خسروؔ کا شمار ان عظیم خلاق ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندی کے فروغ اور ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا اور اُسے ایک نئی سمت عطا کی۔ ان کا عظیم کارنامہ یہ تھا وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ہندی کو آسان، سہل اور مقبولِ عام انداز میں استعمال کیا۔ زبان کی اسی ہیئت کو کھڑی بولی کہا جاتا ہے۔

جہاں اُن کے فارسی کلام پر کلاسیکی فکر و فلسفے کی چھاپ نظر آتی ہے وہاں امیر خسروؔ کی ہندی شاعری ... اندر عوام، مقبولیت، کشش ... رکھتی ہے ...

ہے کہ امیر خسروؔ عوام سے کس قدر قریب تھے۔ یہ سب کچھ اس امر کے باوجود تھا کہ وہ ترکی نسل کے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اپنی بیشتر زندگی بادشاہوں کے درباروں اور بزرگوں کی صحبت میں گذاری تھی۔

امیر خسروؔ کا نام ابوالحسن تھا۔ آپ کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع ایٹہ میں پٹیالی کے مقام پر ۱۲۵۳ء میں ہوئی۔ آپ کے والد امیر سیف الدین محمود نے ترکی کے خطۂ بلخ سے ترکِ وطن کرکے بھارت میں رہائش اختیار کی تھی۔ چار سال کی عمر میں امیر خسروؔ اپنے والد کے ہمراہ دلّی منتقل ہوگئے جنھوں نے سلطان التمش کے دربار میں ملازمت حاصل کرلی تھی۔ اپنی زندگی کے ۷۰ برس کا زیادہ تر عرصہ امیر خسروؔ نے دلّی ہی میں گزارا جہاں آپ نے تین سلطنتوں کا عروج و زوال دیکھا یہ سلطنتیں تھیں غلام خاندان، سلاطین خلجی اور سلاطین تغلق کی آپ کو ذاتی طور پر دلّی کے کئی حکمرانوں کی مسلسل سرپرستی حاصل رہی۔

خسروؔ سب سے پہلے شاہ بلبن کے صاحبزادے محمد کے معلم مقرر کئے گئے جیسے ارباب علم و فضل کی صحبت سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔ امیر خسروؔ دوسرے انسانوں کی طرح ایک عام اور سادہ زندگی گذارتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی اور دانشمندی نے بہت سے ذی اثر دوستوں کے دل جیت لئے لیکن اس کے باوجود دل کی گہرائیوں میں ایک شاعر کی حس اور روشن ضمیر انسان کی بصیرت رکھتے تھے۔ آپ بچپن ہی سے عظیم بزرگ اور صوفی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہوگئے تھے اور یہ رشتہ زندگی بھر دائم و قائم رہا۔ پیرو مرشد کی صحبت نے امیر خسروؔ کے ذہن اور ان کی تخلیقات پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ خسروؔ اپنے پیرومرشد اور اس بزرگ و محترم ہستی سے خلوص دل کے ساتھ وابستہ رہے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ بھی اپنے اس ہونہار مرید اور پیروکار سے اتنی ہی والہانہ محبت کرتے تھے۔

امیر خسروؔ کی تخلیقی صلاحیتیں کسی ایک ہی سمت تک محدود نہیں رہیں۔ ان کی ذہانت کے گوناگوں پہلو تھے آپ بزرگوں اور بادشاہوں دونوں کے ساتھ نہایت بے تکلفی اور یکساں اخلاق سے پیش آتے تھے۔ آپ کو فارسی کے علاوہ کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی، جبکہ فارسی میں خواہ وہ نثر ہو یا نظم کثرت سے آپ کی تخلیقات پائی جاتی ہیں۔ آپ عربی اور سنسکرت میں بھی نہایت قدرت کلام کے ساتھ اظہارِ خیال کرسکتے تھے۔ حالانکہ وہ نغمۂ توحید اسلام میں ڈوبے ہوئے تھے، لیکن وہ ہندو گرنتھوں کے بھی رسیا اور بڑے شوقِ طالبعلم تھے اور آپ کو ہندو دیومالاؤں کے بارے میں بھی اس قدر معلومات تھی جس قدر انھیں اپنے آبا و اجداد کے مسلک کا علم تھا۔

امیر خسروؔ موسیقی کے بھی دلدادہ اور دالا و شیدا تھے۔ آپ کی آواز میں شیرینی تھی، جادو تھا اور آپ کے گانے کے انداز میں دلوں کو مسحور کردینے کی صلاحیت تھی۔ آپ نے بہت سے گیت اور غزلیں کہی ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ کی موسیقی بھی خود ہی تیار کی ہے۔ بھارتی موسیقی میں خیال کو روشناس کرانے کا

فخر آپ ہی کو حاصل ہے اور آج آپ کو مشہور زمانہ ساز ستار کا موجد بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

ایک شاعر اور موسیقار ہونے کے علاوہ امیر خسروؔ ایک مدبّر بھی تھے اور فن سپہ گری کے مشاق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کئی فوجی مہموں میں بھی حصّہ لیا۔ ایسی کچھ مہموں کا تذکرہ انھوں نے اپنی سوانح حیات میں کیا ہے۔

ان آخری مہموں کے سلسلے میں امیر خسروؔ کو بنگال جانا پڑا اور یہی وہ زمانہ تھا جب کہ انھیں حضرت نظام الدین اولیا کی شدید علالت کا علم ہوا۔ آپ فوراً دلّی کے لئے روانہ ہوگئے۔ لیکن ان کے دلّی پہونچنے سے قبل ہی ان کے پیر و مرشد کا انتقال ہوگیا۔ اپنے پیر کی وفات سے امیر خسروؔ کو شدید صدمہ ہوا اور وہ اسے برداشت نہ کر سکے۔ آپ نے اپنی تمام چیزوں کو تیاگ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

اپنے پیر کے انتقال کے پانچ ماہ کے بعد ہی امیر خسروؔ کا بھی انتقال ہوگیا اور انھیں حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کے قریب ہی سپردِ خاک کیا گیا۔

بھارت کے لکھوکھا عوام جو ملک کے ہر حصے سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں خواجہ نظام الدین اولیا جیسی عظیم بزرگ ہستی کی خداداد عنایات سے فیضیاب ہونے کے لئے دلّی میں ان کی درگاہ کی زیارت کرنے آتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کے محبوب ترین مرید اور عظیم شاعر امیر خسروؔ کے آستانے پر بھی سرِ عقیدت خم کرتے ہیں۔

گوپال متل، ایڈیٹر ماہنامہ تحریک دہلی:

دوست دشمن کی پہچان

جناب آنند نرائن مُلّا کی ایک رباعی ہے ؎

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک، مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹی اُردو
اک آخری گیت گنگنا لیں تو چلیں

اپنی ایک اور رباعی میں انھوں نے کہا ہے کہ قتل اُردو کے ہنگام اُردو کے جو رفیق دفاعِ اُردو کے جرم میں مقتول ہوئے اِن میں مُلّا نامی ایک شاعر بھی تھا۔

لیکن یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب مُلّا صاحب کا سیاسی میدان میں داخل ہونے کا ارادہ نہیں تھا۔ پارلیمنٹ کے ایوان تک پہونچانے میں حامیانِ اُردو کے ووٹوں کا بڑا دخل تھا، ان کا لہجہ بدل گیا، اور ۱۹۶۷ء میں انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ مل کر ہندی کے ادیبوں کے حسبِ منشا تیار شدہ اس بیان پر دستخط کر دیے:-

"ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندی یو۔پی کی واحد سرکاری زبان ہے۔ لیکن ہم اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ضروری اور عملی کاموں کے لئے اُردو کے استعمال اور اس کی ترقی کی بھی جملہ سہولتیں مہیا کی جانی چاہئیں۔"

اور اب یو۔پی کے وزیرِ اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی کے اس برملا اعلان کے باوجود کہ:-

"نہ تو یہ ممکن ہے نہ مناسب کہ یو۔پی میں ہندی کے علاوہ کسی دوسری زبان کو ثانوی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔"

وہ حامیانِ اُردو کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یو۔پی کی موجودہ حکومت اُردو کی مخالف نہیں اور وہ ہر طرح کی سہولتیں اور رعایتیں دینے کو تیار ہے۔ اپنا جواز پیش کرتے ہوئے مُلّا صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اُردو کے سلسلے میں میرا نظریہ نہیں بدلا ورنہ میرا راستہ تبدیل ہوا ہے۔ خوشی یہ ہے کہ کانگریس کا نظریہ بدل گیا ہے۔ اور اب وہ اُردو کی مخالف نہیں رہی۔"

کانگریس کی پالیسی اُردو کے بارے میں پہلے کیا

تھی؟ ۱۹۶۵ء میں پارلیمنٹ کے ۱۰۴ ممبروں نے جن میں مسز وجے لکشمی پنڈت اور جناب صادق علی کی سطح کے کانگریسی شامل تھے۔ مرکزی حکومت کو ایک میمورنڈم پیش کیا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ اُردو کو آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق یو۔پی۔ بہار، مدھیہ پردیش، دہلی، پنجاب اور راجستھان میں ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے اور باقی صوبوں میں بھی جہاں اُردو بولنے اور پڑھنے والے موجود ہیں، اسے پڑھانے کے مناسب انتظامات کئے جائیں۔

اس میمورنڈم میں جو مطالبے کئے گئے تھے، حکومت نے انھیں پورا تو نہیں کیا لیکن یہ یاد نہیں پڑتا کہ اس کا منفی جواب دیا گیا ہو۔ اس صورت میں یو۔پی کے موجودہ کانگریسی وزیر اعلیٰ ترپاٹھی جی کے اس دوٹوک اعلان کے بعد کہ ہندی یو۔پی کی واحد سرکاری زبان ہے، ملّا صاحب کے اس قول کو کہاں تک درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ کانگریسی حکومت کی پالیسی تبدیل ہو کر اُردو کے زیادہ موافق ہو گئی ہے۔

جن اُردو اکاڈمی کی اکزیکیٹو کمیٹی کا ملّا صاحب کو حکومت نے چیرمین مقرر کیا ہے، اس کے افتتاحی جلسے کی تقریر میں بھی ترپاٹھی صاحب نے برملا کہا کہ وہ اُردو کو دوسری ریاستی زبان کا درجہ نہیں دیں گے۔ ملّا صاحب نے اس کی حمایت کی اور یہاں تک کہا کہ ہندی ہماری قومی اور رابطے کی زبان ہے اور اُردو کو اس کے مقابلے پر کھڑا کرنا اُردو دشمنی ہے۔ مقابلے سے ملّا صاحب کی مراد اُردو کو ثانوی سرکاری زبان قرار دیئے جانے کے مطالبے سے ہے تو اس منطق کی رو سے کانگریس کے وہ ۱۰۴ ممبر جن میں پنڈت نہرو کی بہن مسز وجے لکشمی پنڈت اور شری صادق علی بھی شامل ہیں اُردو دشمن ٹھہریں گے اور اس کے ساتھ ہی انجمن ترقی اُردو ہند بھی جسے سرکاری امداد بھی اس مطالبہ سے دستکش ہونے پر آمادہ نہ کر سکی۔ ملّا صاحب نے ترقی پسند ادیبوں اور ہندی کے ادیبوں کے ساتھ مل کر جو بیان جاری کیا تھا، اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے انجمن کے افیشل آرگن "ہماری زبان" نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء کے اداریے میں لکھا تھا:۔

"علاقائی زبان کا لفظ بہت دن سے استعمال نہیں آیا تھا۔ حال میں لکھنؤ سے اُردو اور ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کے بیان میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ مجبوراً استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں کے کچھ ادیب اُردو کو سرکاری زبان بنانے کی تحریک کی حمایت کر رہے تھے۔ مخالفت کرنے والوں میں یش پال، امرت لال ناگر اور بھگوتی چرن ورما پیش پیش تھے۔ ان لوگوں کی اُر... کے لئے تائید حاصل کرنے کو ایک مشترکہ بیان کا مسودہ تیار ہوا۔ ہندی ادیبوں نے اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی سختی سے مخالفت کی۔ وہ علاقائی زبان لفظ پر اسلئے راضی ہوگئے کہ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ انھوں نے دستخط کرنے والے اُردو ادیبوں سے یہ بھی منوالیا کہ ہندی ادیبوں نے اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ اُردو کو سہولتیں دینے کی بات تو بیس برس سے کانگریس کی حکومتیں کر رہی ہیں اور اب جن سنگھ بھی یہ

نہیں ہے۔ ہندی کے کچھ ادیبوں کا بھی ان سہولتوں کے بے جانے کی بات کرنا کیا اہمیت رکھتا ہے ؟"

اُردو والے اگر اپنی زبان کا واقعی تحفظ چاہتے ہیں تو اُنھیں قاضی عبدالودود کے اس مشورے پر عمل کرنا چاہیئے جو انھوں نے اپنے ایک تازہ مضمون میں (تحریک، مارچ ۱۹۷۲ء) انھیں دیا ہے۔ قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ :-

" وہ لوگ جو اُردو کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں ان کا مقابلہ اتنا دشوار نہیں جتنا اُردو کے دوست نما دشمن وہ لوگ ہیں جو اُردو کا موجودہ رسم خط ترک کر کے ناگری رسم خط اختیار کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔ ان سے بحث لاحاصل ہے۔ ان کے ضرر سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ یہ بات اچھی طرح واضح کر دی جائے کہ ان کی آواز اُردو دوستوں کی آواز نہیں اُردو دشمنوں کی آواز ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے ایسے سوچنا چاہیئے "

اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ ناگری رسم الخط کی سفارش کرنے والوں کے علاوہ ان سبھی لوگوں کو برملا طور پر اُردو کا دشمن قرار دیا جانا چاہیئے جو فنی تاویل سے کام لے کر اُردو کے مطالبے کو ضعف پہونچانا چاہتے ہیں ان لوگوں کی تحریروں اور تقریروں کے ابتدائیے پر خوش ہونے کی بجائے نظر اس پر رکھنی چاہیئے کہ ان کی بات کی تان کہاں ٹوٹتی ہے ؟

بہ سلسلہ مضمون صفحہ ۲۲

کی جگہ "کرتی" "اپنے" کے بجائے "اپنی" وغیرہ اس عہد کی کتابوں میں ہم کو صوتیاتی فرق بھی ملتا ہے یعنی جس لفظ کو جس طرح بولتے ہیں اسی طرح لکھتے ہیں دراملا تک غیر یقینی ہے جیسے "یہہ" بجائے "یہ" کے ہاتھہ (ہاتھ) ادن" (ان) اودھر" (ادھر) لیے۔ ایسے (ایسے) کبھی کبھی جگہ جگہ کہیں کہیں استعمال ہوتا تھا۔ اس تریا کے اکابر کا اصل مقصد اپنی بات دوسروں تک پہنچانا تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے مقفیٰ مسجع عبارت

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ کا

ایک اور شاہ کار

ادارہ فروغ اُردو کی ادبی مجلس نے جس کی صدارت نسیم قریشی علی گڑھ یونیورسٹی نے کی اور یہ طے کیا کہ

فروغ اُردو کا لکھنؤ نمبر

شائع کیا جائے۔ لکھنؤ نمبر تاریخی، ادبی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی اعتبار سے مکمل دستاویز کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا

اس نمبر کے کم از کم تین حصے ہونگے۔

(۱) پہلے حصہ میں لکھنؤ کی تاریخی و تہذیبی اہمیت یہاں کے علوم و فنون وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا جائیگا۔ (۲) دوسرے حصہ میں نثر کی ترقی میں لکھنؤ کی خدمات مختلف اقسام کا تفصیلی جائزہ۔ (۳) تیسرے حصہ میں نظم کے ارتقا میں لکھنؤ کی خدمات مختلف اصناف کا تفصیلی جائزہ۔

جناب نسیم قریشی صاحب ریڈر شعبۂ اُردو علی گڑھ یونیورسٹی

اور

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

اس یادگار نمبر کے

مرتبین ہوں گے

سید مصباح الاسلام نقوی

اُردو ادب پر وہابی تحریک کے اثرات

وہابی تحریک کا باقاعدہ آغاز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۲ء-۱۷۶۲ء) سے ہوتا ہے۔ یہ تحریک ایک مذہبی تحریک تھی اس کا مقصد مسلمانوں میں پیدا ہونے والی غلط رسومات کو ختم کرنے کی کوشش تھی لیکن اس تحریک کے مذہبی پہلو کے ساتھ ہی ساتھ اس کے دو پہلو اور بھی تھے ایک سیاسی دوسرا ادبی۔ یہاں ہم اس تحریک کا ایک ادبی تحریک کے دور پر جائزہ لیں گے اور دیکھیں [illegible] پہلے [illegible] تحریک کہاں [illegible] کیا تھا اور اس تحریک [illegible]؟

تحریک کا مذہبی پہلو

عام تحقیق کے مطابق وہابی تحریک اٹھارویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۲-۱۷۶۲ء) اس کے بانی [illegible]

سرہندی کا نام بھی ہمارے سامنے آتا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ وہابی خیال و افکار کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی انھیں بزرگ کے سلسلہ میں مرید [illegible] ہیں شیخ احمد سرہندی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے انھوں نے اکبر اعظم اور شہنشاہ جہانگیر کا زمانہ دیکھا تھا۔ شیخ احمد سرہندی نے اپنی اصلاحی کوششوں سے [illegible] [illegible] پیدا کر دی تھی مغل شہنشاہ [illegible] [illegible] [illegible] اورنگ زیب بڑا دیندار ثابت ہوا۔ شیخ احمد سرہندی نے ایوان شاہی کے علاوہ امرائے وقت اور وزرائے دربار کی بھی اصلاح کی اور ان لوگوں سے رسومات شرک و بدعت ترک کروائیں۔ وہابی تحریک کے باقاعدہ آغاز کا زمانہ وہی ہے جو ہندوستان کے معاشی، اقتصادی [illegible]

کا زمانہ ہے۔ یہ وقت وہ تھا جب چاروں طرف بے اطمینانی اور ایک ہیجانی کیفیت پھیلی ہوئی تھی اور خاص طور سے مسلمانوں کے مذہبی عقائد اتنے ضعیف ہو گئے تھے کہ ان میں سیکڑوں ناجائز و شرک آمیز رسومات داخل ہو گئی تھیں گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ یہ رسومات مسلمانوں کی عام زندگی کا ایک جزبن گئی تھیں ان رسومات کا ختم کرنا گویا ایک امرِ محال تھا۔ لیکن ان کو اسی حال میں رہنے دینا اسلام کی بنیاد کو کمزور کرنا تھا۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ رسومات اسلام کی دین نہیں ہیں۔ ورنہ ان رسومات و توہمات کو مسلمان اپنے ہمراہ عرب سے لائے تھے۔

یہ تمام رسومات و فرسودہ خیالات ہندوستان کی دین ہیں۔ جب مسلمان پہلی بار ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کے پاس ان رسومات سے پاک اسلام مذہب تھا لیکن یہاں آکر یہ اسلام ... ہندوستانی اسلام بن گیا۔ جب ہندوستان میں فاتح مسلمان داخل ہوئے یہاں صدیوں ... ہندو مذہب اپنی صدیوں پرانی ... طرزِ زندگی کے ساتھ موجود تھا۔ فاتح و مفتوح کا ملاپ اور زندگی کے ہر شعبہ میں اتحاد و اتفاق ضروری تھا۔ چاہے وہ ادب آرٹ، موسیقی، تہذیب و تمدن کے شعبے ہوں یا پھر زبان و مذہب ہو۔ ہندوستان میں جب مسلمان داخل ہوئے تو ایک سیاح کی طرح نہیں بلکہ ایک فاتح کی طرح داخل ہوئے اور اسی ملک کو اپنا وطن بنا لیا۔ جب مسلم سلاطین ... ہندوستان ... گئے تو یہ

مذہبی طور پر اصلاح و تبلیغ کا کام شروع ہوا۔ ہندو اصنام پرستی کے قائل تھے اور کوئی معبود وں کے وجود میں عقیدہ رکھتے تھے۔ اور اسی کائنات میں معبود کا وجود تلاش کرتے تھے۔ لیکن اسلام مذہب کی ابتدا ہی یہیں سے ہوتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور رسول صلعم خدا کے بندہ اور رسول ہیں۔ عبادت کے لائق وہی ذات پاک ہے۔ یہ دو متضاد نظریئے ہیں جن کی ایک ... آمیزش و آمیزش وقت کا تقاضا تھی۔ دونوں قوموں کے اختلاط کے نتیجہ میں دونوں قوموں کے افراد نے ایک دوسرے کے، اخلاقی، لسانی۔ ادبی، معاشرتی اور مذہبی اثرات قبول کئے۔ مذہبی تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ... پست طبقے کے لوگوں نے تیزی سے اسلام کی وحدانیت کو قبول کرنا شروع کیا لیکن ساتھ ... مذہب کی قدیم رسومات کو بھی گلے لگائے رہے ہیں طرح جو نیا آدمی اسلام قبول کرتا ہے وہ رسومات کو بھی اسلام میں لے ... یہاں آنے کے بعد ان غیر مذہبی رسومات کو نیا اسلامی ... داخل کر لیتا۔ آہستہ آہستہ فرسودہ ... شرک آمیز رسومات خیالات و افکار کا ایک انبار لگ ... اور اسلام غیر اسلامی رسومات کا نام ہو کر رہ گیا جو گھن کی طرح اندر ہی اندر اسلام کی وحدانیت، صداقت اور عظمت کو کھوکھلا کرنے میں لگی تھیں۔

وہابی تحریک انہیں رسومات اور بدعتوں کے خلاف ایک عملی جد و جہد کا نام تھا۔ اٹھارھویں ... صدی کے قریب ان تمام رسومات نے بہت ... رنگ اختیار کر لیا تھا۔ میلے، عرس، منت۔

مراد۔ چلّا۔ گنڈہ۔ تڑہ۔ بدھنی۔ ان تمام چیزوں کا ایسا زور تھا کہ سارا مسلم معاشرہ اسی سیلاب میں بہا جارہا تھا۔ ایسے وقت میں شاہ ولی اللہ اور ان کے مریدین کی ایک فعال جماعت نے جس میں شاہ عبدالعزیز، سید احمد بریلوی، مولانا خرم علی اور حضرت اسماعیل شہید اور شاہ ولی اللہ کے صاحب زادہ شاہ رفیع الدین جیسے صاحب علم و فضل حضرات شامل تھے، تصنیف و تالیف کے ذریعے مسلمانوں کو اس بدعت سے روکنے کی بھرپور کوشش کی۔ اپنے خیالات و افکار کو اپنی تصنیف و تالیف کے ذریعہ گاؤں گاؤں پہنچایا۔ اس وقت کے معاشرہ میں اس طرح کی رسومات عام تھیں جیسے۔

خدائی رات، پیر دیدار کے کونڈے یا بی بی کی صحنک یا بی بی کی پڑیاں، مشکل کشا کے دونے، رجب ٹھیلے کے غ یا شاہ سلطان کے روٹ۔ بی جاکتی جسوت کی نوبت، بی سہجان کی کڑھائی کہ مشکل آسان ہو یا بی۔ ٹیک کی سپاری کہ مراد ٹھیک پڑے، ترت پھرت کی پڑیاں۔ بی کشتی کا کونڈا جس سے جلد کشت یعنی مشکل آسان ہو، بی سہجان کی کٹی، بی آس کی ٹلیا، شاہ مرتضیٰ کا ملیدہ، بارہ وفات میں بارہ دن شاشوں پر فاتحہ۔ شاہ جلال بخاری کا کونڈا۔ خواجہ خضر کی ناؤ، شاہ دریا اور صدر جہاں کا سر یہ آنا شیخ سدو کا بکرا اور سید احمد کبیر کی گائے۔ عورتیں ان رسومات پر زیادہ عقیدہ رکھتی تھیں۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد ان کے مریدوں ...... نے قرآن شریف کا اُردو میں ترجمہ کرکے شائع کیا اور کتابیں لکھ کر احکام خداوندی اور ارشادات محمدی کے ذریعہ تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور ان رسومات کو برے سے منع کیا۔ تذکرۃ الاخوان، "تقویت الایمان"، "قانون النساء" وغیرہ کتابیں جو اس تحریک کے حامی نے تصنیف کی ہیں ان میں اس طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ رسومات اور اس طرح کے بدعت آمیز خیالات اسلام میں کس طرح داخل ہوگئے۔ ہدایت المسلمین میں لکھا ہے

"[1]ہندوستان [illegible] نوبت پہنچی ہے کہ [illegible] ہیں اور جو [illegible] ہوگئے۔ انھوں نے جب [illegible] کرنا مناسب نہ دیکھا اور مطلق چھوڑ [illegible] پایا تو اس واسطے دینی رسمیں اپنے طور صورت ورنام بدل کر مقرر کرلیں۔ مثلاً ہندو جو بیاہ میں موڑ باندھتے ہیں۔ یہ لوگ بھی سہرا اور مقنع باندھنے لگے اور جو وے اپنے مردوں کے دن کرتے ہیں۔ یہ بھی تیجا اور دسواں کرنے لگے اور چالیسواں اور برسی مثل فرض وواجب کے کرنے لگے ۔۔۔ اور اگر ان کے یہاں

[1] اُردو۔ عہد جہانی ادب

[1] اُردو [illegible]

بھرا اور کاٹی جاتے ہیں، یہاں بھی لکن پور، بہرائچ اور اجمیر کو تیار ہو گئے اور دونے جو وہاں کے پرشاد لاتے ہیں۔ تو یہ بھی صندل اور پیر سوئی لانے لگے اور وہ ہے جو جگن ناتھ کا بھات دور دور لے جاتے ہیں [illegible] جانے لگے، اور [illegible] جھنڈیاں چڑھاتے ہیں، یہاں [illegible] اور نیزے چڑھانے [illegible] کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں میں [illegible] نئی نئی باتیں اور نئے عقیدہ اور رسم و رسوم [illegible] ہیں، اور ایک جہاں ان میں گرفتار رہے۔ بچے کا پیدا ہوتے وقت [illegible] بکرا ذبح کرنا اور بندوق چھوڑنا [illegible] اور زچہ کی چارپائی [illegible] اور کلام مجید رکھنا اور چھٹی (چھٹی) کرنا اور نام فلاں بخش اور غلام فلاں رکھنا ...... [illegible] کی شادی کی نقل کرنا ...... مختون [illegible] یا نشان یا جھنڈے کے سلام کو پیجانا اس کے [illegible]

ان بال کا کنگنا باندھنا اور اس کے ہاتھ میں لوہا رکھنا اور رسوم منگنی کرنا پیڑھا وغیرہ باندھنا شادی نکاح میں موتی باندھنا اور کھیل چونے کے ٹیکے دروازہ پر لگانا۔ سانچق اور آتش بازی... مرد کو مہندی لگانا ٹونے کہنا اور جلوہ کرنا تعزیہ بنانا۔ شدے نکالنا ربیع الثانی کو گیارہویں کرنا، جمادی الاول میں لکن پور کو بدیع الدین شاہ مدار کے عرس میں جانا... قبر میں قلا کے ڈھیلے اور شجرہ رکھنا...... توشے کرنا... مقصد کے تحت میں تقلید ہی کافی جاننا اور تحقیق ضروری نہ سمجھنا۔ ذات پات کی برائی [illegible] کرنا۔ دوسرا نکاح معیوب سمجھنا۔ سوگ میں بیٹھنا۔ قبروں پر چادریں ڈالنا مقبرے بنوانا موت کے ذکر کو برا جاننا [illegible] ٹوٹکے [illegible] مشکل بد ہو۔ سنیچر کے دن کو مبارک نہ سمجھنا اور بعض تاریخوں کو نحس جاننا۔ حضرت اسمٰعیل شہید نے اپنی مشہور تصنیف تقویۃ الایمان میں شرک کی مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے "اول سنا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب لیکن اگر لوگ شرک و توحید کے معنی نہیں سمجھتے اور ایمان کا دعوی (کرتے ہیں) رکھتے ہیں سنا چاہیے کہ اکثر لوگ پیروں کو پیغمبروں کو اماموں کو اور شہیدوں کو فرشتوں کو اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں، اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی منتیں

له فارسی میں "تذکرۃ الاخوان" حضرت [illegible]

[illegible] محمد سلطان [illegible]

سه تذکرۃ الاخوان ص ۱۱-۱۲۔ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

له تقویۃ الایمان، اسمٰعیل شہید، ص ۵۔ مطبع دہلی۔ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مانتے ہیں اور حاجت برآری کے لئے اُن کی نذر نیاز کرتے ہیں اور بلا کے ٹلنے کے لئے اپنے بیٹوں کو اُن کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبدالنبی رکھتا ہے کوئی علی بخش کوئی حسین بخش کوئی پیر بخش کوئی مدار بخش سالار بخش کوئی غلام محی الدین کوئی غلام معین الدین اور ان کے جینے کے لئے کسی کے نام کی بدھی پہناتا ہے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہناتا ہے کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالتا ہے کوئی کسی کے نام کے جانور ذبح کرتا ہے۔ کوئی مشکل کے وقت کسی کی دہائی دیتا ہے کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے غرضکہ جو کچھ ہندوؤں میں ہوتا ہے اور جو وے اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ سب یہ جھوٹے (جھوٹے) مسلمان اولیا انبیا اور اماموں سے اور شہیدوں سے اور فرشتوں سے اور پریوں سے کر گذرتے ہیں اور دعوی مسلمان ہونے کا کئے جاتے ہیں۔"

اس وقت کے معاشرہ میں ایک رسم ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی رائج تھی کہ بیوہ عورت کا دوسرا نکاح معیوب سمجھا جاتا ہے اور عورت کے پہلے خاوند کی موت کے بعد۔ اس عورت کی زندگی جہنم بن جاتی تھی۔ اس رسم کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی اور بیوہ کے دوسرے نکاح پر بہت زور دیا گیا —— یہ ایک بہت ہی مختصر خاکہ تھا اس تحریک کا جسے ہم دھابی تحریک کہتے ہیں اس سے ہم کو اس بات کا اندازہ ہو ... کیوں پیدا ہوئی تھی اس کی ادبی اہمیت کا ذکر کرنے سے پہلے اس کے سیاسی رخ پر بھی اجمالاً نظر ڈالنا ضروری ہے ....

تحریک کا سیاسی پہلو

دہابی تحریک کے حامیوں کا نعرہ تھا کہ احکام خداوندی اور ارشادات محمدی کے طرز پر زندگی نہ گذارنے والوں، اس میں کمی زیادتی کرنے والوں کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے پیروکاروں کے یہاں مرید کرنے کی پہلی اور کڑی شرط جہاد اور ہجرت تھی۔ اس سلسلے میں اس تحریک کے حامیوں کو بہت سخت اور کڑی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا اس تحریک کا اثر سب سے زیادہ زور بہار اور بنگال میں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ تحریک ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی ایک انگریز مصنف نے ان لوگوں کو ۸۰ ہزار لوگوں کا ایک گروہ بتایا ہے لوگ تعداد میں کتنے ہی ہوں۔ لیکن اس تحریک نے بہت زیادہ ترقی کی جس وقت تاج برطانیہ کا سایہ پورے ہندوستان پر پھیلتا جا رہا تھا برطانوی فوجیں دہلی تک پہنچ گئی تھیں۔ ہندوستان مغلوب ہو کر انگریزوں کے اقتدار میں جا رہا تھا غرض ہر طرف انگریزوں کا دور دورہ تھا ایسے وقت میں علما ریہ

---

[1] تقویۃ الایمان " اسمٰعیل شہید" ص ۵۔ مطبع

نہ برداشت کر سکتے تھے۔ کہ دہلی جو صدیوں سے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کا مرکز اور گہوارہ رہا ہے وہ کسی دوسری قوم کے اقتدار میں چلا جائے، اس لیے شاہ عبدالعزیز نے ۱۸۰۳ء میں فتویٰ دیا کہ "پورا برطانوی ہند دارالحرب ہے" اور انگریزوں سے لڑنا ہمارا عین دین ہے اس طرح جہاد کا نعرہ بلند کیا گیا۔ وہابی تحریک کا مقصد تھا اقتصادی اور اخلاقی اصلاحات کے ذریعے ایک ایسا منصفانہ معاشرہ قائم کیا جائے جو قرآن کی تعلیم خدا کے حکم کے مطابق عمل، خدمت خلق، عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ یہ لوگ ہندوؤں کے سماجی اقتدار کے خلاف نہیں تھے لیکن ان کو ڈر تھا کہ کہیں مسلمان ان بدعتوں کی وجہ سے دوسروں میں ضم ہو کر نہ رہ جائیں اور ملک کے لیے بوجھ نہ بن جائیں۔ وہابی تحریک اپنی ان اصلاحات کے سیلاب میں اتنی تیز تھی کہ اس نے ملک کے شفق پر ابھرنے والی طاقت کے ساتھ نئی روشنی کو نظر انداز کر دیا۔ برطانوی سامراج اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ سائنس کی ایک نئی طاقت تھی اور نظروں کو خیرہ کر دینے والی نئے خیالات کی نئی روشنی۔ وہابی تحریک خالص ایک مذہبی تحریک تھی لیکن سیاست کے میدان میں ان لوگوں کو مصلحتاً آنا پڑا کیوں کہ برطانوی اقتدار ان لوگوں کو دبانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس تحریک کے حامیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ برطانوی حکومت کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی) کے قول کے مطابق ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک وہابی اکابر پر پانچ بڑے سرکاری مقدمے چلائے گئے اور ان مقدموں میں ماخوذ لوگوں کو سولی پر لٹکایا گیا یا حبس دوام کی سزا بھگتنی پڑی۔

تحریک کی ادبی اہمیت

اس تحریک کی ادبی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس تحریک کے حامیوں اور مداحوں نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے وہ قابل ستائش ہے گو اس تحریک کے دوران لکھی جانے والی کتابوں میں نہ تو کوئی فنی خوبی ہے اور نہ ادبی، لیکن زبان و بیان کا جو خوبصورت انداز اس دور کی کتابوں میں ملتا ہے وہ اس دور کی کسی دوسری کتاب میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ دراصل وہابی اکابر نے جو کتابیں تصنیف کیں ان کا موضوع اصلاح العلوم تھا اور مخاطب بھی ہر طبقہ کے عوام تھے اس لیے زبان اتنی سیدھی سادی صاف شستہ، رواں، عام بول چال کے مطابق آسان سلیس استعمال کی گئی کہ ہر شخص اس کو سمجھ کر پوری طرح مستفید ہو سکے۔ ان لوگوں کی محنت اور تحریریں کامیاب ہوئیں۔ ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک گھر گھر ان کی آواز پہنچی۔ ان کی تصانیف سے چھاپے خانوں کو اور طباعت و اشاعت کو بہت فائدہ پہنچا کیوں کہ اس تحریک کے

دوران لکھی گئیں کتابیں اور رسالے متعدد بار چھپے تقویت الایمان حضرت اسماعیل شہید کی لکھی ہوئی کتاب بہت دفعہ چھپ چکی ہے یہ کتاب بہت سے گھروں میں آج بھی موجود ہو گی۔ ان کتابوں کی مقبولیت کا سبب موضوع سے زیادہ زبان ہے جو آسان اور عام فہم تکلف و تصنع سے پاک ہے۔ سرسید احمد خاں کی آسان و شستہ عبارت سے پہلے ہم کو اس دور کی کتابوں میں آسان زبان ملتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں اور قدیم دہلی ۱۸۲۵ء میں قائم کیا گیا تھا لیکن ان اداروں کی ادبی کوششوں سے پہلے زبان و بیان کے میدان میں وہابی تحریک کی کتابیں نظر آتی ہیں۔ عام طور پر فورٹ ولیم کالج۔ قدیم دہلی کالج، سرسید کی تحریک اور غالب کی خطوط نویسی کو اردو نثر کو تکلف و تصنع سے پاک کرنے کا دور کہا جاتا ہے۔ لیکن شاہ عبدالقادر کے قرآن شریف کے اردو ترجمہ کی عبارت کو دیکھنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے پہلے آسان اور سادہ نثر وجود میں آنے سے پہلے آسان اور سادہ نثر وجود میں آ چکی تھی۔ شاہ عبدالقادر نے ۱۷۹۰-۹۱ء میں قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

"سو اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے بزرگ حضرت شیخ ولی اللہ ابن عبدالرحیم محدث دہلوی کا ترجمہ فارسی کر گئے ہیں سہل و آسان اب ہندی زبان میں قرآن شریف کو ترجمہ کرنے۔ اور اس کتاب کا نام (موضح القرآن) موضح القرآن ہے یہی اس کی صفت اور یہی اس کی تاریخ"

مولانا اسمٰعیل شہید نے عقیدۂ توحید کی تائید میں ایک مثنوی "سلک نور" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

زباں کس طرح حمد تیری کرے
کہ ہے تو تو ادراک ہی سے پرے
نہیں بس یہی تیرا ادراک سہت
کہ ہے ذات تو ہر عیب سے پاک ہے
فلک اس کے سجدہ میں ہے واژگوں
ملک اس کی تسبیح میں سرنگوں
اس کی ہیں خدمت میں شمس و قمر
شب و روز حاضر ہیں بستہ کمر

اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں بھی آسان اور سلیس اردو لکھی جا سکتی تھی لیکن عام ذہنوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی وہابی اکابر کے مخاطب عوام تھے جاہل، کم پڑھے اور پڑھے لکھے ہر طبقے کے لوگ اس میں شامل تھے اس تحریک کے ذریعے جہاں دوسرے مذہبی فوائد ہوئے وہاں اردو زبان و ادب کو بھی بہت فائدہ پہنچا جس سے کوئی بھی صاحب عقل و فہم انکار نہیں کر سکتا اس تحریک کے دوران لکھی جانے والی کتابوں کی ایک لسانی اہمیت بھی ہے کیوں کہ اس وقت تک تذکیر و تانیث کے اصول تک نہیں مرتب ہوئے تھے "بیٹھنے" کی جگہ پر "بیٹھی جاتی تھی۔ جیسے بیٹے کی جگہ "بیٹا" ... کر ...

ترجمہ: م۔ محی الدین

سیکرٹ آف چمنیز

قارئین فروغ اردو کی خدمت میں یہ مسلسل ناول جس کا ترجمہ م۔ محی الدین صاحب کر رہے ہیں قسط وار پیش کیا جائے گا۔ امید ہے کہ دلچسپی کے ساتھ یہ مفید مطلب بھی ہوگا۔

شفیق علوی

([illegible] ادب میں [illegible] کے نام سے مشہور ہیں۔ سیکرٹ آف چمنیز ان کا ایک مشہور ناول ہے جس کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ ترجمہ کرنے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ظاہر ہیں۔ بہرحال کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ صاف اور سلیس ہو۔ اس سلسلہ میں آپ کے قیمتی رائے اور مشورے [illegible] مشعل راہ ثابت ہوں گے)

۱۔ ایک ہزار پاؤنڈ کی بات

مسٹر انتھونی کیڈ دلکش شخصیت اور شاندار کردار کے مالک تھے۔ باتہذیب، شائستہ اور با اخلاق، امن پسندی ان کی فطرت تھی۔ دوسروں کے جھگڑوں کو چکانے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ وہ اپنی پُر اثر شخصیت سے ہر ایک کو آسانی متاثر کر لیتے تھے۔ وہ دبلے پتلے مگر لمبے قد کے مالک تھے۔ [illegible] ذہانت کے روشن چہرے پر چمکتی ہوئی آنکھیں ان کی [illegible] کی آئینہ دار تھیں۔ اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھے پکچر پوسٹ کارڈ سے دل بہلا رہے تھے۔ [illegible] جنگل میں جو" کا نعرہ سنائی دیا۔ مسٹر کیڈ نے چونک کر دیکھا، کمرہ کے کھلے دروازہ میں انھیں کی سی قد و قامت کا ایک نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ یہ نوجوان قبول صورت ہونے کے باوجود مسٹر کیڈ جیسی پُرکشش شخصیت سے محروم تھا۔ مسٹر کیڈ مسکراتے ہوئے اٹھے اور اس نوجوان کے ساتھ، اپنے دوستوں سے معافی طلب کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ پکچر پوسٹ کارڈ اب بھی ان کے ہاتھ میں موجود تھے۔

"یار! یہ تصویریں تمھارے کس کام کی ہیں"
میک گراتھ نے تصویروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"[illegible] نے کاسلس سکیاٹ ٹور میں نوکری کر لی ہے۔ یہ تماشہ بینوں سے متعلق ہیں"

"ایسی بوگس نوکری کرنے کی کیا ضرورت پیش

آگئی تھی؟

"روبیہ! میرے دوست روبیہ! ویسے یہ نوکری مستقل بھی نہیں ہے! کچھ ہی دن میں پیچھا چھوٹ جائے گا"

"اچھا آج شام کو تم میرے یہاں آ رہے ہو! اس وقت ذرا جلدی ہے"

"اوکے!" کیڈ اس سے ہاتھ ملا کر اپنے دوستوں میں پلٹ آیا۔

مس ٹیلر جو اس پارٹی میں سب سے کم عمر اور شوخ تھی چہک کر بولی۔

"مسٹر کیڈ! کیا یہ صاحب آپکے پرانے دوست ہیں؟"

"جی ہاں، مس ٹیلر!"

"لیکن انھوں نے آپ کو پکارا کس نام سے تھا؟"

"جنٹل مین جو کے نام سے"

"کیوں! آپ کا نام جو ہے کیا؟"

"مس ٹیلر آپ جانتی ہیں کہ میرا نام انیقونی ہے"

"پھر وہ ... کہ جنٹل مین جو کیوں کہتا ہے؟"

"محض اس لئے کہ یہ میرا نام نہیں ہے" کیڈ نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"اوہ! چھوڑیئے بھی" ایک صاحب نے جمہائی لے کر اکتائے ہوئے لہجہ میں کہا "صبح کی چائے کا وقت ہو گیا ہے۔ اگلی شاہراہ پر ایک شاندار کیفے ہے۔ وہیں چل کر چائے پی جائے"

"... میں تو نہیں جانے ہو گی" مس ... بولیں۔!

اور یہ پارٹی کیفے کی طرف چلدی! مس ٹیلر جو انیقونی کے بائیں طرف چل رہی تھی بولی "شاید آج آپنے کافی عرصہ کے بعد اپنے دوست سے ملاقات کی ہے!"

"جی ہاں کئی سال بعد!"

"آپ انھیں کب سے جانتے ہیں؟"

"جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ بندھا ہوا پڑا تھا۔ اور اس کے قریب بیٹھے ہوئے چند لوگ اسے بھون کر کھانے کی تیاریاں کر رہے تھے، ٹھیک وقت پر ہم پہونچ گئے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ملک کے اندرونی حصّہ میں کچھ قبائلی آدم خور ہیں!"

"پھر کیا ہوا!"

"معمولی سی لڑائی اور وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے!"

"اوہ مسٹر کیڈ! بڑی حیرت انگیز اور پُر اسرار زندگی گزاری ہے آپ نے بھی!"

"برخلاف اس کے بے حد پُر سکون اور پُر امن آپ یقین کریں!"

ظاہر ہے کہ مس ٹیلر نے اِس بات کا اعتبار نہیں کیا۔

اُسی رات کو ۱۰ بجے انیقونی ایک کمرہ میں داخل ہوا۔ میک گراتھ بڑی نفاست سے بوتلیں سجانے میں منہمک تھا۔

"ادھر لاؤ ایک گلاس"

میک گراتھ چونک کر مڑا۔

"ہلو انیقونی! — ابھی لو!" میک گراتھ بولا مگر

یار مجھے حیرت ہے کہ تم نے یہ نوکری گوارا کیسے کرلی ؟"

"تمھیں کوئی راز [illegible] تا !" انیھونی بولا "نوکری فوراً چھوڑ دوں گا۔"

"سنجیدگی سے کہہ رہے ہو" میک گراتھ نے ایک گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب !"

"یہی کہ اگر تمھیں کوئی دوسرا کام مل جائے تو تم یہ نوکری چھوڑ دوگے"

"ہاں لیکن [illegible] کام [illegible] کیوں نہیں کرلیتے ؟"

"وہ کام تمھارے معیار سے مطابقت رکھتا ہے! مجھے اس میں دلچسپی نہیں محسوس ہوتی !"

"اوہو! یہ کام جنوبی امریکہ میں تو نہیں ہے ؟ جنوبی امریکہ پر میری گہری نظر ہے، وہاں ریپبلکنوں کی طرف سے ایک انقلاب رونما ہونے والا ہے"! انیھونی بولا۔

"مجھے علم ہے کہ تم امریکہ میں گہری دلچسپی لیتے ہو! لیکن بیٹے! یہ کام جنوبی امریکہ میں نہیں بلکہ انگلینڈ میں ہے۔

"انگلینڈ!" انیھونی اچھل پڑا "طویل عرصہ کے بعد ایک ہیرو کی وطن واپسی! لیکن یار میں اس الجھن میں ہوں کہ اس کام کو تم خود کیوں نہیں کرتے"

"دراصل میں جلد ہی سونے کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں۔"

"یار تم ہمیشہ سونے ہی کی تلاش میں رہتے ہو!"

"بھئی تمھاری ہابی سیر و سیاحت ہے! اور میری ہابی سونے کی تلاش ہے۔ مگر چھوڑو اسے! میں تمھیں پوری کہانی سناتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم ہرزد سلاواکیہ" اس کے لہجہ میں عجیب سا تاثر تھا۔

"ہاں! کیا جانتے ہو اس کے بارے میں ؟"

"بس اتنا ہی جتنا دوسرے لوگ جانتے ہیں!"

اس کا لہجہ دھیما تھا! وہ بولتا رہا :-

"یہ بالکن اسٹیٹس میں سے ایک ہے۔ اس کا دارالسلطنت اسکارسٹ ہے۔ آبادی خاص کر ڈاکوؤں کی ہے۔ ان کی ہابی بادشاہوں کو قتل کرنا اور انقلاب برپا کرنا ہے۔ آخری بادشاہ نکولس چہارم، سات سال پہلے قتل کیا گیا تھا۔ تب سے یہاں جمہوریت قائم ہے۔ بہرحال جگہ بہترین ہے۔ مگر تم یہ پہلے ہی کہہ سکتے تھے کہ یہ کام ہرزد سلاواکیہ میں ہے۔"

"نہیں بھئی اس کا ذکر تو ضمناً آگیا تھا۔"

میک گراتھ جلدی سے بولا۔

"یار! پہیلیاں بجھوانے کا تمھارا یہ انداز تمھیں مار نہ کھلوا دے!"

"کاونٹ اسٹلپ ٹچ کا نام سنا ہے تم نے ؟"

میک گراتھ اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں اب تم بات کر رہے ہو۔ بہت سے لوگ جنھوں نے ہرزد سلاواکیہ کا نام نہیں سنا ہے کاؤنٹ کے نام پر چونک پڑیں گے۔ بالکنس کا شاندار بوڑھا! موجودہ زمانہ کا عظیم سیاست دان! زبردست بدمعاش جسے پھانسی نہیں دی جاسکی! میری یہ معلومات

رف اخبارات پر مبنی ہیں! لیکن تمہیں یہ بات یاد
تھا کہ کاؤنٹ کا نام بہت دنوں تک یاد رکھا جائے
اعجب کہ ہم لوگ راکھ اور مٹی کے ڈھیر میں تبدیل
دچکے ہوں گے۔ پچھلے بیس سال سے جو بھی حرکت
رتی ہے۔ مشرق قریب میں، کاؤنٹ اس کی تہ میں
وتا ہے وہ ایک محب وطن ڈکٹیٹر ہے اور سیاست داں
ہے اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے سوا اس کے
کہ وہ فسادوں کا بادشاہ ہے۔ ہاں تو تم اس کے
بارے میں کیا کہہ رہے ہو!"

" وہ ہرزدسلاداکیہ کا وزیر اعظم تھا! اسلئے
یں نے پہلے ہرزدسلاداکیہ کا ذکر پہلے کیا تھا!"

"کمال ہے۔ ہرزدسلاداکیہ کی اسٹلیپ ہنچ
کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں! یہ صرف اس کی
جائے پیدائش ہے اور وہ وہاں کا وزیر اعظم تھا
لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔"

" تمہارا خیال صحیح ہے! دو ماہ پہلے پیرس میں
اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن میں جو کہانی سنانے
جا رہا ہوں وہ اب سے چند سال پہلے شروع ہوئی ہے۔"

"لیکن کہانی ہے کیا؟" انیتھونی نے بےچینی
سے پہلو بدلا۔

"تو سنو!" میک گراتھ نے سنجیدگی سے کہا
"ان دنوں میں پیرس میں تھا۔ ایک رات میں ایک
نسبتاً سنسان جگہ پر تنہا چہل قدمی کر رہا تھا۔ میں نے
دیکھا کہ چھ بدمعاش فرانسیسی ایک شریف اور معزز
بوڑھے کو پیٹ رہے ہیں اور وہ بیچارہ پٹ رہا ہے
میں دندناتا ہوا مجمع میں گھس پڑا اور بدمعاشوں پر
گھونسا بازی شروع کر دی! میرا خیال ہے کہ ایسی
زوردار گھونسہ بازی سے انھیں پہلے کبھی سابقہ نہیں
پڑا تھا اور وہ چند ہی منٹ میں نو دو گیارہ ہو گئے۔"

"بہت عمدہ جمی! کاش میں اسے دیکھ سکتا۔"

"ہاں یار کوئی خاص بات نہ تھی!" میک گراتھ
نے انکساری کے ساتھ کہا "لیکن بوڑھے پر اس احسان
کا کوئی اثر نہ تھا۔ پھر بھی اس نے میرا نام اور پتہ معلوم
کرنے کی زحمت گوارا کر لی! دوسرے دن اس نے میری
قیام گاہ پر آکر میرا شکریہ ادا کیا تبھی مجھے علم ہوا
کہ اس کا نام کاؤنٹ اسٹلیپ ہنچ ہے!

"ہوں؟" انیتھونی نے سر ہلایا "نکولس
چہارم کے قتل کے بعد کاؤنٹ پیرس چلا گیا۔ ہرزدسلاداکیہ
کے لوگوں نے اسے صدارت کی پیشکش کی۔ مگر اس نے
انکار کر دیا اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی
مگر اس کے باوجود بالکنس کے ہر معاملہ میں اس کا
ہاتھ ضرور پایا گیا۔ بہت گہرا تھا آنجہانی کاؤنٹ
اسٹلیپ ہنچ!"

"نکولس چہارم وہی تو تھا جس نے ایک ذلیل
عورت سے شادی کر لی تھی"

"ذلیل؟ — ہاں وہ پیرس کے ایک رقص گاہ
سے متعلق تھی! نکولس اس پر بڑی طرح مرمٹا تھا اور
اور اس کا نام کاؤنٹس پوپونسکی رکھ کر یہ ثابت کرنے
کی کوشش کی تھی کہ اس کی رگوں میں خالص رومانوف
خاندان کا خون گردش کر رہا ہے۔ نکولس نے پادریوں

کی ناراضگی کے باوجود اس سے [illegible] کارسٹ کے چرچ میں شادی کرلی۔ اور اس کے سر پر ملکہ درا گاہ کی حیثیت سے تاج رکھ دیا گیا۔ نکولس نے وزیروں کو ہمنوا بنالیا لیکن عوام کو، جو بادشاہوں کی شادی میں بھائی بہنوں کو [illegible] خیال کرتے ہیں، رام نہ کرسکا۔ ان میں [illegible] بے اطمینانی پھیل گئی۔ اس کو دور کرنے کے لئے جو بے تکا طریقہ اختیار کیا گیا اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ عوام شاہی محل پر ٹوٹ پڑے۔ بادشاہ اور ملکہ قتل کردیے گئے۔ اور جمہوریت کا اعلان کردیا گیا۔ مگر حالات اب بھی ویسے ہی ہیں۔ انھوں نے دو [illegible] کو بھی قتل کردیا، صرف اس سے [illegible] کے مطابق کام نہیں کررہے تھے [illegible] کہ کاؤنٹ نے تمھارا شکریہ اد [illegible] ہوں سے اپنی تقریر میں اچانک بریک [illegible] سے کہا۔

"ہاں! بات ختم ہوگئی۔ [illegible] آگیا۔ اور کاؤنٹ کے متعلق سوچا بھی نہیں۔ مگر دو ہفتہ پہلے مجھے ایک حیرت انگیز پارسل ملا جو خدا بہتر جانتا ہے کہ کہاں کہاں میرا پیچھا کرتے ہیں، مجھے [illegible] مجھے اخبارات کے ذریعہ علم ہوگیا تھا کہ کاؤنٹ کا انتقال پیرس میں ہوگیا تھا۔ خیر اس پارسل میں کاؤنٹ کی نوٹ بک تھی جس میں اس کی یادداشتیں [illegible] کی قسم کی چیزیں تھیں۔ اس پارسل کے [illegible] ایک پرچہ تھا جس میں تحریر تھا کہ اگر میں اس نوٹ بک کو ۱۳ر اکتوبر سے پہلے ایک مخصوص اشاعتی فرم کو [illegible] دوں تو مجھے ایک ہزار پاؤنڈ مل جائیں گے۔۔۔۔"

"ایک ہزار پاؤنڈ!" انیقوتی حیرت سے اچھل پڑا۔ "جمی! تم نے ایک ہزار پاؤنڈ کہا تھا نا!"

"ہاں میرے بیٹے! ایک ہزار پاؤنڈ مجھے یقین ہے کہ کاؤنٹ نے میرے ساتھ مذاق نہیں کیا [illegible] اس کے باوجود میں نے لندن جانے کے بجائے [illegible] جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ سیاست دانوں وغیرہ پر اعتماد کرنا حماقت ہے۔"

"جمی! یار! عجیب و غریب ہو تم [illegible]" انیقوتی [illegible] ایک ہزار پاؤنڈ جس کا ملنا یقینی ہے [illegible] کے ڈھیروں سے غنیمت ہے۔"

"[illegible] فرض کرو یہ ایک مذاق ہو۔"

"بہرحال میں نے سیٹ بک کرالی ہے اور [illegible] کے لئے سامان سفر بھی تیار ہے۔"

انیقوتی کھڑا ہوگیا اور جیب سے ایک سگرٹ نکال کر سلگائی اور بولا۔

"میں سمجھ رہا ہوں جمیں! اچھی بات ہے! تم جاؤ سونے کی تلاش میں اور وصول کرو ایک ہزار پاؤنڈ! لیکن مجھے اس میں کتنا حصہ ملے گا؟"

"چوتھائی! کیا خیال ہے!"

"ڈھائی سو پاؤنڈ! ٹھیک ہے! معاملات طے! جہنم میں جائے کا سلس سلیکٹ ٹو۔"

دونوں نے سنجیدگی سے ایک دوسرے کا جام صحت پیا:

محمد انصار اللہ نظر

پوربی اردو — آغاز اور ارتقا

(گذشتہ سے پیوستہ) ۲

اردو کے متعلق [?] بات مسلّم ہے کہ یہ ہندوستانی [ز]بان ہے اور یہیں کی آب و ہوا اور یہیں کے ماحول میں وجود [پ]کر پروان چڑھی ہے شاہ مقبول احمد صاحب نے اپنے مضمون "اردو یا ہندوستانی" میں اس زبان کے آغاز سے بحث [ک]رتے ہوئے لکھا ہے :-

> "بعض ہندو اہل علم حضرات کا دعویٰ ہے کہ اس کو اردو کے نام سے تو مسلمانوں کے وقت میں بھی بہت بعد کو پکارا گیا مگر زبان مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی عالم وجود میں آچکی تھی...... ان کا عقیدہ ہے کہ جب مغربی ہندی کے بولنے والوں نے نقل و حرکت شروع کی تو اس آپس کے میل جول نے باہمی مفاہمت کے لئے ایک عام بولی پیدا کی اور یہ بولی دہلی کے آس پاس کے خطے میں پیدا ہوئی جو آج کی طرح اس وقت بھی مرکزی مقام ہونے کے باعث مرجع عالم تھی اور موجودہ اردو کا ڈول اسی وقت پڑ چکا تھا البتہ...... زبان ایک خام شکل میں تھی۔"
>
> (اردو، دہلی، جنوری ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۲۵)

اگر یہ بات صحیح ہے کہ اردو اہل ہند کی زبان تھی اور یہ باہر سے نہیں آئی (اور اس حقیقت کے خلاف اب تک کوئی معتبر بیان راقم سطور کے علم میں نہیں) تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ زبان جو بالآخر اردو کی بنیاد قرار پائی مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی بولی جاتی تھی مسلمانوں کی آمد کے بعد اس زبان نے ان مختلف بولیوں (عربی اور فارسی وغیرہ) کے ا[ثر]ات بھی بتدریج قبول کرنے شروع کر دیئے جو مسلمانوں کے استعمال میں تھیں، ابتدائی دَور میں مقامی لب و لہجہ اور تلفظ حاوی رہا ہوگا۔ بلکہ عربی اور فارسی کے لفظوں کو بھی مقامی لب و لہجہ کے مطابق بولا گیا ہوگا۔ ایک مدّت میں جب مسلمان علماء امرا اور سلاطین نے اس زبان کو اختیار کر لیا ہوگا تو ان کے لب و لہجہ [...] کا درجہ حاصل ہو گیا ہوگا اور اس طرح شین قاف درست ہو کر موجودہ اردو وجود میں آئی ہوگی۔

مسلمان سیاحوں، تاجروں اور تاجروں نے بعض مقامی الفاظ کو ابتدائی دَور میں قبول کیا ہوگا لیکن انھوں نے ان کو اپنے لب و لہجہ کے مطابق بدل لیا ہوگا۔ اس ابتدائی زمانے میں بعض مقامی الفاظ اختیار کر لینے کے باوجود ان کی زبان کو "ہندی" (اردو) نہیں کہا جا سکتا اور نہ ان کے یہاں

...ی تلفظ اور آہنگ ہی مل سکتا ہے۔ البتہ ایک مدت تک
...د و ترک کا سلسلہ جاری رہنے کے بعد جو مخلوط زبان وجود
...آئی ہوگی وہ ہندوستانی عوام میں مقبول و معروف ہو کر
...خر ملک گیر حیثیت حاصل کر گئی ہوگی اور اس کو ...
...دو کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ زبان جو ہندوستانی
...ن کے اس مشترک دھارے سے الگ رہ گئی اور جو ملک
...دلے ہوئے حالات سے سخت گیر نظریات و اصول کے سبب
...دہ متاثر نہ ہو سکی وہ زبان ہے جسے ہم آج ہندی کہتے
...اُردو جیسا کہ ظاہر ہے ابتداء ہی ایک وسیع تر فضا
...چھولی پھلی اور پروان چڑھی۔ اس میں ادبی نقوش بھی
...دہ پہلے اُبھر کر سامنے آئے ہونگے۔ اگرچہ یہ کلیہ نہیں
...سکتا کہ جس زبان میں ادبی تخلیقات پہلے وجود میں
...ی قدیم تر ہے لیکن اگر ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ پہلے ادبی
...ش جن کو "ہندی" (اُردو) کہا گیا ...
...علاقے کی بولی میں وجود میں آئے تو اس زبان (اُردو)
...اریخ غالباً زیادہ صحیح اور بہتر طور پر مرتب کی جا سکتی

...زبان اُردو کے محققین نے بالعموم مسلمانوں ...
...مد پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں
...آمد ہی بالآخر اُردو کی موجودہ صورت کا سبب بنی ہے
...لیکن محض "آمد" بہت اہم نہیں، اگر بات محض آمد کی ہو
...شمالی ہند میں سندھ یا پنجاب کے علاقے میں بہرحال
...مسلمانوں نے دہلی سے پہلے قدم رکھا، لسانی تبدیلیوں
...ے لئے جو بات زیادہ اہم ہے وہ آپس کا رابطہ ہے اور
...س رابطہ کے لئے امن و سکون کی فضا کی ضرورت ہوتی
...ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ باہر سے آنیوالے امن و سکون
...فضا میں بھی بالعموم اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہنا پسند

کرتے ہیں اور پھر جب جنگ اور آویزش کا سلسلہ ہو تو
"اغیار" سے دور دور رہنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے
مغربی علاقوں کے حالات ابتداء ہی ... رہے پھر باہر سے آنے والوں کو ان علاقوں میں اپنے
"ہم زبان" قابل لحاظ تعداد میں ملتے گئے، وہ
برسرِ اقتدار اور صاحب اختیار بھی تھے اسلئے دنیاوی
معاملات کے لئے بھی وہ "محکوموں" کی زبان سیکھنے کے
لئے مجبور نہ تھے اسکے برخلاف پورب کے علاقوں میں
مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم تھی، وہ اس حد تک
صاحب اختیار بھی نہ تھے جتنے وہ دہلی میں تھے۔
مسلمانوں کے نئے نئے قافلے وہاں کمتر آتے تھے، پھر
دہلی کے حکمرانوں سے پورب کے حکام اکثر برسرِ پیکار
... دونوں سے زیادہ سے زیادہ اختلاط
اور رابطہ قائم کرنے کے سوا ان کے پاس چارہ نہ تھا
رزم و بزم دونوں میں یہ مقامی آبادی کی شرکت
... محتاج تھے چنانچہ دنیوی مصلحتوں
کے سبب بھی "دیارِ مشرق" میں رابطہ کا سلسلہ جلد تر
شروع ہوا اور زیادہ مستحکم رہا (آج بھی پورب کے
علاقوں میں پوشش اور بول چال وغیرہ کے لحاظ
سے ہندو مسلمانوں میں اتنا نمایاں فرق نہیں ملے گا
جتنا مغربی علاقوں میں دیکھا جا سکتا ہے)۔

دہلی کو زبان اُردو کا "مولد و منشا" قرار
دیتے وقت دہلی کی مرکزی اور سیاسی اہمیت پر بہت
زور دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زمانہ مابعد میں دہلی کو
یہ حیثیت حاصل ہو گئی تھی لیکن جس زمانے میں اُردو

کے اولین نقوش وجود میں آرہے تھے اُس وقت معاملہ برخلاف تھا چنانچہ خود پروفیسر مسعود حسین خاں کو اعتراف ہے کہ :۔

"اولین سلاطین کے عہد کی دہلی کی تمدنی اور لسانی اعتبار سے ہندوستان میں بہت زیادہ مرتبہ حاصل نہ تھا اس وقت اس کی حیثیت تمدنی مرکز کے بجائے فوجی چھاؤنی کی زیادہ تھی۔"

مقدمہ تاریخ زبان اُردو ص۱۲۲

دہلی کی اہمیت پر اصرار کرتے ہوئے اُس قدیم عہد کے لسانی ماحول کو نظر انداز کرنا بھی مناسب نہیں ہوسکتا پروفیسر مسعود حسین خاں نے اس سلسلہ میں لکھا ہے :۔

"اس زمانہ میں بدھ دھرم اپنی بگڑی ہوئی شکل میں مشرقی ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا، بہار میں نالندا اور وکرم شلا نام کی درسگاہیں بدھ سدھوں کے اڈے تھے۔ بختیار خلجی نے ان مقامات کو اُجاڑا تو یہ تتر بتر ہوکر ادھر اُدھر پھیل گئے...... دو ہے لکھے ہیں ان میں چوراسی سدھ مشہور ہیں جن میں سب سے پُرانے سرہ ہیں جو سنہ ۱۳۳ء کے آس پاس گزرے ہیں" (ایضاً ص۹۵)

گوتم بدھ کے سلسلہ حالات میں کشی نگر (کسیا ضلع دیوریا) کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے، اس کا ذکر بھی مناسب تھا۔ ان واقعات پر نگاہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ جہاں مغربی بولیاں پوربی بولیوں کو متاثر کررہی تھیں وہیں پوربی بولیوں کے اثرات بھی ہندوستان گیر تھے۔ بختیار خلجی کا زمانہ وہ ہے جب ایک مشترک تہذیب اور مخلوط ...... نے نگاہ تھا "مشرقی ہندوستان" کے بدھ سدھوں کا اس زمانے میں ملک میں منتشر ہو[ ] اہم واقعہ ہے۔

زبان اُردو کے اولین نقوش تلاش کرنے [ ] مسلمان سیاحوں کے سفرناموں کی اہمیت بھی ہے لیکن ان سفرناموں سے کوئی قطعی رائے قائم کرنا [ ] نہیں البیرونی نے اپنے سفرنامے وغیرہ میں جو ہندی [ ] استعمال کئے ہیں ان کی بابت پروفیسر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے :۔

"مذکورہ بالا الفاظ میں پنجابی اور سندھ کی جھلک صاف نظر آتی ہے اعداد خالصتاً مغربی پنجابی کے ہیں [illegible] عموماً میں [illegible] پائی جاتی ہے اور [illegible] ان سے زیادہ مختلف بھی ہیں" (ایضاً ص۱۱۷)

ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی نے البیرونی کے یہاں مستعمل الفاظ کی بابت جو لکھا ہے نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے :

"البیرونی کی تصانیف میں ہمیں جا بجا تلفظ کا اختلاف نظر آتا ہے انھوں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ کسی ایک جگہ کے تلفظ کے مطابق نہیں ہیں..... البیرونی کی تصنیف میں..... دو طرح کی خامیاں پیدا ہوگئی ہیں ایک تو تلفظ اور لب ولہجہ کا اختلاف، دوسرے بغیر نقطوں کے حروف میں لکھے ہوئے بہت سے نقط..... درست نہیں ہوتے..... البیرونی کی خود نوشت قلمی کتاب کی نقل سنہ ۱۱۶۹ء [ ] میں ہوئی نقل نویس بھی سنسکرت سے ناواقف تھا۔ آواز میں بدل جاتی ہیں اور اکثر لفظ غلط اور بے معنی ہوگئے ہیں..... البیرونی نے عموماً ہندوستانی زبان کی "ح" "دھ" کی جگہ عربی

"د" کا استعمال کیا ہے..... انھوں نے "ڈ"
اور "ڈ" کے لئے "ت" اور "د" کا استعمال
کیا ہے اور جہاں "ڈ" کا تلفظ "ڑ" کی طرح ہے
وہاں "ر" کا استعمال کیا ہے۔

(بکھرے ورق صفحہ ۳۲ تا صفحہ ۳۳)

یہ بات کچھ البیرونی تک محدود نہیں ان کے بعد کے اکثر مصنفین کے یہاں بھی مقامی تلفظ کو ضبط تحریر میں لاتے وقت انھیں دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے اسلئے لسانیاتی بحثوں میں نہایت محتاط رویّہ کی ضرورت ہے، ذرا سی چوک بڑے دوررس نتائج کا سبب ہوسکتی ہے۔ اس دشواری کے علاوہ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ جو سیّاح، تاجر یا تاجور شمالی مغرب سے آکر دہلی یا پنجاب تک ہی رہ گیا اس کی معلومات ہندوستان کی زبان یا معاشرت کے متعلق ناقص ہونگی اس کے بیانات پر تنہا دکرکے کلُ پر حکم لگانا ضروری نہیں کہ بہت صحیح ہو۔

زبان اُردو اگر ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار ہے تو تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس بارے میں صوفیائے کرام کے کارناموں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے صحیح لکھا ہے :۔

"دلوں کے ہاتھ میں لانے کے لئے سب سے پہلے
ہمزبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے' درویش
کا تکیہ سب کے لئے کھلا ہے..... خواص سے زیادہ
عوام ان کی طرف جھکتے تھے اسلئے تلقین کے لئے
جہاں انھوں نے اور ڈھنگ اختیار کئے ان میں
سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں
تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہونچا سکیں"

(اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ ۸)

مولوی صاحب مرحوم نے اس دعویٰ کے اثبات کے لئے ایک اقتباس نقل کیا ہے جو یہاں بھی درج کیا جاتا ہے :۔

"ہمارے اس بیان کی تائید فاضل شارح
الکھروتی (تصنیف ملک محمد جائسی) کے
قول سے بھی ہوتی ہے جس کا اظہار انھوں نے کتاب
کے خاتمہ پر کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ و توہم نکند کہ اولیاء اللہ
بغیر از زبانِ عربی تکلم نکردہ، زیرا کہ جملہ اولیاء
اللہ در ملک عربی مخصوص نبودہ..... و گمان
نکند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبان ہندی تکلم نکردہ،
زیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ..... خواجہ بزرگ
معین الحق..... بدیں زبان سخن فرمودہ، بعد
ازاں حضرت خواجہ گنج شکر..... در زبان ہندی
و پنجابی بعضی از اشعار نظم فرمودہ چنانکہ در
مرحوم مشہور اند"

(ایضاً صفحہ ۸ تا صفحہ ۹)

شارح "الکھروتی" کے پیش نظر ملک محمد جائسی کی زبان تھی جس کے "پوربی" ہونے میں کوئی شک نہیں، وہ حضرت خواجہ بزرگ کی زبان کو بھی ہندی کہتا ہے، حضرت گنج شکر کی بابت کہتا ہے کہ انھوں نے ایک طرف پنجابی میں شعر کہے تو دوسری طرف ہندی میں کہے، یعنی وہ ہندی اور پنجابی میں نمایاں طور پہ فرق کرتا ہے' اس طرح یہ خیال غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس کے نزدیک "ہندی" یا تو وہی زبان تھی جو جائسی کی ہے یا کم و بیش اسی جیسی زبان کا یہ نام ہے۔ انکے اس بیان کو

تاریخی حقائق کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔

پورب کے علاقوں کے تاریخی حالات پر نظر کریں تو بعض اہم حقائق سامنے آئیں گے۔ مثال کے طور پر قصبہ لاہرپور (لہرپور) ضلع سیتاپور کے حالات میں محمد شہیر الحسن عثمانی صاحب لکھتے ہیں :۔

"پاسیوں نے مسلمانوں پر انتہائی مظالم کئے آخر میں قنوج کے فوجدار شیخ طاہر غازی ۳۹۰–۳۷۰ھ[1] کے درمیان ان پاسیوں پر حملہ کرکے ان کی سرکوبی کی شیخ طاہر غازی نے یہیں قیام کیا۔ عیدگاہ وغیرہ تعمیر کرا دیا۔ کربلا جس کو "سکتاہر" بھی کہتے ہیں شیخ طاہر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کربلا سے لے کر جس میں اب محلہ بہلول پور، پرانی گھرکھیت اور نئی گھرکھیت آباد ہے اس میدان میں شیخ طاہر نے پاسیوں سے جنگ جیتی تھی۔"

(تذکرہ علماء و مشائخ لاہرپور ص۷ تا ۸)

اس اقتباس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ان علاقوں میں بہت پہلے آکر آباد ہونے لگے تھے اور وہاں کے عوام کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے تھے وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مقامی لب و لہجہ کے مطابق اُن کے ناموں کے تلفظ کو بھی لوگ تبدیل کر لیتے تھے۔ اس طرح اس علاقے کی اہم ترین تاریخی شخصیتوں میں بہرائچ کے "غازی میاں" بھی تھے، ان کی بابت مختلف روائتیں مشہور ہیں، ان کے حالات اس طرح بیان کئے گئے ہیں:۔

"تاریخ سالار مسعود غازی سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود غزنوی کے انتقال سے دو ایک برس پہلے اس کا ایک لشکر اس کے بھانجے سالار مسعود غازی کے تحت میں ہندوستان آیا۔ سالار مسعود نے مقام ستر کھ میں قیام کرکے مشرقی علاقوں پر چڑھائی کی۔ اکثر راجاؤں نے متحد ہو کر مقابلہ کیا لیکن ان میں بعض ایسے تھے۔ جو پہلے سے سلطان محمود سے ربط رکھتے تھے ...... بہر حال مسعود نے اکثر راجاؤں کو شکست دے کر ان کی متحدہ طاقت کا استیصال کیا لیکن بالآخر خود بھی مقتول ہو کر بہرائچ میں مدفون ہوئے ...... سالار مسعود کے لشکر کا اطراف بنارس تک آنا صریح طور پر مذکور ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ تمام اطراف میں کمتر کوئی مقام ہوگا جہاں ان سپاہیوں نے جنگ نہ کی ہو۔ سالار مسعود کے بعد اس گروہ کے پس ماندہ افراد مختلف اطراف میں منتشر ہو گئے۔ جن جن مقاموں میں مسعود غازی کے سپاہیوں نے جنگ کی اور مقتول ہو کر مدفون ہوئے عام طور پر گنج شہیدان کے نام سے مشہور ہیں۔ اطراف کڑہ مانکپور، غازی پور، سیوان کے علاوہ خاص قصبہ مئو میں بھی ایسی جگہ ہے جہاں اس واقعے کی یادگار میں سالانہ میلہ ہوا کرتا ہے، جو غازی میاں کے میلے کے نام سے مشہور ہیں۔"

(تاریخ مئو ص۹۵ تا ص۹۶)

اس جنگ کا مقصد ملک گیری کے بجائے تبلیغ و اشاعت دین تھا چنانچہ ان میں سے اکثر نے ان مقامات پر سکونت بھی اختیار کر لی، بتایا گیا ہے کہ :۔

"خواجہ عماد خلجی جو سالار مسعود کے ہم جد تھے در محاربہ مجاہدانہ سالار مسعود میں شریک تھے انکی اولاد بہرائچ میں اب تک موجود ہے۔" (ایضاً ص۹۷)

---

[1] اصل "۳۹۰–۳۷۰ھ" لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ سہو کاتب ہے [illegible] تحقیق طلب ہے۔

مطبوعات ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت) (ا)

۱- اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر۔ ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۲/-
۲- نقوش نمبر - فروغ اردو - اقبال صدیقی ۳/۵۰
۳- انوار اللغات اُردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۴/-
۴- ادبی تاثرات - ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۲/۵۰
۵- آئینۂ عقل - پروفیسر نکہت شاہجہانپوری ۲/۵۰
۶- اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ - ڈاکٹر احسن فاروقی ۴/۵۰
۷- امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۳/
۸- انارکلی - امتیاز علی تاج ۲/۲۵
۹- اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ پروفیسر کلیم الدین احمد ۶/-
۱۰- اُردو میں تنقید - ڈاکٹر احسن فاروقی ۳/-
۱۱- انتخاب قصائد اردو مغیث الدین زیدی ۱/۵۰
۱۲- ادب اور نظریہ - آل احمد سرور ۵/-
۱۳- اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ مسعود عبدالشکور ۴/۵۰
۱۴- ادبی نقوش - شاہ معین الدین احمد ندوی ۵/-
۱۵- اقبال - مرتبہ فروغ اُردو ۰/۵۰
۱۶- اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں عبدالماجد دریابادی ۴/۵۰
۱۷- البرامکہ یعنی آل برامکہ کا عروج و زوال ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے ۲/-
۱۸- انتخاب کلام میر مع مقدمہ - ناظر کاکوروی ۱/-
۱۹- انتخاب کلام غالب - بشیر احمد علوی ۱/۵۰
۲۰- ادبی تنقید - ڈاکٹر محمد حسن ۴/۵۰
۲۱- انتخاب قصائد و غزلیات (فروغ اُردو) ۴/-
۲۲- ادب کیا ہے - ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۲/۵۰
۲۳- ادبی خطوط غالب - مرزا محمد عسکری ۶/-
۲۴ آئینۂ نثر اُردو - سعادت علی صدیقی ۳/-
۲۵ ایک نادر روزنامچہ - ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۲/۵۰
۲۶ ابو الخیر - مجنوں گورکھپوری ۰/۳۷
۲۷ اُردو کی کہانی - سید احتشام حسین ۱/۵۰
۲۸ ادب پارے حصہ نظم و نثر " " ۴/۰۰
۲۹ انتخاب نثر جدید " " ۳/-
۳۰ ابو الکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد ۰/۲۵
۳۱ ارمغان نثر و نظم - عبدالاحد خاں خلیل ۲/۲۵
۳۲ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۱/۵۰
۳۳ اچھی نظمیں - آغا کرشتان ۰/۵۰
۳۴- اردو ادب میں طنز و مزاح کامل پو جلد جدید ایڈیشن سید محمد فرقت ۱۳/-
۳۵ اُردو شاعری امیر احمد علوی ۱/۵۰
۳۶ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ ۱/۵۰
۳۷ غزلیات حافظ صائب غالب فارسی ۲/۵۰
۳۸ ایڈیسن کی زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب اعجاز احمد فاروقی ۱/۲۵
۳۹ اللہ کے پیارے امیر حسن نورانی ۰/۵۰
۴۰ ادبی معرکے نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۱/۵۰
۴۱ ارض القرآن جغرافیہ قرآنی - عبدالماجد دریابادی ۱/۲۵
۴۲ اسپین کی شہزادی - صادق سرحدی ۴/۵۰
۴۳ ایک جان تین قالب - خاں محبوب طرزی ۴/-
۴۴ اُلفت " " " ۵/۵۰
۴۵ آغاز سحر " " " ۴/-
۴۶ امین آباد " " " ۳/-
۴۷ اپنی موج میں - آوارہ ۲/۵۰
۴۸- انوار جمیلہ بہ خط و کتابت - خلیق احمد علوی ۰/۲۵

۴۹ ایجادوں کی باتیں ۔ مصطفےٰ احسن رضوی ۲/-
۵۰ اچھی کہانیاں (حصہ اول) شمس الدین نوری ۰/۴۰
۵۱ (حصہ دوم) " " ۰/۳۵
۵۲ (حصہ چہارم) " " ۰/۵۰
۵۳ ادب کا مقصد ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/-

(ب)

۵۴ بابائے اردو عبدالحق ۔ عبداللطیف اعظمی ۵/-
۵۵ بستان حرم (جدید نعتیہ کلام) [illegible] حمید صدیقی ۱/۵۰
۵۶ شہید محبت [illegible] ۴/-
۵۷ [illegible]
۵۸ [illegible]
۵۹ بہادر شاہ ظفر [illegible]
۶۰ بہشتی زیور اول دوم [illegible] تھانوی ۳/-
۶۱ بانی اسلام (علامہ محی الدین [illegible]) [illegible] ترجمہ ۰/۰۵

(پ)

۶۲ پطرس کے مضامین ۔ پطرس بخاری ۱/۵۰
۶۳ [illegible] ۰/۴۰
۶۴ پھولوں کا [illegible] (ناول) [illegible] ۴/۵۰
۶۵ پیسہ اور پرچھائیں (مجموعہ ڈرامہ) ڈاکٹر محمد حسن ۴/۵۰
۶۶ پاگل خانہ (ناول) [illegible] ۳/۲۵
۶۷ پیغام " [illegible] ۳/-
۶۸ پنجاب میں اردو حافظ محمود شیرانی ۲/۵۰
۶۹ پردیسی کے خطوط (حصہ اول) [illegible] ۲/-

(ت)

۷۰ تاریخ ادب اردو (فروغ اردو ایڈیشن) ڈاکٹر سید اعجاز حسین ۹/-
۷۱ تحریریں مجموعہ مضامین ڈاکٹر گیان چند ۴/۵۰
۷۲ تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ ۔ زبیر احمد علوی ۰/۷۵
۷۳ تاریخی جائزے ڈاکٹر محمد یٰسین ۳/-
۷۴ تعارف تاریخ اردو (جدید ایڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/-
۷۵ تاجدار مدینہ اقبال صدیقی ۰/۱۲
۷۶ تنقیدی اصول اور نظریے حامد اللہ افسر ۴/۵۰
۷۷ تنقید و تحلیل ۔ شبیہ الحسن نونہروی ۳/-
۷۸ تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) سید احتشام حسین ۲/۵۰
۷۹ تنقیدی نظریات (جلد اول) " " ۶/-
۸۰ " (جلد دوم) " " ۶/-
۸۱ تنقیدی اور عملی تنقید " " ۵/-
۸۲ تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن ۱۹۶۳ء) آل احمد سرور ۳/۵۰
۸۳ ترانہائے خیام ۔ ڈاکٹر رغیب حسین ۲/-
۸۴ تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص محمد حسین [illegible] ۱/۶۵

(ٹ)

۸۵ ٹیگور آدم سیتاپوری ۲/-
۸۶ ٹھیکرے کی مانگ ۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲/-

(ث)

۸۷ ثنائے حبیب (نعتیہ کلام) بہزاد لکھنوی ۲/۲۵

(ج)

۸۸ جان غالب محمد حسین شمس علوی ۲/-
۸۹ جائزے انور سدیدانی ۳/-
۹۰ جواہرات تحلیل ۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱/-
۹۱ جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) فروغ اردو ۳/-
۹۲ جنگ آزادی نمبر ۲ " " ۳/-
۹۳ جرس رواں (مجموعہ کلام) حامد اللہ افسر ۲/۵۰
۹۴ چادر کی آنکھ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اثر بلگرامی ۳/۵۰
۹۵ جنگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین ۲/۵۰
۹۶ جلوے معین الدین دردائی ۱/۷۵

۹۷ جمیلہ بوائری (ناول) خان محبوب طرزی ۴/۵۰
۹۸ جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۶/-

(چ)

۹۹ چوٹی بہن مجموعہ افسانہ - مسیح الحسن رضوی ۲/۷۵

(ح)

۱۰۰ حیات فضل الحق خیرآبادی ۱/۲۵
۱۰۱ حالی بحیثیت شاعر (جدید اڈیشن مع اضافہ جدید اڈیشن) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۲/-
۱۰۲ حسرت موہانی عبدالشکور ۳/۵۰
۱۰۳ حسرت تعمیر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰
۱۰۴ حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰
۱۰۵ حکیم نباتات وزیر خاں لنکراں ۲/
۱۰۶ حبسیۂ غالب سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۰۷ خیالات رنگین یعنی مجموعہ مضامین فارسی (زیر طبع)
۱۰۸ خلاصہ شریف زادہ مرزا رسوا ۱/-
۱۰۹ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی عبدالماجد دریابادی ۲/۷۵
۱۱۰ خضر راہ معہ ترجمہ علامہ اقبال -/۷۵
۱۱۱ خلاصہ روح تنقید ۱/-
۱۱۲ خلاصہ جواہر العروض ۱/-
۱۱۳ خلاصہ المیزان -/۷۵
۱۱۴ خبطی (مزاحیہ) محمد علی واحدی معہ مقدمہ شوکت تھانوی ۱/۵۰
۱۱۵ خوش بختی کی تلاش - احسن الظفر بی اے ۲/-
خلاصہ شعر الہند (دوم) ۱/-

(د)

۱۱۶ دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۳/-
۱۱۷ دیوان فغانی ۱/۵۰
۱۱۸ داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی)
۳/- [illegible]

۱۱۹ دیوان صفی (حصہ اول) صفی لکھنوی ۲/-
۱۲۰ دہلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/-
۱۲۱ دستۂ گل شبلی نعمانی ۱/۴۰
۱۲۲ دوشیزہ قاف (ناول) خان محبوب طرزی -
۱۲۳ دلربا " " " ۱/-
۱۲۴ دلی کا دبستان شاعری معہ اضافہ جدید اڈیشن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۱/-

(ڈ)

۱۲۵ ڈاکٹر نذیر احمد انوار الحسن ۱/۳۷

(ذ)

۱۲۶ ذوق جستجو - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی /۵۰
۱۲۷ ذوق ادب و شعور - پروفیسر احتشام حسین /۵۰
۱۲۸ ذوق جنون مجموعہ کلام آل احمد سرور /۵۰

(ر)

۱۲۹ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین /۰
۱۳۰ رباعیات غالب معہ اردو ترجمہ سید امیر حسن نورانی /۰
۱۳۱ رہبر مضمون نویسی - شجاعت علی صدیقی /۵۰
۱۳۲ راکھی - ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی /۳۷
۱۳۳ رخسار سحر - انعم کریم قدوائی /۵۰
۱۳۴ رفتار (ناول) /۵۰
۱۳۵ رموز حکمت معہ مقدمہ اردو - محمد شریف /۵۰
۱۳۶ ریاض فارسی - منتخب کلام فارسی /۰

(ز)

۱۳۷ زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ مولانا تھانوی /۵۰
۱۳۸ زنبیلیوں کا بادشاہ (حکیم بابا دفراحیہ ناول) علی عباس حسینی /۰

(س)

۱۳۹	سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	۲/۰
۱۴۰	سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۳/۰
۱۴۱	سرور جہاں آبادی	ڈاکٹر حکیم چند نیّر	- -
۱۴۲	سرود نو (مجموعہ کلام)	پروفیسر اختر قادری	۳/-
۱۴۳	سالک گہر	سید احتشام حسین	۳/-
۱۴۴	ساحل و سمندر	سید احتشام حسین	۶/-
۱۴۵	سرسید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری	سید علی عباس حسینی	۱/۵۰
۱۴۶	سرمایہ زبان اردو	جلال لکھنوی	۴/۵۰
۱۴۷	سخنہائے گفتنی	کلیم الدین احمد	۵/-
۱۴۸	سفر (ناول)	اے ایل کلیم آبادی	۴/-
۱۴۹	سیاحت زمین (ناول)	محمود اعظم فہمی	۱/۵۰
۱۵۰	سید سالار مسعود غازیؒ	جوشی محمود آبادی	۳/۵۰
۱۵۱	ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	۲/۵۰
۱۵۲	سہرا حلقہ		۷۵
۱۵۳	سرسید احمد خاں	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۱۵۴	سوشل اسٹڈی	احمد محسن کاکوروی	۱/۷۵

(ش)

۱۵۵	شرح دیوان غالب (مزاحیہ)	غلام احمد فرقت	۸/۰
۱۵۶	شرح سالک گہر	عبد القوی دریابادی	۳/۵۰
۱۵۷	شاہ نگیں حضرت جی	پروفیسر عبد الشکور	۳/-
۱۵۸	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۴/-
۱۵۹	شرح ادب پارے نظم		۳/۰
۱۶۰	شرح منتخبات فارسی	عبد القوی دریابادی	۴/۵۰
۱۶۱	شبلی نعمانی	انوار الحسن صدیقی	۰/۳۷
۱۶۲	شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن)	نظم طباطبائی	۵/۰
۱۶۳	شاہان سلاطین گجرات کی تاریخ	امیر احمد علوی	۲/۵۰
۱۶۴	شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم	شبلی نعمانی	۲۵/۰
۱۶۵	شرح نثر امروز ایران	احسن مظفر ایم اے	۲/۰
۱۶۶	شرح شعر امروز ایران		۲/۵۰
۱۶۷	شمع و شاعر	علامہ اقبال	۰/۲۵
۱۶۸	شرح حکیم نباتات خاں	نیّر مسعود	۱/۲۵
۱۶۹	شرح انتخاب قصائد و غزلیات		
۱۷۰	مطابق نصاب بی اے	عبد الحلیم ندوی	۶/۰
۱۷۱	شرح ترانہائے خیام	حکیم عبد القوی	۱/۵۰
۱۷۲	شرح نصاب فارسی		۴/۰

(ص)

۱۷۳	صید و بد صید (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۳/۰
۱۷۴	صحیفۂ محبت (مہدی افادی کے خطوط)	ڈاکٹر محمود الٰہی	۵/۰

(ط)

۱۷۵	طرزی نمبر (فرمان) محبوب طرزی	مرتبہ فروغ اردو	۲/۰
۱۷۶	طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے	غلام الثقلین	۰/۳۷
۱۷۷	طلسم اسرار (ڈرامہ)	مرزا رسوا لکھنوی	۱/۲۵
۱۷۸	طرۂ امیر - امیر مینائی منتخب کلام		
۱۷۹	(جدید ایڈیشن)	امیر احمد علوی	۳/۵۰

(ع)

۱۸۰	عذرا (ناول)	صالحہ عابد حسین	۵/۰
۱۸۱	عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)	سید احتشام حسین	۴/۵۰
۱۸۲	غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینے میں	اخلاق حسین عارف	۲/۰

(غ)

۱۸۳ غالب کی تخلیقی تخئیل۔ شبیہہ صفی پوری ۴/۰

۱۸۴ غنچۂ گل سید محمود الحسن رضوی ۳/۰

۱۸۵ غالب کے کلام میں محاکاتی عناصر نادم سیتاپوری ۴/۵۰

۱۸۶ غزنی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۱۸۷ غزلیات نظیری ۱/۵۰

(ف)

۱۸۸ فنِ خطابت یعنی استاد تقریر۔ کتاب مصطفےٰ اینڈ کمپنی ۰/۷

۱۸۹ فریدہ خان محبوب طرزی ۲/۰

۱۹۰ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ نادم سیتاپوری ۴/۵۰

۱۹۱ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۳/۵۰

۱۹۲ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۱۹۳ فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی ۳/۰

۱۹۴ فغانِ محسن محسن کاکوروی ۰/۳۰

۱۹۵ فارسی آموز شبیر احمد علوی ۱/۰

۱۹۶ فنِ داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۴/۵۰

(ق)

۱۹۷ قدیم و جدید مزاحیہ نظمیں غلام احمد فرقت ۵/۰

۱۹۸ قصائد خاقانی ۱/۵۰

۱۹۹ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰

۲۰۰ قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۴/۵۰

۲۰۱ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۷/۰

۲۰۲ قدر و نظر ڈاکٹر اختر اورینوی ۴/۵۰

۲۰۳ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۲/۰

۲۰۴ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/

۲۰۵ قومی ادب نثر و نظم حامد افسر ۳/۸۳

۲۰۶ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۳/۰

(ک)

۲۰۷ کیسر اور کاہی بدرالدین الحبیب جی ۲/۰

۲۰۸ کفِ گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۳/۰

(گ)

۲۰۹ گلبانگ حرم مصورہ مقامات مقدسہ کے فوٹو زائر حرم حمید لکھنوی ۵/۰

۲۱۰ گاندھی نمبر ۲/۰

۲۱۱ گلدستۂ فارسی اول و دوم ۱/۳۰

۲۱۲ گلزار فارسی یعنی آمد نامہ ۰/۴۰

۲۱۳ گلہائے ادب ـ عبدالاحد خاں خلیل ۳/۰

۲۱۴ گاندھی جی کے ساتھ حامد اللہ افسر ۱/۵۰

(ل)

۲۱۵ لوائح جامی مع مقدمہ عبدالاحد خاں خلیل ۱/۵۰

۲۱۶ لالِ نغمہ مائل ملیح آبادی ۶/۰

۲۱۷ لبِ بام عادل رشید ۵/۰

۲۱۸ لسانیات اور اردو سید محمود حسن رضوی ۲/۵۰

(م)

۲۱۹ مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو غلام احمد فرقت ۸/۰

۲۲۰ محسن کاکوروی نمبر ۳/۰

۲۲۱ مسلمان اور کانگریس ابوالکلام آزاد ۲/۵۰

۲۲۲ مرثیہ نگاری اور میر انیس۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ۴/۰

۲۲۳ مضامین فرحت (حصہ اول) مرزا فرحت اللہ بیگ ۳/۰

۲۲۴ مضامین فرحت (حصہ دوم) " " " ۲/۰

۲۲۵ ماضی کی کہانیاں آفتاب اختر تلہری ۲/۵۰

۲۲۶ میرے اسٹیج ڈرامے ڈاکٹر محمد حسن ۴/۵۰

۲۲۰ موسم گل (ناول) عادل رشید ۶/۰

۲۲۰ مجبور " خان محبوب طرزی ۴/۵۰

۲۲۱ مضامین جدیدہ محمد ہادی ۱/۲۵

۲۲۲ مثنوی سحر حلال (فارسی) مع مقدمہ قدرت اللہ بیگ ۲/۵۰

۲۲۳ مطالعہ شبلی ۔ ناظر کاکوروی ۔ شجاعت علی سندیلوی ۴/۰

۲۳۱ نثریات شبلی جالب مظہری ۲/۵۰

۲۳۲ مثنویات حالی ۔ ناظر کاکوروی ۔ شجاعت علی سندیلوی ۲/۵۰

۲۳۳ مطالعہ حالی " " " ۴/۵۰

۲۳۵ میٹھے بول " " ۱/۲۵

۲۳۶ مولوی نذیر احمد کی کہانی ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۰

۲۳۷ معرکہ روم و یونان صادق سردھنوی ۶/۰

۲۳۸ مصنوعی چاند خان محبوب طرزی ۴/۰

۲۳۹ مقدمہ شعر و شاعری (مطابق نصاب بی۔ اے) حالی ۱/۵۰

۲۴۰ مرثیہ غالب " ۰/۲۵

۲۴۱ مجموعہ کربلا جرجی زیدان ۳/۵۰

۲۴۲ معمار مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۲۴۳ مولانا حالی انوار الحسن صدیقی ۰/۳۷

۲۴۴ مہاراج بلی ڈاکٹر احسن فاروقی ۲/۰

۲۴۵ مسٹر ملا کی نوک جھونک ۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ۰/۷۵

۲۴۶ مجذوب اور ان کا کلام ۔ مولانا رضا انصاری ۱/۵۰

۲۴۷ مصباح بلاغت مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۲/۰

۲۴۸ مطالعہ سودا ڈاکٹر محمد حسن ۳/۰

۲۴۹ مزامیر شرح دیوان غالب ۔ غلام احمد فرقت ۸/۰

۲۵۰ مقدمات شعر و مقالات ۔ عبدالماجد خان خلیل ۵/۵۰

۲۵۱ منتخب سوانح اور خاکے ۔ نجم الدین نقوی ۳/۰

(ن)

۲۵۲ نثر امروز ایرانی ڈاکٹر مغیث حسین ۳/۰

۲۵۳ نشاط غالب ۔ وجاہت علی سندیلوی ۲/۵۰

۲۵۴ نقد و انتقاد اعجاز احمد معجز ۲/۰

۲۵۵ نقش حالی اول و دوم یعنی حالی نمبر پروفیسر احتشام حسین ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی شجاعت علی سندیلوی ۱۲/۰

۲۵۶ نغمہ کوہسار خان محبوب طرزی ۳/۰

۲۵۷ نفحات الہند مع مقدمہ (اردو) محمد شریف ۳/۰

۲۵۸ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی کبیر احمد جائسی ۲/۰

۲۵۹ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ [illegible] ۳/۰

۲۶۰ [illegible] (ناول) [illegible] ۳/۵۰

۲۶۱ نوروز (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۲۶۲ نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ آل احمد سرور ۶/۰

۲۶۳ نقوش و افکار مجنوں گورکھپوری ۴/۵۰

۲۶۴ نیلم انتظار حسین ۳/۰

۲۶۵ نذیر احمد کی کہانی فرحت اللہ بیگ ۱/۰

۲۶۶ نصاب فارسی مع مقدمہ [illegible] عبدالماجد خان خلیل ۴/۰

۲۶۷ نقش لکھنؤ نمبر ۲/۰

(ہ)

۲۶۸ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے علی عباس حسینی ۳/۰

۲۶۹ ہندی کے مسلمان شعرا [illegible] ۰/۷۵

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اُردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

① پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہ نامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

② جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب کے روانہ فرمائیں

③ اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

④ جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے

⑤ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں